بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۷۹ جلد ۱۴ یکم جنوری سنہ ۱۹۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۹ جلد ۱۳ — یکم جنوری سنہ ۱۹۱۵ء

تاریخ الفلسفہ

حصۂ اول

(ابتدا و تعریفات)

انسان دیگر حیوانات سے محض اپنی عقل و دانش کی وجہ سے افضل ہے۔ حیوان دیکھتا ہے، سنتا ہے، یاد رکھتا ہے۔ لیکن وہ اُن قُویٰ کا استعمال صرف اُس وقت کرتا ہے جب کوئی فوری ضرورت آ پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان فطرت کے گوناگوں عجائب و مظاہر کا معائنہ کرتا ہے انکی نسبت واقفیت بہم پہنچاتا ہے اور چاہتا ہے کہ دلائلِ عقلیہ کے ذریعے سے ان مختلف عجائب و واقعات کے باہمی ربط و رشتے کو سمجھ لے تاکہ ہر چیز کی اصلیت اسکی سمجھ میں آجائے

حکیم ارسطو کا قول ہے کہ فلسفہ کی ابتدا تحیّر سے ہوئی۔ انسان کو ہر طرف مختلف مظاہر و مناظرِ عالم نظر آئے، حیات کی علی الاتصال تغیر پذیر کیفیات سے اُسکا سامنا ہوا۔ پس وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھنے لگا۔ یہ سب کیوں ہے؟ کہاں سے آیا؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟

کلدانی قوم نے علمِ ہیئت محض اس غرض سے حاصل کیا تھا کہ اُنکو اپنے ریوڑوں کی رہنمائی

کرنے میں مدد ملے۔ بعینہٖ اسی طرح انسان معمائے کائنات کو محض اس غرض سے حل کرنا چاہتا ہے کہ اُسکو اپنی دنیاوی اغراض کے حصول وحفاظت کی تدابیر معلوم ہوجائیں اور وہ جہل کی غلامی سے آزاد ہوجائے۔

فلسفہ

موجوداتِ کائنات کی ماہیت دریافت کرنے کی کوشش وآرزو کا نام فلسفہ ہے۔ اسکی غایت ہے جہالت سے آزادی، تلاشِ حق، اور اس راستی نما دروغ کی پردہ دری جو صرف ظاہری راستی کے سمیائی پردے میں پنہاں ہے۔

۱۔ حکیم ہیروڈولس کا قول ہے کہ تفلسف کے معنی ہیں تحصیل علم۔

۲۔ ہیراکلیٹس کا قول ہے کہ شائستگی حاصل کرنے کی کوشش کو تفلسف کہتے ہیں۔

۳۔ حکیم فیثاغورث وسقراط کا قول ہے کہ عقل ودانش صرف خدا کی ملکیت ہے۔ انسان کے اختیار میں صرف اس قدر ہے کہ اسکے حصول کی کوشش کرے۔ اسی کوشش کا نام تفلسف ہے۔

فلاسفر

یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے عاشقِ عقل

پیشہ ور فیلسوف

وہ شخص جس نے ماہیت اشیا کا دریافت کرنا اور انکی نسبت دلائل عقلی کا قائم کرنا ہی اپنی تحصیل علم کا مقصد اصلی قرار دیا ہو اُسکو پیشہ ور فلاسفر کہتے ہیں۔

سوفس یعنی دانشمند

اوّل اوّل یہ لفظ ہر اُس شخص کے لیے استعمال ہوتا تھا جسکو کسی قسم کی بھی قابلیت ہو، عام اس سے کہ وہ قابلیت دماغی ہو یا جسمانی۔ مثلاً باورچی گری۔ موسیقی۔ وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ صرف اُن لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا جنکو صرف دماغی فضیلت حاصل ہوتی تھی

سوفسطائی یعنی دانش فروش

یہ لوگ تعلیم یافتہ ہوتے تھے مگر تاجر مسافروں کی طرح جابجا دورہ کرتے تھے اور ہر قسم کے علوم اُجرت لے کر سکھاتے تھے جنکو اُنکے خریدار صرف اپنی عملی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے سیکھ لیا کرتے تھے۔

فلسفہ تمام مسائل کائنات کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ محض بعورت علم ہوں یا آدمی کے کسی عملی فائدہ کے لیے ہوں۔ بالفاظِ دیگر۔ فلسفہ اِن تین بڑے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے:۔ کیا ہے؟ کیونکر ہے؟ کیوں ہے؟

انکے جوابات مختلف حکما نے مختلف طور سے دیے ہیں جسکی وجہ سے حکما کے علٰحدہ علٰحدہ حلقہائے تعلیم واثر قائم ہوگئے۔ اس اختلافِ آرا کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہر حکیم نے اپنی رائے خود اپنے گرد وپیش کی حالت کے زیر اثر اور اپنے زمانہ کی خصوصیات کے لحاظ سے دی ہے۔

تاریخ الفلسفہ

اس مختصر خاکہ میں فلسفہ کی تدریجی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ حکمائے ہند و یونان سے شروع ہوتا ہے اور ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے۔ فلسفہ کے دو بڑے دور ہوئے (۱) فلسفۂ قدیم (۲) فلسفۂ جدید۔

فلسفۂ قدیم

اس فلسفہ کے چار دور ہوے۔ ۱۔ فلسفۂ ہند و یونان۔ ۲۔ فلسفۂ یونان ُروم۔ ۳۔ فلسفۂ قرونِ وسطٰی یعنی فلسفۂ عیسائیہ۔ ۴۔ فلسفۂ عربیہ۔

فلسفۂ یونان کے ظہور سے قبل ہندوستان نے شمعِ علم روشن کی۔ قدیم ہندی و یونانی فلاسفروں کے بہت سے مسائل مشترک تھے۔ مثلاً

(۱) خدا و کائنات جدا چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

(۲)۔ کثرت کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

(۳) وجود و خیال دونوں ایک چیز ہیں۔

گوکہ یہ مسائل توحد کے قائل حکمائے یونان نے بیان کیے ہیں لیکن یہ اُپنشد و ہدایت میں پہلے سے موجود تھے۔ یونانی حکیم امپیڈوکلس کی یہ رائے کہ "جو چیز کبھی پہلے موجود نہیں تھی اب موجود نہیں ہو سکتی۔ موجودات کبھی فنا نہیں ہوتے" ہندوستان کے سانکھیا فلسفہ میں اس صورت سے موجود تھا کہ "مادّہ اصلِ اشیا ہے۔ مادّہ غیر فانی چیز ہے"۔

حکمائے یونان کے تذکروں میں لکھا ہُوا ہے کہ حکیم ٹیلیس۔ امپیڈوکلس۔ انکزاگوراس۔ دیمقراطس نے فلسفہ حاصل کرنے کے لیے ممالک مشرقیہ کا دَورہ کیا۔ لہذا یہ واقعہ بے کم وکاست ثابت ہے کہ یونانی لوگ فارس میں پہنچے اور وہاں ہندی علما سے فلسفہ سیکھا۔

حکیم فیثاغورث کے تمام مسائل ہندسی۔ فلسفی۔ ریاضی۔ مسئلہ تناسخ۔ وجودِ عناصر ہندوستان میں چھ سو برس قبل مسیح معلوم تھے۔ فیثاغورث کو مصر سے یہ خیالات حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ قدیم مصریوں کو خود یہ معلوم نہیں تھے۔ علاوہ بریں فیثاغورث کے کثرت سے خیالات ایسے ہیں جو فلسفۂ یوگ میں پہلے سے موجود ہیں۔ لہذا سوائے اسکے کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا کہ اس نے فارس میں ہندی علما سے فلسفہ سیکھا۔

اب اسکے بعد کے زمانہ کو دیکھیے۔ مجددانِ فلسفۂ فلاطون پر فلسفۂ سانکھیا کا صاف صاف اثر نمایاں ہے۔ اس گروہ کا سردار حکیم پولٹینس ہے۔ یہ شخص ۲۰۵ء سے ۲۶۹ء تک زندہ رہا اس نے اپنے مسائل کا استخراج سانکھیا سے کیا تھا۔ مثلاً اسکی یہ مثل کہ ادراک کی حالت آئینہ کی ہو جس پر جو عکس پڑتے ہیں اُنکی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ یا یہ کہ عذاب صرف جسم مادّی سے متعلق ہے، روح پر اسکا کوئی اثر نہیں ہے۔ یا یہ کہ آدمی کو چاہیے کہ ترک و تجرید اختیار کرے اور مراقبہ و استغراق میں حق کی تلاش کرے۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اسپر فلسفۂ یوگ کا بھی اثر پڑا تھا۔

پولٹینس کا شاگرد رشید پرافری بھی فلسفۂ سانکھیا کے مسائل کو مثلاً روح و مادہ میں فرق کر

مادّہ سے جدا ہو کر روح ہر جگہ دائر سائر رہتی ہے۔ دنیا کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔ سب قربانیاں بے کار ہیں۔ حیوانات کو ذبح نہ کرنا چاہیے۔

اسکے بعد ہندی فلسفہ کا اثر فلسفۂ مسیحیت قدیمہ پر بھی پایا جاتا ہے۔ مسیحیت قدیمہ کے یہ مسائل کہ روح و مادّہ میں تقابل ہے۔ قوتِ ارادی و عقل کا وجود جسمی حیثیت سے ہے۔ روح ایک روشنی ہے۔ یہ سب کے سب مسائل سانکھیا کے ہیں۔ بعض حکماے مسیحیت قدیمہ نے انسان کے تین درجے بتلائے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی سانکھیا کا تین گنوں والا مسئلہ ہے۔ ان مسیحیوں نے مذہب بدھ سے تعدد دیبا کا مسئلہ حاصل کیا۔

موجودہ صدی میں بھی ہندی خیالات کا اثر فلسفۂ یورپ پر پڑا ہے۔ تاریک خیال فلاسفر شاپن ہار و ہارٹ مین وغیرہ پر اپنشد کے لاطینی ترجمہ کا اتنا اثر ہوا کہ انکی تحریرات میں صاف نمایاں ہے۔ شاپن ہار کا تو یہاں تک خیال پہنچا کہ اُس نے لکھ دیا ہے کہ اپنشد میرے لیے راحتِ رُوح ہے۔ یہ فنا و بقا دونوں میں میرے لیے کفایت کرتا ہے۔

(خ) اب ہم فلسفۂ یونان کی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ فلسفہ ہندیہ کے مسائل کی مختصر حالت اس کتاب کے حصۂ دوم تاریخ مسائل فلسفہ کی ابتدا میں لکھیں گے۔

(م) اس کے بعد بابل و مصر کا زمانہ ہے۔ ان لوگوں نے تفصیلی علم کا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ حیرت انگیز ترقی کر گئے تھے۔ انکو عجیب طور سے مسائل نازک کے حل کرنے میں دستگاہ حاصل تھی۔ انھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا سہارا تھا جسکے بل پر یونانی خیال نے وہ بلند پروازی کی کہ کوئی قوم انکی گرد کو نہ پا سکی۔

فلسفۂ یونان

اس فلسفہ کے تین زمانے گزرے ہیں۔

اول وہ زمانہ جب موجوداتِ عالم کے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔

دوم وہ زمانہ جب وجودِ انسانی کی تاریخ دریافت کی گئی۔

سوم وہ زمانہ جب مسائل فلسفہ مرتب و منظم کیے گئے۔

تفصیل

اول۔حکماے یونان نے پہلے اپنی توجہ اس جانب منعطف کی کہ عالمِ موجودات کی تحقیقات کیجائے۔یعنی اُنھوں نے اُن اشیا کی ماہیت دریافت کرنا شروع کی جو انسان کو بذریعہ حواس خمسہ محسوس ہوتی ہیں۔ بدیں وجہ تحقیقاتِ فلسفہ کی ساری قوت علم جغرافیہ، طبیعات و ہیت کے غوامض کے انکشاف میں صرف ہوگئی۔ اس زمانہ میں حکما کا خاص میلان اس طرف تھا کہ کسی طرح یہ دریافت کرنا چاہیے کہ وہ کون سی مادی شئے تھی جو ظہور کائنات کا باعث ہوئی۔

اس کے بعد کے زمانہ میں اُس نفسِ تصور کی تحقیقات ہوئی جسکی وجہ دماغ میں خیالات کی ترکیب طبعی واقع ہوتی ہے۔ اس کے بعد کے زمانہ میں مسئلہ تغیر پر غور کیا گیا۔لیکن چونکہ مختلف حکما نے مختلف خاکے بنائے اس وجہ سے اسکی متعدد شاخیں ہوگئیں۔ مثلاً

(۱) وہ کون سی شے ہے جس سے تمام کائنات کی ابتدا ہوئی اور جو خود کبھی متغیر نہیں ہوتی۔

(۲) اس خاص شے یعنی مادۂ تخلیق کائنات نے موجودہ اشیاے مختلفہ کی شکل کیونکر اختیار کی۔

(۳) وہ کون حالت ہوگی جب تمام موجوداتِ عالم متغیر ہوکر پھر اُسی اصل شے میں گُم ہوجائیں گے۔

مسائل تغیر کے ساتھ ساتھ مسائل توحید، وجود و انجام عالم وغیرہ بھی زیر تحقیقات تھے۔ اس زمانہ کے نامور حکما، حکیم تلیس۔ انگزامیندر۔ انگزامنیس۔ ہراقلیطس و فیثا غورث ہیں۔

دوم۔اس زمانہ میں حکما کی توجہ عالمِ غیر محسوس کی طرف رہی۔ وجودِ انسان کی بابت تحقیق کیجاتی رہی۔ علم النفس۔ علم منطق۔ علم الاخلاق اس دور کی خاص یادگاریں ہیں۔حکیم ہرڈوٹس۔

پروٹوگراس - ارس ٹپس - ایمپی ٹینیز - اقلیدس و سقراط اس زمانہ کے خاص حکما میں ہیں۔ ان میں بلند پایہ سقراط تھا - سقراط ایک عالمگیر امر حق کا قائل تھا - وہ اپنے فاضلانہ دلائل کے زور سے ایسے اصول مدون کرنا چاہتا تھا جس پر کاربند ہونے سے انسان اس قابل ہو جائے کہ ایک مکمل اخلاقی زندگی بسر کر سکے۔

سوم - اس زمانہ میں فلسفۂ یونان کی باقاعدہ تدوین ہوئی - اس وقت میں حکیم دیمقراطیس حکیم افلاطون - حکیم ارسطو فلک علم کے روشن ستارے تھے۔

حکیم ارسطو نے تمام گذشتہ حکماے یونان کی رائیں جمع کیں، اُنکی تحقیق و تدقیق کی، انکو فضولیات سے پاک کیا اور پھر سب کو اکٹھا کرکے ایک دلچسپ مرقع تیار کرلیا - اس طرح اُسنے علوم کو صرف مادی جامہ ہی نہیں دیا بلکہ حیاتِ جاوید بھی عطا کی اور عالم کے سامنے ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا - ڈاکٹر وندلبنڈ کا قول ہے کہ جملہ شعبہ ہاے علمی کو ایسی شکل میں لانا کہ ہر ایک میں ایک جداگانہ فلسفی مسئلہ کی شان پیدا ہو جائے اور وہ شعبہ بجاے خود ایک مستقل علم ہو جائے یہ ایک ایسا مشکل کام تھا جس کا پورا کرلینا کچھ اُنھیں قدیم فلاسفروں کا حصہ تھا۔

ارسطو نے علم الٰہیات - علم نفس - علم اخلاق - علم سیاست مدن - علم تناسب اشیاء وغیرہ کو بھی فلسفہ کی شاخ قرار دیا تھا - اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ اُس نے خود اپنے ہی ہاتھوں (علوم خاص) کے زمانہ کا بھی افتتاح کر دیا - پس اصل فلسفۂ یونان حکیم ارسطو کے وقت سے ختم ہو گیا۔

فلسفۂ قدیمہ کا دوسرا دور
فلسفۂ یونان و روم

یہ وہ زمانہ ہے جب ملک یونان رومۃ الکبریٰ کا ماتحت ہو گیا تھا - رومی لوگ محض خیال آرائی کے شائق نہ تھے نہ انھیں اسکی ضرورت تھی - وہ صرف عمل کے فدائی تھے - خود اہل یونان کا یہ حال تھا کہ زوالِ حکومتِ قومی کی وجہ سے ہر چیز میں تغیر عظیم ہو گیا تھا - ایک طرف

اخلاق ومذہب دونوں کا خاتمہ تھا۔ دوسری طرف قدیم تمدن کی عمارت منہدم ہو رہی تھی۔ بدیں وجہ حکما کو اس طرف فوری توجہ کرنا پڑی کہ کوئی نہ کوئی جدید صورت ایسی پیدا کیجائے جو قومی مذہب کا نعم البدل ہوسکے اور جسکی پیروی سے انسان تاحدامکان بہترین اخلاقی زندگی بسر کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ ایسا نہ تھا جو محض خیالی گھوڑے دوڑانے سے حل ہو جاتا اس لیے فلسفہ نے عملی جامہ پہنا اور اخلاق کی آڑ پکڑ کر بڑھا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ قومی مذہب کا حریف اور مقابل بنگیا۔ یہی وجہ ہے کہ غور وخیال اس زمانہ کی خصوصیات میں نہیں ہیں بلکہ طبایع کا میلان سیاسیات وعمل کی جانب رہا۔

اس وقت کے سربرآوردہ حکما، اسٹوئیک واپیکوریس کے گروہ والے ہیں چونکہ روتہ الکبریٰ کی سلطنت کی بنیاد خود غرضی پر تھی اور انھوں نے محکوم قوموں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی تھی اس لیے یونانیوں کی حالت روزبروز ابتر ہوتی گئی۔ ایک طرف مفلسی ونا داری نے قافیہ تنگ کیا، مذہب کے فقدان نے دوسری طرف تسکین قلبی سے محروم کردیا تھا۔ اور سب پر بالاے الم یہ تھا کہ اخلاقی حالت خراب ہونے کی وجہ سے کاہلی وعیش پرستی کا بھوت سر پر سوار ہوگیا غرضکہ یہ بیچارے دھوبی کے کُتے ہوگئے گھر کے نہ گھاٹ کے۔ فلسفہ برابر سعی میں رہا لیکن کامل تشفی قلبی نہ بہم پہنچا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہم پرستی بت پرستی بھی رائج ہوگئی۔ اور ان سب کے خلط مبحث سے وہ گڑبڑ پیدا ہوئی جو احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ یہ حالت ظہور مسیح سے کچھ روز قبل شروع ہوئی اور مسیح کے بعد مدت تک قائم رہی۔

اس کے بعد اور زمانہ گزرگیا۔ اور قومیں آئیں اور یونانیوں میں مل جُل گئیں۔ کوئی چیز اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہی۔ اب فلسفہ نے بھی ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اور حکما کی عام راے اس مسئلہ پر متفق ہوگئی کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی سمجھ کے موافق اخلاقی زندگی بسر کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسائل تخلیقِ عالم اور مسائل سیاسیات سب پسِ پشت ڈالدیے گئے۔ اور مسائل وجودِ انسان کی ایک دفعہ پھر زور شور سے تحقیقات شروع ہوگئی۔

اب فلسفہ مصر کی طرف گیا اور شہر اسکندریہ میں مشرقی و مغربی خیالات کا سنگم ہو گیا۔ حکمائے اپیکورس۔ اسٹوئیک۔ شکیین۔ مجددان فلسفۂ فلاطون۔ حکمائے ہند۔ حکمائے یہود حکمائے مسیحیت قدیمہ۔ سب کے سب یہاں جمع ہو گئے۔ یہاں یہود چاہتے تھے کہ مذہب موسوی کو فلسفۂ یونان کے موافق ثابت کریں اور حکما چاہتے تھے کہ فلسفۂ یونان اصول مذاہب مشرقیہ کے مطابق ثابت کیا جائے۔ بدیں وجہ خیالات و مذاہب کا وہ گڑبڑ ہوا کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنے کا موقع نہ رہا۔ اس معجون مرکب کو نہ فلسفہ کہہ سکتے ہیں نہ مذہب کا نام دے سکتے تھے۔ البتہ فلسفہ و مذہب کے اس عجیب و غریب ولد کو تھیاسوفی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اسی کا نام فلسفۂ اسکندریہ بھی ہے۔

فلسفۂ قدیمہ کا تیسرا دور

فلسفۂ عیسائیہ

سلطنت رومۃ الکبریٰ کو وحشی لوگوں نے تباہ کر دیا۔ اسکے ساتھ ساتھ قدیم یونانی و رومی تہذیب کا چراغ گُل ہو گیا۔ جہالت کے اس دَور میں فلسفۂ یونان معدوم ہو رہا تھا کہ چند مسیحی راہب اُٹھ کھڑے ہوے اور انھوں نے (باوجود مخالفتِ کلیسا) حکما کی اس قدیم یادگار کو فنا کے چنگل سے چھڑا لیا۔ کلیسا کی حکومت فلسفہ کی دشمن تھی۔ اس نے حدود متعین کر دی تھیں کہ فلسفہ کو اُس سے آگے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس جبر کی تائید میں یہ دلیل قائم فرمائی جاتی تھی کہ چونکہ مذہب مسیحی مکمل اور ناقابل گرفت طریقہ سے امر حق کو ثابت کرتا ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ کسی دوسرے طریق سے احقاق حق کی اجازت دیجائے۔ مذہبی احکام کی وجہ سے راہب صرف اس قدر فلسفہ کا استعمال جائز رکھتے تھے جو مسیحی ایمان کے مطابق تھا بقیہ بیکار حالت میں پڑا تھا۔ صدیوں تک یہی حالت رہی اور فلسفہ مذہب کا غلام بنا رہا۔

فلسفۂ عیسائیہ کے دو دَور گزرے ہیں :-

۱۔ زمانۂ اشرافِ مذہبِ مسیح		پہلی صدی عیسوی تا ۱۲۳۰ء

۲ - زمانہ مذہب المدرسہ یا زمانۂ فضلاء سنہ ۹۰۰ء تا سنہ ۱۵۰۰ء

شارلیمن شہنشاہ فرانس نے تمام ملک میں مدرسے جاری کیے تھے جن میں فلسفہ کی تعلیم تو ہوتی تھی مگر مذہب کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ اس تعلیم سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ اُسے عقائد مذہب عیسوی کو ظاہری عقلی لفافہ میں بند کرکے خوبصورت بنانے میں استعمال کرتے تھے۔ اس مذہب المدرسہ کا بانی ایک شخص (اسکوٹس اریجنا تھا) گو کہ مذہبی قید و بند ہر طرح مانع تھی مگر آخر کو مذہب المدرسہ کے فضلا نے بھی مان ہی لیا کہ دنیا میں صرف ایک امر حق ہونا ممکن ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں سوائے دلائل وجود باری تعالیٰ کے اور مسائل بھی داخل ہوگئے تھے۔ اور یہ تو مسلمہ امر ہے کہ تاریخ کا پردہ ڈالکر یہ لوگ فلسفۂ فلاطون وارسطو کو بھی لے آئے تھے۔ چنانچہ فلسفۂ فلاطون تین سو برس تک ان میں رائج رہا بعدہٗ ارسطو کا رنگ چڑھا جو آخر تک قائم رہا۔

اب دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ فلسفۂ عیسائیہ کا یہ دوسرا دَور مذہب عیسائی اور فلسفۂ یونان کا نقطۂ اتصال تھا، جس میں عقل و ایمان۔ فطرت و قدر (جن کا یکجا ہونا پہلے محال خیال کیا جاتا تھا) نہایت خوش اسلوبی سے یکجا کر دیے گئے تھے۔

فلسفۂ قدیمہ کا چوتھا دَور

فلسفۂ اسلامیۂ عربیہ

مسلمانوں میں فلسفہ مذہب کی راہ سے آیا۔ خلفائے عباسیہ کے وقت میں بغداد میں ہر مذہب و خیال کے لوگ جمع ہوگئے۔ جس میں فلسفہ کا چرچا دیکھ کر خلفا کو شوق پیدا ہوا۔ عام حکم دیدیا گیا کہ جو کوئی علمی کتاب ترجمہ کرکے لائے گا اُسکو اُسی کے برابر تول کر سونا ملے گا۔ اب ترجمہ زور شور سے شروع ہوا۔ پہلے وہ کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں جو عیسائی راہبوں نے یونانی سے سُریانی زبان میں ترجمہ کر رکھی تھیں۔ پھر قسطنطنیہ سے کتابیں طلب ہوئیں۔ اولاً شہنشاہ قسطنطنیہ کی رائے نہیں تھی۔ مگر اہل دربار نے سمجھایا کہ مسلمانوں کی مذہبی سختی کم کرنے کی یہ

سترین تدبیر ہے لہذا کتابیں بھجدینا چاہئیں - پس شہنشاہ نے فلسفہ کا کتب خانہ بغداد بھیجدیا -
اسکے بعد خلیفہ ماموں الرشید نے بغداد میں بیت الحکمۃ ورسدخانہ قائم کیا اور فلسفہ وحکمت
کی کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں - یہاں کے خاص مترجمیں میں یہ لوگ تھے - الحجاج الحبیب
جس نے بطلیموس کی کتاب المجسطی دربارۂ علم ہیئت کا ترجمہ کیا اور اصول اقلیدس واصول
ہندسہ کا بھی ترجمہ کیا - یوحنا ابن بطریق جس نے ارسطو کی کتاب سیاست کا ترجمہ کیا -
عبدالمسیح ناعمہ حمصی جس نے ارسطو کی کتاب المذہب کا ترجمہ کیا - قسطا ابن لقا بعلبکی جس نے
بہت سی کتابیں ترجمہ کرنے کے علاوہ ریاضیات ہیئت - وطب پر خود کتابیں تصنیف کیں -
ابو زید حنین بن اسحق اس نے توریت کا و نیز فلاطوں کی کتاب جمہوریہ کا ترجمہ کیا اور حکیم
افورم - حکیم انقوکارطس - حکیم جالینوس کی تصانیف کا ترجمہ بھی کیا - حبیش ابن حسن حنین
بن اسحق کا عمزاد بھائی تھا اور ترجمہ میں اُسکا شریک تھا - ابو بشر متی بن یونس جس نے
ارسطو کی کتاب عروض کا ترجمہ کیا - اسکے علاوہ ایک اور بڑا شخص تھا جس نے متعدد
کتابیں ترجمہ کیں - اس کا نام ابوزکریا یحییٰ بن عادی تھا -

یہ لوگ عیسائی تھے مگر چونکہ انکے ترجمے، تصانیف - تالیفات سب زبان عربی میں
تھے اور یہی ترجمے وغیرہ مسلمانوں میں کثرت سے رائج ہوے اس لیے مصنفین اسلام
نے انکو حکماے اسلام میں داخل کیا ہے - غرضکہ ان تراجم سے مسلمانوں میں بھی تصنیف و
تالیف شروع ہوگئی - لیکن یہ بات صرف اُسی گروہ تک محدود رہی جو دربار خلافت سے
متعلق تھا - عوام وعلما کو فلسفہ سے کوئی مس نہ تھا - فلسفہ کا عام رواج حضرت امام غزالی
کے وقت سے ہوا - مسلمانوں میں ابتدا ہی سے دو گروہ پیدا ہوگئے ایک وہ گروہ جو ارسطو کا
مقلد تھا دوسرا وہ جو یا تو خود کوئی فلسفہ رکھتے تھے یا کسی دوسرے حکیم کے پیرو تھے -
ابو نصر فارابی و حکیم علی ابن سینا مقلدین ارسطو میں تھے - جب سلطنت سامانیہ کا کتبخانہ
تباہ ہوگیا تو حکیم سینا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں - جو بوجہ دوسرے سرمایہ کے

تلف ہونے کے بعد بہت ہی مقبول ہوئیں۔ اسی فلسفہ کی تعریف محقق طوسی نے کی ہے اور اسی کا رَد امام رازی و امام غزالی نے لکھا ہے۔ بغداد کا ذخیرۂ فلسفہ ہلاکو کے ہاتھوں برباد ہوا۔ طوسی کی یہی مراد تھی۔ پس انھوں نے اور ان کے شاگردوں نے اپنا مطبوع خاطر فلسفۂ ارسطو چہار جانب پھیلا دیا۔ اندلس میں فلسفہ جو آخر چھٹی صدی میں پہونچا، وہ بھی فلسفۂ ارسطو تھا۔ اس کے سوا حکیم علامہ ابن طفیل و ابن رشد تھے۔ یورپ نے فلسفہ اندلس سے سیکھا سنہ اوہاں بھی یہی فلسفۂ ارسطو بار دیگر رائج ہوا۔

متکلمین

مسلمانوں کا وہ گروہ جو فلسفۂ ارسطو کا مخالف تھا چوتھی صدی ہجری سے زور پکڑنے لگا۔ فلاطون و ارسطو کے رد میں سب سے پہلی کتاب یحییٰ بطریق اسکندریہ نے لکھی جو چھ مقالوں میں ہے۔ اسکے بعد نظام مغربی نے ارسطو کے رد میں کتاب لکھی۔ پھر ابو علی جبائی نے ارسطو کی کتاب کون وفساد کا رد لکھا۔ حسن بن موسیٰ نوبختی نے کتاب الآراء والدیانات میں ارسطو کی منطق کا رد لکھا ہے۔ ابو بکر باقلانی نے رد فلسفہ میں کتاب الدقائق لکھی۔ علامہ شہرستانی نے ارسطو کا رد اپنی کتاب الملل والنحل میں کیا ہے۔ چھٹی صدی میں یہ مذاق عام ہوگیا اور بکثرت لوگوں نے رد فلسفہ پر قلم اٹھایا۔ جن میں علامہ امام فخرالدین رازی۔ شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی۔ علامہ ابن تیمیہ و ابوالبرکات بغدادی خاص لوگ ہیں۔ ابوالبرکات منہ اللہ بغدادی نے ارسطو کی کتاب العلم کا رد کتاب المعتبر میں لکھا ہے۔ شیخ الاشراق نے حکمۃ الاشراق وغیرہ کتب لکھیں۔ اور آخر میں علامہ ابن تیمیہ نے فلسفہ کے خوب پرزے اڑائے۔

غرض کہ متکلمین نے اپنا وہ کام پورا کیا جسکے لیے وہ آئے تھے۔ یعنی مذہب اسلام کی طرف سے ارسطو کی دہریت والحاد کا خوب مقابلہ کیا اور مذہب کو اسکی دستبرد سے بچالیا۔ ہمنے صرف متکلمین کا تذکرہ اسلیے کیا ہے کہ یہی لوگ اصلی معنوں میں اسلامی فلاسفر

تھے۔ ورنہ مسلمانوں میں ہزاروں فلاسفر گزرے ہیں جنکے ناموں اور جنکی تصانیف کے ناموں سے کتاب کشف الظنون وغیرہ بھری پڑی ہیں۔ جن صحاب کو زیادہ تفصیل کی خواہش ہو وہ علامہ مرحوم شبلی نعمانی کی بیش تصنیفات سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

فلسفۂ جدیدہ

یہ زمانہ علوم کے زمانہ نشاۃ جدیدہ سے شروع ہوکر ہمارے وقتوں تک پہونچتا ہے فلسفہ جدید کا وجود دو تاریخی تحریکوں کے سبب سے ہوا۔ (۱) علوم کا نشاۃ جدیدہ ۱۴۵۳ء (۲) اصلاح انجیلی۔

(الف) علوم کا زمانہ نشاۃ جدید

جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تب یونانی اٹلی میں پناہ گزیں ہوے اور یہاں سے فلسفۂ یونان پھر یورپ میں پھیلنے لگا۔ صدیوں سے فلسفہ یونان فلسفۂ قرون وسطیٰ فلسفۂ یہود فلسفۂ اسلامیہ کے چشمے علیحدہ علیحدہ بہہ رہے تھے۔ آخرکار فرڈرک ثانی کے دربار میں انکا سنگم ہوا اور شہر آرنو سے ایک دریاے تھا رجسکا نام فلسفہ جدیدہ ہے جاری ہوا جسنے سارے یورپ کو تہ آب کردیا۔ روح انسانی اوہام مذہبی کی قید سے آزاد ہوئی۔ اور ایک جدید تہذیب کا آغاز ہوگیا۔ انسان ایک مرتبہ پھر سمجھنے لگا کہ ہاں میں بھی کچھ ہوں اور میرے پاس بھی ایسی طاقت موجود ہے جس سے میں کچھ مستفید ہوسکتا ہوں۔ مذہب المدارس کی خشک ہڈیاں ایک طرف ڈالدی گئیں مخالفت مذہبی جسکی وجہ سے کوئی شخص بطور خود کوئی خیال نہیں قائم کرسکتا تھا، فضول و لایعنی شئی سمجھی جانے لگی۔ لوگونکی آنکھیں کھل چکی تھیں، پادریوں کی حکومت انکو طوق لعنت معلوم ہونے لگی۔ اور سوائے فلسفہ و تہذیب یونان کے کوئی دوسری چیز قلب کو تسکین نہیں دیتی تھی۔ قرون ماضیہ کے تمام فلسفے زندہ ہوگئے۔ غرضکہ الحاد و بیدینی کی وہ تند آندھی چلی کہ جس کا مقابلہ پادریوں کے امکان سے باہر تھا۔ اس زمانہ کے فضلا ماہران علوم ادبیہ کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اعلان کردیا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو رائے چاہے قائم کرے۔ لوگوں نے اسکو زور شور سے لبیک کہا۔ کیونکہ صدیوں کی عقلی غلامی کے بعد

یہ نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔ اس وقت میں فلسفہ کی اجتماعی حالت جاتی رہی تھی اور فعل انفرادی کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔

(ب) زمانہ اصلاح انجیلی فی قرون سادس عشر

اصلاحِ انجیل کے دو بنیادی اصول تھے۔ (۱) افراد کا اپنی عقل کو کام میں لانا۔ (۲) مذہبی حکومت سے بغاوت۔ اس اصلاح کے یہ نتائج تھے کہ فلسفہ مذہب کے پنجہ سے چھوٹا۔ روح پادریوں کے پنجہ سے آزاد ہوئی۔ اور علوم دنیاوی کو حیات تازہ ملی۔

علوم کے نشاۃ جدید و اصلاح انجیل سے ایک تیسری تحریک بھی پیدا ہوئی جس کو فلسفۂ قرون متوسطہ و فلسفۂ جدید کے درمیان کا دورِ انقلاب کہنا چاہیے۔ اس کا نام تحریک نشاۃ علوم طبیعیہ ہے۔

فلسفہ جدید کا ارتقا بھی عین اسی طریقے سے ہوا جیسے فلسفۂ قدیمہ کا ہوا تھا۔ فلسفۂ یونان اپنی ابتدائی زمانہ میں دہری تھا۔ اسکے بعد دورانِ تحقیقاتِ وجودِ انسانی میں سفسطہ شروع ہوا جو بڑھتے بڑھتے الحاد ہو گیا۔ اس سے سقراط و افلاطون کی اصلاح کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ بعینہٖ اسی طرح فلسفہ جدید و نشاۃ علوم کے بعد طبیعیات کی طرف مائل ہوا۔ پھر جب ہالینڈ جرمنی فرانس پہنچا تو وجود انسانی کی تحقیق ہونے لگی۔ اور مسئلہ علم کی صورت پیدا ہوئی۔ یہاں سے جب انگلستان پہنچا تو ہیوم کے فلسفہ نے مستقل الحاد کی شکل اختیار کی۔ اس سے کینٹ کی اصلاح کے لیے راستہ صاف ہوا اور جرمنی میں روحانیات کی شکل نمودار ہو گئی۔ اصول ادعا و اصول کفایۃ العقل میں علم کی اصل کی بابت مباحثہ تھا کنٹ نے یوں صلح کرائی کہ نفس علم کی تحقیق شروع کر دی جس سے امکان علم کا مسئلہ چھڑ گیا اور عقل انسانی کی بابت نئی تحقیقات شروع ہو گئی۔ اس کا نام اُس نے مسئلہ تنقید رکھا۔ اس میں اُس نے علم کی اصل۔ اسکی حد۔ اس کی حدود فاصل دریافت کرنے کی کوشش کی۔ غرضکہ کنٹ نے فلسفہ کو جس طرف پھیر دیا آج تک اُسکا دہارا اُسی طرف بہ رہا ہے۔ کنٹ کا مسئلۂ عقل فچ۔ ہیگل۔ اسکیلنگ

کے جرمن روحانیات کی اصل ہے

علوم طبعی کی حال کی ترقیات نے کنٹ کی وراثت میں بے انتہا دولت کا اضافہ کر دیا ہے۔ موجودہ علمی تحقیقات کا آفتابِ نصف النہار مسئلہ ارتقا ہے۔ جس کی حرارت سے وہ طوفانی رَو اُٹھی ہے جس کے آگے مذہب عیسوی پرکاہ کی طرح بہا چلا جا رہا ہے اور اس کے نگہبان پادری آنکھیں کھولے ہوئے دیکھ رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ اس کا ذکر ہم آگے چل کر مفصل کریں گے۔

(باقی دارد) قاضی خادم حسین امیٹھوی وکیل لکھنؤ

بہت سے مصنفین ایسے ہیں جو اپنی تصنیفات میں نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ بہت سے مقرّر ایسے ہیں جن کا ہر قول آمنّا وصدقنا کہے جانے کا حقیقی طور پر مستحق ہوتا ہے۔ مگر بیشتر اوقات یہی مصنف ومقرر اپنے بیانات کی تکذیب عملی طور پر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور جب کوئی انکو ٹوکتا ہے تو اپنی کمزوریوں کو مصلحتِ وقت اور ضرورت کے دامن میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ برائیوں کا احساس کرنے کے بعد بھی اُن کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ (۱)

کسی حاجتمند کی مدد کرنا، سوسائٹی کی مدد کرنا ہے اور سوسائٹی کی امداد ملک کی خدمت ہے۔ اس طرح ایک انسان کی حاجت روائی کرنے سے ہم وسیع حصۂ پر رہنے والی مخلوق کے کام آتے ہیں۔ (۲)

صبح کا ستارا

اے کہ دیتی ہے نشانِ صبح تیری روشنی — رات کی ہیں آخری گھڑیاں تری منت پذیر
کہہ رہی ہے یہ ضیائے خواب آلودہ تری — صبح کے گہوارے میں ہوجائیگا راحت پذیر
نور سے معمور ہے تیرا دلِ رفعت پذیر
آسماں کے سر پہ ہے اک آخری احساں ترا

محفلِ انجم کی ہے تو اک مقدس یادگار — مرنے والی رات کی اک آخری ہچکی ہے تو
سطحِ گردوں پر ہے پھیلا تیرا نورانی غبار — آنے والی رات کی تو کر رہا ہے جستجو
منظرِ نیرنگیٔ عالم ہے تیرے روبرو
انقلاب انگیز ہے رنگِ ضیا افشاں ترا

روشنی سے کر دیا تو نے اندھیرے کو جدا — درمیانِ نور و ظلمت حدِ فاصل بن گیا
رات کی مجلس کو تو نے آکے برہم کر دیا — اور سحر کی اک مسرت خیز محفل بن گیا
صبح کے پہلو میں گویا نور کا دل بن گیا
ایک جذبِ خاص رکھتا ہے رخِ تاباں ترا

محفلِ نورِ سحر کا ایک چھلکتا جام ہے — یا حیاتِ شب کا اک لبریز پیمانہ ہے تو
گو "ستارا صبح کا" دنیا میں تیرا نام ہے — ہاں مگر شمعِ سحر کا ایک پروانہ ہے تو
رات کی بگڑی ہوئی محفل کا افسانہ ہے تو
اور "نویدِ صبح" ہے اک خوشنما عنواں ترا

ڈوب جاتا ہے دلِ مایوس بھی میرا وہیں — بزمِ دوشینہ کے ٹوٹے پھوٹے ساغر دیکھ کر
اور ہو جاتی ہے محزوں خاطرِ اندوہگیں — تجھ کو اپنے اک نئے ارماں کا محشر دیکھ کر
بڑھتی ہے افسردگی یہ حالِ ابتر دیکھ کر
منتشر ہو جائیگا کچھ دیر میں ساماں ترا

ابو نواس

ہاجرہ کی کامیابی

سلسلۂ ماہ دسمبر ۱۹۱۵ء

(۷)

اکبر کے چلے جانے کے بعد ہاجرہ کی وہ وحشت اور پریشانی رفع ہو گئی، جس نے اکبر کے دوروزہ قیام سیتاپور کو اُسکے لیے وبالِ جان کر دیا تھا۔ لیکن اس کی بدمزاجی اور حماقت کی اس جدید نمایش نے۔ جو ہاجرہ کے لیے اگرچہ نیا تجربہ نہ تھا، تاہم گذشتہ تجربوں کے مقابلہ میں زیادہ شدید اور پُراثر ضرور تھا، جس نے بادِ صرصر کے جھونکے کی طرح راکھ میں دبے ہوئے انگاروں کو بھڑکا دیا؛ اس نے ہاجرہ کی آنکھیں اچھی طرح کھول دیں۔ اور اب اُسنے اپنی گذشتہ چھ ماہ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا، تو اُسے معلوم ہوا کہ اس داستانِ پریشاں کا کوئی باب ایسا نہیں، جو آیندہ کے لیے سبق آموز نہ ہو۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ساس اور سسر کو اُس سے قطعی نفرت ہو گئی تھی، اور ایسا ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا؛ بھلا ایک قدامت پرست سسرال میں، جدید فیشن بہو کی بیباکی اور بیحجابی کیونکر گوارا کیجاتی۔ بدقسمتی سے اکبر میں بھی اس کی اہلیت نہ تھی کہ وہ ایک سمجھدار اور تعلیم یافتہ بیوی کا شوہر بن سکتا۔ ان کے بعد بظاہر اب ہاجرہ کے لیے کوئی دوسرا سہارا نہ تھا، جسپر وہ آیندہ امیدوں اور ولولوں کا قصر تیار کرتی۔ کاہلی اور گمنامی کی زندگی، گھر کی چاردیواری میں مقید رہکر بسر کرنا، یا عقبیٰ کے لیے دنیا کو بالکل تج دینا، اُسے موت کے مقابلہ میں بھی ناپسند تھا۔ غرض انہیں تفکرات اور پریشانیوں میں ہاجرہ نے کئی دن اور راتیں سخت بیچینی اور تردد میں بسر کیں۔ لیکن اُس کا پریشان دماغ، بغیر کسی مدد اور سہارے کے، کوئی ایسی قابلِ عمل تدبیر نہ سوچ سکا جس سے وہ اپنے ظاہرا تاریک مستقبل کو روشن بنا سکتی۔

ایک روز ہاجرہ اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی اسی اُدھیڑبُن میں پڑی تھی کہ جُمیا نے پکارا

"ہاجرہ بٹیا کہاں ہو، دیکھیے ڈاک آئی ہے اس میں کوئی خط آپ کا تو نہیں ہے؟" ہاجرہ نے کمرے ہی میں اُسے بلا لیا، اور خطوں کو دیکھنا شروع کیا تو اُس میں ایک لفافہ "دختر کلاں جناب مولوی فریدالحق صاحب قبلہ وکعبہ" کے نام بھی تھا۔ یہ اکبر کا خط تھا، جسے ہاجرہ نے فوراً چاک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ مضمون یہ تھا:-

"........ جناب والدصاحب قبلہ وکعبہ مدظلہ العالی کی طبیعت اب خدا کے فضل و کرم سے ماشاءاللہ بہ نسبت پیشتر کے اچھی ہے .... یہاں سب کی رائے ہے کہ تمکو بھی یہاں آکر کچھ دنوں رہنا چاہیے۔ برادر عزیز ازجان عظمت علی سلمہ اللہ تعالیٰ دس بارہ روز میں سیتاپور بھیجے جائیں گے، تم انکے ساتھ ضرور چلی آنا۔ جنابہ والدہ صاحبہ مکرمہ و معظمہ کی بھی بعد دعا کے یہی رائے ہے۔ کیونکہ پرسوں یہاں ایک خط آیا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ جناب خان بہادر شمس العلماء حضرت مولانا مولوی شاہ ابوالبرکات صاحب قبلہ دام فیوضہٗ سجادہ نشین قصبۂ بہادرپور، آیندہ ماہ کی یکم تاریخ کو جناب لاٹ صاحب بہادر سے ملاقات کرنے لکھنؤ تشریف لائینگے اور غریب خانہ ہی پر فروکش ہوں گے، لہذا اس سے پہلے تمارا یہاں پہنچ جانا ضروری ہے۔ تاکہ ہم سب کے ساتھ تم بھی جناب مولانا صاحب کی مرید ہو کر سعادت دارین حاصل کرو......
... اگر اب بھی تم نے یہاں آنے میں کچھ پس و پیش کیا، تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا، پھر میں قطعی جناب پھوپھا صاحب قبلہ وکعبہ کو لکھونگا..........."

یہ فرمانِ نادری کچھ شک نہیں کہ اپنی حاکمانہ فصاحت و بلاغت کے اثر سے ایک سادہ اور بھولی بھالی لڑکی کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن ہاجرہ نے اُسے پڑھ کر صرف ایک خفیف سی حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ فرش پر ڈال دیا، لیکن پھر کچھ سوچ کر پھاڑ ڈالنے کے قصد سے اُٹھایا ہی تھا کہ اتفاق سے سیدہ آ گئی۔

سیدہ۔ یہ کس کا خط ہے، لکھنؤ سے آیا ہو تو کچھ اپنے سسر کی خیریت سناؤ۔

ہاجرہ۔ اچھے ہیں۔ (سیدہ کی طرف خط بڑھا کر) لیجیے آپ خود ہی پڑھ لیجیے۔ کوئی نئی

بات نہیں ہے۔

سیدہ۔ کیا تمہاری ساس کا خط ہے؟

ہاجرہ۔ نہیں تو۔ آپ پڑھیں گی تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

سیدہ۔ جو تمہارے میاں کا خط ہو تو میں کیوں پڑھوں، تم زبانی کچھ حال بتادو۔

ہاجرہ۔ نہیں تو خدانخواستہ اس میں کوئی ایسی راز یا پردے کی بات نہیں ہے جسکا لطف صرف میں ہی اُٹھا سکتی ہوں۔ آپ شوق سے پڑھیے۔

سیدہ نے پورا خط پڑھا۔ اور مسکرا کر ہاجرہ کو دے دیا۔ جس کے ٹکڑے کرکے ہاجرہ نے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

سیدہ۔ پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کب تک لکھنو جاؤ گی؟

ہاجرہ۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔ ماموں جان کی تیمارداری میں شریک ہی نہیں ہو سکتی ورنہ بے حیا بیشرم بنوں گی۔ پھر میرا وہاں اور کام ہی کیا ہے۔ یہ بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیکار بیٹھی رہوں یا سب کی جھوٹی خوشامد اور چاپلوسی کیا کروں۔ ممانی جان کی خوشی کروں تو ہر وقت دوسروں کی فضول غیبت اور بُرائیاں کیا کروں۔ کوئی کتاب دیکھوں تو ہر دم طعن وتشنیع سنا کروں۔ یہ باتیں مجھے گوارہ نہیں۔ پھر بھلا میری وہاں کون ضرورت ہے۔

سیدہ۔ بہرحال تمہارے میاں کی خوشی تو یہی ہے، نہ جاؤ گی تو وہ بگڑیں گے انکی تو ہر وقت ناک پر غصہ رہتا ہے

ہاجرہ۔ خوشی ہو یا نہ ہوا میں کہاں تک ہر ایک بچے میں بیٹر دبا کروں گی۔ میری خوشی کا کب کسی کو خیال ہوتا ہے.....

سیدہ چونکہ اکبر کی حماقتوں اور بدمزاجیوں سے واقف تھی اس لیے مصلحتاً اُس نے اس بحث کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا، اور ہاجرہ کی بات کاٹ کر بولی

سیدہ۔ یہ شاہ صاحب کون ہیں، کوئی بڑے پہنچے ہوے درویش ہیں؟ ان کے تو بڑے القاب ہیں۔

اجرہ۔ یہ بہادر پور کے سجادہ نشیں ہیں۔ "خان بہادر" اور "شمس العلماء" کے سرکاری خطاب بھی پائے۔ اِن کا تذکرہ اکثر اخباروں میں ہوا کرتا ہے۔

سیدہ۔ تو لاٹ صاحب کے یہاں انکا کیا کام ہے؟

اجرہ (ہنس کر) شاید لاٹ صاحب کو مرید کیا ہو یا درگاہ کے انتظام میں کوئی مشورہ لینا ہو۔

سیدہ۔ انگریزوں کے یہاں تو پیری مریدی ہوتی ہی نہیں۔

اجرہ۔ یہ بالکل غلط ہے، پہلے شاید ایسا نہ ہوتا ہو۔ لیکن اب تو برابر اخباروں میں چھپتا ہے کہ کسی شاہ صاحب نے دو انگریزوں کو مرید کیا اور کسی نے چار کو۔ اِنھیں شاہ صاحب کے متعلق یہ مشہور ہے کہ بہت سے کلکٹر اور کمشنر خفیہ طور سے انکے مرید ہوے ہیں۔

سیدہ۔ مگر لاٹ صاحب نہیں مرید ہوں گے، مجھے یقین نہیں آتا۔

اجرہ۔ اچھا تو پھر لاٹ صاحب کو کوئی بڑا اخدار سیدہ پیر سمجھتے ہونگے، اور شاید اِن میں بھی خدا کا جلوہ دکھائی دیتا ہو، بلکہ یہی سچ ہوگا، کیونکہ صوفیوں کے عقیدہ میں تو ہر چیز خدا ہی ہے، جیسے نیچریوں کے نزدیک ہر چیز مادّہ سے بنی ہے، اور اسے معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ لے گا بشرطیکہ ......

سیدہ۔ اچھا، ہوگا۔ کہاں کی بات کہاں جا پہنچی۔ ہاں خوب یاد آیا، کل تمھارے ابا جان کہتے تھے کہ نسیم کے خالو کا خط آیا ہے۔ وہ رجب کے مہینہ میں اپنی لڑکی کا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔

اجرہ (کچھ سوچ کر) تو پھر ابا جان نے اُنھیں کیا جواب دیا؟

سیدہ۔ اُنھوں نے یہی جواب دیا کہ مجھے کچھ عذر نہیں۔ نسیم بھی اب ماشاءاللہ بی لے کا امتحان دے چکے ہیں، اُنھیں بھی فراغت ہے۔

ہاجرہ۔ خود نعیم بھائی کی مرضی بھی معلوم ہے؟ اب تک وہ یہاں آئے بھی نہیں۔ اب تو امتحان کو ختم ہوئے بھی کئی دن ہو چکے۔

سیدہ۔ خیر جب وہ خود یہاں آئیں گے تو آپ ہی معلوم ہو جائیگا۔ تم سے کبھی اسکا تذکرہ نہیں آیا؟۔

ہاجرہ۔ ہاں ایک مرتبہ میں نے ہی چھیڑا تھا، تو کچھ خوش نہیں معلوم ہوتے تھے۔اب مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی کیا مرضی ہے۔

سیدہ۔ ناخوشی کی تو کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ میں نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے صورت شکل کی تو بہت ہی اچھی ہے۔ پھر اور کیا چاہیے؟ سُنا پڑھی لکھی بھی ہے۔

ہاجرہ۔ تو پھر شاید انھیں کچھ عذر نہ ہو۔

سیدہ تھوڑی دیر تک بیٹھی ادھراُدھر کی باتیں کرتی رہی، اسکے بعد اُٹھ کر بڑے دالان چلی گئی دوسرے روز جب مولوی صاحب کچہری سے واپس آئے تو سیدے مکان ہی میں چلے آئے، سیدہ سے پوچھا کہ "ہاجرہ کہاں ہے؟"

سیدہ۔ ابھی اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھیں، شاید سائرہ کے یہاں گئی ہوں، کیوں، کچھ ضروری کام ہے؟

مولوی صاحب۔ ہاں ضروری کام یہی ہے کہ عقیہ ممتاز میاں کا لکھنؤ سے خط آیا؟ اُنکی صحت قابل اطمینان نہیں ہے، وہ چاہتے ہیں کہ کچھ دنوں ہاجرہ وہیں لکھنؤ میں رہے۔اگر کل پرسوں تک شاید بھوپال چلے جائیں، وہاں پچاس روپے کی اُنھیں جگہ مل گئی ہے عظمت آٹھ دس روز میں آئیں گے اُنھیں کے ساتھ ہاجرہ چلی جائے۔

سیدہ۔ مگر ہاجرہ کا دل نہیں چاہتا کہ وہ لکھنؤ جائیں، کل اُنکے میاں کا خط بھی اُنکے نام آیا تھا اُنھوں نے بھی یہی لکھا تھا۔

مولوی صاحب۔ آخر کیوں نہ جائے گی؟

سیدہ ۔ کیوں کیا، ایک مرتبہ میں تم سے بیان کر چکی ہوں کہ اُنکے ماموں مانی کا برتاؤ اُن کے ساتھ اچھا نہیں ۔ بس یہی وجہ ہے، جو وہ وہاں جانے سے گھبراتی ہیں ۔

مولوی صاحب ۔ بہرحال کچھ ہو، زندگی تو ہمیشہ اُنھیں لوگوں میں رہ کر بسر کرنا ہے ۔ بہرصورت اُن کی خوشی مقدم ہے ۔

سیدہ ۔ تو اس کوفت کی زندگی سے جب تک بچ سکیں غنیمت ہے ۔ پھر ابھی چار مہینے بھی تو نہیں ہوے جب پندرہ روز رہ آئی ہیں ۔

مولوی صاحب ۔ جب اور بات تھی، اب تو یہ بہت بے موقع ہوگا کہ خسر اپنی بیماری میں دیکھنے کو بلائیں، تو ہو نہ جائے ۔ میرے نزدیک ضرور جانا چاہیے، اور میں نے اُنھیں یہی لکھ بھی دیا ہے ۔

سیدہ ۔ اچھا شام کو کھانا کھانے آنا تو اُن سے کہہ دینا ۔

اُس وقت مولوی صاحب اُٹھ کر باہر چلے گئے ۔ شام کو جب اندر آئے تو ہاجرہ موجود تھی ۔ مولوی صاحب نے ہاجرہ سے وہی کہا جو سیدہ سے کہا تھا، اور چونکہ ہاجرہ باپ کا بہت ادب اور لحاظ کرتی تھی اس لیے وہ انکی باتوں کا بے تکلفی اور بیباکی سے جواب نہ دیسکتی تھی ۔ مولوی صاحب نے اُسکی اس حیاپروری سے فائدہ اُٹھا کر یک طرفہ فیصلہ کر دیا کہ "تمھیں ضرور لکھنؤ جانا چاہیے" اس حکم ناطق کو سُن کر ہاجرہ سخت پریشان ہوئی ۔ مولوی صاحب اُٹھ کر باہر چلے گئے ۔ ہاجرہ کو اب بھوک کہاں تھی ۔ ہرچند سیدہ نے اصرار کیا کہ کچھ کھالو، لیکن وہ یہ عذر کرکے کہ سر میں بہت شدت سے درد ہے، اپنے کمرے میں چلی آئی، اور دوشالہ لپیٹ کر سو رہی ۔

(۸)

ہاجرہ کا خواب

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُسکی زلف مشکیں کی　　ہماری دید کو خوابِ زلیخا عار بستر ہے

"ایک سنسان وسیع جنگل ہے۔ ہاجرہ نیم مدہوشی کی حالت میں اکبر کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ دفعتہً آسمان پر تاریک گھٹا چھا جاتی ہے۔ اندھیرا زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر اکبر اپنی رفتار تیز کرتا ہے، ہاجرہ اُسکے ساتھ چلنے سے ماجزرہ جاتی ہے۔ آخر بڑھتی ہوئی تاریکی اکبر کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے، اور وہ ہاجرہ کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ ہاجرہ پریشان اور متوحش ہر طرف دیکھتی ہے، اُس کی متجسس نگاہیں بیقراری کے ساتھ چاروں طرف کسی انسانی صورت کی تلاش میں گشت لگاتی ہیں لیکن وہاں کسی جاندار کا سایہ تک نہیں۔ درخت بھی اسوقت تاریکی کا جامہ پہنے ہوئے اپنی مہوت شکلوں سے اسے ڈرا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سیاہ سیاہ بادلوں نے متحد ہو کر ستاروں کی دھیمی روشنی کو پوری طرح مغلوب کر لیا۔ ہاجرہ خوف و دہشت سے بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ بالآخر اس انتہائی مایوسی اور ناامیدی میں اُسکی قسمت کا ستارا چمکا، بادلوں کی کڑک اور گرج کے ساتھ ہی بجلی کی ایک ہی جھلک میں اُس نے سامنے میدان میں نعیم کو کھڑے ہوئے دیکھ لیا۔ "نعیم بھائی، نعیم بھائی، خدا کے لیے مجھے بچائیے"۔ یہ دلخراش صدا سنکر نعیم بجلی کی طرح اُسکے پاس پہنچ گیا۔ ہاجرہ نے بے اختیار ہو کر اُسکے گلے میں باہیں ڈالدیں، اور نعیم اُسکی تسکین کے لیے پیار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں آسمان صاف ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی چاندنی رات ہے، ایک خوشنما کوٹھی کے چمن میں ہاجرہ اپنے کو نعیم کے پہلو میں لیٹا ہوا پاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ بھاگنا چاہتی ہے، نعیم فوراً اُسکے دونوں ہاتھ تھام لیتا ہے۔

نعیم (بوسہ لیکر) پیاری ہاجرہ کیا تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟

ہاجرہ (ہاتھ چھڑا کر) نہیں، مجھے آپ کے ساتھ ہمیشہ سے محبت ہے۔ لیکن ابھی آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ ....

جمیا (شانہ ہلاکر) ہاجرہ بٹیا اٹھو بہت دیر ہو گئی، دیکھو نعیم بھیا آئے ہیں بلا رہے ہیں۔

جمیا کی اس آواز پر ہاجرہ نے آنکھیں کھول دیں۔ نعیم کا نام سن کر خون خشک ہو گیا

غیرت اور شرم سے اُسکے بدن میں غیر معمولی سنسناہٹ اور تھرتھری پیدا ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک تو نقش حیرت بنی حمیا کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کی، پھر خشونت آمیز آواز سے بولی "اچھا تو چل میں آتی ہوں" حمیا چلی گئی۔ ہاجرہ تھوڑی دیر تک تو لیٹی ہوئی اپنے خواب کے واقعات پر غور کرتی رہی اور دل میں شرماتی رہی۔ اسوقت اُس کے قلب کی حرکت دوگنی تیز ہوگئی تھی۔ شدتِ غیرت سے اُسکے کپڑے پسینہ سے تر ہوگئے تھے۔ بہزار دقت پلنگ سے اُٹھی، قریب ہی چوکی پر لوٹا رکھا تھا، گھبراہٹ میں منھ تو دھو ڈالا لیکن دانت مانجھنے کا خیال نہیں رہا۔ پھر اس ارادہ سے اُٹھی کہ بڑے دالان میں نعیم کے کے پاس جائے، لیکن باوجود متواتر قصد کے، جب کمرے سے باہر سر نکالتی اور نعیم پر نظر پڑتی، آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر نہ جاسکی۔ اور کمرے ہی میں پلنگ کے پائینتے پیر لٹکا کر بیٹھ گئی اور آئینہ اٹھا کر بال درست کرنے لگی۔ چہرہ فق۔ آنکھیں مخمور، جھیپ کر آئینہ تخت پر ڈال دیا۔

نعیم تھوڑی دیر تک ہاجرہ کا انتظار کرتا رہا، آخر خود ہی اُسکے کمرے میں چلا آیا۔ نعیم کو آتے دیکھ کر ہاجرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ اُسکی اس بدحواسی اور پریشانی کو نعیم نے بھی محسوس کیا۔

نعیم۔ کیوں ہاجرہ، کیسی ہو؟ تم کچھ پریشان سی معلوم ہوتی ہو؟

اس سوال کا جواب دینا ہاجرہ کے لیے قیامت ہوگیا، چاہا کہ مسکراہٹ آمیز خاموشی کے ساتھ ٹال دے۔ لیکن جب نعیم نے پھر یہی سوال کیا، تو اُس نے اپنے چہرہ کو کسی قدر بشاش بنا کر جواب دیا، جو ٹکڑے ہوکر اُسکے منھ سے نکلا۔

ہاجرہ۔ کچھ نہیں یوں ہی ..... ابھی سو کر اُٹھی ہوں .... رات کو سر میں درد تھا۔

نعیم۔ کیا حرارت بھی تھی؟..... اچھا اب اسوقت تو درد نہیں ہے؟

ہاجرہ۔ (سر جھکائے ہوئے) نہیں، اب تو اچھی ہوں۔

نعیم نے دو ایک باتیں اورکیں لیکن ہاجرہ نے نہایت بے تعلقانہ جواب دیئے۔ کئی بار ہاجرہ نے کوشش کی کہ وہ نعیم کے چہرہ پر نظر کرے لیکن دل میں چھپی ہوئی شرم اسکی نگاہ کو نعیم کے سینہ سے اوپر نہ اُٹھنے دیتی تھی۔ نہ یہی چاہتی تھی کہ نعیم اُٹھ جائے اور نہ یہی گوارہ تھا کہ وہ بیٹھا رہے۔ نعیم کو یہ خاموشی سخت ناگوار ہوئی۔ اسکی عقل ہاجرہ کی اس کیفیت کا واقعی سبب دریافت کرنے سے بجا طور سے عاجز تھی۔ اُس نے غلطی سے یہ سمجھا کہ شادی ہو جانے سے ہاجرہ کو اُس سے وہ اُنس نہیں رہا، جو پہلے تھا، جیسا کہ عموماً ہُوا کرتا ہے۔ لڑکیاں شادی سے پیشتر اپنے خاندان کے لڑکوں سے بہت شوق اور بے تکلفی سے ملتی ہیں لیکن شادی ہو جانے کے بعد یہ حالت قائم نہیں رہتی۔ جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ گھر میں بند رہ کر زندگی کی تمام مسرتیں اور دلچسپیاں صرف ایک ہی معینہ دائرہ تک محدود رہتی ہیں، جس سے باہر قدم نکالنا شدید جرم ہے۔ جب تک شادی نہیں ہوتی صنفِ ذکور سے ملنے کی مشتاق رہتی ہیں پھر برسات کی ٹھہری کی طرح، جہاں پیاس بجھ گئی، خاموش ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہاجرہ کی پیاس ایسی نہ تھی جو ایک بد مذاق اور بیوقوف شوہر کی صحبت میں بجھ سکتی۔ یہ نعیم کی غلط فہمی تھی۔

بہرحال نعیم ہاجرہ کی اس بدخلقی کا عادی نہ تھا، اور ہاجرہ پر کیا موقوف تھا، وہ کبھی ایسی بے لطف اور ٹھس صحبت کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ عورت کو کاغذ کا خوشنما پھول سمجھ کر نہ ملتا تھا کہ اُسکے نمائشی حُسن و نزاکت سے دل خوش کرے، بلکہ وہ ایسے پھول کا طالب تھا، جو حسنِ ظاہری کے ساتھ ایسی خوشبو بھی رکھتا ہو جس سے روح کو فرحت و انبساط حاصل ہو، عورت کے پاس بیٹھ کر لطف حاصل ہونا چاہیئے نہ کہ کوفت۔ بدقسمتی سے ہاجرہ اُسوقت کاغذی پھول ہو رہی تھی۔ نعیم کو ہاجرہ کا یہ خلافِ معمول برتاؤ سخت ناگوار ہوا۔ تھوڑی ہی دیر وہ بیٹھا تھا اُلجھن ہوگئی۔ اُٹھ کر چلا تو بھی ہاجرہ

نے کچھ نہ کہا، جب وہ کمرہ کے باہر پہنچ گیا، تب ہاجرہ نے پاندان کھینچ کر دبی آواز سے کہا "پان نہ کھائیے گا؟"

نعیم یہ کہہ کر کہ "نہیں، کچھ جی نہیں چاہتا" جلدی سے باہر چلا گیا۔

نعیم اور ہاجرہ ہمیشہ اُسی اشتیاق و محبت سے ملتے جس طرح دو چچا زاد بھائی بہن ملا کرتے ہیں۔ جس قدر نعیم ہاجرہ سے مل کر خوش ہوتا تھا، ویسی ہی ہاجرہ کو اسکے پاس بیٹھ کر مسرت ہوتی تھی۔ اس مرتبہ ہاجرہ کے خشک اور رُوکھے برتاؤ نے، جو نعیم کے لیے بالکل نیا تھا، اُسے سخت رنج پہنچایا۔ دو روز تک وہ ہاجرہ سے نہیں ملا اگرچہ اندر برابر آتا رہا۔ ہاجرہ بھی اپنے خواب کے خمار میں ایسی مدہوش تھی کہ اُس نے بھی نعیم کی اس بے توجہی اور ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن پھر کب تک۔ آخر تیسرے روز اُس نے اس بے لطفی کو محسوس کیا، اور جب نعیم کھانا کھانے آیا تو یہ بھی جاکر اُسکے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ہاجرہ نے باتیں کرنا چاہیں تو نعیم نے نہایت بے توجہی سے جواب دیے۔ جس سے ہاجرہ کو معلوم ہو گیا کہ نعیم کو اُس سے شکایت ہے۔ جب کھانا کھا چکا اور نعیم باہر جانے لگا تو ہاجرہ فوراً اپنی جگہ سے یہ کہتی ہوئی اُٹھی کہ "نعیم بھائی، باہر نجائیے گا۔ مجھے آپ سے ابھی کچھ کہنا ہے۔" اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نعیم نے پہلے تو ارادہ کیا کہ وہ باہر ہی چلا جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر ہاجرہ کے ساتھ کمرہ میں چلا گیا۔

ہاجرہ۔ آپ مجھ سے ابکی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ پرسوں تھوڑی دیر کے لیے آپ آئے تھے اسکے بعد سے ایسی قسم کھائی کہ ابتک دیکھنے کو ترس گئی، اس بےتعلقی کی تو مجھے آپ سے اُمید نہ تھی۔ آخر مجھ سے کوئی قصور ہوا؟

نعیم۔ قصور کی کوئی بات نہیں، مجھے فرصت نہیں ملی، دوسرے تمھارے جدید مذاق میں مجھے مخل ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

ہاجرہ۔ وہ میرا جدید مذاق کیا ہے۔ میں تو اپنے نزدیک کوئی نئی بات نہیں کرتی۔

آجکل تو کتابیں بھی بہت کم دیکھتی ہوں۔

نعیم۔ یہی تو میرا بھی مطلب ہے، کہ آج کل تمھیں خاموشی اور تنہائی زیادہ پسند ہو شاید یہ تمھاری جدید زندگی کا نتیجہ ہو۔ اگرچہ یہ قابل افسوس ضرور ہے۔

ہاجرہ (نعیم کا مطلب سمجھ گئی) یہ تو آپ نے سچ کہا، بیشک میں ایسے تفکرات کے جال میں پھنسی ہوں کہ نہ ہل سکوں اور نہ بولنے ہی کی طاقت ہے۔ لیکن میرے ساتھ آپ کو ہمدردی کرنا چاہیے تھی نہ کہ نفرت۔

نعیم۔ یہ بھی خوب۔ ہمدردی اُسکے ساتھ کیجاتی ہے جو اُسکا طالب ہو، نہ کہ اُس شخص کے ساتھ، جو پاس بیٹھنے کا بھی روادار نہ ہو۔ تم کو اپنا اُس روز کا برتاؤ یاد کرنا چاہیے نہ کہ اُلٹی مجھ سے شکایت کرنا۔ میری طبیعت سے تم واقف ہو کہ میں صرف اُنھیں سے ملنا پسند کرتا ہوں، جو مجھ سے ملنا چاہیں، بدمذاق اور ٹھس صحبت سے مجھے نفرت ہے۔

ہاجرہ۔ اچھا تو اس وجہ سے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ توبہ اُس روز میری طبیعت کا کمبخت عجب حال تھا، دن بھر کسی سے بات کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ ہاں آپ کی شکایت تو بجا ہے۔ اچھا اب معاف کیجیے، یہ اتفاق تھا، آیندہ خدا چاہے گا، تو آپ کو اس شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

نعیم۔ اچھا تو مجھے تم سے اب کوئی شکایت نہیں اگر تم اپنے اس برتاؤ کو بُرا سمجھتی ہو خیر اب اس قصہ کو ختم کرو کوئی دلچسپ خبر سناؤ؛ ہاں اکبر گوالیار سے نوکری چھوڑ کر کیوں چلے آئے؟

ہاجرہ۔ آپ دلچسپ خبر سننے کی بھی فرمایش کرتے ہیں، اور بات وہ پوچھتے ہیں جس سے سوائے کلفت اور پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں۔ لہٰذا اس تذکرہ کو نہ چھیڑیے، مجھے وحشت ہوتی ہے۔ آپ اگر لکھنؤ جائیے گا تو خود ہی سب حال معلوم ہو جائے گا۔ اب تو ماشاءاللہ ترقی ہو گئی ہے، گوالیار میں تو تیس ہی روپے ملتے تھے، بھوپال میں پچاس کی جگہ ملی ہے۔ اور

گوالیار میں تو افسر اعلیٰ سے صرف زبانی ہی لڑائی ہوئی، بھوپال میں اللہ چاہے گا تو لاٹھی پونگے تک نوبت آجائے گی۔

نعیم (ہنس کر) پھر یہ دلچسپی کی باتیں نہیں ہیں؟ یہی تو میں سنا چاہتا تھا، مگر یہ بات شاید تمھیں نہیں معلوم کہ وہاں لڑائی کس بات پر ہوئی۔ سنو، قصہ یہ ہوا کہ وہاں افسر دوم کی ایک آشنا تھی، حضرت نے بھی اُس سے راہ و رسم بڑھائی، حتیٰ کہ ایک روز وہ آپ کے کمرہ ہی میں تھی کہ وہی افسر وہاں پہنچ گیا، بس اسی کے بعد سے وہ اِن کا دشمن ہو گیا۔ یہی تمام طومار مجھے اپنے خط میں الہ آباد لکھ بھیجا تھا۔ خیر آدمی کچھ کھو کر سیکھتا ہے اب آیندہ کے لیے شاید سبق ہو جائے۔

ہاجرہ۔ بس ہو چکا۔ یہ باتیں شاید سمجھ دار آدمی کو ہوشیار بنا دیں، لیکن جس کا دماغ ہی کھوکھل ہو اُسکے لیے کیا ہو سکتا ہے۔

نعیم۔ خیر ہو گا، تم ان باتوں کی زیادہ فکر نہ کرو۔ (نعیم اس بحث کو ٹالنا چاہتا تھا) ...... ہاں کل چچی جان کچھ ماموں جان کے خط کا تذکرہ کر رہی تھیں، کیا چچا جان کے پاس بھی کوئی خط آیا تھا؟

ہاجرہ۔ ہاں آیا تو تھا، پھر آپ کی کیا راے ہے، میں نے تو سُنا ہے کہ آپ کے ماموں جان کے یہاں شادی کی پوری طیاری ہو گئی اور یہاں ابھی کچھ بھی نہیں آپ ہی کا انتظار تھا۔

نعیم۔ میرا تو ابھی کم از کم سال بھر تک ارادہ نہ تھا، لیکن ماموں جان زبردستی کرتے ہیں کہ آیندہ ماہ میں ہو جائے۔

ہاجرہ۔ سال بھر تک آپ کیوں نہیں کرنا چاہتے، اب تو آپ تعلیم سے بھی فارغ ہو گئے، پھر کیوں پس و پیش ہے؟

نعیم۔ کیا بی اے پاس کر لینے سے تعلیم ختم ہو جاتی ہے؟ یہ بالکل غلط خیال ہے۔

علم کا خزانہ تو اس قدر وسیع ہے کہ اگر کوئی شخص عمر بھر حاصل کرے، تو بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تمام علوم میں منتہی ہوگیا۔ بہر حال میرے پس وپیش کی یہ وجہ نہیں۔ کیونکہ تعلیم سے تو شاید مجھے ابھی کم ازکم تین برس تک فراغت نہ ہوگی۔ میں جس خیال سے سال بھر تک اس تقریب کو بڑھانا چاہتا ہوں اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔

ہاجرہ۔ مثلاً، کچھ معلوم تو ہو! میں اس وجہ سے تحقیق کرنی ہوں کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو پھر ابا جان سے کہدیا جائے تاکہ اُسکی طیاری کی جائے۔

نعیم (کچھ سوچ کر) بات یہ ہے کہ اُس لڑکی کی صحت خراب رہتی ہے، سنا عرصہ سے بخار آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں اس میں جلدی کرنا نہیں چاہتا، لیکن اگر ماموں جان کو اصرار ہے تو مجبوری ہے، بہرصورت وہاں کرنے میں بھی ایک مصلحت ہے۔

ہاجرہ۔ ہاں سُنا ایک ہی لڑکی ہے، اور آپ کے ماموں کی جائداد بھی بڑی ہے۔

نعیم۔ ہاں فی الحال تو یہی خیال ہے، جو مجھے وہاں شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے، بیوی کی گزر اوقات کے لیے وہ بہت کافی ہوگی۔ اور اس صورت میں میں بے فکری کے ساتھ تعلیم حاصل کرسکوں گا۔

ہاجرہ۔ تو یہ تو خود غرضی ہوئی، مجھے بڑا تعجب ہے کہ آپ کے ایسے خیالات ہیں اسکے تو یہ معنی ہوے کہ آپ کو بیوی کی محبت نہیں، جائداد کی تمنا میں شادی کرتے ہیں۔

نعیم۔ ہاجرہ۔ تمھارا اعتراض بجا ہے، لیکن تم نے اسکے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا تم ذرا غور کرو کہ اس خود غرضی سے صرف مجھی کو فائدہ پہنچے گا یا میری بیوی کو بھی۔ فرض کرو کہ میں نے بیوی کے روپے سے کوئی بڑی ڈگری حاصل کی، اور پھر اُسی نسبت سے کوئی بڑی آدمی کی حیثیت ہوگئی، تو کیا بیوی کو اُس سے فائدہ نہ پہنچے گا؟ یا زندگی میں کوئی اچھا پوزیشن حاصل کروں تو بیوی کو اُس سے خوشی نہ ہوگی؟ میں نہیں سمجھتا کہ یہ خود غرضی کیوں قابل ملامت ہے۔ میرے نزدیک تو دنیا کی تمام ترقیاں رُک جائیں اگر انسان میں

خود غرضی نہ ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ یورپ کی تمام موجودہ ترقی صرف انتہائی خود غرضی کا نتیجہ ہے، ایشیا والے ہمیشہ اپنی ایمان داری پر ناز کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج محکومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے تعصب نے ہماری آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دی ہے، ہمیں مغربی تہذیب میں کوئی اچھائی دکھائی نہیں دیتی۔

ہاجرہ۔ یہ سب صحیح ہے، لیکن اِسے تو نہ کوئی مذہب ہی روا رکھتا ہے اور نہ اخلاق جائز رکھتا ہے کہ ہم پرائے مال سے زبردستی فائدہ اُٹھائیں۔ یورپ والوں کا تو یہ طریقہ ہے کہ جس طرح بنے دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنے ٹکے سیدھے کریں۔ ایسی خود غرضی پر لعنت ہے۔

نعیم۔ یہ بھی تمھاری غلط فہمی ہے۔ دیکھو خود غرضی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جس سے صرف اپنی ہی نفس پرستی مقصود ہو، جسے انگریزی میں Selfishness کہتے ہیں، دوسری وہ، جس سے اگرچہ براہ راست اپنے ہی کو فائدہ پہنچے لیکن بالواسطہ عام سوسائٹی کا فائدہ بھی پیش نظر ہو، اسے انگریزی میں Enlightened Self interest کہتے ہیں؛ یعنی وہ خود غرضی جو تنگ خیالی پر مبنی نہ ہو۔ ان میں پہلی صورت تو بیشک قابلِ ملامت ہے، لیکن دوسری اُسی قدر قابلِ تقلید ہے۔ مثلاً ایک شکر کا تاجر بازار کے عام بھاؤ سے زیادہ قیمت لیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اور دوسرے شکر فروشوں کے پاس ویسا مال نہیں ہے، لیکن جو منافع ہوتا ہے، اُس سے ایک کثیر رقم پبلک بہبود کے کاموں میں صرف کرتا ہے، تو ہم کسی طرح اُسے بُرا نہیں کہہ سکتے۔ آج یورپ کے ہزارہا ہسپتال اور یتیم خانے، ایسے ہی فیاض تاجروں کی مدد سے قائم ہیں۔ یہ ہماری صریح حماقت ہے اگر ہم اُنھیں "خود غرض" کہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو بات ہمیں نہیں آتی ہم اُسے بُرا سمجھتے ہیں۔ یورپ میں انفرادی خود غرضی سے بڑھ کر قومی خود غرضی کا درجہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یورپ کی قومیں ہماری خاطر اپنے پَیروں میں کلھاڑی ماریں، بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ یورپ ترقی

کے حصے بخرے کرتا ہے، ہم شور مچاتے ہیں۔ فرانس مراکش اور شمالی افریقہ پر قابض ہو جاتا ہے، ہم واویلا کرتے اور اُسے بے ایمان اور لٹیرا کہتے ہیں۔ یا روس ایران کی آزادی میں دست درازی کرتا ہے، ہم ماتم کرتے ہیں اور اُسے ظالم و جابر کہتے ہیں۔ انگریزی میں مقولہ ہے (Might is right) یعنی قوت حق کی بنیاد ہے، ہم اُنھیں بُرا سمجھتے ہیں، جو اس پر عمل کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس پر مجبور ہیں، کیونکہ اگر ایسا نہ کریں تو یقیناً تباہ ہو جائیں۔ تنازع البقا کی روح جسے انگریزی میں Struggle for existence کہتے ہیں، ہر شخص میں فطرتاً ودیعت کی گئی ہے، وہ مجبور ہے کہ کہ اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیے اپنے سے کمزور لوگوں کی چیز زبردستی حاصل کرے، اب یہ دوسروں کا فرض ہے کہ وہ بھی اپنی حفاظت کے سامان کریں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ دنیا میں خود غرضی سے کوئی انسان یا حیوان خالی نہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی میں یہ اسپرٹ زیادہ ہے اور کسی میں کم۔

ہاجرہ۔ اچھا میں سمجھ گئی، اب آپ یہ بتائیے کہ شادی کا سامان کیا جائے؟

نعیم۔ سامان کیا ہوگا، ماموں جان تو چاہتے ہیں کہ خاموشی کے ساتھ صرف شرعی نکاح کر دیا جائے۔ میں دو چار روز میں وہاں جاؤنگا، پھر جو صورت ہوگی دیکھا جائیگا۔

ہاجرہ۔ خیر جو آپکی خوشی ہو، میں یہی ابا جان سے کہدوں گی۔

نعیم باہر چلا گیا، ہاجرہ نے بھی ایک کتاب اُٹھالی اور اُسے دیکھنے لگی۔

(۹)

ڈپٹی ممتاز علی کو بھوپال سے آئے چار مہینے ہوگئے۔ ابتداءً تو صرف معمولی بخار کی شکایت رہتی تھی، لیکن جب شروع ہی سے علاج میں بے احتیاطی اور بے توجہی کی گئی تو آخر مرض نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اب نہ تو شاہ ابوالبرکاۃ کی دعا اور تعویذوں سے کام چلتا تھا اور نہ جھاڑ پھونک اور ٹوٹکے کے علاج ہی سے کوئی فائدہ تھا۔ یہ حالت سُن کر ہاجرہ کو بھی مجبوراً لکھنؤ

آنا پڑا۔ ایک روز صغرا بیگم (عشرت بیگم کی چھوٹی بہن) ڈپٹی صاحب کی عیادت کو آئیں، دوپہر کے کھانے کے بعد، جب دونوں بہنیں باہم بیٹھیں تو ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہاجرہ کا تذکرہ اس طرح چھڑا۔

صغرا بیگم۔ کہو آپا، بہو صاحب کا کیا رنگ ہے۔ ہاں یہ آئیں کیسے؟ کیا یہاں سے کوئی پھر بھیجا گیا تھا؟

عشرت بیگم۔ آئیں ایسے کہ میں تو قسم کھا چکی تھی کہ اب کبھی نہیں بلاؤنگی، بلکہ میں نے تو جب عظمت انکے ساتھ نہیں آئیں، تب ہی خط لکھ دیا تھا کہ اب باپ ہی کے یہاں رہیں یہاں نہ آئیں۔ اُسپر شاید باپ نے اپنی زورازوری سے بھیجا ہو، لیکن وہ ایسی ضدن اور سرہنگ ہے کہ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ باپ کا بھی کہنا مانتی ہوگی، اور باپ کی اللہ رکھے بڑی دُلاری بھی ہیں، شاید خود ہی کچھ سمجھ میں آگیا ہو کہ اب اس حالت میں تو جا کر دیکھ آؤں۔ سبز قدم ایسی ہے کہ جس دن سے یہ بیاہ کے آئی ہے، اُسی دن سے میرے گھر میں نحوست برسنے لگی۔ اکبر اچھا خاصا گوالیار میں نوکر ہوگیا تھا، اُسکی نوکری چھُٹی، عظمت امتحان میں فیل ہوگیا، پھر گھر میں چوری ہوئی، اب دیکھو چھ مہینے سے یہ بیمار پڑے ہیں، اور خود اپنی ماں بھی بیٹی کے پیدا ہوتے ہی بیمار پڑیں، آخر اُسی میں مریں۔ مجھے تو اب اُسکی صورت سے نفرت ہوگئی ہے۔ کیا میں اُس سے ہنس کے بات تھوڑی کرتی ہوں۔

صغرا بیگم۔ خیر آپا، منحوسیت کی تو کچھ بات نہیں۔ ایسی پریشانیاں تو آدمی کی زندگی کے ساتھ ہیں، کون ایسا ہے جو ہمیشہ خوش رہتا ہو۔ مگر ہاں یہ قطع تو بہو بیٹی کے لیے اچھی نہیں معلوم ہوتی جو ہاجرہ نے اختیار کی ہے۔ بڑوں کا کچھ ادب ہی نہیں۔ میں ابھی اُس کمرہ میں گئی تو لیٹی کوئی کتاب دیکھ رہی تھیں، مجھے دیکھ کر اُٹھ بیٹھیں، بڑی بیبا کی سے سلام کیا، مزاج پوچھا اور ایسی طرح تڑ پڑ باتیں کیں، جیسے کئی سال کی بیاہی اور کئی لڑکوں کی ماں۔ غضب خدا کا، چھ مہینے کی دُلھن، جسے ذرا شرم و حجاب چھو نہیں گیا۔ یہ بھی موئی کوئی وضع ہے۔

عشرت بیگم۔ تم وہاں گئیں کیوں، وہ اس قابل ہے کہ کوئی اُسکے پاس جائے۔ میں نے تو اُسکی وضع قطع دیکھ کے بنّن (لڑکی) کو بھی منع کردیا کہ اُسکے پاس زیادہ نہ بیٹھا کرے۔ یہ بھی تم نے سنا کہ اس مرتبہ جب اکبر گوالیار سے واپس آیا اور بیوی صاحب کو دیکھنے سیتا پور گیا، تو اُس سے خوب لڑی، اور بُرا بھلا کہنے کو تو کچھ اُٹھا ہی نہیں رکھا اور رات بھر میاں کے پاس نہیں پھٹکی۔ پھر میاں نے یہاں سے بُلانے کا خط بھیجا، تو جواب تک نہیں دیا۔ وہ تو قسم کھا چکا ہے کہ میں اب صورت پہ نظر نہیں ڈالوں گا۔ میاں بیوی میں خط وکتابت بھی تو بند ہے۔

صغرا بیگم۔ مگر آج تو جب میں وہیں بیٹھی تھی تو خلقیہ (لونڈی) نے ایک لفافہ لاکے دیا تھا۔ بلکہ میں نے پوچھا بھی کہ کیا باپ کا خط ہے تو بولیں کہ نہیں۔ تھا تو مردانہ خط، میں یہی سمجھی کہ اکبر کا خط ہے۔

عشرت بیگم (طعن سے) اکبر کو خط ہی کہاں لکھ آتا ہے۔ وہ تو جس دن سے قابل بیوی ملیں، میاں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھول گیا۔ اُس دن بنّن نے پوچھا کہ بھابھی جان کوئی خط بھائی صاحب کا تو آپ کے پاس نہیں آیا، تو اسکا جواب کیا دیا کہ "تمھارے بھائی صاحب کو خط ہی لکھنا نہیں آتا، وہ کسی کو خط ہی کیا بھیجیں گے"۔ وہ تو جو کچھ دنیا سے نرالی قابلیت ہے وہ یا تو بیوی کو ہے، یا اُس نگوڑے نعیم کو ہے، اور تو سب جاہل ہیں۔ اُسی کے خط آیا کرتے ہیں۔ مجھے تو اب شک ہے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، نہیں بھلا اسکے کیا معنی کہ بیاہی لڑکی غیر مرد سے خط وکتابت کرے۔

صغرا بیگم۔ تو آپ یہ باتیں اُسکے باپ کو کیوں نہیں لکھ بھیجتیں؟ یہ سمجھ لیں کہ جبتک نعیم سے میل جول نہیں بند ہوگا، اُسوقت تک اکبر کے دباؤ میں تھوڑی آئے گی، اور نہ میاں کی کچھ قدر ہوگی۔

عشرت بیگم۔ ہاں میں یہ رنگ دیکھ رہی ہوں، پھر آخر کیا کروں گی، باپ ہی کو

لکھوں گی کہ صاحب زادی کسے یہ چلن ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ میاں جوان بیوی کے مرید ہیں
اور سیدہ کو اُسنے (ماجرہ) ایسا شیشہ میں اتارا ہے کہ وہ بالکل اسی کی مرضی پر چلتی ہیں، بہرحال میں
لکھوں گی تو ضرور ہی، میرا تو اب اسکی طرف سے ایسا دل پک گیا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں
یہ سمجھ لو کہ جس دن سے آئی ہے، گھڑی دو گھڑی کے سوا وہ کمرے سے باہر نکلتی ہی نہیں۔
ہر وقت پلنگ پر لیٹی کتاب ہی دیکھا کرتی ہے۔ اور کتابیں بھی اُردو کی نہیں۔ ابکی تو ماشاءاللہ
انگریزی سیکھ کے آئی ہیں۔

صغرا بیگم۔ تو اتنی تھوڑی سیکھی ہوگی کہ انگریزی کتابیں پڑھ لیں، وہی کچھ تھوڑی سی گِٹ پِٹ کرنا آ گئی ہوگی۔ اب آج کل لڑکیوں کو یہ شوق بھی تو سمایا ہے کہ کچھ انگریزی ضرور سیکھیں

عشرت بیگم۔ اور سنو، اُس دن بتن میرے پاس آئی کہنے لگی کہ بھابھی جان نے کہا ہے کہ تم فلانی کتاب منگا لو، میں تمھیں انگریزی شروع کرا دوں، میں نے کہا نہیں کچھ ضرورت نہیں، بھابھی جان کو ایم اے، بی اے پاس کرنا ہے، وہ سیکھیں، تمھیں خدا نہ کرے کچھ نوکری تو کرنا نہیں ہے کہ موئے کافروں کی زبان سیکھو۔ اُسپر بتن کہنے لگی کہ پھر بھابھی کو کیوں انکے باپ نے میم سے انگریزی پڑھنے کی اجازت دے دی؟ تب تو میں نے اُسے خوب للکارا کہ بھابھی جان کے باپ سٹھیا گئے ہیں، مگر میں دیوانی نہیں ہو گئی ہوں، اور نہ تمہارے ابا جان ہی کا قرآن درمیان کچھ دماغ ٹل گیا ہے، اب کیا کہنے کو آج انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا ہے تو کل میم صاحب بننے کو دل چاہے گا۔ خیر وہ چپ ہو گئی، پھر اُس دن سے اُس نے انگریزی کا نام نہیں لیا۔ بتن مجھے کبھی اُلٹ کے جواب نہیں دیتی تھی لیکن یہ اسی ماجرہ کی صحبت کا نتیجہ ہے کہ اُسدن اُس نے میری بات کا جواب دیا۔

صغرا بیگم۔ تو کیوں اب اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ دوسروں کو بھی پڑھا سکتی ہیں۔

عشرت بیگم۔ ہاں، اچھی طرح سیکھی ہے، بتن یہ بھی تو کہتی تھی کہ نعیم کا جو خط آتا ہے وہ کچھ اُردو میں ہوتا ہے، کچھ انگریزی میں، جس میں خط پکڑا جائے تو کوئی مطلب نہ سمجھ پائے۔ اور

باتیں بنانے کو بٹن نے پوچھا تو کہنے لگی کہ کتاب میں جو مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا وہ نعیم سے لکھ کر پوچھ منگاتی ہوں۔ بھلا خدا دکھیا نہیں تو عقل سے پہچانا ہے، کون اسے یقین مانے گا کہ نعیم انگریزی کا مطلب لکھ بھیجتا ہے۔ یہ سب دغا بازی اور فریب ہے، کیا میں اسے سمجھتی نہیں۔

صغرا بیگم۔ یہ بھی اُنکی حماقت ہے۔ بھلا جو خط پکڑ سکتا ہے اُسے کوئی انگریزی جاننے والا نہ ملے گا؟ ماشاءاللہ گھر میں عظمت ہی ہے۔ اور یہ کیا نعیم کی ابھی شادی نہیں ہوئی جو وہ پرائی بہوبیٹیوں کو تاکا کرتا ہے؟ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ دو تین مہینے ہوئے جب کوئی کہتا تھا کہ شادی ہوگئی۔

عشرت بیگم۔ اس کی شادی کو ہوئے تو چار مہینے پورے ہوگئے، مگر جب بہوبیٹی کو خود اپنی عزت آبرو کا خیال نہ ہو تو اُسے کیا پرواہ۔ آخر وہ ہے بھی کون، کہنے کو تو سب کہتے ہیں کہ اُس کی ماں کشمیرن تھی، مگر میں جانتی ہوں کہ کوئی رنڈی منڈی ہوگی۔ خدا معلوم حلال زادہ ہے کہ حرام زادہ۔

صغرا بیگم۔ نہیں یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ رنڈی نہیں تھی۔ تھی تو وہ کشمیری ہی کی اور شادی بھی ہوئی تھی، مگر پھر بھی ہماری ذات رات کی نہیں تھی۔

عشرت بیگم۔ خیر رنڈی کا بچہ نہ سہی، ہے تو وہ کمینہ۔ میں تو ابھی سیتاپور لکھوں گی کہ مجھے ہاجرہ کا نعیم کے سامنے آنا ہرگز پسند نہیں اور نہ میں اُسے اپنی ڈیوڑھی پر قدم رکھنے دوں گی۔

صغرا بیگم۔ یہ ہوجائے تو بہت ہی اچھا ہے، پھر خط وکتابت بھی بند ہوجائے گی۔ اب یہ کب تک یہاں رہیں گی؟ میں نے سنا ہے کہ فرید میاں ابھی حج کو جارہے ہیں۔

عشرت بیگم۔ نہیں وہ تو اب پارسال حج کو شاید جائیں، ابھی تو انکا قصد نہیں ہے۔ بیٹی صاحب کے یہاں البتہ جلدی پڑی ہے کہ کسی طرح سیتاپور پہنچ جائیں۔ سنا ہے کہ باپ کو بلا بھیجا ہے۔ عظمت سے کہا تھا کہ مجھے چل کر پہنچا آؤ مگر میں نے اُسے منع کر دیا کہ جب وہ تیرے ساتھ نہیں آئیں تو پھر تو کیوں پہنچانے جائیگا۔ شاید باپ دو ایک روز میں آئیں نہیں تو

لکھوں گی کہ صاحب زادی کے یہ چلن ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ میاں جوان بیوی کے مُرید ہیں
اور سیدہ کو اُسنے (ہاجرہ) ایسا شیشہ میں اتارا ہے کہ وہ بالکل اسی کی مرضی پہ چلتی ہیں، بہرحال میں
لکھوں گی تو ضرور ہی، میرا تو اب اسکی طرف سے ایسا دل پک گیا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں
یہ سمجھ لو کہ جس دن سے آئی ہے، گھڑی دو گھڑی کے سوا وہ کمرے سے باہر نکلتی ہی نہیں۔
ہر وقت پلنگ پر لیٹی کتاب ہی دیکھا کرتی ہے۔ اور کتابیں بھی اُردو کی نہیں۔ ابکی تو ماشاءاللہ
انگریزی سیکھ کے آئی ہیں۔

صغرا بیگم۔ تو اتنی تھوڑی سیکھی ہوگی کہ انگریزی کتابیں پڑھ لیں، وہی کچھ تھوڑی سی
گٹ پٹ کرنا آگئی ہوگی۔ اب آج کل لڑکیوں کو یہ شوق بھی تو سمایا ہے کہ کچھ انگریزی ضرور سیکھیں

عشرت بیگم۔ اور سنو، اُس دن بنّن میرے پاس آئی کہنے لگی کہ بھابھی جان نے
کہا ہے کہ تم فلانی کتاب منگا لو، میں تمھیں انگریزی شروع کرا دوں۔ میں نے کہا نہیں کچھ ضرورت
نہیں، بھابھی جان کو ایم اے، بی اے پاس کرنا ہے، وہ سیکھیں، تمھیں خدا نہ کرے کچھ نوکری
تو کرنا نہیں ہے کہ مُوئے کافروں کی زبان سیکھو۔ اُسپر بنّن کہنے لگی کہ پھر بھابھی کو کیوں
انکے باپ نے میم سے انگریزی پڑھنے کی اجازت دے دی؟ تب تو میں نے اُسے خوب للکارا
کہ بھابھی جان کے باپ سٹھیا گئے ہیں، مگر میں دیوانی نہیں ہوگئی ہوں، اور نہ تمھارے اباجان
ہی کا قرآن درمیان کچھ دماغ چل گیا ہے، اب کیا کہنے کو آج انگریزی پڑھنے کا شوق ہُوا ہے
تو کل میم صاحب بننے کو دل چاہے گا۔ خیر وہ چُپ ہوگئی، پھر اُس دن سے اُس نے انگریزی
کا نام نہیں لیا۔ بنّن مجھے کبھی اُلٹ کے جواب نہیں دیتی تھی لیکن یہ اسی ہاجرہ کی صحبت کا نتیجہ
ہے کہ اُسدن اُس نے میری بات کا جواب دیا۔

صغرا بیگم۔ تو کیا اب اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ دوسروں کو بھی پڑھا سکتی ہیں۔

عشرت بیگم۔ ہاں، اچھی طرح سیکھی ہے، بنّن یہ بھی تو کہتی تھی کہ نعیم کا جو خط آتا ہے وہ کچھ
اُردو میں ہوتا ہے، کچھ انگریزی میں، جس میں خط پکڑا جائے تو کوئی مطلب نہ سمجھ پائے۔ اور

باتیں جاننے کو بٹن نے پوچھا تو کہنے لگی کہ کتاب میں جو مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا وہ نعیم سے لکھ کر پوچھ منگاتی ہوں۔ بھلا خدا دکھا نہیں تو عقل سے بیچا ہے، کون اسے یقین مانے گا کہ نعیم انگریزی کا مطلب لکھ بھیجتا ہے۔ یہ سب دغا بازی اور فریب ہے، کیا میں اسے سمجھتی نہیں۔

صغرا بیگم۔ یہ بھی اُنکی حماقت ہے، بھلا جو خط پکڑ سکتا ہے اُسے کوئی انگریزی جاننے والا نہ ملے گا؟ ماشاءاللہ گھر میں عظمت ہی ہے۔ اور یہ کیا نعیم کی ابھی شادی نہیں ہوئی جو وہ پرائی بہو بیٹیوں کو تاکا کرتا ہے؟ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ دو تین مہینے ہوئے جب کوئی کہتا تھا کہ شادی ہوگئی۔

عشرت بیگم۔ اس کی شادی کو ہوئے تو چار مہینے پورے ہوگئے، مگر جب بہو بیٹی کو خود اپنی عزت آبرو کا خیال نہ ہو تو اُسے کیا پرواہ۔ آخر وہ ہے بھی کون، کہنے کو تو سب کہتے ہیں کہ اُس کی ماں کشمیرن تھی، مگر میں جانتی ہوں کہ کوئی رنڈی منڈی ہوگی۔ خدا معلوم حلال زادہ ہے کہ حرام زادہ۔

صغرا بیگم۔ نہیں یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ رنڈی نہیں تھی۔ تھی تو وہ کشمیر ہی کی اور شادی بھی ہوئی تھی، مگر پھر بھی ہماری ذات راستہ کی نہیں تھی۔

عشرت بیگم۔ خیر رنڈی بچہ نہ سہی، ہے تو وہ کمینہ۔ میں تو ابکی سیتاپور لکھوں گی کہ مجھے ہاجرہ کا نعیم کے سامنے آنا ہرگز پسند نہیں اور نہ میں اُسے اپنی ڈیوڑھی پر قدم رکھنے دونگی۔

صغرا بیگم۔ یہ ہوجائے تو بہت ہی اچھا ہے، پھر خط وکتابت بھی بند ہوجائے گی اب یہ کب تک یہاں رہیں گی؟ میں نے سنا ہے کہ فرید میاں ابکی حج کو جارہے ہیں۔

عشرت بیگم۔ نہیں وہ تو اب پارسال حج کو شاید جائیں، ابکی تو انکا قصد نہیں ہے۔ بیٹی صاحب کے یہاں البتہ جلدی پڑی ہے کہ کسی طرح سیتاپور پہنچ جائیں۔ سنا ہے کہ باپ کو بلا بھیجا ہے۔ عظمت سے کہا تھا کہ مجھے چل کر پہنچا آؤ مگر میں نے اُسے منع کر دیا کہ جب وہ تیرے ساتھ نہیں آئیں تو پھر تو کیوں پہنچانے جائیگا۔ شاید باپ دو ایک روز میں آئیں نہیں تو

اُسے اکیلے چلے جانے میں بھی کچھ عار نہیں ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی سُن چکی ہوں کہ اُسے پردے میں رہنا پسند نہیں۔

صغرا بیگم۔ آپا تم نے ایسی جگہ جان بوجھ کر شادی ہی کیوں کی، جو آپ کُڑھنا پڑتا ہے۔ آخر اُنکی طبیعت کا حال تو پہلے سے معلوم ہوگا؟

عشرت بیگم۔ میں کب کرنے پر راضی تھی، وہ تو تمھارے بھائی کی زورا زوری ہوئی یہ اُنھیں (میاں) کا سب کیا دھرا ہے۔ بڑی تمنا تھی کہ بہن کی نشانی ہے، میں ہاجرہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اب جو میں کہتی ہوں تو کچھ جواب نہیں دیتے۔ میں نے تو کل شام کو بھی، جب اُنکے سامنے ذکر آیا تو یہ سب حال بیان کیا تھا، لیکن بیماری میں اب اُنھیں جھنجھلاہٹ بہت آتی ہے، کہنے لگے کہ "تم میرا دل بہلانے بیٹھی ہو، یا دل کُڑھانے، مجھ میں اب ان باتوں کے سننے کی تاب نہیں ہے، مجھے بخار نہیں بھی ہوتا لیکن تم ایسی باتیں چھیڑتی ہو کہ خواہ مخواہ مجھے حرارت ہو آتی ہے"۔ بس میں چُپ ہو گئی، اور اُسوقت سے اب تک نہیں گئی۔

صغرا بیگم۔ تو اُنھیں بہو کا یہ رنگ پسند ہوگا، جب ہی اُنھیں یہ باتیں ناگوار ہوتی ہیں یہ تو اُنھوں نے سچ کہا کہ بیمار کے پاس بیٹھ کر ایسی باتیں نہ کرنا چاہیے، جس سے اُسے رنج ہو بلکہ ایسی باتیں کی جائیں، جس سے اُس کا دل بہلے اور بیمار کی پریشانی دور ہو۔

عشرت بیگم۔ تو آخر ہمیشہ خود بہو کی وضع قطع کی شکایت کرتے تھے تب پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بھی کس دن بہو سے خوش رہے؟

صغرا بیگم۔ ہمیشہ کی بات نہ کہیے ان کے دشمن کبھی ایسے بیمار ہی کب پڑے تھے، اس بیماری میں تو آدمی کی طبیعت چڑچڑی ہو بھی جاتی ہے۔ خیر یہ تو ہو چکا، اب یہ بتاؤ کہ اکبر ماشاء اللہ اچھی طرح ہے، مُستقل نوکری ہے یا وہی گوالیار کی سی؟

عشرت بیگم۔ نہیں مستقل تو ابھی یہ بھی نہیں ہے، کام بہت زیادہ ہے، کل خط آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ وہاں کی آب ہوا بھی اُسکے موافق نہیں اور اِنکے (میاں) بیمار

ہو کر چلے آنے سے اب اُسکے افسروں کا برتاؤ بھی ویسا نہیں ہے۔ دوسرے یہاں کی حالت سُن کر وہ اور گھبراتا ہے، پھر چھٹی بھی نہیں ملتی۔ عجیب مصیبت میں پھنسا ہے۔ اب پھر عرضی دی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اب چھٹی نہ ملی تو نوکری چھوڑ دونگا پچاس روپے تنخواہ اور کالے کوسوں بھوپال کا رہنا۔

صغرا بیگم۔ پھر یہیں سرکاری نوکری کیوں نہیں تلاش کرتے۔ آخر یہاں بھی تو اُس کا حق ہے؟

عشرت بیگم۔ حق تو سب کچھ ہے لیکن جب کوئی مانے۔ دوسرے بیماری سے فرصت ہو تو سفارش کیجائے۔ اب ایک عمر کا جھنجھٹ بھی نکلا ہے کہ پچیس[۲۵] برس سے زیادہ عمر نہ ہو، اور اُسکی عمر اسوقت ماشاء اللہ ستائیس برس کی ہے۔ اسی وجہ سے وہ خود بھی انگریزی نوکری سے گھبراتا ہے۔

صغرا بیگم۔ نہیں تو جب بھائی (بہنوئی) اچھے ہو جائیں گے تو وہ سفارش کرکے جگہ بھی دلوا دیں گے۔ یہ پچاس روپے کی نوکری اور بھوپال کا رہنا تو اچھا نہیں ہے۔ آپ وہ کیا بیوی کو بھیجے گا اور کیا خود خرچ کرے گا۔ وہاں کا خرچ بھی معمولی نہ ہوگا۔

عشرت بیگم۔ بیوی کا خرچ وہ بیچارہ کیا اُٹھائے گا، میں ہی اُنھیں چار روپے جو دستور ہے، ہر مہینے بھیج دیتی ہوں۔ اُس کا خرچ بھی اس طرح چلتا ہے کہ اکثر دس بیس یہاں سے منگا بھیجتا ہے۔ رشوت کی اُسے قسم ہے ایک کوڑی نہیں چھوتا۔ بس جو تنخواہ ملتی ہے وہی اُسکی آمدنی ہے۔

اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں کہ خلقیہ نے آکر کہا کہ "پرسوں ہاجرہ بٹیا کے ابا جان انھیں لینے آرہے ہیں، ابھی سیتاپور سے خط آیا ہے۔"

عشرت بیگم۔ پھر کوئی کیا کرے۔ خوشی سے آئیں اور بیٹی کو لیجائیں، لیکن اب بندی بھی اکبر کو سیتاپور نہیں جانے دیگی، چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔"

یہ کہکر عشرت بیگم اپنی جگہ سے طیش کے ساتھ اٹھیں، اور قریب ہی چوکی پر لوٹا رکھا تھا، ظہر کی نماز کا وضو کرنے لگیں۔ شام کو صغرا بیگم رخصت ہو کر مکان چلی گئیں۔ لیکن اس عرصہ میں بھی دونوں بہنوں نے ہاجرہ کی غیبت اور برائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ تیسرے روز صبح کو مولوی فرید الحق آئے اور شام کی گاڑی سے وہ ہاجرہ کو لیکر سیتا پور چلے گئے۔ دوسرے روز شام کو میاں اکبر بھی بھوپال سے استعفاء دیکر لکھنؤ چلے آئے۔ ڈپٹی ممتاز علی کی بیماری میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ لکھنؤ کے علاج میں جب کوئی فائدہ نہ ہوا، تو کچھ دنوں دہلی میں رہ کر وہاں کے اطباء کا علاج کیا، لیکن اب پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا حکیم وڈاکٹر کیا کر سکتے تھے، آخر آٹھ ماہ کے مسلسل علاج اور ہزارہا روپیہ صرف کرنے کے بعد دُنیا کے خرخشوں اور زندگی کے دائمی تفکرات سے آزاد ہو کر، قبر کے تنگ و تاریک حجرے میں بیفکری کی نیند سو گئے۔ جائداد پر پہلے ہی سے قرضہ کا بار تھا، جو کچھ باقی رہی تھی وہ بھی اس بیماری میں مکفول ہو گئی۔ گھر کی تباہی میں اب کوئی کسر باقی نہ تھی، اگر بیگم صاحبۂ بھوپال کی فیاضی سے عشرت بیگم کا پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ نہ مقرر ہو جاتا، اور ڈپٹی کمشنر صاحب کی سفارش سے عظمت کو سب انسپکٹر پولیس کی جگہ نہ مل جاتی۔ اکبر کا البتہ وہی رنگ رہا بقول شاعر "وہی رفتار بے ڈھنگی جو آگے تھی سو اب بھی ہے" تیس روپیہ کی جگہ دفتر کلکٹری میں ملی لیکن یہ خدا کا بندہ وہاں بھی اپنی وضعداری پر قائم رہا، یعنی وہاں بھی ہیڈ کلرک سے لڑ کر چلا آیا۔

(باقی آئندہ)

انیس احمد عباسی (کاکوروی)

فنا و بقا

(انسانی روحوں کو اُبھارنا اور اُنکو نیک ترین راہوں سے لیجانا شاعر کا کام ہے)

اس طرح واقع ہوا ہے اہتمامِ کائنات — کوئی شے ضائع نہیں کرتا نظامِ کائنات
خاک کا اک ذرہ یا شبنم کا قطرہ۔ دہر میں — غرق ہو سکتا نہیں بحرِ فنا کی لہر میں
تجربہ بتلا رہا ہے روز کے حالات سے — ہو چکا ہے مسئلہ ثابت یہ تصدیقات سے
ہاں مگر رہتا نہیں ہے مادہ اک حال میں — منتقل ہوتے ہیں اجزا دوسری اشکال میں
جب یہ صورت ہے۔ تو یہ انسان۔ نقشِ کمال — یہ ہمہ تن حسنِ فطرت۔ یہ شبیہ بیمثال
کیا جب اپنے جسمِ خاکی سے جدا ہو جائیگا — اپنی شخصیت سے مرہونِ فنا ہو جائیگا
تو ہوا معیارِ ہستی اس قدر انسان کا — جسم کی امداد۔ گویا فرض تھا اک جان کا
یعنی جب تک جسم اک مخصوص صورت میں رہا — جوہرِ انسانیت مصروف خدمت میں رہا
اور پھر ہونے لگے جب منتشر ذراتِ جسم — رکھ سکا قائم نہ کیا نیِ کیفیاتِ جسم
خاک میں مل کر نیا اک اور پیکر ہو گیا — رہ گیا باقی عرض معدوم جوہر ہو گیا
ذہن میں اس طرح کی تفضیع آ سکتی نہیں — شانِ فطرت ایسی کمزوری دکھا سکتی نہیں

آہ۔ اے انسان! کیوں محوِ خیالِ خام ہے — کس لیے اپنی حقیقت سے تجھے ابہام ہے
بندۂ سرکش، خیالِ امرِ ربانی بھی رکھ — عالمِ اجساد میں احساسِ روحانی بھی رکھ
روح شخصیت کا تیری اصطلاحی نام ہے — جاننا اپنے کو تیرا سب سے پہلا کام ہے
مستقل بالذّات ہے اور دائمی ہستی ہے تو — بن رفیع المرتبت کیوں مائلِ پستی ہے تو
چھوڑ کر باطن کو یوں ظاہر میں سرگرداں نہ ہو — اس قدر بھی لے ظلوم آلودۂ عصیاں نہ ہو

عارضی لذت سے وابستہ ہے تیری دلکشی
کرنہ لطفِ جاوداں سے ایسی بیگانہ وشی

چند روزہ زندگانی کا جو دلدادہ ہے تو
آہ۔ معدومی پہ گویا اپنی آمادہ ہے تو

اس طلسمِ بے بقا کی سیر سے بیزار ہو
عالمِ بالا کو جانے کے لیے تیار رہو

سوچ غافل خاک ہو جانے سے پہلے خاک ہو
زنگ سے آئینہ اپنا صاف کرلے پاک ہو

قیدِ حیوانی سے اپنے نفس کو آزاد کر
حاملِ بارِ امانت تو ہے۔ اتنا یاد کر

باندھ کر آیا کسی سے ہے جو پیمانِ وفا
گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا

خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

ایڈیٹر

خلیفۃ المومنین منصور

خلافت عباسیہ کا دوسرا حکمراں اور محمد ابنِ علی کا تیسرا جانشین منصور ہے۔ اسکا نام عبداللہ اور کنیت ابو جعفر ہے۔ اسکی ماں سلامہ بربری اُم الولد تھی۔ منصور کا نسب حضرت عباس ابن عبدالمطلب تک تین واسطوں سے پہنچتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :- عبداللہ ابن محمد ابن علی ابن عبداللہ ابن عباس ابن عبدالمطلب۔

منصور ۹۵ھ میں پیدا ہوا۔ اور غالباً اسکی عمر کا ابتدائی حصہ مدینے میں گزرا۔ اُس وقت علی ابن عبداللہ تابعی زندہ تھے۔ اور گو منصور نے اُنکے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی لیکن کوئی حدیث اُن سے بلا واسطہ نہیں بیان کی۔ اس بنا پر بعض کا خیال ہے کہ منصور نے اپنے جدِ امجد کو عالمِ طفولیت میں دیکھا تھا۔ اور بچپن کی لاابالی و آزاد زندگی نے اُسے علی کے فیضان سے مستفیض ہونے کا موقع نہ دیا۔ لیکن جن لوگوں کے زمانۂ حیات کی امتدادی کڑیاں آج پچاس سال پہلے کے زمانے سے مل جاتی ہیں اُن سے اُس عہد کے مسلمانوں کے احساسِ مذہبی کی کیفیت سُنیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اسلام کی زندہ تصویر تھے جنکی ہر صدائے مذہب کی گونج اُٹھتی اور ہر قول و فعل میں مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ اُس زمانے کا رندمشرب فرقہ جو متبعین شریعت کی محترم نگاہوں میں ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ اِس زمانے کے اُن مدعیانِ اسلام اور حامیانِ مذہب سے کہیں افضل تھا جو مذہب اور قوم کی صدائیں بلند کرتے ہیں اور جنکی تحریر و تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب میں شرابور ہیں اور قدرت نے ہمدردیٔ قوم کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جب اُس زمانے کا یہ حال تھا جو ہم سے بہت قریب اور آغازِ اسلام سے زمانۂ مابعد میں بعیدتر ہے تو اُس دور کے مذہبی خیالات اور مذہبی احساسات کی کیا کیفیت ہوگی جو حضرت رسول علیہ السلام کے ایامِ حیات سے کچھ زیادہ بعید نہ تھا۔ اب ناظرین کا ذہن رسا خود ہی مسائلِ بالا کے متعلق فیصلہ کرلے گا کہ منصور اپنے دادا کی مجالست حاصل کرنے کے بعد بھی اُنکے فیضان سے مستفیض ہوا ہوگا یا نہیں۔

حضرت علی ابن عبداللہ کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ وہ اُس التابعین میں تھے، انھوں نے اپنے والدِ مکرم اور صحابۂ کرام سے بکثرت حدیثیں سُنیں اور روایت کی ہیں۔

منصور کی آفرینش اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی حلقے میں بیٹھ کر مسائل مذہب کو اپنے دادا اور بزرگان سلف سے نقل کرتا۔ وہ ایک متبحر عالم ضرور تھا اور مسائل دینیہ میں اسے کمال عبور حاصل تھا۔ لیکن قدرت نے اسے کارگاہ ہستی میں خلافت عباسیہ کے استحکام اور بغداد جیسے ام البلاد شہر آباد کرنے کے لیے بھیجا تھا مروانیوں کے اقبال کا روشن آفتاب ہزار ماہ تک عالم کو اپنی نور سے منور کرکے غروب ہوچکا تھا۔ گو عباسیوں کی تلوار نے اُن کا قلع قمع کر دیا تھا، اور اب اُن میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوسکتے لیکن اُنکے ہواخواہ موجود تھے اور مصر و شام میں فساد کا اندیشہ باقی تھا۔ اگر منصور استحکامِ سلطنت اور انتظامِ مملکت کی طرف سے ذرا بھی غفلت کرتا تو اسے بہت سے مصائب کے لیے سینہ سپر ہو جانا پڑتا۔

منصور کی اِن تمام کوششوں پر بھی بنی اُمیّہ نے اندلس پر قبضہ کر ہی لیا۔ اور اس طرح قائم رکھا کہ خلافتِ عباسیہ کے کسی حکمراں کو اُنکے مقابلے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایسی حالت میں اگر اسے کسی مسجد یا کسی حلقے میں بیٹھ کر احادیث اس کثرت سے نہیں بیان کیں کہ اُسے اپنے دادا کی طرح روایت کے نقل کا کبھی موقع ملتا تو اس سے اُسکے متبحر عالم ہونے میں شبہہ نہیں ہوسکتا۔ اُس نے اپنی اعمر ذمہ داری کے ساتھ عطا ابن یسار اور اپنے والد محمد ابن علی سے جس قدر روایتیں نقل کی ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں۔ منصور کے علمی تبحر کا اندازہ اُس واقعے سے ہوسکتا ہے جو اسے اپنے زمانہ خلافت میں پیش آیا۔ ہم اسے ناظرین کی تفریحِ طبع کی غرض سے تاریخ الخلفاء سے ذیل کی نقل کرتے ہیں:۔۔

تاریخ الخلفاء

ایک بار منصور سے کسی امیر نے دریافت کیا کہ دنیوی لذتوں میں سے اب بھی کوئی لذت باقی ہے جسکی آپ کو آرزو ہو؟ منصور نے کہا۔ ہاں! میری تمنا ہے کہ میں ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں اور چاروں طرف اصحاب حدیث کا حلقہ ہو اور لکھنے والا مجھ سے کہے (مَنْ ذَکَرْتَ رَحِمَکَ اللّٰہ) دوسرے دن اعوان سلطنت قلم دوات اور کاغذ لیکر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ احادیث لکھوائیے۔ منصور نے یہ سنکر کہا کہ تم اس جلیل القدر طبقہ میں نہیں ہو وہ لوگ غبار آلود اور اُنکے کپڑے میلے ہوتے ہیں اور انھیں آرائش جمال کی پروا نہیں ہوتی۔ اُنکا

مقصدِ حیات سیاحی اور صرف تحصیلِ حدیث ہوتا ہے"

رعایائے مملکت سے منصور کی بیعت اُسکے بھائی سفّاح خلیفۂ اول کے ایامِ حکومت ہی میں لے لی گئی تھی۔ منصور شجاع، مستقل الرائے، ہوشیار، پُر رعب، ادیب اور خوش کلام ہونے کے ساتھ ہی بخیل بھی تھا۔ اُسنے اپنے عہدِ حکمرانی میں بہت مال جمع کیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ منصور ذمہ دارانِ صیغۂ مال سے ایک ایک پائی کا حساب لے لیتا تھا۔ اگر خدا نخواستہ کچھ غبن ثابت ہوتا تو سزا دینے کے علاوہ روپیہ بھی وصول کر لیتا۔ چنانچہ جب بغداد کی عمارتیں تیار ہو چکیں اور اُنکی حساب فہمی کی گئی تو ایک داروغہ پر غبن ثابت ہوا۔ بغداد کی تعمیر میں جس قدر روپیہ صرف ہوا تھا اگر اُسکا اندازہ کیا جائے تو اُسکے مقابلہ میں یہ غبن قابلِ درگزر تھا لیکن منصور نے اُس سے روپیہ وصول کر لیا اور سزائے قید بھی دی۔

ایک روز منصور پھٹا کُرتا پہنے تھا۔ کسی نے کہا آپکی تیری بڑی شان ہے، تونے منصور کو خلیفۂ عالم بنا کر بھی فقیر ہی رکھا۔ منصور یہ سُن کر بہت خوش ہُوا، اور قریب تھا کہ کثرتِ سُرور سے مست ہو کر زمین پر گر پڑے۔ مصاحبوں نے فوراً تھام لیا۔ پھر منصور نے اُس شخص کو جس نے اُسے فقیر کہا تھا، آدھا درہم انعام دیا تو اُس نے کہا کہ میں نے ہشام بن عبدالملک سے ایک مرتبہ معمولی بات پر دس ہزار درہم انعام میں پائے تھے، اور آپ نے مجھے نصف درہم ہی دیا۔ منصور نے کہا کہ ہشام کو بیت المال سے اس قدر روپیہ صرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اور اپنے وزیر ربیع کو حکم دیا کہ اسکو حراست میں لیکر اُس سے کُل درہم وصول کر کے خزانۂ عامرہ میں داخل کر دیے جائیں۔ ربیع نے اُسی وقت بغرضِ امتثالِ امر اُسے حراست میں لے لیا، اور جب تک کُل مال وصول ہو کر خزانے میں پہنچ نہ گیا رہائی نہ دی۔

مگر حقیقتِ امر یہ ہے کہ منصور فطری طور پر بخیل نہ تھا۔ اُس میں عرب کا خون تھا۔ اور اُنکی طرح وہ بھی سخاوت سے رُکتا تھا۔ لیکن جس امر نے اُسے اِس جُزرَسی پر اُبھار ا تھا وہ ایک واقعہ تھا۔ جسے ابن عساکر نے اپنی کتاب اوائل میں لکھا ہے۔ اور ہم اُسے یہاں نقل کرتے ہیں :-

منصور خلیفہ ہونے سے پہلے تحصیلِ علم کے لیے سفر کر رہا تھا۔ جب ایک مقام پر پہنچا تو راہداروں نے روکا اور دو درہم مانگے۔ منصور کی زندگی اُسوقت طالب علمانہ تھی۔ اُسکے پاس اس قدر سرمایہ نہ تھا

کہ ہر جگہ فیاضی سے صرف کرسکتا۔ اور نہ اُسے اسکی اُمید تھی کہ خلافت اموی اُسکی دستگیری کریگی ناچار اُس نے اپنے اعزازی خاندان کو دستکاری کا ذریعہ نا[illegible] کیا۔ [illegible] ہوں۔ راہدار نے کہا دو درہم دو اور جاؤ۔ منصور نے دوبارہ کہا مجھے جانے دو میں حضرت ختم المرسلین کے چچا کی اولاد سے ہوں۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور درہم مانگے۔ منصور نے تیسری بار کہا کہ میں حافظ قرآن ہوں مجھے جانے دے۔ راہدار نے نہ مانا تو چوتھی دفعہ منصور نے کہا مجھے نحو میں فراہمی اور فقہ کا عالم ہوں۔ جب منصور تنگ ہوگیا تو راہدار کو دو درہم نذر کردیے اور اُسی وقت ارادہ کرلیا کہ میں پیسہ پیسہ اور کوڑی کوڑی جمع کروں گا۔ اہل دنیا کی نگاہیں اسبابِ دنیوی پر ہیں اور یہی کارآمد ہستی ہے۔ اس وقت تک کامیابی غیر ممکن ہے جب تک انسان مرفہ الحال نہ ہو۔ چنانچہ اُس نے اپنے ارادے کو قائم رکھا اور کوتاہ دستی اختیار کرکے خرچ کا معیار اس قدر گھٹا دیا کہ لوگ اُسے "ابوالدوانیق" کہنے لگے اور منصور اس کیفیت کے ساتھ بخل میں ضرب المثل بن گیا ۔

جب انسان مرفہ الحال اور دولتمند ہوتا ہے تو اُسے عطایائے خداوندی کی وہ قدر نہیں ہوتی جو اُنکے شایانِ شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اربابِ دولت صرف اس وجہ سے محتاج ہوگئے کہ اُنھوں نے قدرت کے عطیہ کی قدر نہ کی۔ اور اُسکو فضول مصرفوں میں ناعاقبت اندیشی سے پانی کی طرح بہا دیا۔ مَثَل مشہور ہے کہ "خرچ کرنے سے کُنوئیں بھی خالی ہوجاتے ہیں" دولت کہاں تک سہارا دیتی۔ محدود چیز تھی تمام ہوگئی۔ اور تمام ہونے کے ساتھ اپنے سرپرستوں کی ظاہری وجاہت کا بھی خاتمہ کرگئی۔ خدا کا شکر ہے منصور اس گروہ سے نہ تھا۔ اُسپر ایک زمانہ مصیبت کا بھی گزر چکا تھا۔ اُس نے محتاجی اور تہیدستی کی زحمتیں بھی برداشت کی تھیں۔ اور اب پوری طرح دنیا کے نشیب و فراز سے واقف ہو چکا تھا۔ لہذا اُس نے دولت جمع کرنے میں جن جن فوائد کو ملحوظ رکھا وہ حقیقی فائدے تھے۔

عبدالرحمٰن افریقی اور منصور دونوں ایک ہی اُستاد کے شاگرد تھے اور ہم سبق ہونے کی وجہ سے مدتوں دونوں کی یکجائی رہی۔ وہ منصور کے عہد مفلسی کا حال بیان کرتے ہیں جبکہ منصور کو یہ معلوم

بھی نہ تھا کہ دولتِ امویہ عباسیوں میں مستقل طور پر منتقل ہو جائے گی، اور ایک دن دنیا کی قسمت کا فیصلہ ان زبردست ہاتھوں میں ہوگا۔ منصور انھیں ایک مرتبہ اپنے مکان پر لے گیا۔ کھانے کا وقت تھا اس لیے منصور ایک خوان لایا اُس میں روکھی روٹیاں تھیں۔ منصور نے اپنی لونڈی سے کہا کہ اگر حلوا ہو تو لاؤ۔ اُس نے کہا کہ نہیں ہے۔ منصور نے کھجوریں مانگیں اتفاق سے وہ بھی نہ نکلیں تب اُس نے چت لیٹ کر یہ آیت پڑھی۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ   عنقریب خدا تمھارے دشمنوں کو ہلاک کرے گا۔

اس سے بھی قطع نظر کر لیجیے۔ تو دولتِ عباسیہ کو قائم ہوئے ابھی چند سال ہی گزرے تھے۔ نظامِ حکومت کا یہ بالکل صحیح اصول ہے کہ جب تک سلطنت کی مالی حالت درست نہ ہوگی وہ اجانب و اغیار کے حملوں کو نہ روک سکیگی، اور نہ اپنے حوائج کو پورا کر سکے گی۔ اور کوئی حکومت اُسوقت تک مستحکم و دیرپا نہیں کہی جا سکتی جب تک کہ اُسکا حصۂ مالی ضعیف ہو، یا اُسکے خزانوں میں زرِ نقد کی جگہ صرف اللہ کا فضل ہو۔ یہ بالکل درست ہے کہ منصور کو دمشق کے بیت المال سے بکثرت روپیہ ملا لیکن وہ اس قدر نہ تھا جو اتنی بڑی سلطنت کے لیے کفایت کر سکتا۔ جسکے مشرق میں دریائے سندھ اور مغرب میں اندلس ہو۔ اور جسکی شمالی حدود دیوارِ قسطنطنیہ سے ٹکرا رہی ہوں۔ جہاں ابھی گردن کشوں کے بکثرت گروہ موجود ہوں۔ اور اموی ہاشمی دشمن اپنے اپنے کاموں میں الگ الگ مشغول ہوں۔

منصور کی خون آشام تلوار نے گو افریقہ سے لیکر شام، مصر، خراسان وغیرہ میں تہلکہ مچا دیا تھا اور سیکڑوں ہوا خواہانِ اموی کو اُنکے آقاؤں کے ساتھ آبِ خنک سے سیراب کر دیا تھا۔ لیکن صداقت شعار اور صاف گو افراد کی زبانوں کی کیونکر روک تھام ہو سکتی تھی، جنھوں نے اموی دسترخوان پر مدتوں ذائقۂ لطف حاصل کیا تھا۔ اُنکے دلوں میں نہیں بلکہ اُنکی زبانوں پر مروانیوں کے تذکرے تھے اور اُنکی قدردانی یاد کرتے تھے۔ اور سر دُھنتے تھے۔ اگر یہ لوگ عباسیوں کے مداح اور طرفدار بن سکتے تھے، تو اُسکا یہی طریقہ تھا کہ اُنکو زر و مال اور بیش بہا عطایا سے سرفراز کیا جاتا۔ جسکی فلسفۂ حکومت کے موافق ابھی سلطنت میں قوت ہی نہ تھی۔ اسکے علاوہ منصور نے بغداد کی تعمیر کا نیا محکمہ قائم کر دیا تھا جسمیں

سالانہ آمدنی کا بڑا حصہ صرف ہوجاتا تھا۔ اسکے بعد جو کچھ باقی رہتا اُس سے سلطنت کی ضرورتیں رفع کیجاتیں ان امور پر لحاظ کرکے ہم کہ سکتے ہیں کہ منصور بخیل نہ تھا لیکن دُوراندیشی اور فلسفۂ سیاست کے رُو سے جزرسی ضرور کرتا تھا، اور ایک ایک درہم کا حساب سمجھنا مصالح ملکی پر موقوف تھا۔

منصور اپنے بخل کی داستانیں سُن چکا تھا اور اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ عوام نے مجھے بخل میں ضرب المثل بنا لیا ہے۔ چنانچہ ایامِ حج میں عرفات پر خطبہ (لکچر) دیتے ہوے اُس نے ظاہر کردیا کہ "قوم کی تمام نکتہ چینیوں کی مجھکو خبر پہنچ چکی ہے" اور ضمناً اُس نے اس کا بھی اعتراف کرلیا کہ "میری طرف سے جو کوتاہ دستی عمل میں آرہی ہے اُسکو میں خوب محسوس کرتا ہوں"۔ قوم کو اطمینان دلانے کے لیے جو تقریر اس موقع پر منصور نے کی تھی وہ ادبی اعتبار سے نہایت پُرلطف ہے، اُسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ منصور فصیح البیان بھی تھا۔ وہ تقریر یہ ہے:-

الحمد للّٰہ احمدہ واستعینہ واومن بہ واتوکل علیہ واشہد ان لاالٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہ یا ایہا الناس انما انا سلطان اللّٰہ فی ارضہ اسوسکم بتوفیقہ ورشدہ وخازنہ علیٰ فیئہ اقسمہ بارادتہ واعطیہ باذنہ وقد جعلنی اللّٰہ علیہ قفلاً اذا شاء ان یفتحنی فتحنی لاعطائکم و اذا شاء ان یقفلنی علیہ اقفلنی فارغبوا الی اللّٰہ ایہا الناس وسلوہ فی ہذا الیوم الشریف الذی وہب لکم فیہ من فضلہ ما اعلمکم فی کتابہ اذ یقول الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ ان یوفقنی للصواب ولیددنی للرشاد ویلہمنی الرافۃ بکم والاحسان الیکم ویفتحنی لاعطائکم وقسم ارزاقکم بالعدل فانہ سمیع مجیب۔

ترجمہ

میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں اور اُسی سے مدد چاہتا ہوں اور اُسی پر ایمان لاتا ہوں اور اُسی پر بھروسا کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے، کوئی اُسکا شریک نہیں۔ اے لوگو میں اللہ کی زمین پر اُسکی طرف سے بادشاہ ہوں، اُسکی رشادت اور توفیق سے تمھاری نگہبانی کرتا ہوں اور اُسی کے فَے (مالِ غنیمت) پر خازن ہوں، تقسیم کرتا ہوں مال کو اللہ کے ارادے سے

اور عطا کرتا ہوں اُسی کے حکم سے اور اللہ نے مجھے اُس مال پر قفل بنا دیا ہے، جب وہ مجھ (قفل) کو کھولنا چاہتا ہے کھول دیتا ہے تمھیں عطا کرنے کے لیے اور جب چاہتا ہے اُس مال پر مجھے روک دیتا ہے۔ اللہ کی طرف ہی رغبت کرو اور اُسی سے سوال کرو۔ آج ایسے مبارک دن میں کہ تمھیں اپنا فضل عطا کیا ہے تم میں کون زیادہ جاننے والا ہے اُسکی کتاب کو، وہ فرماتا ہے کہ "آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین پورا کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کی اور تمھارے دین اسلام کو میں نے پسند کیا" وہی مجھے نیک راہ کی توفیق دیتا ہے اور مہربانی کرنے کا الہام کرتا ہے اور میرے دستِ کرم و تیر کھول دیتا ہے کہ تیر عطا کروں اور زر تقسیم کروں انصاف کے ساتھ۔ وہ اللہ سننے والا قبول کرنے والا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ منصور نے اپنی ہیئت کے لیے تقریر کی مگر یہ تقریر رفع بدگمانی یا قوم کے خاطر خواہ تسلی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اُس نے جو لطیف پہلو اختیار کیا ہے وہ بالکل ممتاز ہے اور زمانہ کے رنگ کے موافق۔ اسکے علاوہ منصور نے اس تقریر میں اپنی قوم کے لوگوں کو اُنکے ایک بڑے عقیدے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اصلی فیاض خداوند کریم ہے، جو کچھ ہمیں ملتا ہے وہ اُسی کے خوانِ کرم سے۔ اور اگر کوئی کسی کو کچھ دیتا ہے تو اُسکا صرف اسی قدر احسان ہے کہ اُسکے وسیلہ سے ملا ورنہ وہ عطیہ فیاض ازل ہی کا دیا ہوا ہے۔ انسانی خصوصیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص دولت کا شیدا ہے اور ہرگز نہیں چاہتا کہ دولت مجھ سے زائل ہو جائے اور میری دولتمندی پر افلاس غالب آ جائے۔ انسان کو جو چیز عطا یا اور رحم کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ایک قوت ہے جو نفس سے تعلق رکھتی ہے اور اثراتِ علوی سے متاثر ہوتی ہے۔ انسان کو بطریق مجاز فیاض کہنا ممکن نہیں کیونکہ وہ فیاض بالواسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ منصور کا یہ قیمتی خیال کچھ عرصہ کے بعد تصوف کی شاندار عمارت کا ایک مضبوط ستون بن گیا۔ اسکے متعلق امام غزالی اور بہت سے صوفی شعار علماء نے بحثیں کی ہیں اور میں نے بھی اسکے متعلق ایک مضمون میں بہ تفصیل اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے۔

منصور نے سنہ ۱۳۶ ہجری میں زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی دولت عباسیہ کے دست و بازو

ابومسلم خراسانی کو اُسکی بیباکانہ دست اندازیوں کی وجہ سے قتل کر ڈالا۔ ابومسلم نے عظیم الشان دولت اموبہ کے مقابلہ میں خلافت عباسیہ کے قیام کے لیے جو جو کوششیں کیں وہ بظاہر قابل قدر تھیں اور ہرگز اسکی سزاوار نہ تھیں کہ اُسکے معاوضہ میں اُس کا خون بہایا جاتا۔ مگر اُسکے قتل کے اصلی اسباب تاریکی میں ہیں۔ مورخین کے اختلاف رائے کی بدولت اسوقت تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں کیجا سکتی، جب تک کسی خاص رائے کو ترجیح دینے کے اسباب موجود نہ ہوں۔

(باقی آیندہ)

مولوی ابوالحسن مرحوم

آہ وہ جگہ

(اپنے پرانے مسکن کی یاد)

جہاں پر میرا پیکر پہلے محوِ کامرانی تھا　　وہ مسکن غیر فانی تھا، وہ ملک جاودانی تھا
وہاں دخلِ قضا تھا اور نہ ذکرِ عمرِ فانی تھا　　حیاتِ جاوداں تھی اور لطفِ زندگانی تھا
صدائے ماتمِ پیری بھی آئی تھی نہ کانوں میں
عجب عالم تھا اک زندہ دلی کا نوجوانوں میں

نکلتا ہے جنازہ کیسے؟ ماتم کیسے ہوتا ہے؟　　لحد پر اہتمامِ نوحۂ غم کیسے ہوتا ہے؟
تہ و بالا تمناؤں کا عالم کیسے ہوتا ہے؟　　نشاط و عیش کا شیرازہ برہم کیسے ہوتا ہے؟
وہاں کے رہنے والوں میں نہ ان باتوں کے چرچے تھے
مدارات اور روحانی ملاقاتوں کے چرچے تھے

نہ آنسو غم کے بہتے تھے کسی کی چشمِ گریاں سے　　نہ اُٹھتا تھا دھواں دل کا کسی کی آہِ سوزاں سے
نہ کانٹے ہی اُلجھتے تھے کسی کے چاکِ داماں سے　　تعلق تھا نہ نشتر کو کسی کی شہ رگِ جاں سے
نہ مہجوروں کے دل میں صدمۂ اندوہِ فرقت تھا
نہ بیماروں کے لب پر شکوۂ رنجِ علالت تھا

گلوں کی تھیں فضائیں جوش پر فصلِ بہاراں تھی　　نسیمِ جانفزائے صبح ہر سو عنبر افشاں تھی
تبسم کی ادا اک ایک غنچہ سے نمایاں تھی　　کلی جو تھی چمن میں اک عروسِ گل بداماں تھی
ترو تازہ ہمیشہ تھے چمن، ذکرِ خزاں کیسا
شگفتہ ہر روش پر گل تھے کانٹوں کا نشاں کیسا

انوکھی تھی وہ دنیا اور نرالے کارخانے تھے　　گھروں میں جا بجا بجتے خوشی کے شادیانے تھے
کہیں تحسین کے نعرے تھے کہیں لب پر ترانے تھے　　زبانوں پر نشاط و عیش کے دلکش فسانے تھے
چہکتے طائرانِ قدس تھے ہر سو نشیمن میں
نسیمِ روح پرور چل رہی تھی صحنِ گلشن میں

ش

۱۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء

ایک خط

(جس کے متعلق فی الحال کوئی رائے ظاہر نہیں کی جاتی)

کرمی جناب ایڈیٹر صاحب رسالۂ الناظر

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ - دسمبر حال کا رسالۂ الناظر میں نے پڑھا - مقدمۂ فلسفۂ اجتماع، پڑھنے کے دَوران میں (صفحہ ۴۴ پر) وہ واقعہ نظر پڑا جو شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے رسالۂ امہات الامہ کے متعلق ہے - مجھ کو حیرت ہوئی کہ ایک فلسفہ کی کتاب میں واقعہ اس قدر بے تحقیق درج کیا گیا ہے - ظاہر ہے کہ جب واقعات صحیح نہ ہوں گے تو نتائج بھی غلط نکلیں گے - چونکہ میں اس واقعہ کا عینی شاہد ہوں اور اول سے آخر تک حصہ لینے والا میں تھا - نیز ایک ایسے نامور کی ذات پر حرف آتا ہے جو آج دنیا میں نہیں ہے - اس لیے میرا فرض ہے کہ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ قلمبند کر دوں تاکہ آیندہ غلطی سے اہل قلم محفوظ رہیں - اس سے پہلے بھی بعض مشہور نامہ نگار اس واقعہ کو ادیبانہ رنگ آمیزی سے لکھ چکے ہیں - مگر افسوس ہے کہ مورخانہ تحقیق اُنھیں بھی نہ تھی -

واقعہ یہ ہے کہ جب امہات الامہ شایع ہوئی تو اُسکے بعض مقامات پر نہ صرف علما بلکہ اہل نظر کو بھی سخت اعتراض تھا - اسی بنا پر بعض علما نے تکفیر مؤلف کے فتوے شائع کیے - اسپر شورش ہوئی جو کچھ ہوئی - اسکے بعد بعض اہل فہم کے سمجھانے سے مؤلف مرحوم کو اپنی غلطی پر تنبُّہ ہوا اور اُنھوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی جس کو اب میں واپس لیتا ہوں - اسی بنیاد پر اُنھوں نے تمام نسخے رسالۂ مذکور کے (جو اُنکے پاس موجود تھے) اُن صاحب کے سپرد کر دیے جن کے سامنے اعتراف کیا تھا - جو رسالے شائع ہو چکے تھے (اُن کی تعداد نوسَے تھی) اُنکی فہرست دیدی اور اپنی طرف سے اجازت دی کہ وہ خریداران سے

(اگر کہیں ہو تو) واپس لے لیے جائیں۔ یہ بھی خواہش کی کہ اُنکے اعتراف کا مسلمانوں کے کسی عام مجمع میں اعلان کیا جائے (مثلاً جمعہ کو جامع مسجد میں) اور تمام رسالے تلف کردیے۔ ابھی رسالے تلف نہ ہونے پائے تھے کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس سالانہ شہر دہلی میں ہونا قرار پایا۔ شمس العلماء مرحوم کی اُسوقت باصرار یہ خواہش ہوئی کہ ندوۃ العلماء میں جو علما تشریف لائیں اُنکے سامنے یہ معاملہ پیش ہوکر طے ہو اور علماے موصوف کی جانب سے یہ اعلان ہوکر رجوع کے بعد مؤلفِ رسالہ کے ذمہ کوئی الزام نہیں رہا۔ یہ واقعات میں نے معتمد ذریعہ سے سنے ہیں۔

بربناے خواہش بالا اجلاس ندوۃ العلماء کے خاتمہ پر مشہور علما کا ایک جلسہ کیا گیا۔ (یہاں سے واقعات میرے چشمدید ہیں) اُس میں معتمد شہادت پیش ہوئی کہ مولفِ رسالہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرکے مضامینِ رسالہ کو واپس لیا اور رسالے تلف کرنے کے واسطے حوالہ کردیے۔ یہ پیام سُن کر علماے حاضرین نے بالاتفاق (جہاں تک اب مجھکو یاد ہے) مؤلفِ رسالہ کی برأت لکھی اور طے کیا کہ اب اُنپر کوئی الزام نہیں۔ اس تحریر کے بعد شب کو تمام رسالے جلاکر تلف کردیے گئے۔ جلانے کے بعد آندھی آئی اور مینھ برسا۔ ہوا نے خاکستر کو اُڑا دیا اور پانی نے زمین دھوکر صاف کردی۔

جس مجمع علما میں براءت نامہ لکھا گیا اُس میں علامۂ شبلی مرحوم موجود نہ تھے نہ اُنکے دستخط برأت نامہ پر ہیں۔ نہ اُنھوں نے کتابوں کے تلف کرنے میں حصہ لیا۔

میں تیار ہوں کہ اگر کسی صاحب کو شک ہو تو معتبر شہادت سے واقعات بالا ثابت کردوں۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اگر مؤلف مرحوم رضامند نہ ہوتے تو رسالے کیوں حوالہ کردیتے۔

بیانِ بالا سے واضح ہوگیا ہوگا کہ علامۂ شبلی کے متعلق جو کمزوریاں مضمونِ الناظر میں ظاہر کی گئی ہیں اُن کا دامن اُن سے پاک تھا۔

نیازمند حبیب الرحمٰن شروانی

حسرت

اے نشاطِ دہر لیکر ساغر جم کیا کریں
زخم کو شرمندۂ احسانِ مرہم کیا کریں
لطف ملتا ہے جفاؤں میں کسی بیدرد کی
خوگر دردِ محبت ہیں تو ماتم کیا کریں

اشکِ غم رخسارۂ عاشق پہ ڈھلتے جائینگے
خوں شدہ دل کے یوہیں ارماں نکلتے جائینگے
بے وفاؤں سے اگر رکھیں گے امیدِ وفا
روز اُدھر سے ناوکِ دلدوز چلتے جائینگے

دیکھیے بیتابیِ دل کا تماشا دیکھیے
چہرے پر اک رنگ آتا ایک جاتا دیکھیے
دل ہمارا لے کے پھر محروم رکھتے ہیں ہمیں
گردشیں کیا کیا دکھاتا ہے زمانہ دیکھیے

روز اُنکی اک نہ اک ہم پر جفا ہوتی گئی
ضبطِ شیون سے اُدھر ثابت وفا ہوتی گئی
دم بخود ہم پاسِ الفت سے رہے تو کیا ہوا
اسپہ بھی ناآشنائی کچھ سوا ہوتی گئی

اپنی خاموشی ہی وجہ شدتِ بیداد ہے
اب ذرا چونکے جو ہم فریاد پر فریاد ہے
کون پوچھے اے اسیر دام تجھ پر کیا بنی
ہم تڑپتے ہیں قفس میں اور خوش صیاد ہے

قدسی جائسی

اسرارِ خودی

زمانۂ حال کے جدید مطبوعات میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے بی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا کے زورِ طبیعت نے اسرارِ خودی نامے مثنوی کے ذریعہ سے ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ یہ مثنوی ۲۶×۲۰/۱۶ کی تقطیع پر یونین اسٹیم پریس لاہور سے چھپ کر شایع ہوئی ہے۔ قابل مصنف نے مثنوی کا موضوع فلسفۂ عمل قرار دیکر مثنوی مولانائے معنوی کی بحر میں لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ مختلف عنوانوں سے فلسفۂ تصوف کے بالمقابل جدت طرازیاں کی ہیں اور قندِ پارسی کی گھلاوٹ ادائے مطالب کو اور زیادہ دلفریب بنانے میں کامیاب رہی ہے۔

آغاز کلام ایک مختصر سی نثر سے کیا گیا ہے جو نہ صرف دیباچۂ کتاب بلکہ ملخص بیان بھی ہے۔ اس دیباچہ میں اُنھوں نے دکھایا ہے کہ فلسفۂ طبیعات کے اُس پرشکوہ مسئلہ کو جس پر تکمیل انسانیت کا دارومدار ہے اور جس کا مفہوم کلی لفظ انا میں مجملاً نقش ہے مختلف اقوام کے حکمائے طبیعات والٰہیات نے کس کس طور پر تعبیر کی ہے۔ اور اقوام کے ارتقا پر اُن تعبیرات نے کس حد تک اثر ڈالا ہے۔

ہم اس موقع پر اس پہلو سے زیادہ بحث کرنی بضرورت خیال کرتے ہیں لیکن اس اعتراف پر ہم فاضل مصنف سے معافی چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اسلامیین میں سے فقط چند متصوفین کے مجتہدات پر قناعت کر لیتے ہیں وہ اگر محققین حکماء اسلام کے مصنفات پر زیادہ گہری نظر ڈالتے تو اُنھیں معلوم ہو جاتا کہ جس اجتہاد کا سہرا اُنھوں نے سری کرشن جی کے سر باندھا ہے، وہی اجتہاد اُس سے زیادہ روشن اُس سے زیادہ واضح اُس سے زیادہ قریب الفہم رازداران شریعتِ محمدیؐ کا سرمایۂ ناز رہا ہے۔

شاعرانہ اندازِ بیاں ایک جداگانہ چیز ہے۔ اُس سے قطع نظر کرنے پر صاف نظر آتا ہے کہ انا کا وہ جزوِ جامع جس کو متصوفین نے اپنی اصطلاح میں ما سوی اللہ کا لقب دے رکھا تھا

اور جسکو انکی جہاں سوز شرارہاے محبت کی لپک ہر دم خاک سیاہ کرنے پر ملیار رہا کرتی تھی اُسکے فنا کرنے کی حقیقی تعبیر بھی عدم دلبستگی سے زیادہ کچھ نہ تھی۔

یہ دیباچہ ۲۲ صفحے تک پہنچکر ختم ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد اصل مثنوی اُس نظم سے شروع ہوتی ہے جو بطور پیشکش فخر قوم آنریبل سر سیّد علی امام کی طرف منسوب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس دردمند دل کے تقاضہ سے قوم کے چونکانے کے لیے یہ خونِ جگر کھایا تھا حقیقت میں اُسکے انتساب کے لیے بھی کسی ایسے ہی دردمند بزرگِ ملت اور عظیم القدر شخصیت کی ضرورت تھی۔ سر سید علی امام کے نام نامی سے اس مثنوی کا معنون کرنا بالکل حق بجانب ہے ڈاکٹر صاحب اس بزرگ سیّد کی شان میں کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں ؎

آشناے معنیِ بیگانۂ جلوۂ شمع مرا پروانۂ

پیشکش کے بعد تمہید اور تمہید کے بعد مقدمہ عنوان قائم کرکے ہر ایک پہلو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نظام عالم خودی پر منحصر ہے۔ پیرایۂ استدلال تمثیلی جیسا کہ عموماً مواعظ و تنبیہات کا ہوا کرتا ہے اس مثنوی کا بھی ہے۔ باقی رہی اُسکی شاعرانہ حیثیت، سو ڈاکٹر صاحب کے ذوقِ سلیم اور طبیعت داری میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے زمانۂ حال کے مذاق پر اُردو نظم کے ذریعہ سے جس قدر قوم کی خدمت کی ہے ظاہر ہے۔ اُن کی شوخیِ طبیعت نے پہلے سے اہلِ ملک کو اُن کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اور اب تو اُنکے توسنِ فکر نے کسی دوسرے ہی عالم کو اپنا جولان گاہ بنانا چاہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح کی دلپذیر نظموں سے قوم کو فرسودہ خیالات کی بیڑیوں سے آزاد کرکے حکمت عملی کا دلدادہ بنائیں۔ خدا اُنکی مدد کرے اور قوم و ملک کو توفیق قبول عطا فرمائے۔

ہم کو اس سے پیشتر فارسی زبان پر ڈاکٹر صاحب کی قادر الکلامی کا کوئی بیّن ثبوت نہیں ملا تھا، اس مثنوی کی برجستگیِ بیان و بے تکلفیِ زبان نے ثابت کر دیا کہ انکو فارسی پر بھی اُسی طرح اور اُسی قدر قدرت حاصل ہے جس قدر کہ اُردو پر۔

ایک مقام پر جس کی سرخی ہے کہ "خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد" وہ کہتے ہیں

نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی است | زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پاینده تر | زنده تر سوزنده تر تابنده تر

آگے چل کر ؎

از نگاهِ عشق خارا شق شود | عشقِ حق آخر سراپا حق شود
عاشقی آموز و محبوبی طلب | چشمِ نوحی قلبِ ایوبی طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے | بوسه زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را همچو رومی بر فروز | روم را در آتشِ تبریز سوز
هست معشوقے نهان اندر دلت | چشم اگر داری بیا بنمائمت
عاشقانِ او ز خوبان خوب تر | از حسینانِ جهان محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا می شود | خاک همدوشِ ثریا می شود
خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد | آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است | آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ است
طور موجے از غبارِ خانه اش | کعبه را بیت الحرم کاشانه اش

پھر اسی نعتیہ سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں ؎

ماند شبها چشمِ او محرومِ نوم | تا بتختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ هیجا تیغِ او آهن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در نگاهِ او یکے بالا و پست | با غلامِ خویش بر یک خوان نشست

پھر آگے چل کر ؎

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت | آتشِ او این خس و خاشاک سوخت

اسکے بعد کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں ؎

ہستیِ مسلم تجلی گاہِ او　　طورہا بالا زگردِ راہِ او

پھر کہتے ہیں ؎

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است　　اے خنک شہرے کہ دروے دلبر است

پھر بطور ختم کلام کہتے ہیں ؎

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست　　جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

ہم یہ مختصر سا انتخاب مشتے نمونہ از خروارے کے طریق پر ہدیۂ ناظرین کرکے تہ دل سے دادِ سخن دیتے ہیں۔ دردمندان قوم پر اس مثنوی کا مطالعہ واجب ہے۔

جہاز کا کپتان ایک ناپیداکنار اور ذخار سمندر میں جہاز کو لیے ہوئے جا رہا ہے۔ طوفانی ہوا کا زور ہے اور سمندر میں جوش ہے۔ دن کو قطب نما پر اور شب کو تاروں پر نظر ہے۔ رات کا وقت ہے ابر آسمان پر چھا جاتا ہے اور تارے چھپ جاتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ لیکن کپتان ان مشکلات اور خطرناک حالتوں میں جہاز کی رفتار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اُسکو جہاز پر پورا قابو حاصل ہے اور وہ اپنے فن میں کامل مہارت رکھتا ہے۔ بیشک آدمی کے لیے یہ نہایت کمال کا کام ہے کہ وہ کسی کام پر قابو یا اختیار رکھے۔

نواب سلطان جہاں بیگم

غزلیات

دشمن کو مئے لطف یہ سرشار نہ کردے | کمظرف ترے عشق کا اظہار نہ کردے
خاموش کہ یہ نغمہ سرائی تری بلبل | صیاد کے پنجے میں گرفتار نہ کردے
کہنے کو بھی ہیں حضرتِ دل اپنی تمنا | ڈرتے بھی ہیں وہ بت کہیں انکار نہ کردے
اب تک ہے نہاں رازِ محبت مرے دل میں | ڈر ہے نگہِ شوق خبردار نہ کردے

مجنوں کی طرح عشق جنوں خیز کسی کا
آسط تجھے رسوا سرِ بازار نہ کردے

برملا کہتے ہیں ہم صاف طبیعت والے | تم ستمگر سہی لیکن ہو محبت والے
سب پہ ہے رشتۂ الفت کی نزاکت غالب | عشق کے سامنے آئیں تو نزاکت والے
میں بھی سمجھوں کہ میں دنیا میں نہیں ہوں تنہا | اک نگاہِ کرم اور رافت و رحمت والے
یاد رکھنے کے ہیں قابل یہ بیانِ خاموش | بیزبانی سے جو کہہ جاتے ہیں تربت والے

اے انا البرق میں قائل ہوں بقولِ تسبیل
شوخ سیرت بھی ہوا کرتے ہیں صورت والے

درد کی لذت میں کوئی محو مجھسا بھی نہ ہو | زخمِ دل میں اور دعا یہ ہے کہ اچھا بھی نہ ہو
وہ دکھا جاتے ہیں بھولے سے کبھی اپنی جھلک | اور اسیر چاہتے ہیں یہ کہ اتنا بھی نہ ہو
بسملوں کے بس میں کچھ تو ہے تڑپنا لوٹنا | بےبسی کو دیکھیے اُسکی جو تڑپا بھی نہ ہو
لذتِ دردِ نہاں کچھ اُسکے دل سے پوچھیے | زخم بھی ہو جسکے دل میں اُس پہ چھالا بھی نہ ہو
سیلِ اشک اپنے بہا لیجائیں گے سارا جہاں | ہم نہ ہونگے تو نہ ہوں لیکن یہ دنیا بھی نہ ہو

خوف ہر ظالم کو ہے اس نالہ کی تاثیر سے   ضبط سے جو تا لبِ مظلوم آیا بھی نہ ہو

انوری مر مر کے جیتا ہے ہزاروں بار روز
جیسا یہ عاشق ہے تیرا کوئی ایسا بھی نہ ہو

پیرِ عشق رہنما نہ ہوا   زاہد خشک با خدا نہ ہوا
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا   میں وفا دار تھا خفا نہ ہوا
کون لاتا ترے عتاب کی تاب   خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا
عشق یا حسن کون ہے غالب   آج تک اس کا فیصلہ نہ ہوا
خلشِ خارِ عشق مٹ نہ سکی   چارۂ جانِ مبتلا نہ ہوا
بڑھ گیا اور بھی تغافلِ حسن   نالۂ عشق نارسا نہ ہوا
لطفِ ساقی تھا بیدریغ مگر   مجھ بلا نوش کا بھلا نہ ہوا
اُس پہ آسائشِ بقا ہے حرام   جو تری راہ میں فنا نہ ہوا
چھڑ گئی جب جمالِ یار کی بات   ختم تا دیر سلسلا نہ ہوا
جسم سے روح ہو گئی آزاد   لفظ معنی سے گو جدا نہ ہوا
حسن بے مہر نے یہ کچھ نہ کیا   مونسِ عشق بینوا نہ ہوا
راحتِ جانِ عاشقاں نہ ہوئی   تجھ سے اتنا بھی اے قضا نہ ہوا
ہجر میں جانِ مضطرب کو سکوں   آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا
رہ گئی تیرے فقرِ عشق کی شرم   میں جو محتاجِ اغنیا نہ ہوا

عشق حسرت کے سب ہوے قائل
ایک وہ دشمنِ وفا نہ ہوا

نظرے خوش گزرے

الناظر کی یہ خصوصیت کہ وہ ہمیشہ وقت معینہ پر شایع ہوتا رہا ہے ایک ایسا امتیاز ہے کہ کہ اُسے ہاتھ سے جانے دینا کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن زمانہ اس قدر پُرحوادث اور انسان ان کے مقابلہ میں اُسی قدر معذور و مجبور ہے کہ بسا اوقات اُسکے تمام ارادے۔ کوششیں اور تمنائیں خاک میں مل جاتی ہیں اور وہ سوائے اسکے کہ مُنھ تکتا رہے اور ان نیرنگیوں کا ازراہِ حیرت نظارہ کرتا رہے کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس دفعہ الناظر کے بدیر شایع ہونے کے لیے بھی اسی قسم کے اتفاقات و اسباب جمع ہو گئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دسمبر نمبر کیلیے نظرے خوش گزرے لکھ کر جو خاکسار ظفر الملک بستر علالت سے ہم کنار ہوا تو آج تک پوری صحت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم اس علالت کا الناظر پر کچھ اثر نہ پڑتا جیسا کہ اس سے پیشتر ہماری سخت سے سخت علالت کے زمانہ میں بھی نہیں پڑا اگر بدقسمتی سے ایک ایسا اتفاق مخالف پیش آ گیا جسنے تعویق اشاعت کو ناگزیر بنا دیا یعنی یہ کہ محکمۂ ڈاکخانہ میں رسالہ کی رجسٹری کی ہر سال تجدید کرانا ہوتی ہے جسکے لیے قواعدِ ڈاکخانہ کے رُو سے ختم سال سے کم از کم تین ہفتہ قبل درخواست بھیجی جانا چاہیے۔ سالہائے پیشین میں ہمیشہ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں یہ درخواست جایا کرتی تھی اور تجدید ہو جایا کرتی تھی۔ اب کے دفعہ یہ زمانہ ہماری علالت کے شدائد کا تھا۔ جب کہ سر و پا تک کا ہمیں ہوش نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انقضائے میعاد کی وجہ سے قانون مطابع مجریہ ۱۹۱۰ء کی رُو سے مجسٹریٹ ضلع کی ایک تصدیقی تحریر اس مضمون کی حاصل کرنا پڑی کہ رسالہ ہذا ضمانت سے مستثنیٰ ہے۔ اس تحریر کے حاصل کرنے میں بھی اس سبب سے ضرورت سے زیادہ دیر ہوئی کہ یہ زمانہ حکام کے دورہ کرنے کا ہے اور ہمارے ضلع کے مجسٹریٹ صاحب بھی برابر دورے پر ہیں۔ جسکی وجہ سے ہماری درخواست کو اکثر حصص ضلع کی سیاحت کرنے کے بعد کہیں شرفِ قبول حاصل ہوا۔

ان ہی ناموافق اسباب کی بدولت الناظر اس قدر تاخیر کے بعد شایع ہوتا ہے اکثر ناظرین کرام نے اس عرصہ میں عدم وصول رسالہ کی شکایتیں لکھیں۔ بعض نے اسے الناظر کی ناگہانی موت پر محمول کیا۔ بہر حال ان سب صاحبوں کی خدمت میں ہماری ندامت عذرخواہی کے ساتھ رسالہ حاضر ہوتا ہے جس سے امید ہے کہ تمام ناراضی و بد گمانی رفع ہو جائیگی۔ فروری کا الناظر انشاء اللہ پہلے ہی عشرہ میں روانہ کر دیا جائے گا پھر آیندہ حسب معمول سابق پہلی تاریخ کو پرچہ شایع ہوتا رہے گا۔

خاکسار کی صحت ابتک خراب ہے۔ مرض اگرچہ خدا کے فضل و کرم سے کلیتاً زائل ہو چکا مگر ضعف سے اعصاب و دماغ ہنوز متاثر ہیں۔ تاہم احباب و بہی خواہان الناظر مطمئن رہیں کہ ابھی زیست کے دن باقی ہیں۔ اور جبتک زندگی ہے خدا نے چاہا تو خدمت کے لیے کمر بندھی رہے گی۔ ناحسان شناسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم اپنے شہر کے طبیب نامور حکیم محمد عبد الحمید صاحب خلف اصغر جناب حکیم عبد العزیز صاحب مرحوم و مغفور (جنکی خاندانی حذاقت تمام اقطاع ہند میں شہرت رکھتی اور ہماری ثنا و صفت سے مستغنی ہے) کا شکریہ نہ ادا کریں کہ انکی دلی توجہ اور حقیقی حذاقت نے بالکل مسیحانہ طور پر اس سخت علالت سے ہمیں نجات دی ہے۔ حکیم صاحب موصوف علاوہ ایک اعلیٰ درجہ اور کثیر المرجوع طبیب ہونے کے فن سرجری (عمل بالید) میں مہارت تام رکھتے ہیں۔ اور چونکہ علاج چشم کی طرف آپ کو خاص توجہ رہی اور اسکے متعلق آپ نے اکثر ماہرین فن سے استفادہ کیا اور انکے ساتھ رہ کر تجربات حاصل کیے۔ اسلیے شفاخانہ تکمیل الطب کے اُن تمام مریضوں کی دیکھ بھال جنکا علاج عمل بالید کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور آنکھوں کے تمام امراض کے بیماروں کا علاج آپ ہی کے زیر نگرانی ہے۔ اس سے آپکی عدیم الفرصتی ظاہر ہے۔ لیکن اسکے باوجود آپ نے جس لطف کرم اور توجہ و عنایت سے خاکسار کا علاج فرمایا وہ حد درجہ قابل تشکر و امتنان ہے۔

ہماری دلی دعا میں امید ہے کہ احباب و مخلصین اور تمام ناظرین الناظر بدل شریک ہونگے کہ خداوند جل و علا حکیم عبد الحمید صاحب کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے اور انکی ذات بابرکات سے جو فیض نوع انسانی کو پہنچ رہا ہے

قوت مردمی کے لیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ ہو گئے ہوں تو آخر میں ایکبار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ آتنگ نگرہ گولیوں کا استعمال فرمائیں اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں گئی ہوئی اور ہاتھوں سے کھوئی ہوئی طاقت از سرِ نو عود نہ کرآئیں تو ہمارا ذمہ۔ صاحبو اسکے باب میں زمانہ کے سرز اصحاب تعریف فرما رہے ہیں لاکھوں کی تعداد میں سرٹفکیٹ موجود ہیں مردوں اور عورتوں کو دونوں کو مفید ہیں اور نباتات سے مرکب۔ قیمت بھی بہت کم ہے صرف فی بکس تیس گولیوں کا ایک روپیہ آزمایش شرط ہے۔ یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپے کی دوا زیادہ ملے گی۔ پتہ

ویدشاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

ایجنٹ امیر چند وزیر چند عطار۔ کناری بازار۔ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۴ یکم فروری سنہ ۱۹۱۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۴ — یکم فروری ۱۹۱۶ء

تعلقاتِ زن و شو کی نشو و نما

(یونان و روم کی تاریخ سے)

تہذیبِ حال کی بنیاد یونانِ قدیم اور رُوم نے ڈالی۔ علم ادب۔ فنون لطیفہ۔ اور قانون انھیں کی بدولت ظہور میں آئے۔ ہومر اور کونسٹین ٹائن کے درمیانی زمانہ میں طریقۂ اِزدِواج میں بہت سے تغیر واقع ہوے۔ لیکن اہل یونان زن و شو کے موجودہ باہمی الفت اور وفاداری کے نقطہ خیال تک پہونچنے سے محروم رہے۔ تاہم اُنھوں نے اپنے وحشی ہمسایوں میں احساس پیدا کر دکھایا کہ اِزدِواج اور تمدن لازم ملزوم ہیں اور عفت و عصمت نہایت بیش بہا صفت ہے جو عورات کو پردے میں رکھنے سے یقینی طور پر محفوظ رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ آجکل مشرقی ممالک میں رواج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات شادی میں محبت کو کم دخل دیا جاتا تھا۔ کیونکہ زن و شو کی محبت کی چند مثالیں جو ہم تک پہونچی ہیں عام کلیہ کا حکم نہیں رکھتیں۔ بیوی کی ہستی کا مقصود محض رعایا کی تعداد میں اضافہ تھا۔ سُوسائٹی نے ہر طرح کی قدر و منزلت کسبیوں کیلیے مخصوص کر رکھی تھی۔ عین زمانۂ عروج میں ایتھنز کا یہ حال تھا کہ وہاں کی جاہ طلب عورتیں حصولِ شہرت

کے لیے کسب اختیار کرتی تھیں اور شادی کو تمدنی غلامی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کسی عورت فلسفی کی مشیر ہوتی تھی اور اسی کا حُسنِ گُفتگو سوز شاعر اور صناع دونوں کے لیے ذخیرہ تخیل بہم پہونچاتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ میاں بیوی میں جو باہمی الفت اور محبت ہماری موجودہ زندگی میں پائی جاتی ہے وہ اُس زمانہ میں ایتھنز میں مفقود تھی۔ اور یونانی علم ادب میں اسکی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر ہومر کی[1] Penelope کو دیکھو۔ جو وجیہ اور شان دار عورت ہے اور اپنے خاوند کی بست سالہ غیبت میں اُسی کی محبت کا دم بھرتی رہتی ہے۔ لیکن ویسے دیکھو تو گرمجوشی سے مبرا اور محبہ صفت ہے۔ جب یُولی سِس وطن کو لَوٹتا ہے تو اُسکی واپسی پر گھر میں محبت یا اخلاص کا کوئی خاص اظہار نہیں ہوتا۔ Penelope اسکو دیکھ کر از خود رفتہ نہیں ہو جاتی۔ گم گشتہ خاوند کا استقبال ایک محکوم کی حیثیت سے کرتی ہے اور اسی پر اُسکا فرض منصبی ختم ہو جاتا ہے۔ خیال تو کیجیے زمانۂ حال کا شاعر بچھڑوں کو کس طرح ملاتا ہے۔ کس وفورِ محبت اور اشکوں کے ساتھ دو مفارقت زدہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔

ایس کلس[2] شاعر جذبۂ محبت کو طبع آزمائی کے لائق نہیں سمجھتا وہی اولاد کی کثرت اسکے نزدیک بھی قابلِ تحسین ہے۔ اس کے اشخاص (کیرکٹر) جذبۂ محبت سے بیخبر ہیں اور اسکا نام تک نہیں لیتے۔ سوفوکلیس بھی اسی سخت اصول کا مؤید ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہیمون Haemon اپنی کو Antigone کی قبر پر جان دیتا ہے لیکن اسکی گزشتہ ہرزہ سرائی سے اس امر کا پتہ چلانا دشوار ہے کہ اسکو اس بیرونِ سے محبت تھی یا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب اسکا باپ اسکو عورت کا غلام

---

[1] Ulysses کی بیوی ہے جو جنگ زائی کے مشہور نبرد آزماؤں میں سے ہے ایک عرصۂ دراز تک آوارہ و سرگرداں رہا۔ اسکی غیبت میں اسکی بیوی نے ایک شخص سے اس شرط پر شادی کا وعدہ کیا تھا کہ جب میں ایک کپڑا بُن چکونگی تو شادی کرونگی۔ دن میں کپڑا بُنتی تھی اور رات کو سب اُدھیڑ ڈالتی تھی اسی طرح بیس سال گزر گئے۔ چونکہ آخر دم تک خاوند سے لو لگائے رہی اس لیے اُسکی وفا کا صلہ خاوند کی واپسی کی صورت میں مل گیا۔

[2] یونانی شاعر گزرا ہے۔ سپاہی بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ اسنے ستر ٹریجڈی لکھی لیکن اب صرف سات ملتی ہیں۔ اسکو یونانی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ہونے کا طعنہ دیتا ہے تو وہ اس کنایہ کو توہین سمجھ کر اسکی سخت مخالفت کرتا ہے Racine اور قدیم شعرا میں کس قدر بین فرق نظر آتا ہے۔ اسکا ہیرو ایکلیس Achilles جب Iphigenia کی حمایت میں لب کھولتا ہے تو بالکل دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ اور یونانی شعرا کے اختلاف کا اور زیادہ ثبوت چاہو تو سوفوکلیس کی تصنیف، اینٹی گون کا مقابلہ، شلر کی تصنیف Kabale und Liebe سے کرو۔ فرڈنینڈ اور لوئی، ہیمون اور اینٹی گون کی طرح ساتھ ہی جان دیتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ یونانی ہیرو علم سیاست پر گفتگو کرتا ہے تو خود رائے جرمن عاشق محبت کے حقوق کی حمایت کرتا ہے۔ فرڈنینڈ کہتا ہے "اے باپ میرا ایک گوشۂ دل ہے جہاں تیرے اختیار و اقتدار کی دسترس نہیں۔ اس گوشہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ کر" پھر لوئی کی موت کے بعد اپنے باپ کو اسکی لاش پر لیجاتا ہے اور بے اختیار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) ڈرامے کا باپ کہتے ہیں۔ مسیح سے ۴۵۶ برس پیشتر اسکی وفات ہوئی۔

۵۳ یہ بھی ایک یونانی شاعر تھا۔ ۴۹۶ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۰۶ قبل مسیح میں مرگیا۔ اسکی ٹریجڈیز آج تک دنیا میں زندہ مانی گئی ہیں۔ اسوقت جو کلام ملتا ہے وہ اصلی کلام کے دسویں حصہ سے بھی کم ہے۔

۵۴ ایڈی پس کی بیٹی تھی۔ فرائض اولاد کی مجسم تصویر ہے۔ کری اون نے اسکے باپ کی سلطنت غصب کرلی۔ اسکے بھائی کی لاش کو بے گور و کفن رہنے دیا۔ اسنے اسکو دفن کیا تو اسپر سزائے موت کا حکم صادر ہوا۔ لیکن اس نے آپ ہی خودکشی کرلی۔

۵۵ ۱۶۳۹ء سے ۱۶۹۹ء تک۔ لوئی چہاردہم بادشاہ فرانس کے دربار میں شاعر تھا۔ جذبۂ محبت کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھاتا ہے۔ فیڈری اور اتھیلی دو نہایت نفیس ٹریجڈیز اسی کی تصنیف سے ہیں۔

۵۶ اگے ممنن کی بیٹی تھی۔ اور آرٹمس یعنی ڈائنا (جسکو چاند کی دیوی بھی کہتے ہیں) کی راہبہ تھی۔ یوری پڈیز کے دو ڈراموں کی ہیروئن ہے۔

۵۷ جنگ ٹرائے کا سب سے بہادر نبرد آزما تھا۔ اسکی ماں تھیٹس نے اسے دریائے سٹاکس میں نہلا کر ایسا بنا دیا تھا کہ کوئی ہتھیار اسپر کارگر نہیں ہوتا تھا، صرف ایڑی باقی رہگئی تھی جہاں پیرس نے تیر لگا کر اسکو جنگ میں مار ڈالا۔

۵۸ داعیان تہذیب جرمنوں میں ایک شاعر اٹھارہویں صدی میں گزرا ہے۔ ولیم ٹل اسکی مشہور ٹریجڈی ہے اور تاریخ پر بھی دو ایک کتابیں لکھی ہیں۔

چیخ اٹھتا ہے "اے وحشی دیکھ، اپنے ظلم کے نتائج سے دلجمعی حاصل کر، موت نے اس چہرے پر تیرا نام تحریر کر دیا ہے۔ اور تباہی کے فرشتے اسکو یقیناً پڑھیں گے۔ اے کاش ایسی شکل تیری قبر کے پہلو میں کھڑی ہو جبکہ تو اس سے باہر نکلے اور جب خدا تخت عدالت پر بیٹھے تو وہی شکل اسکے دست راست کی جانب ہو" زمانہ قدیم کا کوئی شخص باپ کو اس طرح مخاطب نہیں کرتا۔

اہل یونان کی ٹریجڈی میں محبت کو بیرحم نوشتۂ تقدیر مانا گیا ہے۔ جذبہ کی صورت میں متاہلانہ زندگی کی ابتدا کرنا ممنوع ہے۔ ساتھ ہی عورت کی حیا کا بھی پاس نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ زمانۂ حال کا عام احساس چاہتا ہے۔ یوری پڈیز[۱] Euripides اور ریسین دونوں نے اینڈرومیکی[۲] Andromache کے قصہ کو اپنے اپنے زمانہ کے نقطۂ خیال سے لکھا ہے۔ یونانی شاعر اپنی ہیروان کی مادرانہ محبت کے اظہار پر ہی اکتفا کرتا ہے اور اسکے دوسرے خصائل کو قطعاً نظر انداز کر دیتا ہے جو اسکے صنف نازک سے ہونے کے باعث قابل بیان ہیں۔ اسکا شریف خاوند ہکٹر[۳] Hector ہنگام جدال یونانیوں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اسلیے وہ پائرس[۴] Pyrrhus کی کنیز بنتی ہے اسکے پہلے درجہ اور امتیاز پر توجہ نہیں کیجاتی۔ برخلاف اسکے وہ ذلیل ترین اقسام کا کام کرتی ہے۔ اور اپنے حارث کی شریک بستر بھی ہوتی ہے۔ اسکی یہ درگت نہ صرف یونانی خیال کے نزدیک خوشگوار ہے بلکہ تہذیب روما بھی اسکو جائز قرار دیتی ہے۔ کیونکہ

ف۱ ۴۸۰ ق م سے ۴۰۶ ق م تک یہ تیسرا یونانی شاعر ہے جو ٹریجڈی کیلیے مشہور ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایس کلیس اور سوفوکلیس کے تخیل میں جنگ جدال اور بہادری نمایاں ہیں یوری پڈیز زیادہ درد بھرا دل رکھتا ہے اور اسیوجہ سے اسکا کلام بہت پُر اثر ہے اسکے ۸۰ ڈراموں میں سے صرف ۱۸ ملتے ہیں۔

ف۲ ہکٹر کی بیوی تھی اور ایلیڈ میں نفیس ترین الفاظ میں اسکی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یوری پڈیز اور ریسین کی مقبول ہیروان ہے۔

ف۳ پرام بادشاہ ٹرائے کا بیٹا جو اہل ٹرائے میں سب سے بہادر آدمی تھا۔ جب تک یہ زندہ رہا اہل ٹرائے کا پلّہ بھاری رہا۔ ایکلیس نے اسکو قتل کرکے اسکی لاش کو شہر میں گھسیٹا اور اپنی فتحمندی کی خوشی منائی۔

ف۴ یونان میں مملکت ایپرس کا بادشاہ تھا اسکا سن پیدائش ۳۱۸ ق م ہے اور سن وفات ۲۷۲ ق م۔ اسنے اہل اطالیہ پر چڑھائی کی اور اپنے ہاتھیوں کی مدد سے زبردست فتح پائی دوسری مرتبہ اسے شکست فاش ہوئی پھر مقدونیہ پر حملہ کیا۔ اور اسے فتح کیا سپارٹا کی جنگ میں ایک عورت نے

درجل یوری پڈیز کے خیالات سے اتفاق کرتا ہے۔ اور پاُرس کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ وہ اینڈرومیکی کو اپنے ایک غلام سے بیاہ دیتا ہے جس کا نام ہیلی نس Helenus ہے اور رشتہ میں ہکڑ کا بھائی ہے۔

جائے غور ہے کہ ایک عالی مرتبت خاتون کے ساتھ ایسا حقارت آمیز سلوک ہوتا ہے، اور اہل یونان و روم دونوں میں سے کوئی بھی اسکے برخلاف ایک لفظ اعتراض کے طور پر نہیں کہتے رسے سین دوسرا پہلو اختیار کرتا ہے۔ اسکی اینڈرومیکی باوجود اسیری عزت اور احترام سے رہتی ہے پاُرس اس پر فدا ہے۔ لیکن اسکی توجہات سے ادب اور حزم آشکارا ہے اور وہ اسکے حباسِ عفت کو رنجیدہ کرنے سے خائف ہے۔ اہل فرانس کے خیال کے مطابق پاُرس کا یہ طرز سلوک بالکل قدرتی ہے۔ اگر رسے سین یونانیوں کے طریقہ پر کاربند ہوتا اور پاُرس کو اپنے قیدی پر مالکانہ حقوق استعمال کرتے ہوئے دکھاتا تو اسکے ناظرین میں غصہ کا ایک طوفان بپا ہو جاتا۔ اہل یونان کی صنف نازک کی طرف سے لاپروا رہنے کی اور مثال ان کے جذبۂ رشک کی تفہیم میں پائی جاتی ہے۔ کسی قوم میں رشک یا رقابت کا ترقی کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنی عورات کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ رشک یا رقابت سے ہماری مراد وہ رشک یا رقابت نہیں جو ادنیٰ حیوانوں کو اپنی مادہ کے حصول کے لیے جنگ و جدل پر آمادہ کر دیتی ہے، بلکہ وہ عالی احساس ہے جو عورت کی عزت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس قسم کی رقابت یا رشک غایت درجے کی ادنیٰ اقوام میں بالکل مفقود ہے۔ جب زنجیر در۔ سلاخ۔ برقعہ اور پردے کی سخت پابندی طبقۂ اناث کی نیکی کے محافظ ہوتے ہیں تو ضرور کچھ نہ کچھ ترقی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات صرف اعلیٰ درجے کی مہذب اقوام میں پائی جاتی ہے کہ مرد عورت کی وفاداری کے جویا ہوتے ہیں اور ساتھ ہی انکے احساس فرض پر اعتماد رکھتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی عورات پر جو اعتماد کیا جاتا ہے اور جبکا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتی ہیں وہ جائز ہوتا ہے۔ لطف و عنایات اور دیگر صفاتِ حمیدہ کی طرح عفت و عصمت بھی فلسفہ کی دو شاخوں کا مبحث ہے۔ طریق فطری Intuitive System کے پیرو تو اسکو نیک و بد کی قدرتی ادراک

Utilita
کا نتیجہ بتانے ہیں جو طبقۂ اناث کی فطرت میں جاگزیں ہے۔ گروہِ استفادی یعنی پیروانِ Utilitarianism اسی صفت کو انسان کی عاقبت اندیشی سے منسوب کرتا ہے۔ ایسے مسائل پر زمانۂ حال کے مسئلۂ ارتقا نے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ طریق فطری اور استفادی دونوں نے حق کا کچھ حصہ ضرور سمجھا ہے۔ جن اقوام میں تہذیب درجۂ کمال کو پہونچ چکی ہے اُنکی عورات میں عفت کا احساس لازمۂ طبیعت ہو گیا ہے۔ اسکی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسی اصولِ دیانت داری کی۔ جو پابندِ قانون اقوام میں جزوِ طبیعت بنگیا ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجیے کہ اصول عفت نے بھی جگہ پکڑلی ہے۔ یہ دونوں صفات یعنی دیانتداری اور عفت ملکیت کے خیال کے ساتھ ترقی کرتی ہیں۔ جب مردوں میں اخلاف کو جانشیں بنانے اور اپنی املاک سپرد کرنے کی خواہش ترقی پاتی ہے تو وہ عورات سے طالبِ عفت ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے طبقۂ ذکور عورات کی بدچلنی پر بے حد سخت گیر چلا آتا ہے۔ بسا اوقات اس جُرم کی سزا موت ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے یہ بالکل نیا یا یوں کہیے کہ عالمانہ خیال ہے کہ مردوں کو بھی بیوفائی کی سزا ملنی چاہیے۔ اس مقام پر یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ آج کل کے جوشیلے حضرات جو مردوں اور عورتوں کے اخلاق کی آزمائش کے لیے ایک ہی معیار قائم کرتے ہیں۔ خاص کر شادی کی قسموں کے عدم ایفا کی حالت میں در اصل وہ بنیادی اصولوں کو سراسر غلط سمجھے ہوے ہیں۔ فرانس کی ایک ملکہ نے بادشاہ سے ایک مرتبہ یہ الفاظ کہے کہ میں شہزادے پیدا کر سکتی ہوں اور تم حرامی بچے۔ ملکہ کا یہ قول معاملہ کو سوئی کی طرح کُرید دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ خاندان کی شرافت عورت کی عفت کے ساتھ وابستہ ہے۔ مرد کی ناہمواری سے خاندان کے مفاد کا متاثر ہونا ضروری نہیں۔

اگر جیمس اول ڈیوڈ رزیو[1] کا بیٹا ہوتا تو ملکۂ میری کا تصور اپنے بدنتائج کے باعث تمام سٹوارٹ بادشاہوں کی مجموعہ بدچلنی سے کہیں زیادہ مضر ثابت ہوتا۔ عورات کا حد درجہ بدگمان ہونا بالکل بجا ہے۔ لیکن اُنکی بدگمانی کا سبب مردوں کی بدگمانی کی وجہ سے بالکل جدا ہے اور ذاتی حفاظت کے

[1] ملکہ میری کا سکرٹری تھا جسے اسکے خاوند ڈارنلے نے ملکہ کی بیجا التفات وعنایت کے باعث قتل کر ڈالا۔

درجے کو پہونچتا ہے۔ بیوی کی بدگمانی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اپنی پوزیشن یا مرتبہ کی حمایت کرتی ہے۔ اگر اُسکو یہ معلوم ہو جائے کہ اسکی رقیب دلاویزی میں اس سے کم ہے اور اسکے خاوند پر اسکے حسن کا جادو نہیں چل سکتا تو اُسکے اندوہ و کاوش میں گونہ تغیر ہو جاتا ہے اور وہ ایک حد تک مطمئن رہتی ہے۔ لیکن ایک بدگمان خاوند کی نظر میں اس خیال کی وقعت کا امکان کم ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اکثر عورتیں فوراً اس بات سے انکار کرویں گی کہ انکی بدگمانی یا رشک کا باعث ایسی ہی معمولی باتیں ہیں جیسی کہ ذاتی مفاد کی ہوتی ہیں۔ اور وہ اس حد تک راستی پر بھی ہیں کیونکہ وہ اپنی دانست میں اس خیال سے برگشتہ نہیں ہوتیں۔

درحقیقت رشک عرصۂ دراز سے دونوں جنسوں میں فطری ہے۔ اور اسی باعث اسکی علت غائی یا تو پوشیدہ ہو گئی یا اسپر کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ عورتوں کا رشک اسی علت پر مبنی ہوتا ہے جیسے کہ مردوں کا۔ ایک صورت میں تو اس فطرتی تحریک کا مقصد اس عورت کی حمایت ہے جو بچے کی ماں ہو کر مرد کی محتاج ہو گئی ہے۔ دوسری حالت میں اسکا مدعا اولاد کی ولدیت کو درست رکھنا ہے۔ خاوند کی لغزش کی تلافی خارج از امکان نہیں ہے اور وہ نظرانداز بھی کیجا سکتی ہے لیکن عورت کی لغزش بلحاظ نتائج پذیرائے تلافی نہیں۔ بنابریں یہ کہنا کہ عورت اور مرد کی خطائیں قانون کی نظر میں یکساں ہونی چاہییں بے اصول منطق ہے۔ اس بات کی سچائی کا ثبوت خود عورات کے میلانِ طبیعت سے ملتا ہے۔ وہ ایک خطاکار بہن کو حد درجہ سختی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں لیکن بہ مقابلہ اسکے قصوروار شوہر کو معاف کر دیتی ہیں۔ انکی فیاضی سخت حیرت انگیز ہوتی ہے۔

عصمت کے طبعی امر ہونے کی بابت جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ان دلائل کی تردید ہو جاتی ہے جو وقتاً فوقتاً عفت باختہ عورت کی لغزش سے درگزر کرنے کے لیے پیش کیجاتی ہیں۔ اور جنکی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ ایسی عورتوں کو سوسائٹی میں مجرم شمار کرنے کی بجائے کسی کی ہوس پرستی کا شکار سمجھا جائے۔ بات یہ ہے کہ جو عورت عصمت کے معاملہ میں ایک مرتبہ لغزش کر بیٹھتی وہ گویا دیدہ و دانستہ اس قانون کے خلاف چلتی ہے جو سوسائٹی نے اپنی حفاظت کے لیے بنایا تھا۔

جب تک یہ معیار قائم ہے۔ زمانۂ حال کی دخترانِ بازاری کا استحقاقِ عفو تنا ہی ہے جتنا کسی سہو کرنیوالے خزانچی کا۔

یونانیوں نے صرف اُس تمدنی ترقی تک رسائی پیدا کی جس میں عورات پردے میں رکھی جاتی ہیں۔ اہل روم کی طرح وہ کبھی اس سے آگے نہیں بڑھے اور انھوں نے کبھی Gynaeceum جنی سی ام کو خیرباد نہیں کہا جو مسلمانوں کے حرم سے مشابہ ہے لیکن ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو عورات سے ویسا سلوک پر الزام دیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جنی سی ام عورات کے تجربے میں ایک تعلیمی منزل تھی۔ جسکے فوائد سے ہم آج بہرہ ور ہیں۔ اغلب ہے کہ یونانی اپنی عورات کے احساس عفت پر اعتماد رکھتے تو ایک فاش غلطی کے مرتکب ہوتے کیونکہ اس زمانہ میں ابھی صرف اسکی ابتدا ہوئی تھی [1]

رشک یا حسد یونانی علم ادب میں صاف طور پر اسی طرح دکھایا گیا ہے جس طرح ہمنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا ازدواج کیا حرم اور کیا طوائف یہ سب میں ایک ہی صورت میں پایا جاتا ہے۔ یعنی مفاد کے لیے جدوجہد سے کسی قدر زیادتی کے ساتھ۔ یوری پڈیز کی اینڈرومیکی مختصر الفاظ میں ہکڑ کو یاد دہانی کرتی ہے کہ میں صرف تیرے پاس خاطر سے ان عورتوں سے محبت رکھتی ہوں جو تجھے مرغوب ہیں نیز ان کے جنے ہوئے بچوں کو دودھ پلاتی ہوں۔ Hermion کو جو حسد اینڈرومیکی سے تھا اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہرمی اون کو خوف تھا کہیں وہ گھرانے کی سرداری نہ کھو بیٹھے اس حسد کی ایک وجہ پائرس کا اپنے ممتاز قیدی کی طرف زیادہ متوجہ ہو جانا بھی تھا۔ سوفوکلیس کی ہیروائن Dejanira کی بابت بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ Dejanira کا حسد اسوقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک کہ

[1] طبقہ اناث کی نیکی پر اعتماد ابھی طفولیت میں تھا۔ چودھویں صدی میں فرانس میں یہ قاعدہ تھا کہ عورات غیر مردوں سے اپنے خاوند کی موجودگی کے سوا اور کسی وقت نہیں ملتی تھیں۔ این [illegible] آف برٹینی نے عورات کے معیار عام [illegible] فیشن کی بنیاد ڈالی۔ وہاں سے فیشن نکلتا ہے گیا۔ انقلاب یعنی Restoration کے زمانے سے بیشتر کی تہ تک [illegible]

اسپر یہ بات منکشف نہیں ہو جاتی کہ آیا اول Female اسکے خاوند کی ایک معمولی بیلا نہیں ہے بلکہ وہ اسکے نزدیک خاص وقعت رکھتی ہے

Menander ایک یونانی شاعر گزرا ہے جسکو بعد میں فروغ حاصل ہوا۔ اسکے ڈراموں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ اسکی Comedies سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق اور رشک و حسد کو اس نے قدما کی نسبت زیادہ وضاحت سے دکھایا ہے۔ لیکن اسکے فسانے زیادہ تر اوباش نوجوانوں اور کسبیوں کے تعشق سے پر ہیں۔ جن سے بلند خیالی مفقود ہے۔

یونانیوں کی سوسائٹی میں کسی عورت کی فوقیت کا سبب آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ بیوی کی حیثیت کا حصن حصین وہ قانون تھا جو اولاد کی قومیت کا محافظ تھا۔ شادی جہیز کے اصول پر ہوا کرتی تھی۔ اور قبل از مناکحت شوہر بیوی کو شاذونادر ہی دیکھتا تھا Comedies جیسا کہ آجکل سوسائٹی کے خیالات اور تمدن کا نمونہ ہیں اسی طرح ہم فرض کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی ہونگی۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات بیوی خود رائے اور بدمزاج ہوتی تھی۔ اور اپنے جہیز سے خاوند کی دولت میں اضافہ کرنے پر ناز کیا کرتی تھی۔ خانہ داری کا محدود حلقہ اسکا دائرہ اثر ہوتا تھا۔ اور اسی میں اسکے خاوند کی حرم بھی شریک ہوتی تھیں۔ برخلاف اسکے کسبیاں آزادانہ زندگی بسر کرتی تھیں اور اپنی معلومات کے باعث خوش آیند جلیس سمجھی جاتی تھیں۔ انکے مکان امجگاہ ادب اور فیشن تھے۔ سقراط اور پیریکلیز (عہ) اکثر Aspasia کے ہاں جاتے رہتے تھے Theodote ایک اور مشہور کسبی تھی۔ جس کا پولیٹیکل اثر بہت کچھ تھا۔ سقراط نے اسکو آشناؤں کے پھانسنے کی تعلیم دی تھی۔

یونان کی تہذیب کا قعر زوال میں غائب ہو جانا عرصہ تک مورخ اور علم الاخلاق کے طالب علم کے لیے مایۂ حیرت رہا ہے۔ اس زوال کا سبب ایک حد تک یہ ہو سکتا ہے کہ ایتھنز کے بچے

عہ ایتھنز کا ایک زبردست مدبر۔ سپاہی اور مقرر تھا۔ ۴۹۵ ق م میں پیدا ہوا۔ طبقہ جمہوریت طلب کا سرگروہ بنکر ۴۶۱ ق م میں سیموس پر حملہ کیا۔ بعدہٗ لوگوں کی نظروں میں اسکی پہلی سی وقعت نہ رہی۔

قوانین شادی بہت سخت تھے اور انکی بدولت سوسائٹی میں جو کچھ بہت بڑی نہ تھی ایک طرح اندرخانہ اولاد پیدا کرنے کا طریقہ جاگزیں ہوگیا۔ اسکی وجہ ذات پات کی بندشیں تھی۔ جسکی خرابیاں شاہی گھرانوں اور امرا میں پائی جاتی ہیں۔ اس بندش کے ثبوت میں ہم وہ تقریر پیش کرسکتے ہیں جو ڈموستھنز[1] نے ایک لڑکی مسمّٰی بہ یزا[2] کی بابت کی تھی۔ جسکو خالص ایتھنز کی نسل سے نہ ہونے کے باعث اعزازِ شہریت سے محروم کردیا گیا تھا۔ یہاں اتنا اضافہ کرنے کی اور ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ایتھنز کی سوسائٹی کی مثال اُس خاندان کی سی تھی جو خونِ صالح نہ ہونے کے باعث کسی اعصابی مرض میں مبتلا ہو۔ اور پھر چند ہی نسلوں کے بعد صفحہ ہستی سے ہٹ جائے۔ اسکی تائید میں یہ حیرت انگیز بات پیش کیجا سکتی ہے کہ طبقۂ اعلیٰ کی مہذب یونانیوں میں جن میں بڑے بڑے ذی مرتبہ پبلک قومی بھی شامل تھے۔ خلافِ فطرت مذموم محبت کا رواج تھا۔ لیکن اور دیگر مصنفین زمانہ حال نے اس مضمون پر خوب خیالات کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ چکی ہے کہ جب انسان کی حسیات شہوانی خراب ہو جاتے ہیں تو اُس میں عصبی[3] زوال شروع ہو جاتا ہے۔ یونان کی صورت میں غالباً آزاد عورتوں کی کمی ایک حد تک اس خرابی کا باعث ہوئی۔ گویا قدرت نے ایک مضر قانون کی وجہ سے اہل یونان کو یہ سزا دی۔

---

[1] یہ بات تحقیق نہیں کہ آیا مقرر ڈموستھنز تھا یا کوئی اور۔ لیکن مقرر کی ذات ہمارے لیے چنداں ضروری نہیں۔ اصل مطلب اُسکی تقریر سے ہے وہو ہذا "ہم اپنی تفریح کیلیے خانگیاں رکھتے ہیں، ہر وقت ساتھ رہنے کے لیے کنیزیں رکھتے ہیں اور بیویاں اس لیے رکھتے ہیں کہ صحیح النسل بچے پیدا ہوں اور وہ ہمارے گھر کے باوفا منتظم بنیں۔

[2] ممکن ہے کہ اس پُراسرار زوال پر عرصہ دراز تک پردہ پڑا رہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ یہ زوال ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ قدم قدم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی صنعت کے نمونوں میں انکی جدت پسند طبیعت ٹھس اور مردہ ہوئی جاتی ہے۔ ان کا تخیل پرواز سے معرّا ہے۔ اور ان کے مشاہیر گر کر اوسط درجے تک پہونچ گئے ہیں نہ یہاں واقعات صرف مورخ کی موشگافی کے لیے ہیں۔ ان کی تہ میں ہم کو کچھ اور نظر آتا ہے۔ ہم قدرتی اسباب کا بتدریج اثر دیکھتے ہیں اور ان ہی اسباب میں وہ کروڑہا آدمی بھی شامل ہیں جو اس اثر کو محسوس کیے بغیر صفحہ ہستی ۲۴

روم کی تہذیب یونانی تہذیب کے نقش قدم پر چلی۔ چنانچہ زمانۂ جمہوریت کے سیدھے سادے اطوار مفقود ہوگئے اور انکی جگہ زمانۂ بادشاہت کے عیش وعشرت نے لے لی۔ زمانۂ قیاصرہ کے روم کی شرمناک حالت کا بیان کرنا اسوقت مقصود نہیں۔ صرف اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ کی لوث شب بیداریاں اور حد درجہ فحش لٹریچر روم کے صفحاتِ تاریخ پر سخت بدنما داغ ہیں۔ یہاں یہ دکھانا ہے کہ ان اخلاقی خرابیوں ہی میں سے عجیب طرح بہتری کی صورت پیدا ہوئی۔ یعنی سوسائٹی اور مسئلہ ازدواج پر اس کا نہایت مفید اثر ہوا شادی سے جو غرض وغایت یونان میں تھے وہی روم میں بھی رہی۔ یعنی جمہور کی تعداد میں نجیب الطرفین افراد کا اضافہ۔ شادی کے دو طریقے مروج تھے۔ اہل روم کی اصطلاح میں ایک کو Confarreatio کون فریشیو اور دوسرے کو Coemptio اِپ شیومتیو کہتے تھے اور دونوں زمانۂ حال کی Mariage de convenance کی قسم سے تھے۔ کیونکہ اس بارے میں جانبین کا میلانِ طبع فرض یا مصلحت کے تابع تھا۔ لہٰذا محبت کو ان شادیوں میں مطلق دخل نہ تھا۔ اور وہی جہیز اور ذات پات کے اصول یہاں بھی مروج تھے جو یونان میں تھے۔ اس بات کا ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رومی زوجہ اپنی یونانی بہن کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ اعزاز پاتی تھی اور باوجود پردے میں رہنے کے کھانے پر وہی صدر نشین تھی اور خاوند کے ہمراہ میلوں تماشوں میں بھی جاتی تھی۔ ایتھنز اور روم کا مقابلہ کرو تو لحاظ شادی دونوں کی حالت یکساں تھی۔ روم میں بھی وہ اپنے ہمراہ جہیز لاتی تھی۔ شہریت کے حقوق پر دعوی رکھتی تھی لیکن حسن اور دلفریبی میں بسا اوقات گری ہوتی تھی

۴۴ سے مٹ گئے اور متعدی امراض کے جراثیم اپنے اخلاف کے لیے چھوڑ گئے۔ جو یکے بعد دیگرے ایک نسل سے دوسری نسل میں زور پکڑتے گئے اور زوال کا باعث ہوئے۔

ﮮ اُس شادی کو کہتے ہیں جو بزرگوں کے ذریعہ انتخاب پاتی ہے۔ دولہا دلہن کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔

جسکے باعث خاوند کنیزوں اور کسبیوں کی صحبت میں اپنا دل بہلاتے تھے۔ عیش و عشرت کی ترقی کے ساتھ کنیزوں کی خرید و فروخت نے ترقی کی اور اسی نسبت سے اخلاقی خرابیوں نے۔ تجربہ نے Mariage de Convenance کی موجودہ اور قدیم دونوں صورتوں کی مضرتوں کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔ اور آج کل کی لاطینی نسلیں اسی سبق کا اعادہ کر رہی ہیں جو انکے قدما سے ظہور میں آچکا ہے۔ امور ازدواج میں دست اندازی کا نتیجہ ہمیشہ مضرت رساں ہوتا ہے۔ جنوبی یورپ میں رشتۂ مناکحت کی بے وقعتی دیکھ کر بعض مصنفین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ گرم آب و ہوا جذبات کو اشتعال دیتی ہے۔ مگر یہ خیال سراسر غلط ہے۔ کیونکہ شمالی امریکہ کے رڈ انڈین اور جزیرہ گرین لینڈ کے باشندے باوجود سرد درجہ برفانی ممالک میں رہنے کے عیاشی میں فرانسیسیوں ہسپانیوں یا اطالیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ بعض اخلاقی حالتوں کا مرقع ڈرامے کی روشنی میں بوضاحت نظر آتا ہے۔ مصنف اپنی ہیروان کو جس نکتۂ خیال سے چاہے منتخب کرے لیکن سوسائٹی کی نظر میں وہ اُسی وقت تک عزیز ہے جبتک کہ وہ اُسکے اندرونی خیالات کو بے کم و کاست اور اصلی رنگ میں دکھاتا ہے۔ اگر اس سے انحراف کرتا ہے تو کوئی کوڑی کو نہیں پوچھتا۔ فرانس میں Mariage de Convenance کا رواج ہے جس پر سٹیج سے ہمیشہ طعنوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے ہر دو جنس کے آزادانہ تعلقات عمدہ روشنی میں دکھائے جاتے ہیں۔ فرانس کے مقابلہ میں انگلستان میں جہیز[۵۳] کا دستور پورے طور پر رائج ہے لیکن ڈراما نگار

---

۵۱ یہ غلطی آج کی نہیں بہت پرانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اول اول مونٹسکیو نے اس غلط اصول کو دنیا کے روبرو پیش کیا تھا۔ لیکن Hnengle بیچارے نے جہاں اور غلطیاں کی ہیں وہاں یورپی اخلاق کی تاریخ میں ایک یہ فروگذاشت بھی اس سے ہوئی ہے۔

۵۲ ایک فرانسیسی مصنف نے اپنی کتاب "تاریخ اخلاق نسائی" میں Mariage de Convenan کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ کورٹ شپ کا زمانہ حتی الامکان کم کر دیا جاتا ہے۔ مبادا فریقین ایک دوسرے سے واقف ہو کر نفرت نہ کرنے لگیں۔ انکو تنہائی میں کبھی نہیں ملنے دیتے۔ اور نوجوان آدمی اپنے فرائض بحیثیت عاشق اس طرح پورا کرتا ہے کہ لڑکی کے ہاں چند بار رسمیہ چلا جاتا ہے۔ اور گل فروش کے ہاں سے ایک ہی مرتبہ گلدستے خرید لیتا ہے اور انمیں سے ایک ایک روزانہ اپنی محبوبہ کو بھیجتا رہتا ہے۔

شادی کو عموماً نگاہ کرم سے ہی دیکھتا ہے۔

جمہوری حکومت کے زمانہ ہی میں اہل روم کے خیالات شادی کی طرف سے علانیہ طور پر برگشتہ ہوگئے تھے۔ پوٹس کی کومیڈیا اس جہیز والی بیوی اسکی بدمزاجی اور تمرد اور اسکا کا رندہ جس کا اختیار خاوند کے اقتدار کا منافی ہے استہزا کا ایک مستقل مضمون ہے۔ بعض اوقات بیچارے خاوند کو اس صورت میں دکھایا ہے کہ وہ اپنے غلام کے ساتھ بیٹھا گفتگو کر رہا ہے تاکہ ایسی ترکیب سوچے جس سے بیوی کو دھوکا دیکر روپیہ اڑائے۔ اور ایک خوبصورت کنیز خریدے۔ ایک طرف تو خاوند بیٹھا ترکیبیں سوچ رہا ہے اور دوسری طرف بیوی اس سازش کو من وعن سن لیتی ہے اور اسکی بدصورتی۔ بدمزاجی اور عمر کی بابت جو اشارے کنائے ہوتے ہیں وہ بھی سن پاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی قابل تعریف کیرکٹر رسم جہیز کو مذموم بتاتا ہے۔ بیوی کے مقابلہ میں پلوٹس اور ٹرنس کی کنیز اعلیٰ خوبیوں کے ساتھ متصف ہے۔ وہ خوددار ہے اور جبتک کہ آقا کے ساتھ رہتی ہے وفادار رہتی ہے۔ اور کسبیوں کے مشوروں یا حریص والدہ کی ترغیب پر مطلق غور نہیں کرتی۔ اسمیں شک نہیں کہ آقاؤں کے تغیر وتبدل سے نہ تو کنیز بیچاری کے دل میں اصلی محبت پیدا ہوتی تھی نہ آقا کو اسکے ساتھ خاص دل بستگی تھی۔ لیکن اسکے خلاف بھی ہوتا تھا۔ ٹرنس کی ایک کسبی عورت کنیز کو ان الفاظ میں مخاطب کرتی ہے "ہمارے عاشق دراصل ہمارے حسن کے عاشق ہیں۔ جب ہمارا حسن خزاں کے زیر اثر آجاتا ہے تو انکی وارفتگی کسی دوسری کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ لیکن تمہاری حالت بالکل مختلف ہے۔ تمہیں جب کوئی ہم مزاج عاشق مل جاتا ہے تو وہ تمہارا ہو رہتا ہے اور آیندہ کے لیے تمہاری خوشی وخرمی یقینی ہوجاتی ہے۔"

اب روم کی سوسائٹی میں شادی کی ایک اور تیسری قسم رواج پاتی ہے۔ اس کا نام اُسُس[۱] usus ہے۔ یہ جانبین میں بغیر کسی ریت ورسم کے ایک معاہدہ ہوتا تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ عرف عام میں یہ بھی شادی ہی تھی۔ دراصل یہ بھی حرم رکھنے کا ایک طریقہ تھا۔

---

[۱] اس کا مترادف لفظ "متعہ" ہو سکتا ہے۔

طرفین کی رضا مندی پر اسکا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس سے سوسائٹی کے لیے منفعت کی کوئی امید نہ تھی۔ اور فی الحقیقت اس طریقہ نے زن و شو کے تعلقات کو جو شادی پر مبنی ہوتے تھے بہت کچھ کمزور کردیا روم میں ایسی عورتیں تھیں جو کیے بعد دیگرے آٹھ آٹھ اور دس دس شوہروں کے آغوش اختلاط میں رہ چکی تھیں، چاہے آپ اسے انکے لیے باعث فخر تصور کریں یا موجبِ شرم۔ سینٹ جروم نے لکھا ہے کہ ایک عورت کی شادی تیئسویں شخص سے ہوئی تھی اور خود حضرت نے بیسویں بیوی سے گلو خلاصی کرائی تھی۔ جس طرح کتنی چھوٹی سی بات سے عظیم تغیرات واقع ہوے ہیں، اسی طرح Usus نے بھی اخلاق عالم میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ بعد میں یہ شکل تزویج روم میں عام ہو گئی۔ اس میں خواہ کیسے ہی نقص کیوں نہ ہوں چند ایسی خوبیاں بھی تھیں جن سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ طرفین کو انتخاب میں پوری آزادی تھی جو خاندانی انتظام میں قطعًا مفقود تھی۔ مزید برآں اس نے عورات کی آزادی برقرار رکھی۔ اور عورتوں کو اختیار تھا کہ وہ اسباب ملکیت پر اپنا قبضہ رکھیں۔ اس طریقہ سے عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا کیونکہ یہ بہت کچھ عورتوں کی بدولت ہوا۔ اگر یہ طریقہ مروج نہ ہوتا تو قدیم طریقوں کے موافق عورتیں بالکل بے بس اور لاچار ہوتیں۔ اور اسی نے عیسائیوں کی ایک عورت سے شادی کرنے کے طریقہ کے لیے راستہ صاف کردیا۔ Usus کی بدولت ہی زن و شو کی باہمی محبت کی وہ اعلیٰ مثالیں ظہور میں آئیں جو تہذیب روم کے اخلاقی طور پر تاریک حصہ میں آجتک درخشاں و نمایاں چلی آتی ہیں۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے خاوندوں کے ہمراہ میدان جنگ کو جاتی تھیں۔ اور اُنکے بعد زندہ رہنے سے انکار کرتی تھیں۔ خاوند اور بیوی دونوں ایک دوسرے پر اس طرح والہ و شیدا تھے کہ سنگ مزار پر زیبائش کے لیے جو تمغہ نما دائرہ بنایا جاتا تھا تو اُسمیں دونوں کو ہم آغوش دکھاتے تھے۔

باوجود ان تمام باتوں کے روم میں وہ جذبۂ محبت پیدا نہیں ہوا جو خیالی یا حقیقی عشق کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی ادراک اعلیٰ کا خارج از بیان طریقہ پر محسوس ہو جانا۔ عفت و عصمت کی عظمت صرف زبانی ہی زبانی تھی۔ عملی طور پر اسکا نشان بھی نہ تھا۔

ایک ایسا دستور بھی تھا جسکی رُو سے دوشیزہ کا قتل ممنوع تھا لیکن جلاد قتل کرنے سے پیشتر اُسکے شیشۂ عصمت کو چور کردے تو اس صورت میں قتل روا تھا۔[1] عہد آگسٹس کے شعرا عشق کے گیت گاتے ہیں لیکن حقیقت میں انکا جذبۂ محبت چنداں قابل توقیر نہیں۔ آئیے دیکھیں کہ وہ اپنے زمانہ کی سوسائٹی کے اخلاق کا کیا نقشہ کھینچتے ہیں۔ Ovid اپنی آشنا کورینا (Corinna) کو خاوند کے دھوکا دینے کے گُر بتاتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے ازحد قلق ہوتا ہے کہ اسکے بتائے ہوے ہتھکنڈے خود اسی کے ساتھ اسکے رقیب یا رقیبوں کی خاطر استعمال کیے جاتے ہیں۔ دونوں آپس میں جھگڑتے ہیں ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے ہیں۔ زدوکوب تک نوبت پہونچتی ہے۔ دونوں جانب اشک ندامت بہتے ہیں اور بالآخر گلے ملتے ہیں۔ Ovid پھر خیال کرتا ہے کہ میں خود کورینا کی طرح بیوفا ہوں۔ لیکن طرفین کی طرف سے بیوفائی یا پیماں شکنی عاشق کے جذبۂ الفت کے لیے سدراہ نہیں ہوتی۔ اب اسکو یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ اسکی آشنا کا خاوند جذبۂ حسد سے بالکل بے بہرہ ہے۔ اسکی تلافی تو فوراً ہو جاتی ہے لیکن اسکے ساتھ ہی ایک اور کاہش پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کورینا اسقدر آزاد ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی بشیمار چالاکیوں کو پوشیدہ رکھنے کی پردا تک نہیں کرتی۔ علیٰ ہذاالقیاس۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کورینا دراصل جولیا بنت آگسٹس تھی۔

Propertius شاعر کا عشق بھی ایسا ہی ابلق فام ہے۔ وہ ایک من لیڈی Cynthia کی تعریف میں رطب اللساں ہے اور سنتھیا کہکر اُسکو مخاطب کرتا ہے۔ پروپرٹیس خود بیوفا ہے، اس لیے حضرت جلد اپنی معشوقہ کو اُسکی بیوفائی پر ملامت کرنے لگے ہیں۔ وہ ایک سپاہی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ پروپرٹیس زار زار روتا ہے اور امید واثق کرتا ہے کہ وہ خوش و خرم ہوگی۔ آخر اتنی محبت تلافی کا استحقاق رکھتی ہے۔ سنتھیا، سپاہی کو چکمہ دیکر پھر شاعر مہجور کے پاس آجاتی ہے۔ وہ ہشاش بشاش ہوجاتا ہے اور اپولو اور دیویوں کا شکریہ بجالاتا ہے۔ لیکن اسکی مسرت کو زیادہ قیام نہیں ہوتا۔ اور اسکو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسکے رقیب بھی ہیں۔ مگر وہ سنتھیا کی بیوفائی سے درگزر کرتا ہے اور دیوانہ وار اُسکے حسن و جمال اور ظاہری و باطنی خوبیوں کے گیت گاتا پھرتا ہے۔ لیکن جلد اسکو اپنا

[1] یہ حادثہ Sejanus کی بیٹی پر گزرا تھا۔

راگ بدلنا پڑتا ہے۔ سنتھیا کا ہرجائی پن شہر بھر میں زبان زد خلائق ہو جاتا ہے اور یہ حضرت اُسکو چھوڑ بیٹھتے ہیں لیکن پھر تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ اب سنتھیا کی باری آتی ہے اور ان سے برگشتہ ہوتی ہے تب شاعر صاحب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں کُتے سے بدتر ہیں۔ ایک دفعہ اور انھیں چکمہ دیا جاتا ہے۔ پھر شراب نوشی میں عشق کو فراموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عاشق و معشوق پھر گلے ملتے ہیں اور طرح طرح کے تماشے ہوتے ہیں۔ مقطع کا بند اسپر آکر ٹوٹتا ہے کہ سنتھیا اپنے عاشق کو ہجو لیوں میں اضحوکہ بنا لیتی ہے اور موت اسکی لغزشوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیتی ہے۔ ٹبولس تین دفعہ دل لگانے کا اقرار کرتا ہے اور تینوں دفعہ اسکو ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑتا ہے۔ ڈیلیا، نمیس اور نیرا معیوب اور مذموم زیادتیوں میں مقابلہ کرتی ہیں اور صرف بیوفائی میں ثابت قدمی دکھاتی ہیں۔ غلو اور مبالغہ سے قطع نظر عہد آگسٹن کے شعرا کی نغمہ پردازیاں دل کو سرد کردینے والا نظارہ پیش کرتی ہیں۔ موجودہ مصنفین میں سے کون ایسا ہے جو کورینا یا سنتھیا جیسی زنانِ بازاری کو اپنے لیے مایۂ تخیل بنائے یا انکے افسوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت کرے۔ اہل روم یونانیوں سے اس بات میں بڑھ گئے کہ اُنھوں نے مسلمہ کو شادی کی ایک شکل قرار دے لیا۔ اور اس طرح عورات کے حقوق تسلیم کر لیے۔ لیکن خیالات میں طبقۂ اناث کی عزت کا احترام جیسا کہ خاندان یا عام طور پر ایک گروہ میں ہونا چاہیے ابھی پورے طور پر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یا اگر تھا تو محض ابتدائی حالت میں، جسے ہم ایک جز قوم سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ عہد آگسٹن کے مرد و عورت کے تعلقات اور اُس زمانہ کے خیالات اُس زمانہ کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُس شاہ راہ کا پتہ لگائیں جس پر سوسائٹی گام فرسائی کر کے آج اس منزل تک پہونچی ہے۔

سید اظہر علی ایم اے

(از شعلہ)

عالمِ تجرید

"شاعر" کے دل و دماغ میں وہ باتیں اور کیفیتیں آتی ہیں جو اگرچہ زمین و آسمان سے وابستگی رکھتی ہیں مگر کبھی کبھی ان سے بھی اوپر نکل جاتی ہیں۔ اور اُن کو "ذہنی تشکیل" میں پیش کرکے "شاعری" انسانی ارواح کی تسکین و طمانیت کا باعث ہوتی ہے (فنونِ لطیفہ)

کشمکش سے جب جہاں کی سیر ہو جاتا ہوں میں / اکثر اس عالم سے کوسوں دور ہو جاتا ہوں میں
پردۂ تنہائی میں مستور ہو جاتا ہوں میں / بادۂ تخئیل سے مخمور ہو جاتا ہوں میں

×

محو ہو جاتے ہیں دل سے خود بخود اسبابِ غم / چھیڑ سکتی سازِ ہستی کو نہیں مضرابِ غم
بند ہو جاتے ہیں میرے واسطے ابوابِ غم / رہنِ تعبیرِ مسرت ہوتا ہے ہر خوابِ غم

×

میری آنکھیں دیکھتی ہیں اک تماشا اور ہی / سامنے نظروں کے پھر جاتا ہے نقشا اور ہی
میرے احساسات ہو جاتے ہیں گویا اور ہی / دل میں ہو جاتی ہے پیدا کچھ تمنا اور ہی

×

کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ پھر کہاں ہوتا ہوں میں / پیکرِ موہوم و تصویرِ گماں ہوتا ہوں میں
لطفِ پنہانی سے لیکن شادماں ہوتا ہوں میں / وقفِ لذت ہائے ادراکِ نہاں ہوتا ہوں میں

×

میں جسے کہتا ہوں "میں" وہ ہے وہاں عشرت پذیر / تشنگیٔ مضطرب۔ تسکیں کی ہے منت پذیر
انتہائے ذوقِ وجدانی ہے کیفیت پذیر / جس سے جذباتِ حقیقی ہیں مرے لذت پذیر

×

ایک معیارِ لطافت ہے وہ میرے واسطے / منظرِ پایانِ راحت ہے وہ میرے واسطے
مرکزِ ارمان و حسرت ہے وہ میرے واسطے / دیدۂ نادیدہ جنت ہے وہ میرے واسطے

×

اُس میں یہ اندازِ فتنہ زائی و افزوں نہیں / اُس میں یہ ہنگامہ آرائی بوقلموں نہیں
اُس میں یہ محشر خرامی ہائے گوناگوں نہیں / اُس میں یہ شوریدہ سامانیٔ ناموزوں نہیں

×

ایک خاموشی ہے طاری اُس فضائے خاص میں / اور تجلی ریزیاں ہیں اک ادائے خاص میں

ہے تسلیِ طمانیت عطاے خاص میں — رُوح پرور جھلکیاں ہیں جلوہاے خاص میں

×

ناظرِ نظارۂ منظور ہو جاتا ہوں میں — کثرتِ تنویر سے پُر نور ہو جاتا ہوں میں
فرطِ تاثیرات سے معمور ہو جاتا ہوں میں — کیفِ بے اندازہ سے مسرور ہو جاتا ہوں میں

×

آہ لیکن مستقل میں لطف اُٹھا سکتا نہیں! — بالکل آزادی سے اس دُنیا میں آ سکتا نہیں
اِن عطیّاتِ خداوندی کو پا سکتا نہیں — کام میں اِس نعمتِ عظمیٰ کو لا سکتا نہیں

×

کیونکہ میری رُوح ابتک زیرِ بارِ جسم ہے — بندۂ حلقہ بگوشِ تاجدارِ جسم ہے
بندِ قیدِ جسم ہے خدمت گزارِ جسم ہے — مبتلائے سرگرانیِ خمارِ جسم ہے

×

کیا کثافت اور لطافت میں ہوا ہے اختلاط — کس قدر ضدّین میں ہے اجتماعی ارتباط
جو نشاطِ جسم ہے۔ گویا ہے روحانی نشاط — منبسط گر جسم ہے تو رُوح کو ہے انبساط

×

جسم لیکن تھک کے ہو جاتا ہے کچھ معذور جب — خواہشوں کی کرتی ہیں ناکامیاں رنجور جب
آرزوئیں یاس سے ہو جاتی ہیں مجبور جب — روح۔ اس قالب میں رہ سکتی نہیں مسرور جب

×

چاہتی ہے بڑھ کے تب جانا حقیقت کی طرف — ملتفت ہوتی ہے اُس پاکیزہ حالت کی طرف
لاتی ہے آلودگی لیکن ثقالت کی طرف — واپس آ جاتی ہے رفعت سے دناءت کی طرف

×

دیکھ لیتی ہے گر پردہ میں ہلکا سا جمال — کچھ یونہی کر آتی ہے سیرِ جہانِ بے مثال
ہم سمجھتے ہیں اُسے اک خواب تھا یا تھا خیال — اور اس تاویل سے کرتے نہیں اصلاحِ حال

×

آہ۔ کیوں روحانیت کو مفت میں کھوتے ہیں ہم — منہمک جسمانیت میں ایسے کیوں ہوتے ہیں ہم
چونکتے جاتے ہیں ہم پھر بھی مگر سوتے ہیں ہم — آپ کانٹے اپنے حق میں اس طرح بوتے ہیں ہم

×

کاش اب بھی اس گراں خوابی سے ہم بیدار ہوں
بادۂ عرفانِ حق کے نشہ میں سرشار ہوں

خلیفۃ المومنین منصورؒ

(بسلسلۂ الناظر ۱ا جنوری ۱۹۱۶ء)

اس قتل کے متعلق مورخ ابن اثیر اور ابن خلدون اور صاحب خلاصۃ الاثر کی رائیں ملتی جلتی ہیں اُن کا خیال ہے کہ منصور کو ابومسلم کے ساتھ حکومت خراسان کی وجہ سے کاوش تھی۔ سفاح نے ابومسلم سے خراسان کی حکومت کا وعدہ کر لیا تھا۔ اُدھر منصور کو بھی خراسان کا فرماں روا بناکر بھیجدیا۔ جب وہ خراسان پہونچا تو ابومسلم نے اُسکی بہت تحقیر کی اور اُسکی پروا نہ کی۔ منصور کو اس کا ملال ہوا۔ اور اس رنجش نے اس قدر ترقی کی کہ جب وہ واپس ہوکر دارالخلافت میں آیا تو خلیفہ سے اُس نے کل واقعات بیان کر دیے اور کہا کہ ابومسلم مار آستیں ہے، جہاں تک ممکن ہو اسکی مدافعت میں پوری کوشش کرنی چاہیے۔ سفاح پرجادو چل گیا اور اُس نے بھی منصور کی رائے کی تائید کی منصور نے اُسوقت سفاح کو قتل کی وہی تدبیر بتائی جسے آگے چل کر وہ خود ابومسلم کے قتل میں عمل میں لایا۔ جب منصور چلا گیا تو سفاح نے ان واقعات پر دوبارہ غور کیا اور ہربار اُسکی عقل یہی فیصلہ کرتی تھی کہ امور مملکت میں ابومسلم کا قتل سراسر مفید ہی ہوگا لیکن ابومسلم کے سفاح پر ایسے احسان نہ تھے جن کو وہ جلد فراموش کرکے محسن کشی کا بدنما دھبہ اپنے دامن پر لگاتا۔ اُس نے سوچ سمجھ کر اپنے سارے فیصلوں کو مسترد کر دیا اور منصور کو بُلا کر تہدید کر دی کہ ابومسلم کے قتل سے باز رہے۔

اس واقعہ کے بعد جس سال سفاح کا انتقال ہوا ہے اُسی سال ابومسلم نے خراسان سے بارگاہِ خلافت میں ایک عرضداشت اس مضمون کی ارسال کی کہ زیارتِ کعبہ کا ارادہ کر رہا ہوں اور چونکہ اہل عرب مجھ سے بدظن ہیں اس لیے اس سفر میں اُن سے مامون نہیں رہ سکتا لہذا بارگاہِ خلافت سے میری محافظت کا انتظام فرما دیا جائے۔

اور امارت حج کا پروانہ بھی میرے نام صادر ہو۔ سفاح کو ابوسلم کا آخری فقرہ ناگوار ہوا کیونکہ وہ صنا دید عرب اور اخوانِ خلافت پر کسی عجمی کو حاکم بنانا نہیں چاہتا تھا اسلیے اُس نے ابوسلم کی حفاظت کے لیے ایک ہزار فوج تو بھیجدی لیکن امارت کے متعلق لکھا کہ "اسال منصور بھی حج کریں گے اس لیے اُنکے نام امارتِ حج کا حکم صادر ہو چکا ہے" پھر ایک خفیہ خط منصور کو لکھا جس میں ابوسلم کی اس درخواست کا ذکر کر دیا اور اسکے ساتھ یہ بھی لکھا کہ "تم بہت جلد ایک عرضی بارگاہ میں اس مضمون کی ارسال کرو کہ امسال میں حج کرنا چاہتا ہوں لہذا اجازت حج کے ساتھ امارت حج کی سند بھی مجھے عطا کی جائے" منصور نے امتثال امر کے لیے فوراً درخواست بھیج دی اور حج کے لیے روانہ ہوگیا۔ دونوں میں مخالفت تو تھی ہی ابوسلم بے کھٹکے سفرِ حج میں اُن باتوں کا ارتکاب کرتا رہا جو منصور کی طبیعت کے خلاف تھیں۔ اسی عرصہ میں سفاح کی وفات کی جانگزا خبر پہونچی چنانچہ پہلے تو منصور نے حسبِ دستورِ سلطنت خلیفہ کا ماتم کیا پھر عیسیٰ کو حکم دیا کہ سب سے ہماری بیعت لی جائے۔ ابوسلم نے بھی تعزیت نامہ بھیجا۔ منصور نے جواباً جو فرمان اُسے لکھا وہ تعزیات کا مجموعہ تھا۔ اور اسمیں اسکی بے راہ روی پر دھمکی دی تھی۔ ابوسلم نے دیکھا کہ منصور کے تیور اچھے نہیں ہیں اس نے دوسرے خط میں معذرت اور حصول خلافت کی تہنیت ادا کی۔ لیکن منصور کا دل صاف ہونا تھا نہ ہوا۔ ادھر ابوسلم بھی جانتا تھا کہ اب منصور خلیفہ ہو گیا ہے۔ اوسکی ناراضی کسی روز رنگ لائے گی۔ اس لیے اُس نے بطریق حفظ ماتقدم خراسان جانے کی کوشش کی منصور کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو اُس نے ابوسلم کو شام کی گورنری پر مامور کرکے خراسان جانے سے باز رکھا۔ ابوسلم گو شام کی گورنری کے حیلہ سے خراسانیوں کی معاونت سے محروم کر دیا گیا تھا تاہم اُسکے ساتھ اُسکے ہم وطن خراسانیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی اور اب اُس نے مجبور ہو کر اپنی محافظت کا بار انھیں لوگوں کے

ڈال دیا تھا۔

سچ ہے کہ جب گردش آتی ہے تو بنی بات بگڑ جاتی ہے اور آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ منصور کے جس قدر احکام ابو مسلم کے پاس پہونچے ابو مسلم نے اُنکی تعمیل کی کبھی پروا نکی اور دلی عناد سے فرمانِ خلافت پر نکتہ چینی بھی کرتا رہا تھا۔ یہ چھپنے والی بات نہ تھی۔ قاصد دیکھتے رہتے تھے۔ ایک شخص نے ابو ایوب کے سامنے منصور کی طرف سے ابو مسلم کی بد دلی بیان کر دی۔ ابو ایوب کو یہ سنکر تاب نہ رہی اور دربار میں حاضر ہو کر تمام باتیں خلیفہ منصور کے گوش گذار کر دیں۔ منصور کی آتش غضب اور بھی مشتعل ہو گئی۔ اُسنے حکم دیا کہ ابو مسلم شام سے دار الخلافت میں طلب کیا جائے۔

منصور اور ابو ایوب ابو مسلم سے بیخوف نہ تھے گو منصور کے حکم کے موافق اُسکی طلبی میں فرمان جاری کر دیے گئے تاہم دونوں کو مسلم کی کثرتِ فوج سے اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی نیا فتنہ اور نہ پیدا ہو جائے۔ آخر کار اُنھوں نے ایسی سازشیں کیں۔ جنکی وجہ سے ابو مسلم کو مجبوراً بارگاہِ خلافت میں آنا پڑا۔ منصور تو اسی تاک میں تھا ہی اُس نے موقعہ پاکر ابو مسلم کو قتل کرا دیا۔ یہ ہے رائے مورخ ابن اثیر اور محقق ابن خلدون اور صاحب خلاصۃ الاثر کی۔

قاضی القضاۃ ابن خلکان نے ابو مسلم کے قتل کے اسباب اور بتلائے ہیں وہ کہتا ہے کہ ابو مسلم کی خود سری نے منصور کو اُسکی طرف سے مکدر کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس واقعہ کو اہمیت حاصل ہوتی گئی اور جب ابو مسلم کی آزادی نے خلافتِ منصور کی بھی تضحیک کرنی شروع کر دی تو منصور اُسکے قتل کے درپے ہو گیا۔ لیکن سوچتا تھا کہ ایسے با اثر امیر کے قتل میں کس سے معاونت حاصل کیجائے اور قتل کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ایک دن منصور نے سلم ابن قتیبہ سے اس معاملہ میں مشورہ کیا اُس نے کہا لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ یعنی اگر ایک ملک میں دو بادشاہ ہوں تو وہ ملک برباد ہو جائے گا۔ جسکا منشاء یہ تھا کہ ابو مسلم کا استیصال لازمی

ہے۔ منصور نے اُسے اپنا ہم خیال پاکر تعریف کی اور فیصلہ کر لیا کہ ابو مسلم کو بغداد بلا کر قتل کر دینا چاہیے۔ ابو مسلم حج سے فارغ ہو کر حیرہ آیا تو ایک نصرانی عالم نے اُس سے کہا کہ تم قتل کر دیے جاؤ گے بہتر یہی ہے کہ خراسان چلے جاؤ وہیں تمھیں اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ ابو مسلم خود بھی ملاحم سے واقف تھا اُسے دیکھا تو اُس سے نصرانی عالم کے قول کی تائید ہوتی تھی۔ اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ابو مسلم کی وجہ سے ایک دولت کا زوال ہوگا اور دوسری دولت قائم ہوگی۔ اب ابو مسلم کو منصور کی طرف سے بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں اور اسی وجہ سے خراسان جانے کے لیے طیار ہو گیا لیکن اُسکے خیال نے غلطی کی۔ نہیں بلکہ اُسکی قسمت نے پلٹا کھایا اور وہ سمجھا کہ میں ارض روم میں قتل ہونگا مجھے یہاں خوف نہ کرنا چاہیے۔ منصور اس زمانہ میں شہر رومیہ میں اقامت پذیر تھا۔ حسب الطلب جب ابو مسلم اُسکے پاس پہونچا تو منصور نہایت خندہ پیشانی سے ملا اور اُسکی بہت خاطر و مدارات کی۔

ابو مسلم منصور کی ملاقات کو اکثر دربار میں حاضر ہوتا تھا۔ لیکن منصور کے طرزِ ملاقات نے اُسے مشکوک نہ ہونے دیا اور ابو مسلم کو یہ خیال بھی نہ ہوا کہ منصور میرے قتل کی فکر میں ہے۔ ابو مسلم ایک روز آیا تو دربان نے کہا وضو کر رہے ہیں یہ سنکر ابو مسلم رواق کے نیچے جا بیٹھا۔ منصور نے ایک گروہ اُسکے قتل کے لیے پہلے سے چھپا رکھا تھا اور اُنکو ہدایت کر دی تھی کہ رواق کے پیچھے چھپے رہیں اور دستک کی آواز سنکر فوراً آ جائیں۔ وضو سے فارغ ہو کر منصور نے ابو مسلم سے درباری کمرے میں ملاقات کی۔ پہلے تو نہایت دل جوئی کی باتیں کرتا رہا پھر اُس نے اپنے طرزِ کلام کو بدلا اور اُن گزشتہ کارروائیوں کا اعادہ کیا جو ابو مسلم سے ظہور پذیر ہوئی تھیں۔ ابو مسلم نے کہا میری جان نثاری پر نظر کرکے حضور ایسا خیال نہ فرمائیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ منصور نے کہا اے حرام زادے بیشک تو ان افعال کا مرتکب ہوا ہے کیا تو نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ "میں ابن سلیط ابن عبداللہ ہوں میرے ساتھ اپنی پھپھی "آسیہ" کا نکاح کر دو"۔ یہ سُن کر ابو مسلم دریائے ندامت میں ڈوب گیا اور بہت معذرت کی مگر منصور نے کہا بخدا میں تجھے قتل کرونگا

اور اگر مَیں تجھے چھوڑ دوں تو خدا مجھے قتل کرے۔

یہ کہکر ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پہ زور سے مارا جو لوگ رواق کی پشت پر آواز کے منتظر تھے برہنہ تلواریں لیے ہوے آگئے اور ایک ساتھ ابو مسلم پر وار کرنے لگے۔ ابھی ابو مسلم کے زخم کاری نہ لگا تھا کہ اُس نے منصور سے پھر کہا" امیرالمومنین مجھے قتل نہ کرائیے میں آپ کے دشمنوں کو پامال کرونگا" منصور نے کہا تجھ سے بڑھ کر اور کون میرا دشمن ہوسکتا ہے۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے اُسے قتل کر ڈالا[1]۔

[1] مورخ تاریخ خمیس اور ابن اثیر نے اس معاملہ کو کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہم بایںخیال اُنکے بیان کردہ واقعات کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں کہ معزز ناظرین اسے پڑھ کر ایک مسلسل نتیجہ پر پہونچ سکیں گے اور ایک حد تک ابو مسلم کے اسباب قتل کا بھی اظہار ہو جائے گا:-

"جب منصور اور ابو مسلم حج سے فارغ ہوے تو امیر عیسٰی نے منصور کے چچا عبداللہ گورنر شام کو لکھا کہ خلیفۂ عالم سفاح نے اس دارنا پایدار سے انتقال کیا۔ اور حسبِ صیت و قرار داد منصور اُنکے جانشیں ہونے کی حیثیت سے تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ لہذا انھیں لکھا جاتا ہے کہ منصور کی بیعتِ خلافت اہل شام سے لو اور خود بھی بیعت کرکے اُنکے ظلِ عاطفت میں داخل ہو۔

عبداللہ نے دیکھا کہ سفاح کا انتقال ہوگیا اور ابو منصور کی خلافت کی خبر ابھی مشہور نہیں ہوئی تو انہوں نے امرائے شام کو ایک جلسہ میں مجتمع کرکے کہا خلیفۂ منصور نے دنیا سے انتقال کیا۔ حال میں جو لڑائی ہوئی تھی تو سفاح نے چاہا کہ افواجِ خلافت کی کمان کسی عباسی امیر کے ہاتھ میں ہو چونکہ لڑائی کا رنگ گڑا ہُوا تھا اس لیے کسی نے ہمت نہ کی۔ سفاح نے جب خاندانی امراء کی یہ سردمہری دیکھی تو اُسے لڑائی کے متعلق گوناگوں خیالات ہوے اور چونکہ مدافعت ضروری تھی اسلیے اُسنے اعلان کردیا کہ جو شخص اس فوج کی سپہ سالاری منظور کریگا وہی میرا حقیقی جانشیں ہوسکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس اہم کو میں نے سر کیا لہذا میں مستحق خلافت ہونے کی حیثیت سے تم لوگوں سے اپنی اطاعت کی بیعت لیتا ہوں۔

جب عیسٰی کو اسکی خبر معلوم ہوئی تو اُس نے کہا کہ سفاح نے اس قسم کی کوئی وصیت نہیں کی۔ اِن عبداللہ

اس میں شک نہیں کہ منصور کو ابو مسلم سے کاوش ہو گئی تھی لیکن یہ خیال کرنا کہ واقعہ خراسان اسکا باعث ہے غور طلب ہے۔ تاریخ کے صفحات اس قسم کے وقائع سے لبریز ہیں لیکن کوئی واقعہ اسکی تائید نہیں کرتا کہ ایسی معمولی باتیں اس قدر پیچیدہ ہو سکتی ہیں۔ ابو مسلم کے احسانات تو ایسے تھے کہ جن کا منصور کافی طور پر شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا اگر اُس نے مخالفت کی تو اُسے ایسی پاداش نہ دینی چاہیے تھی۔ بیرم خاں نے اکبر کی مخالفت کی اور اُسکے مقابلہ میں آیا مگر جب اُس نے معافی مانگی تو اکبر نے نہایت فراخ حوصلگی سے اُسکا قصور معاف کر دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) سے بوقت روانگی یہ کہا تھا کہ میرے بعد خلیفہ منصور ہو گا لہذا اُسکی بیعت حاصل کی جائے لیکن شامیوں پر عبد اللہ کا جادو چل گیا اور سب نے اُسکی بیعت کر لی۔ اب عبد اللہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں منصور کا بڑھتا ہوا سیلاب اُسکی عمارتِ تمنا کو نہ ڈھا دے اس لیے وہ منصور کے مقابلہ کے لیے نکلا۔

دربار میں عبد اللہ کی نقل و حرکت کی خبریں برابر پہونچ رہی تھیں اس لیے علیٰ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں عبد اللہ کا اثر وقیع نہ ہو جائے۔ اور اگر اس وقت مدافعت نہ کی گئی تو اُسکی قوت روز بروز ترقی پذیر ہو کر ایک دن رنگ لائے گی۔ اسلیے اُسنے خلیفہ کی خدمت میں تمام واقعات بیان کر دیے اور کہا کہ اس نوخیز فتنہ کی بیخ دبنیاد اُکھیڑنی چاہیے۔ منصور نے ابو مسلم کو اُسکی حسب خواہش اس مہم کی امارت کے لیے انتخاب کیا۔ مورخ تاریخ خمیس لکھتا ہے کہ نصیبین میں دونوں لشکروں نے دادِ شجاعت دی لیکن ابن اثیر رقم طراز ہے کہ جب عبد اللہ بصرہ پہونچا تو ابو مسلم نے کہلا بھیجا کہ "میں دربار سے شام اور مصر کی گورنری پر مامور ہو کر ملک شام جا رہا ہوں آپ مطمئن رہیں" عبد اللہ سمجھ گیا کہ یہ ابو مسلم کی پولٹیکل چال ہے اور بیخبری میں حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ اسلیے جنگ کی طیاریاں شروع کر دیں لیکن جب شامیوں کو معلوم ہوا کہ ابو مسلم شام کی گورنری پر جا رہا ہے تو پریشان ہو گئے اور ایک رائے ہو کر عبد اللہ سے کہنے لگے کہ اب ملک شام کو واپس چلیے ورنہ ابو مسلم پہونچ کر آفت ڈھائے گا۔ عبد اللہ نے ہر چند سمجھایا اور کہا کہ ابو مسلم الحرب خدعۃ پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اہل شام کی عقلوں پر پردہ پڑ چکا تھا اُنکے بخت برگشتہ نے نیک و بد کی تمیز دور کر دی اُنھوں نے عبد اللہ سے کہا آپ حران جا کر منصور سے تخت خلافت چھینیے ہمارے اہل و عیال شام میں موجود ہیں۔ اگر ابو مسلم پہونچ گیا تو رہائی دشوار ہو جائیگی اور ہمارے آل و اولاد لونڈی اور غلام بنا لیے جائینگے۔

اور قدیم مراتب عطا کرکے دوبارہ اُسکی عزت افزائی کی۔ غور کرو تو بیرم خاں کا اکبر پر اسقدر احسان تھا کہ اکبر نے اُسکے دامنِ عاطفت میں پرورش پائی اور بارِ سلطنت اُسی کی معاونت سے اُٹھایا۔ اسکے مقابلہ میں ابومسلم کے منصور ہی پر نہیں بلکہ کل خاندان عباسیہ پر کس قدر اور کیسے احسانات تھے۔ عباسیوں کو غربت کی ناقابل برداشت تکلیف سے نجات دلائی۔ دنیا سے روشناس کیا اور اُنکی خاطر سے دولتِ اموبہ کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ دولتِ عباسیہ مستحکم ہو جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) عبداللہ نے جب حامیان وطن کی طوطا چشمی دیکھی تو اُسکی تمام تمناؤں پر پانی پھر گیا اور شکستہ دل ہو کر ملک شام کو واپس ہوا۔ ابومسلم تو موقعہ کا منتظر تھا ازدحام کرکے عبداللہ پر ٹوٹ پڑا اور ہنگامۂ رستخیز برپا کر دیا۔ عبداللہ کی جرار فوج نے گو خوب ہی مقابلہ کیا لیکن اُسکی ترقی کا آفتاب ڈھل چکا تھا اور وہ وقت بالکل قریب تھا کہ وہ جھلاتا ہوا اپنی متفرق نورانی شعاعوں کو سمیٹ کر افق مغرب میں روپوش ہو جاتا چنانچہ عبداللہ کو شکست ہوئی اور ابومسلم کو وہ خزائن غنیمت میں ملے جو عبداللہ نے مروانیوں سے خلع خلافت کے وقت حاصل کیے تھے۔

منصور کو جب فتح کی خبر پہونچی تو اُس نے ابو الخصیب کو مال غنیمت کی حساب فہمی کے لیے روانہ کیا۔ ابومسلم کو جو ہمیشہ ایسی قیدوں سے آزاد رہا کرتا تھا اور اب بھی بزعم خود سمجھ رہا تھا کہ یہ مال و اسباب میرے لیے قدرت کا عطیہ ہے، ابو الخصیب کا آنا ناگوار ہوا اور جوش غضب میں اپنے وطن خراسان جانے کی طیاری کر ہی رہا تھا کہ حسن ابن قحطبہ شام اور مصر کی گورنری کا فرمان بارگاہِ خلافت سے حاصل کرکے ابومسلم کے پاس پہونچے۔ ابومسلم فرمان خلافت پڑھکر برہم ہوا اور غصہ میں اُسے زمین پر پٹک یا منصور کی شان میں بھی نالائم باتیں کہیں۔ چونکہ شام کی گورنری پر حسن بن قحطبہ آ ہی چکے تھے اسلیے اب اُسے کوئی امر اپنے وطن خراسان جانے سے مانع نہ تھا۔ حسن ابن قحطبہ کو گورنری کا چارج دیکر خراسان اسی خیال سے روانہ ہوا کہ وہاں پہونچکر دولت علویہ کا پودا لگائے اور اپنے مساعیِ جمیلہ کی آبیاری سے اُسے سرسبز بنائے۔ حسن ابن قحطبہ نے ان باتوں کی دربار میں اطلاع کی تو منصور اور وزیر ابوایوب دونوں کو تشویش پیدا ہو گئی کہ اگر اس ایفناد مسلم نے خراسان پہونچکر اپنے ارادہ کی تکمیل کی تو دولت عباسیہ کا آفتاب ہرگز گہن جائیگا اور سالہا سال کی جانکاہی کا نتیجہ

اگر کوئی قابلِ تسلیم قتل کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ آسیہ کے نکاح کی درخواست ہے یا ابن اثیر اور صاحب تاریخ خمیس کا بیان کردہ سبب۔ بیشک ابوسلم کا آسیہ کے ساتھ خواہش عقد کا جُرم (جو عربوں کے لیے باعث مذلّت تھا) معمولی نہ تھا۔ عربوں نے باوجود اسکے کہ وہ ایک غیر متمدن قوم تھی اور تہذیبِ معاشرت اور سیاستِ مُلک کے قوانین سے بالکل ناواقف تھے۔ انساب کی جیسی حفاظت کی، وہ بے نظیر ہے۔ یہ دفعہ اُنکے قانون معاشرت میں ایسی سخت تھی جس نے اُنھیں اہل عجم کے اختلاط سے باز رکھا اور اب تک سرزمین عرب پر یہی کیفیت ہے۔

ابوسلم خراسانی تھا اور اُسکا نسب ایک ایسے آتش پرست خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس نے بقول بعض مورخین ہمیشہ افلاس اور ذلت سے زندگی بسر کی تھی اور ابھی اُسکے آباو اجداد کو حلقہ اسلام میں داخل ہوئے چند پشتیں بھی نہیں گزری تھیں۔ اگر ابوسلم کا کوئی کفو ہو سکتا تھا تو عجمی ہی۔ بنی ہاشم خلاصۂ عرب تھے اور انکی رگوں میں عدنان کا خون جوش مار رہا تھا۔ ابوسلم سے اُنھیں کوئی نسبت نہ تھی پس اگر منصور اسپر برہم ہوا ہو تو تعجب نہیں اور اگر اُس نے ابوسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا ہو تو حیرت انگیز نہیں ہے۔ دوسرا سبب اس سے بھی زیادہ وقیع ہے۔ یعنی ابوسلم کی خودسری اور دولت عباسیہ کا بے قابو کر دینا۔

منصور نے ابوایوب سے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ کسی طرح ابوسلم قتل کر دیا جائے اسکی وجہ سے آتشِ بغاوت دب جانے کے علاوہ ایک یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہم سلطنت کے کاموں کو بے رکاوٹ کر سکیں گے۔ ابوایوب نے منصور کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ اس سے بہتر کوئی دوسری تدبیر نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ابوسلم دولتِ امویہ کے مقابلہ میں اپنی شجاعت دکھلا چکا تھا اور اُسکے ساتھ اہل خراسان کا ایک جرار لشکر ہونے کی وجہ سے اُسکا قتل آسان نہ تھا اس لیے منصور کے حکم سے ایک شفقت آمیز فرمان بارگاہِ خلافت کی طرف سے ابوسلم کو بھیجا گیا جس میں اُسکی خدمتوں کا اعتراف کیا گیا تھا اور آخر میں رومیہ (منصور کا اسی جگہ قیام تھا) میں

حاضر ہونے کا حکم بھی تھا۔

ابومسلم منصور سے کشیدہ خاطر ہو گیا تھا اور اس سے بھی واقف تھا کہ خلیفہ کا دل اسکی طرف سے صاف نہیں ہے اس لیے اس نے جواب میں حاضری دربار سے معذرت چاہی اور لکھا کہ "میں دُور رہ کر آپ کی اطاعت کرنا چاہتا ہوں۔ میں دربار میں حاضر ہونے سے معاف فرمایا جاؤں"۔

منصور نے دوسرا فرمان پھر طمانیت بخش الفاظ میں لکھ کر بھیجا اور لکھا کہ "تم دربار میں ضرور حاضر ہو"۔

اب ابومسلم مجبور تھا۔ کیونکہ خراسان جانے میں فرمانِ خلافت کی عدول حکمی ہوتی تھی۔ مجبوری اُسے قصد وطن ترک کرکے رومیہ آنا پڑا۔ مورخ تاریخ خمیس لکھتا ہے کہ ابومسلم کے جلوس میں تین ہزار سوار رہتے تھے۔ اُسپر منصور کے بھتیجے نے اعتراض کیا اور کہا دارالخلافت میں کسی امیر کو ایسا پُرشوکت جلوس نہ رکھنا چاہیے۔ اسی اعتراض کی تائید میں ایک حکم دربار سے ابومسلم کے نام صادر ہوا جس کی رُو سے ابومسلم سواروں کی تعداد کم کرنے پر مجبور ہوا۔ اور اُس نے بتدریج سواروں کی تعداد گھٹا کر صرف سو سواروں پر اکتفا کی۔

جس روز ابومسلم قتل کیا گیا ہے اُس دن ابومسلم کے سوا اور کسی امیر کو دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ جب ابومسلم آیا تو اولاً منصور اُس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملا۔ پھر اثنائے کلام میں ابومسلم سے اُسکی لغزشوں کا ذکر کیا جو وقتاً فوقتاً منصور کے احکام کے مقابلہ میں ہوئی تھیں۔ چونکہ ابومسلم ہتھیار لگائے تھا اس لیے منصور نے اُس سے تلوار دیکھنے کے حیلے سے لیکر فرش کے نیچے رکھ دی اور دیر تک شکوہ و شکایت کرتا رہا۔ ابومسلم نے معذرت کی اور عرض کیا کہ اب ان وقائع کو نظرانداز فرما دیجئے۔ جب منصور ابومسلم کی طرف سے مطمئن ہو گیا تو اُس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ جو لوگ بحکم خلافت خیمہ کے پیچھے صفقہ کی آواز کے منتظر کھڑے تھے وہ برہنہ تلواریں لیکر ابومسلم کے سر پر آپہونچے۔ گو ابومسلم نے اپنی اطاعت کے بہت سے وعدے کیے اور گزشتہ خطاؤں کی معافی بھی چاہی مگر منصور کو مصلحتِ وقت نے اُسکے عفو کی اجازت نہ دی اور بالآخر ابومسلم قتل کر دیا گیا۔

مورخ ابن خلکان کہتا ہے کہ ابوسلم قتل ہوجانے کے بعد ایک چادر میں لپیٹ دیا گیا تھوڑی دیر کے بعد جعفر ابن خنظلہ آیا تو منصور نے کہا کہ ابوسلم کے قتل کے متعلق تمہاری کیا صلاح ہے اُس نے کہا اگر تم اُسکے ایک بال پر بھی قابو پاؤ تو اُسے قتل کردو۔ قتل کردو۔ منصور نے کہا خدا تجھے نیک توفیق دے وہ بساط میں لپٹا ہے۔ جعفر ابن خنظلہ نے اُسے مقتول دیکھا تو کہا آج اپنی خلافت کا پہلا روز سمجھیے۔ پھر منصور نے اُسکی لاش علی الاعلان فرش پر ڈلوادی۔ جو آتا تھا منصور اُسکے سامنے یہ شعر پڑھتا تھا:۔

زعمت ان الدین لا یقتضی فاستوف بالکیل ابا مجرم

اشرب بکاس کنت تسقی بہا امر فی الحلق من العلقم

اس واقعہ کے بعد منصور اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا:۔

طوی کشحہ عن کل اہل مشورۃ وبات بنای غیر مہ ثم ضمما

واقدم کالم یجد ندہیا ولن یجد برا من الامرا قدما

بہرحال ابوسلم کے قتل کے اسباب بھی جعفر برمکی کے وجوہ قتل سے کچھ کم پیچیدہ نہیں ہیں۔

ابوسلم کا قتل منصور کا ایسا فعل تھا جسکی تقلید اُسکے جانشینوں نے اچھی طرح سے کی۔ خاندان برمکی نے انتظام خلافت میں جیسی بے لاگ کوششیں کی تھیں اُنکی تعریف میں صفحات تاریخ رطب اللسان ہیں۔ لیکن ہارون نے سب کو قتل و قید کرکے برباد کردیا۔ ابن طاہر نے مامون کی زعم سپہ سالاری میں امین کے ساتھ جو کچھ کیا مامون نے اُسکا معاوضہ تلوار اور مفارقت سے کیا۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ رشید کے جانشین خلیفہ امین کی ہے۔ ابن طاہر نے جب امین کا محاصرہ کیا تو امین نے اُس سے کہلا بھیجا۔ کہ مجھے مامون کے پاس جانے دو۔ وہ میرا بھائی ہے۔ وہ جو کچھ کریگا مجھے منظور ہے۔ تم بالکل یقین کرلو کہ عباسیوں کا اصول ہے کہ ہواخواہوں کو قتل کریں۔ ابوسلم نے اس سلطنت کے استحکام میں جو کچھ کیا اُسکا ثمرہ اُسکے لیے موت تھا۔ خاندان برمکی کی خیرخواہی تاریخ عالم میں یادگار رہیگی۔ تمہیں معلوم ہے والد بزرگوار رشید نے اُنکے ساتھ کیا کیا۔ تم مامون کی خیرسگالی میں میرے خون سے اپنا ہاتھ ملوث نہ کرو ورنہ تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو ہواخواہان عباسیہ کا ہونا چاہیے اور ہوچکا ہے۔ (باقی دارد)

شبِ معراج

تجھ پر جو شبِ اسرا معراج میں گزرا تھا — آنکھوں میں سماں ہے وہ اے قبلۂ ایمانی
یاد آتا ہے رہ رہ کر بندے کا وہ استغنا — وہ بے طلب آنے دن اک بخشش ربانی
وہ جوشِ محبت کا دونوں پہ اثر پورا — وہ دونوں طرف یکساں اک جذبۂ روحانی
معشوق کی خدمت میں جبریلؑ کا وہ آنا — عاشق کی شبِ اسریٰ وہ سلسلہ جنبانی
محبوب سے درپردہ وہ وصل کی استدعا — وہ تذکرتا کہنا حالِ شبِ ہجرانی
بیتابیِ عاشق کا سُن سُن کے وہ ہنس دینا — وہ رشک سے کر دینا کتنوں کا لہو پانی
وہ چشمۂ کوثر سے پانی پئے غسل آنا — وہ گیسوئے جاناں کی کرنا گہر افشانی
وہ قلبِ مصفا کی کچھ اور جلا ہونا — وہ دل کا نکل جانا ہاتھوں سے باسانی
وہ حُلّۂ فردوس اک پہنے تنِ اطہر میں — زیبِ سرِ اقدس وہ عمامۂ نورانی
ہمراہ سواری کے وہ غول ملائک کے — کرتے ہوئے کچھ نوری وہ مردہ ثنا بانی
وہ رات کے پردے میں رفرف پہ تڑا جانا — تا عرش پہونچنا وہ اک قصۂ طولانی
وہ چاہنے والے سے کس ناز سے ضد کرنا — وہ اُمتِ عاصی پر بخشش کی فراوانی
اپنے کو لیے رہنا عاشق سے کھنچے رہنا — اس پر بھی عرق سے تر وہ چاندی پیشانی

محبوب سے فصل اب ہے بس دو ہی کمانوں کا
تھوڑی سی کشش ہاں اور اے جذبۂ پنہانی

صدق - جائسی

ناول نویسی

ہماری زبان میں اسکی ابتدا ہوے زیادہ زمانہ نہیں گزرا - اس سے پہلے عموماً قصہ کہانیوں اور مثنویوں کا زیادہ چرچا تھا، اور اب بھی بہت سے لوگوں کو اُنسے دلچسپی ہوتی ہے لیکن موجودہ تعلیم یافتہ شخص اُن سے زیادہ حظ نہیں اُٹھا سکتا اور سمجھتا ہے کہ وہ بچوں اور کم عمر والوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں - الف لیلہ - طلسم ہوش ربا - چہار درویش - داستانِ امیر حمزہ وغیرہ بڑے پایہ کی کتابیں ہیں، لیکن ان میں ایسی فوق العادت اور غیر فطرتی واقعات بھرے ہوے ہیں - جو سمجھدار دماغ کے لیے عمدہ غذا نہیں کہی جا سکتی - کیونکہ اُن کی دلبستگی کیلیے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں زیادہ تر اس کے ابنائے جنس کے واقعات و حالات اس طرح بیان کیے جائیں جو یا تو سچ معلوم ہوں یا ایسے ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں - جنات، دیو - پری کے حالات سننے کا زمانہ لڑکپن تھا - اور جب ہی اُس میں زیادہ لطف آتا تھا - اب یہ دیکھنا چاہیے کہ جس طرح خیالات و جذبات کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ترقی ہوتی ہے اسی طرح مذاق بھی بدلتا جاتا ہے - اور اس لیے دوسرے ہی قسم کے قصوں کو دل چاہتا ہے جو کئی قسم کے ہوسکتے ہیں -

(الف) تاریخی قصے یا ناول - ان کو سب پر اس لیے ترجیح دی جاتی ہے کہ ان سے زمانہ گزشتہ کا حال اور ایک تاریخی واقعہ معلوم ہوتا ہے، جس سے ہمارے علم میں زیادتی ہوتی ہے - اور اسی وجہ سے ان کا لکھنا عدد درجہ مشکل ہے - یہ سمجھنا کہ دو تین تاریخی کتابیں دیکھ کر ناول لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، سخت غلطی ہے - اس طرح کے معمولی ناولوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکدینا زیادہ مناسب ہے - تاریخی ناول پر قلم اُٹھانا آسان کام نہیں - اُسکے لیے بڑی عرق ریزی اور مطالعہ کی ضرورت ہے - واقعہ کے سچے یا جھوٹے

ہونے سے زیادہ بحث نہیں کی جاتی بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی معاشرت۔ عادات۔ رسوم۔ ملکی، تمدنی و اخلاقی حالات کا نقشہ ہُو بہ ہُو کھینچا گیا ہے یا نہیں۔ پھر پلاٹ خواہ کسی قسم کا ہو، اُس کا نشو و نما کیونکر کیا گیا ہے۔ اس لیے لکھنے والے کو ذرا اور اسی بات کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ تاکہ پڑھنے والوں کو اس بات کا کوئی صحیح اندازہ ہوسکے کہ ناول میں جن لوگوں کا ذکر ہے، وہ کیا پہنتے تھے، کیا کھاتے تھے، کس طرح رہتے تھے، کیسے ملتے جُلتے تھے، کیا خیالات رکھتے تھے اور اُنھیں کس طریقہ سے ادا کرتے تھے۔ غرضکہ اسی طرح کی ہزارہا باتیں جن کو مطالعہ کرتے اور ترتیب دینے کے لیے ایک خاص دماغ اور خاص قابلیت کی ضرورت ہے اور خاص اہتمام و جستجو لازم ہے۔ لارڈ لٹن کا ناول "پامپائی کے آخری دن" اُس کا اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے۔ جب سر بیربوں ٹری نے نیرو کا ڈراما اسٹیج پر لانا چاہا تو لکھنے والوں کی سال ڈیڑھ سال کی محنت، اور برٹش موزیم اور روما وغیرہ میں سرگردانیوں کے بعد وہ ذریات و حالات معلوم ہوے جنھوں نے ہُو بہ ہُو روما کی اُس زمانہ کی معاشرت کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ ایسے ڈراما کا دیکھنا دلچسپ ہی نہ تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ذریعہ بھی تھا۔

اب خیال فرمائیے کہ اول تو آپ کی تاریخوں میں معاشرت ماضیہ کا حال ہی بہت کم مندرج ہے، دوسرے ناول نویس صاحب نے دو تین کتابیں دیکھیں اور اپنے عقلی گدّے لگا کر عشق عاشقی اور فضولیات کے طومار باندھکر ایک ضخیم کتاب تصنیف فرمائی اور تاریخی ناول کی حیثیت سے اُسکو پبلک میں پیش کر دیا۔ حالانکہ اس میں اپنے ہی زمانہ کے خیالات اور زبان اور مذاق کے مرقعے دکھائے گئے ہیں جو معاشرت کی غلط تصویریں کھینچ کر پڑھنے والے کو اور بھی دھوکے میں ڈالتا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری زبان میں ایک بھی ناول ایسا نہیں جسے تاریخی کہا جاسکے۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے بہت کوشش کی ہے۔ اور حتی المقدور کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، لیکن ابھی وہ بھی بہت دُور ہیں اور ہنوز معیار اعلیٰ

تک نہیں پہونچے۔ ان کے پہلے ناولوں میں تو بالکل ایک سرے سے ہندوستان کے موجودہ مذاق، بول چال اور معاشرت ہی کے نقشے دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ یہ آخری ناول کسی قدر بہتر ہیں لیکن لٹن، والڑاسکاٹ، اسٹینلے ویمن، ڈوما کی نادر تصنیفات کے سامنے انکی کوئی وقعت نہیں۔

(ب) ناول متعلق معاشرت موجودہ۔ یہ بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہم کو اپنے ہی زمانہ کی بہت سی اُن باتوں پر آگاہی ہوتی ہے جنکو روزمرہ دیکھتے ہیں لیکن دھیان میں نہیں رکھتے اور ناول نویس اپنے اعلی درجہ کے مشاہدہ۔ تخیل اور مطالعۂ طبیعت انسانی سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے بلکہ وہ موجودہ زمانہ کی تاریخ معاشرت کا بھی ایک نہایت عمدہ ذخیرہ ہوتا ہے۔ جس سے آیندہ نسلیں مستفید ہونگی اور آیندہ مورخین مفید حالات کی تفتیش کر سکیں گے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ حالات بالکل صحیح ہوں، خواہ نفس قصہ یا اصلی پلاٹ فرضی ہو لیکن سوسائٹی کی جو حالت دکھائی جائے اُسکے اصلی ہونے میں سرمو فرق نہ ہو۔ بادی النظر میں یہ آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں نہایت درجہ مشکل کام ہے خصوصاً ہمارے ایسے ملک میں جہاں قسم قسم کی عادات و معاشرت کے لوگ بستے ہیں اور خانگی حالات سے پردہ وغیرہ کے باعث آگاہی حاصل کرنا بہت دشوار ہے۔ اس لیے جیسا ہمنے اوپر لکھا ہے ناول نویس میں خاص قابلیتوں کی ضرورت ہے۔ اسکا مشاہدہ صحیح ہو، اُسکا دماغ تعصبات اور "فرض کر لینے کی" عادت سے خالی ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فلسفیانہ طبیعت رکھتا ہو اور آدمیوں کے دلوں کا حال پڑھ لینے اور اُنکے افعال کے نتائج کی جانچ کرنے میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ تھیکرے کے ناول پنڈنس اور ونٹی فیر یا ڈکنس کے آلیور ٹوسٹ اور کیوریاسٹی شاپ ملاحظہ ہوں۔ یا زولا، بالزک اور ٹالسٹائی کے ناولوں کو دیکھیے اور بعد کو اپنے ناولوں کے طومار سے انکا مقابلہ کیجیے ایک بھی سامنے ٹھہرتا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بدقسمتی سے بہت سے مصنف ایسے پیدا ہوگئے ہیں

جن میں واقعی قابلیت نام کو نہیں۔ قلم اُٹھا کر فراٹے کے ساتھ جو جی میں آیا اٹ سٹ لکھ مارا اور ناولسٹ بن گئے۔ ان میں چند مستثنیات بھی ہیں جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائیگا۔

(ت) **اخلاقی ناول** جس طرح شعر اور قصیدے سے انسان کے دل پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ قصہ کے پیرایۂ میں کسی اخلاقی پہلو کو بیان کرنے سے بھی بجائے خشک اور فلسفیانہ مضامین کے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی میں کثرت اس قسم کے ناول ہیں۔ ہمارے یہاں انکی کمی ہے اور اشد ضرورت ہے۔ بہت سے معاشرتی عیوب ہیں جن کو ہم دلچسپ طریقہ سے عوام کے سامنے پیش کرکے قصہ کے پیرایہ میں اُن مسائل پر سوچنے کے لیے مجبور کرسکتے ہیں اور اصلاح کرنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

(ث) **ڈٹکٹو ناول**۔ یعنی جرائم و رازہاے سربستہ کا کھوج اور اُنکے حالات۔ یہ نہایت دلچسپ قصے ہیں۔ انگریزی میں کانن ڈائل کا شرلاک ہوم مشہور و معروف ہے۔ جس سے ذہن و فکر کو قوت پہونچتی ہے۔ علی ہذا ولیم ڈی کوئی اور اوپنہائن کے ناول بھی بہت دلچسپ ہیں۔ فرانسیسی میں امیلی گبراؤ نہایت مشہور ہے۔

(ج) **خلاف فطرت قصے**۔ انکو لکھنا بہت مشکل ہے۔ بات تو جب ہے کہ واقعات ایسی خوبی کے ساتھ بیان کیے جائیں کہ بالکل صحیح معلوم ہوں۔ رائڈر ہیگرڈ کے ناول عائشہ اور کنگ سولومن مائن ملاحظہ ہوں یا ونس مالمه زدا.ò یا جولس ورن (فرانسیسی) کے عجیب غریب قصے دیکھیے، جنکو ایک دفعہ ہاتھ میں لیکر پھر ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

(ح) **تعلقات زن و مرد**۔ یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق ہے۔ وکٹوریا کراس۔ ہیوبرٹ ولیس۔ ایلینار گلن (جذبات عشق)۔ جمیس بلتھ وغیرہ ناول نویسوں نے انگریزی معاشرت کے اس پہلو کو ایسی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مذکورۂ بالا ناولوں کی خاص خاص شاخیں ہیں۔ انکو پورے طور سے ادا کرنا، بڑی خوبی کے ساتھ لکھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کسی فلسفہ یا علم سائنس کی کتاب پر قلم اُٹھانا۔ افسوس کہ ہم

ناول نویسی کی اہمیت اور ضرورت کو بخوبی نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ معاشرت و اصلاح پر انکا کتنا بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کوئی بڑے معرکہ کا ناولسٹ نہیں پیدا ہوا اور نہ ہونہار لکھنے والوں کی قدر کی جاتی ہے۔ بلکہ اُردو کے غریب ناول نگار تو بعض حلقوں میں ایسے بدنام ہوگئے ہیں کہ لوگ انکے نام سے دُور بھاگتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بیشک فضول دلچر ہونے کی وجہ سے اسی برتاؤ کے مستحق ہیں لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ عوام الناس کا۔ انکے خود اپنے مذاق خراب ہیں۔ ویسے ہی انکے لیے سامانِ دلچسپی پیدا کیے جاتے ہیں۔ انکا فرض ہے کہ اچھے ناول نویسوں کی ہمت افزائی کریں۔ انکی کتابوں کی اشاعت میں مدد دیں مع ہٰذا ناول دیکھنے والوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اسکو ایک قومی خدمت سمجھیں اور عوام الناس کے مذاق پر نہ جائیں بلکہ انکی اصلاح کرنے کی کوشش کریں اور ناول لکھنے کو ایک آسان کام نہ سمجھیں بلکہ بڑے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد قلم اُٹھائیں۔ اور ایسی تصنیف پیش کریں جس سے نہ صرف علم ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہو بلکہ موجودہ اور آیندہ زمانہ کے لیے ایک گراں بہا یادگار قائم رہے۔

علاوہ بریں میرے خیال میں ہمارے یہاں کے میگزین اور رسالوں میں بھی مختصر ناولوں کا زیادہ رواج ہونا چاہیے۔ منجملہ دیگر اسباب کے انکی ناکامیابی کا ایک یہ بھی بہت بڑا سبب ہے کہ ان میں عموماً خشک فلسفیانہ یا دیگر مضامین کی کثرت ہوتی ہے جنھیں عام لوگ دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ اگر یہ ناول با تصویر ہوں تو دلچسپی اور زیادہ بڑھ جائے گی اور انکی اشاعت میں مدد دیگی۔ تجارت کا بہت بڑا اصول مشتہر کرنا ہے۔ دیکھیے کس قدر صرفِ کثیر کرکے بڑے بڑے با تصویر اشتہارات جابجا چپاں کیے جاتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی نگاہ خواہ مخواہ پڑے اور اُنھیں پڑھنے پر مجبور کرے اور اُس چیز کے لینے کا خیال آئے۔ یہی حال رسالوں کا بھی ہے۔ تصاویر کی بہت بڑی کشش ہوتی ہے۔ ایک نہایت روکھے پھیکے مضمون میں وہ جان ڈالدیتی ہے۔ پھر کجا ناول وہ تو تامتر دلچسپی بنجاتا ہے۔ اس میں سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نہ صرف ایک عمدہ تصویر بلکہ عمدہ ناول بھی بغیر معقول اُجرت دیے ہوئے ہم نہیں پہونچ سکتا۔ جتنا گڑ ڈالوگے اُتنا ہی میٹھا ہوگا۔ اس لیے رسالوں کی ابتدا بھی

ایک اچھے سرائے کے ساتھ ہونا چاہیے اور بجائے لکھنے والوں کی خیرات پر چلانے کے انکو معقول اجرت دینا چاہیے اور عمدہ مصور جو بدقسمتی سے ہمارے ملک میں کمیاب ہیں لیکن نایاب نہیں ہیں ان کے ہنر کو کام میں لانا چاہیے۔ مجھے ایک مرتبہ ایک مشہور اڈیٹر سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا موقعہ ملا انھوں نے اعتراض کیا کہ عوام کی ناقدری کی وجہ سے اسکا چلنا بہت مشکل ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کبھی اس کا تجربہ کرکے بھی دیکھا گیا ہے جو پہلے ہی سے ناکامیابی فرض کرلی گئی اور گردن ڈال دی گئی۔ اب نہیں تو کبھی نہ کبھی وہ زمانہ ضرور آنے والا ہے کہ ہم اپنے لٹریچر کو اُس اعلیٰ پیمانہ پر پائیں گے جس رفیع پیمانہ پر دوسری زبانوں کا لٹریچر ہے۔ پھر کیا وجہ کہ اسکا آغاز ابھی سے نہ کیا جائے۔ مشک آنست کہ خود ببوید۔ اگر چیز اچھی ہے تو خود لوگوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔اور اشاعت میں ترقی ہوگی۔ اسکے لیے اپنے متمول اور قدردان فرقہ سے مالی امداد کا بھی ملتجی ہونا چاہیے۔ بہت سے قومی کاموں میں لاکھوں روپے صرف ہو رہے ہیں۔ مُلکی زبان کو بھی اس طرح ترقی دینا ایک بہت بڑا قومی کام ہے۔ میرے خیال میں ہمت اور ارادہ کی ضرورت ہے۔ مقصد و معیار اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ہو۔ اب مَیں اپنی زبان کے ناول نویسوں میں سے چند کو منتخب کرکے اُنکی بعض تصانیف پر ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ اس رائے زنی کو کسی خاص طرفداری یا تعصب پر محمول نہ کیا جائے گا اور نہ اسے کامل سمجھا جائے گا۔ کیونکہ ایک ہی دو ملنوں نے لیکر بحث کیگئی ہے۔ جب مجھے انکے دوسرے ناولوں کے پڑھنے کا موقعہ ملیگا تو اُنکے حسن و قبح سے بھی اسی طرح بحث کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۱) کُڑھم دُھم (مصنفۂ رتن ناتھ سرشار)۔ لکھنؤکے رئیسوں میں ایک صاحب بڑے مرزا نامی ہیں۔ انکی ایک صاحبزادی، عمر ۱۶ برس نوشابہ نام، ایک غیر شخص پر جن کو نواب بہادر کہتے ہیں، عاشق ہو جاتی ہیں۔ دونوں طرف سے نامہ و پیام کا عجب طریقہ اختیار کیا گیا ہے یعنی بندریا والی کے ذریعہ یا دریا میں چراغوں کی تھالی میں خط چھوڑ دیا گیا۔ جو بہتا ہوا دوسری طرف

چلا گیا اور عاشق صاحب نے جن کا محل بھی قریب ہی تھا فوراً اُٹھا کر پڑھا اور اُسی طرح جواب دیا گیا۔ لیکن اس لڑکی کے ایک خالہ زاد بھائی چھوٹے نواب نامی بھی بے طرح پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ میرے ہی ساتھ عقد ہو۔ لڑکی کو یہ منظور نہیں، اسی دُھن میں اُنھوں نے ایک ڈھنڈھورے والے کو محل کے پاس بھیجکر یہ اعلان کرادیا کہ نواب بہادر مرگئے۔ جسکو سنتے ہی نوشابہ کو غش آجاتا ہے۔ سب لوگ اُسے مردہ خیال کرکے رونا پیٹنا شروع کردیتے ہیں۔ اسکے بعد بہنیں وغیرہ جمع ہوجاتی ہیں۔ صحت یابی ہوتی ہے۔ بیچارے بنگالی ڈاکٹر کی دُرگت بنائی جاتی ہے اور ایسا پھکڑ مذاق ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر لکھنؤ کی شریف زادیوں کا یہی حال ہے تو دُور سے ایسی شرافت کو سلام۔ ایک من چلی بیاہی ہوئی عورت موسوم بہ حور لقا بیگم محل کے اوپر سے ایک غیر شخص کو جو دریا میں کشتی پر جارہا ہے اپنی طرف بُلاتی ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے "کوئی اَدھیر سا آدمی سفید پوش ایک چھوٹی سی کشتی میں خود کھیتا ہوا دریا میں نظر آیا۔ حور لقا کے گویا شکار ہاتھ لگا۔ چق اُٹھا کر سامنے کھڑی ہوگئی اور اپنا مُکھڑا دکھایا وہ دیکھکر غش غش کرنے لگا انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا ......" اس غریب کو دھوکا دیکر دوسرے دن خوب مذاق کیا گیا۔ جب ڈاکٹر بابو آئے اور اُنکی زبان سے کوئی لفظ نکل گیا جو ہنسی کے قابل تھا تو "حور لقا بیگم تھیں دل کی صاف۔ نیک پارسا گر بیباک ڈاکٹر کا اتنا کہنا تھا کہ یہ جھپاک سے پردہ کے باہر ڈاکٹر کے سامنے بس پہنچ ہی تو گئیں"۔

یہ بیگم صاحبہ اپنی چھوٹی بہن نوشابہ کی زبانی چراغوں کے طباق کا حال سن کر "حور لقا پھر لپٹ گئیں = جبھی تم کہتی تھیں کہ بند ریا والی تدبیر سے کہیں اچھی تدبیر بیشک کہیں بڑھ گئی۔ جیتی رہو بہن اللہ تمھیں زندگی دے تمھاری آرزو بر لائے" یہ گویا اپنی چھوٹی بہن کو عمدہ اخلاق کا سبق دیتا ہے !!

اب ذرا نوشابہ کے عشق کا حال سُنیے۔ "بہن ایک دن میں سرِشام ہوا کھارہی تھی ایک بجرا دکھائی دیا۔ دیکھا تو نہایت ہی حسین نوجوان پاس آیا تو دل ہاتھ سے جاتا رہا ..... تصویر

دیکھی تو اور بھی طبیعت بیقابو ہو گئی۔ میری وہ تصویر جو دولہا بھائی نے کھنچوائی تھی وہ میں نے بھیجدی" اس تصویر کو جب حور لقا بیگم نے دیکھا تو فرمایا "کیا اچھے اچھے ہاتھ پاؤں سڈول ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ڈنڑ مگدر کا بھی شوق ہے۔ ایک بات ہے نوشابہ انہیں چاہے بُرا مانو یا بھلا، جب یہ تمھارا ہوگا ہم لپٹا کر چوما ضرور کریں گے۔" نوشابہ نے ہنس کر جواب دیا "میں اس بات کی قسم کھاؤں۔ تم بڑی روٹی اُٹھاؤ کہ بس چوما چاٹی تک معاملہ رہے گا۔ نہیں تو بہنوں میں سوتیا ڈاہ ہوجاوے گی۔" اس شگفتہ بیانی کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اُسی میں نوشابہ کا ذرا عشق ملاحظہ ہو کہ اپنے دلدادہ کے متعلق کہتی ہیں "ہاں دال روٹی سے خوش ہیں۔ نوٹ ہیں اور علاقہ بھی ہے۔" بیشک اسی کا نام سچا عشق ہے جس نے غشی تک حالت پہونچادی تھی !!!

آگے چل کر رت جگے کے موقعہ پر دو شریف زادیوں میں یوں گفتگو ہو رہی ہے :۔

ممتاز۔ تو معلوم ہوتا ہے تم کو کوئی غیر ذالک مرد چومے تو بُرا نہ مانو۔

حور لقا۔ برا ماننا کیسا۔ لے وہ ایک دفعہ چومے تو میں سو دفعہ چوموں اور چوما ہی ہے، ابھی پرسوں زینت النسا بیگم کے میاں نے لپٹایا تو میں نے مارے بوسوں کے بَوبا بَولا دیا۔ ہانپنے لگا جیسے بھینیں۔

"آگے چلئے" حور لقا۔ غرضیکہ اکیلے میں خوب چوما آئیں۔ چین کرو۔

ممتاز۔ تمھارے مُنھ میں پانی بھر آیا ہوگا۔

حور۔ اخاہ بے زبانوں کو بھی ہمارے لیے زبان آئی۔ ہمارے مُنھ میں کیوں پانی بھر آنے لگا۔ پانی اُنکے منھ میں بھر آئے گا جو سوا میاں ٹٹروں ٹوں کے اور کسی کو جانتی ہی نہیں۔ یہاں تو جہاں کوئی نکیلا جوان گبھرو دیکھا دوگال ہنس بول لیے۔ ذری چوما چاٹی کی۔ دو چار بوسے اُسنے لیے دو چار ہمنے لیے۔ یہی زندگی کا مزا ہے۔"

آگے چل کر جہاں نوشابہ کی شادی ہوئی ہے، دولہا حور سے کہتے ہیں۔

"ہمارا دل تو اس وقت آپ کی شوخی کے مزے لے رہا ہے۔"

حور۔ اگر تم گورے چٹے ہوتے تو لپٹ کے چوم لیتی۔"

ان تمام باتوں پر بھی ناولسٹ کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ لڑکی بڑی پارسا تھی، صرف شوخ طبع تھی !! شادی عجیب طرح سے ہوئی۔ بڑے مرزا سوتے کے سوتے رہ گئے۔ اور وہیں دیگر عزیزو اقارب نے آکر چپ چاپ اُنکی لڑکی کی شادی کردی لیکن اُنھیں مطلق خبر نہ ہوئی۔ تو شابہ نے چلتے چلاتے ایک نصیحت آمیز خط اپنے پدر بزرگوار کو لکھا جس کا یہ اثر ہوا

مرزا صاحب نے خط پڑھا اور ایک ایک حرف پڑھ کر اپنے اوپر نفریں کی کہ میری عقل پر کیا پتھر پڑ گئے تھے جو مجھے اپنی ہونہار سعادت مند نیک بخت لڑکی کے نیک و بد میں تمیز نہ ہوئی۔

ناظرین ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور خیال کریں کہ کوئی بھی بات اس ناول میں نیچرل ہے اور یہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ جسے ہم اپنی زبان کا بڑا ناولسٹ کہتے ہیں اور جسکی کتابیں بڑے ذوق شوق سے شریف گھرانوں میں بھی شاید پڑھی جاتی ہیں۔ اگر ان کے اور بھی ناول اسی قسم کے ہیں تو خدا کی پناہ۔ مسلمان شریف سوسائٹی کی کیسی مٹی پلید کی ہے۔ یہ درپردہ اسکے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

میں اُسکی شایستہ زبان کی البتہ داد دیتا ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ جہاں کہیں لُچوں، بدمعاشوں ڈنڈ بازوں۔ شرابیوں اور افیمچیوں۔ رنڈیوں، خانگیوں اور بھٹیاریوں کی صحبت بیان کی ہے واقعی قلم توڑ دیے ہیں اور سچا مرقع پیش کیا ہے۔ لیکن کاش وہ اپنی جولانیِ طبع کو انھیں تک محدود رکھتے اور لکھنؤ کی شریف زادیوں کے متعلق جن کی شاید صورت بھی کبھی دیکھنا نہ نصیب ہوئی ہوگی ایسی ہرزہ سرائی نہ کرتے

(۲) **حسن کا ڈاکو و اسرار دربار حرام پور** (مصنفۂ عبدالحلیم شرر)۔ یہ اس مصنف کے بڑے پایہ کے ناولوں میں گنا جاتا ہے اور بظاہر بہت مقبول ہوا ہے کیونکہ دو اڈیشن بہت جلد طبع ہوے ہیں۔ اخلاقی تنبیہ کے لیے بیشک جن لوگوں کی طرف اِس کا اشارہ ہے ممکن ہے کہ وہ اسکے دیکھنے سے پیچ وتاب کھائیں اور دوسروں پر وہ ہولناک واقعات بد اخلاقی ظاہر ہوں جن کا واقعی اگر ایک حصہ بھی صحیح ہے تو بڑی شرم اور افسوس کی بات ہے۔ اور مسلمان سوسائٹی

کے لیے باعث ننگ و عار ہے۔ لیکن نفس مضمون کو چھوڑ کر یہ دیکھیے کہ آیا اُسے نیچرل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے یا نہیں۔ اوّل تو مہ لقا بیگم ایک کم عمر لڑکی کا دُلھنوں کے بھگا لیجانے کے راز کو سمجھ کر اپنی بہنوں کی خاطر اپنی قربانی کے لیے تیار ہو جانا محالات سے ہے۔ ایک نہیں ہزار میموں کی صحبت ہو پھر بھی ہماری لڑکیوں میں ایسی جرأت پیدا ہونا ناممکن ہے۔ بلکہ یورپ میں بھی ایسی عورتیں شاذ و نادر ہی ہوں گی۔ دوّم اسکے عاشق محمد منیر کا ان تمام ارادوں سے پہلے آگاہ ہو جانا لیکن نہ روکنا خلاف فطرت ہے۔ جنّات وغیرہ بھی ایسی فوق العادت باتیں ہیں جن پر اس قدر زور دینا خصوصاً موجودہ زمانہ کی تعلیم و تربیت میں مشکل سے یقین کے قابل ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ منیر ایسے پڑھے لکھے شخص کو انپر ایک لحظہ کے لیے بھی یقین آسکے۔ سوّم ایک دوسری لڑکی کا مرد کے بھیس میں صورت سنگھ نام رکھ کر اپنے منگیتر کے ساتھ عرصہ تک گفت و شنید کرنا۔ پھر وہ بھی پولیس مین ہو کر مطلق شبہ نہ کر سکیں کہ مرد ہے یا عورت۔

عشق و عاشقی کے جذبات بھی کسی قدر رُوکھے پھیکے دکھائے گئے ہیں مثلاً منیر کی تو یہ حالت

"دو مگماں کچھ آہٹ ہوئی۔ دل بلیوں اُچھلنے لگا کہ آگئیں مگر بعد کو معلوم ہوا کہ نہیں میرا ہی گھٹنا میز سے ٹکرا گیا تھا۔

اسی طرح چند منٹ میں صدہا دھوکے ہوئے۔ آرزوؤں کے عالم میں فوری جوش پیدا ہوتا ہے اور ایک طوفان سا اُٹھتا ہے۔ اور آناً فاناً میں غائب ہو جاتا ہے۔ امیدیں بدمستانِ خرابات کی طرح بار بار اُٹھتی ہیں اور مچل مچل کے گرتی ہیں۔"

اسکے بعد وہ آتی ہیں اور یاں دیگر کہتی ہیں۔

"لو میں اسی کو دینے کو آئی تھی۔ بس جاتی ہوں۔"

محمد منیر۔ ایں کیا آئیں اور کیا چلیں۔

مہ لقا۔ (گھبراہٹ کے ساتھ) ہاں میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتی جو کچھ کہنا ہو جلدی کہو۔

محمد منیر۔ تمہیں دیکھ لیا اور سب کہ لیا۔

مہ لقا۔ اوئی۔ میں نے تو خاک نہیں سنا۔ اے ہوش میں ہو کہ نہیں؟

اسکے بعد کچھ اِدھر اُدھر کی مولوی صاحب اور شہزادی زندگی کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ پھر آگے چلکر۔

"یہ کہ کے اُس نے مہ لقا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور چاہا کہ گلے لگالے مگر وہ ہاتھ جھٹک کے دُور جا کھڑی ہوئی اور تیوری چڑھا کے بولی۔ تمھاری یہی حرکتیں ہیں تو خبردار یہاں نہ آنا تم شریفوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔"

ممکن ہے کہ شرر کو اپنے اس سین پر ناز ہو۔ لیکن ہمیں تو جذباتِ لطیفہ سے وہ کچھ خالی خولی سا نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ڈھیلا مار دیا۔

بعدہٗ جب وہ غائب ہو جاتی ہے تو منیر کی یہ حالت ہوتی ہے

"(جوش کے ساتھ) دیکھو یاد آتے ہی وہ سامنے آکے کھڑی ہوگئی۔ اب اسکی زیارت کروں۔ اسکی پیاری باتیں سنوں یا دنیا کے جھگڑوں میں مبتلا ہوں۔ افسوس تم اکیلی گئیں اور مجھے ساتھ نہ لیتی گئیں۔ یہ تو عہد وفا کے خلاف تھا۔ ہاں یہ تم نے سچ کہا مجھے پہلے ہی خبر دے دی تھی ... وہ تمھارا خط گلشن مجھے خوب یاد ہوگیا۔ تیار بیٹھا ہوں کہ تمھاری کوئی تحریر آئے اور فرفر پڑھ لوں۔"

یہ ہملٹ کی طرح اپنے دل سے دیوانہ وار گفتگو کرنا عجیب بے رنگ معلوم ہوتا ہے خصوصاً جب یہ خیال کیا جائے کہ ایسی حالت میں اُسے اپنے اوپر نفریں کرنا چاہیے تھا کہ کیوں احتیاط سے کام نہ لیا۔ اور سب سے زیادہ بھگا لیجانے والوں پر غصہ اور انتقام کے جذبات کا اظہار ہونا چاہیے تھا جنکا کہیں پتہ نہیں۔ مصنف ایک جگہ مہ لقا کے متعلق منیر کی زبانی یوں لکھتے ہیں :—

"مگر وہ خیرخواہی کے جوش میں اندھی ہو کے کنوئیں میں پھاند پڑی اور اپنے نیک و بد کا ذرا بھی خیال نہ رہا"

لیکن ناول کے واقعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسکی اختیاری بات نہ تھی۔ البتہ شادی کو ملتوی کرا سکتی تھی۔ لیکن بھگا لیجانا دوسروں کا کام تھا۔ اور یہ کہ پہلے سے اُسکو اپنی اس حالت کا الہام ہوا ہو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کیونکر ایک چھوٹی سی لڑکی کے دل میں ایسا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ درانحالیکہ بڑے بوڑھوں کو اگر ذرا بھی اندیشہ ہوتا تو شادی ہی ایسے زمانے میں کیوں ہونے دیتے۔

بعض جگہ مولانا کے استعارے عجیب غریب ہوتے ہیں۔ مثلاً حسن کا ڈاکو جلد اول صفحہ ۸۹ "ان آنکھوں کے جھونکے جن کے ہولناک تھپیڑوں سے کشتی عمر ڈگمگا رہی تھی کم ہوئے تو آنسو پونچھ کر کہنے لگا۔"

مہ لقا حد درجہ کی ہوشیار لڑکی تھی۔ منیر سے کہتی ہے۔

"شرط یہ ہے کہ تم بھی عمل و جھاڑ پھونک کا عمل سیکھ لو۔ اس فن میں اپنے اُستاد کے شاگرد ہو جاؤ"........

شاید اُسے مولانا پر پہلے سے شبہ ہوگا۔ منیر تو بالکل ہی دل کے بودے نظر آتے ہیں۔ مردمی کی حالت ہے کہ معشوقہ تو اتنے خطرناک سفر کی تیاریاں کر رہی ہے اور آپ فرماتے ہیں۔

"تمھارے جانے کے بعد میرا سوا اسکے اور کام ہی کیا ہوگا کہ تم سے لو لگائے بیٹھا رہوں اور جب کبھی تمھارا حکم ملے سجا لاؤں"

مہ لقا ۱۶ برس کی کمسن لڑکی نے پہلے ہی سے پیش بندی کرکے ایک عجیب نیا خط ایجاد کیا ہو واقعی ایسی ذہین لڑکی جیسا مصنف آگے چل کے لکھتے ہیں لاکھوں میں ایک ہی ہوگی۔ ہمیں تو کچھ عنقا سی معلوم ہوتی ہے۔

شرر کے ناولوں کے بعض ابواب کے شروع میں ایک عجیب استعارہ آمیز سین کھینچا جاتا ہے جسکی مثال شاید دنیا کے کسی ناولسٹ کے یہاں نہ مل سکے۔ ایک دو مرتبہ خیر کچھ ہرج نہیں لیکن جگہ بے جگہ اور موقعہ بے موقعہ اسکو داخل کر دینا ہمارے خیال میں کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔

مثلاً حُسن کا ڈاکو۔ حصۂ اول صفحہ ۵۶

"افق مشرق کسی لیلا اساس نمکین و سانولی معشوقہ کی طرح مسکرایا۔ ساتھ ہی مرغِ سحر نے بانگ دی کہ گویا ظاہر کیا کہ میں سوتا نہیں بلکہ اس ادائے ناز سے لطف اُٹھانے کے لیے جاگ رہا ہوں.... اس ہنگامہ میں شیخ و برہمن بھی اور قیامت یہ ہوئی کہ شب وصال کے ستائے پیارے مہمانِ شب بھی جاگ اُٹھے.... اسی وقت ہمارے مہربان مولوی سعد اللہ نے کُلبلا کر آنکھ کھولی"

یا ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ جلد اول صفحہ ۲۸

"درختوں میں نئی کونپلیں نکل رہی ہیں بعینہ جیسے کہ کسی حسرت زدہ کے دل میں نئی امیدیں پیدا ہوتی ہیں۔ مکان میں پنکھے کھینچنے لگے اور خس خانوں کی تیاریاں ہو رہی ہیں"

انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بے تکاپن نہیں ہے تو کیا ہے۔ شرر کی زبان گورتن ناتھ اور سجاد حسین

کی طرح زیادہ بامحاورہ وشستہ نہیں ہے اور اُسکے ناولوں میں بہت سے نقص ضرور ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ پلاٹ کو وہ نہایت خوبی کے ساتھ اُٹھاتا ہے۔ اور اسکے بعض تاریخی ناول تو اپنی تحقیق وتفتیش کے لحاظ سے اُردو زبان کے سرمایۂ ناز سمجھے جاسکتے ہیں۔

(۳) **طرحدار لونڈی** (مصنفۂ منشی سجاد حسین صاحب)۔ اس ناول میں یہ خصوصیت ہے کہ آدمیوں کے جذبات یا اُنکے حالات بیان نہیں کیے گئے بلکہ اُنکی گفتگو اور افعال کو دکھاکر ایسا ہو بہو فوٹو کھینچا ہے کہ تمام کیرکٹر تصور کے سامنے جیتی جاگتی تصویروں کی طرح پھرنے لگتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ تصویریں سچی ہیں۔ جو معاشرت دکھائی گئی ہے وہ خیالی نہیں ہے بلکہ واقعی واصلی ہے۔ یہی اس ناول کی بڑی خوبی ہے اور ہمارے خیال میں زولا کی اُس تعریف پر کہ "ناول کو آئینۂ معاشرت ہونا چاہیئے" پوری طورسے سچا اُترتا ہے۔ جو سین اس میں دکھائے گئے ہیں وہ ایسے نیچرل معلوم ہوتے ہیں اُنکی اصلیت یقین کی طرح دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے علم وتجربہ میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے۔ ہم اُسکے اقتباسات پورے طورسے اس مختصر مضمون میں نہیں کرسکتے لیکن ناظرین کے لیے حوالہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں (۱) صفحہ ۱۷۔ مالک ونوکر کے باہمی برتاؤ پر خوب بحث کی ہے۔ (۲) ۴۴ صفحہ۔ بخشو اور اُسکی بیوی کی جوتی پیزار کا حال کیا نیچرل ہے۔ (۳) صفحہ ۸۴۔ بخشو وبجبیا کی عشقبازی خوب لکھی ہے۔ پھر آگے چلکے ایک دوسرے نوجوان کے ساتھ آنکھیں لڑانا کیسا عمدہ بیان کیا ہے۔ صفحہ ۱۴۳ پر بھی اسی سین کو بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو

"بجبیا دانت میں پان دباکر نوجوان کی طرف رُخ کرتی ہے۔

نوجوان (بے تکلفی کرکے چٹاخ سے) بھلا سیب کو چھوڑکے پتے کس نے کھلائے ہیں ......؟

بجبیا۔ ... ارے تم مردوذات ٹھیرے۔ تمہیں کیا۔ اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کے ڈینگ مارو گے۔ آبرو ہے جسکی بجائے گی اُسکی بجائے گی۔ ہم تو کہیں منھ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے (آنکھوں میں آنسو بھرکے) آج تک کسی اور سے واقف نہیں۔ تم کو دیکھ کے جی چاہا دو باتیں کریں ......"

(۴) صفحہ ۱۸۴ - صاحبخانہ اور بیگم صاحب کی ناچاقی کو جیسی شریفوں میں ہوسکتی ہے خوب دکھایا ہے خصوصاً ایسی کمزور طبیعت کا آدمی جیسے نواب صاحب ہیں، یہی کرتا ہے کہ اپنا الزام بیوی پر ڈالتا ہے - اُس غریب کا دل گھر سے جانے کو نہیں چاہتا اور اسکی مجبوری واقعی بڑی قابل افسوس معلوم ہوتی ہے -

صرف دو تین معمولی اعتراض کیے جا سکتے ہیں - اوّل تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنی بڑی چوری ہوجانے کے بعد بیگم کا ملال ایسا نہیں دکھایا گیا جیسا ہونا چاہیے - دوم حیرت ہے کہ مُنّے صاحب جنھوں نے اپنے گھر میں نصیبا کو برابر دیکھا ہوگا اپنے دوست سعادت کے اس قدر پتہ دینے سے بھی اسے پہچان نہیں سکتے - سوم یہ کہ جذبات کو بالکل بیان نہیں کیا گیا - اور پلاٹ نہایت معمولی ہے - زبان کے متعلق ہم صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ اگر اسکے تمام محاورات کو جمع کیا جائے تو ایک پوری ڈکشنری بنجائے -

(۴) **کایا پلٹ** - اسی مصنف کا ایک دوسرا ناول ہے - ہمارے خیال میں ناول الذکر سے بہت گھٹیا ہے - موکل کے جھگڑے اور روحانیت کے سنجیدہ مسئلہ کو لاکر پلاٹ کسی قدر بگڑ گیا ہے خصوصاً دوسرے حصہ میں جہاں غباروں وغیرہ کا ذکر ہے خیالات بہت اُکھڑے سے معلوم ہوتے ہیں - تاہم جو بات دکھانا چاہی ہے اُسکا نقشہ نہایت خوبی کے ساتھ اُتارا ہے - گوہر بیگم کی عشق بازی کا حال نہایت عمدگی کے ساتھ دکھایا ہے - ناولسٹ نے پہلے ہی سے یہ بتا کر کہ اس لڑکی کا حسب نسب کیسا بگڑا ہوا تھا - اسکی تربیت و تعلیم کیسی بے ترتیب ہوئی تھی، ہمیں یہ سمجھنے کے قابل کردیا کہ جو بیباکیاں اُس سے سرزد ہوئیں وہ واقعی ممکن ہوسکتی تھیں - کیونکہ ہر نتیجہ کے کے ساتھ اُسکا ایک خاص سبب بھی ہونا چاہیے - جسے واضح کرنا لکھنے والے کا فرض ہے - یہی بہت بڑا فرق ہے جو رتن ناتھ کی فسانہ اور سجاد حسین کی گوہر بیگم میں پایا جاتا ہے جسکی وجہ سے پہلی کی تصویر کو ہم جھوٹا خیال کرتے ہیں اور دوسری کو سچّا - اس ناول میں بعض حصے بڑے غضب کے ہیں مثلاً (۱) <u>بڑی بی کا قیافہ</u> - سوکھی اچھور - سن سفید - گوری چٹی - نکٹی چھری سے

ترکاری جھیل رہی ہیں ۔ باچھوں سے پیک بہ بہ کر ٹھڈی کا محاصرہ کیئے ہے ..... (صفحہ ۱۶)
بڑی بی اول تو خواجہ خضر کی ہم عمر ۔ سوکھی سہمی ۔ سارے جسم پہ جھرّیوں کا اُتُّو ۔ بال کیسر سفید ہو کر چھوٹے ہی ہو گئے تھے ۔ جوڑے کے قبضے نہ چوٹی کے پیچ ہیں آنے والے ہر وقت پھولے پھالے روئی کے گالے ۔ پیشانی پر شکنوں کے مارے جنتری کا عالم .... ستواں ناک پیری کے بارسے خم ہو کر طوطے کی چونچ ۔ گال پچّے ۔ ٹھڈی خشک سیب کی طرح چھوارا ۔ منھ میں اگرچہ ایک دانت نہیں مگر جبڑے نہایت زور سے بھنچے ہوے ۔ لب بٹوے کی شکن سے سوا کسے کسائے ۔"

(۲) صفحہ ۹ " مس گریہم بھی ڈوا فری پر سانے کی طرح پھولی نہیں سماتیں ۔ چہرہ فرط نازش سے دیسی بیگن ہو رہا ہے ۔"

(۳) صفحہ ۸ ۔ " لاکھ لاکھ زور لگاتے ہیں گر بیچے صاحب آج ہوتے ہیں نہ کل ۔ ایسی زمین پکڑی ہے کہ جاول بھر تو کھسکتے نہیں ۔ نہیں معلوم ٹلس کا ڈر ہے یا اسکول کا خوف ، امتحانوں کا دھڑکا ۔ گھر بھر خوشامد میں مصروف گر آپ ہیں کہ مچلے ہوے ۔"

(۴) صفحہ ۲۱ ۔ " دستور ہے خاندان میں ذرا اُچک جائے ۔ پھر حشرات الارض کی طرح اعزہ و اقربا کی بم خدا جانے کہاں سے پھوٹ نکلتی ہے ۔ ایک عالم ہے کہ اپنا شجرہ میاں کریم سے یوں پیوند کر رہا ہے جیسے قلمی آم کی شاخ سے پپیہا ۔"

(۵) صفحہ ۲۷ ۔ لیڈی ۔ معاف کیجیے ۔ پردہ نشین یا بے بی مشین ۔"

(۶) صفحہ ۲۹ ۔ " اسکا دل زور دار کمانی تھا کہ صدمہ اُٹھا کر ادھ چکا اور اُدھر تن گیا ۔"

(۷) صفحہ ۴۱ ۔ ایک حسین لڑکی کا حلیہ نہایت ہی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے ۔

(۸) صفحہ ۶۹ ۔ مولوی صاحب کے اضطراب کو خوب دکھایا ہے ۔

(۹) صفحہ ۷۱ ۔ موکل کی معشوقہ کا کیرکٹر خوب بیان کیا ہے ۔

(۱۰) صفحہ ۸۸ ۔ گوہر بیگم کے دل میں جو جذبات عشق پیدا ہوے ہیں خوب ہی انکی تصریح کی ہے صفحہ ۸۸ اور ۸۹ کو بھی دیکھیے ۔

(۱۱) مولوی صاحب کو دیدارِ جاناں نصیب ہوتا ہے (صفحہ ۹۲) "غرض کہ آدمی سے دمڑی کے پٹے باز نظر آئے۔ گوہر بیگم لاکھ شوخ بیباک تھی مگر تھی تو اَنیلی۔ پہلے اچانک نظر بھر کر دیکھ لیا مگر پھر نظر نیچی کی تو کسی بوجھ سے اُٹھا ہی نہ سکی۔ ساکت بےحس جہاں کی تہاں کاٹھ ماری کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نیچی نظر کیے مَہری سے رُکھائی کے ساتھ بولی "بھئی مَہری اب چلو"۔ نیچرل تصویر سامنے کھڑی کر دی ہے۔

(۱۲) صفحہ ۹۰ "مَہری بات کے پہلووں ان ناتجربہ کاروں کے منصوبوں کو بڑے شوق سے حافظ کے بٹوے میں تمبا کو اور چھالیہ کی جگہ رکھتی جاتی تھی"۔

(۱۳) صفحہ ۱۰۶۔ تیئسویں باب کے شروع میں خواہشاتِ انسانی پر کیا خوب فلسفیانہ مضمون لکھا ہے۔ مولوی صاحب کے انتظارِ معشوقہ کا تیئر (حسن کا ڈاکو) سے مقابلہ کیجیے۔

(۱۴) صفحہ ۱۲۳ "سحرِ حُسن ٹوٹا ..... خاموش ہو رہتے" یہ تمام عبارت قابلِ مطالعہ ہے اور سچائی سے بھری ہوئی ہے۔

(۱۵) صفحہ ۱۳۶ "گوہر بیگم زاد آزادیہا ...... انھوں نے پیرانہ سالی میں یہ ترکیب نکالی تھی کہ ایک ہم عمر افیونی ڈومنی سے جس کا کس بل مرورِ ایام کے چَوتالے کی تھاپ سے پھٹے طبلے کے تسموں کی طرح ڈھیلا ....."

اس چھوٹے سے ناول میں اتنی باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانے سے ہمارا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ دیکھیں کہ اُردو میں بھی کیسے جدّت اور خوبی کے ناولسٹ موجود ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ سجاد حسین کا ہماری زبان پر بہت بڑا احسان ہے۔

(۵) **امراؤ جان ادا** (مصنفہ مرزا رُسوا صاحب) جس قدر ہمیں دلچسپی و مسرت اس ناول کے پڑھنے سے ہوئی ہے شاید ہی کسی دوسری کتاب سے ہوئی ہوگی۔ اسکی وجہ نہیں کہ یہ ایک بازاری عورت کی صرف سوانحمری ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس میں لکھنؤ کی غدر سے قبل کی معاشرت کے ایسے سچے سین دکھائے گئے ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ ہوبہو

پھرنے لگتے ہیں۔ یہ اُس زمانہ کا تاریخی ناول ہے اور ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اگر ان واقعات کی کوئی اصلیت نہ بھی ہو اور وہ صرف مرزا رسوا کے ذہن وطباعی کا نتیجہ ہوں تو اس کتاب کی اور بھی زیادہ قدر کرنا چاہیے اور اسکے مصنف کو اعلیٰ ترین ناول نویسوں میں سمجھنا چاہیے

صفحات ۴۹ - ۶۱ - ۹۶ - ۹۸ - ۹۹ - ۱۲۳ - ۱۲۴ - ۱۳۵ - ۱۵۱ - ۱۵۳ - ۱۶۰ - ۱۶۷ - ۱۷۸ - ۱۸۰ - ۱۸۷ - ۱۹۲ - ۱۹۶ - ۱۹۷ قابل دید ہیں۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ عبرت انگیز واقعہ اس ناول میں وہ ہے جہاں یہ دکھایا گیا ہے کہ دو لڑکیاں جو بیچڈالی گئی تھیں ان میں سے ایک تو رنڈی ہوئی، دوسری قسمت کے پھیر سے بیگم بنی۔ جب دونوں ملی ہوں گی تو پہلی کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

اس مختصر ریویو کے بعد ہمیں یقین ہے کہ ناظرین ناول کے مفہوم اصل کو بخوبی سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بھی ظاہر ہوگیا ہوگا کہ اس قلیل عرصہ میں گو اس خاص شعبۂ علم ادب میں ایسی ترقی نہیں ہوئی ہے جیسی ہونا چاہیے۔ تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں نذیر احمد۔ رسوا۔ سجاد حسین اور شرر کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اور اُمید رکھنا چاہیے کہ آئندہ انکے ہم پلہ یا شاید ان سے بھی اچھے ناولسٹ پیدا ہو سکیں۔ جسکے لیے بڑی شرط یہ ہے کہ قابل وتعلیم یافتہ لوگ لکھنے کی طرف متوجہ ہوں اور اُنکی حوصلہ افزائی۔ مالی امداد۔ اخبارات کے ریویو۔ اور انکی تصانیف کو زیادہ مشتہر کرنے کے ذریعہ سے عمل میں لائی جائے۔ بخلاف اسکے رطل اُڑانے والوں کا ایک سرے سے بائیکاٹ کیا جائے۔ اور انجمن ترقی اُردو کی ایک خاص کمیٹی ہو جس میں ان تصانیف پہ بحث کرنے کے بعد انکے متعلق سچے اور غیر طرفدارانہ ریویو رسالوں اور اخباروں میں شایع کیے جائیں۔ اب رہے غیر زبان کے ناولوں کے ترجمے۔ میں اسکے بالکل خلاف ہوں۔ ہاں البتہ اگر کوئی ایسی ہی غیر معمولی اور اعلیٰ درجہ کی تصنیف نظر آئے اور یہ یقین ہو کہ اُردو خواں ناظرین اُس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے یا اُنکی دلچسپی کا باعث ہوگی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ رینالڈز کی مسٹریز آف لنڈن کا ترجمہ بڑا مقبول ہوا۔ جس سے افسوس ہے کہ سوا اسکے

اور کوئی بات نہیں نکلتی کہ عوام کا مذاق بداخلاقی کے قصوں کہانیوں کی طرف کس قدر جھکا ہوا ہے۔
ممکن ہے کہ رینالڈز بڑے پایہ کا ناولسٹ ہو لیکن تھیکرے اور ڈکنس اُس سے بھی بڑھ کر ہوئے ہیں
پھر کیا وجہ کہ انکے ترجمے نہیں ہوے۔ صرف اس لیے کہ ان میں وہ " مزے دار" سین کہاں
جن سے صرف ایک بدمذاق شخص ہی چٹخارے لے سکتا ہے اور حظ اُٹھا سکتا ہے۔

چونکہ یہ فن ایشیائی علم ادب میں ابھی بالکل جدید ہے اس لیے میرے خیال میں نئے لکھنے
والوں کو یوروپین زبانوں کے چند منتخب ناولوں کا اولاً مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور غور کرنا چاہیے
کہ کسطرح اُنھوں نے پلاٹ کو اُٹھایا ہے۔ کیسے سین دکھائے ہیں اور کیا کیا جذبات و خیالات و مشاہدات ظاہر و
آشکارا کیے ہیں۔ اس طرح انکا جوہر اصلی اُنکے دماغوں میں سرایت کر جائیگا اور لکھنے میں
[illegible] دیگا۔ جس سے مطلب یہ نہیں ہے کہ اُنکی نقل کیجائے بلکہ صرف اُنکے اصولوں کا اتباع
[illegible] جائے اور اپنے مُلک کی معاشرت وغیرہ کا نہایت غور کے ساتھ خاص طور سے مشاہدہ کیا جائے۔
چھوٹی چھوٹی فطرتی باتوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ شروع میں اگر یہ قوتِ (یعنی مشاہدہ) کسی قدر
[illegible] زور ہو تو اسکو نشوونما دینے کی بڑی عمدہ تدبیر یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا یا سنا جائے اسکو روزمرہ
[illegible] بند کرنے کی کوشش کیجائے۔ اور ایک روزنامچہ تیار کیا جائے۔ اسی طرح نیچرل سینری بھی
[illegible] جائے۔ تو پڑھنے والے کے سامنے ایک اچھی خاصی تصویر کھڑی ہو جائیگی۔ اسی لیے
[illegible] ولسٹ کا مرتبہ مصوّر۔ نقاش۔ موسیقی داں۔ اور دیگر ماہرین فنون لطیفہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔
[illegible] لاً چھوٹے چھوٹے قصوں سے شروع کرنا چاہیے ذیل میں چند ناولوں کی فہرست دیجاتی ہے جو میرے
[illegible] ل میں دیکھنے کے قابل ہیں۔ اسکو میں ہرگز مکمل نہیں کہتا کیونکہ دوسرے سیکڑوں ناول
[illegible] ی درجے کے ہیں۔ لیکن ان معدودے چند کے مطالعہ سے بھی یوروپین مصنفین کے مختلف
[illegible] اور طرز بیان کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے۔

(1) Dickens - Pickwick Papers　(3) Thackery - Vanity F[illegible]
(2) " - Olive Twist　(4) " - Penden[illegible]

(5) Lytton – Last-days of Pompeii
(6) Dumas – Monte Cristo
(7) " The Three Musketeers
(8) Balzac – Cousin-pons
(9) Leblanc – Arsene Lupin
(10) Verne – Round the moon
(11) Zola – L'Assommoir
(12) Tolstoy – Anna Karena
(13) Stanley Weyman – A gentleman of France
(14) Durand – Nadir Shah
(15) Conan Doyle – Sherlock Holmes
(16) Seton Merriman – The Sowers
(17) Marie Corelli – The Mighty atom
(18) Rider Haggard – King Solomon's Mine
(19) Hall Caine – The Prodigal Son
(20) Upton Sinclair – Sylvias marriage
(21) Elinor Glyn – His Hour
(22) Hichens – The woman with fan
(23) Mark Twain – Innocent Abroad
(24) Oppenheim Phillips – The Mischief Maker
(25) Baroness Orczy – The Scarlet Pimpernel
(26) Sienkiwicz, Henryk – Quo-Vadis
(27) R.L. Stevenson – Doctor Jeykl
(28) Hubert Wales – Cynthia in Wilderness
(29) H.G. Wells – The War in The air
(30) Defoe – Robinson Crusoe
(31) Goldsmith – Wicar of Wakefield

راقم "ناظر"

کواکب

نظر آتے ہیں گردوں پہ جو یہ اجرامِ نورانی
عیاں صانع کی صنعت کا ہے ان سے رازِ پنہانی
چراغ آرزو ہیں بزمِ قدرت کے شبستاں کے

فروغِ دیدۂ دانش ہے انکی جلوہ افشانی
نہ یہ یاقوت کے ٹکڑے، نہ ہیں یہ لعلِ رمانی
یہ ہیں روشن نمونے صنعتِ صنّاعِ دوراں کے

بجائے خود نظر آتا ہے ان میں ہر کرۂ اعظم
کشش کا سلسلہ روزِ ازل سے انمیں ہے باہم
نشاں ہر سو نظر آتے ہیں انمیں اوج و پستی کے

یہ معمورے ہیں وہ، آباد ہیں جنمیں نئے عالم
ہمیشہ اپنے محور پہ ہے ان کو گردشِ پیہم
یہ ہیں صورتکدے گویا ہماری بزمِ ہستی کے

کہیں ہیں آبشاریں، کہیں ہیں وادیاں ان میں
کہیں بادِ نسیمِ صبح ہے عنبرفشاں ان میں
مناظر دلربا قدرت کے ہیں پیشِ نظر ہر سو

کہیں پانی کے چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں رواں ان میں
کہیں ہے لالہ و گل کی بہارِ بےخزاں ان میں
ہوا چلتی ہے سن سن، لہلہاتے ہیں شجر ہر سو

نرالی شام ہے انکی، انوکھی ہے سحر ان کی
بظاہر، گو ہے ہستی خندۂ موجِ شرر ان کی
نہاں ہے وسعتِ کونینِ عالم انکے دامانمیں

نہ پوچھو کچھ کہ محفل ہے عجب حیرت اثر ان کی
حقیقت اہلِ ہیئت سے کوئی پوچھے مگر ان کی
مہِ کامل ہے دھندلا اک چراغ انکے شبستانمیں

عجب کیا اگر آباد ہو مخلوقِ خدا ان میں
مناظر ایسے ہیں دلچسپ دلکش ہے فضا ان میں
کہیں بحرِ تموج خیز کا انمیں تلاطم ہے

کہ آتا ہے نظر دنیا سے اک عالم جدا ان میں
کہیں پانی کی نہریں ہیں، کہیں موجِ ہوا انمیں
کہیں موجوں کے ہچکولوں میں بیڑا عقل کا گم ہے

بنائی الغرض ہے یہ ہماری سرزمیں جس نے
ہمارا خاک سے کھینچا ہے نقشِ دلنشیں جس نے
کرشمے ہیں کواکب بھی اسی خلاقِ دوراں کے

کیا ہے عالمِ ایجاد میں ہم کو مکیں جس نے
ہماری خاتمِ شہرت کے چمکائے نگیں جس نے
یہ نورانی ہیں شیشے صنعتِ بیچونِ یزداں کے

ش

اقلیدس

اقلیدس دنیا میں سب سے بڑا ریاضی و علم ہندسہ کا ماہر گزرا ہے - مدتیں گزر جانے پر بھی اُسکی شہرت اور تعریف آج تک ہر جگہ وہی ہے جو کبھی یونان میں تھی اور پھر عرب میں ہوئی۔ اب ہمارے ملک کا بچہ بچہ جو ذرا بھی پڑھا لکھا ہے اس نامور حکیم کے نام سے آشنا ہے۔ کیونکہ اسکی لاجواب کتاب کے تقریبًا ہر زبان میں ترجمے شائع اور نصاب تعلیم میں داخل ہوچکے ہیں یہ کتاب "ریاضی" کی اب تک ایک لاجواب کتاب مانی جاتی ہے اور تمام ریاضی داں ہمیشہ سے اسکے خوشہ چیں رہے ہیں۔

یہ توقطرس بن برنیقس کا بیٹا تھا اور بہت پرانا حکیم ہے۔ تھا تو یونانی الاصل لیکن ہمیشہ ملک شام کے مشہور تاریخی شہر "صور" میں رہا اور بڑھئی کا پیشہ کرتا تھا۔ "علم ہندسہ" کو سب سے پہلے اسی نے دنیا سے روشناس کیا، اور اُس میں ایک تازہ روح پھونکی۔ اس سے پہلے کوئی اس علم کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ اور یہی اقلیدس صاحب "جامیٹری" کے لقب سے بھی معروف ہے۔ یونانی زبان میں جو کتاب "علم ہندسہ" پر اس نے تصنیف کی تھی اُس کا نام "اسطروشیا" تھا۔ جس کے معنی ہیں "اصول ہندسہ" لیکن حکمائے یونان میں اس کا نام "ارکان" رواج پا گیا۔ اور رومیوں نے جب اُسکو اپنی زبان میں لیا تو اس کا نام "استقصات" رکھا۔ پھر مسلمانوں نے "الاصول" نام تجویز کیا۔ اس موضوع پر یہ نہایت مفید اور بڑے پایۂ کی کتاب بلکہ اپنی نوع میں "اصل الکتب" ہے۔ یونانی لٹریچر میں اس شان کی جامع کتاب نہ اس سے قبل تھی اور نہ بعد کو ہوئی۔ حکمائے متاخرین بھی اسی شمع کے پروانے بنے رہے اور جو کچھ اقلیدس کہہ گیا تھا یہ بھی وہی گاتے رہے ہیں۔ نہ صرف یونانی بلکہ رومی اور اسلامی ریاضی دانوں کی متعدد مقتدر جماعتوں نے بھی اسپر ہمیشہ اپنی توجہ مبذول رکھی ہے۔ کسی نے اس کتاب کی

شرح لکھی۔ اور وقت طلب مضامین کو آسان و عام فہم کرکے ملک کو فائدہ پہونچایا۔ کسی نے صاحب کتاب کے مجوزہ مسائل کے موافق شکلیں بنائیں۔ اور کسی نے خاص خاص دقیق نکات و رموز کو واضح کیا۔

اب تک جس قدر حکما، فلاسفہ گزرے ہیں اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اقلیدس کے نفس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کیا ہو۔ اور اُسکے کمالِ عقل کا شاہد نہ ہو۔ بلکہ اسکی تصنیفات کی تو یہاں تک قدر ہوئی کہ ایک زمانہ میں حکماے یونان نے اپنے اپنے مدارس کے دروازوں پر لکھ دیا کہ جو ریاضی داں نہ ہو وہ ہمارے مدرسہ میں نہ آئے۔ یعنی جس نے کتاب اقلیدس نہ پڑھی ہو وہ ہمارے مدرسہ ہی میں داخل نہ ہو۔

یعقوب بن اسحٰق کندی جو نہایت نامور اور اسلام کا مشہور فلسفی ہے۔ اپنے بعض رسائل میں لکھتا ہے کہ یونان کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ نے خزائن کتب یعنی محفوظ کتبخانوں میں دو کتابیں پائیں جو ابلونیوس نجار (بڑھئی) کے نام سے منسوب تھیں۔ جن میں اُن اجسام خمسہ کی ترکیب و صناعۃ کا ذکر تھا جن کے سوا اور کوئی جسم کرۂ عالم کو محیط نہیں۔ اب بادشاہ کو ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جو اِن دونوں کتابوں کے مطالب کو بخوبی حل کرسکے۔ گر سرزمین یونان میں کوئی اُنکا سمجھنے والا نہ نکلا۔ تاہم اس علم دوست بادشاہ نے امید منقطع نہ کی۔ بلکہ اُس زمانہ میں جو لوگ مختلف ممالک کا سفر کرکے واپس آئے تھے اُنکو بلا کر دریافت کیا۔ چنانچہ ایک سیاح نے خبر دی کہ میں نے شہر صور ملک شام میں ایک شخص کو دیکھا ہے جسکا نام اقلیدس ہے وہ بڑھئی کا کام کرتا ہے اور اس فن میں دخل کافی رکھتا ہے اور اس سے حسب ضرورت کام لیتا ہے۔ بادشاہ نے اُسی وقت "والی صور" کی خدمت میں یہ دونوں نسخے بھیجے اور ایک خط بھی لکھا جس میں اُس سے خواہش کی گئی تھی کہ اقلیدس نجار سے ان کتابوں کو حل کرنے کے لیے استدعا کی جائے۔ ملکِ صور نے شاہ یونان کی تحریک کے موافق یہ کتابیں اقلیدس کے پاس بھیجدیں اور اپنے ایک خاص معتمد سے اُس کا پیام بھی پہونچا دیا۔ اقلیدس جو اُس زمانہ

میں علمِ ہندسہ کا سب سے بڑا ماہر اور جاننے والا تھا۔ بادشاہ کی خاطر دونوں کتابوں کے حل طلب مسائل کو صراحت کے ساتھ معرضِ تحریر میں لایا۔ اور ابلونیوس حکیم نے جو کچھ اُن میں لکھا تھا اُس کی صاف صاف شرح کر دی اور اُن پانچوں مجہات کو آسانی سے سمجھ لینے کی غرض سے ایک "مبدء" وضع کیا۔ اُسی سے اِن تیرہ مقالات کے وجود میں آنے کی بنیاد پڑی جو ابتک اقلیدس کے نام ہی سے منسوب ہیں۔ کتاب کی صورت میں مقبول خاص و عام ہیں۔

اقلیدس کے بعد ان تیرہ مقالوں میں دو مقالے اور ملا دیے گئے جن میں ایسے مسائل ذکر کیے گئے تھے جو ابلونیوس نے نہیں لکھے تھے۔ یہ دونوں مقالے بھی اقلیدس ہی کے ہیں۔ مگر بعض حکماء کا خیال ہے کہ یہ اقلیدس کے نہیں بلکہ کسی اور کے ہیں جو کتاب کے آخر میں بعد کو بڑھائے گئے ہیں۔

مورخین نے ذکر کیا ہے کہ "اقلیدس" حکیم ارشمیدس وغیرہ سے بھی پہلے گزرا ہے۔ اور ریاضی داں فلاسفہ میں یہ ایک بڑا شخص ہے"۔

"اصول علم ہندسہ" پر اُس کی جو نایاب کتاب ہے اُس کی دو نقلیں حجاج بن یوسف بن مطر کوفی نے حاصل کی تھیں[1]۔ ایک ہارونی کے نام سے معروف ہے جو پہلی نقل ہے۔ دوسری مامونی کے نام سے مشہور ہے اور یہی نقل زیادہ معتبر ہے۔ اسحٰق بن حنین نے اُسکی نقل اور ثابت بن قرہ حرانی نے اصلاح کی۔ اُسی سے چند مقالے علامہ ابو عثمان دمشقی نے نقل کیے تھے۔ علامہ ابن ندیم نے کہا ہے کہ "میں نے مقام موصل میں علی بن احمد عمرانی کے کتب خانہ میں صرف دسواں مقالہ دیکھا ہے اور اس زمانہ میں موجود ہیں یعنی ۳۷۷ھ میں علم ہندسہ کے ایک فاضل ابو صقر قبیصی ہیں جو مجسطی کا درس دیتے ہیں۔ یہ بڑی معلومات کے بزرگ ہیں علامہ ایران نے اسکے شکوک کو رفع کیا اور علامہ تبریزی نے اُسکی شرح لکھی ہے اور ایک اور شخص نے بھی جو کرابیسی کے نام سے مشہور ہے اس کتاب کی ایک شرح لکھی ہے۔ اور علامہ

[1] یہاں سے آخر مضمون تک دیکھنے سے عرب کا علمی شغف اور خدمت کتب علمی پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ مترجم۔

جوہری نے شروع سے آخر تک پوری کتاب کی شرح لکھی ہے اور صرف پانچویں مقالہ کی شرح ماہانی نے بھی لکھی ہے۔ اور نظیف متطیب نے ذکر کیا ہے کہ "اُس نے اقلیدس کا دسواں مقالہ رومیہ میں دیکھا ہے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کتاب اقلیدس کے جو نسخے ہیں اُن سے اس نسخہ میں چالیس شکلیں زیادہ ہیں۔ ان نسخوں میں ایک سَو نو شکلیں ہیں"۔ نظیف متطیب نے اسکو عربی زبان میں منتقل بھی کر لیا تھا۔

یوحنا القس نے ذکر کیا ہے کہ "ثابت حرانی نے پہلے مقالہ میں دعویٰ کیا ہے کہ ایک شکل اور ہے جو میری نظر سے گزری ہے۔ اس کا گمان ہے کہ یہ شکل یونانی میں اقلیدس ہی کی ہے۔ نظیف کا قول ہے کہ میں نے ہی اُسکو یہ شکل دکھائی تھی۔

ابوحفص خراسانی اور ابوالوفا بوزجانی نے بھی اس کتاب کی شرحیں لکھی ہیں۔ مگر بوزجانی اُس کو پورا نہ کر سکے۔ البتہ ابوالقاسم انطاکی نے پوری کتاب کی تفسیر کی ہے۔ اگرچہ انطاکی اب دنیا میں نہیں رہے مگر اُن کی کتاب طلباء میں موجود ہے اور سند بن علی نے نو مقالوں کی پوری اور تھوڑی سی دسویں مقالہ کی شرح لکھی ہے۔ اور ابو یوسف رازی نے دسویں مقالہ کی پوری شرح کی اور۔ ابن عمیلا کے لیے اُس کی تجدید کی۔

علامہ کندی نے اپنے رسالہ "اغراض کتاب اقلیدس" میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو ایک اور شخص نے تالیف کیا تھا، جس کا نام ابلینس یا ابلونیس نجار ہے اور اُس نے پندرہ مقالے لکھے تھے۔ مگر جب اس کتاب کی شہرت پُرانی ہو گئی اور لوگوں نے بے توجہی برتی تو اسکندریہ کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے اقلیدس سے تحریک کی کہ اس کتاب کی اصلاح اور شرح ہو جائے تو بہت ہی مناسب ہو۔ چنانچہ اقلیدس نے اُس سے تیرہ مقالوں کی اصلاح کی۔ اُس وقت سے یہ مقالے اقلیدس ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اسکے بعد اقلیدس کے شاگرد ابسقلاوس نے دو مقالے (چودھواں پندرھواں) اور پائے اُنکو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے بادشاہ نے اُنھیں بھی ان تیرہ مقالوں میں شامل اور اضافہ کر دیا۔

ابو علی حسن بن حسن بن ہیثم بصری نزیل مصر نے اس کتاب کے مصادرات کی شرح لکھی ہے
اور کتاب میں جو شکوک تھے اُن کا ذکر کیا ہے۔ اور جوابات بھی لکھے ہیں۔
اور وزیر جمال الدین ابو الحسن بن علی قفطی صاحب کتاب اخبار الحکما باخبار العلماء نے
لکھا ہے کہ میں نے دسویں مقالہ کی شرح یونان کے ایک قدیم آدمی کی جس کا نام بلیس تھا
دیکھی ہے۔ جس کو عربی میں ترجمہ اور منقل بھی کر لیا ہے اور ابن کاتب حلیم سے اُس کو
لکھوایا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔ اور دسویں مقالہ کی ایک شرح
میں نے قاضی ابو محمد بن عبد الباقی بغدادی فرضی کی لکھی ہوئی بھی دیکھی ہے۔ یہ بزرگ قاضی
بیمارستان (شفاخانہ) مشہور ہیں اور یہ شرح نہایت عمدہ ہے۔ اس میں اعداد کے ذریعہ سے
شکلیں بھی بنائی ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب بھی میرے پاس مولف کی لکھی ہوئی موجود ہے[۵۵]
اور ابو الحسن قشیری اندلسی نے ذکر کیا ہے کہ اس کتاب کی کسی اندلسی نے بھی شرح کی
تھی جس کا نام "آنسیۃ" رکھا ہے۔ ابو الحسن قشیری نے یہ مجھ سے ۵۹۵ھ میں بیت المقدس
شریف میں کہا تھا۔

اس کتاب کے علاوہ اقلیدس کی اور چند تصنیفات یہ ہیں (کتاب) الظاہرات،
(کتاب) اختلاف المناظر (کتاب) المعطیات (کتاب) النغم (یہ کتاب علم موسیقی کے نام سے
مشہور ہے) (کتاب) القسمت اصلاح ثابت (کتاب)* القانون (کتاب) الثقل والخفہ (کتاب) الترکیب
(کتاب) التحلیل، کتاب المفروضات وغیرہ لیکن الفوائد اور الترکیب اور التحلیل کی نسبت بعض
اہل الرائے اس طرف گئے ہیں کہ یہ کتابیں اقلیدس کی نہیں بلکہ کسی اور حکیم کی ہیں جس کا
نام امتداد زمانہ اور قدامت ایام کی وجہ سے صحیح طور پر دریافت نہ ہو سکا۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد حسین محوی۔ صدیقی
(ترجمہ)

[۵۵] اس سے عربوں کے کمال ذوق علمی وعلم پرستی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ * القواعد (کتاب)

تصوّرِ جاناں

آہ اے تصویرِ جاناں تجھ میں ہے بیشک کمال | باعثِ تسکینِ دل ہے دُور کرتی ہے ملال
ہجر میں گو لطف آگیں ہے ترا حسن و جمال | تجھ سے بہتر ہے مگر اُس ماہ سیما کا خیال
کُنجِ تنہائی مِرا آباد۔ اُس کے دَم سے ہے
دل مصیبت میں بھی ہرگز شاد۔ اُس کے دم سے ہے

اے تصور اے خیالِ یار۔ اے آرامِ جاں | اے گُلِ گلزارِ حسن و عشق۔ اے جانِ جہاں
تو نہ ہو تو خواب میں بھی ہم اُسے پائیں کہاں | لیگیا جو چھین کر دین و دل و تاب و تواں
بوے دلبر گر نہ ہو اپنے گلِ اُمّید میں
موت سے بدتر ہے جینا حسرت جاوید میں

آج او آرامِ جاں تیرا کدھر آنا ہُوا | داغِ دل چمکے۔ منور پھر سیہ خانہ ہُوا
آج پھر آباد یہ ویران کاشانہ ہُوا | خوش ترے دیدار سے تیرا یہ دیوانہ ہُوا
آ۔ مرے زخمِ جگر سے چشمِ پُرخوں سے نہ ڈر
دل میں ہے تیری جگہ آباد کر اپنا یہ گھر

باعثِ بیماریِ دل جو بتِ پندار ہے | اُسکو میرے نام سے نفرت ہے مجھ سے عار ہے
اب تو جو کچھ ہے وہ تو ہی اے خیالِ یار ہے | اک نظر تیری جو ہو جائے تو بیڑا پار ہے
تاجِ شاہی کی ہوس نے درہم و دینار کی
آرزو گر ہے تو تیری یا جمالِ یار کی

آ۔ کہ غربت میں کوئی ہمدم نہیں۔ تیرے سوا | آ۔ کہ تسکینِ دلِ پُرغم نہیں۔ تیرے سوا
اس جگر کے زخم کا مرہم نہیں۔ تیرے سوا | آ۔ کہ مجھ کو عیسیِ مریم نہیں۔ تیرے سوا

آنکھیں مدت سے ترستی ہیں ترے دیدار کو
جاں نثاری کی تمنا ہے دلِ بیمار کو

چشمِ تر تیار ہے موتی لٹانے کے لیے — اور نگاہِ شوق آنکھوں میں بٹھانے کیلیے
دل جگر آمادہ ہیں قربان جانے کے لیے — ہیں سبھی موجود تیرے ناز اٹھانے کے لیے

حسرتیں دل سے نکلنے کو ہیں گھبرائی ہوئی
جانِ استقبال کو ہونٹھوں پہ ہے آئی ہوئی

پھر وہ چشمِ نرگسیں یہ چشمِ مضطر دیکھ لے — اپنے عیسیٰ کو دلِ بیمار دم بھر دیکھ لے
پھر یہ مہجورِ ستم۔ اپنا ستمگر دیکھ لے — آ کے پھر اک بار یہ بلبل۔ گلِ تر دیکھ لے

اے تصور تیرے دم سے زندگی کی آس ہے
اسکی تصویر مکمل ہے تو تیرے پاس ہے

تا کجا۔ اے عاشقِ مہجور یہ رنج و ملال — [illegible] لیے یوں روز و شب رہتا ہے تو یہ شفتہ حال
طالبِ دیدار ہے تو اک ذرا [illegible] — کھول او مدہوش آنکھیں دیکھ شانِ ذوالجلال

[illegible] میں [illegible] ستاروں میں گل و گلزار میں
جلوۂ جاناں ہے ہر جا دیدۂ بیدار میں

راشد علی۔ مخدومی۔ اٹھیوی

[illegible]

تم نمک پاشی جو زخمِ دلِ پُر غم میں رہے — محو ہم چاشنیِ لذتِ پیہم میں رہے
ایک لحظہ بھی نہ بیٹھا رشبِ غم [illegible] رہے — رات بھر مشغلۂ نالۂ پیہم میں رہے
صبح ہوتے ہی کریں گلشنِ ہستی سے سفر — شور رہے شب کو یہ باہم گل و شبنم میں رہے
تیرے دیوانوں میں یہ بات نرالی دیکھی — رہ کے دنیا میں کسی اور ہی عالم میں رہے
زخم میں لذتِ آزار بڑھاتا ہے اگر — چارہ گر شودۂ الماس بھی مرہم میں رہے
داد خواہی بھی ہوئی حشر کے دن پرسش بھی — ہاں مگر مست ترے اور ہی عالم میں رہے
زیست اس طرح سے گزری کہ نہ جانا کیا — کون سی دھن میں رہے کون سے عالم میں رہے

"ایک خط" کے متعلق کچھ عرض

جناب من

آپ کے رسالہ کے جنوری نمبر میں مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے مولانا شبلی کے متعلق ایک واقعہ مندرجہ "فلسفۂ اجتماع" کی تغلیط فرمائی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں مختصراً دو باتیں کہنا ہیں :-

(۱) نفس بشری کی نیرنگی و تلونِ فطری سے متعلق مجھے جس حد تک استشہاد کرنا تھا، وہاں تک وہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ اور یہ میں خود مولانا شبلی کی روایت کے اعتماد پر لکھ رہا ہوں۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں یہ واقعہ خود مجھ سے بیان فرمایا تھا، اور مجھے اُنکے بیان کے بعد اسکی صحت کے لیے کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب بہ حیثیت شاہدِ عینی، اور اس واقعہ میں اول سے آخر تک حصہ لینے والے کے، اس کے جو کچھ جزئیات وتفصیلات تحریر فرماتے ہیں، (یہاں تک کہ بغایت تحقیق وہ کتابوں کے جلائے جانے کے بعد، آندھی کے آنے، اور مینھ کے برسنے، ہوا کے خاکستر کو اُڑا دینے، اور پانی کے زمین کو دھوکر صاف کر دینے تک کو نظرانداز نہیں فرماتے) وہ سب حرف بہ حرف صحیح ہوں گے۔ لیکن ان سے مجھے کچھ واسطہ نہیں۔ میرے مقصد کے لیے صرف اتنی حقیقت بس کرتی ہے، کہ "کتب خانۂ اسکندریہ" کے مصنف نے ان کتابوں کی بربادی میں تائید واعانت کی۔ اور اسکے راوی کوئی زید وعمر نہیں، بلکہ خود مصنف موصوف تھے۔

(۲) مولوی صاحب مکرر غور فرمائیں، تو اُنھیں خود نظر آجائے گا کہ جن الفاظ میں، اور جس حیثیت سے یہ واقعہ "فلسفۂ اجتماع" میں منقول ہے، اُن سے مولانا مرحوم کی اہانت کا کوئی خفیف پہلو بھی نہیں نکلتا، بلکہ وہ تو اُنکی عظمت کا عین اعتراف ہے۔ مقصود یہ دکھانا تھا، کہ دنیا کی بڑی سی بڑی انسانی ہستیاں بھی انسانیت کی فطری کمزوریوں سے پاک نہیں رہ سکتیں، جیسا کہ

سقراط، و مولانا شبلی وغیرہ کی زندگی سے ظاہر ہے۔ اگر یہ طرزِ بیان بھی اہانت آمیز ہے، تو میں نہیں نہیں جانتا کہ اعترافِ عظمت کے لیے کیا اسلوب اختیار کرنا چاہیے۔ مولانا مرحوم سے مصنفِ "فلسفۂ اجتماع" کو عقیدت و شیفتگی تھی، اُسے وہ آج سے پانچ برس پیشتر انھیں صفحات میں حافظ کی زبان سے یوں ادا کر چکا ہے:-

عاشقِ روے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست
منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست

اور مولانا کی وفاتِ بے ہنگام نے اس جوشِ عقیدت کو بجاے ضعیف کرنے کے اور قوی کر دیا ہے۔ البتہ وہ اُنکی علمی یا اخلاقی معصومیت کا کبھی قائل نہیں رہا۔ اور یہ ایک ایسی رائے ہے، جس کی تردید کے لیے ہمارے مکرم مولوی صاحب موصوف بھی قلم اُٹھانا غالباً غیر ضروری خیال فرمائیں۔

۹، فروری ۱۶ء — عبد الماجد

حسن اچھا ہے کوئی جسکا خریدار بھی ہو — وہ مسیحا ہے کہ جس کا کوئی بیمار بھی ہو
عمر گزری ہے درِ بت پہ جبیں سائی میں — اب تقاضا ہے مرے سر کا کہ دیوار بھی ہو
دشتِ وحشت میں مری آبلہ پائی ہے عبث — لطف جب ہے کہ رہِ وادیِ پرخار بھی ہو
جلوۂ یار نے پردے میں سرِ طور کہا — دیکھ سکتے بھی نہیں۔ طالبِ دیدار بھی ہو
کم نہیں خمکدۂ دہر میں یہ جنسِ لطیف — بادۂ غم کا کوئی دل سے طلبگار بھی ہو
سخت جانی کو مری دیکھ کے قاتل نے کہا — جان دیتے بھی نہیں۔ جان سے بیزار بھی ہو
چاندنی رات ہو ساقیِ طرحدار بھی ہو (ق) — صحن گلزار بھی ہو۔ ابرِ گہربار بھی ہو
سامنے جام بکف اک بتِ عیار بھی ہو — بادہ نوشی کے لیے پھر اسے اصرار بھی ہو
شیخ جی آپ ہی ایمان سے کہیے مجھ سے — اتنا ساماں ہو پھر آپ کو انکار بھی ہو؟
کیا کرم ہی ہو کہ دل میں لیے رحمت کی امید — عرصۂ حشر میں باسط سا گنہگار بھی ہو

نظرے خوش گزرے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

مرزا غالب مرحوم کی فکر بلند نے جس جامعیت اور اختصار کے ساتھ اُن تمام واقعات کو اس شعر میں بیان کیا ہے جو اکثر عشاق کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اور جن کے بغیر شاید عاشق مزاج لوگوں کی معاشرت میں ایسا خلا پیدا ہو جائے کہ سارا لطفِ زندگی جاتا رہے۔ آج جو ہم غور کرتے ہیں تو الناظر کو اس شعر کے بسیط مفہوم کا بالکل مصداق پاتے ہیں۔

ابھی دسمبر میں ہمنے اعلان کیا تھا کہ الناظر کے متعلق جو مشکلات و افکار ہمیں آئے دن پیش آتی رہتی تھیں اور جن کی وجہ سے بجائے اسکے کہ الناظر کی حالت عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی روز بروز ابتر ہوتی جاتی تھی اُن سے سبکدوش ہونے کے لیے ہمنے ایک عزیز دوست کو اپنا مستقل شریک بنا لیا ہے جو لکھنؤ میں قیام کرکے الناظر کو ترقی دینے اور اُسکے نظم و نسق کو سدھارنے میں کوشش کریں گے اور ہمیں یقین واثق تھا کہ جو انتظام اس وقت تجویز کیا گیا ہے یہ الناظر کے لیے۔ ناظرین اور عام پبلک کے لیے اور نیز ہمارے لیے حد درجہ قابل اطمینان ہوگا۔

ہمارے دوست جنھوں نے کچھ تو بنظر ہمدردی انسانی اور بہت کچھ اپنے حقوقِ ادبی کی بنا پر اس بارِگراں کو اپنے سر لیا تھا ابتداءً عزم مصمم رکھتے تھے کہ یہ تجاویز عملی صورت اختیار کریں چنانچہ لکھنؤ آنے کے قبل ہی اُنھوں نے الناظر کی ترتیب اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور توسیع اشاعت وغیرہ کے متعلق کوششیں شروع کر دی تھیں۔ مگر اب وسط فروری میں انھوں نے اپنی موجودہ جائے قیام کو چھوڑنے سے معذوری ظاہر کرکے اُس تمام قرارداد کو فسخ کر دیا جو الناظر کے متعلق ہمارے اُنکے درمیان طے پا چکی تھی اور الناظر کا بیڑہ پورے پھر

ہمارے تفویض کر دیا گیا۔
ہمیں اپنے عزیز دوست سے کسی قسم کا شکوہ کرنا منظور نہیں اس لیے کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس عالمِ اسباب میں ہر شخص واقعات و اتفاقات کا تابع ہے اور سیکڑوں تجاویز جنکے پختہ کرنے میں غایت درجہ حزم و احتیاط برتی جاتی اور نہایت دماغ سوزی کی جاتی ہے، خفیف سے واقعات کے پیش آجانے سے خاک میں مل جاتی ہیں البتہ اس بات کی پھر فکر پیدا ہو گئی ہے کہ الناظر کو اس پیا نہ پر چلانے کے لیے جو ہمارا مطمح نظر تھا اور ہے اب کیا نئی تدابیر اختیار کی جائیں۔ موجودہ حالت میں خصوصاً جبکہ ہماری صحت مسلسل خراب رہتی اور ہمارے متعلق بہت سے کام بھی ہیں الناظر کو کسی نہج سے ترقی دینا محال نظر آتا ہے۔ تاہم ابھی نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو اگر منظور ہے تو جلد کوئی نہ کوئی انتظام ایسا ہو جائے گا جس سے الناظر کے متعلق ہماری افکار کا اور ناظرین کی بدمزگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔ لیکن الناظر کے قیام و ترقی کی تمام کوششیں اُس وقت تک بے سود ثابت ہوں گی جب تک ناظرین عام طور پر اُسکے ساتھ ہمدردی و دل سوزی نہ فرمائیں گے۔ اور اُن کی ہمدردی کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ الناظر کی اشاعت میں میرا ہاتھ بٹائیں۔

قدر دانانِ الناظر! کیا ہماری یہ گزارش بالکل ناقابلِ التفات ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ توجہ فرمائیے اور عملاً الناظر کی اعانت کے لیے طیار ہو جائیے۔ وما علینا الا البلاغ۔

انجمن ترقی اردو کا سالانہ جلسہ حسبِ دستور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ بمقام پونہ منعقد ہوا۔ افسوس ہے کہ اپنی علالت کے باعث ہمیں شرکت نصیب نہ ہوئی جو وہاں کی کارروائی کے متعلق ذاتی علم کی بنا پر کچھ لکھتے۔ مولوی سید سلیمان ندوی صدر قرار پائے تھے اور جیسی کہ توقع کیجاتی تھی سنا ہے کہ اُنکی تقریرِ صدارت نہایت عالمانہ تھی۔ مکمل حالت میں مل گئی تو شاید اپریل نمبر میں اُسکا شائع کرنا ممکن ہو سکرٹری صاحب کی رپورٹ تیار ہے۔ انشاء اللہ مارچ نمبر کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہو گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۴ — یکم مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۴ — یکم مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش

تمہید

اگر آپ ان اوراق کو ناول سمجھ کر پڑھیں گے اور مذاقِ صحیح بھی رکھتے ہیں تو آپ ان میں نزاکتِ تخیل، جدت طرازیِ بیان، لطافتِ زبان، پلاٹ کی چستی و ندرت، اور کسی انوکھے فلسفہ کی تعلیم ڈھونڈھیں گے۔ اور آپ اس کا پورا حق رکھتے ہیں۔ مگر آپ یہاں ان خصوصیات میں سے بجز ایک خصوصیت کے اور کچھ نہ پائیں گے۔ ایک انوکھے فلسفہ کی تعلیم البتہ ہے۔ مگر آپ اسے افسانہ سمجھ کر اس سے مطلقاً محظوظ نہیں ہو سکتے۔ نہ محظوظ کرنا راقم کا مقصد ہے۔ خدا کرے آپ ملتفت ہوں کیونکہ یہی میرا مدعا ہے۔

وہ ایک سیدھا سادہ تذکرہ ہے اُن ذاتی اور تلخ تجربوں کا جو ایک نوجوان کو ہندوستانی سوسائٹی کے ایک بدقسمت ممبر کی حیثیت سے پیش آئے ہیں اور آئے دن اور نوجوانوں کو بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ جزئیات میں کسی قدر اختلاف ہو تو ہو تو صورت ایک ہی ہوا کرتی ہے۔ لہذا میں اپنی نامراد زندگی میں اوروں کے لیے عبرتناک سبق بننے کی صلاحیت پاتا ہوں اور اس لیے کچھ واقعات صرف بقدر ضرورت قلمبند کر لیے ہیں۔

میں کسی کام کے لائق تو نہ تھا اے کیفی ؛

ہاں گردیدۂ بینا کے بہت کام آیا ؛

گر مجھے صاف اقرار ہے کہ میرا مقصدِ اصلی قوم کا افادہ نہیں بلکہ ذاتی تلذذ ہے۔ جبکی زندگی میں مایۂ نشاط سے کوئی حصہ باقی نہیں رہ جاتا اسکے پاس بالآخر ایک سہارا ضرور رہ جاتا ہے۔ اور وہ عہدِ ماضی کی یاد اور اسکا ذکر ہے۔ کوئی سُنے یا نہ سُنے، اظہارِ ہمدردی و غمخواری کیسے یا نہ کرے، وہ دردِ دل بیان کرتا پھرتا ہے۔ اس میں اُسے لذت ملتی ہے اور تھوڑی دیر کے لیے قلب کو سکون ہو جاتا ہے۔ یہ سامعہ خراشی بھی دراصل نتیجہ ہے ایسی ہی خلش کا۔

یوسف

مجھ سے چھپا دیا گیا !

والد مرحوم نے میری شادی باوجود اماں جان کے اصرار کے میرے انٹرنس پاس کرنے سے پہلے نہ کی۔ اور یہ اُن کی بڑی روشن خیالی سمجھی جاتی تھی۔ میں تھا تو اُنیس برس کا نو عمر، مگر تاہل کی ذمہ داریوں کو کچھ نہ کچھ سمجھتا تھا۔ لیکن ابا جان سے استلاف کرنے کا بھی عادی نہ تھا۔ اُنھوں نے یہ دریافت کر لیا تھا کہ یوسف، میمونہ سے محبت کرتا ہے اور بس۔ اس معاملہ کا تعلق میرے ساتھ وہ اس سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔

میمونہ صرف خوبصورت نہ تھی۔ بلا کی شوخ۔ مگر ساتھ ہی انتہا کی ذکی اور شاعر دل۔ سراپا محبت۔ محبت اس کا دین تھا اور محبت اس کا ایمان۔ ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے اگر میں اُس سے محبت کرتا یا وہ مجھ سے تو جائے تعجب نہ تھی۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ میمونہ میری بیوی ہونے والی ہے تو میری محبت پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا۔ وہ کون رنگ تھا؟ اسکی مثال دینا یا شرح کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ دنیا میں ویسی کوئی چیز نہیں پاتا جس سے مثال دیکر حقیقت پر روشنی ڈالی جا سکے۔ خدا کی مار ہو پردے پر، میمونہ کو مجھ سے چھپا دیا گیا۔

بحرِ محبت کی طغیانی

جاڑوں کی رات ہے۔ ایک بجا ہوگا۔ شہر پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بالاخانہ کا سُنسان کرہ ہے! ایک میں ہوں اور میری شمع۔ وسّ بجے سے اقلیدس سامنے کھُلی ہے۔ مگر اب تک ایک شکل بھی ذہن نشیں نہیں ہوئی۔ خیالات کا ہجوم کسی طرح ذہن کو اتنی مہلت نہیں دیتا کہ کتاب کے مطلب کو اخذ کرے۔ جانچ کے امتحان کو صرف پندرہ روز باقی ہیں۔ ایک تو کمبخت فن ریاضی سے دلی نفرت، اُسپر یہ ہجوم تخیلات! تخیلات کیا تھے؟ آہ یہ نہ پوچھو ؎

"نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھکو ساغر یاد آتے ہیں"　　(حسرت موہانی)

امیدوں کا ایک ہرا بھرا باغ آنکھوں کے سامنے لہلہا رہا تھا۔ تمناؤں کے پھول کھل رہے تھے، جن سے مشامِ جاں معطر تھا۔ حسرتوں کا ایک پُرشور دریا لہریں لے رہا تھا۔ ایک عالم تھا کہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھیے نور ہی نور نظر آتا تھا۔ کہیں تاریکی کا وہم بھی نہ تھا۔ کیا وہ دن بھی آئیں گے جب میمونہ میری ہوگی؟ کیا اُسکے اُبھرے اُبھرے گلابی گالوں تک میری نظروں ہی کی نہیں ہونٹھوں کی رسائی بھی ہوگی؟ کیا اُس خوبصورت و معطر پھول کا لذت کش صرف میرا باصرہ ہی نہیں شامہ بھی ہوگا؟ ؎

"نیند اُسکی ہے، دماغ اُسکا ہے، راتیں اُسکی ہیں
جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں"　　(غالب)

....

مگر میں پروانہ وار عشق کا قائل نہیں۔ پروانہ جل مرا شمع خبر بھی نہ ہوئی۔ نامرادِ عشق، نامرادِ زندگی نامرادِ موت۔ اول تو یہ ہو کیونکر سکتا ہے کہ کوئی کسی سے سچے دل سے محبت کرے اور وہ اُس سے متاثر نہ ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو عاشق کی زیاں کوشی ہے، سعیِ بیہودہ ہے..............

.......میمونہ جب مجھ سے پردہ نہ کرتی تھی تو مجھ سے محبت رکھتی تھی مگر اُس وقت اُسکی محبت کی نوعیت کیا تھی اور اب کیا ہے؟ کچھ نہیں معلوم۔ اگر وہ بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرتی ہو جیسی میں، تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں کون ہو سکتا ہے؟

دس بجے سے ایک بجے تک انھیں تخیلات میں وقت گزر گیا۔ مگر نظر اقلیدس کی شکل ہی پر جمی رہی۔ گویا میں اتنی دیر سے اقلیدس پڑھ رہا ہوں۔ یکایک خیال آیا کہ میں پڑھ نہیں رہا ہوں اور پھر شکل بنا کر "فرض کرو کہ آ ب ج ایک مثلث قائمۃ الزاویہ ہے" شروع کیا۔ مگر پھر دماغ نے جواب دیا۔ کتاب اُٹھا کر رکھ دی۔ اور لکھنے لگا۔

بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا

میری پیاری میمونہ

کیوں رکھا دید سے محروم بنا کر شتاق؟ آج تک کر نہ سکا حل یہ معمّا کوئی

گو سوسائٹی کے قانون اور ظالمانہ قانون نے تم کو میری نظروں سے دور مگر دل سے قریب تر کر دیا ہے۔

چھپائے لاکھ حسنِ عالم آرا کو نقاب اُنکا نظر بازوں کو یہ کب مانع دیدار ہوتا ہے؟

اس پردے کی حالت میں شاید میرا یہ خط لکھنا ایک ناقابل معافی گناہ سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر یہ سچ ہے کہ تم میری آیندہ تمام زندگی میں میرے رنج و راحت کی شریک بننے والی ہو تو میرا حق عقل و انصاف اور شریعت اسلام کی رُو سے اس سے کہیں زیادہ ہے کہ میں تمھیں ایک خط لکھوں اور تم سے اُسکا جواب چاہوں۔ تمھاری سلامت روی اور دانائی سے بھی یہی امید ہے کہ تم اسے روا رکھوگی۔ جس کام کو ہمارا ایمان حق قرار دیتا ہے اُسے دنیا کی زبردستی سے ناحق اور ناحق کو حق کیوں سمجھیں؟ دنیا کا لحاظ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کافی ہے کہ ہم ایسے کاموں کو حتی المقدور اس سے چھپائیں۔

بدقسمتی سے ہم لوگوں میں شادی ایک کھیل اور تماشا سمجھ لی گئی ہے۔ والدین نے اپنی مرضی

سے آنکھ بند کرکے جس کی قسمت کو جس سے چاہا وابستہ کردیا - اُن کا ایک بڑا ارمان نکل گیا اور خوش ومطمئن دنیا سے سدھار گئے - اب میاں بیوی میں کیسی بنتی ہے اور کیسی گزرتی ہے انکی بلا جانے -

عموماً بے وقت شادی نوجوانوں کی ترقی میں سنگِ راہ ثابت ہوتی ہے - مثلاً آج میں انٹرنس میں پڑھتا ہوں - والدین زندہ ہیں - اُنکا خیال ہے کہ شادی ہمارے مقررہ دستورالعمل میں حائل نہیں ہوسکتی - میں عام رفتار سے بی ال کر بی - لے پاس کر جاؤنگا - لیکن وہ ایک منٹ کے لیے یہ نہیں سوچتے کہ انکی آمدنی آج منتظم ہے مگر اتنی کافی نہیں کہ ایک نئے خاندان کا بار آسانی سے اُٹھا سکیں - ثانیاً اُنکی اوقات سرکاری ملازمت پر ہے - آج ہے، اگر کل نہ رہی؟ یا خدانخواستہ خدانخواستہ وہ خود نہ رہے تو کیا ہوگا؟ اگر شادی سے انکی مراد میری شادمانی ہوتی تو وہ اِس تعجیل کو راہ نہ دیتے - جب میرے اپنے بازو مضبوط ہوچکتے اور میں اِس ذمہ داری کا بار اُٹھانے کے قابل خود ہوجاتا تو میں بے خوف وخطر شادی کرسکتا تھا - مگر والدین کو اپنی خوشی منظور ہے، جسے وہ ارمان کہتے ہیں - اور جسے وہ اپنی زندگی میں نکالنا لذتِ زندگی سمجھتے ہیں مگر فرضِ پدری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں -

بحث ازدواج میں دوسرا مسئلہ جو میرا اصل مقصود ہے وہ طرفین کی باہمی موانست ہم خیالی ہے - طرفین میں محبت ہو اور ایسی ہو کہ گویا ایک دوسرے کے لیے خلق کیا گیا ہو - پس تنقیح طلب دو باتیں ٹھیریں - مناسب وقت - مناسب جوڑا - وقت کے اعتبار سے میں صاف محسوس کررہا ہوں کہ یہ شادی میرے حق میں مضر ہوگی - رہا دوسرا سوال -

جس سوسائٹی میں پردے کی سی مذموم رسم جاری ہو وہاں ازدواج کی یہ دوسری شرط تو کسی طرح پوری ہی نہیں ہوسکتی - جس حلقے میں ہمیں شادی کرنا ہے وہ قاف کی پریوں کا غول ہے - غیر مرئی - جن کی آواز بھی کانوں تک نہیں پہونچ سکتی - انکی اُفتادِ طبع، تعلیم، صورت وصحت کا پتہ لگانا بہت دشوار اور محبت تو خارج از خیال - یہ حسن اتفاق ہے کہ تم میری ماموں زاد بہن ہو - ایک زمانہ تک ہم تم ساتھ رہے - ایک دوسرے سے بہت کچھ واقف ہیں - اس لیے ہم

دونوں کو موقع حاصل ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ اگر پہلی شرط کے فوت ہونے کے باعث شادی سے انکار کروں تو دوسرا غنیمت موقع ہاتھ سے جاتا ہے۔ انسان موقع کا منتظر ہوتا ہے۔ موقع انسان کا منتظر نہیں ہوتا۔ مجھے تعلیم یافتہ بیوی ہمیشہ مل سکتی ہے، خوبصورت اور نیک سیرت بھی مل سکتی ہے مگر وہ صرف بیوی ہوگی، بچوں کی ماں ہوگی، گھر کی مالکہ ہوگی۔ وہ سب کچھ ہوگی مگر شاید وہ نہیں ہو سکتی جو تم ہو۔ یعنی میرے دل کی مالکہ۔ کعبۂ دل کا بُت۔ محبت کی چیز۔ پرستش کی شے۔

دو شرطوں میں سے ایک مجھے حاصل نہیں تو دوسری اہم تر شرط ضرور حاصل ہے اس لیے میں پہلی شرط سے کیوں باز نہ آجاؤں اور دوسری شرط پر اپنی قسمت کا فیصلہ کروں۔ جب سارے اچھے مواقع ایک شخص کو ایک وقت میں میسر نہیں آسکتے تو میں کیوں طلب الکل فوت الکل کا شکار بنوں؟

رہی یہ بات کہ میں اب تمھاری صحیح رائے دریافت کروں۔ پردے کے قبل ہماری تمھاری دوستی کی نوعیت اور تھی اور اب اور ہونا چاہیے۔ اُس وقت بے شک تم مجھے دوست رکھتی تھیں گر ممکن ہے کہ بحیثیت پھوپھی زاد بھائی یا دوست کے تم مجھے پسند کر سکتی ہو مگر شوہر بنانے کے لیے تمھارا معیار اور ہو۔ اپنی تو میں صاف کہے دیتا ہوں کہ تم میرے معیار سے کہیں بلند مرتبہ رکھتی ہو۔ اب میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ میں تمھارے معیار پر پورا اُترتا ہوں یا نہیں۔ اگر اُتروں تو اپنی قسمت پر ناز کروں، نہ اُتروں تو تمھارے بھلے کو ابا جان سے اختلاف کر کے یہ نسبت فوراً منقطع کر دوں۔ خواہ مجھ پر جو کچھ گزرے۔

خدا کے واسطے صاف جواب دیکر ہمیں اس فشار سے نجات دو۔ جواب میں میں تم سے ویسی مدلل اور سلجھی ہوئی تقریر کا طالب ہوں جو بعض دفعہ تم متین بن کر کر جایا کرتی تھیں اور میں مُنھ دیکھ کر رہ جایا کرتا تھا۔ کچھ اور بس نہ تھا۔

سراپا شوق۔ یوسف

میمونہ کا چھوٹا بھائی نصیر مجھ سے پڑھتا تھا۔ میں اُس سے محبت کرتا تھا اور وہ مجھ سے لپٹا رہتا تھا۔ میں نے اُس سے قاصد کا کام لیا اور خط ملفوف کرکے اسکی معرفت میمونہ کو بھیج دیا اور رازداری کی تاکید کردی۔

محبت یا جاہ وثروت؟

دوسرے روز مجھ کو جو جواب ملا وہ یہ تھا:۔

منصفی ہو تو غضب۔ نامنصفی ہو تو ستم
اُس نے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا (داغ)

میں نہیں جانتی کہ آپ کو کن القاب سے خطاب کروں

ہم بیچاریاں کیا اور ہمارا معیار کیا؟ ماں باپ نے جس سے ہاتھ پکڑا دیا شکرورضا کے ساتھ زندگی کاٹ دی۔ ہم بھلا معیار رکھ کر کیا کریں جب اُس سے مصرف ہی نہ لے سکیں۔ آج تک ہمیں اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ہم کو کسی معیار کی ضرورت ہے یا کوئی معیار ممکن بھی ہے۔

آپ مجھ سے اپنے امتحان کی درخواست کرکے شاید اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں۔ آپ شاعر ہو کر میرے چہرے پر لکھے ہوے حروف نہیں پڑھ سکے؟ میری خاموشی سے کیا کوئی صدا آپ کے کانوں تک نہ پہونچی؟ کیا آپ مجھے لب کشائی پر مجبور کرکے حُسن معنی کو غارت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ کو یہ گوارا ہے تو یوں ہی سہی۔

معیار کی پانچ تقسیم ہوسکتی ہیں۔ (۱) علم (۲) حُسن سیرت (۳) تندرستی (۴) فراغ دستی۔ (۵) شرافت خاندانی۔ ۱ علمی کمالات کے لحاظ سے آپ کا شمار خاندان کے قابل فخر نوجوانوں میں ہے اگرچہ انگریزی آپ نے انٹرنس ہی تک پڑھی ہے مگر آئندہ ترقی کی قوی امید ہے۔ ۲ حُسن سیرت کے متعلق آپ کی پاکبازی، مستقل مزاجی، بلند ہمتی اور تمام مردانہ خصائل کی تعریف کی جاسکتی ہے مگر میں سب سے زیادہ آپ کی جس چیز کی قدر کرتی ہوں وہ آپ کا گرم اور زندہ دل ہے جو زم اور

لطیف جذبات سے معمور ہے (۳) تندرستی کے متعلق ماشاء اللہ کچھ کہنا نہیں ہے (۴) فراغ دستی کے لحاظ سے پھوپھا ابا ذی حیثیت شخص سمجھے جاتے ہیں اور خود آپ کی ذات سے بہت امیدیں ہیں۔ (۵) خاندان جو میرا وہ آپ کا۔ مگر میں آپ کو جس وجہ سے اچھا سمجھتی ہوں وہ ان اوصاف میں سے ایک بھی نہیں بلکہ "در ازل بود کہ پیمان محبت بستند" اور کیا عرض کروں؟

مگر جہاں میرے بھلے کے لیے آپ نے میرا عندیہ دریافت کیا ہے وہاں میں بھی آپ کے بھلے کے لیے آپ کو اپنی عقل کے مطابق دو تین مشورہ دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ اپنی پہلی شرط سے باز آکر اپنی دنیاوی ترقی کو خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں؟ میں جانتی ہوں کہ آپ کے خیالات بہت وسیع اور حوصلے بہت بلند ہیں۔ لیکن شادی کے بعد آپ جس دن سے ڈرتے ہیں اگر وہی دن آگئے، اگر آپ ٹھوکر کر رہ گئے تو محض ایک غلطی کے باعث آپ اپنی ساری زندگی ندامت اور ناکامی میں گزاریں گے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اُس ممکن تصویر کو پیش نظر کیجیے۔ جس شخص کا مقصد ہائی کورٹ کی ججی ہے وہ ایک ماتحت عدالت کے کرانی کی حیثیت سے ذلیل زندگی گزار رہا ہے۔ پھٹا کوٹ۔ ٹوٹا جوتا۔ بلا پھندنے کی میلی کچیلی تُرکی ٹوپی۔ گمنام۔ بے نشان۔ اپنی نظر میں آپ ذلیل۔ فکرِ معاش سے چُور۔ افکار سے قبل از وقت بال پک گئے ہیں۔ کسی کی بات اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی سیدھی بات پوچھے تو جھلا کے نوچنے کو دوڑتا ہے۔

یہ میں اپنے لیے نہیں کہتی۔ اگر مجھے آپ لونڈی بننے کی عزت نصیب ہوئی تو بخدا ہر حال میں خوش رہوں گی اور آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گی۔ میرے دل میں کوئی ارمان نہیں۔ صرف محبت کی طلبگار رہوں اور بس

"جو ہو مجھ سے پیار تم کو۔ جو ہو تم سے پیار مجھ کو
نظر آئے خارِ ہستی گُلِ نوبہار مجھ کو" (نیرنگ)

میں تو آپ کے حوصلوں سے ڈرتی ہوں۔ کہیں آپ بعد کو اپنے کو دنیا میں ناکام سمجھ کر میری ذات کو بلا نہ سمجھنے لگیں اور مجھ سے متنفر نہ ہو جائیں۔ یہ سب آج ہی سوچ سمجھ لیجیے۔

آپ نے صاف جواب طلب کیا تھا اور صاف عرض کیا۔ امید ہے کہ یہ صاف گوئی اگر ناگوار ہوئی ہو تو آپ معاف فرمائیں گے۔ والسلام　　ناچیز۔ میمونہ

محبت کی فتح

یہ میں ضرور جانتا تھا کہ میمونہ کو عام رواج سے بہت زیادہ تعلیم دی گئی ہے۔ مگر اس خط نے اُسکے دماغ کی جس غیر معمولی تربیت کا ثبوت دیا وہ میرے وہم میں بھی نہ تھا۔ یہ خط پڑھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اسکی دور اندیشی پر عش عش کرنے لگا۔ اب دو خیالات میں کشمکش ہونے لگی۔ ایک طرف میمونہ کی تقریر۔ مستقبل کی ممکن بھیانک تصویر، دوسری طرف میمونہ کی قابلیت کا مزید ثبوت۔ اور اُسکی دماغی فضیلت کا اعتراف۔ ایک ہفتہ تک میں اسی اُلجھن میں رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا فیصلہ کیجیے۔

ماضی و مستقبل جو نظر سے دور ہوتے ہیں حال پر غالب نہیں آسکتے۔ مستقبل کی تصویر فرضی تھی اور میمونہ کی تصویر واقعی۔ نظر کے سامنے۔ زمانۂ حال میں۔ آپ خواہ مجھ سے اتفاق کریں یا میری عقل کا فریب کہیں یا عمر کا اقتضا یا قوۃ فیصلہ کی کمی سمجھیں۔ میں نے اپنے آپ کو خضرِ عشق کے سپرد کر دیا۔ فیصلہ کر لیا کہ مجھے سب کچھ گوارا مگر میمونہ کو ہاتھ سے دینا نہیں گوارا۔ میرے سارے حوصلوں کا مرکز میمونہ ہے۔ وہ ہے تو سب کچھ۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میری دنیا اور میری زندگی کی خوشی و کامیابی عبارت ہے میمونہ کی ذات سے۔ چنانچہ میں نے اسی مضمون کا خط میمونہ کو لکھ بھیجا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک ہفتہ تک جواب کے انتظار میں وہ بھی بہت بے چین رہی تھی۔

نشیب و فراز

آخر وہ دن بھی آئے کہ میمونہ میری تھی اور میں میمونہ کا۔ سارے خیالی طلسمات اب واقعی تھے۔

وہ اُسکی نیچی نیچی نگاہیں۔ ہلکا ہلکا تبسم۔ شوخی میں حیا، حیا میں شوخی! دل سے تمنائیں گھبرا گھبرا کر نکل پڑی تھیں۔ ایک برس تک نہ مجھے دنیا کی خبر تھی نہ اپنی۔ خدا جانے واقعی وہ کوئی عالم تھا یا فریب تخیل؟ آج اُسے یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ وہ سارے واقعات کسی مادّی دنیا کے اور خارج از ذہن تھے۔ مگر زمانہ غم اور خوشی میں تمیز نہیں کرتا۔ دن گزرے۔ راتیں کٹیں، اور چشم زدن میں وہ گھڑیاں قصۂ ماضی بن گئیں۔

ایک برس کے بعد وہی ہوا۔ آہ وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا۔ ابّا جان کا انتقال ہوگیا۔ اور ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ابھی میں نے اِف اے کے دوسرے ہی سال میں قدم رکھا تھا۔ بھیا سب رجسٹرار تھے۔ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پاتے تھے۔ چار بچّے تھے جن میں سے دو اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ کیا اپنی خبر لیتے کیا ماں کی اور کیا میری۔ یہ اُنکی محض ہمت ہی ہمت تھی کہ مجھ سے برابر تعلیم جاری رکھنے اور بی۔ اے پاس کرنے کے لیے اصرار کرتے رہے مگر مجھے اُنکی جیب پر کچھ بھی بار رکھنا گوارا نہ تھا۔ میمونہ نے مجھے مشورہ دیا کہ کوئی ملازمت قبول کر لو۔ مگر اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے میمونہ کی وہ کھڑی کی ہوئی تصویر پھر قائم ہوگئی جسے دیکھ کر میں لرز گیا۔ نہ مجھے یہ ذلت گوارا تھی نہ بھائی کی اعانت۔

میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرے شہر میں پہنچ کر اِف۔ اے کی جماعت سال دوم میں شریک ہوگیا۔ پرائیوٹ ٹیوشن سے مجھے ۲۰ روپے ماہوار ملنے لگے جو میرے خانگی اخراجات کے لیے کسی طرح کافی نہ تھے۔

اسی سال ہماری فکروں میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔ خدا نے مجھے ایک اور ہستی کا کفیل بنا دیا۔ سنتا ہوں بچّہ اپنی ماں کے پیٹ سے رزق لیکر آتا ہے اور سچے مومن کی حیثیت سے مجھے اس پر ایمان رکھنا چاہیے۔ مگر کاد الفقر ان یکون کفراً۔ واقعہ کو کیا کروں۔ اِف۔ اے کا دوسرا سال میں نے کس مصیبت سے پورا کیا ہے کچھ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ پاس تو کر گیا

مگر ہمت نے جواب دیدیا۔ میں جب مکان جاتا تھا تو میمونہ کی جفاکشی پر گھبرا اُٹھتا تھا۔ جاڑا پڑ رہا ہے۔ بچے کو کسی طرح لپیٹ رکھا ہے مگر خود اکہرا کُرتا پہنے، سر پہ باریک ململ کا صرف آنچل ڈالے سردی سے اکڑی جاتی ہے۔ منھ سے کبھی نہ نکلا کہ مجھے کیا تکلیف ہے اور کیا چاہیے۔ بشرے کی شگفتگی اور بشاشت میں کبھی فرق نہ آیا، ہاں یہ دیکھا کہ گلاب سی رنگت اب چنبیلی کے پھول کی طرح سفید پڑ گئی ہے!

مجبور ہو کر میں نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی۔ گو یہ اسکول ماسٹری اور چالیس روپے کی تنخواہ مجھ پر بہت شاق تھی۔ میں اپنے کو بالکل ناچیز سمجھتا تھا۔ اپنی نظر میں آپ ہلکا تھا۔ دِل بیٹھا جاتا تھا۔ میمونہ شاید اس راز سے واقف نہ تھی۔ وہ اب خوش تھی۔ مطمئن تھی۔ اسکا رنگ پھر نکھر گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نکل آئی تھی۔ میں جب گھر آتا تھا تو اپنی حیثیت کو بھول جاتا تھا۔ میمونہ کا بچّے کو گود میں لیکر پیار کرتے ہوئے اور بچے کو قلقاریاں مارتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ اب میری خوشی کی گونہ تھی، مگر اُسی وقت تک جب میں گھر میں ہوتا تھا۔ جب تک گھر سے باہر نوکری پر ہوتا تھا افسردہ دل، ناخوش، مضمحل۔

ابھی چھ مہینے ملازمت کی تھی۔ زندگی کا ایک ڈھرّا بندھ گیا تھا۔ ایک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ پیارا بچہ جو ماں باپ کی خوشی کا سرمایہ تھا اُسے خدا نے لے لیا۔ وہی جانتا ہے کہ دیا کیوں تھا؛ ور لے کیوں لیا؟ میمونہ پر اس صدمہ نے جو قیامت ڈھائی اُسے وہی ماں جانتی ہے جسے ایک بچے کے سوا دولتِ دنیا سے کوئی اور حصہ نہ ملا ہو اور وہ بھی چھن گیا ہو۔

میمونہ کی دل دہی کے لیے میں ایک ماہ کی فرصت لے کر گھر آ رہا۔ مگر اُس کی حالت میں کوئی افاقہ نہ تھا۔ سوا میرے اُس کو کسی طرح، کسی حال اور کسی صحبت میں تسکین نہ ہوتی تھی۔ مزید فرصت کی درخواست کی منظور نہ ہوئی۔ ناچار ملازمت کو خیرباد کہی۔ چند مہینوں میں اختلاج سے افاقہ ہوا تو ممانی جان (میمونہ کی ماں) اُسے اپنے گھر یعنی میمونہ کے ننہال لے گئیں۔

طول امل

اب جو ذرا اطمینان حاصل ہوا تو نام ونمود اور جاہ وثروت کا خیال پھر دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ ایک مشہور شہر میں پہونچ کر ایک مشہور کالج میں داخل ہوگیا۔ ساتھ ساتھ ٹیوشنوں سے، اخبار نویسی سے اور اسی قسم کے اور اور ذرائع سے تیس چالیس پچاس ساٹھ روپے ماہوار اور کبھی اس سے زیادہ مہیا کرلیتا تھا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک پیسہ بھی حاصل نہ کرسکا۔

میمونہ کو میری جدائی کبھی گوارا نہ تھی اور اب اور زیادہ ناگوار تھی۔ مگر وہ ہمیشہ میری خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم رکھتی تھی۔ وہ کبھی اصرار اور زور کے ساتھ مجھے میرے ارادے سے روکتی تھی جو کچھ اُس پر گزرجاتی تھی وہ خاموشی سے جھیل لیتی تھی۔

بی۔ اے میں داخل ہونے کے چھ ماہ بعد خدا نے میمونہ کو اُس کی کھوئی ہوئی دولت پھر بخش دی۔ یعنی ایک بیٹا پیدا ہُوا۔ اُس وقت اتفاق سے کچھ زیادہ روپے میسر آگئے جو وقت پر کام آئے۔ غرض یوں ہی دن گزرتے تھے اور یہی اوقات ہوگئی تھی۔

جب میں نے بی۔ اے پاس کیا تو کوئی معقول ملازمت حاصل کرسکتا تھا مگر سٹیٹ اسکالرشپ کے اعلان نے میرے دامنِ ہوس کو اور دراز کردیا۔ ہمارے پرنسپل کی شخصیت محکمہ تعلیم ہند میں بڑی زبردست تسلیم کیجاتی تھی۔ اُنھیں کے ایما سے درخواست کی۔ سعی وسفارش اور سارے مراحل انھوں نے خود طے کیے اور مجھے یورپ جانے کے لیے وظیفہ مل گیا۔

میں نے میمونہ کو خط لکھا :—

میری پیاری میمونہ

تم شاید یہ خبر سُننے کو پہلے سے تیار نہ ہوگی کہ مجھے یورپ میں جدید طرز پر عربی کی تکمیل کے لیے گورنمنٹ سے اسٹیٹ اسکالرشپ عطا ہُوا ہے۔ یہ محض خدا کا فضل ہے ورنہ لوگ جانیں لڑا دیتے ہیں اور نصیب نہیں ہوتا۔

مگر جو رقم گورنمنٹ سے ملتی ہے وہ یورپ کے سفر کے لیے کافی سے زیادہ نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ میں تمھارے لیے کیا سامان کروں۔ میں اب تک اسے حل نہیں کر سکا ہوں۔ کئی صورتیں ذہن میں ہیں۔ ایک صاحب سے قرض حسنہ کی امید ہے۔ بہرکیف اسکے متعلق جلد کوئی فیصلہ کرکے تمھیں مطلع کروں گا۔

اب مجھے تم سے یہ دریافت کرنا ہے کہ تم اسے کیسا سمجھتی ہو۔ گو میں تمھارے خیالات سے واقف ہوں مگر تمھیں کہو کہ تم ایک پچاس ساٹھ روپے تنخواہ پانے والے کس مپرس اسکول ماسٹر یا گھسے ہوے پیسے کی طرح نہ چلنے والے مفلس وکیل کی بیوی بننے میں زیادہ مسرت محسوس کروگی یا ایک ڈاکٹر آف فلاسفی کی بیوی کہلانے میں، جس کی تنخواہ پانسو روپے ماہوار سے شروع ہوگی؟ کیا اُس وقت تم اپنی ہمچشموں میں فخر نہ کروگی؟ کیا اُس وقت سوسائٹی کے معزز سے معزز شخص کی بیوی تم سے ملنا اپنی عزت نہ سمجھے گی؟

بے شک محبت دنیا کی بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی دولت ہے۔ مگر میری جان جاہ و ثروت بھی دنیا کی بہت بڑی اور جائز لذت ہے۔ اور اگر حاصل ہو سکے تو ہم لوگ اس خوشی سے کیوں محروم رہیں؟ اور اپنی موجودہ خوشی پر اضافہ کر سکیں تو کیوں نہ کریں؟ محبت ایک معشوق ہے مگر سادہ وعریاں۔ جاہ و ثروت اس کا لباس اور زیور ہیں۔ معشوق عاشق کی نظر میں ہر حالت میں پیارا معلوم ہوتا ہے مگر لباس فاخرہ اور زیور سے آراستہ ہو تو کیا کہنا!

تمھارا یوسف

ہمیں صرف محبت چاہیے

میرے سرتاج　　خدا آپ کی مرادیں پوری کرے

مجھ کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو یورپ جانیکے لئے سرکار سے وظیفہ ملا ہے آپ کے ارمانوں کی اس معراج پر آپ کو دل سے مبارکباد دیتی ہوں ؎

سفر رفتنت مبارک باد　　بسلامت روی و باز آئی

میرے متعلق آپ تردد نہ کریں۔ پانچ برس جس طرح کٹ گئے اُسی طرح یہ چند سال بھی کٹ جائینگے اگر کچھ تکلیف بھی ہوگی تو آپ کی آیندہ کامیابی کے خیال سے ہلکی ہو جائے گی۔ اور آپ کی دوبارہ ملاقات رہا سہا رنج و غم بُھلا دے گی۔

آپ نے جو سوالات مجھ سے کیے ہیں اُنکے جوابات جو کچھ میں رکھتی ہوں آپ کو پہلے سے معلوم ہیں میں کبھی عرض کر چکی ہوں اور شاید میرے طرز عمل سے بھی آپ کو میرے اس خیال کا عملی ثبوت ملگیا ہوگا کہ میرے لیے دس بیس سو پچاس اور ہزار پانسو اُس وقت تک سب یکساں ہیں جب تک ہمارے متاع محبت میں کوئی کمی نہیں، جب تک ہم میں پیار کرنے اور پیار کیے جانے کی یکساں قابلیت موجود ہے، جب تک آپ ہماری نظر کے سامنے ہیں اور نہیں آپ کی سے

"جو ہو مجھ سے پیار تم کو، جو ہو تم سے پیار مجھ کو (نیرنگ) نظر آئے خار ہستی، گُل نو بہار مجھ کو"

میں ہرگز ایسی تقدیر پر راضی نہیں ہو سکتی جو مجھے کل ساری دنیا وی دولتوں کا وعدہ کر کے آج آپ کو ہم سے چھڑا لے جائے۔

محبت اور جاہ و ثروت اجتماع ضدین۔ جاہ و ثروت بجائے اسکے کہ محبت کا لباس اور زیور ہو، اسکے خون کا پیاسا دشمن ہے۔ قدرتی محبت ہر تکلف و تصنع سے پاک یعنی عریاں ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ قدرت خود عریاں ہے اور سچا عاشق اسی حالت کو پسند کرتا ہے۔ خالص و معرّیٰ محبّت میں وہی فرق ہے جو ایک اصلی گلاب اور گلاب کی ریشمی وزرتار تصویر میں۔ مجھ کو اصلی گلاب، خالص و عریاں محبت، چاہیے۔ مجھے اپنا سادہ و معرّا یوسف، میرا پیارا شوہر درکار ہے۔ ڈاکٹر یوسف پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا وغیرہ وغیرہ کی مجھے حاجت نہیں۔ وہ تصور میں مجھے نامحرم سے مرد معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے آج سوسائٹی کا کیا گناہ کیا ہے کہ معزز سے معزز خاتون سے آنکھیں چار نہ کر سکوں؟ یہی نا، کہ مجھے دنیاوی دولت حاصل نہیں؟ نہ سہی! میں کب پروا کرتی ہوں؟ میری جوتی کو کیا پڑی ہے کہ سوسائٹی میں گھسنے جاؤں۔ جب تک مجھے محبت کی دولت حاصل ہے۔ جب تک میرا دامن اخلاق صاف و بے داغ ہے میں کبھی کسی کے آگے اپنے کو حقیر نہیں سمجھ سکتی۔

آپ مجھ سے ناحق مشورہ چاہتے ہیں۔ زندگی کے متعلق میرا نقطۂ نظر اور ہے، آپ کا اور۔ آپ کی نظر کے سامنے ایک غیر محدود دنیا اور اُسکی لاانتہا ہی لذتیں ہیں جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ مگر میرے سامنے صرف ایک محدود دنیا ہے غیر محدود لذت کے ساتھ، جو دنیا کی ساری لذتوں پر غالب ہے۔ وہ ہماری محبت کی دنیا ہے۔ ہم دونوں کی دنیائیں جدا جدا ہیں۔ آپ میری دنیا کے مزے سے ناآشنا، میں آپ کی دنیا سے بے نیاز۔ لہذا آپ جائیں اور خوشی سے جائیں مگر خدا کے واسطے اسیر مجھ سے صاد نہ ہوائیں۔

اگرچہ آپ کو خوشی سے رخصت نہیں کرسکتی مگر رخصت ضرور کرونگی۔ یہ آپ کا ارمان، آپکا مقصد، آپ کی خوشی ہے۔ اور آپ کی خوشی میرا ارمان، میرا مقصد اور میری خوشی ہے۔

داؤد آداب کہتا ہے۔ آپ کی میمونہ

اس لڑکی کا فلسفہ مجھ کو ہمیشہ عاجز ہی کرتا رہا۔ اس خط نے میری قوتِ فیصلہ میں پھر ایک تہیج پیدا کردیا۔ یہ خط نہ تھا۔ فردِ قراردادِ جُرم تھی۔ مجھ پر سرکارِ محبت سے بے وفائی، سردمہری، سُست عہدی، اور ہوسناکی کا الزام عاید کیا گیا تھا۔ مجھ کو ملامت کی جارہی تھی۔ مجھ پر نفرین کررہا تھا۔ کون؟ میرا دل! گھبرا کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ چشمِ تصور کھُل گئی۔ میمونہ ایک کُرسی پر اُداس بیٹھی ہے۔ میں اُسکے سامنے سر جُھکائے کھڑا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ "میمونہ! تیرا الزام بجا ہے۔ میں تیری محبت کا سزاوار نہیں۔ تیرا سا پاک دل میرے پاس نہیں۔ پھر تیرے سے پاک جذبات مجھے کہاں سے میسر آئیں!........ معاف کر پیاری میمونہ! مجھے یوں نہ دیکھ۔ لے میں ولایت کے خیال سے باز آیا۔ ہاں اب مسکرا اور مجھے بیٹھنے کا حکم دے۔"

میں یکایک چونک گیا۔ تھوڑی دیر میں پھر دریائے خیال میں غوطے لگانے لگا "لیکن میمونہ پھر بھی عورت ہے۔ عورت صرف جذباتِ لطیف سے معمور ہوتی ہے۔ اس کا حوصلہ تنگ ہوتا ہے۔ اسکی خوشی کا دائرہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ مرد فطرۃً اولوالعزم ہوتا ہے۔ اس میں کسے کلام ہوسکتا ہے کہ انسان اس کشمکشِ حیات میں اپنی عزیمت، ہمت، اور قوتِ ارادی ہی سے غلبہ حاصل کرتا ہے؟

یہ مردانہ صفات ہیں ۔ جُرم نہیں ۔ گناہ نہیں ۔ میمونہ کا فلسفہ اگرچہ بجائے خود بہت زبردست ہے مگر عملی نہیں ۔ مگر دوسروں کو وہ خیالی معلوم ہو تو ہو وہ خود اس پر عامل ہے ۔ اس کا مذہب اسکا مقصدِ زندگی، بلکہ خود اُسکی زندگی محبت ہے ۔

میں خیالات کی اسی کشمکش میں مبتلا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کرسکا ۔

رخصت

مکان آیا ۔ میمونہ سے اپنے ارادے کا تذبذب ظاہر کیا ۔ مگر خود اُس نے مجھے جانے کے لیے مجبور و ناچار کردیا ۔ میرے سفرِ یورپ کی خبر اب طشت از بام ہو چکی تھی ۔ بھائی بھی مجھے رخصت کرنے کو مکان آگئے ۔ اور وہ میری غیر حاضری میں پچیس روپے ماہوار میمونہ کو دینے پر مُصر ہوے میں کسی طرح انکار نہ کرسکا ۔ اور سوا قبول کرنے کے چارہ ہی کیا تھا ؟ اور کوششیں ناکام ہو چکی تھیں ۔ میمونہ کو یہ اعانت بہت ناپسند تھی مگر وہ میری خاطر سب کچھ گوارا کرتی تھی ۔

ماں سے رخصت ہوا ۔ بھائی اور اُن کے بچوں سے ملا ۔ داؤد کو پیار کیا ۔ مگر میمونہ کا زرد چہرہ اور آنسو ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میرا دل مسل گیا ۔ آنکھیں چار ہونا تھیں کہ اُسکے آنسو جنھیں ضبط سے وہ آنکھوں میں چھپائے تھی ایک بار ٹپک گئے ۔ وہ کھڑی تھی مگر تلملا کر بیٹھ گئی ۔ میں نے سنبھالا ۔ تھوڑی دیر میں اُس نے خود اپنے کو سنبھالا اور کہنے لگی " میری خطا معاف فرمائیے گا ۔ میں ہمیشہ آپ کی پُر حوصلہ زندگی میں خارِ دامن بنی رہی ۔ آپ میری بدولت ناشاد رہے ۔ میری خطائیں معاف فرمائیے گا ۔ میں نے اپنا مہر آپ کو معاف کیا " اس وقت وہ سراپا استقلال تھی ۔ آنسو خشک تھے ۔ ہونٹھ اور سارا جسم کانپ رہا تھا ۔ میری زبان بند ہوگئی ۔ حواس پراگندہ ہوگئے ۔ ریل کا وقت تنگ تھا ۔ اعزا باہر منتظر کھڑے تھے ۔ بھائی پکار رہے تھے ۔ میں نے اپنے کو گھسیٹ کر باہر نکالا ۔ اور اس درد سے رخصت ہوا جس کی ٹیس آج تک سینے میں موجود ہے ۔

گلاب کا پھول

ولایت جانے کے چھ ماہ بعد ایک اور بچے کی ولادت کی خبر آئی۔ پھر اسکے پانچ مہینوں کے بعد مجھے میمونہ کا یہ خط ملا :۔

"چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں"

میرے گلشن محبت کی بہار !

کھوئی ہوئی دولت کا واپس ملنا آسان ہے۔ نام و نمود اور جاہ و عزت کا حاصل کرنا سہل ہے مگر جوانی کے گزرے ہوئے گھنٹوں کا واپس آنا ناممکن۔ عورت کی زندگی گلاب کا پھول ہوتی ہے۔ خوشنما مگر مختصر۔ پھول نہ کھلنے میں کسی کا منتظر ہوتا ہے نہ کھل کر مرجھانے میں کسی کی خاطر دیر کر سکتا ہے، نہ مرجھائے ہوئے پھول کو کوئی طاقت کھلا سکتی ہے۔ جو پھول کی بہار لوٹنا چاہتا ہے وہ اسکی شگفتگی پر نظر رکھتا ہے۔ پھول جب تک کھلا رہتا ہے گلدان نظر کے سامنے میز پر دھرا ہوتا ہے، کیونکہ وہ کبھی دیکھنے والے کی مہلت کا انتظار نہیں کرتا۔

میری زندگی تمام ہونے کو ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں پھول کی طرح کھلی تو ضرور مگر مشتاق آنکھوں سے دور، اور قدردان ہاتھوں سے محروم۔ یہ نامرادی اور بھی قبل از وقت پژمردہ و خشک کیے دیتی ہے۔ شادی کو آج چھ برس ہوئے مگر مشکل سے چھ مہینے بھی مسلسل آپ کی صورت دیکھی۔ مرد ایک سرسبز سرو ہے۔ سدابہار۔ ہمیشہ تروتازہ۔ آپ تو اس خیال میں رہے کہ ابھی بہت وقت ہے۔ مگر مجھے یہ ڈر کہ جب تک مرجھا نہ جاؤں۔ اور یہی ہوتا نظر آتا ہے۔

میرے پیارے شوہر! آپ کی دولت، آپ کی ثروت، آپ کی نصرت، آپ کی عزت آپ کو مبارک! اگر میں زندہ بھی رہی تو کیا! آپ کی شادمانی و کامرانی سے لذت اٹھانے کی قابلیت باقی رہی نہ آپ کی شریک خوشی ہو کر آپ کی خوشی میں اضافہ کرنے کی لیاقت۔

"بعد میرے کیوں نوید وصل یار آنے کو تھی
وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی" (داغ)

جب سے اسحاق پیدا ہوا ہے میں ایک روز بھی اچھی نہیں رہی۔ مس براؤن نے کہ دیا ہے کہ زچگی کا بخار ہے اور بہت مخدوش ہے۔ بہت مخدوش ہوگئی ہوں۔ جسم میں خون کا نام نہیں۔ آثار اچھے نہیں ہیں۔ آپ کے تردد کے خیال سے اب تک آپ کو مطلع نہ کیا۔ اپنی فکر نہیں۔ بچے تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ داؤد کو کھانسی ہے اور اسحاق کو دودھ نہیں ملتا۔

بھیا نے دو مہینوں سے روپے نہیں بھیجے ہیں اور خوب کیا نہ بھیجا۔ میں کب چاہتی تھی کہ بھیجیں۔ صرف یہ دعا ہے کہ خدا آپ کو کامیاب کرے اور بچوں کو اپنی امان میں رکھے۔ ایک آرزو اور تھی مگر وہ پوری ہونے والی نہیں

"آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمھارے سامنے
تم ہمارے سامنے ہو ہم تمھارے سامنے" آپ کی جاں نثار میمونہ

یہ خط پڑھ کر فوراً بھائی کو تار دیا اور ایک مفصل خط میں خوب دل کا بخار نکالا۔ جواب تشفی بخش تھا۔ بھیا نے روپے نہ بھیجنے کا معقول عذر بتایا۔ دو گزشتہ دو آیندہ جملہ چار مہینوں کے سو روپے یک مشت میمونہ کے حوالہ کرنے کی کیفیت لکھی۔ میمونہ کے دوسرے مختصر خط سے بھی روپیوں کی رسید اور اطمینان کا حال معلوم ہوا۔ میں کچھ مطمئن تو ہوگیا۔ مگر طبیعت سرد ہوگئی۔ وہ ذوق و شوق کامیابی کا باقی نہ رہا۔

اب کوئی سنگِ راہ نہیں

میں برلن میں تھا اور پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہا تھا کہ بھائی کا تار آیا۔ تار کیا آیا مجھ پر بجلی گر گئی۔ میں بت کی طرح بے حس و حرکت تھا۔ مجھ کو خبر نہیں مجھ پر کیا کیا گزری۔ میرے قوائے ذہنی معطل ہوگئے تھے۔ کیسی ڈگری اور کہاں کی کامیابی۔ بائیسویں روز میں اپنے غمکدے کے دروازے

پر تھا۔ اماں مجھے سینے سے لگا کر رونے لگیں۔ ان کے آنسو دل سوزی سے ضرور نکلتے تھے مگر اُن میں ہمدردی کی جھلک نہ تھی۔ اُن کو میرے غم اور درد کا احساس رُلاتا تھا۔ مگر دل اُس ہمدرد کو ڈھونڈھتا تھا جو میمونہ کے لیے میرے ساتھ روئے میرے آنسو دیکھ کر آنسو نہ بہائے۔ دنیا میں ایسا کوئی ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ ہاں اسوقت میرے بچے یاد آئے۔ پدری جوش محبت اگر کوئی چیز ہے تو اُسکی حس مجھے اُسی وقت ہوئی۔ بچوں کو پوچھا۔ معلوم ہوا بھابھی انکو اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔

بھیا کا مکان اسٹیشن سے دو گھنٹے کی راہ ہے۔ میں اُسی وقت چل کھڑا ہوا۔ اب تک غم کی آگ میرے دل میں سُلگ رہی تھی۔ آنسو خشک تھے۔ بچوں پر نظر پڑنا تھی کہ تاب ضبط نہ رہی۔ فرش پر بیٹھ گیا اور بچوں کو گود میں بٹھا کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ اتنا رویا کہ عمر بھر کبھی نہ رویا ہوں گا۔ داؤد تتلا تتلا کر کہنے لگا "اماں اللہ میاں کے گھر گئی ہیں۔ اور ابتک نہیں آئیں" اور رونے لگا۔

"آہ میمونہ! بے شک تیرا فلسفہ صحیح تھا۔ میری جاہ طلبی ہرگز اولوالعزمی نہ تھی۔ فرض فراموشی تھی، حق تلفی تھی، ستم شعاری تھی، بے ایمانی تھی! بے شک تو گلاب کا پھول تھی۔ میں نے تجھے پامال کر دیا۔ تیرا شجر جوانی آب محبت کے بغیر سوکھ گیا"!

رات کو بستر پر پڑا پڑا دیکھتا ہوں۔ کہ میمونہ وہی کپڑے پہنے ہوئے کھڑی ہے جو مجھے ولایت رخصت کرنے کے وقت پہنے تھی۔ تھرائی ہوئی آواز سے کہہ رہی ہے "آپ کی خاطر میں راستہ سے ہٹ گئی۔ اب تامل کیا ہے؟ جہاں چاہیں شوق سے جائیں۔ اب آپ کی منزل میں کوئی سنگِ راہ نہیں" یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ مَیں گھبرا کر میمونہ میمونہ پکارنے لگا۔ بھائی نے شانہ پکڑ کر ہلا دیا۔ آنکھیں کھُلیں تو کچھ نہ تھا۔ ایک فرشتہ مجھ پر لعنت کرکے غائب ہوگیا تھا۔ ۶

اے واے نامرادی! اے واے نامرادی!

دردِ محبت

کیسا ہی شدید و قیامت خیز حادثہ ہو، ہر ایک رات کو وہ غم کا ایک چٹان سینے سے ہٹا دیتی ہے۔

یہاں تک کہ ایک دن غم مٹ جاتا ہے۔ جس سانحہ کا خیال وقوع کے قبل دل ہلا دیتا ہے۔ جس کا حدوث قیامت اور موت کے مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے وہ آخرکار ایک معمولی بات رہ جاتی ہے اور پھر فراموش ہو جاتی ہے۔ میری ماں، بھائی، یا اور احباب و اعزا اگر آج دس برس سے شادی شادی کی رٹ لگا رہے ہیں تو وہ بالکل بے قصور ہیں۔ اُن کا تقاضا فطرت کا تقاضا ہے جس پر دنیا معتل ہے۔ مگر کاش ان چارہ سازوں کو معلوم ہوتا کہ ہر مرض علاج پذیر نہیں ہوتا۔ ایسا درد بھی ہوتا ہے جسے زمانہ کبھی مٹا نہیں سکتا۔ ایسے زخم بھی ہوتے ہیں جن کے لیے کوئی مرہم نہیں۔ ایسا صدمہ بھی ہوتا ہے جسے مرورِ ایام ہلکا نہیں کر سکتا! کاش یہ مدعیانِ دوستی و دلسوزی اتنا سمجھتے کہ انکا لطف میرے حق میں ایک ناقابلِ برداشت ستم ہے!

شادی کا ذکر؟ شرک فی المحبۃ؟ اس سے بڑھ کر محبت کی اور کیا اہانت ہو سکتی ہے؟ جس نے میری محبت میں جان نثار کر دی کیا میں اتنا بھی نہ کروں کہ جب تک جیوں اُسکی محبت کی حرمت قائم رکھوں؟

اُف ری کمبخت ہوسِ جاہ! نتیجہ آخر یہی ہوا کہ میں ایک اسکول کا ہڈ ماسٹر ہوں اور اُس اسسٹنٹ ماسٹری کی زندگی کو رو تا ہوں جس پر اگر قناعت کرتا تو آج دنیا میں شاد و بامراد ہوتا۔ گھوم پھر کر وہی زندگی اختیار کرنا پڑی مگر محبت کا خون کر کے۔

وہ راتیں اور یہ راتیں!

ایک وہ راتیں تھیں جو شادی کے قبل میمونہ کے دھیان میں بسر ہوتی تھیں۔ چمنستانِ امید و تمنا پیشِ نظر رہتا تھا، حسرتوں کا تلاطم تھا۔ ایک وہ راتیں تھیں جب میں اسکول کی ملازمت کی چھٹیوں میں مکان آتا تھا اور ساری ساری رات باتوں میں گزر جاتی تھی۔ اذان کی آواز ہم دونوں کو چونکا دیتی تھی اور دیر تک ہمیں صبح ہونے کا یقین نہ آتا تھا۔ ایک وہ راتیں تھیں جو اگرچہ ویسی پُرلطف نہ تھیں مگر آئندہ عظمت و اعزاز اور ناآوری کے خوابِ شیریں میں بسر ہوتی تھیں۔ ایک یہ راتیں ہیں۔ آہ یہ

راتیں! اُداس، بھیانک، وحشت خیز! اگلی تمنائیں مایوسیوں سے مبدّل ہیں! حسرتیں مردہ پڑی ہیں! لذتِ شوق اور ذوقِ دیدار کی یاد تلخکام کر رہی ہے! جاہ وثروت کا خیال اب خوابِ شیریں نہیں بلکہ ایک پریشان اور ہولناک وہم ہے!

اِک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے۔ اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اُٹھکر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے
(ضیا مرحوم عظیم آبادی)

ایک ہونہار، باحوصلہ، بلند ہمت، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان دنیا میں گمنام، ناکام، تلخ زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور صرف ایک غلطی کی بدولت۔ وُہ مختلف النوع خواہشوں میں خلط مبحث۔ جاہ وثروت کی آرزو کی تھی تو محبت کا نام اُس وقت تک لینا نہ تھا جب تک یہ پوری نہ ہو جاتی۔ اور اگر محبت (جو کبھی وقت اور موقع نہیں دیکھتی) کے حلقۂ بگوشوں میں داخل ہونا تھا تو جاہ وثروت کا طوق گلے سے توڑ پھینکنا تھا۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دُوں — ایں خیال ست ومحال ست وجنوں

آہ یہی حقیقت تھی جسکی طرف میمونہ نے اپنے شاعرانہ طرز میں مجھ کو بار بار توجہ دلائی مگر میں متنبہ نہ ہوا۔

مرحومہ کی صرف دُو نشانیاں ہیں جو کسی وقت تسکین بخشتی ہیں۔ اور کبھی بے چین کرتی ہیں۔ وہ میری اولاد ہے۔ لڑکی تو ماں کی تصویرِ مجسّم ہے اور میں کسی وقت اُسکا نظر سے اوجھل ہونا گوارا نہیں کرتا۔

آج میری عمر ۳۵ پینتیس ۳۶ چھتیس کے درمیان ہے مگر ۵۵ پچپن ۵۶ چھپن برس کا بوڑھا معلوم ہوتا ہوں۔ اور اس بے وقت بڑھاپے سے بدل راضی اور ممنون ہوں جو مجھے روز بروز میمونہ سے قریب تر کرتا جاتا ہے۔

تمام شُد

محمد مسلم (عظیم آبادی)

قصیدۂ نعتیہ

(از خواجہ عزیز الدین عزیزؔ مرحوم)

با ایں صفا کہ از زمی انساں برآمدہ	گوئی ز خاک چشمۂ حیواں برآمدہ
زاں چشمہ قطرہ قطرہ بود بحرِ بے کراں	زاں بحرِ بے کراں دُر و مرجاں برآمدہ
ہر تبدیش قیمتِ یاقوت را شکست	ہر دُر گراں برآمدہ غلطاں برآمدہ
از خاکِ چشمۂ کہ بود فیض آں محیط	و ز نارِ برق خرمنِ ایماں برآمدہ
چوں باد و خاک و آتش و آب ست ضدِ ہم	ابلیس ازاں مخالفِ انساں برآمدہ
آساں مگیر خلقتِ انساں کہ گوہرش	بسیار سعی رفت کہ از کاں برآمدہ
گہ با جمالِ عیسیٰؑ مریم نمود رُوے	گہ با جلالِ موسیٔ عمراں برآمدہ
دریا گہے بر و شدہ پایاب راہ داد	گہ لالہ و گل آتشِ سوزاں برآمدہ
یونسؑ ز بطنِ ماہی و یوسفؑ ز قعرِ چاہ	نوحؑ از بلاے ورطۂ طوفاں برآمدہ
روشن سوادِ مصر ز مہرِ فروغ کرد	ماہے کہ آں ز خطۂ کنعاں برآمدہ
شد مہرِ نیم روز خجل از فروغِ خود	چوں ماہِ نیم ماہ ز گیلاں برآمدہ
گہ آبیارِ مزرعِ شرعِ شریف شد	گہ چشمہ سا ز لجۂ عرفاں برآمدہ
گہ فرخی فزاے جہاں شد چو مشتری	گہ پاسبانِ خلق چو کیواں برآمدہ
ہر کوکبے کہ جلوہ ہمی کرد شد نہاں	کز مکہ آفتابِ درخشاں برآمدہ
فرِ فروغِ آں ہمہ عالم فرا گرفت	ہر ذرہ ہمچو آئینہ حیراں برآمدہ
ہر شش جہت زیرِ تو آں رونقے گرفت	ہر ہفت ہفت گنبدِ گرداں برآمدہ
شد خاکِ مردہ زندہ و سر سبز کوہ و دشت	از ہر کنار سنبل و ریحاں برآمدہ
حسانِ ثابت از عرب آمد بمدحِ شیخ	از ہند ہم عزیزِ ثناخواں برآمدہ

ہاجرہ کی کامیابی

(بسلسلۂ الناظر ماہ جنوری ۱۹۱۶ء)

"مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر"

"ہاجرہ کی کامیابی" کا تیسرا ٹکڑا ناظرین الناظر کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ صرف ایک مختصر قصہ تک اسے محدود رکھوں، جو زیادہ سے زیادہ الناظر کی دو اشاعتوں پر ختم ہو جائے۔ لیکن اپنے بعض محترم دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر قصہ کو بقدر طول دینا پڑا کہ آخر یہ ایک پورا ناول ہو گیا۔ اور پھر بھی ختم نہ ہوا۔ اب تک تو یہ برابر ماہ بماہ الناظر میں شایع ہوتا رہا لیکن آیندہ، چونکہ میں ایک عرصہ تک بالکل عدیم الفرصت رہوں گا، اس لیے مجبوراً اس سلسلہ کو موقوف کرنا ہوگا۔ اگر بقیہ حصہ کسی مجبوری سے الناظر میں شائع نہ ہو سکا، تو میرا ارادہ ہے کہ اسے آیندہ مستقل ناول کی صورت میں علٰحدہ شائع کرا دوں۔

اس عرصہ میں اکثر ناظرین الناظر نے (جن میں بلا شبہ زیادہ تر خواتین ہیں)، "ہاجرہ کی کامیابی" پر جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اُن سے نہ صرف میری ہمت افزائی ہوئی، بلکہ اُسے میں اپنی محنت کا کافی معاوضہ سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم میں اگر ایسی خواتین موجود ہیں جنھیں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اور جو اپنی مقید اور مجہول زندگی کے نقصانات سے آگاہ ہو گئی ہیں، تو یہ نہ صرف فرقۂ نسواں کی ترقی کے لیے فال نیک ہے، بلکہ میرے نزدیک تمام قوم کی ترقی کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک ایسا کثیر گروہ بھی ہے، اور جن میں زیادہ تر الناظر کے مستقل ناظرین ہیں، جن کے جذبات کو میرے خیالات سے سخت ٹھیس پہونچی ہے (مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف ہے کہ یہ سب ہمارے ہی فرقۂ ذکور کے معزز افراد ہیں) اور جنھوں نے صرف زبانی مخالفت ہی کو کافی

نہیں سمجھا بلکہ خطوط کے ذریعے سے بھی اپنی شدید مخالفت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ بعض دوستوں نے اپنے گرامی ناموں میں میری ذات پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہیں فرمایا۔ بہرکیف مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں، کیونکہ اختلافِ خیالات کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ کسی تحریک کی اگر دس موافقت کرتے ہیں تو بیس مخالفت کیلئے بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن زمانہ ہمیشہ اُنھیں کی تائید کرتا ہے، جو فلسفہ کے اس زبردست قانون کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ "دنیا میں بہتر شے قائم رہے گی" (Survival of the fittest) اور یہی یہ میرا بھی اعتقاد ہے، جس کی تائید کے لیے واقعات کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شخص اپنی ہی محدود سوسائٹی میں، مختلف معاشرتی تغیرات کی متعدد نظریں پا سکتا ہے۔ اس مضمون میں گنجایش بہت محدود ہے۔ اس لیے اس بحث کو کسی دوسری فرصت کے لیے موقوف رکھتا ہوں۔ بہرحال میں اس قدر اور عرض کروں گا ؎

سخت شرمائے وہ اتنا نہ سمجھا تھا انھیں چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بیجا کرتا

آخر میں مجھے یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس "قصہ" میں ناظرین کو بہت سی باتیں شاید بے ضرورت معلوم ہوں، لیکن میرے نزدیک وہ ناگزیر ہیں۔ اس سے بھی مجھے انکار نہیں کہ بعض واقعات ایسے بھی لکھ دیے گئے ہیں، جنکا اظہار ہماری مروجہ تہذیبِ اخلاق کے خلاف ہے۔ لیکن چونکہ میرے پیش نظر زیادہ تر انگریزی ناول رہے ہیں، اور انھیں کا مذاق کسی قدر اصلاح کے ساتھ مجھے پسند بھی ہے، دوسرے ہمارے جدید ناول نویس جنمیں بخصوصیت کے ساتھ مسٹر عبداللہ بی-اے ایڈیٹر معلومات کا نام لونگا، جن کے مشہور ناول "جمیلہ کی ناکامیابی" کے مطالعہ سے مجھے اس "قصہ" کے لکھنے میں کافی مدد ملی ہے) بھی اب یہی مذاق اختیار کر رہے ہیں، اس لیے مجھے ان واقعات کی پردہ پوشی کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بہرحال یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔

"نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہ خوش ہو مری تحریر سے کوئی نہ سہی"

"عباسی"

(۱۰)

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا
(میر انیس)

ڈپٹی ممتاز علی کے انتقال کو پورے دس ماہ ہو گئے - اب اگرچہ رونے والوں کی آنکھیں اشک شوئی اور ماتم گساروں کے ہاتھ سینہ کوبی ختم کر چکے تھے، تاہم خاندان کے سرپرست کی موت کوئی ایسا معمولی حادثہ نہ تھا جسے جلد بھُلا دیا جاتا، خصوصاً اس حالت میں کہ ڈپٹی صاحب کی حیات سے اُنکے بہت سے اعزا کا رزق وابستہ تھا - لیکن پھر رنج و غم کب تک؟ دنیا کی اسٹیج پر ایسے تماشے روز ہی ہوا کرتے ہیں - ابنر کون سدا ماتم کیا کرتا ہے؟ انسان کا دل اگر موم ہے، تو پتھر بھی ہے - آج جن مرحوم عزیز کا نام سُن کر ہم بے اختیار رو دیتے ہیں کل کچھ بعید نہیں کہ اُسی کے ذکر پر ہم قہقہے اُڑائیں - بہرکیف آخر صبر کرنا ہی پڑتا ہے - لیکن کسی کی بے وقت موت سے، جانی نقصان کے علاوہ، اگر کوئی مالی نقصان پہونچتا ہے، تو اُس وقت اُس خاندان کو جس مصیبتِ عظیم کا سامنا ہوتا ہے، وہی ڈپٹی ممتاز علی مرحوم کے خاندان کو بھی پیش آئی - گھر کا خرچ، جس اعلیٰ پیمانہ پر چل رہا تھا، بھلا بھوپال کی پچاس روپے ماہوار کی امداد، اور عظمت کی قلیل تنخواہ کیونکر کافی ہو سکتی تھی - اس عرصہ میں عشرت بیگم نے بہت دور اندیشی کی کہ حلیمہ (اکبر کی بہن) کے عقد سے فراغت کر دی، کیونکہ اب جبکہ بظاہر گھر کے سنبھلنے کی کوئی صورت نہ تھی، تو پھر لڑکی کو کس امید پر بٹھا رکھتیں؟ میاں اکبر کی گزشتہ دس ماہ کی زندگی جس طرح گزری، اُس کا مختصر حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں، خلاصہ یہ کہ مختلف سرکاری و غیر سرکاری محکموں پر حملے کیے، لیکن کہیں قدم نہ جمے، ہر جگہ سے نہایت شاندار طریقہ سے پسپا ہوے - بیوی کو پہلے ہی سے الٹیمیٹم دے رکھا تھا، لیکن ابھی تک حملہ کی نوبت نہ آئی تھی، اگرچہ وہ وقت بھی اب کچھ دور نہ تھا - عشرت بیگم اگرچہ بہو کے مقابلہ میں ہمیشہ بیٹے کا ساتھ دیتی تھیں، لیکن وہ خود بھی اکبر کی حماقتوں اور فضول خرچیوں سے

سخت عاری ہو گئی تھیں۔ باپ کے انتقال کے بعد بھی اس نے حتی الامکان اپنے اخراجات میں کوئی کمی نہ کی۔ جو کچھ اس عرصہ میں تھوڑا بہت کمایا وہ اُڑا دیا، اور اسکے علاوہ مال سے بھی چھینے جھپٹے کچھ نہ کچھ لے ہی بھاگتا تھا۔

ایک روز عشرت بیگم، حلیمہ سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اُسی وقت اکبر بھی آگیا، اور جھٹ پٹ پان دان کھول کر دس پندرہ گلوریاں بنا کر ڈبیا میں بھریں، عشرت بیگم یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب اکبر باہر جانے لگا، تو انھوں نے یہ کہکر "ابھی باہر نجانا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"، اُسے روک لیا۔

اکبر۔ آپا، جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ دیجیے مجھے دیر ہوتی ہے، نہیں تو پھر شام کو کہیے گا۔"

عشرت بیگم۔ کیوں کیا کہیں نوکری لگی ہے؟ آخر ایسے ہوا کے گھوڑے پر کیوں سوار ہو؟

اکبر۔ آپ کو تو ہر وقت نوکری ہی کی پڑی رہتی ہے، رات ہے تو نوکری دن ہے تو نوکری۔ آپ کے نزدیک دنیا میں اور کوئی دوسرا ضرورت کا کام ہی نہیں۔ کل اسی کمبخت ... نوکری کی وجہ سے میں آخر گھوڑدوڑ نہ جا سکا، اب آج بھی آپ چاہتی ہیں کہ میں وہی نوکری کے قصہ میں پڑا رہوں۔ تو آپا مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ اسی بکھیڑے میں اپنا وقت ضائع کروں

عشرت بیگم۔ ہاں تم سے یہ کیوں ہونے لگا، دن بھر میں دو ڈھائی آنے کے پان چبائے جائیں گے، پاؤ ڈیڑھ پاؤ خمیرہ تماکو پیا جائے گا، لیکن نوکری نہ کی جائیگی۔ پھر میں پوچھتی ہوں کہ یہ کس کے گھر سے آئے گا۔ کہیں قارون کا خزانہ رکھا ہے؟ کیا گھوڑدوڑ دیکھنے میں یہ صرفہ نکل آتا ہے؟

اکبر۔ بس اب آپ کے طعن تشنے شروع ہو گئے۔ سب ہی گھوڑدوڑ دیکھنے جاتے ہیں پھر میں جو جاتا ہوں تو آپ کو کیوں کھلتا ہے؟

حلیمہ۔ بھائی جان، سب لوگوں کی نہ کہیے، جنھیں دنیا میں اور کوئی فکر نہیں وہی جاتے ہیں۔ آپ کو سو طرح کی فکریں ہیں، پہلے اُن سے فرصت کر لیجیے، پھر کہیں تماشا دیکھنے کا شوق کیجیے۔

اکبر - یہ، تم بھی آپا کی سی کہنے لگیں۔ ارے بھائی کل تو ہو آیا ہوں، مگر جب وہ .... کچھ سنتے ہی نہیں تو پھر میں کیا کروں؟

عشرت بیگم - تو کیا کل تم کمشنر کے ہیاں گئے تھے؟ پھر وہ کیسے ملا، آخر کچھ امید دلائی؟

اکبر - ہاں۔ میں کل آٹھ بجے اُسکے بنگلے پر گیا تھا۔ وہاں پچاسوں ملنے والے تھے۔ آدھ گھنٹہ تک میں انتظار کرتا رہا، پھر میں مکان چلا تو اُسکے بیرا نے آواز دی کہ اب صاحب خالی ہیں۔ خیر میں گیا، پہلے خاندان کا سب حال پوچھا، پھر کہنے لگا کہ تم نے اتنی جگہ نوکریاں کیں تو کیوں چھوڑ دیں؟ میں نے کہا کہ کام مشکل تھا، مجھ سے نہ چلا۔ اسپر وہ کہنے لگا کہ پھر اب بھی نوکری دی جائے تو تم سے کام نہیں چلے گا۔ اب میں اس کا کیا جواب دیتا۔ چپ ہو رہا۔ پھر عمر پوچھی۔ میں نے کہا کیوں تو میری عمر ستائیس سال ہے، مگر سرٹیفکٹ کے حساب سے چوبیس سال ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر کہا "اب تمہارا سن نوکری ملنے کا نہیں ہے، خیر ہم تمھارا خیال رکھے گا"۔ میں سلام کرکے چلا آیا

حلیمہ - تو آپ نے ۲۷ برس کی عمر کیوں بتائی؟ یہی کہدیا ہوتا کہ جو عمر سرٹیفکٹ میں لکھی ہے وہی اصلی عمر ہے۔

اکبر - تو کیا میں جھوٹھ بولتا۔ ایسی نوکری پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ ایمان بیچ کے مَیں نوکری نہیں کرتا۔

حلیمہ - ایمان بیچنے کی کون بات تھی؟ آپ کو یہی کہدینا تھا کہ میری عمر سرٹیفکٹ میں لکھی ہے آپ دیکھ لیں، پھر وہ کچھ نہ کہتا۔

اکبر - واہ۔ یہ .... انگریز بال کی کھال نکالنے والے ہوتے ہیں۔ بھلا ان باتوں کو یہ مانیں گے۔ ڈاکٹری تک تو یہ کرلیتے ہیں، تب کہیں نوکری دیتے ہیں۔

عشرت بیگم - خیر اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا، نوکری سے اب ہاتھ دھو ڈالنا چاہئے بھوپال میں بھی اب کوئی صورت نہیں اور وہاں تم جانے کو نہیں کہتے، پھر آخر کیا کروگے؟

اکبر۔ بس اب میں تجارت کروں گا، آج منشی منیر حسن صاحب نے یہ صلاح دی ہے کہ رُوئی کی تجارت میں آجکل بڑا منافع ہوتا ہے۔ آپا آپ صرف تین سو روپے کا کسی طرح بندوبست کر دیجیے، میں منشی جی کی شرکت میں کام شروع کر دوں۔

عشرت بیگم۔ بھلا میں کہاں سے بندوبست کرونگی؟ میرے پاس تو تم جانتے ہو کہ جو کچھ تھا، وہ تمھاری بہن کی شادی میں صرف ہو گیا، ہاں ایک صورت میری سمجھ میں آتی ہے کہ تمھاری بیوی کو زیور پہننے کا تو کچھ شوق نہیں، اُنھیں تو میم صاحب بننے کا شوق ہے۔ پھر زیور کس دن کام آئیگا؟ تم سیتاپور جاؤ اور اُن سے یہ سب حال بیان کرو۔ اگر زیور نہ دیں گی تو باپ سے کہکر روپے کا بندوبست کرا دیگی بس اس طرح کام نکل جائے گا۔

عشرت بیگم کی زبان سے یہ الفاظ کہ "پھر زیور کس دن کام آئے گا؟" اگرچہ اچھے نہ معلوم ہوتے تھے، لیکن بہرحال اُنکی حالت دیکھتے ہوے، یہ صلاح بھی کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ تھی۔ البتہ اُنکا یہ کہنا کہ ہاجرہ کو "میم صاحب بننے کا شوق ہے" ضرور بے موقع تھا، جبکہ خود اُنکی لڑکی حلیمہ، جو اسوقت اُنکے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی، اور جو اب ایک بیرسٹر کی بیوی تھی، اپنے انگلش بوٹ اُونی اسٹاکنگ اور ریشمی اسکارف میں نیم میم بنی ہوئی تھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بیچاری عشرت بیگم پر کچھ موقوف نہیں، یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے کہ انسان کو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دکھائی دیتا، لیکن دوسرے کی آنکھ کا تنکا فوراً دیکھ لیتا ہے۔ حلیمہ کو اوّل تو ہاجرہ سے کوئی عداوت نہ تھی، دوسرے یہ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ لڑکیاں نہ صرف اپنے زیور کو عزیز رکھتی ہیں، بلکہ اپنی دوسری بہنوں کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کرتیں کہ اُنکے زیور کو کوئی نقصان پہونچے۔ حلیمہ ماں کی اس بے انصافی کو برداشت نہ کر سکی، اور بولی۔

حلیمہ۔ آپا، یہ آپ کیسی نا انصافی کی باتیں کرتی ہیں، کیا میم صاحب بننے سے زیور کا شوق جاتا رہتا ہے، آخر مجھے بھی تو مجبوراً انگریزی کپڑے کبھی کبھی پہننے پڑتے ہیں، لیکن اس سے یہ نہیں ہوتا کہ مجھے زیور کا شوق نہ رہے۔ بھابی جان کے زیور پر کسی کو کوئی حق نہیں، وہ اُنکی چیز ہے،

خواہ وہ دیں یا نہ دیں، اس میں زبردستی کی کوئی بات نہیں۔ ایسی ہی باتوں سے تو آخر اُنھیں ہمارے گھر سے نفرت ہوگئی۔

عشرت بیگم (قائل ہوکر) پھر آخر میں کہاں سے تین سو روپیہ لاؤں، جو یہ تجارت کریں۔ آخر تجارت میں اگر فائدہ ہوگا تو وہ اُنھیں کے کام آئے گا، یا مجھے کچھ مِل جائے گا۔ میری اکیلی ذات کے لیے بھوپال کے پچاس روپے بہت کافی ہیں۔ تمھیں بتاؤ کہ پھر یہ (اکبر کی طرف اشارہ ہے) کیا کریں؟

اکبر۔ نہیں آپا، آپ کی صلاح بہت ٹھیک ہے، اور جو سلوک میرے ساتھ کیا گیا ہے بس اُسکی یہی سزا ہے۔ سیدھی اُنگلیوں گھی نہیں نکلتا۔

حلیمہ۔ خیر بھائی جان یوں آپ کو اختیار ہے، وہ آپ کی بیوی ہیں، مگر یہ بہت ہی بےموقع بات ہے کہ بیوی سے بگڑیں تو اُنکا زیور چھین لیں، اس سے تو یہ بہتر ہے کہ اُسی مہاجن سے، جسکے یہاں سے لین دین ہے، تین سو روپیہ اور قرض لے لیجیے، پھر منافع سے ادا کرتے رہیے گا، لیکن خدا کے لیے بھابھی جان کے زیور پر نظر نہ ڈالیے۔ بڑی بےشرمی کی بات ہے۔

عشرت بیگم۔ مہاجن تو اب جواب دے چکا ہے کہ آیندہ سے قرض نہیں دوں گا، اور زیور بھی کچھ بیچا تھوڑی جائیگا، بس اُسکی آڑ رکھ کر روپیہ نکالا جائیگا، پھر جب روپیہ ادا ہو جائیگا تو زیور چھڑا کر اُنھیں واپس کر دیا جائے گا، خدا نہ کرے کوئی ہضم تو کر نہیں لے گا۔

حلیمہ۔ واہ کہیں واپس نہ آیا ہو، مہاجن کے گھر میں زیور پہونچ جائے اور پھر واپس آئے۔ یہ تو بہت کم ہوتا ہے۔

اکبر (کچھ بگڑ کر) خیر واپس آئے یا نہ آئے، اسوقت کام نکالنے سے مطلب ہے، تم بیکار ناسمجھی کی باتیں کرتی ہو۔ تمھیں اُن سے بڑی محبت ہے تو تم ہی تین سو روپے کا بندوبست کرا دو۔

عشرت بیگم کو اکبر کی اس حماقت آمیز گفتگو سے سخت ندامت ہوئی۔ بڑی خیریت یہ ہوئی کہ ان تینوں کے سوا اکبر کی اس بےوقوفی کی داد دینے والا اور کوئی موجود نہ تھا، ورنہ پھر ان الفاظ

کی خوب ہی تشہیر ہوتی۔ عشرت بیگم نے زبان دانتوں سے دبالی، اور آنکھ سے اکبر کو اشارہ کیا کہ خاموش ہو جائے، جو اتفاق سے اُسکی سمجھ میں آگیا، لیکن علیمہ کے لیے جواب دینا فرض ہو گیا، کیونکہ اگر وہ جواب نہ دیتی تو یہ حضرت ایسے عقل کے پُتلے تھے کہ یہی سمجھتے کہ اُنھوں نے پالا مار لیا، اور علیمہ کو قائل کر دیا۔

علیمہ۔ بھائی جان آپ تین سو کو کیا کہتے ہیں، اگر میرے اختیار میں کچھ ہوتا تو میں تین ہزار آپ پر سے قربان کر دیتی۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔۔۔۔

عشرت بیگم (بات کاٹ کر) اچھا، ہوگا۔ اس کا کیا تذکرہ۔ بعض وقت یا یسی ہی نا سمجھی کی بات کہہ جاتے ہیں۔ اچھا پھر اب کیا رائے ہے، اور ہی کوئی تدبیر کی جائے۔

اکبر۔ دوسری کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی، بس آپ کی وہی تجویز ٹھیک ہے، میں پرسوں ہی سیتاپور جاؤں گا، اور پھر دیکھا جائے گا۔

عشرت بیگم۔ سیتاپور تو جاؤ گے، مگر وہاں کسی کے سامنے یہ نہ کہنا کہ آپا نے یہ تدبیر بتائی، نہیں میری تمام میں بدنامی ہوگی، سعیدہ کی طبیعت سے میں خوب واقف ہوں، وہ ضرور اس کا کھوج کریگی، اور پھر جو یہ پتہ چل گیا کہ یہاں سے تم اسی غرض سے بھیجے گئے تھے تو تمام خاندان کی رسوائی ہوگی۔

اکبر۔ نہیں آپا، کچھ میں بیوقوف تھوڑی ہوں، کہ سب کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کہتا پھروں کہ آپا نے مجھے یہ صلاح دی۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

عشرت بیگم۔ سب کا کیا تذکرہ، میں تو کہتی ہوں کہ تم اپنی بیوی اور ساس کے سامنے بھی کوئی ایسی بات نہ کرنا، جس سے میرے اوپر الزام آئے کہ میں نے تم کو یہ صلاح دی۔

اکبر۔ اچھا میں اُن سے بھی نہیں کہوں گا، بس اب تو آپ کو اطمینان ہے؟

علیمہ۔ خیر، یوں آپ لوگوں کی جو خوشی ہو کیجیے، مگر میں جانتی ہوں کہ دنیا والے بھی آپ ہی لوگوں کے نام رکھیں گے۔ اور آپس میں جو رنجش ہوگی وہ اسکے علاوہ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ

بھابھی جان کا دل ہم لوگوں کی طرف سے صاف نہیں ہے، اب یہ نئی شکایت پیدا ہوگی۔

اکبر۔ شکایت پیدا ہوگی تو ہمارا کیا نقصان ہے، اسکا نتیجہ خود ہی بھگتیں گی اور اب بھی بھگت رہی ہیں۔ قسم خدا کی اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو کیا میں کسی کی صورت پر نظر بھی ڈالتا۔ میرے ساتھ اب تک جو بدتمیزیاں کی ہیں، کیا وہ میں بھول گیا ہوں۔

حلیمہ۔ آپ نہیں ملتے تو اُن کا ہرج ہی کیا ہے، بلکہ وہ تو اور خوش ہوتی ہیں۔ اب یہ خدا جانے کہ اُن کا برتاؤ اچھا نہیں ہے یا آپ کا۔

اکبر (بگڑ کر) میں اُنکے ساتھ کیا بُرا برتاؤ کرتا ہوں؟ وہی ہمیشہ آڑھت کیا کرتی ہیں۔ ہر بات میں نوک جھوک، جو بات کہو اُسپر اعتراض، عجیب قماش کی طبیعت ہے۔ نہیں معلوم اُنکے دماغ میں کہاں کا کوڑا بھرا ہے۔

عشرت بیگم۔ اچھا اِن قصوں کا کوئی موقعہ نہیں، بس تم اللہ کا نام لیکر پرسوں سیتاپور چلے جاؤ۔ اور ہاں خوب یاد آیا، اُنکے باپ اگلے مہینے حج کو جانے والے ہیں، تم اُنھیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ ہی لیتے آنا۔ یہاں کی حالت دیکھ کر وہ خود ہی شاید کوئی تدبیر کریں۔

اکبر۔ بہتر ہے، جیسی آپ کی رائے ہو، .... اچھا آپا، اب مجھے دیر ہوتی ہے، گھوڑدوڑ ختم ہو جائے گی۔

یہ کہکر اکبر جلدی سے اُٹھ کر باہر چلا آیا اور وہاں سے گھوڑدوڑ روانہ ہوگیا۔ میاں اکبر کو گھوڑدوڑ کا ہمیشہ سے خبط تھا، بازی بھی بدا کرتے تھے، اور اب تک سیکڑوں روپیہ ضایع کیا، لیکن اس تمام عرصہ میں کبھی چوَنّی اَٹھنّی سے زیادہ نہ جیت سکے۔

(باقی آیندہ)

انیس احمد عباسی (کاکوروی)

نعت

(از سید شاہ محمد اسمٰعیل حسن رسا۔ ہمدانی گیاوی)

وقت آیا جو نعتِ حضرت کا — ولولہ بڑھ گیا طبیعت کا
حبذا نامِ پاکِ مصطفویٰ — بھیجتا ہے درود ربِ قوی
نام کس کا شفیعِ محشر ہے — شیفتہ کس پہ ربِ اکبر ہے
وحیِ منزل ہے بات حضرت کی — فخرِ آدم ہے ذات حضرت کی
درِ دولت پہ جبہہ سائی کی — آج تقدیر نے رسائی کی

شوق میں جب زباں پہ نام آیا
غیب سے تحفۂ سلام آیا

اے حبیبِ خدا ترے صدقے — مظہرِ کبریا ترے صدقے
خضرِ راہِ خدا ترے قربان — ہادی و رہنما ترے قربان
عنبریں زلف پر فدا سنبل — روئے رنگیں پہ صدقے لالہ و گل
باغِ عالم کی تجھ سے زینت ہے — تختۂ خاک صحنِ جنت ہے
تیرے قدموں سے آسماں ہو زمیں — غیرتِ عرش و لامکاں ہو زمیں
تو نے کی ہے وہ زمزمہ سازی — صدقے جس پر عراقی و تازی
روحِ اسلام دل میں پھونکی ہے — تازگی باغِ دیں کو بخشی ہے
مست ہو کر ترے ترانے سے — ہوئے ناآشنا زمانے سے
چھوڑ کر در ترا کہاں جائیں — تیرے کہلائیں گے جہاں جائیں

حشر میں یار و غمگسار ہے تو
حامیِ دینِ باوقار ہے تو

پانی

ارسطو اور اُس کے متبعین کا خیال تھا کہ تمام عالمِ اجسام میں صرف چار عناصر ہیں اور انھی کی متنوع ترکیب کیمیاوی سے مختلف شواہدات عالم کا وجود پایا جاتا ہے۔ لیکن متاخرین کی ہمت تحقیق کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے دنیا کو اس غلطی سے نجات دلائی۔ چنانچہ انکشافات جدیدنے اب تک ہم کو اٹھتر (۷۸) عناصر گنوائے ہیں اور ممکن ہے کہ تحقیق اور تلاش کی وسعت اس تعداد میں بھی اضافہ کردے۔ آپ یہ معلوم کرکے تعجب کریں گے کہ قدمانے ہم کو جن عناصر کا پتہ دیا تھا یعنی آب۔ آتش۔ باد۔ خاک۔ ان میں سے ایک بھی عنصر نہیں چنانچہ قارئینِ "الناظر" کے ذوق طبع کے لیے ہم پانی کو لیتے ہیں۔ اور اسپر مختلف حیثیتوں سے نگاہ ڈالیں گے۔

(۱) عنصر کسے کہتے ہیں۔

(۲) پانی عنصر ہے یا نہیں۔

(۳) تجربۂ کیونڈش۔

(۴) پانی کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں اور انکے مابہ الامتیاز خواص۔

(۵) یہ عناصر ترکیبی پانی میں کس نسبت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

(۱) عنصر کسے کہتے ہیں قبل اسکے کہ ہم پانی کے عنصر یا غیر عنصر ہونے کے متعلق کچھ عرض کریں ہم کو جاننا چاہیے کہ عنصر کسے کہتے ہیں؟ منطقی تعریف سے قطع نظر عنصر کو اس طرح سمجھیے کہ عنصر اُس جسم اوّلیں کا نام ہے جو کیمیاوی اعتبار سے دو یا دو سے زیادہ مختلف الخواص اجسام میں تحلیل نہ ہو سکتا ہو۔ یا جو دو سے زیادہ مختلف الخواص سے مرکب نہ ہو۔ مثال اول۔ سونے کو لیجیے ہم اسپر چاہے کسی قسم کا عمل کیمیاوی کریں لیکن یہ دو مختلف الخواص اجسام میں

تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ سونا عنصر ہے۔ مثال دوم۔ سینڈ Mercuric Oxide جو ایک سرخ برادہ ہے اگر گرم کیا جائے تو دو مختلف الخواص اجسام میں یعنی پارہ اور آکسیجن Oxygen میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ لہذا سینڈور عنصر نہیں۔

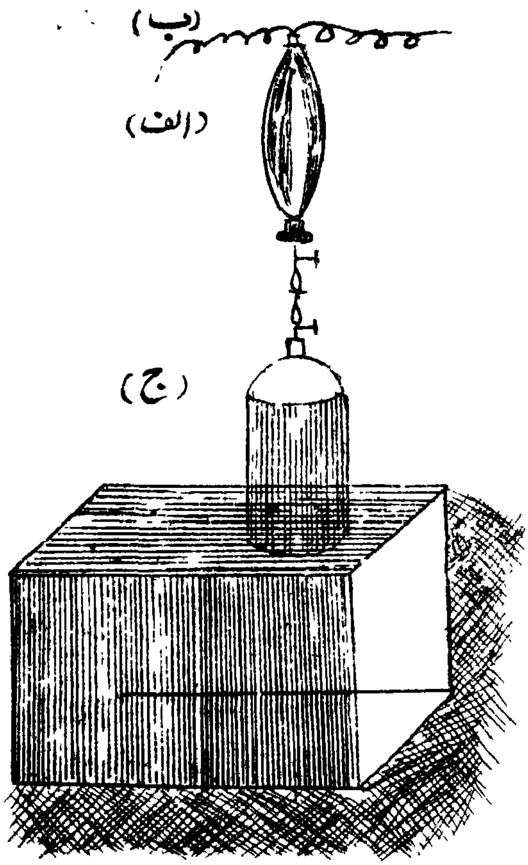
مثال سوم۔ اگر ہم ایک حصہ کاربن Carbon اور دو حصہ آکسیجن Oxygen ملا کر جلائیں تو ایک تیسری چیز کاربن ڈائی آکسائڈ Carbondioxide طیار ہوجاتی ہے۔ جو اپنے اثرات اور خواص میں آکسیجن Oxygen اور کاربن Carbon دونوں سے مختلف ہے۔ اس لیے ہم کاربن ڈائی آکسائڈ Carbondioxide کو کبھی عنصر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ بھی ایک مرکب چیز ہے۔ ان ہرسہ امثلہ کے سمجھنے کے بعد آپ غالباً اچھی طرح عنصر اور غیر عنصر میں تفریق کر سکتے ہیں۔ بس بعینہٖ اسی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر پانی سے دو مختلف الخواص اجسام حاصل ہو سکتے ہیں یا وہ دو مختلف الخواص اجزاء سے ترکیب دے کر حاصل کیا جا سکتا ہے تو یقیناً پانی عنصر نہیں۔

پریسٹلی جو یورپ کا ایک مشہور محقق گزرا ہے اُس نے مشاہدہ کیا تھا جب ہائڈروجن Hydrogen اور آکسیجن Oxygen باہم ملا کر جلائے جاتے ہیں تو کچھ تھوڑی سی نمی پیدا ہو جاتی ہے۔ پریسٹلی کو دوسرے کیمیاوی تجارب کے ضمن میں یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ لیکن یہ فخر اولوالعزم کیونڈش کو نصیب ہونا تھا کہ وہ پانی کے عناصر اصلیہ دریافت کرے۔ اور اُسکے متعلق صحیح علمی اصول پر تجربے کرے۔

کیونڈش کا تجربۂ اولیں

۱۷۸۱ء میں اولوالعزم کیونڈش نے اپنے تجارب سے عالم پر آشکارا کر دیا کہ پانی عنصر نہیں بلکہ ہائڈروجن Hydrogen اور آکسیجن Oxygen کی ترکیب کیمیاوی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ہم اسکے سب سے پہلے تجربہ کو اس جگہ بوضاحت درج کرتے ہیں جس سے قارئین کرام پانی کے متعلق اکثر مباحث سمجھ جائیں گے۔

آپ کے سامنے سیب نما شکل کی ایک بوتل ہے۔ جس کے حصہ (ب) کے قریب آپ کو



دو تار لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بوتل کے منھ کے قریب ایک ٹونٹی لگی ہوئی ہو جس سے بوتل کا مُنھ حسب ضرورت بند اور کھولدیا جا سکتا ہے۔ اس بوتل کے آلۂ مستخرج ہوا Airexhausting pump کے ذریعہ سے تمام ہوا نکال دیگئی۔ اور بدستور ٹونٹی بند کر دی گئی۔ کیونڈش نے ایک دوسری بوتل میں جسکی شکل (ج) آپ کے سامنے ہے ایک حصہ آکسیجن Oxygen اور دو حصہ ہائڈروجن Hydrogen بھر کر اس بوتل کا منھ بھی ٹونٹی سے بند کر دیا۔ اب سیب نما شکل کی بوتل اور اس نئی بوتل (ج) کا مُنھ سے مُنھ ملا دیا۔ اور دونوں بوتلوں کی ٹونٹیاں کھول دی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہائڈروجن Hydroge اور آکسیجن Oxygen کی ممزوج ہوا بوتل میں داخل ہوگئی۔ پھر اس نے متذکرہ بالا تاروں کو آلۂ تکوین البرق سے ملا دیا۔ Ellectric Battery تاکہ برقی لہر ہائڈروجن Hydrogen اور آکسیجن Oxygen کی ممزوج ہوا میں گزرے۔ جیسے ہی کہ برقی لہر اس ممزوج ہوا میں گزرتی ہے بوتل الف میں ایک شعلہ پیدا ہوتا ہے اور اسکے ساتھ ہی ہائڈروجن Hydrogen اور آکسیجن Oxygen غائب ہو جاتے ہیں اور انکے بجائے خشک بوتلوں میں مختصر سے قطرات نمودار ہوتے ہیں۔ کیونڈش پھر اسی بوتل میں دو حصہ ہائڈروجن Hydrogen اور ایک حصہ آکسیجن Oxygen بھر کر

بدستور سابق عمل کرتا ہے اور پھر اسی طرح آکسیجن Oxygen اور ہائڈروجن Hydrogen غائب ہو جاتے ہیں اور ان کے بجائے بوتلوں میں قطرات نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ عمل دوچار مرتبہ کرنے کے بعد کیونڈش نے مشاہدہ کیا کہ بوتل الف میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ جو تجربہ کے بعد نہایت صاف اور شفاف پانی ثابت ہوتا ہے۔

متذکرۂ بالا تجربہ سے ہم کو چند ضروری باتیں معلوم ہوئیں۔ جن پر ہماری بحث کا خاتمہ ہے۔

(۱) پانی ہائڈروجن Hydrogen اور آکسیجن Oxygen کی ترکیب کیمیاوی کا نتیجہ ہے۔

(۲) پانی میں آکسیجن Oxygen اور ہائڈروجن Hydrogen کی باعتبار حجم $\frac{1}{2}$ کی نسبت ہے۔ یعنی پانی طیار کرنے کے لیے ایک حصہ آکسیجن Oxygen اور دو حصے ہائڈروجن Hydrogen کی ضرورت ہے۔

(۳) آکسیجن Oxygen اور ہائڈروجن Hydrogen کو محض آپس میں ملا دینے سے پانی نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ انکی ترکیب کیمیاوی کے لیے برقی کا جزو لاینفک ہے۔

اب اگر آپ عنصر کی تعریف متذکرۂ صدر پر غور فرمائیں تو یہ امر آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ پانی عنصر نہیں بلکہ آکسیجن Oxygen اور ہائڈروجن کی ترکیب کیمیاوی کا نتیجہ ہے۔ ہماری بحث اس جگہ پر ختم ہو گئی۔ لیکن غالباً ضمناً یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آکسیجن Oxygen اور ہائڈروجن کے خواص کیا ہیں؟ اسی ضمن میں آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ مرکب کیمیائی اپنے عناصر ترکیبی سے کس قدر مختلف اور متبائن ہوتا ہے۔

آکسیجن (Oxygen)	ہائڈروجن (Hydrog)	پانی (H_2O)
(۱) آکسیجن ایک ایسی گیس ہے جسکی نہ کوئی خوشبو ہے نہ کوئی رنگ ہے اور نہ کوئی ذائقہ ہے	(۱) اسکی بھی نہ کوئی خوشبو ہے نہ کوئی رنگ ہے اور نہ کوئی ذائقہ ہے۔	اس کے خواص عام طور سے معلوم ہیں یعنی یہ بھی بے ذائقہ ایک سیال چیز ہے جس کا کوئی رنگ نہیں اور نہ کوئی خوشبو ہے

(۲) اگر کسی کانچ کے برتن میں جس میں آکسیجن بھری ہو ایک جلتی ہوئی لکڑی داخل کریں تو وہ اُس میں ادنیا وتی کے ساتھ جلے گی	(۲) اگر ایک جلتی ہوئی لکڑی کسی کانچ کے برتن میں جس میں ہائڈروجن بھری ہو داخل کی جائے تو لکڑی بجھ جائے گی۔	وغیرہ وغیرہ
(۳) یہ ہائڈروجن سے ۱۶ گنا وزن میں زیادہ ہے۔	(۳) یہ دنیا میں سب سے زیادہ ہلکی ہے۔	

ایم - صدیق رضا (علیگ)

غزل

جو اُس چاندنے اپنی صورت چھپائی — اُداسی کی بدلی مرے دل پہ چھائی
سواری جب اُس شاہِ خوباں کی آئی — تو سارے زمانہ نے گردن جھکائی
ہماری وفاؤں کا بدلا یہیں ہے — نہ کرے وفائی نہ کرے وفائی
مرے خوں کی محشر میں پُرسش ہوئی ہے — وہ بُت دے رہا ہے خدا کی دوہائی
بہت دن سے دل کا مکاں جل رہا ہے — خدا جانے یہ آگ کس نے لگائی
ہر اک جانتا ہے ہر اک مانتا ہے — ہماری وفا آپ کی بے وفائی
میں پہچانتا ہوں وہ قاتل ہے میرا — مرے خون کی جس نے مہندی لگائی
بُرائی کی بھی آخرش کوئی حد ہے — مقدر کرے گا کہاں تک برائی
بتو ظلم بے جا نہ کرتے اگر تم — تمھیں کو ستی کیوں خدا کی خدائی
جگرؔ تو خدا جانے کیا بک رہا ہے — کوئی بات اپنی سمجھ میں نہ آئی

حکیم جگر صدیقی از بسواں

سکونِ خاطر۔ دلچسپی۔ لذت

انسانی زندگی کے روزانہ حالات پر خیال کرتے ہوئے تین باتیں ذہن میں آتی ہیں :—

(۱) پہلی بات تو یہ کہ ہر انسان خوش زندگی بسر کرنے کے لیے سکونِ اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ زندگی کو پُر لطف بنانے کے لیے انسان دلچسپ مشغلہ تلاش کرتا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ جس کام میں جس بات میں جس مشغلہ میں اُسکو لذت آتی ہے اُسکو قائم رکھنے کی دل سے کوشش کرتا ہے۔

یہ تینوں امور فطری ہیں یعنی انسان کی خلقت میں داخل ہیں۔ ان تینوں خواہشوں سے کوئی انسان خالی نہیں ہے۔ کوئی شخص اسکو پسند نہیں کرتا کہ اُسکی حالت بے چینی اور بے اطمینانی کی ہو اور اُن اسباب کے دفعیہ کی کوشش بالطبع نہ کرتا ہو۔ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اُسکی زندگی بے مزہ اور خاموشی کی ہو۔ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ جس چیز سے اُسکو لذت حاصل ہوتی ہے وہ اُس سے علیحدہ ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان تینوں خواہشوں میں انسان قابلِ الزام نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خواہشیں انسان کی خلقتاً درجبلت میں داخل ہیں۔ البتہ دانا اور نادان میں فرق اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ سکون واطمینان کی خواہش میں وہ کیا طرز اختیار کرتے ہیں۔ جس کا عمل ایسا ہو کہ اُس سے اصلی سکون واطمینان حاصل ہو سکے تو اُس آدمی کو دانا کہیں گے اور اگر حصولِ اطمینان کے لیے وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اصلی سکون واطمینان کا باعث نہیں ہے بلکہ بظاہر وہ کسی بے چینی یا بے اطمینانی کے سکون کا تو ضرور سبب ہے مگر انجام میں اور فی الحقیقت وہ فعل اور بہت سی بے چینیوں اور بے اطمینانیوں کا باعث ہے تو یہ اُسکی نادانی ہے۔ ایسی حالت میں دانشمند آدمی کا کام یہ ہے کہ اس بات سے فوراً آگاہ ہو جائے کہ ہم جس عمل کو ذریعہ سکون واطمینان خیال کر رہے ہیں وہ واقعی ذریعۂ اطمینان وسکون نہیں ہے بلکہ بہت سی بے چینیوں

کا باعث ہے اور اُس سے فوراً اجتناب کرے اور جو عمل باعث سکون و اطمینانِ قلب ہو اُسکو اختیار کرے اور پھر جس عمل کا انجام باعث اطمینانِ قلب در فراغتِ دل و دماغ ہو اُسپر استقامت و مداومت کرے اور جس فعل میں وہ عارضی اور نمایشی سکون و اطمینان یا کسی بیجا اور ناروا خواہش کو پورا ہوتا ہوا پائے تو اُسکے چھوڑنے میں اگرچہ اُسکو تکلیف ہی ہو مگر اُسکی پروا نکرنا چاہیے۔ اس واسطے کہ بیجا اور ناروا اور ناواجب بات کے ترک کرنے میں قدرتی، اور دائمی راحت و مسرت ہے۔ جو تکلیف بیجا بات کے چھوڑنے میں ہوتی ہے وہ عارضی اور چندروزہ ہوگی دیرپا نہیں ہوسکتی۔ کسی شاعر نے یہ سارا فلسفہ ایک شعر میں لکھ دیا ہے جسکا اعادہ غالباً اس موقع پر موزون و مناسب ہوگا۔

جسکا آغاز ہوا چھا وہ خوشی ہے بدتر ۔ جسکا انجام ہوا چھا وہ مصیبت اچھی

دوسری بات دلچسپی ہے۔ دلچسپی کا مدار دل کے تعلق پر ہے۔ جس بات سے، جس مشغلہ سے، جس کام سے آدمی کو دلی تعلق ہوگا اُسی کے ساتھ آدمی کو دلچسپی ہوتی ہے۔ کم سے کم وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہی چیز میری دلچسپی کی ہے۔ اور اُسی میں ایک طرح کا انہاک اُسکو ہوجاتا ہے۔ حالانکہ دلچسپی نتیجہ دلی تعلق کا ہے۔ اگر بجاے اُس چیز کے کسی اور چیز سے دلی تعلق ہوتا تو اُسی چیز سے دلچسپی ہوتی۔ اب اس موقع پر دانائی اور نادانی کا فرق یوں ظاہر ہوسکتا ہے کہ جس چیز سے آدمی کو دلچسپی ہوتی ہے اُسکے نتائج پر لحاظ کرے۔ اگر نتائج اُس مشغلہ کے اچھے ہیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اچھا مشغلہ ہے، اور اُس مشغلہ کو قائم رکھنا چاہیے۔ اور جو نتائج اُسکے بد ہیں تو فوراً اُس سے دل کے تعلق کو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور کم کرتے کرتے اُس تعلق سے دل کو آزاد کرلینا چاہیے۔ اور ایسے امور سے دل کو متعلق کرنا چاہیے جنکے نتائج اچھے ہوں۔ اور یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم کو اس مشغلہ کے سوائے کسی دوسرے مشغلہ سے دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک فاش غلطی ہے۔ اس واسطے کہ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کو رقص و سرود سے دلچسپی ہے تو اُسکے ساتھ ہی کسی کو قرآن و حدیث اور عمدہ کتب اخلاقی اور فلسفہ کے مضامین میں اُس سے زیادہ انہاک ہے، جیساکہ کسی کو رقص و سرود میں، اور کسی کو دیکھتے ہیں کہ اُسکو روپیہ کمانے اور جمع کرنے میں ایسا شغف ہے

کہ قرآن وحدیث سے دلچسپی رکھنے والے کو قرآن وحدیث کے ساتھ ہے اور نہ رقص وسرود میں انہماک رکھنے والے کو رقص وسرود کے ساتھ - پھر انہماک وشغف کا یہ عالم بھی نظر آتا ہے کہ جس مشغلہ سے کسی کو دلچسپی ہوگئی اُسکے مقابلہ میں دنیا کے تمام مشاغل اُسکے نزدیک ہیچ اور نا قابل توجہ ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی خاص مشغلہ میں کوئی دلچسپی ذاتی طور پر نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے دلی تعلق پر اُسکی دلچسپی کا مدار ہے - جب حالت یہ ہے تو دانا آدمی کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ دل کے تعلق پیدا کرنے میں غور وفکر سے کام لے - اور عمدہ مشغلوں سے دلچسپی پیدا کرے - اور اگر بُرے مشغلوں سے کسی غفلت اور نادانی کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہو تو اُنکو جلد سے جلد ترک کردے - یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی شخص کو بُرے مشاغل سے دلچسپی رہی ہے مگر جب وہ اُنکے نتائج بد سے مطلع ہوگیا تو اُس نے اچھے اور نیک مشاغل سے دل کو متعلق کر لیا اور انھیں میں اُسکو ایسی دلچسپی اور ایسا انہماک ہوگیا کہ بُرے مشاغل کو کبھی خیال میں بھی نہیں لاتا اور اگر کبھی اُنکا خیال بھی آتا ہے تو نفرت کے ساتھ - اور اس خیال سے کہ بُرے مشاغل سے کبھی اُسکو تعلق رہا ہے، وہ دل ہی دل میں اپنے اوپر سخت ملامت اور نفریں کرتا رہتا ہے اور اپنی گذشتہ نادانیوں پر اُسکو حیرت اور حسرت ہوتی ہے۔ مسئلۂ دلچسپی پر اس حیثیت سے بھی نظر کرنا چاہیے کہ وہی بات جو ایک شخص کے لیے باعثِ دلچسپی ہوتی ہے، دوسرے شخص کے لیے باعث وحشت ونفرت ہوجاتی ہے - اس سے بھی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کوئی خاص مشغلہ فطری طور پر انسان کیلیے باعثِ دلچسپی نہیں ہے بلکہ مختلف اشخاص کے مختلف دلی تعلقات پر دلچسپی کا انحصار ہے - اور جب کوئی مشغلہ بالطبع فطرۃً انسان کے لیے باعثِ دلچسپی نہیں ہے تو یہ امر تا متر انسان کے اختیار میں ہے کہ اچھے مشاغل سے دلچسپی پیدا کرے اور بُرے مشاغل سے اجتناب واحتراز کرے -

تیسری بات لذت ہے - جس طرح دلچسپی نتیجہ دلی تعلق کا ہے اُسی طرح لذت نتیجہ دلچسپی کا ہے - اور یہی لذت ہے جو آدمی کو مبتلا کرکے، باوجودیکہ انسان میں نیک وبد کی تمیز فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ اُسکو امور کردنی سے باز رکھتی اور ناکردنی افعال کا مرتکب بناتی ہے۔

مگر تھوڑے سے غور کرنے کے بعد انسان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس لذت کی بھی بنیاد نہایت کمزور ہے۔ جیسا کہ دلچسپی کے بیان میں ابھی لکھا گیا ہے۔ کوئی شغل فطری طور پر انسان کے لیے باعث دلچسپی نہیں ہے اور جب لذت نتیجہ ہے دلچسپی کا، تو کوئی لذت بھی فطری نہیں ہو سکتی۔ لیکن بعض بعض انسانی لذتیں ایسی بھی ہیں جنکو فطری خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مرد و عورت کے باہمی تعلقات میں ایک خاص لذت مضمر سمجھی جاتی ہے حالانکہ یہ بھی تمام تر دلچسپی اور میلانِ خاطر پر منحصر ہے۔ اگر مرد کو کسی خاص عورت کے ساتھ اور عورت کو کسی خاص مرد کے ساتھ دلچسپی اور میلانِ خاطر نہ ہو تو ایک کو دوسرے سے لذت حاصل ہونا درکنار وہ باہم گر ملتفت ہونا بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ لذت کا مدار تمام تر دلچسپی پر ہے۔ جسکو جس چیز کے ساتھ دلچسپی ہے اُسکو اُسی میں لذت آتی ہے۔ اور اگر دلچسپی نہ ہو تو چاہے وہ کیسی ہی لذت والی چیز ہو مگر انسان اُسکے قریب بھی نہ جائیگا لذت حاصل ہونا تو ایک دُور کی بات ہے۔

ان واقعات پر نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ لذت جو انسان کو اپنے میں مبتلا کرکے بسا اوقات خراب حال کرتی ہے فی الاصل ایک بے حقیقت چیز ہے اور اسکو اُس شغل، چیز یا شخص سے جسمیں وہ پائی جاتی ہے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ اُس کا دار و مدار خود ہماری دلچسپی پر ہے اور دلچسپی کو تعلق دل کے متعلق ہونے سے ہے۔ اور دلی تعلقات نتیجہ ہماری دانائی اور نادانی کے ہیں۔ پس تمام تر ہم کو اپنی حالت کو سُدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم ہی میں خیالات نیک و بد ہیں ہم ہی میں دلی تعلق ہے ہم ہی میں دلچسپی ہے ہم ہی میں لذت ہے۔ کسی دوسری چیز یا شغلہ یا شخص میں نہیں۔ مثلاً شیرینی ایک خوشگوار چیز ہے۔ مگر جب ہم بخار میں ہوتے ہیں تو شیرینی کا مزہ ناگوار اور بُرا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے وہ کھانے جنکو حالتِ صحت میں ہم شوق سے مزے لے لے کر کھاتے ہیں بُخار کی حالت میں تلخ اور بدمزہ معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ شیرینی اور دوسرے کھانوں کے ذائقوں میں کوئی تغیر نہیں ہوتا بلکہ یہ محض ہماری حالت کے بدلنے کا اقتضا ہے کہ شیرینی اور کھانوں کا مزا ہم کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔

ماحصل اس تحریر کا یہ ہے کہ ہم کو اپنے خیالات کے اچھے بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور کبھی اس طرف سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ جب خیالات اچھے ہوں گے تو اچھے مشاغل سے دل کو میلان اور تعلق پیدا ہوگا اور دلچسپی پیدا ہوگی اور انہیں اچھے مشاغل میں ہم کو لذت آئے گی اور بُرے مشاغل سے ہم اجتناب و احتراز کرتے رہیں گے۔ اور اُن کی طرف نہ تو ہمارا میلانِ خاطر ہوگا نہ ہمیں اُن سے دلچسپی اور لذت حاصل ہوگی اور اس صورت میں اصلی سکونِ خاطر و اطمینانِ قلب و فراغِ دماغ کے ساتھ ہم چین اور سُکھ کی زندگی بسر کریں گے اور یہ طرزِ زندگی ہمارے دین و دُنیا کی فلاح کا باعث ہوگی۔

محمد امین اللہ

سرِ بزم دل جلانے کو مرے یہ گھات ہوتی — کبھی اس سے بات ہوتی کبھی اُس سے بات ہوتی
میں عدم میں تھا بلا سے جو مجھے نہ تم بلاتے — دلِ نا امید کو کیوں خلشِ نجات ہوتی
جو ذرا بھی جانتا میں رہ و رسمِ آشنائی — تری اور شان ہوتی مری اور بات ہوتی
شبِ وصل یار آتا میں اُسے گلے لگاتا — اسی دُھن میں دن گزرتا اسی غم میں رات ہوتی
پئے فاتحہ لحد پر جو کبھی حضور آتے — مری یوں خراب مٹی نہ پسِ ممات ہوتی
دلِ مبتلا کے ہاتھوں مری جان ہے غضب میں — شبِ ہجر موت آتی جو مری حیات ہوتی
مجھے اک جھلک دکھاتے مری آرزو نکلتی — وہی بات کل جو ہوگی وہی آج بات ہوتی
تو الجھ کے مجھ سے ناصح جو رُکا یہ خیر گزری — کہیں اور بات بڑھتی تو کچھ اور بات ہوتی
جو صفات سے گزر کر کبھی بحثِ ذات کرتے — مری ہر صفت سے ثابت تری ایک ذات ہوتی
وہ بگڑ کے کہہ رہے ہیں شبِ وصل کس ادا سے — جو کسی کو موت آتی تو مری نجات ہوتی

جو بزل کے نام احقر انھیں داستاں سُناتے
تو وہ اس مزے سے سُنتے کہ تمام رات ہوتی

احقر بہاری

نظرے خوش گزرے

ناظرین کرام - مارچ کا الناظر حاضر ہوتا ہے مگر بتاخیر - جس کا اعلان فروری نمبر میں کردیا گیا تھا۔ انشاءاللہ اپریل کا پرچہ یکم اپریل کو شایع ہوجائے گا اور آیندہ خدا نے چاہا تو وقت کی پابندی کا جو انتظام ابتدا سے رہا ہے اُسکا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے گا - السعی منی والاتمام من اللہ -

اسی پرچہ میں حسب وعدہ انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ بابت ۱۹۱۵ء جو لائق سکرٹری نے گذشتہ اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا میں پڑھی تھی شایع کی جاتی ہے - جس سے ناظرین کو اس بات کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے کہ دولت آصفیہ کی تعلیمی خدمات انجام دینے اور بوجہ مہتمم مدارس (انسپکٹر اسکول) ہونے کے تقریباً سال کے آٹھ نو مہینے دورہ پر خیموں میں زندگی بسر کرنے کے باوجود ہمارے مکرم دوست مولوی عبدالحق صاحب اپنی زبان قوم اور ملک کی کیسی عظیم الشان خدمات کر رہے ہیں - رپورٹ پر ہمیں کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی البتہ ایک بات ہے جس پر متاسف ہونے اور جسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کیے بغیر نہیں رہ سکتے - اور وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے سپرد جو عظیم الشان کام کیا گیا ہے اُسکی اہمیت، ضرورت و عظمت سے قوم کے اصحاب علم و دانش اور ارباب اثر و دولت عام طور پر اور منتظمین کانفرنس خاص طور پر حد درجہ بے التفاتی کر رہے ہیں - تعلیم یافتہ - با اثر اور مالدار اصحاب کی بے توجہی کا تو یہ عالم ہے کہ باستثناے معدودے چند علم دوست اصحاب کے جو اپنے ذوق علمی کی وجہ سے انجمن کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور اپنے قلم اور نیک مشوروں سے کسی قدر اعانت فرماتے رہتے ہیں بقیہ حضرات (جنھیں اُن عالی منزلت اور ذی وجاہت رہبران ملک و ملت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے جو قوم کے مسلمہ لیڈر کہے جاتے - جو جلسوں اور کمیٹیوں کے صدر نشیں بنائے جاتے - جو گورنمنٹ کے درباروں میں قوم کے وکیل بنکر ڈیپوٹیشن لے جاتے - جو شہرت و ناموری کے پھریرے اُڑاتے ہوے اسپشل ٹرینوں پر لٹے لٹے پھرتے - جو کونسل کی ممبری کی خاطر قوم کے عام افراد کو اپنا مساوی الدرجہ ظاہر کرتے اور موقع موقع سے

چندوں کی صورت میں بارشِ زر کرتے رہتے۔ اور جو دردِ اسلامی اور محبتِ قومی سے سرتاپا لبریز نظر آتے ہیں اُسکے عدم وجود سے بےپرواہ اور اُسکی حمایت و امداد سے مستغنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسوقت تک اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و حشمتہٗ اور اُنکے اعیانِ دولت اور رعایاے مملکت کے علاوہ سوائے علیا حضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا اور اُنکے صاحبزادہ والا تبار پرنس حمید اللہ خاں بہادر بی۔ اے کے کسی نے انجمن کی دستگیری اور اعانت نہیں کی۔ اور ابتک جو کچھ کام ہوا یا ہو رہا ہے محض حیدرآباد کی سالانہ گرانٹ۔ اربابِ دکن کے چندوں اور سرکار بھوپال کے فیاضانہ عطیہ کی بدولت ہے۔ مگر کیا قدر بڑا اور جس قدر اہم یہ کام ہے اُسکے لحاظ سے یہ گرانٹ یا چندے اور عطیے کافی کہے جا سکتے ہیں؟

دنیا کے تمام اربابِ فکر و ہوش اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ جس قوم کی تعلیم کا اصلی اور بڑا ذریعہ اُسکی مادری زبان نہ ہو وہ ہمیشہ دوسری اقوام کے مقابل خسارہ میں رہیگی۔ پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جسکے ثبوت میں متعدد تاریخی شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ جس قوم نے اپنی مادری زبان سے غفلت برتی اُس نے رفتہ رفتہ اپنے قومی تمدن کو برباد کر دیا۔ ان مسلمات کو پیش نظر رکھ کر ذرا اپنی زبان کی موجودہ حالتِ بے مائگی پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اعلےٰ علمی ضروریات تو درکنار ہم اگر چاہیں تو معمولی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے بھی ہمارا سرمایۂ کتب ناکافی ہے۔ ان کتابوں کی تیاری اور قوم کی اعلیٰ دماغی تربیت و تعلیم کے لیے قدیم و جدید ذخائرِ علوم و فنون کے ترجمہ و اشاعت کے لیے کثیر التعداد اربابِ علم کی خدمات اور لاکھوں روپے کے صرف کی حاجت ہے جس کا مہیا کرنا بشرطیکہ اسکی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کیا جائے تمام اُن اصحاب کے ذمہ واجب ہے جو قوم کے دردمند نیز زمانہ کی ضرورتوں سے واقفیت تامہ رکھنے کا دعوے کرتے اور ملک و قوم کی اصلاح و رہبری کا ادعا رکھتے ہیں اور جنھیں خدائے جل و علا نے علم و عقل یا مال و زر کی دولت عطا فرمائی ہے۔

مگر حالات کیا ہیں؟ سارے ملک میں صرف ۷۲ اصحاب ایسے ہیں جو اس اہم ترین مقصد قومی و ملکی کے لیے بارہ [۱۲] روپیہ سالانہ دیتے ہیں اور ان میں سے بھی دو ثلث سے زائد خاص مملکت آصفیہ کے بسنے والے ہیں جنھوں نے مولوی عبدالحق صاحب کی ذاتی خصوصیات و خدمات کی بنا پر اس قدر ایثار

گوارا فرمایا۔ اب بقیہ ایک ثلث کے قریب ارکان کی صوبہ وار تقسیم ملاحظہ ہو: صوبۂ متحدہ (۶)۔ اودھ (۴)۔ پنجاب (۳)۔ صوبۂ متوسط (۱)۔ برار (۱)۔ مدراس (۱) بہار (۱)۔ سندھ (۱)۔ اجمیر (۱) بھوپال (۲) گوالیار (۱)۔ جملہ ۲۱۔ یہ اعداد کیا بتاتے ہیں؟ وہ تعلیم یافتہ اور دانشمند اصحاب جنکی مادری زبان اُردو ہے یا جسے قومی زبان کہتے اور سمجھتے ہیں غور فرما کر اپنے اپنے نتائج خود اخذ کریں۔ ہمیں اسوقت ایک واقعہ یاد آیا جسکو کسی کی دلشکنی کی خاطر نہیں بلکہ اپنی قوم کے احساس ضرورت کا اندازہ بتانے کے لیے یہاں درج کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔

دو سال ہوئے جبکہ ہمارے دوست مولوی عبدالحق صاحب کو سکریٹری ہوئے صرف ایک سال گذرا تھا اور اوپر جن فیاضانہ ارادوں کا ذکر کیا گیا ان میں سے کوئی حاصل نہیں ہوئی تھی اور انجمن کے کاموں کی داغ بیل ڈالنے کے لیے ابتدائی سرمایہ کی فراہمی کی بڑی فکر تھی ہم اُنھیں ایک صاحب کی خدمت میں لے گئے جو اُسوقت بھی بڑے آدمی تھے اور اب تو بہت ہی بڑے آدمی ہیں صاحب موصوف بڑی بھاری جائداد رکھتے تھے۔ عالی خطابات اور قومی منزلتوں پر فائز ہو چکے تھے۔ لیڈروں کی فہرست میں درجۂ اختصاص پا گئے تھے اور قوم کی خدمت و محبت کے لیے شہرت عام حاصل کر چکے تھے۔ ملک کی بڑی بڑی درسگاہیں اور مجالس اُنکی فیاضیوں کی شرمندۂ احسان تھیں اور اُنکے بذل و کرم کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام تھیں۔ ہمیں اور مولوی عبدالحق صاحب کو بعض اسباب کی بنا پر اُنکی ذات با صفات کے ساتھ بہت کچھ ارادت و عقیدت تھی اور اسی وجہ سے جب ہم نے اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا تو ہمارے دلوں میں گوناگوں توقعات کی لہریں موجزن تھیں۔ چنانچہ ہم لوگ اپنے رہبرِ قومی کے دربار میں حاضر ہوئے اور اُنکے نرم مخملی گدے کے پائیں نہایت ادب و احترام کے ساتھ جا بیٹھے اور جیسا کہ گداگرانِ قومی یا عام بھکاریوں کا قاعدہ ہے، معبودِ زریں کی ثنا و صفت میں قصیدہ خوانی کرنے کے بعد انجمن کی سابقہ حالت، موجودہ انتظام، اپنا پروگرام، آگرہ کانفرنس کا رزولیوشن، سرمایہ جمع کرنے کی حاجت وغیرہ یکے بعد دیگرے عرض کی۔ اور اُسکے بعد اپنی غایتِ حاضری اُسی سائلانہ لہجہ و انداز سے بیان کر کے دستِ سوال دراز کیا اور جوابِ با صواب کے امیدوار بنکر، سر بسجود ہو کر اگر نہیں تو سر جھکا کر سہی، بیٹھ گئے۔

اب ہمارے معبودِ باطل کے لب ہائے شیریں مقال کو جنبش ہوئی اور اُردو زبان کی اہمیت، اُسکی ترقی اور وسعت کی کوششوں کی ضرورت، مقاصدِ انجمن سے دلی ہمدردی اور اُسکی امداد میں غیر معمولی ہمت و فیاضی

کا تہیہ وارادہ رکھنے کے متعلق نہایت دردمندی وخلوص کے پیرایہ میں تقریباً پندرہ منٹ تک اظہار خیال فرمانے کے بعد اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا کہ چونکہ اس وقت ایک خاص مسئلہ آپکی تمام تر توجہ کو اپنی طرف منہمک کیے ہوئے اور وہ بہت جلد ہی طے پا جانے والا ہے اس لیے چند ماہ تک وہ کسی قسم کی امداد واعانت۔ توجہ والتفات سے معذور ہیں۔ اُسکے بعد ہزار دوہزار نہیں بلکہ بیس ہزار تک شاید دیدیں۔ چنانچہ اسی قسم کے مواعید کے ساتھ ہیں ناکامیاب مگر پر از امید رخصت کیا گیا۔

وہ مسئلہ خاص جس میں انہماک رکھنے کے باعث صاحب موصوف کسی دوسری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے تھے آج تک حل نہیں ہوا اور اس دو سال سے زائد کی مدت میں یہی نہیں کہ ہمارے رہبر قومی نے متعدد جدید مجالس اور انجمنوں کے قیام میں کافی سے زیادہ دلچسپی لی اور بعض ایسے ارادوں کے اعلان میں دریغ نہیں کیا جن کی تکمیل معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے مرکوز خاطر نہ تھی اور صرف بربنائے مصالح وتغیرات حالات محض اظہار تہیہ ضروری تھا بلکہ زرفشانی کا دروازہ بھی تنہیں ا۔البتہ یہ دوسری بات ہے کہ ان فیاضیوں کی تہ میں کہیں دوٹوں کا جال بچھا ہوا تھا اور کہیں صدارت کا اعزاز حاصل ہونے کی مسرت پنہاں تھی۔

خیر یہ تو ایک واقعہ تھا اُن سیکڑوں واقعات میں سے جو روزانہ پیش آتے رہتے ہیں اور جن کے مشاہدہ سے خواہ دل کتنا ہی کڑھے مگر یہ حقیقت روزبروز ذہن نشیں ہوتی جاتی ہے کہ اسلام کا سچا درد اور قوم کی حقیقی فلاح وبہبود ہم میں مفقود ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض دوسروں کی تقلید اور بیشتر ذاتی اغراض کی بنا پر ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

گر سب سے زیادہ افسوسناک بلکہ شرمناک اُن لوگوں کی بے اعتنائی ہے۔ جن کی ذات نہ صرف انجمن ترقی اُردو کی بلکہ قوم کی ہر قسم کی تعلیمی و علمی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ منتظمین آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس خواہ اسے محسوس نہ کرتے ہوں مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قوم کا ایک بڑا طبقہ اُن سے بہت کچھ آس لگائے ہوئے ہے اور اگرچہ بعض افراد قوم کانفرنس کے طریق کار اور منتظمین کے طرز عمل پر بدنیتی سے بھی اور خیراندیشی سے بھی نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں لیکن اونچی دوکان دیکھکر سب کے سب یہیں چلے کہ ان کی تلاش میں اُسکے دسترخوان پر جمع ہوتے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو اسی کانفرنس میں قائم ہوئی تھی اور ابتدا سے لیکر آج تک اُس کا دامن

اُس کے ساتھ وابستہ رہا اور ہے۔ مگر کس قدر بہت تکلیف اور مایوس کن اس رپورٹ کے یہ الفاظ ہیں کہ

" کانفرنس نے حسب قرارداد اپنی مقررہ رقم (پانسو روپیہ سالانہ) دو سال سے ادا نہیں کی "

مقام حیرت ہے کہ وہ کانفرنس جس کا انجمن ترقی اُردو ایک شعبہ ہے - جو ہزاروں روپیہ سال کے آمد و صَرف پر قدرت رکھتی ہے - جسکے سفیر ہر سال ملک کے گوشہ گوشہ میں جاکر روپیہ بٹورتے ہیں - جسکو اپنے دفتر کی عمارت بنانے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے مل سکتے ہیں - جو ہر سال اپنے دسمبر کے اجتماع کی غرض سے مقامی استقبالی کمیٹیوں کے ہزارہا روپے صرف کرا دیتی ہے - جس نے ابتدائے قیام میں بھی اور بعد کو جب جدید سکرٹری کو اس اہم ذمہ داری کے کام کے لیے اپنے گوشۂ عزلت سے نکال کر مرد میدان بنایا تو انجمن کو پانچسو کی قلیل سالانہ امداد دینے کا وعدہ کیا تھا - اس طرح کی عہد شکنی اور بے التفاتی روا رکھتی ہے - اور پھر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جنکی ثنا و صفت کے یہ اوراق بارہا منت کش ہوے اور جنکی قدر و منزلت کے اظہار میں ہم کو ہمیشہ اصرار رہا ہے اس بات کی اُلٹی شکایت کرتے ہیں کہ لوگ کانفرنس کو بدنام کرتے ہیں - ہمیں صاحبزادہ صاحب کے ساتھ ابتدا سے دلی عقیدت رہی ہے اور اُنکی لغزشوں سے قطع نظر کرکے آج بھی ہم بلا خوف تردید و لومۃ لائم یہ کہنے کو طیار ہیں کہ باوجودیکہ ہمیں اُنکی بہت سی رایوں سے اختلاف ہے اور اُنکی بعض کارروائیوں سے دلی کلفت ہوتی ہے لیکن تمام علی گڑھ پارٹی میں اُن سے بہتر اور لائق احترام کوئی شخص نہیں نظر آتا - مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُنکے کارناموں پر کسی قسم کی تنقید نہ کیجائے . یا اُن کے ہر فعل کو محض بربناے ارادت سراہا جائے - بحیثیت کانفرنس کے سکرٹری ہونے کے جہاں اُنکی خدماتِ جلیلہ ہمارے اور ساری قوم کے اعتراف کی مستحق اور تحسین و آفریں کی سزاوار ہیں وہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے بعض شعبہ جات کے ساتھ کانفرنس اور اُسکے سکرٹری نے جو تغافل برتا وہ حد درجہ قابل ملامت و افسوس ہے اور اگر یہ اور اسی قبیل کے دوسرے بعض نقائص ہمارے محترم لیڈر کے طرز عمل میں نہ نمودار ہوتے تو بے شبہہ اُنکی ذات پر اب سے بہت زیادہ لوگوں کو اعتماد ہوتا اور اس اعتماد کی وجہ سے کانفرنس کے کاموں میں سہولت اور اسکی ہر دلعزیزی میں روز افزوں ترقی ہوتی -

تقریباً چار سال گزرے جب ہمارے محترم کرم فرما خواجہ غلام الثقلین مرحوم زیارتِ مقاماتِ مقدسہ و سیاحت ممالک اسلامیہ سے واپس آئے اور ہم نے الناظر میں ایک نوٹ کے ذریعے سے اور نیز ایک پرائیوٹ خط لکھ کر مرحوم کو صیغۂ اصلاحِ تمدن

کا کام دوبارہ اپنے ہاتھ میں لینے اور قوم کی یہ نہایت ضروری خدمت انجام دینے کی تحریک کی تو اُس مخلص قوم نے ایک طویل خط میں وہ تمام عذرات وموانع ہمیں لکھے جو اس کام کو پھر شروع کرنے میں مزاحم تھے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی طرح خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے ساتھ بھی ہمیں ہمیشہ دلی عقیدت رہی اور بے شبہ اُنکی ذات سے بہت کچھ توقعات خدمتِ قومی کی وابستہ تھیں اور یہ محض اُنھیں توقعات کی بنا پر تھا کہ اُنکی بعض بے اعتدالیوں اور لغزشوں کے باوجود ہماری دلی خواہش یہ تھی کہ سوشل ریفارم (اصلاح تمدن) کے اہم ترین شعبہ کو جسکی خدمت کے لیے وہ حددرجہ موزوں تھے از سرِ نو زندہ کیا جائے۔ لیکن اُنکے عذرات سُن کر ہمیں خاموشی اختیار کرنا پڑی اور بعد کو دسمبر ۱۲-۶ء میں جب لکھنؤ میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو الناظر کے وسیلہ سے اور نیز زبانی ہم نے سکرٹری کانفرنس سے یہ عرض کیا کہ اس شعبہ کی ہستی کو مٹ جانے دینے کے بجائے مناسب ہوگا کہ ملک کے کسی دوسرے بزرگ کو خواہ وہ علیگڑھ سے تعلق نہ بھی رکھتے ہوں اسکی خدمت پر آمادہ کیا جائے اور جیسا اُسوقت لکھا اور عرض کیا گیا تھا آج بھی ہمیں یقین ہے کہ اگر کانفرنس کی طرف سے پوری تلاش وجستجو کی جائے اور شعبۂ اصلاحِ تمدن کو واقعتاً زندہ وقائم رکھنے اور اُس سے کام لینے کی کوشش ہو تو باوجود قوم میں قحط الرجال ہونے کے کوئی نہ کوئی بندۂ خدا اسلام اور مسلمانوں کا دردمند ایسا ضرور نکل آئے گا جو اس نہایت ضروری شعبہ کا کام کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر افسوس ہے کہ آج تک کچھ نہ ہوا۔ اور کانفرنس کا یہ خلف الرشید (شعبۂ اصلاحِ تمدن) خود منتظمین کی بے التفاتی کا شکار ہو گیا۔

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے جس خط کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اُسکے مندرجۂ ذیل اقتباس کو منتظمین کانفرنس ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ اُنکے طرزِ عمل نے ایک مخلص۔ پُرجوش اور غیر معمولی قابلیتوں کے خادمِ قوم کو کس طرح بددل بنا دیا۔ اور اُس عظیم الشان تحریک کو جسپر درحقیقت تمام تر فلاح وبہبودِ قوم کا انحصار ہے اور جسکے ابتدائی حالات بنہایت اُمید افزا تھے، خاک میں ملا دیا۔ وہوہٰذا۔

"...... جو نوٹ رسالہ الناظر میں آپنے لکھا ہے اُسکے متعلق اگر میں تفصیل کروں تو بہت ناپسندیدہ باتوں کا انکشاف کرنا ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر میں اصلاحِ تمدن کے صیغہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہوں تو لے سکتا ہوں اور کارکنانِ کانفرنس بہت مستعدی سے یہ کام میرے حوالہ کر دیں گے۔

مگر اسمیں چند دقتیں ہیں۔ اول تو جہاں تک ہو سکے گا وہ مالی مدد سے پہلو تہی کرینگے۔ دوسرے انکی قلیل مالی امداد میں ایک شرط مضمر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنے معاملات میں جو غلط یا صحیح اصول اور طرز عمل قرار دے چکے ہیں اُس میں کسی طرح کا اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

اب تک میرا تجربہ یہ رہا ہے کہ جو شخص ان حضرات سے دب کر نہ چلے اور سچائی کے ساتھ قومی معاملات میں رائے دے تو وہ ایسے شخص کو ایک ناپسندیدہ رقیب سمجھتے ہیں اور اپنے جتھے کی مدد سے اُسکو گوناگوں پریشانیوں میں ڈالتے ہیں۔ اگر یہ شخص اپنے وقت کا بڑا حصہ جتھا یا پارٹی بنانے میں صرف کرے تو اُن سے مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہوگی کہ وقت اور قوت ایک مدت تک بے کار باتوں میں ضایع جائے گی۔ کام کرنے کا موقع کم رہے گا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد میں نے چند سال پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ داغ مرحوم کا یہ شعر پڑھ کر مجھکو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے علحدہ رہنا چاہیے۔

نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ　　　بس اب خانہ آباد دولت زیادہ"....

یہ رائے مرحوم کی ہرچند کہ جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور اُنکے شرکار کار کو بہت تلخ معلوم ہوگی لیکن انصاف پسند اور کسی جتھے یا پارٹی سے تعلق نہ رکھنے والے اصحاب یقیناً اُسکو مبنی بہ حقیقت پائیں گے اور اپنی سب سے بڑی مجلسِ قومی کے کارکنوں کی اس حالت پر رنج و افسوس کیے بغیر نہ رہیں گے۔

قومی کام جو لوگ کرتے ہیں وہ جہاں ہمارے مخدوم اور واجب التکریم بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں مغربی طرز پر نہیں بلکہ ٹھیٹ اسلامی تعلیمات و روایات کی بنا پر اس بات کا بھی پورا حق حاصل ہے کہ اگر اُنکی روش صراطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی نظر آئے یا اُنکے طریقِ کار میں خرابیاں نمودار ہوں تو ہم آزادی کے ساتھ اُنکی غلطیوں سے اُنھیں متنبہ کرتے اور اصلاحِ حال پر توجہ دلاتے رہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ کانفرنس کے ارکانِ حل و عقد عموماً اور جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب خصوصاً ان واقعات و حالات پر غور فرمائیں گے اور اپنے طرزِ عمل میں ایسی مناسب تبدیلی کرینگے کہ اس قسم کی شکایتوں کا دروازہ بالکل مسدود ہو جائے۔

اُردو زبان کا سب سے بڑا مرکز صوبہ متحدہ آگرہ واودھ سمجھا جاتا ہے اور یہاں کے شعرا و دیگر اہل قلم دلی والوں کو چھوڑ کر سارے ہندوستان کے لوگوں کی تحریروں کا مضحکہ اُڑانے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ عجب کس درجہ مقام حسرت و شرم ہے کہ یہاں کے اصحاب بھی انجمن ترقی اُردو کو معقول مالی امداد نہیں دے سکتے۔ ہمنے الناظر کے ذریعہ سے متعدد دفعہ خاص اودھ اور لکھنؤ کے اصحاب کو اس طرف توجہ دلائی ہے مگر دیکھتے ہیں تو یہاں بھی کسی کو اسکی طرف التفات نہیں۔ البتہ خدا بھلا کرے مسٹر عبدالماجد کا جن کی تحریک و کوشش سے یہاں انجمن کی ایک شاخ قائم ہوئی ہے۔ اور اگر تغافل نہ برتا گیا تو شاید اسکی وساطت سے اُردو زبان کی کوئی خدمت ہمارے اہل صوبہ کر سکیں۔

ہمیں اس دفعہ بہت کچھ لکھنا تھا مگر گنجایش کی قلت کے باعث دوسرے مباحث پر اب زیادہ لکھنا ممکن نہیں۔ اوائل مارچ میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ بمقام اورنگ آباد منعقد ہوا تھا۔ ہمیں بھی اس قدیم تاریخی شہر کی خوشنما و آب ہوا شرکت جلسہ کے لیے کھینچ لے گئی اور چند روزہ قیام کے باوجود بفضلہ وہاں کی آب و ہوا نے اُمید کے مطابق ہماری صحت پر نہایت مفید اثر کیا۔ اگر یہاں کی ضرورتیں مجبور نہ کر دیتیں تو غالباً ہم پندرہ بیس روز وہاں رہ کر زیادہ توانائی حاصل کر سکتے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی اخبارات کے ذریعہ سے پبلک تک پہنچ گئی ہے لیکن چونکہ کانفرنس کی ابھی ابتدائی حالت ہے اور ہمارا خیال ہے کہ بزرگان دکن کو ایسی مجالس قائم کرنے اور چلانے کا کافی تجربہ نہیں ہے اس لیے اجلاس کی کارروائی پر مفصل تبصرہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو آیندہ نمبر میں انشاءاللہ ہدیۂ ناظرین ہوگا۔

ہمارے وہ بہت سے کرم فرما جنھوں نے اپنی اپنی تالیفات و مطبوعات بغرض اظہار رائے ارسال فرمائی ہیں بہت مایوس اور غالباً کبیدہ خاطر ہونگے کہ ابتک اُنکی تعمیل ارشاد میں ہم قاصر رہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عرصہ میں ہماری صحت کی خرابی نے کتب بینی کے ناقابل بنا دیا ہے۔ دماغی محنت جگر کے مریض کے واسطے یوں بھی مفید نہیں۔ اور پھر جس شخص کے سر بیسیوں دھندے ہوں اُسکے لیے تو اور بھی مضر ہے۔ اسوقت جو تھوڑا بہت وقت لکھنے پڑھنے کے کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے اُسکا بیشتر حصہ ضروری کاروباری تحریروں کی نذر ہو جاتا ہے

حالانکہ جیسا چاہیے اُسکے لیے بھی بہت ہی تھوڑا وقت ملتا ہے جس سے سخت نقصان ہو رہا ہے - الناظر کے متعلق جو تھوڑا بہت کام کیا جاتا ہے وہ معلوم نہیں کس قدر مشکل سے ہوتا ہے ۔ بس یہی غنیمت ہے کہ پرچہ کی اشاعت ہو جاتی ہے - اب کچھ طبیعت روبا صلاح ہے اور امید ہوتی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد الناظر کے لیے زیادہ وقت نکل سکے گا - اُسوقت البتہ یہ ممکن ہوگا کہ کتابوں کا سرسری مطالعہ کرکے دو دو چار چار سطریں لکھ کر یہ نہایت ضروری فریضہ ادا کیا جائے۔

---

۱۰ اراپریل سنہ ۱۶ء کو ہمارے شہر میں مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس اس غرض سے منعقد ہونے والا ہے کہ گزشتہ اکتوبر میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کی ایک جماعت نے جو سفارشی رزولیوشن بدیں مضمون فونڈیشن کمیٹی کے فیصلہ کے لیے بھیجا ہے کہ جن شرائط پر ہندو یونیورسٹی کا چارٹر ملا ہے اُنھیں اصول کو تسلیم کرکے مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کیا جائے ۔ اُسکے متعلق فونڈیشن کمیٹی اپنا آخری فیصلہ صادر کرے ۔

مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اراکتوبر سنہ ۱۵ء میں جس کا ابھی حوالہ دیا گیا ہے ہمیں بھی شرکت کا اتفاق ہوا تھا اور جس قدر کارروائی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی اُسکو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے بیشتر اراکین جنھیں یورپ یا ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا حال معلوم ہے اور جو مسئلہ تعلیم سے زیادہ دلچسپی رکھتے اور اسکے متعلق نیک مشورہ دینے کے اہل ہو سکتے ہیں اس تجویز سے بدل متفق نہ تھے کہ موجودہ شرائط پر یونیورسٹی کا چارٹر لیا جائے ۔ یہ صحیح ہے کہ اُسوقت زمانہ کی حالت پر نظر کرکے یہ اصحاب اس بحث کو چھیڑنا قرین مصلحت نہیں سمجھے اور اسی وجہ سے محض التوا کی خواہش کی ۔ مگر دلوں میں جو جذبات موجزن تھے اور اس بارہ میں جو کچھ اُنکی حقیقی رائیں تھیں اُنکا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہ تھا لیکن جو لوگ یونیورسٹی کا چارٹر لینے کی حمایت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر رہے تھے اور جن کی روش بتا رہی تھی کہ وہ اُس جلسہ میں غور و بحث کے لیے نہیں بلکہ ایک قرارداد وہ امر کو طے کرلنے کی غرض سے تشریف لائے ہیں اُنھوں نے اپنے طرز عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ جماعت اولالذکر کے نیک مشوروں سے استفادہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔

جلسہ کی کارروائی پر اخبارات میں اس شد و مد سے بحث ہو چکی ہے کہ اب کچھ لکھنا فضول ہوگا۔ البتہ یہ دیکھنا ہے کہ فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں اس کشاکش اور اختلاف کا کیا حشر ہوتا ہے۔

ہمیں ماہر تعلیم ہونے کا ادعا نہیں۔ تاہم قومی فوائد و اغراض کے لحاظ سے اس بارہ میں ہماری جو کچھ رائے ہے وہ انشاء اللہ آیندہ نمبر میں ظاہر ہو جائے گی۔

یہ امر نہایت درجہ طمانیت بخش اور مسرت انگیز ہے کہ ندوۃ العلما کو گزشتہ چند سالوں میں اسکے منتظمین کی باہمی رنجش کے باعث جو نقصان پہونچا اُسکی تلافی کے لیے جدید دور میں پوری کوشش ہو رہی ہے۔ اس سے قطع نظر کرکے کہ دار العلوم ندوۃ العلما کے اندر اس سال میں کیا ہوتا رہا ہے ندوہ کے بیرونی تعلقات پر اگر نظر کی جائے تو صورت حالات امید افزا معلوم ہوتی ہے۔ سالہا سال سے بزرگان ندوہ اسکی کوشش کرتے تھے کہ لکھنؤ سے باہر کسی شہر کے مسلمان اُنکو سالانہ اجتماع کے لیے دعوت دیں لیکن ندوہ کی ساکھ بگڑ چکی تھی اور جس مذہبی رنگ کی لوگ اُس سے توقع رکھتے تھے وہ بے گل بکر اُڑ چکا تھا۔ اس لیے ندوہ کے سالانہ جلسے اب سال بسال لکھنؤ ہی میں کرنا پڑتے تھے۔ اور اگرچہ ان جلسوں کو کامیاب بنانے کے لیے جدید تعلیم یافتہ گروہ کے ارادت کیش و مصلحت اندیش اصحاب بڑی مستعدی کے ساتھ انتظام و اہتمام میں مصروف رہتے تھے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مجلس اب ندوۃ العلما کہے جانے کی مستحق نہیں رہی تھی کیونکہ چند مستثنیات کے سوا جو وضعداری کی بنا پر یا کسی خاص سبب سے ان جلسوں کی شرکت گوارا کر لیتے تھے علما کی جماعت کثیر نے عملاً مقاطعہ اختیار کیا تھا اور کنارہ کش ہو گئی تھی۔

مگر ابکی جناب حکیم عبد الحی صاحب جدید ناظم کی کوششوں سے ندوہ کا سالانہ جلسہ ایسٹر کی تعطیلات میں بمقام پونہ منعقد ہونے والا ہے اور اُنکے ایک تازہ اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے علمائے کرام نے اس جلسہ میں تشریف لانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور خدا کرے یہ اعلان لفظ بلفظ صحیح ہو اور ہمارے ہادیان ملت پھر ایک مرکز پر مجتمع ہونا گوارا فرمائیں۔ کیونکہ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ندوۃ العلما کا یہی مقصد اولین ہے۔ اور اسی پر اسکی حقیقی کامیابی کا انحصار ہے۔

سالانہ رپورٹ

انجمن ترقی اردو

بابت سنہ ۱۹۱۵ء

جناب صدر انجمن

گزشتہ سال ہندوستان کی سرحد کے قریب جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس دسمبر کی آخری تاریخ کو ختم ہوا اور لوگ فصیح مقرروں واعظوں اور خطیبوں کے خیالات سے مستفید ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے انھیں کے ساتھ سورج دیوتا بھی دن بھر کی حکومت و کامرانی کے بعد پورب سے پچھم کو سدھارے۔ رات اس طرح چپ چپاتے آئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور بغیر شور و شغب کے ایک دنیا پر مسلط ہو گئی۔ زمین و آسمان میں سنسان کا عالم تھا، دنیا محو خواب و خود فراموشی تھی سنہ ۱۴ء باوجود شوریدہ سری اور مفسدہ پردازی کے ایسی غریب اور مظلوم صورت بنائے کھڑا تھا جیسے کچھ خبر ہی نہیں، کہ اتنے میں بارہ کی گجر بجی۔ اِدھر یہ چپ چاپ چوروں کی طرح ایک دروازے سے نکلا ہی تھا۔ کہ اُدھر دوسرے دروازے سے سنہ ۱۵ء نئے جاہ و جلال اور جلوس کے ساتھ اس خرابہ آباد دنیا میں

داخل ہوا۔ اس سمے کو ابھی کچھ دیر نہیں ہوئی تھی کہ افسوس دنیا کی اس بیرنگی اور بیوفائی کو دیکھ کر ہم میں سے ایک عزیز مسافر اس سرائے کون وفساد سے تاروں کی چھاؤں میں ٹھنڈے ٹھنڈے کوچ کر گیا۔ صبح ہوئی تو بساط دوسری تھی۔ زمانہ وہی تھا پر رُت بدلی ہوئی تھی۔

دو در دارد ایں باغ آراستہ — در و بند ازیں ہر دو برخاستہ

بیا از درِ باغ و بنگر تمام — ز دیگر درِ باغ بیروں خرام

یہ عزیز مسافر ہماری قوم کا بڑا محسن تھا۔ اس نے ایسے وقت میں جو ہمارے لیے بہت نازک تھا، ہمیں اپنے درد انگیز نغموں سے چونکا دیا۔ یہ کانفرنس اس سے بے خبر نہیں، اس کی درد بھری آواز اسکے اجلاسوں میں بارہا سنائی دی ہے اور سامعین اُسے سنکر بیتاب ہو ہو گئے ہیں۔ اسکے دردنے دلوں میں گرمی اور حرارت اور اس حرارت نے حرکت پیدا کی۔ اس نے سرسید کے مشن کو سب سے زیادہ تقویت دی اور اس کمی کو جو خود سرسید اور اُن کے رفقا میں تھی پورا کیا۔ اِس نے اُردو نظم ونثر میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس کے آثار ملک میں ہر جگہ ظاہر ہیں اور اب اچھے اچھے انشاپرداز اور ناظم اُس کے تتبع کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ وہ اخلاق کا نمونہ اور انسان کے لباس میں فرشتہ تھا۔ اس کی پاک سیرت، اعلی اخلاق، اُس کی محبت اور ہمدردی غرضکہ اُس کی کل زندگی ہمارے لیے قابل تقلید ہے۔ گو ملک نے اس کی کوئی یادگار جو اس کی شان کی شایاں ہو، قائم نہیں کی، مگر وہ اپنی یادگار خود قایم کر گیا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی وہ بغیر ارادے اور خیال کے ہمیں یاد آئیگا اور ہمیشہ یاد آئے گا۔ وہ بڑے بڑے لوگ جن کے ہم نام لیتے ہیں،

اُن کی یادگاریں کس نے قائم کیں؟ خود اُنھیں کے کاموں نے - اور یہی حیات جاودانی کا راز ہے - وہ دوسروں کی یادگاروں کے محتاج نہیں - دوسروں کی یادگاریں عارضی اور فانی ہوتی ہیں، مگر اُن کی یادگار یعنے اُن کے کام زیادہ مستقل زیادہ پائدار اور باقی رہنے والے ہیں -

مولانا حالی مرحوم کو انجمن ترقی اُردو سے ابتدا ہی سے بڑی ہمدردی تھی وہ ہمیشہ اس کی بہبودی میں ساعی رہتے اور اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرماتے رہے - انجمن کو نیز اُردو زبان کو جسکی خدمت وہ عمر بھر کرتے رہے اور جسکا رتبہ اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے بڑھا دیا، اُن کی وفات سے بڑا صدمہ پہونچا ہے - وہ زندگی میں ہمیں عزیز تھے، لیکن مرنے پر اور زیادہ عزیز ہوگئے ہیں - اب ہماری سعادتمندی اس میں ہے کہ ہم اُن کی پاک زندگی سے سبق حاصل کریں اور اُنکے نقش قدم پر چلیں -

اس پرملال فرض کے ادا کرنے کے بعد میں اصل کام کی طرف رجوع کرتا ہوں - میں نے گزشتہ سال ۱۹۱۴ع کی رپورٹ میں چند کتابوں کا ذکر کیا تھا جو انجمن تیار کر رہی تھی اور جن کے طبع و اشاعت کا انتظام اس سال کیا گیا اِن میں سے مفصلۂ ذیل کتب یا تو طبع ہو چکی ہیں یا زیر طبع ہیں -

۱ - **مقدمات الطبیعات** - مؤلفہ مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب طبع اور شایع ہوچکی ہے -

۲ - مولوی عبدالماجد صاحب بی - اے - مصنف **فلسفۂ جذبات** نے ایک اور عمدہ کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام **فلسفہ اجتماع** ہے - اسکا تعلق انسانی جذبات اور علم النفس سے ہے **فلسفۂ جذبات** میں جہاں افراد انسانی کے نفسیاتی ادراک اور

اُس کے زیر اثر جو افعال سرزد ہوتے ہیں اُن سے بحث کی گئی تھی، یہاں فلسفۂ اجتماع میں اُن کیفیات و حسیات نفس کا بیان ہے جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں فاضل مصنف نے بڑی خوبی اور امثال کے ساتھ اُن تعلقات کا ذکر کیا ہے جو لیڈروں (یعنی سردار قوم) اور عوام (یعنی پبلک) میں پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ کس طرح دفعتاً اپنی بروقت تقریروں اور فصاحت کے زور سے اعلیٰ رتبہ پر پہنچ جاتے ہیں اور اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے کس طرح لوگوں کے جذبات مشتعل کرکے اُنھیں اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور پھر کس طرح موقع و محل کے نہ پہچاننے سے نظروں سے گر جاتے ہیں۔ ابن الوقت ہونا اور بات ہے اور حقیقی خادم ملک اور سردار ہونا دوسری بات ہے لیکن اسمیں عوام کے جذبات کو بڑا دخل ہے۔ ہمارے ملک کی اور خاصکر ہماری قوم کی جو حالت ہے اسکے لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور دلچسپ ہوگا۔ انسان کی سب سے بڑی قوت اس میں ہے کہ وہ اپنے ضعف کو پہچانے اور یہ کتاب اس ضعف کا آئینہ ہے۔ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

۳۔ تیسری کتاب۔ علامۂ ابوریحان بیرونی کے ذاتی حالات اور اُنکی تصانیف کے تذکرہ میں ہے۔ اس کتاب کے متعلق میں اپنی گزشتہ رپورٹ میں ذکر کرچکا ہوں۔ یہ کتاب علی گڑھ کے پُرانے طالب علم جناب سید حسن صاحب برنی بی۔ اے۔ کی تحقیق و محنت کا نتیجہ ہے۔ جسکے لیے انجمن ان کی شکرگزار ہے۔ اب یہ کتاب جناب مسٹر حیدری ہوم سکریٹری دولت آصفیہ کی عنایت و فیاضی سے طبع ہو کر تیار ہے۔

۴۔ سید انشاء اللہ خاں کی مشہور نایاب کتاب **دریائے لطافت** بھی چھپ رہی ہے۔

۵۔ پلوٹارکس لائیوز، جسکا ترجمہ سید ہاشمی صاحب نے بڑی خوبی اور محنت سے کیا ہے، زیر طبع ہے۔ ایک جلد مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے شروع میں قابل مترجم نے تاریخ یونان و روم پر ایک بہت مفید مقدمہ لکھا ہے جو کتاب کے مضامین سمجھنے کے لیے ضروری تھا۔

۶۔ آخر اُردو قاعدہ بہت سے مباحث اور مشوروں اور مراسلت کے بعد تیار ہو گیا ہے اور بہت جلد طبع کے لیے بھیجدیا جائیگا۔ اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی کتاب معلمین کے لیے بھی لکھی گئی ہے جس میں طریقۂ تعلیم کے متعلق ہدایات درج ہیں۔ اس قاعدے میں جو اصلاحات مدنظر تھیں، اُنکا مفصل ذکر میں اپنی گزشتہ رپورٹ میں کر چکا ہوں۔ یہاں اُنکا اعادہ کرنا غیر ضروری ہے۔

۷۔ علم المعیشت (پولیٹکل اکانمی) پر مولوی محمد الیاس صاحب برنی۔ ایم۔ اے پروفیسر علی گڑھ کالج نے ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے اور بڑی محنت اور احتیاط کے ساتھ اس علم کے مشکل مسائل کو سادہ اور آسان زبان میں ادا کیا ہے۔ اس کتاب کا بہت بڑا حصہ لکھا جا چکا ہے اور باقی حصہ ایک مہینے کے عرصے میں ختم ہو جائے گا۔ یہ کتاب اُردو زبان میں بے مثل ثابت ہوگی۔ انجمن فاضل مصنف کی بے انتہا ممنون ہے کہ اُنھوں نے اس کتاب کا پہلا اڈیشن بلا کسی معاوضہ کے انجمن کو عنایت فرمایا ہے۔

۸۔ مولوی برکت علی صاحب۔ بی۔ ایس۔ سی۔ پروفیسر علی گڑھ کالج انجمن کے لیے علم ہیئت جدیدہ پر نہایت جانفشانی اور غور و مطالعہ سے ایک بسیط کتاب لکھ رہے ہیں اور ایک معتد بہ حصہ اس کا لکھ بھی چکے ہیں۔ امید ہی کہ آیندہ سال تک یہ کتاب ختم ہو جائگی اس کتاب سے اُردو زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ ایسی ہی کتابیں ہیں جن سے اُردو زبان میں علم کی روشنی پھیلنے کی توقع ہے اور جو اس زبان کی جڑوں کو مضبوط کرنے

والی ہیں۔ انجمن فاضل پروفیسر کی اس سرگرمی اور محنت کی بے انتہا ممنون ہے۔

۹۔ ڈاکٹر لطافت حسین خاں صاحب آئی۔ ایم۔ ایس نے انجمن کے لیے علم واعمال حفظان صحت پر جو کتاب لکھنی شروع کی تھی، اُسے اب ختم کر چکے ہیں صرف نظر ثانی باقی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب آیندہ سال مکمل ہونے کے بعد طبع کے لیے دیدی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت کی ہے اور ہر طرح انجمن اور بہی خواہان اُردو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جب انجمن کی رپورٹ بابتہ ۱۹۱۴ء علیا حضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا کی خدمت میں پہونچی تو آپ نے اسپر بہت اظہار مسرت فرمایا۔ علیا حضرۃ کو اس مضمون سے خاص دلچسپی ہے اور اُنھوں نے خود بھی حفظان صحت پر متعدد رسالے تصنیف فرمائے ہیں۔

۱۰۔ جناب مسٹر عبدالماجد بی۔ اے انجمن کے لیے پروفیسر لیکی کی مشہور کتاب **ہسٹری آف دی یورپین مارلس** کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ انگریزی میں بڑے پایہ کی کتاب ہے اور معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ قابل مترجم نے پہلی جلد کا ترجمہ ختم کر دیا ہے جو آیندہ سال طبع ہو کر شایع کر دی جائے گی۔

۱۱۔ مولوی سید افتخار عالم صاحب اُسی شغف اور تحقیق کے ساتھ حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری کے لکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس کے لیے ضروری سامان جمع کرنے میں بڑی جانفشانی اور سرگرمی سے کام کر رہے ہیں اور یقین ہے کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں جو اُنھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے، بڑی خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونگے۔ اکثر اصحاب اس کتاب کے منتظر ہیں کیونکہ ابھی تک کوئی مکمل سوانح عمری حضرت امیر خسرو کی اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ حضرت امیر خسرو کا زمانہ، اُن کے حالات، اُنکا کمال

اور اُنکا جامع صفات ہونا، یہ ایسی باتیں ہیں کہ ہر شخص اُنکے سوانح لکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ سید صاحب موصوف نے آجکل اپنے آپکو اس کے لیے وقف کردیا ہے اور برابر اسی دھن میں لگے رہتے ہیں جس سے یہ قوی امید ہوتی ہے کہ اُن کی یہ کتاب جامع مبسوط اور مقبول ہوگی۔

۱۲۔ مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب نے تاریخ تمدن گزو کا ترجمہ ختم کرلیا ہے۔ اب اس پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ آیندہ سال طبع کا انتظام کیا جائے گا۔ انجمن مرزا صاحب کی اس توجہ اور ہمدردی کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

۱۳۔ مرزا غالب کے اردو کلام کا صحیح نسخہ مرتب ہوگیا ہے۔ اس میں مرزا صاحب کا وہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے جو مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس کی ترتیب اور جمع کرنے میں بہت وقت لگا۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کام کے انجام دینے مین بڑی محنت اور سرگرمی سے کام کیا اور اس لیے ہر طرح ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ اب ہر نہج سے مکمل ہوگیا ہے اور طبع کے لیے بھیجدیا گیا ہے۔ نیز یہ انتظام کیا گیا ہے کہ دیوان غالب کا یہ اڈیشن نہایت صحت اور نفاست کے ساتھ طبع کیا جاے اس اہتمام کے لیے انجمن مولوی ظفر الملک علوی صاحب اڈیٹر الناظر کی ممنون ہے۔

۱۴۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولوی ظفر حسن صاحب ایم اے نے فلسفۂ اسلام مصنفہ ڈی بور کا ترجمہ شروع کردیا ہے صاحب موصوف فلسفہ مین بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں اور آپ نے یہ التزام کیا ہے کہ جابجا مفید حواشی کا بھی اضافہ کریں۔ انجمن صاحب موصوف کی بہت ممنون ہے۔

۱۵۔ میں اپنی گزشتہ رپورٹ مین ذکر کر چکا ہوں کہ جناب مولوی حافظ علی صاحب نے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ اسپنسر کی کتاب **علم الاخلاق** کا ترجمہ شروع کر دیا ہے۔ اِسوقت اُنکے ترجمہ کے تخمیناً ڈیڑھ سو صفحہ وصول ہو چکے ہیں۔ فاضل مترجم نے ترجمہ بڑی احتیاط سے کیا ہے اور کتاب کے مطالب کو اس طرح سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُن کے سمجھنے میں زیادہ دقّت نہو۔ علاوہ اس کے علمی اصطلاحات کے ترجمہ میں بھی بڑی دقّت نظر سے کام لیا ہے۔

۱۶۔ علامہ ابو ریحان بیرونی کی مشہور کتاب **کتاب الہند** کا ترجمہ بھی انجمن کے لیے ایک ایسے صاحب نے شروع کر دیا ہے جو علم کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور اپنا زیادہ تر وقت مطالعہ و تالیف و ترجمہ میں صرف کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ قابل مترجم نے ابھی اپنے نام کے ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کتاب سے علامہ موصوف کی وسعت نظر، منصف مزاجی اور ریسرچ جانکاہی ثابت ہوتی ہے یہ کچھ کم بات نہیں ہے کہ ایک مسلمان فاضل چھٹی صدی ہجری میں ہندوستان آئے اور سنسکرت سی غیر مانوس بلکہ بالکل اجنبی اور سخت مشکل زبان کا مطالعہ کرکے اسپر کامل عبور حاصل کرے اور ہندوؤں کے علوم و معاشرت و رسوم پر ایسی جامع کتاب لکھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ اس زمانے میں ہندوستان کے لیے مفید ثابت ہوگا اور ہندوستان کے دو بچھڑے عنصروں کے امتزاج میں مدد دے گا۔

۱۷۔ مسٹر سویشن، ور آنندبی۔ اے نے تحریر فرمایا ہے کہ اُنھون نے جاپان کی ایک تاریخ پانچ سال کے مطالعہ اور محنت کے بعد لکھی ہے جو تخمیناً چھ سو صفحات کی ہوگی اور اُس میں ۶۶۰ قبل مسیح سے حال تک کے واقعات درج ہیں۔ اور رو اُن کی

تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی۔ اور اقتصادی حالات پر مفصل بحث کی ہو جو اہل ہند کے لیے نہایت مفید ہونگے اُن کا منشا ہے کہ کتاب ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ چھپے۔ انجمن نے اُردو اڈیشن کے طبع کا ذمہ لیا ہے اور امید ہے کہ کتاب اہل ملک کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

۱۸۔ مظفر علی خان صاحب اورسیر نے بڑی محنت سے متعدد رسالے پیمایش اور فن انجنیری پر لکھے ہیں اور اُن میں سے بعض رسالے انجمن کے پاس بھی بھیجے ہیں میں چاہتا تھا کہ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب انھیں دیکھ کر اپنی راے سے مطلع فرماتے لیکن بار بار لکھنے پر بھی اُن کی طرف سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ غالباً اُنکی مصروفیتوں نے مجھے جواب سے محروم رکھا۔ چونکہ یہ رسالے ایک خاص فن کے متعلق ہیں اس لیے تاوقتیکہ کوئی صاحبِ فن اِن کے متعلق راے نہ دے انجمن کوئی قطعی راے ان کے متعلق قایم نہیں کرسکتی۔

۱۹۔ مولانا عبداللہ العمادی تحریر فرماتے ہیں کہ "امام یوسفؒ نے ہارون الرشید کے لیے کتاب الخراج لکھی تھی، میں آپکی انجمن کے لیے ایسی ہی کتاب لکھ رہا ہوں جسکا ماحصل یہ ہے کہ ہندوستان قدیم کی اسلامی سلطنتوں میں قانون خراج کیا تھا۔ بندوبست کی کیا نوعیت تھی اور نظام مالیہ کن اصول پر مبنی تھا۔ اس کتاب کو عہد جدید سے کوئی تعلق نہیں"۔ انجمن مولانا کی نہایت ممنون ہے اور مولانا کے علم و فضل اور بے نظیر انشا پردازی سے توقع ہے کہ یہ کتاب لاجواب ہوگی۔

۲۰۔ مولوی ریاض حسن صاحب نے نامۂ دانشوراں کے ڈیڑھ سو صفحہ کا ترجمہ بھیجا ہے اور اطلاع دی ہے کہ اسیقدر ترجمہ اور تیار ہے جو صاف کرانیکے بعد روانہ کیا جائیگا اس کے وصول ہونے کے

بعد طبع کا انتظام کیا جائیگا۔

(۲) جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مجھے ایک کتاب کا مسودہ عنایت فرمایا ہے جو کانفرنس نے بہ اجرت لکھوائی تھی یا حاصل کی تھی مگر وہ ابتک طبع نہیں ہوئی تھی اسکے لکھنے والے سید ہاشمی ہیں اور اس میں اُن مشکلات اور مصائب کا ذکر ہے جو دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کو علم کی تحصیل میں پیش آئے ہیں اور وہ محض اپنی جفاکشی محنت و مستعدی سے غالب آئے اور دنیا میں نامور و کامیاب ہوئے طالب علموں کی رہنمائی کے لیے اس سے بہتر کتاب نہیں ہوسکتی انجمن اسے بھی آئندہ طبع کرائے گی۔

میں نے اس سال ایک گشتی چٹھی ارکان انجمن و دیگر حضرات کی خدمت میں اس مضمون کی بھیجی تھی کہ "جس قسم کی کتابیں اُنکے نزدیک انجمن کو ترجمہ یا تالیف و تصنیف کرانی چاہییں، اُنکا نام تجویز کرکے مجھے ارسال فرمائیں کہ آیندہ کتابوں کے انتخاب میں انجمن کو آسانی ہو اور جس حدتک ممکن ہو اُسکی نئی مطبوعات معاونین اُردو کے حسب منشا ہوں"۔ انجمن اُن تمام حضرات کی ممنون ہے جنھوں نے زحمت فرماکر اس کا جواب عطا فرمایا اور اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا اور بعض مفید کتب کی فہرست ارسال کی۔ لیکن اس ضمن میں اُردو کے نامور انشا پرداز مولانا عبدالحلیم صاحب شرر اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بیرسٹر ایٹ لا کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ مولانا شرر کی رائے ہے کہ

(۱) اس انجمن کا (جو ایک قومی جماعت ہے) یہ کام نہیں ہے کہ متفرق تصانیف کا ترجمہ شایع کرا کے وہ کام کرے جو خود بخود کسی حد تک ہو رہا ہے۔

(۲) انجمن کو اپنے ہاتھ میں ایسے علمی کام لینے چاہییں جو شخصی کوشش سے انجام

نہ پا سکتے ہوں۔ جو اسوقت حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(ا) کسی مکمل و ضخیم لغت جغرافیائی کا ترجمہ مکمل یا تدریجاً شایع کرایا جائے۔

(ب) کوئی مکمل لغت سیر (بیاگریفکل ڈکشنری) ترجمہ کرکے شایع کی جائے۔

(ج) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے جو آرٹکل مشرقی و اسلامی مبحث پر ہیں اُن میں سے اکثر میں شرمناک اور متعصبانہ غلطیاں ہیں، قابل لوگ منتخب کیے جائیں کہ ایسے آرٹکلوں کا پورا پورا ترجمہ تصحیح کے ساتھ کریں اور وہ شایع کیے جائیں تاکہ آیندہ ترتیب میں خود پبلشر ونکو مدد ملے۔

(د) فرنچ زبان میں ڈوزی کی تصانیف نہایت مستند ہیں، اگر انکا ترجمہ شایع ہو تو نہایت مفید ہوگا۔

(ہ) فی الحال انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مرتب ہوتا جاتا ہے اسکا ترجمہ تصحیح و ترمیم کے ساتھ نہایت مفید و سودمند اور بہت اعلیٰ درجہ کا کام ہوگا۔

مجھے مولانا کی رائے سے بہت کچھ اتفاق ہے اور انجمن کے مدنظر چند ایسے کام ہیں۔ مثلاً اُردو میں ابتک دنیا کا مکمل جغرافیہ نہیں انجمن نے اسکی تجویز کی ہے اور اس کے بعد مکمل لغت جغرافیہ لکھوائے گی۔ اسی طرح اُردو میں تاریخ کا سرمایہ بہت کم ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک سلسلہ تواریخ اقوام کا لکھوایا جائے جو بہت مفید ثابت ہوگا۔ ڈوزی کی ایک ضخیم کتاب ترجمہ ہو چکی ہے اور زیر ترتیب و تصحیح ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ترجمہ کا بھی خیال ہے، لیکن یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب انجمن کی مالی حالت زیادہ قابل اطمینان اور مستقل ہو جائے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بیرسٹرایٹ لا نے ازرہ ہمدردی و عنایت

یورپ کی جدید اعلیٰ درجہ کی کتب فلسفہ و سائنس اور ادب کی ایک منتخب فہرست عنایت فرمائی ہے اور اُن کے ترجمہ کے متعلق مفید مشورہ دیا ہے۔ اور خود بھی انجمن کے لیے کام کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

انجمن اِن ہر دو صاحب کے اعلےٰ او بیش بہا مشورہ کی ممنون ہے اور امید ہے کہ جوں جوں انجمن کے سرمایہ میں ترقی ہوتی جائے گی اِن مشوروں پر عمل شروع ہوجائے گا اور بلا شبہ اُس وقت یہ انجمن حقیقی طور پہ ملک و قوم کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔

علاوہ اس علمی کام کے انجمن نے دوسرے مقاصد کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ کی۔ گزشتہ سال کی رپوٹ میں میں نے یہ اطلاع دی تھی کہ بمبئی میں انجمن کی ایک شاخ قائم ہوئی ہے اور اس کے متعلق اردو کا ایک مختصر کتب خانہ اور دار الاخبار بھی ہے اور وہ اب تک برابر جاری ہے۔ اس کی مختصر کیفیت اس رپوٹ کے ضمیمہ (الف) میں درج ہے۔ اس سال بھوپال میں مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ کی توجہ اور سعی سے جو ہر مفید اور قومی کام میں حصہ لینے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے ہیں اور مولوی ظفر الملک علوی کی تحریک سے ایک شاخ قائم ہوی ہے اور اسی طرح لکھنؤ میں بھی مسٹر عبد الماجد صاحب ڈاکٹر ناظر الدین صاحب اور حضرت عزیزؔ کی خاص سعی اور سرگرمی اور مولانا عبد الحلیم صاحب شررؔ، مولوی کرامت حسین صاحب اور مولوی نظام الدین حسن صاحب کی ہمدردی سے ایک شاخ قائم کردی گئی ہے۔ اور کانپور میں حاجی ریاض الدین احمد صاحب نے خاص طور پر کوشش اور محنت کرکے انجمن کی شاخ کا ڈول ڈالا ہے اِن شاخوں کے

قایم ہونے سے انجمن کو اپنے مقاصد کی اشاعت اور ترقی میں بہت کچھ اعانت ملنے کی توقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ملک میں یہ انجمن پسندیدہ نظر سے دیکھی جانے لگی ہے اور اس کے مقاصد سے ارباب علم کو ہمدردی ہوتی جاتی ہے۔ انجمن کے حق میں یہ بہت مبارک فال ہے۔

تمام بہی خواہان اُردو کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ ممالک محروسہ سرکار عالی یعنی گورنمنٹ نظام کے تمام مدارس میں از روے نصاب جدید مقامی زبان کے ساتھ اردو زبان لازمی قرار دی گئی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر مسرت خیز امر یہ ہے کہ وہاں کے دارالعلوم کے متعلق یہ طے کر دیا گیا ہے کہ تمام علوم کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ چونکہ دارالعلوم کے جدید نصاب میں علاوہ عربی فارسی و علوم مشرقیہ کے سائنس، فلسفہ جدید، پولیٹکل اکانمی (اقتصادیات)، تاریخ قدیم و جدید، ہیئت و ریاضی بھی داخل ہے لہذا اب ان تمام علوم کی تعلیم کے لیے اُردو زبان میں کتابیں لکھوائی یا ترجمہ کرائی جائیں گی۔ اور اس کام کو انجمن ترقی اُردو نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ درحقیقت بہت بڑا کام ہوا ہے اور اس کے نتائج آیندہ بہت اچھے نکلیں گے۔ اس سے پہلے جب کبھی یہ کہا گیا کہ علوم کی تعلیم اپنی زبان کے ذریعہ سے دی جاے کیونکہ غیر زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں طرح طرح کے نقصان ہیں تو اکثر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اُردو میں کتابیں ہی کہاں ہیں لیکن یہ کتابیں کہاں سے آئیں جبکہ ہم نے سرے سے کبھی اپنی زبان میں تعلیم دینے کا تہیہ ہی نہیں کیا۔ یہ پہلا وقت ہے کہ دارالعلوم حیدرآباد میں قطعی طور سے اسکا فیصلہ ہوا ہے اور اب کتابیں بھی تھوڑے ہی عرصہ میں تیار ہو جائیں گی۔ ضرورت نے دنیا میں بڑے بڑے کام

کیے ہیں۔ جن لوگوں نے ایک عمر علم و فضل کی تحصیل میں صرف کی ہے اور حقیقتاً وہ لوگ جو سرچشمہ علوم و فنون کے کنارے پہونچ کے اور سیراب ہو کر آئے ہیں، اُنکا فرض ہے کہ وہ اس آب حیات سے اہل ملک کی پیاس بجھائیں۔ بہر حال حضور نظام کی گورنمنٹ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کہ اس نے ایک ایسے کام کی ابتدا کی ہے جو ملک میں حقیقی علم اور روشنی پھیلانے کا باعث ہوگا۔ اور آیندہ جس کی تقلید دوسرے مقامات پر بھی کی جائے گی۔

جناب والا۔ دو سال ہوے جبکہ میں نے آگرہ کے اجلاس میں یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ اگر اس بر اعظم ہند میں پانچ سو اصحاب بھی ایسے ملجائیں جو ایک روپیہ ماہانہ ادا کریں تو انجمن کا کام آسانی سے چل سکتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میری یہ درخواست کچھ بیجا یا غیر معقول نہ تھی، لیکن اب تک ارکان اعانت کی تعداد ۴۷ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں کچھ میری ہمت کا بھی قصور ہے لیکن وہ بھی بری الذمہ نہیں ہوسکتے جو اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ ہمیں بنی بنائی زبان ملی ہے، جبکہ اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنیکی صلاحیت موجود ہے۔ جبکہ اس کی جولانیاں ہندوستان کے حدود سے نکلکر دور دور پہونچ گئی ہیں، اس کے لیے کچھ نہ کرنا اور اسے اس رتبہ تک نہ پہونچانا جس کی وہ مستحق ہے، ہماری کوتاہی کی دلیل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ زبان مرنے والی نہیں ہے۔ لیکن ایسی زندگی بھی کیا زندگی کہ ہر ایک چیز میں دوسروں کی محتاجی ہو۔ اس احتیاج اور افلاس کے مٹانے کی تدبیر سب سے زیادہ مقدم ہے۔ ملک میں عام طور پر بیداری پیدا ہوگئی ہے موجودہ تعلیم نے، بُری ہو یا بھلی، خیالات میں ہلچل اور انقلاب پیدا

کر دیا ہے۔ لوگ دوسروں ہی کے حالات سے نہیں بلکہ اپنی حالت سے بھی واقف ہو گئے ہیں، اور اس عام بیداری کے آثار سب سے زیادہ اس بات میں پائے جاتے ہیں۔ کہ اہل ملک اپنی اپنی زبانوں کی طرف زیادہ مائل اور متوجہ ہوتے جاتے ہیں۔ آج ہندوستان کے ہر کونے سے یہ صدا آ رہی ہے کہ علوم کی تعلیم اپنی زبان کے ذریعہ سے دو۔ یہی بات چالیس برس پہلے مجذوب کی بڑ سمجھی جاتی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک پردہ تھا، جواب اُٹھ گیا ہے۔ اور ہم سمجھنے لگے ہیں کہ غیر زبان خواہ کوئی ہو اور کیسی ہی ہو، ہماری زبان نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بالفرض چند اشخاص کی ہو بھی جائے، تو ملک کی زبان نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر ہم ملک میں عام طور پر علم کی روشنی پھیلانا چاہتے ہیں۔ تو اس کا ذریعہ ملک کی زبان ہی ہونا چاہیے۔ یہ ایک صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ مگر یہ ایک راز تھا، جواب جا کر ہم پر کھلا ہے۔ اور وہ بھی کیسی مصیبتوں اور ٹھوکریں کھانے کے بعد۔ لیکن اب معلوم ہونے اور سمجھنے پر بھی خاموش رہنا غفلت ہی نہیں بلکہ معصیت ہے۔ اُردو بولنے اور سمجھنے والے ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ہیں۔ اُن تک آواز پہنچانے کی کیا سبیل ہونی چاہیے۔ آفتاب علم جو آج تمام عالم پر اس تیزی سے چمک رہا ہے۔ کیا اس کی چند کرنیں بھی ان تک نہ پہونچیں؟ ان میں سے لاکھوں کروڑوں ایسے ہیں جو کسی غیر زبان کا ایک لفظ تک نہیں جانتے۔ ان تک خیالات اور معلومات پہونچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ان کی زبان ہے۔

اُردو زبان کی ابتدا اصل ہماری دوسری زبانوں کے شاعری سے ہوئی اور ایک مدت تک اسی چوچلے اور ناز و نعم میں اس نے پرورش پائی۔ نثر کے قدم

بہت بعد میں آئے اور میر امن سے لیکر اب تک اس کی رفتار بڑھتی گئی اب اُردو میں نثر میں متانت۔ زور اور وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہتا کہ اسمیں ہر قسم کے لطیف اور نازک و علمی خیالات ادا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اب اس میں اس کی صلاحیت ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اور صحیح اصول اور استقلال کے ساتھ ابھی سے اس کام کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ جو آگے چلکر اُن تمام مشکلات کو رفع کردے جو جہالت کی وجہ سے ہمارے سدراہ ہین۔ انجمن ترقی اُردو نے اسکا بیڑا اُٹھایا ہے۔ لیکن کیا ایک انجمن جس کے ارکان اعانت صرف (۲۰) ہوں ایسے بڑے اور اہم کام کو قابل اطمینان طور سے انجام دے سکتی ہے۔؟ میں اس وقت پھر وہی التجا کرنے والا تھا جو میں نے اس سے قبل کی تھی لیکن میرے کرم دوست مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے (ناظم تعلیم ریاست بھوپال) نے نہایت پرزور الفاظ میں میرے پاس یہ راے بھیجی کہ "تمام ملک میں کم سے کم ایک ہزار ارکان انجمن کے ایسے ہونے چاہئیں۔ جو ایک روپیہ ماہانہ ادا کریں اور اس کے معاوضہ میں انھیں بارہ روپیہ قیمت کی کتابیں دی جائیں۔ ان کا احسان صرف اتنا ہوگا کہ وہ یہ رقم پیشگی ادا کردیں۔ اگر کسی زبان کے ایک ہزار پڑھنے والے بھی نہ ملیں (اور خصوصاً ہندوستان جیسے وسیع ملک میں) تو وہ کوئی زبان نہیں اور اور اس کے لیے سعی وجد وجہد کرنا محض عبث اور فضول ہے"۔ جناب مفتی صاحب نے یہ راے بڑے خلوص دل اور ہمدردی سے دی ہے اور وہ سچائی کے ساتھ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اگر یہ ممکن نہو تو اس خیال ہی کو ترک کردینا چاہیے اور اس زبان کی ترقی سے ہاتھ اُٹھا لینا چاہیے۔ کیا اس عظیم الشان ملک سے جسمیں کروڑوں اردو بولنے والے

ہیں ایسی توقع رکھنا محال ہے؟ اگر یہ محال ہے تو پھر آسان کوئی چیز نہیں!

جناب والا۔ یہ زبان چند لوگوں کی سازش یا کسی جماعت کے مشورے یا علما کے فتوے یا کسی فرمانروا کے فرمان سے جاری نہیں ہوئی اسے خاص ضرورت نے پیدا کیا تھا اور وہی ضرورت اب بھی اسکی داعی ہے کہ اُسے قائم رکھا جاے۔ وہ ضرورت کیا تھی؟ مختلف زبانین بولنے والوں میں کسی مشترک زبان کا ہونا۔ یہ ناگزیر تھا بغیر کسی کوشش کے قدرتی طور پر خود بخود اظہار خیال کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا۔ اور انھیں مروجہ زبانوں میں سے ایک نئی زبان بن گئی اور آج اُسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اس کے بولنے سمجھنے یا جاننے والے ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ کیا یہ اسی کا کرشمہ نہیں کہ اسوقت پونا میں جو مرہٹوں کا قبلہ اور مرہٹی کا مدینہ ہے اسی کانفرنس کی کارروائی اُردو زبان میں ہو رہی ہے؟ کیا یہ فخر ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو ہو سکتا ہے؟ کیا مہاراشٹر کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی حصہ مین ہم کسی مجلس کی کارروائی مرہٹی میں کر سکتے ہیں۔ بنگالی جس کے ادب اور ترقی کی دھوم مچی ہوئی ہے وہ اپنے جنم بھوم سے نکل کر کس کام آسکتی ہے؟ اُردو کے سوا ہندوستان کی کسی زبان کو یہ پایہ حاصل نہیں وہ سب اپنے اپنے رقبہ میں محدود اور مخصوص ہیں۔ علاوہ اس کے اسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ ہندو مسلمانوں کے میل جول اور یک جہتی کی یادگار ہے۔ اور یہ بہت عزیز یادگار ہے۔ دوسرے اسے ہندی اور سنسکرت، عربی اور فارسی سے یکساں تعلق ہے! اور اس لیے ہمیں اور بھی عزیز ہے اور اسلئے اسکا قائم رکھنا اور اُسے ترقی دینا ہمارا سب سے بڑا ممکن فرض ہے اسوقت زبان کی اشاعت زیادہ تر اخبارات اور خصوصاً اخبارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ عجلت یا محض سہولت کی وجہ سے زبان کو مخلوط اور بے ربط نہ بنائیں۔ اسکی سلاست و فصاحت کو زائل نہ کریں اور اسے بلا وجہ اور بے ضرورت

دقیق، ناگوار اور قابل مضحکہ نہ بنائیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں یہ ملکی زبان ہے اور ہندو مسلمان، ہندی و سنسکرت، عربی و فارسی سے یکساں تعلق رکھتی ہے اور اس لیے ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم زبان کی حیثیت ایسی نہ بنائیں کہ جس سے دوسروں کو تنفر اور وحشت پیدا ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس سے قبل یہ مشورہ دیا تھا کہ جو حضرات علمی اصطلاحات وغیرہ وضع کرتے ہیں۔ انھیں فارسی سے بھی بلا تکلف مدد لینی چاہیے۔ کیونکہ ترکیب الفاظ کی سہولت کے علاوہ وہ ہندی اور اُردو سے زیادہ اقرب اور زیادہ سریع الفہم ہے۔

لیکن اس سے بڑھکر اعلیٰ اور مقدم فرض جس پر ہماری قومیت۔ ہماری ترقی اور آئندہ بہبودی کا دار و مدار ہے وہ یہ ہے کہ ہم علوم اپنی زبان کے ذریعہ سے سکھائیں اور اُردو زبان کو علم و حکمت سے مالامال کردیں۔ ورنہ جو ڈھنگ اسوقت تعلیم کا پڑ گیا ہے اگر ہم اسمیں صد ہا سال تک بھی ایڑیاں رگڑتے رہیں گے تو علم ایسا ہی مفقود رہے گا جیسا اسوقت ہے اور قومیت کا عنصر بھی ہم سے اسی قدر دور رہیگا جیسا اسوقت ہے۔ غیر زبان کے ذریعہ سے نہ علم آتا ہے اور نہ قوم بنتی ہے۔ دنیا میں اسکا بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور یہ قول ہمیشہ صحیح ثابت ہوا۔ اسوقت تمام عالم میں یہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جہاں علم غیر زبان کے ذریعہ سے سکھایا جاتا ہے اور جب تک یہ رہے گا ہم تعلیم تعلیم پکارا کریں مگر تعلیم کا کہیں پتہ نہیں۔ انجمن بہرحال اسمیں جدوجہد کر رہی ہے اور اگر خدا کا فضل شامل حال ہے اور جو تجویزیں اس بارے میں کی جا رہی ہیں انمیں کامیابی ہوگی تو انشاء اللہ تعالیٰ اُردو زبان اور علمی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

یہاں میں اس امر کا اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کانفرنس نے حسب قرارداد

اپنی مقررہ رقم دو سال سے ادا نہیں کی شاید کانفرنس کی مالی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس کی حالت کیسی ہی سقیم کیوں نہو یہ ممکن نہ تھا کہ کسی نہ کسی مد سے پانسو روپیہ کی قلیل رقم یا اسکا کوئی حصہ ادا نہ کردیا جاتا۔ خیر اسکا بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن یہ ستم ظریفی قابل ذکر ہے۔ کہ اس سال کے بجٹ میں یہ تحریر فرمایا گیا ہے کہ گزشتہ سال انجمن ترقی اُردو کو رقم ادا نہیں کی گئی۔ اور اس سال اگر گنجائش ہوئی تو ادا کی جائے گی۔ غالباً یہ کانفرنس ہی کا بجٹ ہے جسمیں اس قسم کی تحریروں کی گنجایش ہوسکتی ہے۔

میں اس موقع پر خاص طور سے جناب مسٹر حیدر علی بی۔ اے۔ ہوم سکرٹری دولت آصفیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے ہر موقع پر انجمن کی اعانت فرمائی۔ نیز اس کی آیندہ بہبودی اور فلاح کے لیے بھی مساعی ہیں۔

میں مسٹر محمد علی اڈیٹر ہمدرد کا بھی شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے حسب وعدہ اپنے اخبار ہمدرد میں جب تک اخبار جاری رہا علاوہ ماہانہ رپوٹوں اور اطلاعوں کی اشاعت کے انجمن کی مطبوعات کے اشتہار بغیر کسی اجرت کے شایع کیے۔ نیز میں اڈیٹر صاحبان، وکیل، زمیندار، نیر اعظم، الناظر، ظل السلطان۔ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے ماہانہ رپورٹیں اور انجمن کی دوسری اطلاعیں شایع کیں۔ اور اپنے اخبار بھیجے۔

علاوہ ان حضرات کے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے میں اصحاب ذیل کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے انجمن کے ارکان بہم پہونچانے اور دیگر امور میں انجمن کی اعانت فرمائی

۱۔ جناب مرزا احمد بیگ صاحب افسر تصفیہ اراضیات گنڈہی پیٹھ عثمان ساگر (حیدرآباد دکن)

۲۔ جناب مولوی مسعود حسین صاحب بی۔ اے ،،

۳۔ جناب مولوی محفوظ علی صاحب بی۔ اے (بدایوں)

۴۔ جناب مولوی محمد مستحسن صاحب دلیل (اورنگ آباد)

۵۔ مولوی فخرالدین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال

آخر میں یہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی بے وقت موت پر اظہار رنج وافسوس کرتا ہوں۔ مرحوم علی گڑھ کالج کے نہایت ممتاز طالب علموں میں سے تھے۔ وہ عمر بھر طالب علم رہے اور اُنکا اکثر وقت خواہ کسی حالت میں ہوں مطالعہ اور علمی مشاغل میں صرف ہوا۔ مرحوم نے صداقت، راست بازی اور خاص کر سادہ زندگی اور علم دوستی کی ایسی مثال چھوڑی ہے جو دوسروں کے لیے عموماً اور طالب علموں کے لیے خصوصاً قابل تقلید ہے۔ مرحوم کو اردو زبان اور اس انجمن سے خاص ہمدردی تھی اردو میں ان کے متعدد رسالے اور بے شمار مضامین موجود ہیں۔ مجھے ان کے برادر بزرگ مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ انکی وصیت تھی کہ انکے تمام لطائف طبع کرائے جائیں۔ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ اس پر آمادہ ہیں اور ان کے مضامین وغیرہ جمع کردیے ہیں۔ مرحوم کو قوم کی تعلیمی اور معاشرتی مسائل پر بڑا عبور تھا ان کی رائیں اکثر بہت صائب اور مستقیم ہوتی تھیں۔ افسوس ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ بے لوث اور سچے کام کرنیوالوں کی شدید ضرورت تھی وہ ہم میں سے اُٹھ گئے۔ خدا انکو غریق رحمت کرے۔

عبدالحق

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸۲ جلد ۱۴ — یکم اپریل سنہ ۱۹۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۴ یکم اپریل سنہ ۱۹۱۶ء

دین و سائنس

(از ہربرٹ اسپنسر)

آخر میں ہم یہ بیان کرنا ضروری جانتے ہیں، اور یہ بیان بے شک سخت حیرت کا باعث ہوگا، کہ سائنس کی تعلیم کو معمولی تعلیم پر ایک وجہ شرف یہ بھی ہے کہ سائنس کی تعلیم سے دینداری حاصل ہوتی ہے۔ ہم یہاں "سائنس" اور "دین" کو اُن محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتے، جیسا کہ عام طور پر اُنکا استعمال ہے، بلکہ اُنکے وسیع ترین و اعلیٰ ترین معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ سائنس کو بے شک اُن توہمات اور وساوس سے خصومت ہے، جو دین کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، مگر اُس اصلی و حقیقی دین سے مخالفت نہیں جسکو توہماتِ مذکورہ چھپائے ہوئے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سا رائج سائنس ایسا ہے جسمیں بیدینی کی روح دوڑی ہوئی ہے، مگر اُس سائنس کی یہ صورت نہیں جو سطحی حالت سے گزر کر رو بہ تکمیل ہے۔

پروفیسر ہکسلے اپنے حال کے لکچروں کے مجموعہ کے اختتام پر کہتا ہے کہ "سچا سائنس اور سچا دین توام ہیں" (الدین الحق والعلم الصحیح توامان) جنکا ایک دوسرے سے جدا ہونا یقیناً دونوں کے واسطے موجب ہلاکت ہے۔ سائنس جس قدر دیندارانہ ہوتا ہے اُسی نسبت سے ترقی کرتا ہے اور دین اُسی نسبت سے رونق پکڑتا ہے جس قدر اُسکی بنیاد از روے سائنس عمیق و استوار ہوتی ہے۔ جو بڑے بڑے

کارِ نمایاں حکما سے ظہور میں آئے ہیں، چنداں اُنکی دانش کا ثمرہ نہ تھے، بلکہ زیادہ تر اُس ہدایت کا نتیجہ تھے جو حکماے موصوف کی عقل کو اُس دل سے حاصل ہوئی تھی، جو اعلیٰ درجہ کی دینداری سے آراستہ تھا۔ حقائقِ علوم پر جو دسترس اُنکو حاصل ہوئی، ثبات و استقلال سے، شوق سے، صدق دلی و استقامت سے، بذلِ نفس سے حاصل ہوئی، نہ اس وجہ سے کہ وہ بڑے تیز فہم منطقی تھے۔

پس سائنس مورثِ بے دینی نہیں، جیسا اکثروں کا گمان ہے، در اصل سائنس سے غفلت کرنا بے دینی ہے، گرد و پیش کے مظاہر پر غور نہ کرنا بیدینی ہے۔ اس موقع پر ہم ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کرو کسی مصنف کی تعظیم و تکریم میں روزانہ جو فضائل بیان کیے جائیں وہ سب بصیغۂ افعل التفضیل ہوں، فرض کرو جو ثنا و صفت اُسکو مخاطب کرکے کیجائے اس میں ہمیشہ اُسکی تصنیفات کے حکیمانہ انداز، شوکتِ بیان، خوبی و فصاحتِ کلام کا ذکر ہو، فرض کرو جو لوگ علے الدوام اسکی تصنیفات کی تعریف و توصیف کرتے ہوں، اُنھوں نے اُن تصنیفات کو محض باہر سے دیکھ لینے پر اکتفا کی ہو، اور سمجھنے کی کوشش کرنا تو در کنار، کبھی اُن کتابوں کو کھولا تک نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی تعریفوں کی ہماری نظروں میں کیا قدر ہوگی، اور اُنکے خلوص کی نسبت ہمارا کیا گمان ہوگا۔ اگر ادنیٰ امور پر اعلیٰ امور قیاس کیے جائیں، تو ظاہر ہوگا کہ لوگوں کا طرزِ عمل عالم و علتہ العلل کے باب میں بالکل ایسا ہی ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے کہ جن چیزوں کو شبانہ روز حیرت انگیز و تعجب خیز کہتے ہیں، کبھی اُنپر غور نہیں کرتے، اور نہ اُنکی طرف متوجہ ہوتے ہیں، بلکہ جو لوگ اپنا وقت مشاہدۂ فطرت میں صرف کرتے ہیں، لوگ اُنکی اکثر تحقیر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنا وقت ایک فعل عبث میں ضائع کرتے ہیں، اور جو لوگ عجائباتِ عالم کے مشاہدہ سے عملاً دلچسپی رکھتے ہیں، اُنکا تو فی الواقع استہزا کیا جاتا ہے۔ پس ہم مکرر کہتے ہیں کہ سائنس مورثِ بیدینی نہیں ہے بلکہ سائنس سے غفلت بیدینی ہے۔ سائنس میں مصروفیت ایسی عبادت ہے، جس میں زبان کو حرکت نہیں اور سکوت کے عالم میں بعد غور و خوض اس بات کا بھی اعتراف کیا جاتا ہے کہ کوئی چیز بیکار خلق نہیں ہوئی جس میں ضمناً اس بات کا بھی اعتراف ہوتا ہے کہ انکا کوئی مُسبّب ہے۔ یہ عبادت محض عبادت

باللسان نہیں - بلکہ ایسی عبادت ہے جس کا اظہار افعال سے بھی کیا جاتا ہے - یہاں تعظیم و تکریم، تحمید و تمجید محض زبان سے نہیں کی جاتی بلکہ خلوصِ عبادت کا ثبوت صرفِ وقت، بذل فکر اور مشقت سے دیا جاتا ہے -

سچے سائنس کی حقیقی دینی حیثیت اسی ایک صورت پر موقوف نہیں - سچا سائنس ایک اور مذہبی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ سائنس کی بدولت ہمارے دل میں اُس وحدتِ نظام کی گہری عظمت اور اُسپر راسخ اعتقاد پیدا ہوتا ہے جو عالم کی کُل اشیا سے نمایاں ہے - اہل سائنس کو تجربوں کی کثرت سے اس امر کا کامل یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ مظاہرِ فطرت کے تعلقات تغیر پذیر نہیں، علت معلول کے تعلق میں کبھی فرق نہیں آتا، نتائج نیک و بد قطعی و حتمی ہوتے ہیں بجائے اسکے کہ تقلیدی دین کی جزا و سزا کا معتقد ہو، جس کے حصول اور جس سے نجات پانے کی لوگ باوجودِ معصیت امیدِ موہوم رکھتے ہیں، سائنس داں دیکھتا ہے کہ موجوداتِ عالم کے معیّن نظام میں جزا و سزا موجود ہے - نافرمانی کے نتائج بد کسی کے روکے رُک نہیں سکتے - وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جن قوانین کی پابندی ہمپر فرض ہے شدید بھی ہیں اور کریمانہ بھی - وہ سمجھتا ہے کہ ان قوانین کی متابعت سے کاروبار زیادہ تکمیل کے ساتھ انجام پاتے ہیں اور بیشتر راحت کے باعث ہوتے ہیں - اس لیے اُنکی اطاعت کی تاکید کرتا ہے، اور برہم ہوتا ہے جب لوگوں کو اُن سے غفلت کرتے دیکھتا ہے - پس اس طرح موجوداتِ عالم کے ازلی و ابدی ناقابلِ تغیر اصول کا اظہار اور اُن کی الٰہی عظمت کے لزوم پر اصرار کرکے وہ اپنے آپ کو سچا دیندار ثابت کرتا ہے -

آخر میں ہم ایک اور صورت سائنس کی دینی حیثیت کی بیان کرتے ہیں، وہ یہ کہ سائنس ہی سے ہم کو اس بات کا صحیح تصور حاصل ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں، اور اسرارِ وجود کے ساتھ ہمارا کیا تعلق ہے - جہاں سائنس یہ بتلاتا ہے کہ کن کن چیزوں کا علم حاصل کرنا ہمارے امکان میں ہے، وہ اُس حد کو بھی بتلا دیتا ہے جسکے آگے ہم کچھ جان نہیں سکتے - سائنس ہم کو اعتقادی اصول سُنا کر تلقین نہیں کرتا کہ علت العلل کا ادراک دائرۂ امکان سے خارج ہے، بلکہ ہر جانب سے ہمکو اُن

حدود تک پہنچا کر جہاں سے گزرنا محال ہے، واضح طور سے اسکا نا ممکن ہونا ہمارے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ جس طرح سائیس اس بات کو ثابت کرتا ہے، کوئی اور چیز نہیں کر سکتی کہ "انسان کی عقل اُس قوت کے مقابلہ میں جو انسانی عقل سے بالاتر ہے، بے حقیقت ہے" سائنس کا سلوک روایات واسناد کے ساتھ چاہے متکبرانہ ہو، مگر اُس حجاب کے سامنے جو قادرِ مطلق کو محجوب کیے ہوے ہے، عجز و انکسار سے چارہ نہیں۔ پس سائنس کا تکبّر بھی صحیح اور انکسار بھی درست: صرف سائنس کا سچا عالم اور اس سے ہماری مراد اُن لوگوں سے نہیں ہے جو فاصلوں کا تخمینہ کرتے ہیں، یا مرکبات کی تحلیل کرتے ہیں، یا حیوانات ونباتات وغیرہ کی جنس و نوع قرار دیتے ہیں، بلکہ اس سے ایسا شخص مراد ہے جو ادنیٰ حقائق کے ذریعے اعلیٰ اور بالآخر اعلیٰ تر حقائق کی تفتیش کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ صرف سائنس کا سچا عالم ٹھیک ٹھیک اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ عالم حیات۔ عقل و فکر انسانی جس قدرتِ کاملہ کے آثار ہیں اُنکی کنہ انسان کے ادراک بلکہ وہم و قیاس سے بالاتر ہے۔

(ترجمہ) حافظ علی

اقبال کی حرکت دھیمی اور ادبار کی حرکت تیز ہوتی ہے۔ کیونکہ صاحبِ اقبال ایسا ہے جیسے سیڑھی پر چڑھنے والا، اور صاحبِ ادبار ایسا ہے جیسے کوئی اونچی جگہ سے پھینک دیا گیا۔

کنجوس دولتمند ایسے ہیں جیسے خچر اور گدھے کہ سونا اور چاندی اُٹھاتے ہیں اور گھاس اور جَو چرتے ہیں۔

کام کے جلد پورے ہونے کی خواہش نہ کرو بلکہ اُسکی عمدگی کو چاہو۔ کیونکہ لوگ یہ نہیں پوچھتے کہ کتنی دیر میں فارغ ہوتے ہو، بلکہ اُسکی مضبوطی اور عمدہ صنعت کو دیکھتے ہیں۔

دل اپنی خوراک کے لیے داناؤں کی باتوں کا ایسا ہی محتاج ہے جیسے جسم اپنی خوراک کے لیے کھانے کا۔ (قمر)

؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛

اعجازِ محبت

(۱)

"ایا لو بندر اور چوپاٹی کو چولھے میں ڈالو! مجھے نہ یہاں لطف آسکتا ہے نہ وہاں! تمہیں نئی روشنی کی نمائش غیر ضروری اور پُرانے رنگ کی تقلید حماقت آمیز، دونوں سے متنفر ہوں! چلتے ہو تو کسی سُنسان سڑک پر چلو!"

فرید کو تعجب تھا کہ وہ اعجاز کے زبان سے ایسے الفاظ سُن رہا تھا! اُس نے نگہ اُٹھا کر میز پر رکھی ہوئی خوبصورت ٹائم پیس کو دیکھا؛ اُسکے برابر چاندی کے فریم میں لگے ہوئے اعجاز کے بسٹ کو دیکھا، سامنے والی دیوار پر نظر آنے والے "وینس" کے رنگین پینٹنگ کو دیکھا، کارنس پر رکھے ہوئے کیوپڈ اور سائیکی کے ہم آغوش ہونے والے مجسمہ کو دیکھا؛ اور سگرٹ کا کش لے کر دُھنواں چھوڑنے میں چھلّے بناتے ہوئے کہا۔ "اعجاز! اگر میں تمھیں اچھی طرح نہ جانتا ہوتا۔ یادش بخیر، کالج میں کامل دو سال میں تمھارا کلاس فیلو نہ رہا ہوتا۔ مجھے اسکا علم نہ ہوتا کہ تمھاری آنکھوں میں صنفِ نازک پر دلکش اثر ڈالنے والی خاص چیز، اور تمھارے دل میں کسی کی محبت سے متاثر نہ ہونے والی خاص کیفیت موجود ہے؛ تو میں یقین کر لیتا کہ تم پر بھی عشق کا بھوت سوار ہوا..."

"لیکن! فرید!" اعجاز نے بات کاٹ کر اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں اگر خود اقرار کروں کہ واقعی جذبۂ محبت میرے مردہ دل میں ازسرِنو مشتعل ہو گیا ہے؟"

"تو! میں کہوں گا کہ غلط اور سراسر غلط!" فرید نے تصویروں اور آرائش کی چیزوں سے نگہ ہٹا کر، اپنے سگرٹ کو خاص نظر سے دیکھتے ہوئے۔ جس کی اب وہ راکھ جھاڑ رہا تھا۔ کہا۔ "میں ابھی تم کو اور تمھاری قلبی حالت کو بھولا نہیں ہوں! حمیدہ پر تمھارا فریفتہ ہونا۔ جب وہ گرلز اسکول میں انٹرنس کے لیے کوشاں تھی؛ اس فریفتگی کا قیام مستحکم؛ قسمت کی برگشتگی؛ تمھارا اعیذ ن؛ بی۔ اے۔ سے پیشتر ہی کالج کو الوداع اور اسٹیج کی زندگی کو اختیار کرنا؛ مجھے سب کچھ یاد ہے،

اور خوب یاد ہے! مجھے یقین ہے کہ اعجاز پر محبت کا انجھراب کوئی صورت نہیں مار سکتی! وہ ایک کو دل دے چکا اور اب اُسی ایک کی یادِ خلش آمیز کا مجنون ہے۔ ہے اور رہے گا! حُسن کی ہمیالی سے ہمیالی صورت بھی اُسے ڈگمگا نہیں سکتی!"

"عزیز دوست!" اعجاز نے۔ اُلٹے ہاتھ سے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں سے کھیلتے ہوئے اور نظر اُٹھا کر کیوپڈ و سائیکی کے مجسمہ کو دلکش نظر سے دیکھتے ہوئے۔ کہا۔ "یہ سچ ہے کہ حمیدہ نے میرے دل کو چھین لیا؛ میں محبت کے پاک جذبہ میں ڈوب گیا، اور دیوانہ ہوگیا؛ مگر حمیدہ نے میری سچی محبت پر دوسرے شخص کے تموّل سے پیدا ہونے والی فوقیت کو ترجیح دی اور اسکے ساتھ شادی کرلی؛ میرے دل و دماغ پر اُسکی شکل نے ایسا گہرا نقش چھوڑا تھا کہ میں یکایک مایوس ہو جانے سے تقریباً از خود رفتہ ہوگیا اور اس از خود رفتگی نے ہی کالج بھی وقت سے پہلے چھوڑا دیا اور میری زندگی کو بھی ایک چراغِ گور بنا دیا، جو تاریک رات میں دُور سے ٹمٹما تا ہوا اور جس سے سوائے ایک مرقدِ غیر حِس کے کوئی لطف نہ اُٹھاتا ہو! دنیا اپنی لاتعداد دلچسپیوں سے معمور سہی، مگر میری نظر میں تاریک، خشک، اور جھوٹی چیز معلوم ہونے لگی! دلِ جنوں لبریز رہ رہ کر فریاد پر مجبور کرتا تھا؛ جذبۂ دیوانگی آمیز ٹھہر ٹھہر کر لب تک آ جانے کے لیے مچل جاتا تھا؛ ایسی حالت میں مجھے اپنی بے چینی کا درماں اسٹیج پر نظر آیا۔ جہاں ہر رات کو، کبھی رومیو کی صورت میں اور کبھی ہیملٹ کی شکل میں مجھے اپنی کیفیت قلبی کو ظاہر کرنے اور دلی بخار ایک حد تک نکال لینے کا موقعہ مل جاتا ہے....." (اُس نے ایک آہِ سرد.....)

فرید (بات کاٹ کر)۔ "جب ہی تو میں یقین نہیں کر سکتا کہ اعجاز سوائے اُس ایک صورت کی یادِ دلکش کے کبھی اَور کا ہو سکتا ہے!"

اعجاز: "بے شک صحیح! حمیدہ مجھ سے ہی نہیں دنیا سے کنارہ کر گئی۔ کم و بیش تین سال ہوئے مر گئی! مگر عزیز دوست میرے دل میں، میری دماغی دنیا میں، وہ صورت برابر زندہ رہی اور ہے! اب تک صرف دماغ میں ہی تھی مگر اب اُس نے چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی صورت میں جنم لے لیا!"

فرید (نہایت تعجب کے ساتھ)۔ "یعنی؟ یعنی؟"

"یعنی۔ وہ زندہ ہوگئی!" اعجاز مسکراتا ہوا، کھڑا ہوگیا اور پتلون کی جیب میں اُلٹا ہاتھ ڈال کر، اُس نے فرید سے پھر کہا:" زندہ ہوگئی! حمیدہ کے نام سے نہیں، ایک اور نام سے۔"

"یعنی تم کسی اور عورت پر مرنے لگے! ناممکن! قطعی ناممکن!!" فرید نے سگرٹ ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے ہوکر جواب دیا" میں تمھاری زندگی کو پانچ سال سے دیکھ رہا ہوں۔ حمیدہ کے انتقال کے بعد بھی تمھارا جنون برابر قائم ہے! تم شریف خاندان سے ہو، اور اسوقت ہندوستان میں تم جیسے تعلیم یافتہ اور شریف نوجوان نے ایکٹنگ کو ایک قابلِ عزت چیز بنا دیا ہے! جس وقت تم اپنی ڈگری چھوڑ کر اسٹیج میں شامل ہوے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ اُسوقت تم پر معزز و تعلیم یافتہ طبقہ نفرین کرتا تھا: مگر اب تمھاری قدر کیجاتی ہے، عزت کیجاتی ہے، پرستش کیجاتی ہے........"

اعجاز (بات کاٹ کر):" فرید! فرید!! آخر اس قصیدۂ مدحیہ کا مطلب.....؟"
وہ عجیب مسرت آمیز چشم و ابرو کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

فرید (اعجاز کو محبت کے ساتھ دیکھتے ہوے):" مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں۔ مَیں خود دیکھ رہا ہوں۔ تمھاری معمولی سی توجہ پر خوبصورت سے خوبصورت اور متمول سے متمول، تعلیم یافتہ بیوی تم کو، ہر وقت مل سکتی ہے: لیکن پھر بھی تم اُسی اپکے دیوانے، اُسی دماغی صورت کے دلدادہ ہو اور رہوگے!"

اعجاز:" فرید تم نے میری دلی کیفیت کے سمجھنے میں غلطی کی" اُس نے اپنے سیدھے ہاتھ کے پنجے کو کوٹ کے دو لگے ہوے بٹنوں کی درمیانی خلا میں ڈال کر کہا:" میں حمیدہ پر نہیں مرتا تھا، بلکہ اُس چہرے، اُس نقشے، اور اُس مجموعی ہیأت پر مرتا تھا۔ جو حمیدہ کے نام سے موسوم ہونیوالے قالب میں مجھے نظر آئی تھی! اس قدر عرصہ کے بعد اب پھر میں اُسی چیز کو، چلتا پھرتا اور ہنستا بولتا پاتا ہوں جسکی تلاش میں میرا دل و دماغ برابر مصروف اور دیوانہ تھا!"

فرید (تعجب کے ساتھ):" اور اس اجمال کی تفصیل؟"

اعجاز:" کچھ نہیں۔ صرف یہ کہ میں حسب معمول سنیچر کے روز شام کو ٹہلتا ہوا بینڈ اسٹینڈ

پہونچا نکلا: وہاں بیٹھا تھا اور مجمع تھا! اسی بھیڑ میں، ایک کونے کی طرف، میں نے اُس دلکش چیز کو کھڑا ہوا پا لیا جس کی تلاش میں یا پرستی میرا شیوہ ہو گیا تھا!"

فرید: "اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ کون ہے؟"

اعجاز: "ہاں! یہ بھی معلوم کر لیا اور خوب معلوم کر لیا! میں نے اُسی دن، اُس سے چھپ کر اُس کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ اُسکے مکان کا پتہ لگا لیا۔ لگا لیا اور آمد و رفت شروع کر دی! خدا کرے کہ حمیدہ کی طرح اُس کا دل ناقدر شناسِ محبت نہ ہو!"

فرید: "اب یہ ناممکن ہے! حمیدہ بھی اگر اسوقت زندہ ہوتی تو تمھاری موجودہ عزت ہر دلعزیزی کے سامنے خود اپنا دل نذر دیتی......"

اعجاز (بات کاٹ کر) "مگر میں اُس بھولی چیز کو اپنی شہرت و عزت کے جال میں پھانسنا نہیں چاہتا! میں نے اپنا نام اعجاز نہیں بتایا ہے اور نہ اُسکو میرے ایکٹر ہونے کا گمان ہے! میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اعجاز سے موسوم ہونے والی شخصیت کو دیکھے، اُن عادات و اطوار کا اندازہ کرے جو فطرتِ ثانیہ بن کر مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے: اور ایسی شخصیت کا اندازہ اُس تمام عزت و شہرت کی جھول علحدہ کر دینے کے بعد جو چشم زدن میں معدوم ہو سکتی ہے، اُسے اختیار ہے کہ نفرت کی نگاہ سے کرے یا پسندیدگی کی نگاہ سے!"

فرید: "لیکن تم وہاں پہونچے کس تقریب سے؟"

اعجاز: "اس قدر تو میں نے اُسکی تنہائی پسند عادت سے پہلے ہی روز معلوم کر لیا تھا کہ وہ فارغ البال اور تفکر سے آزاد نہیں ہے: یعنی اُسے اپنا پیٹ خود پالنا پڑتا ہے، لیکن دوسرے دن بلا توقف اُسکے مکان میں چلے جانے کی جرأت اُس سائن بورڈ سے ہوئی جو اُسکے مکان پر لگا ہے اور جس پر "یہاں پیانو اور ہارمونیم سکھایا جاتا ہے" لکھا ہوا ہے!"

"گویا تم ہارمونیم سیکھنے جاتے ہو؟" فرید نے ہنستے ہوئے کہا!

"ہاں!" اعجاز نے کافی پر لگے ہوئے قد آدم آئینہ میں۔ اپنے سیاہ سوٹ، کوٹ کے

لمبے کالر میں سے نظر آنیوالی سفید فینسی ویسٹ کوٹ، اور اپنے سُرخ سفید چہرے کو دیکھا۔ دیکھا ؟ اور مسکراتے ہوئے۔ کچھ اس طرح گویا وہ اسٹیج پر ایکٹ کر رہا ہے۔ کہا "اعجاز ہارمونیم کو بھول گیا؛ بلکہ جانتا ہی نہیں: وہ سیکھتا ہے، روزانہ صبح کو سیکھتا ہے داس قدر غبی ہے کہ چار روز میں سرگم بھی صاف نہیں بجا سکتا! اور اس امید میں ہے کہ سکھانے والی کی شرمیلی مگر سرقۂ دل کی عادی آنکھیں کبھی غصہ کی دلفریبیاں ادا کے ساتھ اُسپر پڑیں!!"

(۲)

اعجاز۔ مشہور معزز ایکٹر۔ سچ تو یہ ہے کہ اس محبّت کے بدولت ہی ایکٹنگ میں غیر معمولی ذہانت کا آدمی سمجھا جاتا تھا! محبت کا روپ بھرنے کے وقت اُس کا دل محبت سے حقیقی طور پر معمور ہوتا تھا، اس لیے وہ رومیو ہو یا ہملٹ، ناصرالدولہ ہو یا ادرکچھ، سچی اور واقعی محبت اُسکے حرکات، اُسکی چال، اُسکی آواز، اُسکے چشم و ابرو، اور اُسکی ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی! واقعی اُس نے ہندوستان کی اسٹیج پر "ایکٹنگ" کے ذلیل سمجھے جانے والے پیشہ کو، قعرِ ذلت سے نکال کر فنونِ لطیفہ کی معزز حدود میں داخل کر دیا تھا! ایک مردہ تصور کی محبت نے اُسکی زندگی تک کو "ایکٹ" بنا دیا تھا اور اسی وجہ سے اُس ہستی کو کسی اور قالب میں پا کر وہ جس رنگ میں اُس سے مِلا ایک قِسم کا "ایکٹ" ہی تھا!

مِس رُستم۔ سیاہ و شرمیلی آنکھیں، سفید و کتابی چہرہ، لمبے اور لہردار بال، رکھنے والی جوان لڑکی۔ پیر سے بجنے والے اونچے ہارمونیم کے پاس کھڑی تھی، کبھی ہارمونیم کو اور کبھی ہارمونیم بجانے والے نوجوان کو دیکھ رہی تھی، اور کسی خاص خیالِ مستقل سے پیدا ہونے والی شانِ افسردگی۔ مایوسی نہیں، محض افسردگی۔ اُسکی پیشانی میں جھلک مار رہی تھی!

فرامرز۔ باجا بجانے والا فیشن ایبل نوجوان۔ ایک اونچی تپائی پر باجے کے آگے بیٹھا تھا، اُسکے پانوُں دھوکنی پر اور اُسکے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں باجے کے پردوں پر متحرک تھیں، مگر اُس کی آنکھیں۔ اُسکے دل و دماغ کی تعمیلِ حکم میں۔ باجے کے بجائے کسی اور طرف۔ کسی مقناطیس نظر کی طرف۔

نگاہ وشوق کے معنی خیز شرارے چھوڑنے میں مصروف تھیں!

"سا رے گا، رے گا ما، گا ما پا" کی آواز باجے کی پردوں سے نکل کر چھوٹے اور سلیقہ کے ساتھ۔ تھوڑے سامان سے۔ سجے ہونے والے کمرہ میں گونج رہی تھی!

"پا دھا نی، دھا نی سا، سا نی دھا...."

"ٹھہریے! ٹھہریے!! جلدی نہ کیجیے!" مس رستم نے نوجوان سے کہا!

"اور اگر وقت تھوڑا ہو۔ تو بھی کام میں عجلت نہ ہو" فرامرز نے منہ پھیر کر مس رستم کو دیکھتے ہوئے کہا!

مس رستم:- "افسوس ہے کہ آپ میرے بتانے پر غور نہیں کرتے! آج دو ہفتہ گزرتے ہیں لیکن ابھی تک آپ سرگم کے تمام پلٹے صاف طور پر نہیں بجا سکتے! میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایسا...."

فرامرز (بات کاٹ کر) "غبی شخص پالے پڑا ہو" وہ مسکرانے لگا!

مس رستم (کچھ گھبرا کر)"- جی نہیں! میرا مطلب یہ نہیں تھا! معاف کیجیے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی!"

فرامرز:- "غلط فہمی میری خصوصیات میں سے ہے! میں باجا بجانے کی ہدایات کو بھی غلط سمجھتا ہوں"

مس رستم:- "میں معافی مانگتی ہوں اگر آپ کو ناگوار ہوا ہو" کچھ خجالت اور کچھ معصومیت اُسکی چشم و ابرو سے ظاہر ہو رہی تھی!

فرامرز:- "نہیں۔ نہیں! مجھے مطلق ناگوار نہیں ہوا۔ آپ کو ہر بات کہنے کا حق ہے....."

مس رستم (بات کاٹ کر) "اب میرا پلٹا بجائیے!"

"سارے، سارے، گا، رے گا، رے گا ما" باجے کی آواز پھر گونج رہی تھی "گا ما، گا ما، پا، ما پا، پا ما، دھا....."

"غلط، غلط! پھر بجائیے!" مس رستم نے کہا!

"ما پا، پا ما، دھا" فرامرز نے دُہرایا!

"جی نہیں! ما پا، ما پا، دھا" مس رُستم نے۔ سُریلی آواز میں گا کر۔ بتایا!

" میں اس آپا۔ دعاپلے سے عاجز آگیا ہوں" فرامرز نے باجے کو چھوڑ کر مس رستم سے کہا!

" مگر بغیر اسکے آپ آگے نہیں چل سکتے"

" چل سکوں یا نہ چل سکوں! اب تو میری انگلیاں دُکھ گئی ہیں" فرامرز نے ہنستے ہوئے کہا" ذرا دَم لے لینے دیجیے"

فرامرز کو اوّل ہی دن سے حیرت تھی کہ ایسی دلکش ہستی کنجِ تنہائی میں باجا سکھانے کو اپنا ذریۂ معاش کیوں بنائے ہوئے ہے؟ چھوٹے کمرے میں لگی ہوئی دو تین تصویروں نے فرامرز کے متجسس نظر اور ذہین طبیعت کو تھوڑی بہت امداد دی تھی لیکن مس رستم کی تنہائی پسندی اور خاموش افسردگی پھر بھی بجائے خود ایک گرہ تھی جو ابھی تک اُسکی فکر رسا پوری طور پر کھول نہ سکی تھی!

مس رُستم کو پہلی ہی ملاقات سے تعجب تھا کہ ایسا متموّل نظر آنے والا نوجوان روزانہ صبح کو محض باجا سیکھنے اُسکے معمولی درجہ کے گھر تک پیدل کیوں آتا ہے؟ فرامرز کی آنکھوں نے مس رستم کے تخیلات میں ایک خاص جھلک ضرور پیدا کر دی تھی لیکن پھر بھی ایسی متاثر کرنیوالی صورت کا غبی یا کُند ذہن ہونا ایک ایسی چیز تھی جس کو مس رستم پوری طرح سمجھ نہ سکی تھی!

" میں دیکھتا ہوں! آپ متفکر زیادہ رہتی ہیں۔ اور اپنی فکر کو زبان تک نہ آنے دینے کا پورا خیال رکھتی ہیں؟"

" جی نہیں! میں فطرتاً خاموشی پسند ہوں!" مس رستم نے جواب دیا!

" کم سخنی اور چیز ہے، اور فکر اور چیز ہے!" فرامرز نے [illegible] کے ساتھ مس رستم کے چہرے ظاہر ہونے والی کیفیت کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا" آپ [illegible] رہتی ہے اور مستقل فکر رہتی ہے! کیا آپ مجھے قابلِ اعتماد اور لائق امداد شخص نہیں سمجھتیں؟"

" مگر مجھے کسی امداد کی حاجت نہیں، جس کے لیے آپ کو تکلیف دوں" گردن جھکائے ہوئے اُس نے کہا!

" دیکھیے! پھر آپ مجھ پر اعتماد کرنا نہیں چاہتیں پھر آپ پردہ رکھنا چاہتی ہیں! مجھے افسوس ہے

کہ آپ ایسی فضول فکر میں مبتلا رہتی ہیں جو بہت جلد دور ہو سکتی ہے !"

" میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کیا فرماتے ہیں ؟" مس رستم نے ۔ قریب قریب لاجواب ہو جانے کے رنگ میں کہا !

" میں وہ کہتا ہوں جو مجھے نظر آ رہا ہے ! آج سے پیشتر بھی میں نے چند بار کہنا چاہا کہ آپ جو کچھ مجھ سے پردہ میں رکھنا چاہتی ہیں ، میں سب جانتا ہوں ، مگر افسوس ہے کہ مجھے اظہار کی جرأت نہ ہوئی ! آج البتہ یہ ذکر خود بخود چھڑ گیا تو کہتا ہوں کہ مجھے تمام باتوں کا علم ہے ....."

" کن باتوں کا علم ہے ؟" مس رستم نے بات کاٹ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا !

فرامرز (مس رستم کو غور سے دیکھتے ہوئے) " اس کا علم ہے کہ آپ متفکر رہتی ہیں ۔ فکرِ معاش میں سرگرم رہتی ہیں ؛ محض اپنے لیے نہیں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ۔ اُسکے تعلیم کے اخراجات کیلیے ! اور اسکے ساتھ ہی اپنے مستقبل کے لیے !" وہ کہہ رہا تھا اور انتشار آمیز کیفیت کا مشاہدہ سامنے والے چہرے پر کر رہا تھا ؛ وہ سُن رہی تھی اور استعجاب و حیرت میں ڈوب کر کہنے والے کو نجومی سمجھ رہی تھی ؛ " مستقبل کے لیے اس وجہ سے بھی کہ زمانۂ ماضی نے کچھ خوشگوار اثر نہیں چھوڑا ؛ آپ کے دل و دماغ پر حسین ناقدر شناسِ محبت کا نقش رہ گیا وہ فی الحقیقت انسان پرست نہ تھا بلکہ تموّل پرست تھا ! وہ ایک چھوٹا اکیڑ تھا جسکے لغو الفاظ کو آپکے ناتجربہ کار دماغ نے عرصہ تک سچا سمجھا ۔ سچا سمجھا اور آخر کار رنج و پشیمانی کا نقش دیرپا ثبت ہو گیا ....."

" کیا ؟ کیا ؟" مس رستم گھبرا اُٹھی !

فرامرز " آپ مطلق بھی تشویش نہ کریں ! یہ تصویریں جو آپ کے کمرے میں لگی ہوئی ہیں سوائے میرے اور کسی سے یہ راز افشا نہیں کر سکتیں ! میری آنکھیں آپ کی حرکات و سکنات میں مطالعۂ سیرت کرتی رہتی ہیں ! میں سمجھتا ہوں کہ سچی محبت کا سچا معاوضہ نہ ملنے سے ایک شگفتہ طبیعت کس طرح پژمردہ ہو جاتی ہے ! مجھے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تخیلات کی دنیا میں آسائش و اطمینانِ قلب کی تصویر کچھ ایسی کھینچی ہو گی کہ ۔ ایک چھوٹا سا خوشنما بنگلہ کسی دریا کے کنارے پر ، مگر آبادی کے

کے شور و غل سے دُور ہو؛ وہاں سورج کی دھوپ اور چاندنی چاندنی پھولوں سے لیکر سطح آب تک کو نظر فریب رنگ میں روز و شب رنگتی رہے؛ دنیا و ما فیہا سے بیخبری ہو؛ سُر یلا باجا ہو، خاموش زندگی ہو اور؟ اور ایک قدر شناسِ محبت دل ہو.......“

فرامرز کہے گیا اور مس رستم سُنے گئی! آوازِ سحر آمیز انچھر باراکی اور تشنۂ محبت دل متاثر ہوا کیا! خدا جانے کس قدر وقت اس طرح گذرا، کیسا باجا اور کہاں کی سرگم!!

(۳)

تکلف کیسی بدنما دیوار ہے جو دو طبیعتوں کے درمیان۔ تہذیب کے پردے میں اکثر حائل ہو جاتا ہے! لیکن خلوت کا تبادلۂ خیالات اس دیوارِ آہنی کو رفتہ رفتہ۔ زنگ کی طرح بالکل کھا جاتا ہے! کل جو شخص ”آپ“ کے ساتھ مخاطب بنایا جاتا تھا، آج ”تم“ ہی پر اُس سے اکتفا کیا جاتا ہے: نا واقفیت سے بے تکلفی کی حدود کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے؛ خلوت کی ہم نشینی، اور تبادلۂ خیالات کا موقعہ اگر دونوں چیزیں خوش نصیبی سے حاصل ہو جائیں تو نا واقفیت کا مسافر بے تکلفی کی حدود میں دیکھتے ہی دیکھتے پونہچ جاتا ہے اور کسی کو کان و کان بھی خبر نہیں ہوتی! پھر اگر مدِ مقابل صنفِ نازک ہو، اور کوشش کرنے والا بھی کم از کم بدصورت نہ ہو۔ دونوں طرف کھولت کی تاریکی نہ چھائی ہو۔ تو گویا اس منزلِ شوق لبریز کا سفر فی گھنٹہ ۶۰ میل چلنے والی ڈاک گاڑی میں طے ہوتا ہے!

فرامرز نا واقفیت سے واقفیت تک۔ اور واقفیت سے بے تکلفی تک۔ پونہچا اور ضرور پونہچا! مس رُستم باجا سکھانے سے باتیں کرنے کی۔ اور باتیں کرنے سے اظہارِ جذبات کی عادی ہو چلی اور ضرور ہو چلی! دو مشتاق آنکھیں سامنے والی دو بھولی آنکھوں کو۔ رہ رہ کر جھک جانے والی آنکھوں کو وائرلیس ٹیلیگرافی (بے تار کی تار برقی) کے ذریعہ سے پیغامِ معنی خیز پونہچاتی رہیں اور دو دماغ اپنی اپنی حیثیت کے موافق اس نظر نہ آنے والی قوت کے نقشِ دیرپا قبول کرتے رہے!

اُسی مدرسۂ محبت۔ یا۔ مکتبِ بارمونیم نوازی۔ میں فرامرز باجا بجا کر ایک روز اُٹھا تھا، اُسکے ہاتھ میں دستی چھڑی لپکا تھا، اُسی ہاتھ کی بانہہ پر سیاہ چسٹر ڈال چکا تھا، اور رخصت ہونے سے پیشتر

مس رستم سے کہہ رہا تھا: "کیا آپ تھیٹر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں؟"

"پسند تو کرتی ہوں مگر۔ مگر ....." وہ خاموش ہو گئی!

فرامرز: "مگر۔ مگر کیا؟ بیان کیجیے!"

مس رستم (گردن جھکا کر): "آپ جانتے ہیں میری حالت مجھے اجازت نہیں دیتی! ورنہ مجھے تھیٹر کا بہت شوق ہے!"

فرامرز: "اسکے کہنے کی آپ کو حاجت نہیں! میں ٹکٹ لے چکا ہوں۔ میرے ساتھ ایک میرے دوست بھی ہیں، اور ایک جگہ خالی ہے: اگر آپ پسند کریں۔ پسند نہیں بلکہ مجھے ممنون بنانا چاہیں۔ تو چلیے۔ ٹھیک وقت پر امپائر تھیٹر پونہچ جائیے۔ میرے دوست آپ کو باہر ہی ملیں گے! میں ایک ضرورت کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد پونہچوں گا! آپ اُنکے ساتھ بلا تکلف اندر جائیں اور میرا انتظار کریں!"

مس رستم (نیچی نظروں سے): "بہت اچھا!" (کچھ شرما کر): "میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں!"

فرامرز: "یہ کیا؟ تماشا دیکھنے سے پہلے ہی شکریہ چہ معنی دارد؟ تماشہ دیکھ لیجیے اسکے بعد شکریہ ادا کیجیے! بلکہ اسکے بعد میں خود یاد دلاؤں گا کہ شکریہ ادا کیجیے کیونکہ آپ مشہور ایکٹر اعجاز کا ایکٹ دیکھ سکیں گی!"

مس رستم (خوش ہو کر): "اعجاز! اعجاز کا نام میں بہت سُن چکی ہوں اور اُس کا ایکٹ دیکھنے کی عرصہ سے مشتاق ہوں! وہ بڑا معزز اور مشہور شخص ہے! تماشہ دیکھنے کے قابل ہو گا!!"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

مس رستم تماشہ شروع ہونے سے کچھ پیشتر تھیٹر پونہچ گئی تھی، فرامرز کا دوست انکو باہر کھڑا ہوا ملا گیا تھا جس نے پہلی ہی نظر میں انکو پہچان بھی لیا تھا، اور دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر اندر جا بیٹھے تھے مگر فرامرز ابھی تک نہیں آیا تھا!

تھیٹر تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا: گھنٹی بجی: شور و غل کم ہوا اور پردہ اُٹھا! آبشار کا سین سامنے تھا! مس رستم بڑی دلچسپی کے ساتھ تماشہ دیکھ رہی تھی اور فرامرز کا دوست سکوت کے ساتھ

اُسکی حالت کو دیکھ رہا تھا! ایک سین۔ دوسرا سین۔ تیسرا سین؛ تماشہ برابر ہوتے چلا جاتا تھا، چنگیز کا ایکٹ اُسے متوجہ کیے ہوے تھا، لیکن فرامرز ابتک نہیں آیا تھا! پردہ اُٹھتا ہے اور جھولے والا سین سامنے تھا: ناصرالدولہ کا معصوم بچہ جھولے پر سے اُتر کر "امّی جان" کہتا ہوا ناصرالدولہ کی بیوی سے لپٹ جاتا ہے اور عین اُس وقت جبکہ وہ اسے پیار کرتی ہوتی ہے۔ پوری خاموشی اور اشتیاق کی کیفیت تماشائیوں پر طاری ہوتی ہے کہ۔ اعجاز، مشہور و معروف ایکٹر، ناصرالدولہ کے روپ میں، جذبۂ محبت سے معمور، "چور۔ چور!!" کہتا ہُوا اسٹیج پر آتا ہے!

مس رُستم کیا دیکھ رہی تھی! غضب کا ایکٹ، بلا کی آواز، قیامت کا اظہارِ عشق! لیکن سکے علاوہ بھی وہ اور کچھ دیکھ رہی تھی!! اُس نے پہلو بدلا، گھبرا کر اپنی ریشمیں ساڑی کے دامن کو سنبھالا، اور پھر دیکھنا شروع کیا! پھر وہی چیز اُسے نظر آرہی تھی جس سے وہ متحیر تھی! فرامرز کا دوست مسکراہٹ کو روک رہا تھا، کن انکھیوں سے مس رستم کو تاڑ رہا تھا، اور خاموش تھا! مس رستم متحیر تھی، بے چین ہوتی جاتی تھی، اور سمجھ نہیں سکتی تھی کہ کیا دیکھ رہی ہے! اُس نے پھر پہلو بدلا، آنکھوں کو ملا، اور غور سے دیکھنا چاہا! جس قدر غور کرتی تھی، حیرت بڑھتی جاتی تھی! وہ پریشان تھی، مبہوت تھی، سمجھ نہیں سکتی تھی کہ ناصرالدولہ کا پارٹ کرنے والا، مشہور و معروف ایکٹر اعجاز ہے۔ یا۔ نو آموز ہارمونیم نواز، فرامرز!!

وہ گھبرائی: اُسکا چہرا متغیر ہوا: وہ اُٹھ کھڑی ہوئی: باوجود اصرار کے بھی نہ ٹھہر سکی اور دھڑکتے ہوے دل اور باختہ حواس کو انتہائی کوشش خود داری سے سنبھالتے ہوے چلدی!!

(۴)

"مس رُستم آج کہاں گئی ہیں؟" فرامرز۔ یا اعجاز۔ نے سن رسیدہ خادمہ سے کمرے کے اندر گھستے ہوے پوچھا!

"مجھے نہیں معلوم!"

"مگر وہ تو اس وقت کبھی باہر جایا نہیں کرتیں؟" اعجاز نے تعجب کے ساتھ پھر سوال کیا۔

"جی اِن کبھی نہیں جاتیں! اگر کل حسنِ وقت سے تماشہ دیکھ کر واپس آئی ہیں۔ کچھ طبیعت اچھی نہیں معلوم ہوتی! کچھ سُست سُست معلوم ہوتی ہیں! شاید زیادہ جاگنے سے سر میں درد ہوتا ہو اور صبح سویرے ہی ٹہلنے چلی گئی ہوں!"

اعجاز تصویروں پر نظر ڈالتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا! باہر سڑک سامنے تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر بمشکل تمام ساکت رہنے والی مخلوق، صبح ہوتے ہی زندان خانۂ شب سے ایک رنگی نکل پڑی ہے! گاڑیاں۔ بائیسکل۔ موٹر۔ ٹرام۔ اور پیدل: انسانی آبادی کی رَو ہے کہ چلی جارہی ہے؛ مصروفیت کا سمندر ہے کہ بَل مار رہا ہے! اعجاز غور کے ساتھ دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا؛ مگر کاروباری مخلوق کی تیز رفتاری اور ہجوم اُسکی نظر میں ایک لغو سی حرکت معلوم ہوتی تھی! ان تمام حرکات میں کوئی شعریت، کوئی مذاقِ دلچسپ، کوئی محبت کی جھلک۔ کم ازکم اعجاز کو۔ نظر نہیں آتی تھی! اور ان تمام باتوں کے معدوم ہو جانے کو وہ موت سمجھتا تھا یا مشین کی طرح چلنے والی زندگی! دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا باجے کے پاس پہنچ گیا! تپائی خالی پڑی تھی اور باجہ بند تھا! اعجاز باجے کو کھول کر تپائی پر بیٹھا اور بجانے سے پیشتر پھر تھوڑی دیر کے لیے محوِ تخیل ہوگیا!

ایک دل کا دوسرے دل کی طرف پسندیدگی کے رنگ میں کھنچنے کا نام محبت کا عمل ہے! اور دوسرے دل کے عملِ محبت سے متاثر ہو کر جذبۂ محبت میں ڈوبتے جانے کو محبت کا جوابِ موافق سمجھنا چاہیے! اسکے بالکل برعکس کشیدگی کا اثر پیدا ہونے کو نفرت سمجھیے! گویا نفرت و محبت ایک ہی اصلیت سے پیدا ہونے والی دو متضاد چیزیں ہیں: ایک دور کھینچنا چاہتی ہے، اور دوسری اتصال کی کوشش کرتی ہے! فصل و وصل دو مختلف نتیجے اسی لحاظ سے پیدا ہوتے ہیں! لیکن محبت کے عمل کا ردِّ عمل نہایت جاں کاہ؛ اور جوابِ موافق نہایت روح پرور! ہر ذرہ ایک دوسرے کو کھینچتا ہے مگر پھر بھی ہر ذرہ اپنی جداگانہ ہستی کے لیے دوسرے سے فصل کرنے پر مجبور ہے! آہ دنیا! دورنگی دنیا! متضاد قوتوں پر مبنی دنیا!! انسان۔ کیسی عجیب غریب ہستی ہے: صانعِ مطلق کی صنعت کاملہ کا

نقشِ آخریں ؛ دماغی لحاظ سے تمام کائنات کا حکمراں ! روحانی لحاظ سے فرشتہ ! مقصدِ کائنات ! فخرِ موجودات !! اور - جذبۂ محبت کے لحاظ سے ، خود ہی سب کچھ ! حقیقتِ ہستی ! عین حقیقت ! حقیقت اور صرف حقیقت !!!

مگر پھر بھی انسان - ایک معمۂ مہمل ہے : اپنی ذات تک کو قائم نہ رکھ سکنے والا ضعیف البنیان دنیا کی جاندار و بے جان اشیا کا محتاج ! ہوا و ہوس کا بندہ ! دغا بازی و نفرت کی جڑ ! کشت و خون کا حامی ! ظلم و کینہ وری کا عادی ! بے ایمان ، بے ایمان ! مجسم شیطان !!

ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کھڑکی کے پردہ کو خفیف سی جنبش دیتا ہوا اندر گھسا ، محوِ تخیل اعجاز کو گدگداتا ہوا خدا جانے باجے کے پردوں میں چھپ گیا یا اعجاز کے دل و دماغ میں اتر گیا ! اعجاز کچھ چونکا - چونکا اور ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ باجا بجانے لگا !

سبک انگلیاں پردوں پر نہایت تیزی کے ساتھ دوڑ رہی تھیں : ہارمونیم کی دلکش آواز کمرے میں گونج رہی تھی : بجاتے بجاتے بے خود ہو جانے والے اعجاز کا سُریلا گلا بھی باجے کا ساتھ دینے لگا :-

یک شبے مجنوں بخلوت گاہِ ناز + گفت "اے پروردگارِ بے نیاز !
از چہ نامم تو مجنوں کردۂ؟ + عشقِ لیلےٰ در دلم چوں کردئی؟"

آواز کا نظر نہ آنے والا فرشتہ کمرے میں گونج کر باہر تک جا رہا تھا ! دلِ پُر درد سے نکلنے والے الفاظ - ایک پرانے کشتۂ عشق کے مست کر دینے والے الفاظ - مثنوی کی مخصوص طرز میں ، دردِ دل کو سُن کیے دیتے تھے ! کمرے کے دروازے سے لگی ہوئی بس رستم خاموش کھڑی تھی - کھڑی تھی اور موسیقی کا سحر اسکے دل و دماغ کو دیوانہ بنائے دیتا تھا ! اُس نے سُنا اور اچھی طرح سُنا ! برابر سُنا ! دل کے کانوں سے سُنا !!

پھر جادو بھری آواز کمرے میں گونج رہی تھی :-

"عشقِ لیلےٰ نیست ایں کارِ منست ! * حُسنِ لیلےٰ عکسِ رخسارِ منست !"

اب مس رستم کو تاب نہ تھی۔ وہ اندر گھسی؛ پیر کی آہٹ کے ساتھ ہی اعجاز بھی مڑا: ہاجا بند تھا اور دونوں، آنکھوں کے توسّل سے ایک دوسرے کے سامنے تھے! تھوڑی دیر تک خاموشی: مس رستم کی آنکھوں کا خود بخود جھک جانا؛ اور اسکی زبان سے مشکل سے ادا ہونا "آپ نے ایسا دھوکا دینے کے بعد بھی آنے کی جرأت کی؟"

"دھوکا! پیاری نازنین! اعجاز اِس صورت کو جو اُسکے سامنے ہے دھوکا نہیں دے سکتا! وہ عرصے سے اس صورت کی پرستش کرتا ہے! وہ مس رستم میں اس صورت کو پانے سے پہلے بھی اپنی دماغی دنیا میں اسیر مرتا تھا! آہ! اعجاز کی زندگی اس صورت پر منحصر رہی ہے اور رہے گی!" اعجاز نے کھڑے ہو کر نہایت محبت بھری آواز میں جواب دیا!

"نہیں! نہیں! آپ اب بھی چلے جائیے! اور پھر نہ آیئے!!" مس رستم نے درد بھری اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اسکی حالت ناقابل ضبط ہو چلی تھی!

"پیاری نازنین! اعجاز کو نہ نکالو۔ وہ محبت کا مارا، ناقدر شناسیٔ محبت کا فریادی، اپنی زندگی سے بیزار ہے! وہ تم سے زیادہ تمھاری جیسی صورت سے متاثر ہو کر برسوں اپنی محبت کا معاوضہ نہ پلنے پر آٹھ آٹھ آنسو رویا کیا ہے! اُسکی حالت قابل رحم ہے! اسکو تم سے۔ جسکے پہلو میں خود لذت یاب درد دل ہے۔ محبت کی قدر کی امید ہے!" اعجاز جذبۂ محبت میں بھرا ہوا، دیوانہ وار کہتا رہا اور مس رستم کے قریب ہوتا گیا!

مس رستم کی آنکھیں نیچی تھیں! بدن میں خفیف سی جنبش تھی! زبان بند تھی اور وہ خاموش تھی! اعجاز اب اُسکے بالکل قریب تھا، اس کا ایک ہاتھ کمر میں حائل ہو کر مس رستم کو آغوش میں لے چکا تھا، اور دوسرا ہاتھ جھکے ہوے چہرے کو اُٹھا رہا تھا! پھر نظریں ملیں اور اعجاز کو مس رستم کی آنکھوں میں آنسو۔ شکستہ اور تشنۂ محبت دل کے جذبہ سے بننے والے دو بیش بہا موتی۔ ڈھلتے نظر آئے! اب اُسے تاب نہ تھی: حائل ہونے والے ہاتھ کی امداد سے دو بے چین دل مل گئے! دونوں سینوں میں کوئی چیز دھڑک رہی تھی، دونوں دماغوں پر کوئی شے مسلّط تھی، دونوں

دل دو کے بجائے ایک ہو جانا چاہتے تھے !!! اعجاز نے بیاختہ کہا "پیاری مہ جبیں! معاف کردو! میرے طریقت اگر تمہارا دل دکھا تو معاف کردو! عاشق نوازی کی خاطر معاف کردو! اپنے حسنِ جادو اثر کے صدقہ میں معاف کردو! اعجاز دیوانہ تھا: دیوانہ ہے: اور دیوانہ رہے گا!!"

اعجاز کا منھ جھکا، بس رستم پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی، اور دو لبوں نے کسی خوشنما دہانہ پر۔ غنچہ ناشگفتہ کی تصویر پر۔ ایک مہرِ محبت لگا دی!!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مجھے افسوس ہے کہ اس سرگذشت کا کوئی خشک منطقی۔ اخلاقی و معاشرتی۔ نتیجہ نہیں نکلتا! تاہم بعض آنکھوں کو مخربِ اخلاق ہی نظر آجائے تو غنیمت ہے!!

سلطان حیدر جوش

زباں پر جب کسی کی درد کا افسانہ آتا ہے　　ہمیں رہ رہ کے یاد اپنا دلِ دیوانہ آتا ہے
خدا جانے وہ منکر نام دل کس طرح پیش آئیں　　زباں پر اپنی آج اک حرفِ گستاخانہ آتا ہے
عدو کیا شمع کیا پروانہ کیا میں کیا مرا دل کیا　　تری محفل میں جو آتا ہے بیتابانہ آتا ہے
وہیں بے رحم سوچا ہو کچھ اس ظلم کی حد پر　　جہاں پر رحم کے قابل مرا افسانہ آتا ہے
اٹھا کر دور رکھ دوں شمع یار کس بہانے سے　　میں جل مرتا ہوں اسکے پاس جب پروانہ آتا ہے
نیا لطف آئیگا دل کی کہانی جب سنا دینگے　　سنو تو سو طرح سے مجکو یہ افسانہ آتا ہے
بتا کہتا ہے کیا اب حق میں مجھ خواروں کے اے ناصح　　نظر ابر سیہ ایک جانب میخانہ آتا ہے
پشیماں دل میں اپنے ظلم پر ہوتا ہے وہ کیا کیا　　جہاں میں بعد میرے جب مرا افسانہ آتا ہے
تمھارے پاس آیا ہوں تمہیں تعبیر دو اسکی　　دل اپنا خواب میں مجکو نظر ویرانہ آتا ہے
وہ کہتے ہیں کہ اسکو چھوڑ میرا جی نہیں لگتا　　میں کہتا ہوں مرے یاد اب مرا افسانہ آتا ہے
مرا اپنا صدق جھک جاتا ہے آگے سنگِ اسود کے
خیالِ عظمتِ سنگِ درِ جانانہ آتا ہے

صدق۔ جائسی

وداع

(سر رابندر ناتھ ٹیگور کا موضوعِ بیاں)

مل گئی رخصت مجھے جاتا ہوں میں — اے عزیزانِ کرم الوداع
نغمۂ آخریں گاتا ہوں میں — مہربانانِ معظّم الوداع

لے لو دروازے کی اپنے کنجیاں — اس مکاں سے کچھ مجھے مطلب نہیں
ہو رہا ہوں دست بردارِ جہاں — میرے دل میں کوئی خواہش اب نہیں

چاہتا ہوں تم سے سُن لینا فقط — آخری الفاظِ مہر آمیز چند
یہ تعلقہائے گوناگوں غلط — عارضی تھے نقش دل آویز چند

ایک عرصہ تک رہے ہمسایہ وار — ہو گیا تھا اس لیے کچھ اتحاد
اب سفر میں کر رہا ہوں اختیار — ہے مناسب مجھ کو کہ دو خیرباد

ہاں - ہمیشہ یہ مری حالت رہی — جو دیا اُس سے زیادہ پا لیا
ابتدا سے ایک ہی صورت رہی — جس طرح جی چاہا دل بہلا لیا

ہو گئی اب صبح دن آیا نکل — بجھ گیا - گھر میں جو تھا روشن چراغ
آ گیا طلبی میں پیغامِ اجل — میں بھی اب جاتا ہوں پا کر انفراغ

(تھانوی)

خلیفۃ المومنین منصور

بسلسلۂ الناظر ماہ فروری ۱۹۱۶ء

منصور نے جس وقت زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تھی اموی کثرت موجود تھے۔ کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ اُنکی ہزار سالہ حکومت عباسیوں میں منتقل ہو کر آگئی تھی۔ ابھی اُنکے زخم بالکل ہرے تھے۔ ممکن تھا کہ ہوا خواہان کی معاونت سے پھر اُبھر آتے اسی خیال نے منصور کو اُنکی کلی استیصال پر آمادہ کیا۔ اور حتی المقدور منصور نے ایک اموی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ لیکن ابھی امویوں کو ایک سنبھالا لینا تھا اُنکے ہاتھ سے گو خلافت سی نعمت غیر مترقبہ نکل چکی تھی اور بظاہر اس قابل بھی نہ تھے کہ مصر و شام میں امن کے ساتھ رہ سکیں مگر قدرت کو اُنکا بے خانماں ہونا منظور نہ تھا۔

عبد الملک ابن مروان کا پوتا عبد الرحمٰن ابن معاویہ جان بچا کر شام سے مصر بھاگ گیا۔ اُسے وہاں بھی صورتِ امن نظر نہ آئی تو افریقہ چلا گیا۔ اسپین کی بدنظمیاں ضرب المثل بنی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ اسکی موجودہ حالت پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر بخت نے ساعدت کی تو مروانیوں کی نئی دولت یہاں قائم ہو سکتی ہے۔ یہی خیال تھا جو اسے کشاں کشاں طلبِ معاونت کے لیے رفقاء کے پاس لے گیا چنانچہ عبد الرحمٰن نے اُنکی امداد سے ۱۳۸ھ ہجری میں اسپین فتح کرکے ایسی مستحکم سلطنت کی بنیاد ڈالی جسے عباسیوں کے بڑھتے ہوے سیلاب سے کوئی ضرر نہ پہونچ سکا۔ اور سو سال تک ملک پر مسلط رہ کر قوم و ملک کی خدمت کرتے رہے۔ اتفاق سے عبد الرحمٰن مروانی اور منصور دونوں بربری عورتوں کے بطن سے تھے اس لیے لوگ کہا کرتے تھے کہ دو بربری عورتوں کے لڑکے دنیا کی قسمت کے مالک ہوگئے ہیں۔

منصور نے استحکام سلطنت کے لیے جس قدر کوششیں کیں اُن میں ۱۴۵ھ ہجری میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جب اسکو فراغ بالی حاصل ہوئی تو اپنے فطری شوق کی طرف مائل ہوا اور اُس نے دریائے دجلہ کے کنارے ایک شہر آباد کیا جس نے بغداد کے نام سے شہرت حاصل کی۔ ابن خلدون تعمیر بغداد

کے متعلق رقمطراز ہے کہ منصور کا مستقرِ خلافت کوفہ تھا لیکن اہل کوفہ اور راوندیوں کے خیالات منصور کی طرف سے اچھے نہ تھے۔ اس لیے منصور نے کوفہ کی اقامت کو خطرناک سمجھ کر ارکینِ دولت سے مشورہ لیا تو اُنھوں نے بھی کوفہ کو دارالخلافت بنانے کی مخالفت کی۔ اور رائے دی کہ آپ اپنا نیا دارالحکومت بنائیں۔

دمشق اپنی رونق اور سرسبزی کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کا شہر اور مسلمانوں کا تختگاہ بھی تھا۔ لیکن منصور کے لیے وہاں بھی وہی خطرے موجود تھے جنکی وجہ سے وہ کوفہ کی اقامت مضر سمجھتا تھا۔ کیونکہ مروانیوں کے ہواخواہ اور عبداللہ ابن علی کے طرفدار موجود تھے۔

اس میں اختلاف ہے کہ منصور نے خود ہی سرزمین بغداد کا انتخاب کیا تھا یا معتمدانِ خلافت نے۔

صاحبِ تاریخ خمیس لکھتا ہے کہ ایک روز منصور شکار کھیلتا ہوا دریاے دجلہ کے اُس کنارہ پر جا نکلا جہاں اب بغداد ہے۔ یہ سرزمین ویران اور غیر مزروعہ تھی۔ یہاں ایک راہب کا دَیر تھا۔ منصور نے راہب کو بُلا کر اُس کا اور اُس زمین کا نام دریافت کیا۔ راہب نے کہا میرا نام تو بلاطہ ہے اور اس زمین کو داد کہتے ہیں۔ میں نے ملاحم اور اقلیدسیات میں پڑھا ہے کہ اس مقام پر آخر زمانہ میں ایک شہر آباد ہوگا۔ منصور نے یہ سُن کر حکم دیا کہ اس جگہ پر دارالخلافہ کا نقشہ کھینچا جائے۔

لیکن مورخ ابن خلدون لکھتا ہے کہ بغداد کی سرزمین کو منصور کے آدمیوں نے ذیل کے چند اسباب سے دارالخلافت کے لیے انتخاب کیا تھا:—

(۱) یہ مقام عراق میں لحاظ آب ہوا بہتر اور دلکش تھا۔

(۲) تمام عالم کی تجارت کا مرکز بن سکتا تھا کیونکہ دریاے دجلہ عراق کو شام مصر ہند چین روم افریقہ سے ملاتا ہے۔

(۳) بلحاظ وسعتِ سلطنت وہ جگہ وسط میں واقع ہوئی تھی اور وہاں سے کُل حکومت کی حفاظت مساوی طریقہ سے ہو سکتی تھی۔

(۴) راوندی کوئی شامی بغیر پل دریائے دجلہ عبور نہیں کرسکتے تھے۔

منصور نے تعمیرات بغداد کے لیے اطرافِ عالم سے مشہور معمار بلائے تھے اور اُس کے حساب کیلیے جن متدین لوگوں کو اُسکی نگاہ مردم شناس نے انتخاب کیا تھا اُن میں امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ ابن ارطاۃ تھے۔

بغداد کا ابتدائی نقشہ ریت سے کھینچا گیا تھا۔ نشان پختہ کرنے کے لیے انھیں اثرات پر بنولے جلائے گئے اسکے بعد اُسی نقشہ کے موافق بنیاد اُٹھانے کے لیے زمین کھودی گئی۔ قلعہ مستدیر دائرہ کی شکل میں بنایا گیا تھا اور قلعہ کے وسط میں قصرِ خلافت۔ منصور نے قصرِ خلافت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے۔ بسم اللہ والحمد للہ والارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔ قلعہ اور قصر دونوں کی بنیاد ابتدائً پچاس گز عریض اُٹھائی گئی تھی لیکن جب وہ سطح زمین کے محاذ میں آئی تو منصور کے حسب منشاً اُس کا آثار صرف بیس گز کا رکھا گیا۔ یہ عمارات چار سال میں طیار ہوئیں اور اُنکی طیاری میں دس لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا۔

سفاح کی حسب وصیت عیسیٰ منصور کا ولیعہد سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے دربار میں اُسکی بہت عزت تھی۔ منصور کے داہنی جانب عیسیٰ بیٹھتا اور بائیں جانب مہدی۔

سنہ ۱۴۷ ہجری میں منصور نے مہدی کو اپنا ولیعہد بنانا چاہا لیکن عیسیٰ نے اپنے خلع سے انکار کردیا۔ منصور کی خوددار طبیعت ایسی نہ تھی کہ جو خلافِ طبع باتوں کو ضبط یا نظرانداز کرسکتی۔ اُسنے عیسیٰ کو بائیں جانب بیٹھنے کا حکم دیا اور مہدی کو اُسکی جگہ پر (ابن اثیر نے اس واقعہ کو بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ عیسیٰ منصور کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اُس نے اپنے بوتے کے موافق گو بہت مخالفت کی، لیکن منصور کے ارادہ کو تبدیل نہ کرسکا۔

مہدی کے ولیعہد بنانے کے لیے منصور اُسے معذور ہوجانے پر مجبور کررہا تھا جب عیسیٰ کو اپنی ناکامیابی کا پورا یقین ہوگیا تو طوعاً کرہاً اپنی تمام خدمتوں کو نظرانداز کرکے معزول ہوگیا اور مہدی کی جانشینی تسلیم کرلی۔

جب بغداد کی کل عمارتیں طیار ہوگئیں تو بعض مصالح ملکی کی وجہ سے ارکین حکومت سے حسب ایماء دریاے دجلہ کے دوسرے کنارے پر ایک شہر رصافہ آباد کیا۔ اور ولیعہد خلافت مہدی کے لیے قصر شاہی اور ارکین حکومت کے محل بنائے گئے۔ چونکہ بغداد دارالخلافت ہونے کی وجہ سے معمور ہوچکا تھا اس لیے لوگوں کی توجہ رصافہ کی آبادی کی طرف مبذول ہوئی اور ولیعہد سلطنت کے مستقر ہونے کی حیثیت سے رصافہ کی شان بڑھتی گئی اور ۱۵۱ھ ہجری میں شہرپناہ کی دیوار بنائی گئی۔

جب بغداد آباد ہوگیا تو منصور نے علماے وقت میں سے امام ابوحنیفہ نعمان ابن ثابت کو قضاء بغداد کے لیے انتخاب کرکے طلب کیا۔ امام صاحب خلیفہ کے حسب الطلب بغداد آئے لیکن جب منصور نے ربیع ابن حاجب (امام صاحب سے مخاطب ہوکر)

دیکھیے امیرالمومنین قسم کھا چکے ہیں آپ کو منظور کرلینا چاہیے۔

امام صاحب۔ امیرالمومنین میرے مقابل میں آسانی سے قسم کا کفارہ دے سکتے ہیں۔"

(اس کا یہ مطلب تھا کہ امیرالمومنین کو قسم کھاکر دباؤ نہ ڈالنا چاہیے کیونکہ وہ کفارۂ یمین ادا کرنے پر قادر ہیں)

اس مکالمہ سے زیادہ لطیف وہ مکالمہ ہے کہ جسے قاضی ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں نقل کیا ہے۔

منصور (امام صاحب سے مخاطب ہوکر) میں تمھیں بغداد کا چیف جسٹس بنانا چاہتا ہوں۔

امام صاحب۔ اس بارگراں کا متحمل اُسے بنائیے جو خداترس ہو اور جب میں مومن الرضا نہیں ہوں تو مامون الغضب کیونکر ہوسکتا ہوں۔ بمقابلہ قضاء کے میں ایسے ناجائز امر کا ارتکاب کرنا بہتر سمجھتا ہوں جسکی پاداش میں خلیفہ دریاے فرات میں میرے غرق کردینے کا حکم دیں اور سچ یہ ہے کہ میں اپنی ذات میں قضا کی صلاحیت نہیں پاتا اور اسی سبب سے مجھے انکار ہے۔

منصور۔ تم غلط کہتے ہو قضاء کے ہر وقت سزاوار ہو۔

امام صاحب۔ جھوٹا شخص قضا کے لائق نہیں ہوتا اور چونکہ میں بھی جھوٹا ہوں اس لیے میں بھی عہدۂ قضا کے لائق نہیں ہوں۔

جب امام صاحب انکار پر اڑے رہے تو منصور نے فرمانِ خلافت کی حکم عدولی کا جرم قائم کرکے سزائے قید کا حکم صادر کیا۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے رہائی پائی یا نہیں۔ مورخ ابن خلکان اور صاحب تاریخ خمیس رقم طراز ہیں کہ منصور کے ایماء سے امام صاحب کو بحالتِ قید زہر دے دیا گیا[1]۔ لیکن انھیں مورخین کی تحریر سے اس قول کی تردید بھی ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے پھر قضا قبول کرلی اور ۱۵۰ھ میں رہائی پاکر تین چار روز تک صافہ کے قاضی رہے۔ اس عرصہ میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ جو آپ کی ایک کرامت کا باعث خیال کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے دو ہی تین دن بعد ۱۵۰ھ ہجری میں آپ نے دنیائے ناپائدار سے انتقال فرمایا۔

منصور کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح ملک میں امن قائم ہو اور رات دن کی مصائب آرائیوں سے نجات ملے۔ لیکن امن نہ ہوا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ کسی حکومت میں امن قائم نہ رہنے کا باعث خود حکمرانِ سلطنت ہی ہوا کرتا ہے۔ اس کلیہ کی بنا پر منصور پر بھی یہی فرد قرارداد جرم قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں منصور بے قصور ہے۔ اُس نے امن عام قائم کرنے کے لیے مفسدین کا قلع قمع بھی کیا۔ لیکن چونکہ دولتِ عباسیہ نوخیز حکومت تھی اس لیے بغاوتوں کا خاتمہ نہ ہوتا تھا نہ ہوا۔ اور خود منصور کو بھی اسکی شکایت نہ رہی۔

عبد الرحمن افریقی ایام طالب علمی سے منصور کے ہمدم و ہم نفس تھے۔ جب منصور خلیفہ ہوا

[1] امام صاحب کو زہر دینے کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ جب منصور کی دراز دستی نے ملک کے امن عام کو مٹا دیا اور ہر طرف منصور کی شکایتیں اور مظالم گنے جانے لگے تو آپ نے بھی عبد الحمید ابن عجلانی کی تائید میں منصور پر جواز خروج کا فتویٰ دے دیا تھا۔ چونکہ آپ مقید تھے اسلیے آپکو زہر دیدیا گیا۔ عبد الحمید ابن عجلانی وغیرہ نے محمد اور ابراہیم علویوں سے بغاوت کرا دی جسکی مدافعت کیلئے عیسیٰ کا دربار سے تقرر کیا گیا۔ عیسیٰ نے پہونچکر علویوں کو شکست دی اور منصور نے بہت سے علویوں کو قتل کرا دیا۔

تو وہ اس سے ملنے کے لیے آئے۔ ایک روز اثنائے گفتگو میں منصور نے اُن سے دریافت کیا کہ ہماری حکومت مروانیوں کے مقابلہ میں کیسی خیال کی جاتی ہے۔ اُنھوں نے کہا اُنکی حکومت سے زیادہ تمھارے دَور خلافت میں ظلم ہو رہے ہیں۔ منصور نے کہا اعوان حکومت اچھے نہ ملنے سے مجبور ہوں۔ عبد الرحمٰن نے کہا عمر بن عبد العزیز کہتے تھے :۔ "بادشاہ کی مثال ایک بازار کی ہے جو چیز بازار میں آئیگی وہی بک سکتی ہے اگر بادشاہ نیک مزاج ہے تو اعیان بھی نیک ہو سکتے ہیں اور اگر بادشاہ فاجر ہے تو وہ بھی فاجر ہوں گے" منصور نے گردن جھکالی۔ اور چونکہ انصاف پرست تھا۔ اس لیے اُسے اپنے رفیق کی بات سے ملال بھی نہیں ہوا۔

منصور کی انصاف پسندی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ جن سے ناظرین اُسکے تحمل عدل شرافت طبع کا خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ منصور پر قتل خلائق کا بہت بڑا جرم عائد کیا جاتا ہے بے شک اُس نے سفاح سے زیادہ سفاکی کی۔ اُسکے زمانہ میں بکثرت بغاوتیں ہوئیں اور ہر بغاوت میں ہزاروں پامال ہوگئے۔ اسکے علاوہ آپس کی منافرت نے بھی قتل وغارت میں حصہ لیا۔

منصور کی اسی سفاکی کی وجہ سے امام مالک ابو حنیفہ عبد الحمید جعفی امام سفیان ثوری وغیرہ نے باختلافِ اوقات خروج کے فتوے دیے اور امام جعفی اور امام مالک نے صرف فتووں پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ علویوں کو مقابلہ پر آمادہ کر دیا۔[1]

---

[1] عرصہ ہوا کہ ایک رسالہ ہماری نظر سے گزرا تھا اُسمیں ہندوستان کے مایۂ ناز مورخ نے تمام سادات کو آمادہ فساد اور عام فسادات کا منبع بتلاتے ہوئے تزک جہانگیری سے استدلال کر کے دکھلایا تھا کہ جہانگیر نے بھی اپنے جانشینوں کو سادات کی طرف سے پرحذر رہنے کی تاکید کی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ بہتان عظیم ہے۔ دنیا کی پوری تاریخ گو تاریکی میں ہے لیکن تاریخ اسلام روشن ہے۔ عربی ذخیرہ تاریخ کا ایک ایک ورق ایک ایک صفحہ ایک ایک سطر بغور پڑھیے لیکن کہیں سے اس کا ثبوت نہیں ہوتا ہے کہ علویوں نے ہوس حکومت میں خود بخود تحریک یا بغاوت کی۔ اس قسم کے فتنے ہمیشہ عوام کی تحریک سے پیدا ہوئے منصور کے عہد حکومت میں علویوں کی بغاوت علما کی تحریک سے ہوئی اور عوام نے اپنے مفادِ قومی پر نظر کر کے ساتھ دیا تھا۔ ورنہ کبھی محمد بن حنفیہ کی خلافت کی خواہش نہ کی اور نہ اُنکے پسماندوں میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوا۔ بعض لوگ کہیں گے صفحہ

علما اور ہمدرد گروہ کی تحریک معمولی نہ تھی اُس نے علویوں کے دل ودماغ پر قابو حاصل کر کے ہنگامۂ فساد قائم کر دیا۔

منصور بانیان بغاوت سے کیونکر چشم پوشی کر سکتا تھا، اُس نے عیسیٰ کو مقابلہ میں بھیجا عیسیٰ اُن علماء کے علاوہ جنکی تحریک سے بغاوت پھیلی تھی، اہل بیت کے اُس حصہ کو بھی جسکے متعلق یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید خاندانی وجاہت کی وجہ سے بغاوت کریں، قتل کرا دیا۔ علویوں اور عباسیوں میں اسی واقعہ سے تفرقہ پڑ گیا اور اُس یکجہتی کا خاتمہ ہو گیا جو سالہا سال سے پائی جاتی تھی۔ اگر منصور اسوقت عفو سے کام لے کر علویوں کی روک تھام کرتا تو عوام الناس کو آئندہ بغاوت کے حوصلے نہ ہوتے۔ منصور کا خیال تھا کہ اس کشت وخون سے علویوں کے ارادے پست ہو جائینگے۔ اور آئندہ کبھی انھیں خلافت کا حوصلہ نہ ہوگا۔ لیکن یہ اُسکی غلطی تھی۔ اس واقعہ سے پہلے اُسے صرف امویوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا اب علویوں سے بھی لڑائی مول لے لی۔ ناچار منصور نے عفوِ قصور کی اخلاقی دفعہ اپنے قانونِ سیاست سے مٹا دی۔ اور ہر گناہ کی سزا قتل ہی تجویز کی۔

ایک دفعہ عبدالصمد ابن علی نے اُس سے شکایت کی کہ اس پالیسی سے انصاف کا خون ہو رہا ہے اور رعایا میں بددلی پھیل رہی ہے۔ تو اُس نے کہا مروانیوں کے واقعاتِ جنگ تازہ ہیں اور علوی مقابلہ کے لیے مستعد۔ ایسی قوم جس نے ہمیں کل بازاری فرقہ کی صورت میں دیکھا تھا آج خلیفۂ وقت دیکھ رہی ہے اُن میں ہمارا رعب اُسوقت تک نہیں قائم ہو سکتا جب تک ہم عفو کے نام کو بھی بھول نہ جائیں۔

بااینہمہ اُسکے عفو کے کارنامے بھی بکثرت ہیں۔ اُس نے بزرگانِ قوم کی سفارش۔ قیدیوں کی معذرت۔ اور اُنکی قابلیت علمی پر نظر کر کے اُن کے قصور معاف کر دیے۔

صہ مصلحت تو یہی تھی کہ یہ خاموشی کنج عافیت میں بیٹھے رہتے لڑائی کے اسٹیج پر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اس کا جواب ظاہر فرض کر لو تنہا انسان ایک دو آدمیوں کے اصرار سے متاثر نہ ہو لیکن جب قوم کے مقدس علما اور عوام سب ہی یک زبان ہو کر تحریک کریں تو ایک انفرادی قوت مجموعی طاقت کا کیونکر مقابلہ کر سکتی ہے۔

مبارک ابن فضالہ اپنے وقت کے جید عالِم تھے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ منصور کے دربار میں تھا کہ منصور نے ایک مجرم کے قتل کا حکم دیا۔ میں نے منصور سے کہا امیرالمومنین میں نے حسن بصری سے سُنا ہے کہ نبیِ اکرم علیہ السّلام فرماتے تھے کہ میدانِ حشر میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے منادی ہوگی کہ وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن سے خدا نے انعام کا وعدہ فرمایا ہے۔ تو قصور معاف کرنے والے کھڑے ہو جائیں گے۔" منصور میری مراد سمجھ گیا اور اُس قیدی کا قصور معاف کر دیا۔

ایک بار ایک اور قیدی حاضر کیا گیا تو اُس نے منصور سے کہا امیرالمومنین بدلہ لینا عدل ہے اور اُس سے درگذر کرنا افضل ہے۔ بخدا ہم نہیں چاہتے کہ آپ ایک معمولی چیز اختیار کر کے اعلیٰ رتبہ حاصل نہ کریں۔ یہ سُن کر منصور نے رہا کر دیا۔

عربوں کی دیدہ دلیری اور بیباکی مشہور ہے۔ سچ بات کے قدر دان ہیں اور اپنی صداقت شعاری پر ناز کرتے ہیں۔ جس طرح اُنکی سیفِ بُرّاں میدان میں اپنے جوہر دکھانے میں نہیں رُکتی ایسے ہی اُنکے طبائع سچ بات کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ جب منصور مُلکِ شام میں گیا تو اُسنے ایک بدوی (دہقانی عرب) کو بلا کر کہا کہ "خدا نے ہماری حکومت کی برکت سے مُلکِ شام کو طاعون سے پاک کر دیا۔" چونکہ منصور کے عہدِ حکومت میں عمدہ خُرما بازار میں نہیں آتا تھا اور اوزان بھی گھٹ گئے تھے۔ اس لیے اُس نے برجستہ یہ جواب دیا کہ "امیرالمومنین یہ بات نہیں ہے خدا کو منظور نہ تھا کہ تمھاری حکومت کے ردی خرمہ اور کمی پیمانہ کے ساتھ طاعون بھی باقی رہے۔" منصور کو اُسکے جواب دینے کا کچھ بھی ملال نہ ہُوا اور اُسکی جرأت کی قدر دانی میں چند ہزار درھم دے کر رخصت کیا۔

یہ ہے صداقت شعاری اور آزادیِ رائے۔ جس کا زمانہ نے یا تو خاتمہ ہی کر دیا اگر کہیں اس کا وجود مل سکتا ہے تو اُنھیں صحرا نشیں عربوں میں۔ ممالکِ متمدنہ گو بزعم خود ماتحت رعایا کی آزادی کے ترنم سرا ہیں۔ لیکن سچی آزادی کا اُسی وقت اندازہ ہوتا ہے جب رعایا کی آواز

سلطنت کی پالیسی کے برخلاف بلند ہوتی ہے اور نکتہ چینی کے پہلو میں حکومت اپنی غلط روی پر مطلع کی جاتی ہے اور اُسکے صلہ میں سزائے قید اور جلاوطنی کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

جب منصور کسی قدر اغیار و اجانب کی مدافعت سے فارغ ہوا تو اُسکی جدت پسند طبیعت اصلاح معاشرت کی طرف متوجہ ہوئی اور معاشرت میں بھی بہت سی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہو۔

ملبوسات میں ٹوپی کی نسبت حکم دیا کہ لوگ نرکل کی لانبی ٹوپیاں بنا کر پہنیں۔ ابودلا نے اس حکم کی یادگار میں دو شعر کہے جو قیامت تک باقی رہیں گے:۔

وکنا نرجی من امام نایادہ	فزاد الامام المصطفٰی فی القلانس
ہمیں خلیفہ سے زیادتی کی امید تھی	تو اُس برگزیدہ امام نے ٹوپی میں اضافہ کیا
تراہا علٰی ہام الرجال کانہا	دنان الیہود جللت بالبرانس
تم اُسے مردوں کے سروں پر دیکھو گے کہ گویا	یہودیوں کے

منصور کی دلی خواہش تھی کہ ملک میں امن قائم ہو اور عدالت کے چشمے کُل سلطنت کو سیراب کریں۔ ججوں کو سخت تاکید تھی کہ قانون شرع کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کریں۔ منصور کی خوش قسمتی سمجھیے یا اتفاق وقت۔ اُسے ایسے جج ملے جو ہر طرح منصف مزاج و نیک سیرت تھے۔ اور جب منصور پر رعایا کی طرف سے مقدمات دائر ہوتے تو خلیفہ کے خلاف فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد رہتے ہوتے۔ ذیل کے وقائع اسکی تصدیق کرتے ہیں:۔

قاضی سوار ابن عبداللہ بصرہ کے قاضی تھے۔ اُنکے اجلاس میں ایک اراضی کا مقدمہ دائر ہوا۔ جس میں مدعی نے ایک تاجر پر غصب کا دعوٰے کیا تھا۔ منصور نے قاضی سوار کو لکھا کہ آپ فلاں مقدمہ میں زمین مدعی کو دلوا دیجیے۔ قاضی سوار نے جواب میں لکھا کہ گواہوں نے تاجر کی زمین ثابت کر دی ہے۔ شرعاً میں اُسکے قبضہ سے نہیں نکال سکتا۔ اگر یہ زمین دراصل مدعی کی ہے تو اُسے گواہ پیش کرنے چاہییں۔ منصور نے پھر لکھا کہ آپ کو زمین مدعی کو دلوانی ہوگی۔

قاضی سوار نے جواب میں لکھا کہ خدا کی قسم میں تاجر سے وہ زمین ظلماً علیحدہ نہیں کر سکتا۔ منصور کے پاس سوار کا جواب پہونچا تو اُس نے کہا واللہ میں نے ظلم کرنا چاہا تھا لیکن میرے قاضی مجھے حق کی طرف ہی مائل کرتے ہیں۔

قاضی سوار کا ایک اور دلچسپ قصہ علامہ سیوطی نے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی نے منصور سے قاضی سوار کی بُرائی کی۔ منصور نے قاضی سوار کو دربار میں طلب کیا۔ جب وہ آئے تو دربار میں منصور کو چھینک آگئی۔ قاعدۂ شرعی کے موافق قاضی صاحب نے یرحمک اللہ نہیں کہا۔ منصور نے پوچھا آپ نے یرحمک اللہ کیوں نہیں کہا؟ قاضی سوار نے جواب دیا کہ آپ نے الحمد للہ نہیں کہا تھا۔ اسپر منصور نے کہا الحمد للہ میں نے دل میں کہا تھا۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں نے بھی دل میں یرحمک اللہ کہہ لیا تھا۔ منصور کو قاضی سوار کی دلیرانہ گفتگو پسند آئی اور انعام دے کر بحال کیا۔

منصور کا ایک اور قصہ علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ جب منصور مدینہ گیا تو اُس نے اونٹ والوں کو پوری مزدوری نہ دی۔ ساربانوں نے منصور پر محمد ابن عمران قاضی مدینہ کے اجلاس میں مقدمہ دائر کیا۔ قاضی نے ابن نمر سے کہا تم منصور کے نام سمن لکھو۔ انھوں نے اولاً معذرت کی لیکن محمد نے اس قدر مجبور کیا کہ اُنھیں تعمیل کرنی ہی پڑی۔ جب وہ لکھ چکے تو قاضی نے اُن سے کہا تمھیں منصور کے پاس اسے لے جاؤ۔ ابن نمر اُسے لیکر وزیر ربیع کے پاس گئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ ربیع نے اُسے بارگاہِ خلافت میں پیش کیا تو منصور نے کہا تم اعلان کردو کہ کل میں مدعا علیہ بن کر عدالت میں جاؤں گا کوئی میرے ساتھ نہ چلے۔ دوسرے روز منصور اور ربیع دونوں دار القضاۃ میں آئے۔ قاضی محمد ابن عمران نے احترام نہ کیا۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو قاضی نے قانون شرعی کے موافق مدعیوں کو ڈگری دی اور مدعا علیہ منصور کو حکم دیا۔ جب قاضی محمد ابن عمران فیصلہ کرچکے تو منصور نے اُن سے کہا "جزاک اللہ احسن الجزاء" آپ کو بیت المال سے ایک لاکھ درہم دینے کا میں نے حکم دے دیا ہے۔

خلفائے دولتِ عباسیہ کی فہرست میں رشید، مامون، معتصم کے نام سب سے زیادہ روشن ہیں

لیکن اگر ہارون الرشید اور مامون علم پروری اور قدردانی میں ضرب المثل ہیں تو منصور بھی اُن سے کم نہیں رہا۔ اگر انھوں نے علوم عقلیہ کو عربی لباس پہنا کر مسلمانوں پر احسان کیا تو منصور نے تدوین حدیث۔ فقہ۔ تفسیر میں حصہ لیا۔

ذیل میں اُن بزرگان امت کے نام لکھے جاتے ہیں جن اصحاب نے منصور کے زمانۂ خلافت میں علوم کی تدوین کی:۔

نام	مقام	فن	نام	مقام	فن
امام ابوحنیفہ	کوفہ	حدیث و فقہ	حماد ابن سلمہ	بصرہ	حدیث
ابن جریج	مکہ	حدیث	معمر	یمن	"
امام مالک	مدینہ	"	امام سفیان ثوری	کوفہ	"
امام اوزاعی	شام	"	ابن ابی اسحٰق		مغازی
ابن ابی عروبہ	بصرہ	"			

ان کے بعد ہی ابن وہب۔ لیث ابن سعد۔ ابویوسف۔ ابن مبارک۔ ہشام جیسے باکمال اصحاب کو زمانہ نے پیدا کر دیا۔ جن کے نام صفحۂ عالم پر بقائے اسلام کے ساتھ موجود رہیں گے۔ انھیں کے نقش قدم پر بخاری اور ابوداود سجستانی۔ اسحٰق ابن راہویہ۔ ترمذی وغیرہ چلے۔ اور اگر بفرض یہ لوگ نہ ہوتے تو متاخرین کا وجود اس قدر سودمند نہ ہوتا۔

منصور ادیب بھی تھا اور اُسکی شاعری نکات اور اخلاقی تعلیم سے لبریز ہوتی تھی۔ اُسکی زبان سے ادب کے متعلق جو لفظ نکلتا وہ عالمانہ پہلو لیے ہوے ہوتا تھا۔ افسوس ہے اُس کا کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے۔ چند شعر ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں یہاں بھی دو شعر نقل کرتے ہیں جن سے منصور کی شعری قابلیت اور سیاسی قوت کا پتہ چلتا ہے:۔

اذا کنت ذرائے فکن ذا عزیمۃ   فان فسادالرأے ان تترددا

اگر تم صاحب رای ہو تو مستقل ارادے بھی ہو   کیونکہ رائے کا فساد یہی تردد کرتا ہے

ولا تقبل الا عداء بید ما تقدر ہ وبادرہم ان یملکوا ومثلہا عذا

جب تم دشمن پر قابو پاؤ تو اُسے مہلت نہ دو اور تم مبادرت کرو تاکہ وہ کہیں ایسا موقع نہ پائیں

منصور نے ذیل کی نصیحت اپنے لڑکے مہدی کو کی تھی اس سے اُس کی بلند خیالی اور اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

یا ابا عبد اللہ الخلیفۃ لا یصلحہ الا التقوٰی والسلطان لا یصلحہ الا الطاعۃ والرعیۃ لا یصلحہا الا العدل واولی الناس بالعفو اقدرہم علی العقوبۃ وانقص الناس عقلاً من ظلم من ہو دونہ لا تبرمن امراً حتی تفکر فیہ فان فکرۃ العاقل مرأتہ تریہ قبحہ وحسنہ ای بنی استدم النعمۃ بالشکر والمقدرۃ بالعفو والنصر بالتواضع والرحمۃ للناس۔

(ترجمہ) اے ابو عبد اللہ خلیفہ کے لائق حال تقوےٰ ہے اور سلطان کو نہیں درست کرتا ہے مگر طاعتِ پروردگار۔ اور رعیت کی صلاحیت کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اور بہتر لوگوں کا عفو کے ساتھ زیادہ قادر ہے اُن پر اور کم عقل لوگوں کا وہ ہے جو اپنے زیردستوں پر ظلم کرتا ہے۔ نہ کرو کوئی کام مگر پہلے اُس میں غور کر لو اس واسطے کہ عاقل کی فکر اس کے لیے آئینہ ہے بُرا بھلا دکھا دیتی ہے۔

منصور نے جو کچھ کہا وہ ایک والیِ ملک کے لیے لازمۂ زندگی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے اصولِ سلطنت اور اصولِ سیاست کا انھیں پر مدار ہے۔ رعایا کو بادشاہ سے اُسوقت تک الفت نہیں ہو سکتی جب تک رعایا کے ساتھ ارتباط نہ پیدا کرے۔

جن اربابِ بصیرت نے تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ منصور کے نصائح کی اہمیت تسلیم کررہے ہیں۔ بہت سی حکومتیں صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئیں کہ سلاطین نے اصولِ رعایا پروری کو نظر انداز کر دیا تھا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تھے تو اور نصائح کے ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ دار الخلافت کی طرح اپنے بیت الحکومت پر دربان نہ مقرر کرنا اور بیت المال سے اپنے حق سے زیادہ نہ لینا۔

کہاں ہیں حریت کے شیدائی اور مساوات بین الاقوام کے دل ودماغ۔ اگر حقیقی مساوات

اور سچی حریت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اسلامی تاریخ پڑھیں اور اسلام ہی میں اُسے ڈھونڈھیں۔ حریت اور مساوات کی جتنی آوازیں آج کل بلند ہو رہی ہیں در حقیقت وہ صرف خوش کن ہیں۔ یورپ کے دستِ تطاول سے ایشیا کو حریت کی امید رکھنی فضول بلکہ ایک حد تک ہزیان ہے۔

۸۵۱ھ ہجری میں منصور مکہ مکرمہ کا حج کے غرض سے سفر کر رہا تھا کہ راستہ میں بیمار ہوا اور چند روز بیمار رہ کر وفات پائی۔ ایک شاعر نے مرثیہ میں ذیل کے دو شعر کہے

قفل الحجیج وخلفوا ابن محمد — رہنا بمکۃ فی الصریح الملحد

اشہد و مناسکم کلھا واما ھم — تحت الصفائح محرما لم یشہد

مولوی ابو الحسن مرحوم

بتِ کافر ادا دل لیتے ہیں ایمان لیتے ہیں
ستم یہ سب سے بڑھ کر ہے کہ آخر جان لیتے ہیں

اُٹھا لیتے ہیں اکثر فائدہ ساقی کی مستی سے
خبر ہوتا نہیں دامن میں ہم مے چھان لیتے ہیں

اجل کمبخت کے ممنونِ منت اپنے دشمن ہوں
کہ ہم سر پہ تری تلوار کا احسان لیتے ہیں

دکھاتا ہے مقدر لطف کیا کیا مرنے والوں کو
نگاہِ التفات آمیز سے وہ جان لیتے ہیں

عیادت کو وہ آئیں تو سہی۔ کہدوں میں جو کچھ ہو
کہ تیرے وصل کے ارمان میری جان لیتے ہیں

زمینِ گور کی قیمت ہے ہفت اقلیم سے بڑھ کر
سلاطینِ جہاں بھی دیکھے اپنی جان لیتے ہیں

صفائے قلب کی وہ مے دوا ہے کوئی کیا جانے
جسے ہم دامنِ پیر مغاں میں چھان لیتے ہیں

نہ پوچھو قصۂ طولِ ستم ظالم حسینوں کا
اُسے تا حشر تڑپاتے ہیں جسکی جان لیتے ہیں

بھرا ہے سحر اندازِ بیانِ شوق میں ایسا
کہ وہ بھی مسکرا کر بات میری مان لیتے ہیں

ابھی سن کم ہے اُسکا شکل بھولی وضع سادی ہے
مگر انداز ایسے ہیں کہ سب کی مان لیتے ہیں

فضاؔ چھریاں لگاتے ہیں وہ دلپر دستِ نازک سے
پڑے بیدرد ہیں دے دے کے چرکے جان لیتے ہیں

شیخ محمد علی جان فضا

امین آباد پارک لکھنؤ

لا شرابِ ارغواں اے شاہدِ باغِ جہاں
طائرِ دل کی سنیں مستی میں آ کر داستاں

مرحبا اے صانعِ نقش و نگارِ جاوداں
حبذا اے انجمن پیرا اے بزمِ کُن فکاں

بارک اللہ پارک کا منظر ہے رشکِ آسماں
ہر روش سے جسکے ظاہر ہے بہارِ گلستاں

دیکھکر باغِ جہاں افروز کا عالم نیا
بندھ گیا اللہ کی قدرت کا آنکھوں میں سماں

واہ ری صنعت کیا گلزار جنت کو بھی مات
شرم سے غوّاص ہے پانی میں عکسِ آسماں

سرو نے زیبِ بدن کی سبز مخمل کی قبا
سبزۂ دلکش نے رکھی ہے زمرد کی دُکاں

ہیں ستارے یا عروسانِ چمن ہیں محوِ سیر
کیوں نہ لائے پھول کشتی میں لگا کر آسماں

ہیں مہیا جس جگہ سامانِ راحت بیشمار
ساقی و مطرب گلِ تر سبزۂ و آبِ رواں

بے در و دیوار میں لکھوں یہ نقشِ دلفریب
کلکِ صناعِ ازل نے کی ہیں رنگ آمیزیاں

جلوۂ دیر و حرم نظر میں دونوں ایک ہیں
گونجتی ہے کانوں میں آوازِ ناقوس و اذاں

مائلِ پروانہ ہے مرغِ دلِ خلوت پذیر
دیکھکر شام و سحر گلزار کی نیرنگیاں

گرم بازارِ تجارت ہے یہاں گو رات دن
مفت میں حاصل ہے لیکن لطفِ سیرِ بوستاں

جمع ہوتے ہیں خریدار اور تاجر جوق جوق
شہد کا چھتہ بنا لیتی ہیں جیسے مکھیاں

گفتگو میں ہے جو اُردوئے معلّٰی کا چلن
نغمہ سنجانِ چمن ہیں بلبلِ ہندوستاں

اک مرقع ہے جہاں کا یہ فضائے باغ بھی
خود مصوّر جسکا ہے صنعت طرازِ کن فکاں

کھنچ گئی تصویر گویا یہ فضائے دہر کی
آفریں اے شوخیِ رنگِ بہارِ بوستاں

غور سے دیکھو تو کھلتا ہے رازِ بزمِ دہر
جلوۂ فردوس منظر پہ ہے جادو کا گماں

اسلیے اے طائرانِ نغمہ سنج ہوش و عقل
عبرت آموزِ چمن ہے عندلیبِ خوش بیاں

یہ چمن یوں ہی رہیگا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بول کر اُڑ جائینگے سب بولیاں

[illegible]

ہاجرہ کی کامیابی

(مسلسلۂ الناظر ماہ مارچ ۱۹۱۶ء)

عزیزی مسٹر انیس احمد عباسی اس سال بی اے کے امتحان میں شریک ہیں اور اس وجہ سے اُنکا خیال تھا کہ گذشتہ دو مہینے میں اُنکو امتحان کی تیاری میں شغف رہنے کی وجہ سے "ہاجرہ کی کامیابی" کا سلسلہ منقطع ہو جائیگا۔ اسی بنا پر مارچ نمبر میں جو ٹکڑا اس فسانہ کا شایع ہوا ہے اُسکے شروع میں جو نوٹ اُنھوں نے لکھا تھا اسمیں اپنی عدیم الفرصتی کا عذر کرکے ناظرین الناظر سے اتنے دنوں کی رخصت چاہی تھی مگر یہ ٹکڑا لحاظ حجم کے اتنا بڑا تھا کہ بیک دفعہ اُسکی اشاعت کیجاتی تو الناظر کے نصف سے زیادہ صفحات اُسی کے نذر کرنا پڑتے۔ پھر انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ اور اُسپر ہمارے نوٹ نے گزشتہ مہینہ میں اتنی جگہ لے لی کہ حصۂ مضامین کا حجم اور بھی تھوڑا ہوگیا۔ لہذا ہمنے عزیز موصوف کی اجازت سے اس ٹکڑے کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ مارچ میں چھپ چکا ہے دوسرا اب ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے اور تیسرا حصہ مئی نمبر میں شایع ہو سکے گا۔ شرکت امتحان کی غرض سے الہ آباد جانے سے قبل اتفاق سے صاحب مضمون کو کچھ مہلت مل گئی تو اُنھوں نے ایک حصہ اور لکھکر دیدیا جو انشاء اللہ جون نمبر میں چھپے گا۔ الناظر کی اشاعت میں اب تک جو تعویق ہوتی رہی اُسکی وجہ سے راقم مضمون نے اس قصہ کی اشاعت کا پروگرام جو اپنے ذہن میں تجویز کیا تھا وہ بدل گیا لیکن ہمیں امید ہے کہ ناظرین کی دلچسپی میں اُس سے کوئی فرق نہ آئے گا۔

ایڈیٹر

(۱۱)

نعیم اپنی شادی کے بعد سے اب تک سیتاپور نہیں آیا تھا، کیونکہ اس عرصہ میں وہ الفنسٹن کالج میں ایم اے، ایل، ایل، بی، کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ نعیم نے الہ آباد چھوڑکر بمبئی یونیورسٹی کو کیوں ترجیح دی؟ اسکے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اگر آدمی

ترقی اور نیکنامی کا طالب ہے، تو اُسے اپنے خاندان اور وطن سے دور رہنا چاہیے، جہاں ہر اچھے بُرے فعل پر اعتراض کرنے والوں کی کثرت ہوتی ہے، لیکن تعریف کرنے والوں کا ہمیشہ قحط ہوتا ہے۔ اور جہاں انسان کا صرف کھوٹا پن دیکھا جاتا ہے، اُسکے کھرے پن پر بہت کم نظر پڑتی ہے۔ اس ڈیڑھ برس کے زمانہ میں وہ ایک لڑکے کا باپ بھی ہوگیا اور بیوی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ لڑکے کے پیدا ہوتے ہی بیوی شدید بخار میں مبتلا ہوئی، اور ابھی اپنے بچہ کو جی بھر کر کھلا بھی نہ سکی تھی کہ ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا کردی گئی۔ نعیم کی خوشی سے اگرچہ اُس کی شادی نہ ہوئی تھی، تاہم اُسے بیوی سے محبت ضرور ہوگئی تھی۔ بیوی کے انتقال کے ۴ ماہ بعد وہ بمبئی سے واپس آیا، اور کچھ عرصہ ماموں کے یہاں قیام کرکے سیتاپور چلا آیا۔

نعیم کو سیتاپور آئے ہوئے تین روز ہوگئے، چوتھے روز صبح کو، جب وہ ہاجرہ کے پاس گیا، تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد، ہاجرہ نے نعیم سے کہا۔

ہاجرہ۔ نعیم بھائی۔ فاخرہ کے لیے تو جو کچھ آپ بمبئی سے لائے وہ اچھا کیا، اگرچہ جس رنج وغم کی حالت میں آپ آئے۔ اُسکے لیے کسی تحفہ تحائف کی ضرورت نہ تھی، لیکن میرے لیے جو یہ آپ ساڑھی اور رسٹ واچ (کلائی کی گھڑی) اور دوسری چیزیں لائے، انکی بالکل ضرورت نہ تھی۔

نعیم۔ ضرورت اور غیر ضرورت کا تو مجھے خیال ہی نہ تھا۔ بلکہ میں نے اپنی خوشی سے یہ چیزیں خریدیں، اور اسی امید پر تم کو دیں کہ انھیں پہن کر خوش ہوگی، یہ مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ تم کو میری چیز سے انکار ہوگا۔ ورنہ میں کبھی نہ لاتا، ہر کیف اب تو غلطی ہو چکی۔

ہاجرہ۔ توبہ، آپ میری بات کا مطلب ہی نہیں سمجھے! میں آپ کی چیزوں سے انکار نہیں کرتی، اور نہ اب میں اُنھیں واپس کرنا چاہتی ہوں، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے ان چیزوں کا کبھی شوق ہی نہیں کیا، بھلا آپ ہی بتائیے کہ کبھی آپ نے اس طرح کی چیزیں پہنے ہوئے مجھے دیکھا ہو

نعیم۔ تو کیا تمھیں اس طرح کی چیزیں پسند نہیں؟ لیکن یہ تو میں کبھی نہیں مان سکتا کہ عورت ہو کر تمھیں زیبائش اور آرائش کی چیزیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہوں۔

ہاجرہ - نہیں اس سے تو میں انکار نہیں کرتی کہ مجھے بھی یہ چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں، لیکن انکے پہننے کو دل نہیں چاہتا۔

نعیم - یہ بھی تم غلط کہتی ہو، عورت کسی حالت میں زیبایش کی چیزیں ناپسند نہیں کرتی۔

ہاجرہ - خیر، آپ کا یہ دعوے تو ہرگز صحیح نہیں۔ معاف کیجیے گا، آپ کے لیے ایم۔ اے پاس کر لینا آسان ہے، لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ آپ عورتوں کی طبیعت کا بھید دریافت کریں، اسے صرف عورت ہی خوب سمجھ سکتی ہے۔ مردوں کی عقل ہمیشہ اس سے عاری رہی ہے

نعیم - اچھا خیر یہی سہی، مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر تمھارے انکار کی کیا وجہ ہے؟

ہاجرہ - انکار تو میں نہیں کرتی لیکن مجھے ان چیزوں کے پہننے سے کچھ خوشی نہیں ہوتی اور یہ کچھ مجھی پر موقوف نہیں بلکہ میری ایسی بہت سی بدنصیب بہنیں ہیں، جنکے لیے اس قسم کی زیبایش اور آرایش کی چیزوں میں کوئی مسرت نہیں۔

نعیم - آخر اس کا کیا سبب ہے؟ کیا پریشانیاں اور تفکرات اس قسم کے نسوانی شوق کو بھی مٹا سکتے ہیں؟

ہاجرہ - نہیں، یہ بات بھی نہیں ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ عورت کسی زیبایش اور آرایش کو پسند نہیں کرتی، اگر دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

نعیم - ہاں، بے شک یہ تم سچ کہتی ہو......... (مذاق میں) اچھا ہاجرہ تم پہنو، ہم دیکھیں گے۔ (یہ کہہ کر نعیم ہنس دیا)

ہاجرہ - (مسکرا کر) اب آپ بھائی ہو کر مذاق کرتے ہیں، تو اسکی تو بات ہی دوسری ہے لیکن سچی بات تو وہی تھی، جو میں ابھی کہہ چکی ہوں۔

نعیم - پھر آخر تمھیں کوئی صورت بتاؤ۔ اب تو بیچاری فاطمہ مرحومہ (نعیم کی بیوی) بھی نہیں کہ یہ چیزیں انھیں کو پہنائی جائیں۔

نعیم یہ جملہ کہہ کر خدا معلوم ہاجرہ سے کس جواب کا متوقع تھا، اور ہاجرہ کے لیے بھی اسکا جواب دینا آسان نہ تھا، تاہم ہاجرہ نے، خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ، ترچھی نظروں سے، نعیم کو سر سے پیر تک دیکھا، اور بولی "تو کیا آپ خدا نخواستہ عمر بھر یوں ہی تھوڑی بیٹھے رہیں گے ان چیزوں کے پہننے والیاں سیکڑوں مل جائیں گی، رکھی ہوئی چیزیں کبھی کام آ ہی جاتی ہیں۔"

نعیم۔ تو دوسرے الفاظ میں اسکے وہی معنی ہوئے کہ تمھیں انکے لینے سے انکار ہے، (کسی قدر ناگواری کے ساتھ) خیر کچھ مضائقہ نہیں۔

ہاجرہ۔ نہیں، یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ میرا مطلب نہیں، اور نہ میں واپس کرتی ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ میری تمام حالت سے واقف ہو کر بھی میری بدشوقی کی شکایت کرتے ہیں اب اگر آپ صاف صاف سننا چاہتے ہیں تو سن لیجیے کہ میرا شوق خود نہیں مٹا، بلکہ مٹا دیا گیا، اور .... اچھا، بس اب اس سے زیادہ نہ پوچھیے۔

نعیم۔ یہ سب صحیح ہے، لیکن تم تو خود سمجھ دار ہو۔ تمھیں یہ سوچنا چاہیے کہ دوسروں کی وجہ سے خواہ مخواہ تم کیوں اپنی زندگی کو تلخ کر دو۔ تمھیں اچھا پہننے اور اچھا کھانے سے کوئی نہیں روک سکتا، ان باتوں میں تو کم از کم کسی کی تابعدار نہیں ہو۔

ہاجرہ۔ یہ بھی صحیح نہیں، ان باتوں میں سمجھ سے کچھ کام نہیں چلتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سمجھدار کے لیے ایسی حالت اور مصیبت ہو جاتی ہے، بیوقوف کی تو ایک ہی بات ہے کہ نہ وہ سمجھے گا اور نہ جلے گا، لیکن جو سمجھتا ہے، اُسے ایک ہی بات کا خیال نہیں ہوتا بلکہ پچاسوں طرح کی باتیں اُسکے خیال میں آتی ہیں، اور وہی اُسکے لیے کوفت ہو جاتی ہیں۔

نعیم۔ خیر، جیسی تمھاری خوشی ہو، لیکن میں اب ان چیزوں کو واپس نہیں لے سکتا، کم سے کم اتنی خوشی تو تمھیں ضرور پوری کرنا ہوگی، باقی تمھیں اختیار ہے۔

ہاجرہ۔ اس میں مجھے کوئی عذر نہیں، اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو مجھے بھی کچھ اصرار نہیں۔

اسکے بعد تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ نہ معلوم اتنی دیر ہاجرہ کن خیالات

میں غرق رہی، اور نعیم کیا سوچتا رہا۔ بہرحال اب نعیم کو بیٹھے ہوئے بہت دیر ہوگئی تھی، وہ اُٹھ بیٹھا اور ہاجرہ سے پھر کسی وقت ملنے کا وعدہ کرکے باہر چلا گیا۔

نعیم صرف دس روز کے لیے سیتاپور آیا تھا، لیکن یہاں آکر اُسے ایک مہینہ ہوگیا اب مولوی فرید الحق بھی حج کو جانے والے تھے، اور کسی کا مکان پر رہنا ضروری تھا، لیکن چونکہ نعیم ابھی اپنی تعلیم ختم نہ کرچکا تھا، اس لیے وہ مستقل قیام نہ کرسکتا تھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ نعیم کو بھی بمبئی جانا تھا، ورنہ شاید وہ زیادہ قیام کرتا۔ اگرچہ نعیم اور ہاجرہ کی ملاقاتیں اس مرتبہ دلچسپی اور لطف سے خالی نہ تھیں، تاہم طرفین کے باہمی تعلقات محبت کی اُس چاشنی سے محروم تھے، جسکی خلش دونوں اپنے دل میں محسوس کرتے تھے، لیکن اظہار کی جرأت کسی کو نہ ہوتی تھی۔ نعیم اب تک تو ہاجرہ کو ایک بہن کی نظر سے دیکھتا تھا، لیکن اب ہاجرہ کی ہر ملاقات، اسکے زاویۂ نگاہ کو کچھ نہ کچھ ضرور بدل دیتی تھی۔ وہ ہر مرتبہ کوشش کرتا تھا کہ اپنے دلی خیالات کی ترجمانی، ہاجرہ کے سامنے بند بند الفاظ میں کردے، لیکن ہاجرہ ہمیشہ بات تاڑ جاتی، اور حتی الامکان اُسے اظہار خیال کا موقع نہ دیتی، اور اُسکی بات کو گول مول کرجاتی۔ لیکن کیا ہاجرہ کو نعیم سے محبت نہیں ہوگئی تھی، اور کیا اُسے بھی وہی دقتیں پیش آتی تھیں، جو نعیم کے لیے مصیبت ہوجاتی تھیں؟ اور اگر ہاجرہ کا ساغرِ دل بھی اُسی شراب سے پُر تھا، تو بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ نعیم کے جذبات کی ٹھیس سے وہ چھلک نہ جاتا؛ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہے، کیونکہ عورت کو اپنے جذبات کے دبا دینے کی جیسی قدرت ہوتی ہے، وہ قوت مرد کو حاصل نہیں۔ عورت اور حیثیتوں سے خواہ مرد سے کمزور ہو، لیکن جذبات پر جو حکومت عورت کو فطرت نے عطا کی ہے، مرد کو وہ نصیب نہیں، اس صورت میں وہ صرف اپنے ہی جذبات پر حکومت نہیں کرتی، بلکہ ایک بڑی حد تک مرد کے جذبات بھی اُسکے قابو میں رہتے ہیں، اور مرد بالکل بے قابو ہوجاتا ہے۔

نعیم کو بمبئی جانے میں دو روز باقی رہ گئے، اور مولوی صاحب بھی اپنے اعزا سے ملنے، وطن چلے گئے، اُس روز نعیم اندر آیا، تو ہاجرہ اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی یہ غزل آہستہ آہستہ گا رہی تھی۔

"تھندی ہی کر مرا ترکِ ستم ایجاد آیا خوں بہاتا ہوا ہاتھوں سے وہ جلاد آیا"

نعیم جیسے ہی کمرہ میں داخل ہوا، تو ہاجرہ نے جلدی سے اپنی زبان روک لی۔ لڑکیاں اپنی ہجولیوں میں بہت شوق سے گاتی ہیں، لیکن مردوں کے سامنے گانے میں، خواہ وہ اپنے بھائی ہی کیوں نہ ہوں، عموماً ہچکچاتی ہیں۔ ہاجرہ اگرچہ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال تھی، لیکن وہ بھی اس نسوانی خصوصیت سے مستثنیٰ نہ تھی۔

نعیم۔ ہاجرہ، تم کون غزل گا رہی تھیں؟ اور چپ کیوں ہو گئیں؟ ..... اچھا، میں اسوقت تمھاری دلچسپی میں ہارج تو نہیں ہوا؟

ہاجرہ۔ نہیں، مجھے کچھ گانے کا شوق نہیں۔ اسوقت یونہی یہ غزل یاد آگئی، بلکہ یاد بھی یوں آئی کہ کل سائرہ ایک غزلیات کی کتاب لائی تھیں، اُسمیں سے اُنھوں نے یہ غزل گائی تھی۔

نعیم۔ یہ عذر تو تمھارا درست نہیں کہ تمھیں گانے کا شوق نہیں۔ کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ تمھیں ہمیشہ گانے کا شوق رہا، بلکہ اسی وجہ سے تم اچھا گانے لگیں۔ اور جب میں یہاں رہتا تھا، تو اکثر تمھیں گاتا سنا کرتا تھا، اب اگر تم وہی ہاجرہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تمھیں ویسا ہی گانے کا شوق نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم میری خوشی نہ کرو۔

ہاجرہ۔ سچ تو یہی ہے کہ اب میں وہ ہاجرہ ہی نہیں رہی، یہ شوق بھی کمبخت مٹا دیا گیا، میں اب اگر کوئی شوق باقی رہ گیا ہے، اور وہ بھی میری زورازوری اور زبردستی سے، تو یہی کہ کمرہ میں تنہا پڑی کتابیں دیکھا کروں، یا پھر اس سے فرصت ہو تو اپنی قسمت کو جھینکا کروں۔

نعیم۔ یہ حالت واقعی قابل افسوس ہے، لیکن یہ خیال رکھو کہ ہر وقت کتاب دیکھنا اچھا نہیں، اس سے یا تو دماغ مختل ہو جاتا ہے یا کوئی سخت بیماری اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی دلچسپی کا مشغلہ ضرور ہونا چاہیے۔ تم اگر کچھ نہیں کرسکتیں تو ایک ہارمونیم ہی منگالو، اُسی سے

طبیعت بہلا لیا کرو۔

ہاجرہ۔ ایسی چیزوں کا کبھی شوق ہی نہیں دلایا گیا، پھر بھلا اس سے مجھے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، اور میری طبیعت بھی ان باتوں کے لیے بالکل مردہ ہوگئی۔

نعیم۔ ہاجرہ یہ تمھاری سخت غلطی ہے کہ تم ہر بات میں مایوسی کے پہلو پر زیادہ غور کرتی ہو اچھا ابھی میں بمبئی سے آؤں گا تو ایک ہارمونیم ضرور لاؤں گا۔ بہر حال اسوقت تمھیں ضرور کچھ گانا چاہیے۔ شاید تمھیں غالب کی وہ غزل یاد ہو، "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے....." مجھے یاد ہے کہ شاید تم نے کبھی یہ غزل گائی تھی۔

ہاجرہ۔ اب تو مجھے غالب کی کوئی غزل یاد نہیں (بات ٹالنے کی غرض سے) اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ غالب کا کلام کیوں اس قدر پسند کرتے ہیں۔

نعیم۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ غالب کے کلام میں تصنع اور جھوٹھ بہت ہی کم ہوتا ہے، یعنی اُنکی شاعری نیچرل شاعری ہوتی ہے، جس میں صرف وہی باتیں ہوتی ہیں جو فطرتاً ممکن ہیں، نہ کہ وہ، جو خواب میں بھی ممکن نہیں۔ مجھے پُرانے مذاق کی شاعری بالکل پسند نہیں، مثلاً یہاں کے شعرا نے مبالغہ کی بھی وہ حد کردی کہ الٰہی توبہ؛ کوئی صاحب چاہِ زنخداں کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، کسی کے یہاں نزاکت کا یہ عالم ہے کہ غنچے کے چٹکنے سے اُنکے سر میں دھمک پیدا ہوتی ہے، ایک صاحب ہیں کہ اُنکی عقل معشوق کی کمر کی جستجو میں پھرتی رہی، لیکن آج تک اُسکا کہیں پتہ نہ چلا، اور سچ یہ ہے کہ پتہ چلے تو کیونکر، جب اُس قد و قامت اور شکل وصورت کا کوئی انسان دنیا جہان میں ہو بھی۔ پھر ایک دوسرے صاحب ہیں، جن کا شاعرانہ تخیل یار کی زلفوں میں ایسا اُلجھا کہ اب قیامت تک وہ اس جال سے نہیں چھوٹ سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے کالج کے ایک یورپین پروفیسر نے، ایک لڑکے سے کسی اُردو کے شعر کی فرمایش کی، اُس نے داغ کا یہ مطلع سُنایا،

"پڑا فلک کو ابھی دل جلوں سے کام نہیں — جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں"

اور جب اُس نے انگریزی میں اُسے مطلب سمجھایا، تو وہ بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ اُنکے یہاں بھلا اس قسم کی شاعری کہاں، جس میں زمین وآسمان کے قلابے ایک کردیے جائیں۔ ٹینسن، اسکاٹ اور گولڈ سمتھ وغیرہ کو ایسے مضامین خواب میں بھی نہ سوجھیں گے۔ وہ تو فطرت کے نقاش ہیں، نہ کہ غیر فطرت کے، اُنکی نظر تو دھوکے سے بھی اُس خیالی معشوق پر نہیں پڑ سکتی، جو ہماری اُردو شاعری کی جان ہے، اور نظر پڑے بھی تو کیونکر، کیونکہ نہ تو ایسا عنقا معشوق کبھی یورپ میں پیدا ہوا اور نہ ایشیا کا معشوق ہی کبھی وہاں پہونچ سکا۔ (ہنس کر) یونان میں ان کے (ایشیائی معشوق کے) آباو اجداد شاید کبھی رہتے تھے۔ مگر پھر وہاں سے جو نکالے گئے تو ایسے کہ اب انکے سوانح قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ......۔

ہاجرہ۔ اچھا ہوگا، اب آپ نے تو بات کو مذاق کرڈالا۔ خیر یہ بتائیے کہ آج کل کے شاعروں میں آپ کسے پسند کرتے ہیں؟

نعیم۔ مجھے خود تو نہ شعروشاعری کا مذاق ہی ہے، اور نہ کچھ زیادہ شوق، ہاں اگر کبھی دیکھتا ہوں تو آج کل کے شعرا میں حسرت موہانی کی غزلیں، حضرت اکبر کی مذاقیہ نظمیں، اور سرور، واقبال، اور نادر کاکوروی وغیرہ کی نیچرل نظمیں زیادہ پسند کرتا ہوں، تمھیں اگر شوق ہو تو میری رائے میں جدید شعرا میں تم ان لوگوں کے کلام کو دیکھو۔

ہاجرہ۔ نہیں مجھے خود بھی شعروشاعری سے کچھ ایسی رغبت نہیں، یوں ہی کبھی رسالوں میں نظمیں چھپتی ہیں تو پڑھ لیتی ہوں۔

نعیم۔ خیر یہ تو سب ہے، لیکن تم نے ابھی تک میری فرمائش پوری نہیں کی۔ ہاں کوئی غزل سناؤ۔

ہاجرہ (کچھ دیر خاموش رہ کر) .... غالب کی تو کوئی غزل اب پوری یاد بھی نہیں ہے، اور نہ اب گانے ہی کا شعور رہا ہے، پھر کیا سناؤں۔

نعیم۔ اچھا پوری غزل نہ سہی، جو کچھ یاد ہو وہی سناؤ۔ مگر ایسی غزل سُنانا، جو میں نے تک

اُسکی چاشنی یاد رہے۔

ہاجرہ۔ تو معاف کیجیے۔ مجھے کوئی ایسی چاشنی دار غزل یاد نہیں ہے۔

نعیم (ہنس کر) اچھا غزل نہ سہی، آواز تو ایسی چاشنی دار ہوگی۔

ہاجرہ (کسی قدر جھینپ کر) میری آواز تو بھدّی ہے، اس میں چاشنی کہاں!

نعیم (مسکرا کر) نہیں! اس سے اطمینان رکھو کہ میرے کانوں کے لیے تمھاری آواز بھدّی نہیں ہوسکتی۔

عورت خواہ کیسا ہی بُرا کیوں نہ گاتی ہو، لیکن اُسے ضرور اپنے گانے پر ناز ہوتا ہے ہاجرہ بھی اس نسوانی غرور سے پاک نہ تھی۔ پھر نعیم کا یہ آخری جملہ کہ "میرے کانوں کے لئے تمھاری آواز بھدّی نہیں ہوسکتی" صرف ہاجرہ کے اِس نسوانی غرور ہی کی داد نہ دے رہا تھا۔ بلکہ یہ نعیم کے دلی جذبات کی بھی ترجمانی کر رہا تھا۔ حقیقت میں یہ وہ تیر تھا، جس نے ہاجرہ کے دل کو چھید دیا ——— وہ دل، جو آج تک اس لذت سے ناآشنا رکھا گیا تھا، لیکن اسکے فراق میں ہمیشہ بے چین رہتا تھا ——— اور آج اُسے معلوم ہوا کہ اسکی قدر کرنے والا بھی دنیا میں کوئی موجود ہے، لیکن ہاجرہ، اگرچہ اس ناگہانی حملہ کے لیے بالکل طیار نہ تھی، تاہم وہ عورت تھی، اور اپنے جذبات پر قابو رکھتی تھی، وہ نعیم کے چہرہ کا متغیر رنگ بھی دیکھ رہی تھی۔

ہاجرہ۔ آپ بیکار ضد کر رہے ہیں، میں سچ کہتی ہوں کہ میں اب بالکل گانا بھول گئی ہوں۔

نعیم (کسی قدر ناگواری کے لہجہ میں) تو کیا تم مجھے ٹالنا چاہتی ہو؟ میں کب کہتا ہوں کہ تم اچھا ہی گاؤ۔

ہاجرہ نے ہنس کر گردن جھکالی! وہ نعیم کی حالت کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ نعیم اس کیفیت کو چھپانا چاہتا تھا، لیکن یہ اب اُسکے اختیار میں نہ تھا۔ اُس کی مخمور آنکھیں اور سرخ چہرہ اُسکے اندرونی جذبات کا پتہ دے رہا تھا۔ اور ہاجرہ بھی یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ خود بھی گویا جذبات کے بحر بیکنار میں، ایک معمولی تختہ کے سہارے ڈوبنے سے بچی ہوئی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ صاف

بچ کر نکل جائے، لیکن اب یہ غیر ممکن تھا، وہ نعیم کو ناراض کرنا بھی نہ چاہتی تھی، کیونکہ ہمیشہ سے نعیم کی محبت کی ٹیس وہ اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، اپنے خواب کی تعبیر بھی اُسکے پیش نظر تھی، اور انگریزی کی یہ مثل اب اُسکے حال پر بالکل صادق آگئی تھی کہ" ہونے والے واقعات کا سایہ پیشتر سے ظاہر ہو جاتا ہے"۔ بہرحال یہ ہاجرہ کے لیے بڑی مشکل کا وقت تھا۔ اسوقت ہاجرہ کے خیال میں صرف نعیم ہی تھا، اور نعیم کے خیال میں ہاجرہ، اب ضبط کا موقع نہ تھا، نعیم نے بے اختیار ہاجرہ کو چپٹا لیا، اور ہاجرہ نے بھی اپنی باہیں نعیم کے گلے میں ڈال دیں، اور دائمی محبت کے اقرارنامہ پر، خلوص و صداقت کے بوسوں سے مُہر کر دی گئی۔ نعیم کچھ اس سے زیادہ لطفِ محبت کا طالب تھا، لیکن ہاجرہ اِس کیفیت کو تاڑ گئی، اور چیخ کر اُسکی گرفت سے نکل گئی۔ نعیم جھیپ کر خاموش ہو گیا۔

تیسرے روز نعیم اپنے چچا مولوی فریدالحق کے ہمراہ بمبئی روانہ ہو گیا، نعیم کے لیے یہ جدائی شاق تھی، لیکن وہ مجبور تھا، اور مصلحت بھی یہی تھی۔

(باقی آئندہ)

انیس احمد عباسی (کاکوروی)

"اپنی ہستی"

پوچھے نہ کوئی مجھ سے میں کون ہوں میں کہاں ہوں
تصویرِ فنا سمجھو۔ اِک خاک کا پُتلا ہوں

ہندو ہوں مسلماں ہوں میں گبر و نصارا ہوں
میں دیر ہوں کعبہ ہوں مندر ہوں کلیسا ہوں

دن بھر میں تڑپتا ہوں۔ یوسف کا میں شیدا ہوں
میں رات کو روتا ہوں۔ دیوانۂ لیلےٰ ہوں

میں دردِ سراپا ہوں میں خود ہی مداوا ہوں
بیمار ہوں پھر اپنا میں خود ہی مسیحا ہوں

میں میر کا نشتر ہوں۔ یوں دل میں اُترتا ہوں
سمجھے نہ کوئی مجھکو۔ غالب کا معمّا ہوں

میں آب ہوں میں گِل ہوں میں باد ہوں میں آتش
اُس خالقِ یکتا کی قدرت کا نمونا ہوں

آیا تھا یہاں پر مَیں ہستی کے نظارے کو — آئینۂ حیرت ہوں۔ خود محوِ تماشا ہوں
سودائی ہوں میں وحشی مجنوں ہوں میں دیوانہ — پتھر سے جسے توڑیں لڑکے وہ کھلونا ہوں
مسلک بھی مرا دیکھو تو سب سے نرالا ہے — ناقوس کا نالہ ہوں۔ تکبیر کا نعرہ ہوں
ملتا ہوں برابر مَیں ہندو سے مسلماں سے — بیگانوں سے بیگانہ۔ اپنوں کا میں اپنا ہوں
اے چارہ گرو ٹھیرو حسرت تو نکل جائے — دامن نہ مرا پکڑو۔ دیوانۂ و رسوا ہوں
ہاں شمع مجھے جانو۔ مَیں سوزِ مجسّم ہوں — پروانہ مجھے سمجھو میں شوق سراپا ہوں
بتخانے میں بیٹھا ہوں۔ کعبے میں مرا دل ہے — خدمت میں بتوں کی ہوں۔ اللہ کا بندہ ہوں
جذباتِ دلی میرے آنکھوں سے چھلکتے ہیں — روکے نہ کوئی مجھکو امڈا ہوا دریا ہوں
بدبخت ہوں میں بیشک برگشتہ مقدر ہوں — بگڑی ہوئی قسمت کا بوسیدہ سا نقشا ہوں
یا آنکھ سے بہہ جائے خوں ہوکے شبِ فرقت — یا دل میں رہے پنہاں میں ایسی تمنا ہوں
قسمت میں مری چکر لکھا ہے ازل ہی سے — گرداب ہوں پانی میں۔ خشکی میں بگولا ہوں
دیکھیں تو کبھی مجھکو اربابِ نظر پھر کر — افلاک کی گردش کا پیسا ہوا سرمہ ہوں
ہاں باغِ جہاں میں تم حالت نہ مری پوچھو — کانٹوں میں جو پھنس جائے شبنم کا وہ قطرہ ہوں
انکار کہاں مجکو۔ آنکھیں ہیں مری بیشک — غفلت سے جو اندھا ہو وہ دیدۂ بینا ہوں
دیکھیں نہ مجھے کیونکر اربابِ نظر باسط — نیرنگیِ عالم کا دلچسپ خلاصہ ہوں
اے کاش فنا ہوتا میں وصل تو ہو جاتا — ناچیز سا قطرہ ہوں مہجورِ دریا ہوں

پوچھے نہ کوئی مجھ سے مَیں کون ہوں میں کیا ہوں
جو کچھ ہے مری ہستی میں خوب سمجھتا ہوں

باسط (بسوانی)

دبستانِ حیات

زندگی مثل ایک درسگاہ کے ہے۔ یہ دنیا تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایک گھر ہے۔ یہ کوئی قیدخانہ نہیں ہے، اور نہ تو وہ استغفار کی جگہ، نہ تو ایوانِ راحت و رافت ہے، اور نہ کھیل تماشے کا اکھاڑا۔ بلکہ اسکو "دبستانِ حیات" سمجھو۔

زندگی کا صرف یہی ایک نظارہ ہے جو "فلسفۂ حیات" کی تہ تک پہونچتا ہے۔ اور صرف یہی ایک ہے جو اس اہم سوال کا جواب دیتا اور لاینحل مسئلۂ زندگی کو حل کرتا ہے کہ:-

"انسان کو زندگی کس لیے دی گئی ہے؟"

"اگر محض تفرج و شادمانی کے لیے؟" "اگر صرف رنج و غم کے لیے؟" تو اس (دنیا) کو اضداد کا ایک پریشان۔ ایک بے ترتیب مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن اگر اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لیے ہے، تو اس (دنیا) کی ہر چیز، ہر شئے، نہایت اہم، نہایت ضروری، اور پُراز عقل و فہم ہے!

یہ خیال ایک بہت بڑی عملی اہمیت رکھتا ہے جو ہمکو فی الفور اس سوال سے دوچار کردیتا ہے کہ

"ہم کیا سیکھ رہے ہیں؟"

کیا فی نفس الامر یہ کوئی ایسا اہم سوال نہیں ہے؟ دیکھو جب تمھارا لڑکا سالانہ تعطیلات میں گھر پر آتا ہے تو سب سے پہلے تمھارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "اس وقت تک اس نے کیا سیکھا ہے؟" اور تم اُس سے دریافت بھی کرتے ہو، یا کم از کم تم اُسکے معلمین کی سندات یا سارٹفکیٹ طلب کرتے ہو تا کہ تم اُسکی پڑھائی کا اندازہ کرسکو۔ اسی طرح اس عظیم اور مہتم بالشان "درسگاہِ حیات" میں بھی صرف یہی ایک اہم سوال پیش آتا ہے کہ:- "ایک آدمی نے زمانۂ گزشتہ کے تجربہ تعلیم و تربیت اور موقعوں سے کیا فائدہ اُٹھایا؟"

لیکن یہ سوال ہرگز نہ کیا جائیگا کہ:- "بادی النظر میں اُس نے اپنے گرد و پیش اپنی ظاہری فلاح و بہبود

کی صورت میں کیا کچھ جمع کر لیا ہے؟"

بلکہ یہ کہ :- " اُس نے اس دوسرے بیش بہا - اور سرمدی خزانہ میں جسکو نفس (mind) کہتے ہیں کیا اضافہ کیا ہے؟"

ہم ایک آزاد خیال طالب علم کی ظاہری ٹیم ٹام، اور تزک و احتشام سے اُسکی قابلیت وفضل کا اندازہ نہ کریں گے، اور نہ یہ خیال کرینگے کہ اسکے نصاب کی کتابیں نہایت خوشنما، مطلا، اور مجلد ہیں؛ نہ یہ کہ اسکے مطالعہ کی میز نفیس اور قیمتی ہے، یا اُسکی کرسی نرم و ملائم مخمل سے منڈھی ہوئی ہے۔ ہم اُس اسکول کی کی شاندار عمارت کا بھی خیال نہ کرینگے جس میں اس نے تعلیم پائی ہے۔ ہمیں یہ بھی خیال نہ کرلینا چاہیے کہ اُسنے بڑی عزت حاصل کرلی ہے، جب تک یہ نہ ثابت ہو کہ فلاں مضمون میں ترقی کرنے پر وہ اس اعزاز کا مستحق ٹھیرا گیا؛ اگرچہ وہ کسی مشہور ترین یونیورسٹی کا گریجوائیٹ ہو۔

تو کیا اس عظیم الشان " دبستانِ حیات" میں بھی (جس کا طمانیت بخش نصاب مسرت، نیکی، اور بہشت کی تحصیل ہے) اسی قبیل کے سوالات و تفکرات پیش آتے ہیں؟

میں دوہراتا ہوں کہ " زندگی ایک درسگاہ ہے" ادوارِ حیات اسکی مقررہ میعادیں (terms) اور تمام انسانی حالتیں اسکے فارم forms ہیں۔ تمام انسانی اشغال اور مصروفیتیں اسکے اسباق ہیں، تمام کنبے families اسکی اخلاقی تعلیم کی ابتدائی Primary جماعتیں ہیں، سوسائٹی کے مختلف طبقے اسکی ترقی یافتہ درجے ہیں، سلطنتیں اسکی یونیوسٹیاں ہیں، اور یہ دنیا جو ایک " ترکیب مادی" ہے اسکے انتظامِ تعلیم کے لیے وضع کی گئی ہے۔

میں دوبارہ کہتا ہوں " زندگی ایک درسگاہ ہے" اور اسکے تمام ادوار ـــ طفلی، شباب، پیری وغیرہ میں سے ہر ایک کے ذمے اس " دبستانِ حیات" میں، ایک علیحدہ اور مخصوص کام سپرد ہے

اختر (جوناگڑھی)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

اجلاس دوم منعقدہ ۲-۳ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء بمقام اورنگ آباد دکن

(۱)

ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تعلیم کی پکار ہو رہی تھی - اور کوئی صوبہ بلکہ صوبہ میں بھی کوئی صدر مقام ایسا نہیں جہاں تعلیم کی اشاعت عامہ کے لیے مختلف قوموں نے علیحدہ علیحدہ یا مشترک طور پر انجمنیں اور مجالس نہ قائم کی ہوں - آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تیس سال سے تمام حصص ملک کے مسلمانوں کو تعلیم کی تحریص و ترغیب دلانے، حصول تعلیم کے وسائل و ذرائع پیدا کرنے اور مقامی حکومتوں کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کی طرف توجہ دلانے میں مصروف تھی - مسلمانوں کے سوا ہندو - سکھ - جینی - برہمو - آریے - عیسائی تا آنکہ وہ بندگان خدا جو نیچ ذات والے کہے جاتے ہیں سب اسی دُھن میں لگے ہوئے تھے - دیسی ریاستوں میں بھی تعلیمی ضرورتوں کے احساس نے ایک قسم کی ہلچل پیدا کر دی تھی بلکہ بڑودہ اور میسور نے تو تعلیمی ترقی کا ایسا نمونہ پیش نظر کر دیا کہ علاقۂ انگریزی کے باشندوں کو مقابلۃً اپنی تعلیمی پستی کی وجہ سے شرم آنے لگی مگر مملکت آصفیہ میں باوجودیکہ وہ ہندوستانی ریاستوں کی سرتاج ہے اور فراوانیٔ دولت - فیاضیٔ شاہانہ و بخشش عام کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر کہی جا سکتی ہے اس قسم کی کوئی حرکت یا تو نمودار نہیں ہوئی یا ہوئی تو قعرِ گمنامی میں دفن رہی - لیکن یہ سکون و جمود کب تک قائم رہ سکتا تھا زمانہ کے تیز و تند جھونکوں نے آخر کار ہمارے ان خوابیدہ بھائیوں کو جگایا اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہوشیار کیا اور ہوا کا رُخ پہچاننے اور موجودہ ضروریات کے مطابق تعلیم کی اشاعت عام کرنے کے لیے آمادہ کر دیا - چنانچہ گذشتہ سال حیدرآباد کی مجلس تعلیمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور خاص دارالخلافہ سلطنت ابد مدت آصفیہ میں اُسکا پہلا اجلاس نہایت شان و شکوہ اور جوش و خروش

کے ساتھ ریاست کے معزز ہوم سکرٹری اور ملک کے نامور فرزند مسٹر محمد اکبر نذر علی حیدری بی اے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس تحریک کا بانی کون ہوا؟ اگرچہ فی الاصل اسکی تفتیش و تحقیقات چنداں مفید و ضروری نہیں ہوسکتی لیکن ناقدرشناسی اور احسان فراموشی ہوگی اگر اُس شخص کی مساعی جمیلہ کا اعتراف نہ کیا جائے جس نے تقریباً ایک کروڑ باشندگانِ دکن کو اُبھارنے اور تعلیم کے بیش بہا زیور سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے وقت افکار اور قوتوں کا ایثار گوارا کیا اور اس طرح نہ صرف اربابِ دکن کو بلکہ تمام اہل ہندیا حقیقت پر نظر کی جائے تو تمام بنی نوع انسان کو اپنا رہینِ منت بنایا ہے۔ ہمارے محترم نوجوان مولوی محمد مرتضیٰ اگرچہ بظاہر حیدرآباد کے ایک سرکاری دفتر میں معمولی اہلکار ہیں، مگر اپنے اس بڑے کارنامہ کی وجہ سے ہماری نگاہوں میں ہندوستان کے بڑے محسنین میں شمار ہونے کے قابل ہیں کہ باوجود بے بساطی و بے مایگی محض دردِ قومی اور سچی لگن کے باعث اُنھوں نے اس عظیم الشان کام کی بناڈالی اور ہم اونھیں دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ چمنستان دکن میں شجر تعلیمی کے نصب کرنے اور پھر پورے خلوص، دردمندی اور جانفشانی کے ساتھ اُسکی آبیاری کرنے میں جو ہمت و محنت اُنھوں نے صرف کی ہے اُس کا ثمر نیک بہت جلد حاصل ہوگیا۔ جیسا کہ اُن کی پہلے سال کی رپورٹ سننے اور دیکھنے سے معلوم ہوا اعلیحضرت میر عثمان علی خاں تاجدار دکن خلداللہ ملکہٗ وحشمتہٗ کی بارگاہِ اقدس میں کانفرنس کے معروضات مقبول ہوے اور حضورِ ممدوح کی گورنمنٹ نے ازراہِ قدردانی وہمت افزائی اُسکی اکثر تجاویز کو منظور فرمایا اور ان تحریکات کے مطابق انتظامات کیے جانے کے متعلق ضروری احکام صادر کیے۔

یہ صحیح ہے کہ سرزمین دکن کا تاجدار کوئی یوروپین لارڈ نہیں جسے غیر ملکی رعایا کے ساتھ اظہارِ تلطف میں اس سبب سے پس و پیش ہو کہ کہیں یہ کالی ہستیاں ترقی کرکے اپنے گورے رنگ والے حکمرانوں سے حقوق مساوات و آزادی کے طالب نہ ہوں، بلکہ وہ ایک ایشیائی شہریار ہے جو اپنے اسلاف اور پیشرووں کی طرح ہمارے ساتھ پدرانہ شفقت ظاہر کرتا ہے اور جسے ہم اسی سبب سے حقیقی طور پر اپنا دنیاوی خداوند سمجھتے اور باپ کی طرح دلی احترام و تکریم

کا مرکز جانتے ہیں اور اس بات کی پوری توقع رکھتے ہیں کہ جب کبھی اور جس قسم کی ضروریات سے ہم اپنے آقائے نامدار کو مطلع کریں گے تو اُن پر پورا التفات ہوگا اور شاہ و رعیت کی یکدلی و ہم آہنگی سے اس خطۂ ملک میں وہ نتائج پیدا ہوں گے جو دوسری جگہ محض اس بنا پر ممکن نہیں ہیں کہ وہاں رعب و داب حکومت کے قائم و برقرار رہنے کا دارومدار باہمی اعتماد اور شفقت و محبت پر نہیں بلکہ پالیسی اور زور و طاقت پر ہے۔

(۲)

کانفرنس کا دوسرا اجلاس اورنگ آباد میں ہوا۔ جو اپنے بانی کی تاریخی عظمت۔ اپنی موجودہ جغرافیائی حالت اور نہایت ہی خوشگوار آب و ہوا کی وجہ سے دکن کے تمام شہروں میں فضیلت کا درجہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ عام دستور ہے اہل شہر کی ایک مجلس نے مہمانوں کے استقبال۔ قیام و طعام اور ہر طرح کی راحت رسانی کا اہتمام کیا اور مختلف اضلاع مملکت اور خاص بلدۂ حیدرآباد کے اصحاب ایک معقول تعداد میں جمع ہوئے۔ جن میں سے بعض تو صرف شرکت کانفرنس ہی کی غرض سے آئے تھے اور اکثر وہ تھے جنکو کانفرنس کے علاوہ خلدآباد (جو آرامگاہ اورنگزیب ہونے کے سوا کثیر التعداد اولیائے کرام کے مزاراتِ مقدسہ کی وجہ سے مرجعِ خلائق ہے) اور غارہائے ایلورا کی سیر بھی مقصود تھی۔ مجلس استقبالیہ اور اسکے لائق، روشن خیال اور باسلیقہ معتمد کے حسنِ انتظام نے ایک نہایت ہی خوشنما خیموں کا پنڈال نصب کرا دیا تھا۔ دورانِ اجلاس ہائے کانفرنس میں جو معزز مہمانوں اور اہل شہر کی ایک تعداد کثیر سے بھرا رہتا تھا۔ اجلاس اول میں صدر نشین مجلس استقبالیہ مولوی غلام جیلانی صاحب ناظم صدر عدالت صوبہ اورنگ آباد کے پُرمغز اور دلچسپ خطبہ کے بعد مولوی حبیب الدین صاحب صدر محاسب (اکاونٹنٹ جنرل) دولتِ آصفیہ نے جو اس اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب کیے گئے تھے اپنی افتتاحی تقریر پڑھ کر سنائی۔ معزز صدر مجلس اپنی وجاہت ثروت ذاتی کے علاوہ ارباب دکن میں اپنی فضیلت علمی اور روشن خیالی کی بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں اور اگرچہ مغربی تمدن اور یورپین طرز معاشرت کے اثر نے انکے لہجہ کو بہت کچھ متاثر کر دیا ہے تاہم جو خطبۂ افتتاحیہ وہ تیار کرکے لائے تھے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ فصاحت و بلاغت سے معرّا تھا۔ اور اگرچہ صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر کی طرح ملک کی موجودہ تعلیمی حالت سے اس میں کم بحث کی گئی تھی تاہم اپنے ابنائے وطن کو میدان تعلیم میں تیز روی کے ساتھ قدم بڑھانے اور اس مقصد کے حصول کے لیے پوری جد و جہد کرنے کی طرف خاص توجہ دلائی گئی تھی اور اسی ضمن میں جا بجا ایسی بہت سی حقیقتوں کا اعادہ کیا گیا تھا جنکا علم اصحاب دکن کے لیے خالی از منفعت نہیں ہو سکتا۔

اور اس لحاظ سے یہ خطبہ لائق صدر نشیں کے لیے اور نیز اُس مجلس کے لیے جس میں وہ پڑھا گیا تھا ہر طرح قابلِ افتخار کہا جا سکتا ہے۔ مگر ایک بات جو ہم نے اس خطبہ میں بھی محسوس کی اور کانفرنس کی دو روزہ کارروائی کے دَوران میں صاحبِ صدر کے طرزِ عمل میں بھی نمایاں پائی وہ ہماری رائے میں حد درجہ قابلِ اعتراض تھی۔

حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی کا قصّہ کچھ نیا نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اہلِ ملک کی نسبتاً پست حالت کے لحاظ سے دوسرے صوبوں کے باشندگان کے مقابلہ میں ملازمتِ سرکاری کے مختلف شعبہ جات میں اُنکے حقوق کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے سب سے پہلے نواب محسن الملک کے عہد میں گورنمنٹ نظام نے یہ طے کیا تھا کہ جہاں تک ممکن العمل ہو دوسرے حصصِ ہند کے لوگوں کو نوکریاں نہ دی جائیں۔ اس اصول سے باہر کے اُن لوگوں کو ہمیشہ اختلاف رہا اور رہے گا جو دولتِ آصفیہ میں پرورش پاتے رہے یا اب پا رہے ہیں مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ حالاتِ ملکی کے لحاظ سے اس قسم کے احکام کا اجرا نہایت ضروری تھا اور ہے۔ اور جب تک تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اہلِ دکن اپنے دوسرے صوبوں کے بھائیوں کے برابر نہ ہو جائیں۔ اس اصول پر پابندی کے ساتھ عمل کرنا گورنمنٹ کا اہم ترین فرض ہے۔ یہ بات ہمارے شمالی ہند کے بھائیوں کو ناگوار اور تلخ معلوم ہوگی لیکن بڑی ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہوگی اگر اس صداقت کو تسلیم نہ کیا جائے۔

اسی اصول پر عملدرآمد کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج خدا کے فضل و کرم سے بہت سے حیدرآباد کے باشندے اپنے ملک کی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں اور اگرچہ تعلیمی حیثیت سے اب بھی وہاں کے لوگ بہت پیچھے ہیں لیکن ترقی کا وسیع میدان کھلا ہوا ہے، اور گورنمنٹ نے جس قدر فیاضی کا سلوک اُن کے ساتھ کیا ہے اُس سے پوری طور پر مستفید ہو کر وہ اپنی حالت کو بہت کچھ سدھار سکتے ہیں۔ لیکن مختلف صوبوں کے اصحاب میں باہمی رقابت ہے اُسکی وجہ سے اس بحث نے ایک ناگوار صورت بھی اختیار کر لی ہے یعنی عام طور پر دکن سے متصل صوبجات کے اکثر باشندے اور

خاص کر وہ لوگ جنھوں نے اُس مُلک میں مستقل تعلقات پیدا کرلیے یا وہاں مستقلاً اقامت گزیں ہوگئے ہیں اپنے آپ کو تو ملکیوں میں شمار کرتے ہیں اور شمالی ہند کے لوگوں کے ساتھ اجانبؔ اغیار کا سا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قدامت تعلق کے لحاظ سے دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔ اور مُلکی خدمات پر اگر نظر کی جائے تو ان لوگوں نے دکن اور اہل دکن کی ترقی میں جو کوششیں کی ہیں وہ خاص طور پر اعتراف کے قابل ہیں۔ مگر تعصب کی آنکھیں ہمیشہ اندھی ہوتی ہیں۔ سارے ملک میں اسکی بدولت ایک خاص قسم کی نہایت درجہ مذموم اور ناخوشگوار کشاکش نظر آتی ہے۔ جسکی اصلاح کے بجاے اس کانفرنس کے قیام سے اندیشہ کیا جاتا ہے کہ اُس میں اضافہ ہوجائے گا اس لیے کہ بانیانِ کانفرنس اور نیز اُسکے اکثر حامی و مددگاران تعصبات میں ڈوبے ہوے ہیں۔ اور مولوی حبیب الدین صاحب جو خود اصلاً دکن کے باشندے نہیں کہے جاسکتے اُنھوں نے اسی کانفرنس کے اندر بعض موقعوں پر ایسی روش ظاہر کی جو بہت بددلی کا باعث ہوئی۔ مثلاً ایک صاحب کو جو کانفرنس کے رکن ہیں۔ حسب قواعد اُسکا سالانہ چندہ ادا کرتے ہیں اور محض شرکت کانفرنس کی غرض سے حیدرآباد سے تشریف لائے تھے، ایک موقع پر تقریر کرنے سے یہ کہکر روک دیا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام عالی مقام کی طرف سے صاحب صدر کو ہدایت ہے کہ وہ کسی غیر ملکی کو تقریر نہ کرنے دیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اعلیٰ حضرت کا ارشاد اس بارے میں حقیقتاً کیا تھا اور اُسکی تاویل کرنے میں مولوی حبیب الدین صاحب سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ مگر یہ امر ضرور تحقیق طلب ہے کہ جب کانفرنس کے قواعد و ضوابط میں صاف اور صریح طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ "تحریکات پر تقریر کرنے اور رائے دینے کا حق صرف ارکان کو ہوگا" (ص ۱) اور رکنیت کانفرنس کی دفعہ ۲ میں یوں صراحت کی گئی ہے کہ "ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ جو خواہانِ تعلیم مملکت آصفیہ ہوں اس کے رکن ہوسکیں گے" تو کسی ایسے شخص کو جو رکن کانفرنس ہو، کیسے تقریر کرنے سے روک دیا جاسکتا ہے۔ اگر فی الحقیقت اعلیٰحضرت کے فرمان واجب الاذعان کا منشا وہی تھا جو صاحب صدر نے بیان کیا تو سرے سے ایسے لوگوں کو رکنیت کانفرنس سے ہی محروم رکھنا چاہیے تھا۔ پھر ستم یہ ہے کہ کانفرنس کے مطبوعہ پروگرام میں جتنے اجلاس مقررین درج تھے

اُن میں سے بہت کم ایسے تھے جو حقیقتاً غیر ملکی نہ ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ملازم سرکاری ہونے کی وجہ سے اُن کا شمار ملکیوں میں کیا جاتا ہو۔ پھر یہ بھی کچھ قرین دانشمندی و تدبّر نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ایسے مجمع عام میں جہاں اہلِ ملک کی تعلیمی حالت و ضروریات پر بحث و مشاورت کی غرض سے وہ اصحاب جمع ہوئے ہوں جن پر مُلکی ہونے کا اطلاق ہو یا نہ ہو لیکن جن کے متعلق کم سے کم یہ یقینی ہے کہ وہ اہلِ مُلک کی تعلیمی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اعلیحضرت حضور نظام کا نامِ نامی ایک ایسی کارروائی سے منسوب کیا جائے جو لوگوں میں بددلی کا باعث ہو۔

مولوی حبیب الدین صاحب نے افسوس ہے کہ ایک قومی مجلس میں بیٹھ کر اپنے اعلیٰ عہدہ دار ہونے کو نہایت بدنمائی کے ساتھ نمایاں کیا۔ اور شروع سے آخر تک جلسہ کی جس قدر کارروائی ہماری نظروں سے گزری اُس سے صاف طور پر مترشح ہوتا تھا کہ محض صاحب صدر کے تحکمانہ انداز کے بدولت یہ کانفرنس کوئی قومی مجلس نہیں بلکہ ایک سرکاری جلسہ ہے۔ جو کانفرنس کی مقبولیت وہر دل عزیزی اور نیز اُسکے دائرۂ نفع رسانی کی وسعت کے لیے یقیناً مضرت رساں ثابت ہوگا۔ دورانِ اجلاس میں اور نیز بعد کو ہمیں بہت سے اصحاب دکن سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور اُنکی بددلی نے ہمارے دل پر خاص اثر کیا۔ کاش کہ آیندہ سالوں میں جو بزرگ اس اہم اور ممتاز خدمت کے لیے منتخب کیے جائیں وہ اپنی روش سے ثابت کر دیں کہ یہ بزم تعلیمی حقیقت میں ایک قومی مجلس ہے جس کی غرض و غایت ملک میں تعلیم کی اشاعت عام ہے۔ ورنہ جیسا اس وقت ایک گروہ کو اندیشہ پیدا ہوگیا ہے یہ انجمن جنوبی ہند کی ایک جماعت کے متعصبانہ عزائم کی تکمیل کا آلہ بن جائے گی جو اُس ملک کی حقیقی ترقی کا باعث نہیں کہی جا سکتی۔

یہ باتیں کسی قدر تلخ و ناگوار معلوم ہونگی اور عجب نہیں کہ ہمارے جنوبی احباب ہمیں اپنے شمالی ہموطنوں کی حمایت اور طرفداری کا الزام بھی دیں۔ لیکن اگر وہ اس حقیقت پر غور فرمائیں گے کہ مملکت آصفیہ کے باشندوں کے حقوق کا تحفظ اور اُنکی پست و زبوں حالتِ جہالت کا دفعیہ ایک گروہ کی متعصبانہ کوششوں اور دوسری جماعت کی قبیلہ بندی کشاکش کی حالت میں سہل الحصول ہونے کے بجائے دشوار تر ہوتا جاتا ہے تو غالباً اُس دلچسپی کی وجہ سے جو ہمیں اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اہلِ دکن کے معاملات سے ہے ہمیں اس تلخ نوائی اور صاف گوئی کے لیے قابلِ معافی تصور کریں گے۔

ایڈیٹر

(باقی آیندہ)

مُسلم یونیورسٹی

گزشتہ پرچہ میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس اہم مسئلہ کے متعلق قومی نفع و نقصان کے لحاظ سے ہماری جو کچھ رائے ہے اُسے اس نمبر میں ظاہر کریں گے - چنانچہ آج اس بارے میں جو کچھ ہمارا خیال ہے اُسے معرضِ تحریر میں لاتے ہیں -

مسلم یونیورسٹی کے متعلق ابتدا سے جو توقعات قوم کے عام افراد اور نیز ہمارے بزرگانِ ملت نے قائم کی تھیں وہ تو مسلّم ہے کہ سرِدست پوری نہیں ہو سکتیں - اس وجہ سے کہ جن شرائط پر ہمارے برادرانِ ہنود کو یونیورسٹی دی گئی ہے صاف طور پر ہم سے کہدیا گیا ہے کہ انھیں شرائط پر تم کو یونیورسٹی مل سکتی ہے - لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ آیا ہندو یونیورسٹی کے شرائط پر اس وقت یونیورسٹی لے لی جائے یا نہیں ؟ بزرگانِ ملت میں سے اکثر وہ افراد جنھیں علی گڈھ سے خاص تعلق رہا ہے اور جو "علی گڈھ پارٹی" کے رکن رکین ہیں اس خیال کے مؤید ہیں کہ یونیورسٹی انھیں شرائط پر لے لینا چاہیے اور نوجوان تعلیم یافتہ جماعت کے بیشتر افراد اس رائے کے مخالف ہیں - اور اگرچہ جیسا ہمنے گذشتہ نمبر میں لکھا تھا یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے جلسۂ اکتوبر میں اُن اصحاب نے کھل کر مخالفت نہیں کی اور صرف التوا کی خواہش ظاہر کی اور اب بھی مسٹر مظہر الحق نے بانکی پور میں جو جلسۂ مشاورت منعقد کیا تھا اُس میں یہی خواہش ظاہر کی گئی ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اصحاب اُن شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنا مناسب نہیں سمجھتے جنکے بموجب ہندو یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کیا گیا ہے -

حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق شروع سے جو امیدیں قایم کی گئی تھیں وہ خواہ کتنی ہی حق بجانب اور مفید قوم ہوں لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ غلط تھیں اور غلط فہمیوں پر مبنی تھیں - ہم اپنے بزرگوں کو اس بارے میں کوئی الزام نہیں دے سکتے اور نہ اُنکی عاقبت اندیشی پر کوئی اعتراض کر سکتے ہیں - اُنھوں نے جو کچھ سوچا تھا وہ قوم کے مفاد کے لحاظ سے صد درجہ قابلِ ستایش تھا اور

اُنکا یہ خیال کہ اُنکی تجاویز ایکدن بارآور ہوں گی اور جو نفع وہ قوم کو پہونچانا چاہتے ہیں وہ پہونچے گا اگرچہ اب غلط ثابت ہو رہا ہے لیکن اُس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ بیجا نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہمارے موجودہ رہنمایانِ قوم نے یہ غلطی ضرور کی کہ باوجودیکہ حالاتِ زمانہ نے اُنھیں پوری طور پر اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ لارڈ کرزن نے جس تعلیمی پالیسی کی طرح ڈالی اُسکے ہوتے ہوئے ہمیں اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق آزاد یونیورسٹی کا چارٹر نہیں مل سکتا لیکن اُنھوں نے قوم کو برابر یہی آس دلائی اور اسی مغالطے میں ڈال کر مُلک بھر سے روپیہ تحصیل کیا۔ اور اب جو روپیہ ہاتھ میں آگیا ہے تو قوم کی خواہشات اور توقعات کے بالکل برخلاف اس بات پر آمادہ ہیں کہ جیسی یونیورسٹی بھی ملے لے لی جائے۔

یونیورسٹی کا چارٹر موجودہ شرائط پر لینے کے مؤیدین میں جو چند تعلیم یافتہ اصحاب ہیں اُن میں سے ایک صاحب سے ابھی حال میں جب ہم سے اس مسئلے پر گفتگو آئی تو اُنھوں نے صاف لفظوں میں یہ تسلیم کیا کہ جو یونیورسٹی ہم کو دی جا رہی ہے وہ کسی طرح الہ آباد یونیورسٹی سے بہتر نہ ہوگی۔ اور یہی وہ تعلیم یافتہ جماعت بھی کہتی ہے جو اِن شرائط پر یونیورسٹی لینے کی مخالف ہے۔ لیکن ہمارے اوّل الذکر دوست کا خیال ہے کہ یونیورسٹی مِلنے یا نہ مِلنے پر قوم کے بننے بگڑنے کا انحصار نہیں ہے لہذا اس روپئے کو بیکار اور تمام قوم کی قوتوں کو معطل رکھنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ جن شرائط پر بھی یونیورسٹی مِلے لے لو اور اس روپئے کو کام میں لگا کر قوم کو دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنے کا موقع دو۔ اس استدلال میں بظاہر بہت وزن ہے اور یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ مُسلم یونیورسٹی کا چارٹر قوم کے بنانے یا بگاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ نے اب تک قوم کو اس دھوکے میں کیوں رکھا کہ مُسلم یونیورسٹی اُسکے تمام امراض کا علاج ہے اور قومی تعلیم کے مسئلے کا حل اسی پر منحصر ہے؟ آج اگر آپ قوم سے یہ کہہ کر دنیا چھپا چھڑاتا اور اُس کے مطالبات کو اِن بہانوں سے مسترد کرنا چاہتے ہیں تو کل جب آپ کوئی دوسری اسکیم یا تجویز قوم کے سامنے پیش کریں گے تو اُسے آپ کی باتوں پر اعتماد کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ رہا روپئے کے بیکار رہنے کا مسئلہ، تو یہ چنداں دشوار نہیں ہے۔ جن لوگوں نے آپ کو روپیہ دیا ہے اُن سے پوچھیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ جو اصحاب ہندو یونیورسٹی کی شرائط پر مسلم یونیورسٹی

لینا چاہتے ہوں اُن کا روپیہ اس غرض کے لیے مخصوص کر دیجیے اور جس قدر کمی ہو اُن سے کہیے کہ پوری کردیں۔ اور جو لوگ ابھی تک آزاد یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے ہوں اُن کے روپے یا تو اُنھیں واپس کر دیجیے یا اُن کے لیے ایک دوسری آزاد یونیورسٹی بنائیے۔ بلا لحاظ اسکے کہ گورنمنٹ سے اُس کا چارٹر ملے یا نہ ملے۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ گورنمنٹ اُس قسم کی آزاد یونیورسٹی دینے کے لیے طیار نہیں ہے جو آپ کا یا اُس جماعت کثیر کا مدعا ہے جس نے چندہ دینے اور فراہم کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ پس بہتر یہ ہے کہ آپ ایک آزاد قومی یونیورسٹی کی بنا ڈالیے اور گورنمنٹ کے چارٹر کو دُور سے سلام کیجیے۔ وہی یونیورسٹی آپ کے تعلیمی مسئلے کا حل ہو سکتی ہے اور اُسی سے آپ قوم کو کوئی معتدبہ حقیقی نفع پہونچا سکتے ہیں۔ باقی سرکاری ملازمت اور اُن پیشوں میں داخل ہونے کے لیے جنکی تعلیم سرکاری یونیورسٹیوں۔ مدارس اور امتحانات کے جکڑبند میں ہے آپ شوق سے موجودہ شرائط پر ایک مسلم یونیورسٹی بنائیے۔

لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ قوم اس بات میں آپ سے متفق الرائے ہو جائے کہ جس قسم کی یونیورسٹی بھی ملے وہ لے لی جائے اور اس وقت جو روپیہ قوم نے جمع کیا ہے اُس سے بھی غم کھائے اور آیندہ بھی آپ کی پرستش کرنے اور مسلم یونیورسٹی کے نام سے نذرانہ دینے میں دریغ نہ کرے تو

این خیال ست و محال است و جنوں

بے شبہہ قوم کی جہالت و غفلت سے آپ ابھی کچھ دنوں اور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں لیکن اب کچھ پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے لوگ بھی قوم میں پیدا ہو گئے ہیں جو ان مغالطوں اور فریب کاریوں سے آگاہ ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ وہ حقیقتوں سے چشم پوشی کرتے رہیں اور بھیڑ بکریوں کی طرح آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اور اپنے حقوق کے تحفظ سے دست بردار ہو جانا گوارا کریں۔

——— ::٭:: ———

جو اصحاب ہندو یونیورسٹی کی شرائط پر مسلم یونیورسٹی لینا چاہتے یا کم سے کم اسے گوارا کرتے ہیں وہ یہ دلائل ہمیں باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اگرچہ مسلم یونیورسٹی اس نصب العین کے مطابق نہ ہوگی جو ابتدا سے ہمارے پیش نظر رہا ہے اور اس وقت ہماری وہ آرزوئیں پوری نہ ہوسکیں گی جو چالیس سال سے ہمارے دلوں میں پرورش پاتی رہی ہیں۔ تاہم اپنی یونیورسٹی بن جانے سے ہمیں وہ فوائد بیش از بیش حاصل ہوں گے جو اس وقت علی گڈھ کالج کو دوسری یونیورسٹی کے ماتحت رکھنے کی وجہ سے ہمیں حاصل نہیں ہیں اور پھر رفتہ رفتہ حسب ضرورت و موقع مزید اختیارات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اس دلیل میں بہت کچھ اثر ہے اور یہی وہ اثر ہے جس نے بعض رزولیوشن ساز انجمنوں کو یونیورسٹی لینے کی حمایت میں ہم آہنگ بنا دیا ہے۔ لیکن یہ تصویر کا ایک ہی رخ تھا۔ اب دوسرے رخ پر نظر کیجیے تو فریق ثانی یہ کہتا نظر آتا ہے کہ جہاں تک آزادی عمل۔ اختیارات اور مداخلت سرکاری کا تعلق ہے علی گڈھ کالج کی موجودہ حالت بسا غنیمت ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا چارٹر اس سے بھی ایک بڑی حد تک ہمیں محروم کر دیگا۔ پھر جب تک کہ ہندو یونیورسٹی کے ریگولیشنز یا ضابطۂ عمل مرتب ہو کر سرکار سے منظور نہ ہو جائے نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت جو فوائد اور اختیارات ہمیں حاصل ہیں اُن میں سے اور کیا کیا ہمارے ہاتھ سے جائیں گے اور کیا باقی رہیں گے اور اسی بنا پر التوا کی خواہش کی جاتی ہے۔ جس وقت سے مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے کیلئے گورنمنٹ آف انڈیا سے پیام سلام شروع ہوا ہے اب تک برابر اور تدریجاً گورنمنٹ کی طرف سے ایسی شرائط میں اضافہ ہوتا رہا ہے جو ہماری ضروریات اور ہمارے پیش نظر نصب العین کے لحاظ سے ناقابل تسلیم ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس ترکش سے یہ خدنگ نکلتے رہے ہیں اُس میں ابھی کچھ اور تیر ایسے باقی ہوں جو ہماری موجودہ امیدوں میں سے بعض یا اکثر توقعات کا خون کر دیں اور جس قدر آسانیوں اور منفعت کی اس وقت آس لگائی جاتی ہے اس میں بھی فرق آجائے ہندو یونیورسٹی کے ریگولیشنز کچھ صدیوں میں مرتب نہ ہوں گے جو اُن کے انتظار کی زحمت گوارا نہ کی جا سکے پس جو جماعت آج یونیورسٹی قبول کرنے کی حامی ہے وہ عام جذبات قومی اور تعلیم یافتہ گروہ کی ایک

بڑی جماعت کی خواہشات کا لحاظ کر کے اگر کچھ مدت کے لیے اس مسئلے کا تصفیہ ملتوی کر دے تو ہم نہیں جانتے کہ اس قلیل مدت میں قوم کو کونسا نقصان عظیم پہونچ جائے گا۔ بلکہ حقیقت میں خود اُن اصحاب کے لیے جنکے ہاتھوں میں اس وقت علیگڈھ کالج ہے اور آیندہ کچھ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی رہے گی قرین مصلحت یہی ہے کہ اس وقت مؤیدینِ التوا کی بات مان لیں اور ہندو یونیورسٹی کے ریگولیشنز کا مسودہ منظور ہو جانے کے بعد جب تمام اصول و فروع پیش نظر آجائیں اُس وقت حصولِ چارٹر کے لیے زور دیں۔ تاکہ جب مسلم یونیورسٹی کا چارٹر ملے تو اس جماعت کی شرکت امداد سے پورا فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ بے شک علیگڈھ کالج کو آج جن مالی مشکلات کا سامنا ہے اُنکا مقابلہ کرنے میں ان حضرات کو کسی قدر دشواری ہو گی لیکن یہ دشواری ایسی نہیں ہے جس سے عہدہ برآ ہونا محال ہو۔ کم سے کم سالِ گزشتہ کی طرح اس سال بھی مسلم یونیورسٹی کے جمع شدہ چندے کا منافع اس مشکل کو آسان بنانے کے لیے موجود ہے اور غالباً مؤیدینِ التوا کو اس میں عذر نہ ہوگا کہ اُن کی خواہشات کا لحاظ کرنے کے معاوضہ میں وہ اس بارہ میں کسی قسم کا اختلاف کریں۔

قوم کے بڑے اور چھوٹے عام طور پر اب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہمارے مرض کی اصلی دوا وہ مسلم یونیورسٹی نہیں ہو سکتی جو ہمیں دی جا رہی ہے اور جسے چار و ناچار آج نہیں تو کل ہمیں لینا پڑے گا۔ اور جب تک یہ غفلت طاری ہے ہمارے قومی رہنماؤں کو کچھ اندیشہ نہ ہونا چاہیے۔ ہر صورت میں اُنھیں کے ہاتھ بازی رہے گی اور قوم کو جس راہ پر وہ لگائیں گے اُسی پر وہ چلتی رہے گی۔ وما علینا الا البلاغ

گھر میں رکھنے کے قابل کتابیں

علیا حضرۃ بیگم صاحبۂ بھوپال کی تصانیف

تندرستی ۔ حفظانِ صحت ۔ انسدادِ امراض متعدی ۔ تیمارداری کے اصول ۔ حجم ۱۵۰ صفحے قیمت آٹھ آنے ۔ مجلد ۱۲؍

بچوں کی پرورش ۔ زچہ خانہ کی احتیاط ۔ بچوں کی رضاعت ۔ غذا ۔ امراض ۔ نگرانی صحت ۔ متعدی امراض سے حفاظت ۔ زہر اور زہریلے جانوروں کے کاٹنے کا دفعیہ ۔ حوادث میں تیمارداری ۔ عام ممنوعات حجم ۲۰۵ صفحے قیمت ۱۲؍

تربیت الاطفال ۔ بچوں کی تربیت ۔ اخلاق کے اصول جن پر والدین کو کاربند ہونا چاہیے حجم ۱۴۷ صفحے قیمت ۸؍ مجلد ۱۲؍

ہدایات تیمارداری ۔ جس میں ڈاکٹری اصول کے مطابق تیمارداری کے طریقے درج ہیں ۔ قیمت ۲؍ مجلد ۵؍

ہدیۃ الزوجین (خانہ داری کا پہلا حصہ) شوہر و زوجہ کے شرعی و قانونی حقوق و اختیارات اور فرائض جن پر امور خانہ داری کے مناسب انصرام کا دارومدار ہے قیمت ۸؍ مجلد ۱۲؍

حفظ صحت (خانہ داری کا دوسرا حصہ) اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طریقہ پر عورتوں کو زندگی بسر کرنا چاہیے تاکہ اُن کی تندرستی قائم رہے جس کے بغیر گھر کا انتظام کبھی درست ہی نہیں رہ سکتا اور ہمیشہ پریشانی اور مصیبت کا سامنا رہتا ہے ۔ قیمت ۱۴؍ مجلد ۱۲؍

التربیت ۔ تربیت و پرورش اطفال کے متعلق نہایت عالمانہ و کارآمد اور پراز معلومات تقریر ۔ قیمت ۱؍

تہذیب النسواں و تربیت الانسان (مولفہ خلد مکان نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ) جس میں امراض مخصوصہ نسواں ۔ طبی احتیاطوں ۔ خانہ داری کی ضروری اور کارآمد باتوں پر نہایت قابلیت و وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے ۔ کتاب کی مقبولیت اور خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں ۔ طبع جدید کا حجم ۶۶۸ صفحے قیمت ۱۲؍ مجلد ۱۲؍

ہندوستانی گھروں میں تیمارداری جو میجر بیگم صاحب کی لاجواب کتاب "انڈین ہوم نرسنگ" کا ترجمہ ہے ۔ اس میں تیمارداری کے زریں اصولوں سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے جن پر عملدرآمد کرنے سے مریضوں کو بہت راحت اور جلد شفا ہوگی ۔ قیمت ۱۲؍

حفظان صحت ۔ بیگم صاحبۂ صاحبزادہ حمید اللہ خاں بہادر بی اے (علیگ) کے دو مفید لکچر ۔ قیمت ۲؍

تفریح الاطفال (مولفہ مسز جی تحفی لیڈی سپرنٹنڈنٹ مدرسہ سلطانیہ بھوپال) بچوں کے لیے یہ کھیلوں کی کتاب نہایت دلچسپ ثابت ہوئی ہے ۔ قیمت ۸؍

سرگذشت ۔ اس میں بیگم زہرا فیضی صاحبہ نے ہندوستانی گھروں کی بعض غیر متمدن حالتوں کا نقشہ دکھایا ہے ۔ قیمت ۱۳؍

آغوش مادر (مصنفہ سید مخدوم عالم مارہروی) ننھے ننھے بچوں کی مرغوب طبع لوریاں قیمت ۱؍

پہیلیاں (مصنفہ سید مخدوم عالم مارہروی) ننھے بچوں کا دلچسپ اور عقلی امتحان ۔ قیمت ۱؍

ڈومیسٹک اکانومی دو حصے (مولفہ جناب مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے منشی فاضل ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال) سلسلہ سلطانیہ کی یہ لاجواب کتابیں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ازحد کارآمد ہیں ۔ اسکے قصّے کہانیوں میں خانہ داری کی وہ سب باتیں بیان کی گئی ہیں جو ایک مستورات کو ہر روز کی سلیقہ مند گھرستن بنانے کے لیے ضروری ہیں ۔ یہ قصّے کہانیاں اس قدر لطیف اور دلچسپ ہیں کہ ممکن نہیں کہ کوئی لڑکی ایک دفعہ کتاب ہاتھ میں لے اور پھر اسے ختم کیے بغیر رکھ دے ۔ وہ تمام اصحاب جو اپنی لڑکیوں کی عمدہ تعلیم کے خواہاں ہیں اس سلسلہ کی کتابوں کو اپنے گھروں میں ضرور منگا رکھیں ۔ قیمت فی حصہ ۳؍ مکمل سٹ ۸؍ مجلد ۱۲؍

ضخامت [illegible]

مختصر رپوٹ انجمن ترقی اُردو

(اورنگ آباد دکن) بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء و ماہ جنوری و فروری سنہ ۱۹۱۶ء

۱- دسمبر کے آخر ہفتہ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پونا میں منعقد ہوا۔ انجمن کو بھی حسب معمول شب کا وقت رپورٹ خوانی کے لیے ملا - انجمن کا اجلاس زیر صدارت مولوی محمد سلیمان صاحب ندوی منعقد ہوا۔ صدر انجمن نے اول خطبۂ افتتاحیہ پڑھ کر سنایا جو بڑی قابلیت کے ساتھ لکھا گیا تھا اور لوگوں نے عموماً پسند کیا۔ اسکے بعد سکرٹری نے سنہ ۱۹۱۵ء کی رپوٹ سنائی۔ جس میں سال بھر کی کارگزاری کا حال درج تھا- رپورٹ زیر طبع ہے اور ہفتہ عشرے میں چھپ کر شایع ہو جائے گی۔ رپوٹ کے ختم ہونے کے بعد جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ایک پُرجوش تقریر میں سکرٹری کے حُسن کارگزاری کے متعلق شکریہ کا ریزولیوشن پیش کیا

۲- فلسفۂ اجتماع اور البیرونی چھپ کر شایع ہو گئی ہیں اور سکرٹری یا مہتمم صاحب دارالاشاعت انجمن ترقی اُردو لکھنؤ سے مل سکتی ہیں۔ دریاے لطافت بھی چھپ چکی ہے اور چند روز میں شایع ہو جاے گی۔

۳- علم المعیشت زیر طبع ہے۔ اردو زبان میں اس علم پر یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں تمام مشکل اور ضروری مسائل آسان اور سریع الفہم زبان میں ادا کیے گئے ہیں۔

۴- علم و عمل حفظان صحت مولفۂ کپٹن سرجن لطافت حسین خاں صاحب۔ آئی۔ ایم۔ ایس ختم ہو چکی ہے۔ نظر ثانی اور تصیح کا کام ہو رہا ہے۔

۵- تاریخ اخلاق یورپ کا ترجمہ مسٹر عبد الماجد بی۔ اے ختم کر چکے ہیں اب صرف نظر ثانی فرما رہے ہیں۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔

۶- مسٹر عبد الماجد انجمن کی فرمایش پر علم النفس پر بھی ایک کتاب تحریر فرما رہے ہیں۔

۷- ہیئت پر جو کتاب مولوی برکت علی صاحب بی۔ ایس سی لکھ رہے تھے اس کا کام ابھی تک

ہی مستعدی کے ساتھ جاری ہے۔ یہ ایک مبسوط اور جامع کتاب ہو گی۔ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

۸ سید ہاشمی صاحب انجمن کی فرمائش پر یونان و روم کی تاریخ پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جو نصاب تعلیم کے کام بھی آ سکیں اور عام پڑھنے والوں کے لیے بھی مفید ہوں۔

۹ اسکے علاوہ چند اور مفید علمی کاموں کی تجویز کی جا رہی ہے جو ملک کے لیے بہت مفید ہوں گے ان کی تفصیل آیندہ رپوٹ میں درج کی جائے گی۔

۱۰۔ حضرات ذیل نے ازراہِ عنایت جدید ارکان انجمن ہونا قبول فرمایا۔ اسمائے گرامی مع چندہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جناب پروفیسر قادر حسین خاں صاحب ایم۔اے سول سروس لاج حیدرآباد دکن عہ، (سکہ عالی)

(۲) جناب مولوی محمد اسداللہ خاں صاحب بی لے رجسٹرار مجلس وضع قوانین سرکار عالی (عہ،) ״

۱۱۔ حضرات مندرجہ ذیل نے بطور عطیہ انجمن کو جو رقوم ازراہ ہمدردی عطا فرمائیں اُنکے اسمائے گرامی مع شکریہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جناب چودھری محمد صالح صاحب تحصیلدار نصراللہ گنج بھوپال	۸	سکہ قیصریہ
(۲) جناب منشی رشید احمد صاحب آرشد تھانوی کورٹ سب انسپکٹر ״	۵،	״
(۳) جناب ننھے خاں صاحب رئیس کنٹھ	۵	״

۱۲۔ حضرات ذیل نے چندۂ رکنیت ادا فرما کر انجمن کو ممنون فرمایا اسما مع چندہ درج ذیل ہیں۔

(۱) مولوی عبدالوحید صاحب ایم۔اے اجمیر	(ے)	سکہ قیصریہ
(۲) مسٹر ظفر عمر بی۔اے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کھیری	(عہ،)	״
(۳) نواب غلام احمد صاحب کلامی کورنڈل بنگلور	(عہ،)	״
(۴) مولوی جمیل احمد صاحب ڈسٹرکٹ انجنیر عثمان آباد۔دکن	(عہ،)	سکہ عالی
(۵) مولوی محمد تقی حسین صاحب تعلقدار صرف خاص ״	(عہ،)	״

(۶) مسٹر داراب جی باکوجی چلنائی مددگار معتمد مالگذاری عثمان آباد دکن (لعہ) سکہ عالی

(۷) مولوی سردار علی خاں صاحب دوم تعلقدار رائچور " (عہ)

(۸) مولوی خان عالم خاں صاحب اسسٹنٹ انجنیر بیدر " (عہ) "

(۹) مولوی محمد علیم الدین صاحب مددگار مہتمم کوتوالی نلگنڈہ " (عہ) "

(۱۰) مولوی سید شاہ پیران صاحب بی اے مہتمم مجلس نظام آباد " (لعہ) "

(۱۱) مولوی نذیر محمد صاحب ڈرائنگ ماسٹر مدرسۂ صنعت و حرفت " (سے) "

(۱۲) مولوی عبد الرشید صاحب پیرزادہ درگاہ قلندر صاحب پانی پت " (عہ) سکہ قیصریہ

(۱۳) جناب سید یعقوب حسن صاحب مدراس (لعہ) "

(۱۴) جناب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی ہیڈ ماسٹر جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ " "

(۱۵) جناب منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال " "

(۱۶) جناب مولوی سلطان حیدر صاحب جوش نائب تحصیلدار بلگرام " "

(۱۷) جناب مولوی خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب سب ڈویزنل افسر سونی پت " "

(۱۸) جناب مولوی عبد الرزاق صاحب تحصیلدار دیوان گنج بھوپال (سے) "

(۱۹) مولوی تفضل حسین صاحب صدر مدرس مدرسۂ مڈل ہنگولی دکن (عہ) سکہ عثمانیہ

(۲۰) جناب مولوی امین الحسن صاحب تعلقدار کپل " (لعہ) "

(۲۱) جناب مولوی حمید الدین صاحب بی۔ اے صدر دار العلوم " (عہ) "

(۲۲) جناب مولوی معشوق حسین خاں صاحب بی اے مددگار معتمد مالگزاری " (صہ) "

(۲۳) جناب مولوی مصطفٰی علی صاحب وکیل جالنہ " (سے) "

(۲۴) جناب مولوی محمد شرف الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ " (لعہ) "

(۲۵) جناب احمد خاں صاحب ہیڈ کوارٹر انسپکٹر پولیس نلگنڈہ " (عہ) "

(۲۶) جناب نواب فخر جنگ بہادر تعلقدار بھونگر " (عہ) "

(۲۷) جناب رنگاریڈی صاحب تحصیلدار کھم ورنگل دکن (عدر) سکۂ عثمانیہ
(۲۸) جناب خان بہادر محمد یوسف صاحب سول انجینیر حیدرآباد " (عدر) "
(۲۹) جناب نوبی محمد بیگ صاحب افسر تصفیۂ اراضی عثمان ساگر " (عہ) "
(۳۰) جناب محمد حبیب اللہ صاحب ڈپٹی ناظم عدالت بیڑ " (عہ) "
(۳۱) جناب مسٹر ڈی-بی کامت بی-اے مہتمم تعلیمات ضلع پربھنی " (صہ) "

مطبوعات جدید

فلسفۂ اجتماع (قیمت غیر مجلد عہ مجلد ۱۲؍) مسٹر عبدالماجد بی اے مصنف فلسفۂ جذبات نے علم النفس کی یہ دوسری کتاب انجمن کے لیے لکھی ہے جس کا انگریزی ایڈیشن تھوڑے سے تغیر کے ساتھ انگلستان کے مشہور کارخانہ فشرانون کمپنی کے یہاں چھپا ہے - فلسفۂ جذبات میں جہاں افراد انسانی کے نفسیاتی ادراک اور اُس کے زیر اثر جو افعال سرزد ہوتے ہیں اُن سے بحث کی گئی تھی یہاں فلسفۂ اجتماع میں اُن کیفیات و حسیاتِ نفس کا بیان ہے جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں - اس میں فاضل مصنف نے بڑی خوبی اور امثال کے ساتھ اُن تعلقات کا ذکر کیا ہے جو لیڈروں اور عوام میں پایا جاتا ہے۔

البیرونی (قیمت مجلد ۱۲؍) ہمارے ماسٹر سید حسن برنی بی اے (علیگ) نے بڑی کوشش و جستجو سے علامہ ابوریحان بیرونی کے حالات جمع کیے ہیں اور اس علامۂ جلیل کی سوانحعمری مرتب کرکے اہل ملک کو کتاب الہند کی زندگی کے اہم واقعات اور اُسکے کمال ذوق علمی و رطالبعلمانہ تجسس و تلاش سے آشنا کر دیا ہے - جس کے مطالعہ سے اس بات کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی علم و فن کے حاصل کرنے کے لیے کس درجہ استقلال - ہمت اور جفاکشی کی ضرورت ہے بیرونی کی حقیقی عظمت کا زیادہ صحیح اندازہ اُردو خواں اصحاب کو اُس وقت ہو سکے گا جب کتاب الہند کا ترجمہ ہماری زبان میں ہو جائیگا مگر اس نسبتاً مختصر سوانحعمری اور تبصرہ سے بھی ایک حد تک اس جلیل القدر محقق کے مرتبہ و مدارج کمال کا اندازہ ہو جائے گا -

ایجنٹ امیر چند وزیر چند عطار۔ کناری بازار۔ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸۳ جلد ۱۴ — یکم مئی ۱۹۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸۲ جلد ۱۴ — یکم مئی سنہ ۱۹۱۶ء

فلسفۂ فطرت

(رقم زدۂ جناب شیخ فیروز الدین مراد، ایم۔ ایس۔ سی، بی۔ اے، پروفیسر علوم طبیعات ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ)

فہرست مضامین (رسالہ فلسفہ فطرت)

فصل (۱) مقالات افتتاحیہ

فصل (۲) علوم طبیعات کی تقسیم

فصل (۳) علمی تحقیقات سے حقیقی مسرت کا حصول

فصل (۴) علوم طبیعات کی تحصیل کے عملی فائدے

سائنس کا افادہ - مکالے کی رائے - مقابلہ ماضی و حال - تمدن پر سائنس کا اثر - سائنس کی علت اصلی استفادہ نہیں ہے - ایک عملی مثال -

فصل (۵) سائنس اور حق تعالیٰ کی شکرگزاری

سائنس کی علتِ غائی - سرجان ہرشل کی رائے - خالق کا احسان - سائنٹفک شکرگزاری - معرفت یزداں -

(۱) مقالۂ افتتاحیہ

یہ مضمون دراصل لارڈ کیلون کے اُس ابتدائی لکچر کا ملخص ہے جو پچاس برس سے زائد عرصہ تک لارڈ کیلون بہ حیثیت پروفیسر علوم طبیعات گلاسگو یونیورسٹی میں ہر سال اپنی سائنس کی جماعتوں کے سامنے پڑھا کرتے تھے - لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے ہم نے بہت سی جگہوں میں اپنی طرف سے تبدیلیاں اور ترمیمات علاوہ اُن تصرفات کے کی ہیں جو اُردو خواں پبلک کے لیے اس مضمون کو مناسب بنانے کے لیے ضروری تھے لیکن عام طور پر اس مضمون کا ماخذ وہی شہرۂ آفاق لکچر ہے جسے ہمارے زمانہ کا سب سے بڑا عالمِ صحیفۂ فطرت پچپن برس تک اپنے طلبہ کے سامنے سال بسال پیش کیا کرتا تھا۔

تمہید

لارڈ کیلون کے نام نامی سے بہت سے اردو داں اصحاب ناواقف ہوں گے - اس ناواقفیت کی بالعموم دو وجہیں ہیں - اوّلاً ملک میں علمی مذاق کا فقدان دوئم لارڈ کیلون کی ہمعصری اور اُس کے علمی انکشافات اور ایجادات کی دقت اور بلند پائگی - سببِ ثانی سببِ اول سے زیادہ زبردست مانع ہے اس لیے کہ باوجود علمی مذاق کے فقدان کے نیوٹن کا نام ہندوستان میں بھی غیر معروف نہیں ہے - ایک بڑی وجہ اس فرق کی یہ بھی ہے کہ ہر ایک محقق کے علمی کارنامے اُس زمانہ کی اوسط علمی حالت سے یقیناً ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں جس میں کہ اسکی زندگی بسر ہوتی ہے - نیوٹن جس زمانہ میں گزرا تھا اُس زمانہ کی علمی حالت بہت ردی تھی یہاں تک کہ فی زمانا ایک معمولی طالب علم اُس زمانہ کے لائق عالموں سے زیادہ نہیں تو برابر ضرور جانتا ہے - یہی وجہ ہے کہ نیوٹن کی علمی تحقیقات

ہمعصر مشاہیر سے ناواقفیت کے وجوہ

اور انکشافات کے نتائج سائنس کے ہر ایک طالب علم کے معلومات کا ضروری جزو ہیں اور عوام الناس بھی کم و بیش نیوٹن کی عظمت کے معترف ہیں۔ چند صدیوں کے بعد اسی قاعدہ کے مطابق لارڈ کیلون بھی تمام مہذب اور علم دوست ممالک میں عوام الناس کے محدود احاطۂ علم میں داخل اور شامل ہو جائیگا۔

انشاءاللہ العزیز ہمارے ایک انگریزی مضمون* کا اُردو ترجمہ عنقریب بعنوان "لارڈ کیلون کے مختصر سوانح اور علمی کارنامے" شایع ہو جائے گا۔ سر دست ہم موجودہ مضمون کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ناظرین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لارڈ کیلون کا رتبہ علمی دنیا میں کسی حیثیت سے نیوٹن اعظم سے کم نہیں ہے۔ عام تفہیم کے لیے آپ اس حقیقت پر یوں غور کر سکتے ہیں کہ اگر ہم نیوٹن اور کیلون کو اپنے اپنے علمی کارناموں کے چبوترہ پر اِن کے علمی قد کے مطابق کھڑا فرض کریں تو تفاوتِ زمانہ کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ان دونوں کے سَروں کو ملانے والا خط بہ شکل ٹیڑھا ہوگا، بہ الفاظِ دیگر بادی النظر میں یہ بتانا آسان نہ ہوگا کہ علمی حیثیت سے کون زیادہ اونچا ہے؟ کیلون یا نیوٹن؟۔ دونوں کے سَر تقریباً ایک ہی بلندی پر نظر آئیں گے۔ ہاں اس ذہنی تصویر میں جو امر نمایاں طور پر نظر آئے گا وہ ان دونوں کے درمیانی زمانہ کے باقی تمام سائنس دانوں کے سروں کا اِس خط سے بہت نیچا ہونا ہوگا۔

لارڈ کیلون اور نیوٹن کا مقابلہ

مضمون کی دلچسپی کو بڑھانے کی خاطر ہم مختصراً لارڈ کیلون کے متعلق چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ لارڈ کیلون کا اصلی نام ولیم ٹامسن ہے۔ آپ ۱۸۲۴ء میں بلفاسٹ میں پیدا ہوے تھے جبکہ آپ کا باپ جیمز ٹامسن بلفاسٹ میں حساب کا پروفیسر تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ امتحان بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۴۶ء میں ۲۲ برس کی نازک عمر میں آپ گلاسگو یونیورسٹی میں علوم طبیعات کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور برخلاف ہمارے پس ماندہ مُلک کے پس ماندہ پروفیسروں کے جو لُڑھکتے ہوے پتھر کی طرح آج یہاں اور کل وہاں تلاش روزگار میں

لارڈ کیلون کے مختصر سوانح

* اصلی مضمون مدراس کے پاپولر سائنس جرنل کی دو اشاعتوں میں (جولائی ۱۹۱۳ء و اکتوبر ۱۹۱۳ء) بعنوان مشاہیر سائنس سلسلۂ دوم شائع ہو چکا ہے۔

بھٹکتے پھرتے ہیں آپ ساٹھ سال سے زائد تک پروفیسری کی خدمات نہایت قابلیت کے ساتھ اُسی گلاسگو

یونیورسٹی میں سرانجام دیتے رہے۔ ۱۸۹۶ء میں آپ کے پچاس سالہ عہد پروفیسری کی جو شاندار جوبلی علمی دنیا میں منائی گئی وہ کسی بادشاہ کی جوبلی سے کم نہ تھی۔

علاوہ ازیں ایک درنمایاں فرق جو ہندوستان کے پروفیسروں کی غیر معروف اور کس مپرسی کی زندگیوں میں اور لارڈ کیلون کی ممتاز پروفیسرانہ زندگی میں پایا جاتا ہے وہ ایک طرف تو لارڈ کیلون کا علمی ذوق تحقیقات اصلی میں انہماک اور پھر حکومت وقت سے

ہمارے ملک کے پروفیسر صاحبان کی حالت زار

انکی قابلیت اور علمی خدمات کا شاندار اعتراف ہے اور دوسری طرف ہندوستانی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی مردہ زندگی (جو اصلی تحقیقات یا علمی ذوق سے اسی قدر دور ہوتی ہے جس قدر قطبین میں بُعد ہے) اور تعلیم سے زیادہ غیر تعلیمی معاملات میں بے حد دلچسپی لینا ہے۔ علاوہ پروفیسری کی اہم خدمات کے بخوبی سرانجام دینے اور گلاسگو یونیورسٹی کے علمی محل کو آراستہ کرنے کے آپ مدتوں انگلستان کی بلکہ دنیا بھر کی سب سے سربرآوردہ علمی انجمن رائل سوسائٹی آف لندن (یعنی لندن کی شاہی انجمن جس کا مقصد جمیع جملہ علوم انسانی کی اشاعت اور ترقی ہے اور جس کے نام کے ساتھ ارادۃً ہمہ گیری کے اظہار کے لیے کوئی تخصیص نہیں لگائی گئی) کے صدر رہے۔ برٹش ایسوسی ایشن (جو مسلمانان ہند کی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح مختلف مقامات پر اپنے سالانہ اجلاس کرتی ہے بہ ایں فرق کہ ہماری تعلیمی کانفرنس کا صدر شاذ ہی محکمۂ تعلیم سے تعلق رکھتا ہے اور انگلستان اور باقی ممالک کی انجمنوں کے جو برٹش ایسوسی ایشن کے نمونہ پر ملک کے تمام حصص میں تعلیمی چرچا پھیلانے کے لیے قائم کی گئی ہیں صدر بالعموم یونیورسٹیوں کے پروفیسر یا استاد ہوتے ہیں) کے متعدد سالانہ اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے اور علمی مضامین پڑھے۔ ۱۸۶۹ء میں سب سے پہلی اٹلانٹک کیبل (یعنی بحر ظلمات کے پار انگلستان کے مغربی ساحل اور امریکہ کے مشرقی ساحل کے مابین برقی پیغام رسانی کے واسطے آبی تار) کے لگانے میں علمی حصہ لیا اور مانچسٹر میں جول (لارڈ کیلون کا ایک نامور سائنس داں معصر) کے ساتھ نسبت سے تجربات کرنے کے لیے جاتے رہے۔ گورنمنٹ نے ان علمی خدمات کے اعتراف میں پہلے ان کو نائٹ بنایا اور ازاں بعد لارڈ۔ سائنس کا لارڈ

عمر کے آخری حصہ میں لارڈ کیلون پارلیمنٹ کے دارالامراء (ہوس آف لارڈز) میں شریک ہوتے تھے۔ خاتمہ میں اس امر کا بیان بے محل نہ ہوگا کہ لارڈ کیلون قدرتی مناظر اور سیر و تفریح سے حظ وافر حاصل کرتے تھے۔ بالخصوص آپ سمندر کی سیر کے بہت شایق تھے۔ اپنی سبک رفتار کشتی "لالہ رُخ" میں بیٹھ کر دنوں بلکہ کئی کئی ہفتوں تک سمندر ہی میں رہتے تھے اور پھر جیسا کہ معراج کمال کا لازمہ ہے یہی آبی سیر علمی تحقیقات کے لیے ان کو نیا نیا مسالہ بہم پہونچاتی تھی۔

اب ہم اِن تمہیدیہ تشریحات کے بعد لارڈ کیلون کے ابتدائی مضمون متعلقہ فلسفۂ فطرت٭ کا ملخص ترجمہ نکتہ رس اصحاب کی تفریح طبع کے لیے پیش کرتے ہیں۔

(۲) علوم طبیعات کی تقسیم

کسی نئے مضمون کا مطالعہ شروع کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کی حدود کی تعیین کرلی جائے۔ لیکن سائنس میں کسی حصۂ مضمون کی جامع و مانع تعریف کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور آج تک ایسی تمام کوششوں کا نتیجہ ناکامی رہا ہے۔ تعریف کرنے سے زیادہ ضروری اور مفید کام مطالعہ میں باقاعدگی اور حسن اسلوب پیدا کرنا ہے۔ ....

روح اور مادّہ قدرت کے دو بڑے حصّے اور علمی تحقیقات کے لیے نہایت ہی موزوں اور جداگانہ مضامین ہیں۔ روح کے متعلقہ علوم کو روحانیات یا دماغی علوم کہتے ہیں اور گو فطرت کے مفہوم میں صحیح طور پر تمام مخلوق اشیاء شامل ہیں لیکن عام طور پر علوم فطری سے مراد صرف وہ علوم ہوتے ہیں جو فطرت کے مادّی حصہ سے بحث کرتے ہیں۔ روح اور مادّہ

مظاہرِ فطرت یعنی بیرونی دنیا کے مظاہر کے ترقی کناں مطالعہ میں پہلا درجہ واقعات کا مشاہدہ اور تنظیم (جماعت بندی) ہے اور اسکے بعد قوانینِ قدرت کی تلاش میں استقرائی کلیے بنائے جاتے ہیں۔ سائنس کے اِن دو مدارج کا علٰحدہ علٰحدہ نام تواریخ فطری (نیچرل ہسٹری Natural History) اور فلسفۂ فطری (نیچرل فلاسفی Natural Philosophy) ہے۔ انسانی معلومات کی دوسری بڑی شاخ یعنی دماغی علوم (روحانیات) تاریخ فطرت اور فلسفۂ فطرت

٭ لارڈ کیلون کے زمانہ میں فلسفۂ فطرت یعنی نیچرل فلاسفی Natural Philosophy کی اصطلاح علوم طبیعات یعنی فزیکل سائنسز Physical Sciences کی نسبت زیادہ مروج تھی۔ مفہوم دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔

میں بھی اسی کے مشابہ مدارج ہیں جن پر ہم اس خیال سے کہ وہ ہماری مندرجۂ بالا تقسیم پر روشنی ڈالتے ہیں یہاں ایک لمحہ کے لیے بحث کرتے ہیں ۔

روحانیات کے مطالعہ کے پہلے درجہ میں ہم صرف ذاتی تجربہ اور مختلف قسم کے آدمیوں اور اُن کے اخلاق و عادات کے مطالعہ تک یعنی سیاسیات اور تواریخ تک محدود رہتے ہیں۔ اور پھر اسکی بنا پر ہم انسانی دل و دماغ کی خواصیات پر بحث کرتے ہیں اور عام قوانین کے اس نظام کو مرتب کرتے ہیں جسے اصطلاح میں فلسفۂ روحانی کہ سکتے ہیں۔ اسی طرح مظاہر قدرت کے مطالعہ میں پہلا درجہ مادہ کی اُن مختلف اقسام کے متعلق جن کی خواصیات کا مطالعہ ہمیں مقصود ہوتا ہے ۔ واقعات کا مشاہدہ اور تنظیم ہے اور یہ درجہ جائز طور پر تاریخ فطری کہلاتا ہے۔ عہد تاریخ فطری کے جمع شدہ واقعات کی بنا پر استقرائی طور پر مادی دنیا کے کسی خاص حصہ میں عام قوانین کا مرتب کرنا مناسب طور پر فلسفۂ فطری کا فعل قرار دیا جا سکتا ہے۔

عام طور پر ان اصطلاحات کے استعمال میں یہ تفریق ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ کیونکہ مندرجہ بالا تشریح کے مطابق گو ہر ایک علم کے پہلے درجہ کو تاریخ فطری سے موسوم کرنا چاہیے لیکن محاورۃً تاریخ فطری کے مفہوم

فلسفۂ فطری کی حدبندی کو زمین پر عالم حیوانات معدنیات و نباتات کے متعلق واقعات کی تشریح اور تنظیم تک محدود کر دیا گیا ہے اور برعکس اس کے مدوجزر۔ آب و ہوا اور درجۂ حرارت کے اختلافات اور نیز اجرامِ فلکی کی حرکات اور اُن کی شکل کی بحث کو علوم فطری کے مختص حصوں یعنی علم آب و ہوا metereology and climatology اور تشریحی علم ہیئت Descriptive Astronomy میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ موخرالذکر علوم میں شروع ہی سے باقاعدہ مشاہدات اور تجربات کا ضروری ہونا قرار دیا جا سکتا ہے۔

فلسفۂ فطری کا صحیح مفہوم سمجھنے کے بعد یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اسکے بعض حصوں کو خاص خاص مستقل نام دیے گئے ہیں مثلاً ارضیات۔ کیمیات۔ عضویاتِ حیوانی اور عضویاتِ نباتاتی وغیرہ اور

علوم طبیعیات کی تفصیل گو یہ سب علوم حقیقی طور پر فلسفۂ فطری میں شامل ہیں لیکن اب فلسفۂ فطری

کا ذکر کرتے ہوئے عام طور پر ان کو فلسفۂ فطری سے جداگانہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس تخصیص اور علیحدگی کے بعد فلسفۂ فطری کا سب سے اہم موضوع ڈائنامکس[1] یعنی علم القوۃ

۱۔ علم القوۃ اور اُسکی تقسیم — (جسے عرف عام میں علم جرثقیل بھی کہتے ہیں) ہے جس میں میکانیک[2] علم الحرکت[3] اور علم توازن القویٰ[4] شامل ہیں۔

ہر ایک مظہرِ قدرت کسی نہ کسی طریقہ سے قوّت کا اظہار کرتا ہے اور اس لیے قدرت کا کوئی فعل قوّت کی تاثیر سے آزاد نہیں ہوتا۔ بنا بریں علم القوۃ تمام علوم طبیعیہ کی رُوح درواں ہے۔ اور پیشتر اس کے کہ قدرت کے فلسفیانہ مطالعہ میں کوئی ترقی کی جا سکے علم القوۃ کے اصولوں کو مکمل طور پر سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء کے اتفاق رائے سے علم القوۃ تمام علوم طبیعیہ سے مقدم

۲۔ خواص المادّہ — سمجھا جاتا ہے۔ علومِ طبیعیات کا ایک مستقل حصہ آج کل خواص المادّہ یا (Properties of matter) تسلیم کیا گیا ہے جس میں تصوراتِ مجردہ کی مدد سے مادہ کے عمومی خواص تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیے جاتے ہیں مثلاً لچک۔ کشش ازانیب شعری۔ سالکات کی انزوجی رگڑ (وس کاسٹی Viscosity) وغیرہ وغیرہ۔

علم الحرکت اور علم توازن القویٰ فلسفہ میکانیک کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ موخرالذکر میں دو یا دو سے زیادہ قوّتوں کے توازن سے بحث کی جاتی ہے اور علم الحرکت میں غیرمتوازن قوّتوں کے اثر پر جس کا اظہار اجسام میں حرکت پیدا کرنے یا اُن کی حرکت بدلنے سے ہوتا ہے بحث کی جاتی ہے۔ علم الحرکت کی دو شاخیں ہیں ایک کا مبحث مخصوص اجسام میں ایک خاص رفتار کی حرکت پیدا کرنے یا ایک متحرک جسم کو ساکن کرنے کے لیے یا اسی قسم کے اور مسائل میں ضروری قوّتوں کی دریافت ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف نے اس حصۂ علم کے لیے ایک خاص نام کِنےمٹکس Kinematics تجویز کیا ہے جسکے معنی حرکتِ محض کے ہیں۔

علاوہ ازیں علم الحرکت اور علم توازن القویٰ کے اور حصے بھی ہیں جو زیادہ تر اُن اجسام سے

Statics[4] Kinetics[3] Mechanics[2] Dynamics[1]

متعلق ہیں جن پر قوت کا اثر دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہائڈروسٹیٹکس Hydrostatics اور ہائڈروکائنٹکس Hydrokinetics اِن خاص شاخوں کے نام ہیں جن میں مائع اجسام کی حالتِ سکون اور حالتِ حرکت سے بحث کی جاتی ہے اور تخصیص کو ایک قدم آور آگے بڑھا کر نیومیٹکس Pneumatics مائع اجسام کی حالتِ سکون کے متعلقہ علم کے اُس مخصوص حصہ کا نام ہے جس میں ہوائی اجسام پر بحث کی جاتی ہے۔ اسی طرح علم الصوت (اکوسٹکس Acoustics) عام علم الحرکت کا وہ خاص

۳۔ علم الصوت

حصہ ہے جس میں اُس خفیف حرکتِ لرزاں کے قوانین دریافت کیے جاتے ہیں جن سے آواز کے مختلف مظاہر متعلق ہیں۔ فلسفۂ فطری کے مختلف حصوں کی امتیازی خصوصیات کی تشریح ان مضامین کی مثالیں بیان کرنے سے عمدہ طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔

ہمارے مبحث کی ایک اور بڑی تقسیم علم النور (آپٹکس Optics) ہے جس میں روشنی کی خواصیات اور بینائی کے قوانین دریافت کیے جاتے ہیں۔ کیا بلحاظ اُن لاتعداد نورانی مظاہر کے جو

۴۔ علم النور

آغوشِ قدرت میں آشکارا ہیں اور کیا بلحاظ اُن مختلف النوع اختبارات کے جو کہ اس مضمون کے متعلق علمی معملوں میں کیے جا سکتے ہیں روشنی کا علمی مطالعہ بیش از بیش دلچسپیوں اور دلکش مناظر کا مَموّہ ہے۔ برعکس اس کے جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ علم ہیئت کے تمام جدید مشاہدات جن سے علم ہیئت میں اس قدر نمایاں اور وافر ترقی ہوئی ہے اُن آلاتِ رصدی کے محتاج ہیں جو علم النور کے قوانین اور اصولوں کی دریافت و انکشاف پر منحصر ہیں اور نیز یہ کہ نہ صرف علم ہیئت میں بلکہ علومِ طبعیات کے ہر ایک حصہ کی صحیح تحقیقات میں ایسے آلات کا استعمال لابدی ہے تو روشنی کے علم کے مطالعہ کا عملی افادہ اِس کی دلکشی اور دلچسپی سے کہیں زیادہ گہرا نقش انسانی دل پر بٹھاتا ہے۔

صحیفۂ فطرت کے طالبِ علم کے لیے انسانی آلۂ سمع یعنی کان اور انسانی آلۂ بصر یعنی آنکھ غیر معمولی انہماک اور عمیق مطالعہ کے مرکز ہیں۔ لیکن ان دونوں حیرت انگیز اور مکمل آلاتِ انسانی کی خوبیوں کا

آنکھ اور کان کی صنعت کا اعجاز

کما حقہٗ احصا کرنے کے لیے نہ صرف صوتیات (علم الصوت) اور بصریات پر کافی عبور ہونا چاہیے بلکہ تمام ان آلات کا بھی پورا پورا علم ہونا چاہیے جو ان عضووں سے [illegible]

کان اور آنکھ کا عملی وظیفہ سرانجام دینے، ان کے نقائص کا تدارک کرنے یا اُن کے افعال میں اعانت کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہم اس اہم عضوی بحث کو کسی دوسرے مضمون کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں اور یہاں صرف اتنا بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ آج تک باوجود اتنی وسیع علمی ترقی کے انسانی اور کان اور آنکھ کے وظائف کی مکمل تشریح کرنے سے قاصر ہے۔ مدہم، اونچی، لمبی اور باریک سبھی قسم کی آوازیں کان کس طرح صحیح طور پر سُن لیتا ہے؟ ریشہائے کورٹی کی مدد سے! لیکن اس صنعتِ بدیع کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہے! آنکھ کے ذریعہ دماغ بیرونی اجسام کی اُلٹی تصویر کس طرح سیدھی کر لیتا ہے! یا وہ نقائص جو عمدہ سے عمدہ محدب شیشوں Lenses میں پائے جاتے ہیں اور جن کا مکمل دفعیہ ناممکن ہے انسانی آنکھ کے محدب شیشے میں کیوں مفقود ہیں؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات ایک بسیط تشریح کے محتاج ہیں۔)

فلسفۂ فطرت یا علوم طبیعات کے بقیہ مضامین تین حصص پر منقسم ہیں۔ حرارت برق اور مقناطیس علم کی اِن سہ گانہ شاخوں کی تحقیقات نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ میکانیک کی طرح ان کے جملہ مظاہر کو ہم چند آسان قوانین کے ماتحت رکھ کر حسابی
علم الحرارت۔ علم البرق اور علم مقناطیس
دلائل سے ہر ایک نتیجہ کا استنباط کر سکیں۔ اس لیے اِن کے مطالعہ میں مشاہدہ اور تجربہ معلومات کا اصلی ذریعہ ہیں۔ بنا بریں بالعموم علوم طبیعات کے تجرباتی حصہ میں صرف یہی تینوں مضامین شامل کیے جاتے ہیں گو فلسفۂ فطرت کے مکمل نظام کی تکمیل کے لیے علم القوۃ، علم النور اور علم الصوت وغیرہم علوم کاملہ بھی جن کی تشریح حسابی قواعد کے مطابق چند بسیط قوانین کی مدد سے ہو سکتی ہے فلسفۂ فطرت کے نصاب میں شامل کیے جاتے ہیں۔

(اس فقرہ کے حصۂ اول کے متعلق یہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ کیلون کے تقاضائے تکمیل کے مطابق نظریۂ برقیہ (الکٹران تھیوری Electron Theory) علم البرق اور علم المقناطیس
نظریۂ برقیہ کی ہمہ گیری
کی تشریح کے لیے روز افزوں کفایت کر رہا ہے۔ ہم اس مبحث پر مزید روشنی اپنی تصنیف جدید علمی قیاسات اور فلسفۂ طبیعات میں ڈالیں گے اور یہ دکھائیں گے کہ کس طرح

تمام برقی اور مقناطیسی مظاہر کی صحیح تشریح ایک حد تک اس ایک نظریہ کی مدد سے ہوسکتی ہے بلکہ بعض حالات میں یہ نظریہ جدید انکشافات کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ علم الحرارت میں گو نظریہ میکانیکی متعلقۂ حرارت (ڈائی نیمکل تھیوری آف ہیٹ - Mechanical or Dynamical Theory of Heat) ایک حد تک گرم اجسام کے مختلف مظاہر اور خواصیات میں ارتباط و اتصال قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن اس کی تشریحات عمومیتِ تامّہ سے عاری ہیں اور اس لیے لارڈ کیلون نے اپنے پہلے فقرہ کو قائم رکھا ہے)

(۳) علمی تحقیقات سے حقیقی مسرت کا حصول

از منۂ قدیمہ سے آج تک صحیفۂ فطرت کے مطالعہ میں جس قدر کامیابی حاصل ہوچکی ہے اور حقائق قدرت کے انکشاف میں جتنی ترقی انسانی دماغ نے کرلی ہے اس پر غور کرتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ صانع مطلق نے اپنے کارہائے نمایاں کی بقا، دنیا کی یکرنگی اور نفس انسانی اور صحیفۂ فطرت کا مطالعہ صیانت حیات وغیرہ کے متعلق جو قوانین ازلی وضع کیے ہیں اُنکے دریافت کرنے کی دماغی طاقت جو اُس حکیم پاک نے انسانی ذہن میں ودیعت کی ہے ہماری تمام خداداد قابلیتوں میں سے برگزیدہ ترین طاقت ہے۔ اگر ہم اپنی استعداد کے مطابق اِن قوٰی کی تربیت اور تہذیب کے مواقع سے بہترین طور پر مستفید نہ ہوں تو ہم کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اُسکی عنایات کا مستحق ثابت نہیں کرتے۔ اس سے بالاتر اللہ تعالیٰ نے استعداد تحصیل کے ساتھ ساتھ اس طاقت کا استعمال ذریعۂ خوشی اور موجبِ انبساط بھی بنا دیا ہے اور یہ حقیقی طور پر صحیح ہے کہ عقل کے راستے خوشی اور مسرت کی شاہراہیں ہیں۔ حق سبحانہٗ کا احسان ہے کہ نہ صرف ہم اسکے وضع کردہ قوانین کے انکشاف کی کوشش کرنے کے اہل بنائے گئے ہیں بلکہ اس کوشش میں جو لذت اور سُرور پنہاں ہے اس کے سامنے باقی تمام لذات اور سُرور ہیچ اور سات ہیں۔ آج سے ۲½ ہزار برس قبل صحیفۂ سائنس کے مطالعہ کی لذات فطرت کے ایک جید طالبِ علم لُکریشس Lucretius* نے اُس قناعت اور انبساط کو جو حقائقِ قدرت کی تحقیقات سے حاصل ہوتی ہے بوضاحت یوں ادا کیا ہے " یہ ایک دل خوش کُن منظر ہے

* اس کا حاشیہ صفحہ ۱۱ میں ملاحظہ ہو۔

کہ ہم حفاظت کے ساتھ ساحل پر کھڑے یا چہل قدمی کرتے ہوئے متموّج سمندر کے اوپر جہازوں کو تلملاتے ہوئے یا ایک محصور بُرج میں محفوظ ہوکر میدانِ کارزار میں دو افواجِ قاہرہ کو نبرد آزما ہوتے ہوئے دیکھیں۔ لیکن نفسِ انسانی کے لیے اس سے کہیں زیادہ خوشی کا مقام حصارِ حق میں قلعہ گزیں اور تمکن ہونا اور وہاں سے دوسرے آدمیوں کی غلط کاریوں اور محنتوں کا مطالعہ اور استقصاء کرنا ہے"۔

حقیقی اور غیر فانی خوشی کی تعریف

بیکن Bacon علم اور سائنس کی خوشیوں کو باقی تمام خوشیوں سے اعلیٰ اور ارفع گردانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام خوشیوں سے آخرالامر انسان کو ایک قسم کی سیری حاصل ہو جاتی ہے اور اُن کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اور ازلی خوشیاں نہیں ہیں بلکہ خوشی کا سراب یا حظِ نفسی کا دھوکا ہیں ان کی اصلیت میں خوشی کا عنصر مضمر نہ تھا بلکہ حقیقتاً اُن کی جدت نہ کہ ان کی فطرت ہمارے انبساط و سرور کا باعث تھی۔ لیکن مملکتِ علم میں کوئی سیری نہیں ہے بلکہ ازدیادِ علم کے ساتھ اشتہائے علم بڑھتی ہے یہ الفاظِ دیگر سیری اور اشتہا ء علم کے متعلق مرادف الفاظ ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لازم آتا ہے کہ علم بجائے خود مفید اور دل خوش کُن ہے اور اسکی خوشی میں دوسری خوشیوں کی طرح کوئی دھوکا یا فریب نہیں ہے۔

سائنٹفک تحقیقات کی گہری دلچسپی اور اس کے حظِ وافر کی صحیح قدر و منزلت کا اندازہ

٭ لکریشس کا نام بحیثیت بانی اول نظریۂ سالمات (اٹامک تھیوری Atomic Theory) ہمیشہ یادگار زمانہ رہے گا۔ سالمہ یا اٹیم لکریشس کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ نظریۂ سالمات کا بانیِ جدید ڈالٹن تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فی زماننا سالمات کے متعلق علمی خیالات نظریۂ برقیہ کے باعث بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ علم آموزی اور علم کی قدر و قیمت کے متعلق قرآن شریف کی آیات اور احادیث نبوی ہم نے اپنے مضمون سائنس اور اسلام حصۂ اول مطبوعۂ ہندوستان ریویو اکتوبر و نومبر ۱۹۲۲ء میں جمع کردی ہیں اس لیے متن میں لارڈ ایوبری کے سلسلۂ بیان کو ان کے اندراج سے منقطع نہیں کرتے۔

وہ لوگ جو اس سے ناآشنا ہیں بمشکل کر سکتے ہیں تاہم کم و بیش حد تک تمام وہ لوگ جو سرگرمی کے ساتھ فلسفۂ فطرت کا مطالعہ شروع کرتے ہیں اس حظ کا احساس رکھتے ہیں۔ (سائنٹفک تحقیقات کے متعلق ایک مفصل مضمون ہم انشاء اللہ العزیز عنقریب شایع کریں گے سردست اس مبحث کے متعلق مزید معلومات الناظر مطبوعۂ نومبر ۱۹۱۴ء کے عنوان اوّلین "ہندوستان میں علمی تحقیقات کی ضرورت" سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہم نہایت زور کے ساتھ متلاشیانِ علم سے سفارش کرتے ہیں کہ الناظر کے اس مضمون کا مطالعہ کریں۔ اس مبحث کے متعلق خود بھی غور فرمائیں۔ اور دوسروں کو بھی اپنے خیالات سے مستفید کریں)

سائنٹفک تحقیقات کی دلچسپیاں

(۴) علوم طبیعات کی تحصیل کے عملی فائدے

علوم طبیعات کے مطالعہ کے لیے ایک زبردست سفارش ان نتائج کی اہمیت ہے جو بنی نوعِ انسان کی طبعی حالت کی اصلاح میں علوم طبیعات کی ترقی سے مترتب ہوئے ہیں۔ تاریخ عالم کے اور کسی حصہ میں سائنس کے عملی نتائج اتنے عیاں و منفعت بخش ثابت نہیں ہوئے جتنے کہ موجودہ زمانہ میں ثابت ہو رہے ہیں۔ سائنس کے عملی فوائد کو لارڈ مکالے نے جسکے نام نامی سے ہندوستان بخوبی آشنا ہے باوجود اپنے انہماکِ تاریخی اور اسی قسم کے غیر سائنٹفک اشغال کے نہایت جوش کے ساتھ تسلیم کیا ہے اور وہ سائنس کا ایک مختصر تبصرہ لکھتے ہوئے یوں رطب اللساں ہوا ہے :-

سائنس کا افادہ

٭ "سائنس نے زندگی لمبی کر دی ہے۔ تکلیف کو گھٹا دیا ہے۔ بیماریوں کی بیخکنی کر دی ہے۔ زمین کی پیداوار بڑھا دی ہے۔ ملاحوں کی زندگی کو خطرہ سے محفوظ کر دیا ہے۔ سپاہیوں کے لیے نئے نئے بازو بنا دیے ہیں۔ بجلی کو مطیع و منقاد بنا لیا ہو۔ رات کی تاریکی کو دن کے اُجالے سے زیادہ روشن بنا دیا ہے۔ آنکھ کی دُوربینی کو وسعت بخشی ہے۔ انسانی طاقتوں کو لاانتہا ترقی دی ہے۔ رفتار تیز کر دی ہے۔ فاصلہ کم کر دیا ہے۔ میل ملاپ آسان کر دیا ہے اور حضرتِ انسان کو سمندر کی تہ اور آسمان کی بلندی کی سیر کرا دی ہے۔ یہ سائنس کے ادنیٰ فوائد میں سے چند ہیں۔ ہزارہا فائدوں سے انسان ابھی تک

مکالے کی رائے

٭ ہم نے یہ اقتباس اپنے مضمون "حیرت انگیز جدید علمی انکشافات" مطبوعۂ ادیب مئی ۱۹۱۲ء سے اخذ کیا ہے۔

متمتع نہیں ہو سکا۔ سائنس کا قانون ترقی پذیر ہے۔ جو باتیں کل ہماری آنکھوں سے مخفی تھیں آج ہمارے پیش نظر ہیں اور آیندہ وہی ہماری تحقیقات کی ابتدا ہوں گی "

جو امور اس مختصر اقتباس میں بیان کیے گئے ہیں اُن میں سے ہر ایک کی تفصیل وتشریح بجائے خود ایک ایک عنوان کی محتاج ہے۔ علم دوست اصحاب جو زمانہ سے پیچھے نہیں ہیں خود اس اجمال کی تشریح کر سکیں گے اور کسی غلط فہمی میں نہیں پڑیں گے۔ اگر سائنس کا یہ دعوےٰ ہے کہ اسکی بدولت زندگی لمبی ہو گئی ہے تو یہ چنداں حیرت انگیز نہیں ہے۔ زندگی کے لمبے ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ فی الحقیقت انسانی عمر میں زیادتی کرنے کے لیے سائنس نے کوئی کیمیائی نسخہ یا برقی آلہ دریافت کیا ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ سائنس کے طفیل انسان اپنی تھوڑی سی عمر میں فی زماننا بہت سے کام کر سکتا ہے جو سائنس کی مدد کے بغیر صدیوں میں بھی سرانجام نہیں ہو سکتے تھے۔ فرہاد پہاڑ کاٹ کر تمام عمر میں ایک نہر شیریں کے محل تک لا سکا تھا۔ اور پھر ہر کوئی آدمی فرہاد نہیں بن سکتا۔ لیکن آج ڈائنامیٹ کی بدولت بیسیوں ایسی نہریں ایک زندگی میں کاٹی جا سکتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس باقی فقرات بھی سمجھنے کے قابل ہیں۔ صرف مکالے ہی سائنس کے محاسن بیان کرنے میں اتنے جوش سے رطب اللسان نہیں ہوا ہے بلکہ ہر کہ وبہ سائنس کی فضیلت کا معترف ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلطی ہوگی کہ علومِ طبیعات کے فوائد زمانۂ حال ہی میں تسلیم کیے گئے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر کا ایک عام فہم مصنف مفصلۂ ذیل الفاظ میں انسان کی قدیم

مقابلۂ ماضی وحال

وحشیانہ حالت کا مقابلہ اپنے زمانہ کے ساتھ کرتا ہے " غیر مہذب اور وحشی زمانہ کا انسان جس کے پاس قوتِ مالا یموت کے لیے بمشکل ذخیرہ جمع ہوتا تھا جو موسم کی بے رحمیوں کا اور جنگلی جانوروں کا شکار بنا رہتا تھا۔ مہذب اور تعلیم یافتہ انسان کے مقابلہ میں ایک قابلِ رحم منظر پیش کرتا ہے۔ وہ بیچارہ تعمیرات۔ زراعت۔ تجارت سے نا واقف اور اُن تمام فنون سے نابلد ہوتا تھا جن کا انحصار میکانیکی قوتوں کے استعمال پر ہے۔ جنگل میں بے آرامی کی انفرادی زندگی بسر کرتا تھا۔ ہیئتِ اجتماعی کی نعمتوں سے بے بہرہ تھا۔ شیر اور چیتے کی مثل زندگی بسر کرتا تھا لیکن طاقت اور حفاظت کے لحاظ سے

ان سے بھی گرا ہوا تھا۔" "اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کبھی ایسی پس ماندہ حالت میں رہ چکا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت دیرپا نہ ہوگی۔ اسکی دماغی ریاضت سے علوم و فنون کا آغاز ہوا ہوگا۔ ان کی مدد سے ویرانہ باغ میں مبدل ہوگیا ہوگا اور آباد شہر، محلات اور معابد انسانی دنیا کی زینت بنائے گئے ہوں گے۔ اس حالت میں پہنچ کر انسان اپنے آپ کو ان وحشی حیوانات اور جنگلی درندوں سے بہت فاصلہ پر دیکھتا ہے جن کے ساتھ وہ اپنے ایام جہالت میں بالکل ملا ہوا نظر آتا تھا۔"

اُس وقت جبکہ انسانی قُوی کا مسطورۂ بالا اندازہ لگایا گیا تھا علوم طبیعات اور کیمیات کے اعلیٰ ترین اصول اُن نتائج کے پیدا ہونے کا باعث ہوے ہیں جن کو آج سے قبل ناقابلِ اعتبار مانا جاتا اس

تمدن پر سائنس کا اثر — وقت کون مان سکتا تھا کہ تیس چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سفر کے لیے ایک سُست اوسط شمار کی جائے گی یا یہ کہ ہمارے پیغامات خشکی اور تری کے اوپر حقیقی طور پر برق رفتاری کے ساتھ پہنچائے جائیں گے ؟ یہ مثالیں علوم جدیدہ کے عملی فوائد کی بیّن شواہد ہیں اور ہمیں ان سے زیادہ مثالیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ فی زمانا ہر کس و ناکس علوم طبیعات کے قوانین کی دریافت کے عملی نتائج کا قائل ہے اور ان کی اہم ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ ایسے خیالات اور جلبِ منفعت کو کسی صورت میں بھی سائنس کا مقصد قرار نہیں دینا چاہیے۔

سائنس کی علت غائی استفادہ نہیں ہے — ایسے خیالاتِ فاسدہ کی اشاعت سے زیادہ کوئی اور چیز علمی ترقی کی منافی اور سائنٹفک تحقیقات کے لیے مہلک نہیں ہے۔ بس یوں خیال فرمائیے کہ فائدہ کا خیال بھی سائنس کے لیے زہرِ ہلاہل سے زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ہم ایک اہم علمی انکشاف کو لیتے ہیں۔

ایک علمی مثال — جو علومِ طبیعات کی ایک نئی شاخ کا سنگ بنیاد ہے اور جسے آج برقی مقناطیس (الکٹرو مگنٹزم *Electro-magnetism*) کے نام سے ایک جداگانہ شعبۂ علم

* ہم نے رسالۂ ادیب مرحوم مطبوعہ مئی ۱۹۱۲ء میں بعنوان "حیرت انگیز جدید علمی انکشافات" چند عجیب و غریب تازہ سائنٹفک ایجادوں اور دریافتوں کی تشریح کی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پاپولر سائنس جرنل اور ویڈنسڈے ریویو میں بھی عجائبات سائنس کے عنوانوں سے چند عام فہم مضامین لکھے ہیں۔

قرار دے کر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگر اورسٹد (Oersted) اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ٹھہر جاتا کہ اسکی تحقیقات کس طرح عملی طور پر مفید ہو سکے گی تو وہ ہرگز برقی رَو اور مقناطیس کے درمیان رشتۂ اتحاد نہ دریافت کر سکتا۔ اور اس طرح ہم آج برقی پیغام رسانی کے عجائبات سے جاہل ہوتے اور اسکے بے شمار فوائد سے کبھی متمتع نہ ہو سکتے۔

(۵) سائنس اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری

درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ فلسفۂ فطرت میں کوئی بڑا قانون اپنے عملی فائدہ کی خاطر دریافت نہیں ہوا۔ لیکن اس بات کے بے شمار شواہد موجود ہیں کہ بہت سے اسی قسم کے بے فائدہ اعتبارات

سائنس کی علتِ غائی　　آخر الامر قیمتی نتائج اور عملی ثمرات کا باعث ہوے۔ فلہذا ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ علوم کی تحصیل کا حقیقی مقصد قوانینِ فطرت کا انکشاف ہے اور اس مقصدِ وحید کے حصول کے لیے ہمیں اِدھر اُدھر دائیں بائیں بھٹکنے کے بجاے دیانت داری اور تن دہی سے مشغولِ فکر رہنا چاہیے۔ بیکن نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ترقیِ علم میں اِسی خیال کو یوں ادا کیا ہے: بہت سے لوگ غلط طریقوں سے علم کی تحصیل میں کوشاں ہوتے ہیں۔ بعض شہرت اور ناموری کے متلاشی ہوتے ہیں۔ بعض عملی فوائد کے جویا ہوتے ہیں۔ بعض ایک متجسس ذہن کی اشتہاء کی سیری کی خاطر اور بعض اپنے دماغوں کو علم کے تنوّع اور گوناگونی کی لذّات سے متمتع کرنے کی خاطر علمی مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں۔ صرف معدودے چند اصلی غرض کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کی احسن خدمت بجا لانا اور اُس جاہ و جلال والے کی عظمت اور بزرگی کا کما حقہٗ اعتراف کرنا اپنا مطمحِ نظر قرار دیتے ہیں۔

'نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم مُلّا خطرۂ ایمان' مشہور ہے۔ اسی طرح تھوڑے سطحی علم کو ایک خطرناک چیز مان کر ناقص کہا گیا ہے لیکن مکمل اور عمیق علمیت کے خلاف ایسا کوئی اعتراض پیش نہیں کیا جا سکتا

سر جان ہرشل کی رائے　　سر جان ہرشل نے اپنی فصیح البیان کتاب فلسفۂ فطرت کے مطالعہ میں خوب کہا ہے کہ "سچے فلسفی (جویندۂ حق) کی سیرت یہ ہے کہ نہ تو وہ تمام چیزوں کو ناممکن تصور کرے اور نہ اُن کو غیر معقول ہی مانے۔ جس کسی نے طبیعاتی یا حسابی علوم کی تاریکیوں اور الجھنوں کو چشم ترمیں

روشن و منار ہوتے۔ اور تحقیقات کے لحاظ سے نہایت بیجر اور یاس انگیز مضامین کو ہمارے نقطۂ خیال کی ذرا سی تبدیلی یا کسی نئے اصول کی مدد سے علم کے ایک زرخیز سرچشمہ میں مبدل ہوتے دیکھا ہے وہ انسان کی موجودہ یا آیندہ حالت اور قسمت کے متعلق مایوسانہ خیالات باور کرنے میں سب سے آخری شخص ہوگا۔ ماسوا اسکے ایک طرف دماغی خلاقی اور مادی تعلقات کے وسیع مناظر جو ان اشغال کے تتبع میں اسے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف میزانِ خلقت میں اپنی بے حیثیتی کا یقین اور عالم کی وسیع کل کے انتظام یا ردوبدل میں اپنی کمزوری اور بے بضاعتی کے قطعی ثبوت۔ اسکو یہ عملی حقیقت منوانے کے لیے کافی ہونگے کہ دعاوی میں عاجزی اور امیدوں کی بلندی بہترین طور پر اسکے شان کے شایاں ہیں۔

خالق کا احسان

ساتھ ہی اسکے جب ہم انسانی علوم کی وسعت اور کارناموں کی خوشیاں مناتے ہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جوں جوں خالق کے کارناموں میں ہماری دوربینی بڑھتی ہے اسی نسبت سے ہمارے دلوں میں اسکی عظمت جلال اور رعب و داب کے خیالات جاگزیں ہوتے ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ علم ہیئت کی داغ بیل بھی نہ پڑی تھی ایک متضرع قلب نے اس طور پر خدا کی حمد گائی تھی۔

"جب میں تیرے آسمانوں میں غور کرتا ہوں اور چاند سورج ستاروں کے متعلق سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس عظمت کے تجھے انسان اور انسان کی اولاد کا خیال رہتا ہے!"

سائنٹفک شکرگزاری

اب جبکہ علم ہیئت نے اس قدر ترقی کرلی ہے اور ایک قلیل پیمانہ پر ہم نے اُن قوانین کے راز سمجھ لیے ہیں جن کے مطابق ارض و سماوات کی تخلیق ہوئی ہے ہماری عاجزانہ سپاس گزاری اللہ تعالیٰ کے حضور میں اور بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ جب ہم عالم کے اس چھوٹے سے حصہ کی وسعت پر غور کرتے ہیں جسکے متعلق ہمیں تھوڑا سا علم حاصل ہوگیا ہے۔ اور پھر جب ہم اس امر کا اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ حصہ کل کے مقابلہ میں کس قدر ہیچ ہے تو ہم حقیقی طور پر محسوس

معرفتِ یزداں

کرتے ہیں کہ انسان ایزدِ متعال کی مخلوق میں کس قدر چھوٹی سی چیز ہے اور نیز محسوس کرتے ہیں کہ ہم کو کتنا زیادہ شکرگزار اُس خالق کا ہونا چاہیے جو ہر لحظہ ہمارا خیال رکھتا ہے اپنی بیشمار نعمتوں سے ہمیں متمتع کرتا ہے اور اپنے نور سے ہمارے دلوں کو منور کرتا ہے! اسی قسم کے جذبات اور خیالات سائنس کے ہر ایک سرگرم طالب علم کے دل میں موجزن رہنے چاہییں اور صرف اسی طرح سے ہم منازلِ علم طے کرتے ہوئے قدرت سے خالقِ قدرت تک پہنچ سکتے ہیں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

دل میں آجاؤ بس اتنی ہی تمنا دل میں

تضمین غزل عالی جناب معلی القاب آنریبل خان بہادر جناب سید محمد ہادی صاحب بہادر
ڈپٹی کمشنر پرتاب گڈھ دام اقبالہٗ

از تصدق حسین صدق جائسی

چشم عاشق سے تو رہنا کہیں اچھا دل میں عکس آنکھوں سے اُتر آنے دو اپنا دل میں
ہوگئے خوش دیکھ کے اک اور ہی دنیا دل میں دل میں آجاؤ بس اتنی ہے تمنا دل میں
ہم بھی دل کھول کے دکھلائیں کہ ہے کیا دل میں

رحم بس رحم کہ ہیں کب سے گرفتارِ عذاب صدمۂ ہجر اُٹھانے کی ہیں اب نہیں تاب
ہو چکا عاشقِ بے تاب ہے کب تک یہ حجاب آؤ پہلو میں اُٹھاؤ رخِ روشن سے نقاب
شوقِ بے چین ہے پہلو میں تمنا دل میں

بے وفا تھے جگر و دل نے بہم ساز کیا ایک نے دوسرے کو ہمدم و ہمراز کیا
حسنِ تدبیر پہ تڑپا کے ہمیں ناز کیا دوست کو دوست کے مہماں نے سرافراز کیا
درد اُٹھا جو کلیجے سے تو ٹھہرا دل میں

مخزنِ غم دلِ صد چاک جو ہے اے کافر ذکرِ خوش خود ہی نہیں اپنی پسندِ خاطر
آرزو ایک جو کی بھی تو ہوا یہ ظاہر ہرچہ در کانِ نمک رفت نمک شد آخر
بن گئی یاس در آئی جو تمنا دل میں

صدق سے راز چھپاؤگے کہاں تک ہادی ہمدم اک چاہیے ممکن ہو جہاں تک ہادی
سیر ہو ساتھ رہے کوسے تیاں تک ہادی چل کے پہونچا نہ تمہیں آئیں وہاں تک ہادی
ہم سمجھتے ہیں جہاں کا ہے ارادہ دل میں

اخلاقی جرأت

(بہ اتباعِ صحیح پہلو اپنے خیالات کا عملی رنگ میں اظہار اخلاقی جرأت ہے)

انسانی مصروفیتیں انسانی ضروریات اور انسانی مشاغل ایسے مختلف الانواع ہیں کہ اُنکی نسبت ایک ہی قسم کے فیصلہ اور ایک ہی قسم کے نتائج و تاثیرات کی امید رکھنا ایک غلط کاری ہی نہیں بلکہ ایک تکلیف دہ امر بھی ہے۔ گو کہ انسان کی زندگی ایک محدود زندگی ہوتی ہے اور اس کی پائداری کا اعتبار بھی بہت ہی موہوم اور مشکوک ہوتا ہے لیکن پھر بھی انسانی زندگی کی ضرورتیں بعض وقت اس قدر لازمی اور ضروری ہوتی ہیں کہ اُن کے انصرام بغیر انسان خود کو ایک ایسی حالت میں پاتا ہے جو بہت کچھ غیر مطمئن ہوتی ہے اور حیرت یہ ہے کہ بعض وقت کم اندیشی اور جلدبازی کی وجہ سے بعض ضروریات کے نظام کے بعد بھی انسان ایک مغالطہ میں ہی نہیں بلکہ ایک ناگفتہ بہ تکلیف میں پڑتا ہے۔ اور دوسری طرف دُور اندیشی بعض وقت اس سے بھی زیادہ تر فریب دِہ اور نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ دُور اندیشی ایک اچھا مسلک ہے لیکن بعض اوقات جب وہ اپنی نزاکت میں بہت بڑھ جاتی ہے تو بجائے مفید ثابت ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ تر

نکتہ چینی کا خوف۔
معترضوں کا ڈر۔
شرم۔
یہ بات کہ لوگ کیا کہیں گے۔

ایسے موجبات اور ایسے عناصر ہیں کہ انسان ایک کام کرتے کرتے سوچتے سوچتے اس قدر دیر کر دیتا ہے کہ ہمیشہ اُس کے دل و دماغ میں ایک تکلیف ایک اذیت کا احساس تو رہتا ہے لیکن اُس کا علاج کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک عمل ایک کام اور ایک چیز کو اُس کا دل چاہتا ہے لیکن عوام کی نکتہ چینی اور پرسش کی وجہ سے

کچھ کر نہیں سکتا۔ اگرچہ خود کو ایک تکلیف میں پاتا ہے مگر جرأت نہیں کر سکتا۔

بہت سے ایسے انسان اس دنیا میں ملیں گے جو اگرچہ بعض کام دل سے کرنا چاہتے ہیں لیکن نکتہ چینی کے خوف سے جرأت نہیں کرتے۔ بے شک بعض وقت بعض کاموں کے کرنے سے تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن ذاتی تکلیف کے سوائے نکتہ چینی کا جو خوف ہوتا ہے وہ اُس ذاتی تکلیف سے بھی زیادہ تر تہلکہ میں ڈالتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ نکتہ چینیاں بعض وقت سچی بھی ہوتی ہیں لیکن اُس انسان کی زندگی جو بوجہ چند در چند نکتہ چینیوں کے ایک فعل کرنے سے رُکا ہوا ہے جس گرداب میں سے گزرتی ہے اُس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

بعض لوگ اپنی تحقیقات کے بموجب ایک رسم ترک کرنا مناسب اور موزوں خیال کرتے ہیں اور اُنکی رائے میں خود اُن کے واسطے وہ رسم ایک مضر اور تکلیف دِہ رسم ہے لیکن محض نکتہ چینیوں کی وجہ سے اُس کا ترک اُن پر مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک بات راست بازی کے اعتبار سے دوسرے کو کہہ دینی چاہیے۔ایک کام ذاتی تحقیقات کے رُو سے مفید ہے لیکن صرف اس واسطے وہ بات نہیں کہی جاتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ وہ کام نہیں کیا جاتا کہ مختلف اُنگلیاں اُٹھیں گی یا لوگ شرم دلائیں گے۔ گو کہ ایسی شرم بجائے خود چند اوہام ہی کا اثر اور نتیجہ ہو۔

بیشک لوگوں کا حق ہے کہ باعتبار انسانی ہمدردی اور خیرخواہی و قوانین سوسائٹی و اخلاقی کے دوسروں کے افعال اور ترکِ افعال کی تنقید کر کے اپنی رایوں کا اظہار کریں لیکن اُس شخص سے بھی دریافت کرنا چاہیے جس کے ایسے خیالات اور ایسے اِرادوں کی رَد روکی جاتی ہے جنھیں وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے حق میں بعض پہلوؤں سے مفید اور مستحسن خیال کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اُسکا خیال درست نہ ہو لیکن وہ بھی تو کوئی حق رکھتا ہے۔ بیشک بعض وقت اخلاقی۔ معاشری اور تمدنی پہلو سے ایک کام کا کرنا یا ایک خاص وقت میں کرنا غیر مفید پڑتا ہے اور عوام الناس کے خیالات کے وہ کسی حد تک مخالف ہوتا ہو۔ لیکن اگر عوام الناس کو بہ حیثیت ایک خدائی فوجدار کے کوئی ایسا حق حاصل ہے تو کیوں خاص کر ایک دوسرے شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بھی اپنی تحقیقات اور ضروریات کے مطابق کوئی

فعل یا ترکِ فعل کرے۔ بیشک ایسے شخص پر یہ بھی لازم ہے کہ اگر دوسروں کی نکتہ چینی کوئی صحیح پہلو رکھتی ہے تو اُس کا لحاظ بھی کرے۔ لیکن دوسروں کا یہ زور دینا کہ چاہے اُن کی نکتہ چینی کوئی پہلو رکھتی ہو اور اُس کی بازاری قیمت کچھ ہی ہو پھر بھی دوسرے کا یہ فرض ہے کہ بہ اتباع نکتہ چینی اپنے صحیح اور مفید ارادوں سے باز آئے۔ اگر یہ بات مانی جا سکتی ہے تو اس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہو گا کہ دوسروں کے خیالات کا مار دینا یا خیالی خودکشی صحیح اور جائز ہے۔

کیا بہ ایں حالات انسانی کائنات میں کوئی اخلاقی جرأت باقی رہ سکتی ہے؟ اور کیا وہ ضرورت جو اخلاقی جرات اپنی تہ میں رکھتی ہے ملیامیٹ ہو جانے سے محفوظ رہتی ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا ہی عمل ہر حالت میں مستحسن خیال کیا جائے تو دنیا کے وہ کام جو اخلاقی جرأت کے تابع ہیں باقی رہ ہی نہیں سکتے۔ ہمیشہ نکتہ چینی اُن اسباب کے تابع ہوتی ہے جن سے دوسرا شخص ایک حد تک ناواقف ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں گویا دوسرے شخص سے یہ کہنا ہے کہ تمھاری بات اور تمھارا اجتہاد کبھی مانا ہی نہیں جا سکتا اور تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ کبھی کوئی اجتہاد کر سکو یا کوئی کام تمھیں اپنی رائے کے مطابق بھی کرنے کا اختیار ہو۔ ایک طرف ایک بالغہ عورت کو تو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی شادی اپنے مذاق کے مطابق کرے لیکن دوسری طرف عامہ نکتہ چینی کے ماتحت کوئی کام کرنے کی کسی دوسرے کو اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ باتیں ہیں جو دنیا کے دھندوں میں دخیل ہو کر اکثر زندگیوں کو مشکلات میں ڈالتی ہیں، ایک شخص محض اس وجہ سے ایک کام کرنے کی جرأت نہیں کرتا کہ بعض لوگ اُس پر معترض ہوتے ہیں یا بعض لوگ اُسے اچھا نہیں سمجھتے۔ بیشک سیاسی قوانین اور رسوم اخلاقی و رسوم سوسائٹی کے ماتحت بعض امور مخدوش اور ممنوع ہیں لیکن انھیں چھوڑ کر بھی بہت سے کام ہم صرف اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ یا تو ہمیں ایک قسم کی شرم مانع ہے چاہے اُسکی وجہ کوئی ہو اور یا اس وجہ سے کہ اُس کے کرنے سے ہمیں بعض وقت بعض قسم کی نکتہ چینیوں کا خوف رہتا ہے۔ اس قسم کی تمام صورتیں ذہن نشیں کر کے ہمیں سوچنا چاہیے کہ

کیا بہ ایں حالات اخلاقی جرأت باقی رہ سکتی ہے اور کیا اس طرح پر اخلاقی جرأت کا

ملیا میٹ ہو جانا انسانی زندگیوں کے واسطے کوئی مفید پہلو ہے۔

ہم اکثر زندگیاں انسانی کائنات میں ایسی پائیں گے جو محض اخلاقی جرأت کے نہ ہونے کی وجہ سے قریباً ایسی تکلیف اور ایسے گھاٹے میں رہتی ہیں کہ اُنکی نسبت یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ ایک قابلِ علاج اور ناقابل افسوس قلق اور اضطراب ایسی زندگیوں کی قسمت میں لکھا رہتا ہے اور باوجود ایک چارہ و علاج کے ہاتھ میں ہونے کے بھی ایسی زندگیاں اپنے ہی ہاتھوں سے ایک گرداب والی تکلیف میں رہتی ہیں۔ ہندوستان کا ایک شریف بچہ اور ایک شریف بیوہ اپنے والدین سے جدا ہونا چاہتے ہیں لیکن یہ شرم جدا ہونے نہیں دیتی کہ اَور لوگ کیا کہیں گے۔ ایک شخص چند نقصان رساں رسوم اور فضول خرچیاں چھوڑنا چاہتا ہے۔ لیکن دوستوں اور ہمسایوں کی چہ میگوئیاں جرأت نہیں دلاتیں۔ ایک شخص کاروباری زندگی میں ایک پہلو اختیار کرنا چاہتا ہے لیکن بعض لوگوں یا بقیہ ممبرانِ خاندان کی نکتہ چینیاں ایسا کرنے سے روکتی ہیں۔ فقِس علیٰ ہذا۔

اس روک سے گو کہ ایک حد تک نکتہ چینیوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے لیکن جو کچھ دلوں پر گزرتی ہے جو کچھ زندگیوں کی آسائش پرورش ہوتی ہے وہ بعض وقت ایسا تلخ سماں ہوتا ہے کہ کوئی کوئی زندگی ہی اُس کا مزہ چکھ سکتی ہے۔ زندگیوں کی بابت ہمیشہ خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بعض وقت اگرچہ زندگی کیسی ہی تلخ گزرے اُسکے مقابلہ میں شیریں وسائل کی تلاش ایک اخلاقی جرم ہوتا ہے اور بعض وقت قدرتی خواہشات کے ماتحت یہ صحیح خیال مرکوز ہوتا ہے کہ جو دَم اور جو وقت اچھا گزر سکتا ہے وہ اچھا ہی گزرنا چاہیے کیونکہ قوانین قدرت یہ نہیں چاہتے کہ خواہ مخواہ کوئی شخص بلا میں گرفتار رہے۔ بمصداق لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔ واقعی قدرت کبھی بھی یہ نہیں چاہتی کہ انسان خواہ مخواہ تکلیف اور دُکھ میں رہے یا بس چلتے آسائش اور آرام کے حاصل کرنے سے معذور رہے۔ اسلام میں یہ جو کہا گیا ہے لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ اُس کا منشا یہی نہیں ہے کہ معادی اور دینی رنگ میں بھی خود کو تکلیف میں ڈالنا انسانی خواہشات اور فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔

قدرت ہم سے وہی چاہتی ہے جسکی اُسکے ضابطہ میں اجازت دی گئی ہے۔اُس سے زیادہ نہیں۔
یہ بالکل سچ ہے کہ بہت سے انسان صرف اپنے ہی ہاتھوں سے آفت اور تکلیف میں پڑتے ہیں۔انسانی فطرت اکثر اوقات صحیح فیصلہ دیتی ہے۔اگر ہم اُس فیصلہ کے مطابق چلیں تو ہماری بہت سی تکلیفات اور صعوبتیں حل ہو سکتی ہیں لیکن چونکہ ہم بعض اوقات اخلاقی جرأت سے مُنھ موڑ کر خود بخود ایک ضغطہ میں پڑنا پسند کرتے ہیں اس واسطے خود ہمارے اپنے افعال ہی ہمارے واسطے ایک وبال ہو جاتے ہیں۔انسان غور کرنے کے بعد خیال کر سکتا ہے کہ ہماری بہت سی مصیبتوں کا باعث اپنی ہی غلط کاریاں ہوتی ہیں اور ہم جان بوجھ کر خود کو ایک اضافی تکلیف اور ایک ناگفتہ بہ ضغطہ میں ڈالتے ہیں۔
جن اقوام اور جن ممالک میں صحیح اور نتیج تعلیم زیادہ ہوتی ہے اُن میں نسبتاً یہ کیفیات ضغطہ میں ڈالنے والی کم ہوتی ہیں کیونکہ ان میں خدائی فوجدار کا منصب شاذ ہی کوئی اختیار کرتا ہے۔
جہاں یہ حالت نہیں وہاں صدہا لوگ خدائی فوجدار ہوتے ہیں۔اُن کی زندگیوں کا بڑا بھاری کام یہی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی زندگیوں کی معاندانہ رنگ میں یا حاسدانہ پہلو سے تنقید کرتے ہیں۔
اور خواہ مخواہ کی نکتہ چینی سے اُن کے واسطے ایک روک اور ایک بندش ثابت ہوں۔ایک پُرانا شعر وردِ زبانِ عام ہے

> بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد   کسے را با کسے کارے نہ باشد

جہاں یہ حالت اور یہ کیفیت نہیں وہ سوسائٹی واقعی اقطاعِ بہشت سے بہت ہی دُور ہوتی ہے۔
جہاں ہر شخص خدائی فوجدار ہے وہاں زندگیاں کس طرح محفوظ رہ سکتی ہیں۔
بیشک بعض وقت حالات اور کیفیات سوسائٹی اور قوانین اخلاق کے مطابق یا ضرورت سے نکتہ چینی کی جاتی ہے اور اُسکا کوئی حرج بھی نہیں بلکہ ایسی نکتہ چینی صحت معاملات اور تزکیۂ اجتہاد کے واسطے لازمی ہوتی ہے لیکن ایسی نکتہ چینی میں خدائی فوجدار کے اختیارات سے کام نہیں لیا جاتا جب ایک شخص برنگ خدائی فوجدار حملہ اور یورش کرتا ہے اور خواہ مخواہ دوسروں کے خیالات کو روکتا اور اپنی فرضی اور حاسدانہ حکومت کے ماتحت اُنھیں لانا چاہتا ہے تو صورت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ہر شخص با وجو

قسم قسم کی بندشوں اور رکاوٹوں کے بھی اپنے اندر اور اپنے دل ودماغ میں کچھ نہ کچھ آزادی اور آزاد خیالی رکھتا ہے۔ اُس کا یہ ایک طبعی اور فطری حق ہوتا ہے اُس سے اُسکو خواہ مخواہ روک دیا جانا ایک ایسی روش ہے جو فطری قانون کے ماتحت بھی ایک جرم ہے۔

جہاں قوانین اور ضوابط کی پابندی اور احترام لازم ہے وہاں اخلاقی جرأت کی تکریم اور تعظیم بھی لازمی ہے۔ جن اقوام میں اخلاقی جرأت کا عنصر نہیں ہے یا کمزور ہے وہ قومیں ترقی کے مراحل میں بہت کچھ پیچھے رہنے والی ہیں۔ اخلاقی جرأت کی بدولت ہی بہت سے قومی معاملات اور قومی اُلجھنیں صلاحیت پذیر ہوتی ہیں۔ جس قوم میں یہ وصف نہیں وہ مُردہ ہے۔ اُسکی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جو اپنے اندر نہ تو کوئی صداقت اور صداقت پسندی رکھتی ہے اور نہ اُس کا کوئی مدعا ہوتا ہے۔ کیونکہ مدعا یا خیال اور تخصیص مدعا ہی ایک ایسا خیال ہے جو اخلاقی جرأت کے نشوونما کا ایک کامل ذریعہ ہے جب ہمارا کوئی مدعا ہی نہیں تو ہم عرصۂ زندگی میں موجود ہو کر کیا کچھ کہہ سکتے ہیں اور جب ہم کوئی نہ کوئی مدعا رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ زندگی کا دوسرا نام مدعا ہی ہے تو ہمیں جرأت سے بھی کام لینا پڑے گا اور دوسرے الفاظ میں اُس اسٹیج پر جا پہنچیں گے جو خودداری کا اسٹیج کہلاتا ہے۔

قومی زندگی اُس صورت میں زیبا معلوم دیتی ہے جب اُسکے ساتھ اخلاقی جرأت بھی ہو۔ ہر شخص زندہ رہتا اور زندگی بسر کرتا ہے لیکن کیا کوئی اصلی معنوں میں یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسی زندگی بھی کوئی قیمت اور کوئی وقعت رکھتی ہے۔ نکتہ چینیوں کے مقابلہ ہی سے زندگی کی قیمت بڑھتی ہے۔ جو زندگی ایک حجرہ میں گزرتی ہے اور جو سب زندگیوں کے تابع ہو کر رہنا پسند کرتی ہے اُس زندگی کا معیار ہو لے اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مُنہ چھپا کے اس دنیا میں سے گزر جاؤ نہ کوئی دیکھے اور نہ کوئی کچھ کہے سُنے۔ زندگی وہی ہے جو معرکہ کی زندگی ہے۔ معرکہ کی زندگی وہی ہے جو صحیح رنگ میں اخلاقی جرأت رکھتی ہے۔ بیشک غیر صحیح اخلاقی جرأت ناموزوں اور فاسدانہ عمل ہے لیکن تمیز کرنے کے بعد ہی۔ صحیح اخلاقی جرأت کا اختیار نہ کرنا ایک اور بھی غلطی ہے۔ رہا یہ کہ اُس کا نتیجہ کیا نکلے گا یہ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نتائج کے امیدوار رہ سکتے ہیں لیکن ہمیشہ ہمارے ارادوں کے مطابق نتائج کا نکلنا ضروری نہیں۔ بر توکل زانو اُشتر بہ بند۔ **سُلطان احمد**

رباعیات امیر مینائی

جس زمانہ میں میرے والد صاحب (منشی سید ناظم علی مرحوم) مہتمم مہمان خانۂ ریاست تھے۔ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی بھوپال تشریف لائے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کا عہد تھا۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اُنکے پُرانے کاغذات دیکھے بھالے۔ جن میں علاوہ مطبوعات و تحریراتِ ماضیہ کے منشی امیر احمد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک[1] کاغذ بھی نکل آیا جس کا ابتدائی حصہ تو دیمک کے نذر ہوگیا۔ صرف آخری حصہ ہے۔ جو اس عبارت سے شروع ہوتا ہے۔

جیسی مہماں نوازی اور مسافر پروری سرکار کے مراحم خسروانہ سے ہو رہی ہے اُسکا شکر ادا ہونا کسی طرح ممکن نہیں بجز اس کے کہ رویاں رویاں دعائے ترقی اقبال میں مصروف ہے۔ اب یہ التجا ہے کہ آستانہ بوسی و باریابی سے بھی عزت افزائی فرمائی جائے کہ آخری عمر کی آرزو بر آئے۔

اس کے بعد چار رباعیاں ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ آخری رباعی میں نے اپنے والد صاحب مرحوم سے اکثر مرتبہ سُنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ رباعیاں اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

قیصر

فیض و کرمِ عام کا چشمہ یہ ہے | دیتا ہے جو آبرو وہ دریا یہ ہے
اس در پہ نصیب جبہ فرسائی ہو | بس آخری عمر کی تمنا یہ ہے

---

[1] منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی دو مرتبہ بھوپال تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ دوم ذالحجہ سنہ ۱۳۱۲ھ کو آئے اور ۲۰ محرم سنہ ۱۳۱۵ھ کو تشریف لے گئے۔ دوسری مرتبہ ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۸ھ کو تشریف لائے۔ کاغذ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ رباعیاں کب کی لکھی ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ پہلی مرتبہ جب تشریف لائے تھے تو یہ رباعیاں لکھی ہوں گی۔ کیونکہ دوسری مرتبہ اُنکی تشریف آوری کا مجھے بخوبی علم ہے بلکہ میں روزانہ حاضر ہوا کرتا تھا اور منشی صاحب کی اُس وقت کی تمام تحریریں میری نگاہ میں ہیں۔ قیصر

اس در پہ مسافر جو پہنچ جاتا ہے　　　بھولے سے بھی گھر یاد نہیں آتا ہے
مہمان جو دیکھتا ہے یہ شانِ کرم　　　رخصت[1] کا وہ نام لیتے شرماتا ہے

پامالوں نے کب یہ سرفرازی دیکھی　　　بیماروں نے کب یہ چارہ سازی دیکھی
مجھ سے تو ملاکے آنکھ کہدے کوئی　　　کس آنکھ نے یہ بندہ نوازی دیکھی

گو میں نے اودھ کی سرزمیں دیکھی ہے　　　یہ داد و دہش مگر نہیں دیکھی ہے
کانوں سے سُنی پر آنکھ کی ہمت　　　آنکھوں سے جو دیکھی تو یہیں دیکھی ہے

ہاجرہ کی کامیابی

(سلسلۂ الناظر ماہ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء)

(۱۲)

مولوی فریدالحق اور نعیم کے روانہ ہونے کے تیسرے روز میاں اکبر شام کو سیتاپور پہنچے، بیوی سے ناراض تو تھے ہی، عقلمندی یہ کی کہ سیدھے بیوی کے یہاں نہیں آئے بلکہ سیتاپور میں اپنے ایک کاشمیری دوست کے یہاں قیام کیا، جو اُنکے پرانے کلاس فیلو تھے، اور اب سیتاپور میں وکالت کرتے تھے۔ پنڈت ہردے نرائن، اکبر کے تمام حالات اور سیتاپوری تعلقات سے بخوبی واقف تھے، اُنھیں اکبر کی یہ حرکت عجیب معلوم ہوئی کہ وہ سسرال چھوڑکر ایک غیر شخص کے مکان پر مقیم ہوا۔ ہردے نرائن کی بیوی بھی اکبر سے پردہ نہ کرتی تھی (کاشمیری خواتین رفتہ رفتہ پردہ کی سخت بندشوں سے آزاد ہوتی جاتی ہیں، اگرچہ مسلمانوں کے یہاں کا پردہ تو ان کے یہاں کبھی رائج نہ تھا)۔ کامنی (ہردے نرائن کی بیوی) کو اسکی خلش ہوئی کہ کیوں اکبر بیوی کے یہاں نہیں ٹھہرا؟ عورتوں کو عموماً ان باتوں کی بہت فکر ہوتی ہے، اور جب تک وہ اسکی تحقیق

---

[1] قیصر صاحب نے اس مصرع کو یوں کہا ہے ع رخصت کا نام لیتے ہوئے شرماتا ہے۔

تیں کر لیتیں، انھیں چین نہیں پڑتا۔ کامنی، خود بھی کئی مرتبہ ہاجرہ سے مل چکی تھی، اور وہ اُسکی بہت عزت کرتی تھی، اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کشیدگی کی کیا وجہ ہے۔ خاطر و مدارات کے بعد، جب یہ تینوں اطمینان سے بیٹھے تو کامنی نے اس قصہ کو چھیڑا۔

کامنی۔ کیا وکیل صاحب (مولوی فریدالحق) کے ساتھ اُنکی بیوی بھی حج کرنے گئی ہیں؟

اکبر۔ مجھے نہیں معلوم، شاید گئی ہوں، میں وہاں جاوں تو پتہ چلے، سویرے دریافت کرکے بتا دوں گا۔

کامنی۔ نہیں، میں دریافت کرنا نہیں چاہتی، میں نے اس لیے پوچھا کہ آپ وہاں گئے نہیں تو شاید ہاجرہ بھی باپ کے ساتھ گئی ہوں۔ کیا آپ کو بیوی کے آنے جانے کی کچھ خبر نہیں؟

اکبر۔ نہیں مجھے جہاں تک معلوم ہے وہ نہیں گئیں۔ پھوپھا صاحب نے صرف اپنے ہی جانے کی نسبت لکھا تھا۔

کامنی۔ کیا آپ کے یہاں بیوی سے خط و کتابت نہیں ہوتی؟

اکبر۔ نہیں، خط و کتابت کیوں نہیں ہوتی، لیکن میں نے آج تک ایسا نہیں کیا، اور نہ اسکی ضرورت ہی پڑی۔

ہردے نرائن (ہنس کر) کیا بیوی سے لڑائی ہے؟ تم ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے تھے، کہیں بیوی سے تو نہیں کھنچ گئے؟

اکبر (خفیف ہوکر) نہیں، بات یہ ہے کہ میں نے اپنے آنے کی پہلے سے خبر نہیں دی تھی۔ اس وجہ سے وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔

کامنی۔ میں نے وہاں جانے نہ جانے کا تو ابھی سوال نہیں کیا (ہنس کر) لیکن ہاں اب پوچھتی ہوں کہ کیا بیوی کے یہاں جانے کے لیے بھی خبر کرنا ضروری ہے؟

ہردے نرائن (ہنس کر) ہاں اور کیا۔ نہیں تو بیوی ڈنڈا لیکر مارنے نہ دوڑتیں، (اکبر سے مخاطب ہوکر) نہیں جی، تم نے بڑی سمجھ کا کام کیا۔

کامنی (ہنس کر) خیر تم نے تو بات کو مذاق کر دیا، (اکبر سے) نہیں، سچ بتائیے آخر آپ

وہاں کیوں نہیں گئے۔ کچھ بیوی سے ناراض ہیں؟

ان دو طرفہ حملوں کا جواب دینا اکبر کے لیے مصیبت ہوگیا، اور گھبراہٹ میں اُسنے کہدیا کہ "میں وہاں رہنا پسند نہیں کرتا" جسے اُن دونوں میاں بیوی نے دلچسپی اور مذاق کا مشغلہ بنالیا

کامنی - آخر ناچاقی کی کیا وجہ ہے؟ کیا ہاجرہ بدمزاج ہیں، آپ کا کہا نہیں مانتیں؟

ہردے نرائن (ہنس کر) ہنسے جو بات کہدی وہی سچ ہے، یہ جب جاتے ہیں وہ ضرور ڈنڈا لیکر مارنے دوڑتی ہیں۔

اکبر- یار تمھاری مذاق کی عادت نہ گئی (کامنی سے) بیوقوفی کی حرکتیں کرتی ہیں اور اپنے آپ کو بڑی عقلمند اور قابل سمجھتی ہیں۔

کامنی- ہاجرہ سے تو میں کئی بار ملی ہوں، میں نے تو اُنہیں کوئی بیوقوفی کی بات نہیں پائی، بلکہ میرے نزدیک تو وہ واقعی بڑی سمجھدار اور قابل ہیں۔

ہردے نرائن (مسکراکر) اس سے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال اُنکی اور اُنکی عقل میں تو ضرور ہی فرق ہوگا۔ (کامنی ہنسنے لگی لیکن میاں اکبر کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ ہردے نرائن نے یہ جملہ کس مطلب سے کہا۔ حماقت سے آپ یہی سمجھے کہ یہ اُنکی تائید میں کہا گیا)۔

کامنی- مگر یہاں رہ کر بیوی کے یہاں نہ جانا تو بڑی بےموقع بات ہے۔ میں کہتی ہوں کہ آپکا دل کیسے مانتا ہے؟ ہزار ناراض سہی۔

ہردے نرائن- واہ دل ہزار چاہے، لیکن پھر اپنی عزت آبرو بھی تو کوئی چیز ہے؟ اور بیوی کی تو انھیں کچھ پروا بھی نہیں (اکبر سے مخاطب ہوکر اور قہقہہ مار کر) کیوں یار اب بھی وہ شوق ہے؟

اس جملہ پر میاں اکبر بھائی کی ہنسی ہنس تو دیے لیکن بدن کا خون خشک ہوگیا۔ یہ اس گفتگو کو ٹالنا چاہتے تھے، لیکن اب جو بات کہتے وہ فٹ بال بنالی جاتی تھی۔ آخر جب ان پیہم حملوں سے مدافعت کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو آپ پیشاب کے بہانے سے اُٹھے، اور پورے ڈیڑھ گھنٹے تک پاخانہ میں بیٹھے رہے۔ اس عرصہ میں ہردے نرائن اور اُنکی بیوی دونوں اپنے کمرے میں جاکر سو رہے

دوسرے دن صبح کو میاں اکبر سسرال گئے، لیکن صندوق اور بستر وہیں اپنے کاشمیری دوست کے یہاں چھوڑ آئے۔ مکان پہونچکر سیدھے اندر سیدہ کے پاس چلے گئے، ہاجرہ اپنے کمرے میں تھی، اُسے اکبر کے آنے کی مطلق خبر نہ تھی۔

سیدہ۔ کہو، اچھے رہے، لکھنؤ میں سب خیریت ہے؟ اور تم یہاں کس وقت کی گاڑی سے آئے؟ کیا رات کو لکھنؤ سے چلے تھے؟

اکبر۔ جی ہاں ابھی گاڑی سے چلا آرہا ہوں، اسباب بھی ابھی اسٹیشن ہی پر ہے۔

سیدہ۔ وہاں کس کے سپرد کر آئے، کیا اسٹیشن پر اِکّے نہ تھے، جو اسباب چھوڑ آئے؟

اکبر۔ نہیں، اِکّے تو بہت سے تھے لیکن سویرے کے وقت پیدل چلنے سے تفریح ہوتی ہے اس وجہ سے اِکہ نہیں کیا۔

سیدہ (ہنس کر) چاہے اسباب خدانخواستہ کوئی اُٹھالے جائے، لیکن تفریح ضرور ہو بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔

اکبر۔ نہیں وہاں ایک قلی کے سپرد کر آیا ہوں، وہ ابھی دے جائے گا، اسباب نہیں جاسکتا۔

اسی درمیان میں ہاجرہ کسی ضرورت سے باہر نکلی۔ وہ تو انھیں دیکھ کر گردن جھکائے چلی گئی، لیکن آپ بھلا اس بے شرمی کے کب روادار تھے، جلدی سے اچکن کا دامن اُٹھا کر مُنہ کے سامنے کر لیا۔ سیدہ نے ہزار ضبط کرنا چاہا، لیکن آخر اُسے اس حرکت پر ہنسی آہی گئی۔ اِن کو اسکی کب تاب تھی۔ معاً چہرے پر شکن پڑ گئی۔

اکبر۔ جناب۔ مجھے ایسی بیحیائی پسند نہیں، اسی وجہ سے میں نے یہاں کی آمدورفت کم کر دی۔

سیدہ۔ تو یہ تم ڈیڑھ برس سے اسی لیے نہیں آئے؟ تو بہ مَیں بڑی پریشان تھی کہ تم کیوں نہیں آتے، لیکن یہ بات مجھے نہیں معلوم تھی، تو کس نے تمھارے ساتھ بیحیائی کی؟

اکبر (ناراض ہوکر) یعنی آپ نے اسوقت کی حرکت خود دیکھ لی، اور پھر آپ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ کس نے بیحیائی کی۔ بس یہی باتیں ہمیشہ ہوئیں، جب میں یہاں آیا۔

سیدہ۔ پھر آخر وہ کیا کرتیں؟ انھیں تو یہ معلوم نہ تھا کہ تم میرے پاس بیٹھے ہو، اور جب وہ باہر نکل آئیں تو پھر کہاں جائیں، کیا وہیں منھ چھپا کر بیٹھ جاتیں؟

اکبر۔ وہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی، کیا کمرے میں واپس نہ جا سکتی تھیں؟

سیدہ۔ وہ ایک ہی بات ہوئی، خواہ کمرے میں چلی جاتیں، یا دالان میں۔ یہ تو میرے نزدیک کوئی بیحیائی نہیں ہوئی۔

اکبر۔ جی ہاں آپ تو ایسی ہی بات کہیں گی، یہ آپ ہی کی صحبت کا تو اثر ہے۔

سیدہ اکبر کی بدمزاجی سے اچھی طرح واقف تھی اُس نے اس بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور یہ کہہ کر بات ٹال دی "اچھا بگڑنے کی کوئی بات نہیں، میں ہی بُری سہی۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ کہاں ملازم ہوئے"

اکبر (کچھ رُک کر) میں نے نوکری چھوڑ دی۔ اب انشاء اللہ تجارت کروں گا۔

سیدہ۔ پھر اب کب سے ارادہ ہے؟ کس چیز کی تجارت کروگے؟

اکبر۔ فی الحال ہڈی کی تجارت کا ارادہ ہے۔

سیدہ۔ اللہ برکت دے، پھر کب سے شروع کروگے؟

اکبر۔ بس روپے کی فکر میں ہوں، آپا آجکل خالی ہاتھ ہیں ورنہ ابتک شروع کر چکا ہوتا۔

سیدہ۔ کیا تمھاری آپا کی بھی یہی رائے ہے کہ تجارت کی جائے؟

اکبر۔ جی ہاں اُنھیں کی صلاح سے تو یہ بات قرار پائی۔

اسی عرصہ میں کسی نے آواز دی۔ جُمیا گئی، تو دیکھا، ایک آدمی اکبر کا صندوق اور بستر لیے کھڑا ہے حاقت سے میاں اکبر اپنے دوست سے کہہ آئے تھے کہ انکا سامان مکان پر بھیجدیں۔ جُمیا نے اس آدمی سے پتہ پوچھا، تو اُس نے سب حال کہہ دیا۔ جُمیا نے اُسی وقت اکبر کی موجودگی ہی میں سب کچا چٹھا بیان کر دیا۔ میاں اکبر کا جھوٹ کھُل گیا۔ سچ ہے، جھوٹ بولنے کو بھی عقل چاہیئے اب تو یہ حضرت سخت پریشان ہوئے، لیکن کیا کریں زمین سخت اور آسمان دُور۔

سیدہ (مسکراکر) تم نے تو مجھ سے کہا کہ میں صبح کو آیا ہوں، اور وہ آدمی کہتا ہے کہ رات کو جو بابو صاحب وکیل کے یہاں ٹھہرے تھے اُنکا اسباب ہے" کیا یہ تمہارا اسباب نہیں ہے؟

اکبر (کھسیانہ ہوکر) نہیں، اسباب تو میرا ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ رات کو گاڑی دیر سے آئی اس لیے میں وہیں ٹھہر گیا۔ یہاں کواڑ کھلوانے میں دقت ہوتی۔

سیدہ۔ کچھ دقت نہ ہوتی، آدمی دروازہ پر رہتا ہی ہے، اور اگر ہوتی بھی تو بہرحال ایک غیر کے یہاں رہنے سے تو وہ تھوڑی دیر کی دقت اُٹھانا بہت بہتر تھا۔

اکبر۔ نہیں اُنھوں نے اصرار کیا کہ یہیں ٹھہر جاؤ۔ میں نے بھی اسمیں کوئی ہرج نہ سمجھا۔

سیدہ۔ مگر اصرار تو اُنھوں نے اُسوقت کیا جب تم وہاں گئے۔ اگر تم وہاں اُسوقت نہ جاتے تو وہ اصرار نہ کرتے۔

اکبر۔ مجھے اُن سے ایک ضروری کام بھی تھا اسی لیے اُنکے پاس گیا تھا نہیں تو میں سیدھا یہیں چلا آتا۔

سیدہ۔ وہ کام صبح کو بھی ہو سکتا تھا۔

اب میاں اکبر کے زچ ہونے میں کوئی کسر نہ تھی۔ ہر بات رد کر دی گئی۔ مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر باہر کمرہ میں چلے گئے، اور دن بھر وہیں رہے۔

میاں اکبر، جس غرض سے سیتاپور آئے تھے، اسکے لیے ضرورت تھی کہ کئی روز قیام کرتے، ہاجرہ سے مل کر سہولیت کے ساتھ اپنا کام نکالتے، تاکہ کشیدگی نہ بڑھتی۔ لیکن اسکے لیے بھی سمجھ کی ضرورت تھی، جسکا یہاں قحط تھا۔ آپ سیتاپور آئے تو ہوا کے گھوڑے پر سوار، بات کہی تو ڈھیلا سا مار دیا۔ دنیا میں قاعدہ ہے کہ محبت اور میل جول سے سیکڑوں مشکل کام آسانی سے نکل جاتے ہیں، لیکن سختی اور غصہ کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی اور پریشانی ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ میاں اکبر نے ارادہ کر لیا کہ وہ اُسی روز شام کی گاڑی سے لکھنؤ واپس جائیں گے۔ پانچ بجے آپ بیوی کے کمرے میں آئے، ہاجرہ اُسوقت موجود نہ تھی، وہ سائرہ کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ آپ خاموش بیٹھے رہے اور اپنے غصے

اُسے اپنے آنے کی خبر بھی نہ کرائی۔ بہرکیف جیا اُدھر سے نکلی تو اُسکی نظر اُنپر پڑ گئی، اور اُسنے جاکر ہاجرہ کو خبر کی۔ ہاجرہ فوراً چلی آئی۔

ہاجرہ۔ تم بڑی دیر سے بیٹھے ہوے ہو؟

اکبر (منھ پھلائے ہوے) مجھے آئے ہوے دو گھنٹے ہوگئے۔

ہاجرہ۔ دو گھنٹے کہاں سے ہوگئے؟ ابھی تو مجھے یہاں سے گئے ہوے بھی پورا ایک گھنٹہ نہ ہوا ہوگا۔

اکبر۔ خیر میں جھوٹا سہی، تم ہی سچ کہتی ہوگی۔

ہاجرہ۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ تم خلاف معمول اسوقت آؤگے۔ نہیں تو میں اسوقت وہاں نہ جاتی۔

اکبر۔ اچھا کیا وہاں گئیں، میں کچھ نہیں کہتا۔ میں تو شام کی گاڑی سے لکھنؤ واپس جاؤں گا اس لیے اس وقت چلا آیا۔

ہاجرہ۔ تو پھر آنے کی کیا ضرورت تھی، جب یہاں رہنے کا ارادہ نہ تھا۔

اکبر۔ اپنی ضرورت سے آیا تھا، ورنہ میں کبھی نہ آتا۔

ہاجرہ۔ وہ ضرورت کیا تھی، جس کے طفیل میں میرے حال پر بھی عنایت کرنا پڑی؟ تم نے تو میری صورت پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھالی تھی۔

اکبر۔ تمنے بھی تو میرے ساتھ ایسا ہی کیا ہے، پھر تمہیں شکایت کا کون موقع ہے؟

ہاجرہ۔ شکایت مجھے بالکل نہیں، لیکن میں نے کس دن تمسے نہ ملنے کی قسم کھائی، تمہیں گرپے دریہاں آنا بالکل چھوڑ دیا۔

اکبر۔ اور تمنے بھی تو لکھنؤ آنا مطلق ترک کردیا، بلکہ میرے بلانے پر بھی نہیں آئیں۔

ہاجرہ۔ خیر اُسوقت کسی مصلحت سے میں لکھنؤ نہ آسکی لیکن پھر اُسکے بعد سے تو تین مرتبہ وہاں جاکر رہ چکی ہوں۔

اکبر۔ اچھا اب تم بھی چلتی ہو تو میں ٹھہر جاؤں، ورنہ پھر میں آج ہی واپس جاؤں گا۔

ہاجرہ۔ اب آج کل تو میں کسی طرح نہیں جاسکتی، آپا بالکل تنہا ہیں۔

اکبر (اسقدر پرشکن پڑگئی) خیر یہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم لکھنؤ نہیں جاؤگی، میں تو آج ہی واپس جاؤنگا۔

ہاجرہ۔ خیر یہی تمہاری خوشی ہے تو میں اصرار نہیں کرتی کہ تم ٹھہرہی جاؤ، مگر میں تو جانے سے بالکل مجبور ہوں۔

اسکے بعد تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے، ہاجرہ پاندان کھینچکر پان بنانے لگی، اور اکبر گردن جھکائے اور منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ آخر ہاجرہ نے پان دیا، اور پوچھا "کیا اب بھوپال جانے کا ارادہ نہیں ہے؟" جس کا مختصر جواب صرف "نہیں" تھا۔

ہاجرہ۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟ سرکاری نوکری بھی شاید مشکل سے ملے۔

اکبر۔ دیکھا جائے گا۔ میرا اب نوکری کا ارادہ بھی نہیں ہے۔

ہاجرہ۔ پھر آخر کیا کروگے، ممانی جان کی پنشن تو بہت قلیل ہے۔

اکبر۔ تمہیں اسکی کیا فکر، جو میرے دل میں آئیگا وہ کرونگا۔

ہاجرہ۔ ہاں سچ ہے مجھے اسکی کیا فکر۔

اکبر۔ میرا ارادہ تجارت کا ہے، اسی غرض سے میں یہاں آیا تھا۔

ہاجرہ۔ کیا یہاں تجارت کرنے کا ارادہ ہے؟

اکبر۔ خدا نکرے کہ میں یہاں تجارت کروں۔ اس جملہ پر ہاجرہ اکبر کی طرف سے منھ پھیر کر مسکرا دی، جسے خیریت ہوئی کہ اکبر نے نہیں دیکھا۔)

ہاجرہ۔ پھر آخر وہ کون کام ہے؟

اکبر۔ میں تمہارے پاس اسلیے آیا ہوں کہ آپا کا حال تو ظاہر ہے، جو کچھ انکے پاس تھا، وہ منّن (بہن) کی شادی میں صرف ہوگیا، اور مجھے اب تین سو روپے کی ضرورت ہے۔ مہاجن سے بھی قرض نہیں مل سکتا۔ آخر تمہارا زیور بیکار پڑا رہتا ہے، نہ تم کہیں جاتی ہو اور نہ زیور پہنتی ہو۔ تو اگر تم میرے یہاں کے زیور کا کچھ حصہ دیدو، تو میں اُسے رکھ کر کچھ سودی روپیہ نکال لوں، پھر جب فائدہ ہوگا، تو میں تمہارا زیور چھڑا کر انشاءاللہ واپس کردونگا۔

اکبر نے یہ اور عقلمندی کی کہ "میرے یہاں کے زیور کا کچھ حصہ" کہکر زیور کی تخصیص بھی کردی

جس سے ہاجرہ کو اسوقت رنج تو ضرور ہوا، لیکن بعد کو اُسے یہ سوچ کر اطمینان ہوگیا کہ یہ زیورات اسکے لیے ہتکڑیوں اور بیڑیوں سے کم نہ تھے، جس سے وہ آزاد ہوگئی۔

ہاجرہ "تمھارے یہاں کے زیور کا ایک حصہ تو شاید تین سو کا نہ ہوگا" یہ کہکر وہ جلدی اپنی جگہ سے اُٹھی اور الماری کھول کر اپنے زیور کا صندوقچہ نکال کر لے آئی۔ اسکے بعد، جس قدر زیور اُسے سُسرال سے ملا تھا، وہ اکبر کے سامنے رکھدیا۔ عورتوں کو اپنے زیور سے جو محبت ہوتی ہے، اُسکا تقاضہ تو یہ تھا کہ اُسکا دل بھر آتا، لیکن ہاجرہ نے نہایت خندہ پیشانی سے، ایک ایک چیز گن گن کر اکبر کے حوالہ کردی۔

ہاجرہ۔ ممانی جان کو دکھا دینا کہ اس میں کوئی چیز باقی تو نہیں رہ گئی ہے؟

اکبر۔ تو میں یہ سب لیکر کیا کروں، دو تین چیزیں ان میں سے کافی ہوں گی۔

ہاجرہ۔ نہیں، شاید پھر کبھی ضرورت پڑے، آخر میرے پاس پڑے پڑے زنگ لگ جائیگا۔

اکبر۔ زنگ میرے پاس رہنے سے بھی لگ جائیگا۔ (تین چیزیں لیکر) لو یہ بقیہ تم رکھ لو، میں تو یہ تم سے قرض لے رہا ہوں۔

ہاجرہ (چہرہ بشاش بناکر) تو میں یہ سب قرض دیتی ہوں۔ مجھے اسکا ذرا بھی رنج نہیں، آخر تمھاری ہی چیز ہے۔

اکبر۔ تو یہ سب میرے کس کام کا، میں اِسے کہاں رکھوں گا؟

ہاجرہ۔ ممانی جان کے پاس رکھادینا، جیسے میرے پاس رہا ویسے اُنکے پاس۔"

اکبر نے ہزار اصرار کیا لیکن ہاجرہ نے آخر تمام زیور گن کر اُسکے حوالے کردیا، جسے اکبر نے رومال میں باندھ لیا۔ اُسوقت ہاجرہ نے قلم دوات اور کاغذ نکال کر اکبر کو دیا کہ وہ تمام زیور کی رسید لکھدے۔ اکبر کو یہ سخت ناگوار ہوا، لیکن آخر ہاجرہ کے اصرار، اور سمجھانے بجھانے سے مجبور ہوگیا، اور تمام زیور کی، ہاجرہ کے حسب منشا، رسید لکھدی۔ اس طرح میاں اکبر نے آٹھ نو سو پر بیوی کو فروخت کر ڈالا، کیونکہ اسکے بعد سے پھر ہاجرہ نہ خود کبھی لکھنؤ گئی (اکبر کے یہاں) اور نہ اکبر ہی بجز ایک مرتبہ کے، پھر سیتاپور آیا۔

اکبر زیور لے کر لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ مکان پہونچا۔ ماں سے سب حال بیان کیا، تو عشرت بیگم کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ اکبر کی اس حماقت پر سخت ناراض ہوئیں، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حلیمہ کو جب یہ قصہ معلوم ہوا، تو اُس نے بھی اکبر سے صاف کہ دیا کہ "بس اب سمجھیے کہ بھابھی جان سے آپ کا قطع تعلق ہوگیا" جس کا جواب اکبر نے وہی دیا، جس کی اُس سے اُمید تھی کہ "پھر کیا کروں، کچھ میرا روٹی کپڑا تو بند نہ ہو جائے گا"—— شاباش،

اکبر کے چلے جانے کے بعد، دوسرے ہی دن ہاجرہ نے نعیم کو بھی یہ سب ماجرا لکھ بھیجا (باقی آئندہ)

انیس احمد عباسی
(کاکوروی)

صورتِ حال

آرزو مدت سے پنہاں دل میں تھی — لیلیِ پردہ نشیں محمل میں تھی
شوق نے شورِ تمنا کر دیا — محشرِ جذبات برپا کر دیا
وہ سکوتِ جاں فزا جاتا رہا — لطفِ پنہاں کا مزا جاتا رہا
اضطراب و بیقراری بڑھ گئی — ناشکیبائی و زاری بڑھ گئی
چشمِ گریاں وقفِ خوں باری ہوئی — وسعتِ دامن پہ گُل کاری ہوئی
خود بخود اندر سے دل گھُٹنے لگا — سوزشِ غم کا دھواں اُٹھنے لگا
اپنے پیدا دل میں کچھ چھالے ہوے — پھر عیاں ہونٹوں پہ تبخالے ہوے
نالہ و آہ و فغاں کرنے لگا — شکوہ ہائے آسماں کرنے لگا
ہوگیا پیدا اک اندازِ جنوں — بن گئی شوریدگی نازِ جنوں
قید خانہ گھر نظر آنے لگا — آخر اس زنداں میں گھبرانے لگا
وُسعتِ سمائی چل کے جنگل دیکھیے — اور اس جنگل میں منگل دیکھیے
سیرِ صحرا باعثِ تسکیں ہوئی — شاد کچھ کچھ خاطرِ غمگیں ہوئی
اب مجھے حالت پہ اپنی وجد ہے — قیس میں ہوں اور یہ دشت نجد ہے

(باقی آئندہ)

امریکہ کی خالہ

مسٹر پالم — ڈاکٹر
مسز پالم
مسز پلینوال — مسٹر پالم کی خالہ
مسٹر اسمتھ — کپتان
مسز اسمتھ
مسٹر ہین — وکیل
مسز ہین
مسٹر ڈالم — تاجر
مسز ڈالم
مسٹر لاوڈ ۔ سابق کپتان
(مسٹر اور مسز پالم کے دوست)

میری ۔ پالم کی ملازمہ
بیل (شیدی) مسز پلینوال کا ملازم

(پہلا سین)

پالم کی نشستگاہ ۔ لانبی میز ۔ اُس کے داہنے بائیں جانب ایک ایک کرسی اُس کے پیچھے ایک ریا۔ دروازہ کھلا ہے اور اُس کے داہنی طرف ایک خط پڑا ہے

(میری تنہا ۔ اس کے پیچھے مسٹر اور مسز اسمتھ

میری۔ (دعوت کی میز ترتیب دیتے ہوئے) اے آسمان معمولی ملازمہ کی زندگی کس قدر تلخ ہوتی ہے ۔ دن، رات محنت مشقت، صبح سے شام تک کام کرتے رہنا ۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے آرام کرنے کی

جرأت کرتی ہے تو اس کو اپنی مالکہ کی دھمکیاں اور جھڑکیاں سہنا پڑتی ہیں ۔ کاش میرے آقا متموّل ہوتے تو وہ ایک ملازمہ اور رکھ لیتے اور مجھکو کچھ آرام کرنے اور اپنے کارپورل کے ساتھ سیر کرنے کا موقع ملتا۔ اُف ۔ یہ کیسا پُرلطف وقت ہوتا ۔ کاش وہ بہت جلد سارجنٹ ہوجائے اور میرے ساتھ شادی کرکے اس گھر سے نجات دلائے۔ (وہ داہنی طرف نکلنا چاہتی ہے اور پڑے ہوئے خط کو دیکھتی ہے)

یہ کیا ہے ؟ (اُٹھاکر) اچھا ! خط ۔ شاید ڈاکٹر صاحب اسکو یہیں بھول گئے ۔ ...... کس کا ہے (کھول کر) کیا اس کا پڑھنا جرم تو نہیں ہے ؟ اُنھ ۔ کوئی خط کا مضمون کچھ تھوڑے ہی پھیر دوں گی ۔

(پڑھتی ہے)

شکاگو ۔ ۲ر دسمبر ۱۹۰۰ء

عزیز بھانجے ۔ تم حیران ہوگے ، جب تم کو ایک ایسی عورت کا خط ملے گا جس سے تم ناواقف محض ہو ۔ اس لیے میں پہلے اپنا تعارف تم سے کراتی ہوں ۔ غالباً تمھاری اچھی ماں جو افسوس ہے کہ تمھاری کم سنی میں انتقال کر گئی ۔ تم سے کبھی کبھی اپنی بہن کا ذکر کرتی ہوں گی جو اپنے شوہر ڈاکٹر پلیتوال کے ساتھ امریکہ چلی گئی تھی ۔ پیارے بھانجے میں تمھاری وہی خالہ ہوں ۔ میں نے تمھاری ماں کو یا اپنے اور کسی عزیز کو کبھی خط نہ لکھا ۔ اس کا سبب میں لکھنا نہیں چاہتی ۔ اسی قدر کافی ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں ۔ مگر میرے شوہر کا گزشتہ سال میں انتقال ہوگیا اور میں اس وسیع ملک امریکہ میں تنہا رہ گئی ۔ میں نے اس حصۂ دنیا کو کبھی پسند نہیں کیا ۔ لیکن میرے فرٹس (یہی میرے شوہر کا اصلی نام تھا) نے یورپ جانا نہیں چاہا ۔ کیونکہ وہ نئی دنیا میں بہ نسبت پُرانی دنیا کے زیادہ امیر ہوسکتا تھا ۔ یہاں ہم دونوں خوش حالی سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ اور بہت معمولی طریقہ یعنی کفایت شعاری کے ساتھ ۔ اور میں اپنی اسی طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتی ہوں ۔ لیکن میری دلی خواہش ہے کہ میں یورپ آؤں اور اپنی زندگی کے آخری دن اپنے عزیز بھانجے کے پاس جو میرے شوہر کا ہم نام ہے گزاروں ۔ کیا تم اسے پسند کروگے ؟ یہ میری بڑی آرزو ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمھاری شادی ہوچکی ہے (یہ میں پھر بتلاؤں گی کہ کیونکر مجھے اس کا علم ہوا) اور تمھاری بیوی ایک نہایت شریف اور مہذب خاتون ہے ؛

(مسٹر اور مسز اسمتھ اندر آنا چاہتے ہیں لیکن میری کو دیکھ کر آپس میں چُپ رہنے اور سُننے کا اشارہ کرتے ہیں اور کھُلے ہوئے دروازہ میں ٹھہر جاتے ہیں)

"وہ مجھے اپنا شریکِ زندگی بنانا خوشی سے پسند کرے گی۔ میرے پاس قریباً ایک لاکھ ڈالر ہیں جو فرنس نے میرے لیے چھوڑے ہیں اور جو میرے مرنے پر تم دونوں کی ملکیت ہوں گے۔ بشرطیکہ تم نے مجھ سے اچھا سلوک کیا۔ میں تکلفات کی عادی نہیں ہوں۔ میرے لیے ایک معمولی کمرہ اور میرے ملازم کے لیے جو میرے ساتھ آئے گا ایک کوٹھری کافی ہوگی۔ یہ ملازم ایک شیدی ہے اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔ کیونکہ عرصہ سے یہ میری خدمات وفاداری سے انجام دے رہا ہے۔ علاوہ اس شیدی کے میرے پاس ایک سبز رنگ کا طوطا ہے جو بولتا ہے اور کہہ سکتا ہے "ڈاکٹر ہے بدمعاش" "فرنس پیارا ہے شریف" اور میرے پاس ایک بلی بھی ہے۔ جس کے لیے تھوڑی سی جگہ مکان کے گوشہ میں کافی ہوگی۔ اگر تمہارا مکان بہت چھوٹا ہو جس میں مَیں، شیدی، بلی، اور طوطا نہیں رہ سکتے، تو مہربانی سے دوسرا بڑا مکان کرایہ سے لے لو۔ اس تبدیل مکان میں جو مزید اخراجات ہوں گے اُنکی ذمہ دار مَیں ہوں گی۔ عزیزمن یہ خیال نہ کرنا ....

(دوسرا سین)

(میری، مسز اسمتھ، مسٹر اسمتھ، مسز پالم)

مسز پالم (کمرہ کے داہنی طرف باہر سے) میری ....

میری (خط پڑھتے پڑھتے چونک کر) یا اللہ ...... میڈم پکارتی ہیں۔

(جلدی سے خط کو دروازہ کے پاس رکھ دیتی ہے۔ مسٹر اور مسز اسمتھ اُسکے پیچھے آہستہ سے دروازہ بند کرکے چلے جاتے ہیں۔)

مسز پالم (پہلے سے زیادہ زور سے چلا کر) میری۔ میری

میری۔ میڈم میں آرہی ہوں (وہ بائیں طرف سے نکلنا چاہتی ہے کہ کوئی دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے) ارے کون دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے (دروازہ کھولتی ہے مسٹر اور مسز اسمتھ اندر آتے ہیں)

مسز اسمتھ۔ گڈ ایوننگ میری۔ کیا ڈاکٹر گھر میں ہیں؟

میری۔ جی نہیں۔ وہ ایک گھنٹہ سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔

مسز اسمتھ۔ کیا میڈم بھی گئی ہیں؟

میری۔ جی نہیں۔ وہ گھر ہی میں ہیں۔

مسز پالم۔ (اندر سے بہت زور سے چلا کر) میری - میری - آتی کیوں نہیں -

میری - جی میڈم آ رہی ہوں -

مسز اسمتھ - جاؤ - ہم ٹھہریں گے - کہدو کہ ہم مختصر ملاقات چاہتے ہیں -

میری - بہت اچھا - میں ابھی کہے دیتی ہوں - (چلی جاتی ہے)

مسٹر اسمتھ (اپنی بیوی سے) اس خط کے متعلق کیا کہتی ہو -

مسز اسمتھ - مسز پالم نے عرصہ ہوا یہ خط مجھے دکھایا تھا - لیکن اُسکے بعد تین خط اور آچکے ہیں - جس میں بوڑھی خالہ نے مختلف قسم کی تکالیف کی شکایت کی ہے - اول یہ کہ بلی مرگئی - دوم شیدی بیمار ہوگیا جس کی وجہ سے سفر عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا -

مسٹر اسمتھ - شاید اُس کا روپیہ بھی کھو گیا -

مسز اسمتھ - نہیں روپے کے متعلق اُس نے کچھ نہیں لکھا - لیکن مسٹر اور مسز پالم اندیشے میں تھے کہ روپے کے متعلق بہت ناگوار واقعہ پیش آگیا - مگر اسکی کوئی تصریح نہیں کی - البتہ اُنکو اسکا افسوس بہت ہے کہ بڑا مکان کرایہ پر لے لیا - کیونکہ ڈاکٹر کو خالہ کے سفر کے ملتوی ہو جانے کا اندیشہ ہے

مسٹر اسمتھ - کیا ہمارے دوستوں نے ان خطوں کو سُنا ؟

مسز اسمتھ - ہاں - اور ہم نے ایک دل لگی کی تجویز کی ہے - جس میں میں اور تم دونوں پارٹ کرینگے

مسٹر اسمتھ - اور ہمارا اسٹرڈم کا سفر ؟

مسز اسمتھ - ایک بہانہ تھا کہ آج شام کو ہم اس گھر میں نہ ہوں گے - وہ تار جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا نہیں آیا .... اب ہم معذرت کرنے آئے ہیں -

مسٹر اسمتھ - لیکن تم نے مجھ سے پہلے اس مذاق کا ذکر کیوں نہیں کیا - کیا تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں ؟ میں بچہ نہیں ہوں -

مسز اسمتھ - اس کا سبب ! تم جانتے ہو کہ تم راز چھپا نہیں سکتے ...... بگڑو نہیں - ابھی گھر چلتے ہیں اور پارٹ کے لباس بدلتے ہیں - پھر چند منٹ کے بعد دونوں میاں بیوی کو گھبرانے کے لیے

واپس آتے ہیں۔ میں خالہ بنوں گی۔ تم شیدی۔

مسٹر اسمتھ۔ مگر تم مجھے کالا تو نہیں کرو گی۔

مسز اسمتھ۔ صرف چہرہ۔ اور ہاتھوں میں سیاہ دستانے پہن لینا۔

مسٹر اسمتھ۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ ہم بولنے والا طوطا لائیں۔

مسز اسمتھ۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کا انتظام ہو گیا۔ تم دیکھتے جاؤ۔ اچھا چپ ہو۔ کوئی آتا ہے۔

(تیسرا سین)

(مسٹر اور مسز اسمتھ اور مسز پالم)

مسز پالم (اندر آکر) معاف فرمائیے اتنی دیر تک میں نے آپ کو منتظر رکھا۔

مسز اسمتھ۔ کیا مضائقہ ہے۔ ہم صرف آپ کو مبارکباد دینے اور معافی چاہنے کو آئے ہیں۔ کہ آج شام کو ہم نہیں آسکتے۔ چند ضروری کاموں کی وجہ سے آج اسٹرڈم جانا لازمی ہے۔ ہم کو بہت افسوس ہے لیکن مجبوری ہے۔

مسٹر اسمتھ۔ ہاں بہت ہی ضروری معاملہ ہے اور ....

مسز اسمتھ۔ لیکن ہم اپنا وقت باتوں میں نہیں گزار سکتے۔ کیونکہ گاڑی آدھ گھنٹے میں چلی جائے گی۔ ہم کو عجلت ہے۔ اچھا مسز پالم اپنے شوہر کو ہماری طرف سے مبارکباد دیجیے گا۔

مسز پالم۔ میں آپ کی مشکور ہوں۔ فرٹس کو آپ کی عدم موجودگی کا بیحد افسوس ہو گا۔ کیونکہ بغیر کپتان کے جلسے روکھے پھیکے رہتے ہیں۔

مسز اسمتھ۔ ہاں۔ تاہم آپ کی تفریح ہو جائے گی۔ اچھا میری دوست ہم جاتے ہیں۔ خدا حافظ۔ (مسٹر اور مسز اسمتھ چلے جاتے ہیں)

(چوتھا سین)

(مسز پالم اُس کے بعد مسٹر پالم)

مسز پالم۔ آٹھ بج گئے۔ چند منٹ کے بعد میں مہمانوں کا انتظار کر سکتی ہوں لیکن فرٹس

کہاں ہیں؟ (کھڑکی میں دیکھتی ہے) وہ آرہے ہیں۔ اب میں دیکھوں کہ میری نے میز کو اچھی طرح آراستہ کیا ہے یا نہیں۔ یہاں مسٹر اور مسز ہین بیٹھیں گے۔ یہاں مسٹر لائل۔ یہاں مسٹر اور مسز ڈالم اور یہاں فرٹس اور میں .... میز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مہمان آرام سے بیٹھیں گے۔ خدا کرے کہ دیر سے نہ آئیں۔ (مسٹر پالم آتے ہیں) فرٹس۔ میں خوش ہوں کہ تم آگئے۔ مہمان جلد آجائیں گے ..... مسٹر اور مسز اسمتھ ابھی یہ کہنے آئے تھے کہ وہ ہماری دعوت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ بعض اہم معاملات کی وجہ سے اُن کو اسٹرڈم جانا لازمی تھا۔ میں اُنکی طرف سے تم کو مبارکباد دیتی ہوں۔

مسٹر پالم۔ اُن کی عدم موجودگی کا مجھے بہت افسوس ہے ..... خالہ کا ایک خط اور آیا ہے۔ میں نے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ چٹھی رساں نے مجھ کو دیا۔

مسز پالم۔ جلدی کھولو۔ کوئی حادثہ تو نہیں گزرا۔ پہلے تینوں خطوں سے مجھے بہت پریشانی ہوئی تھی ...... اچھا کیا لکھتی ہیں؟ (مسٹر پالم پڑھتا ہے)

عزیز بھانجے اور بھانجی! میں تم کو اطلاع دیتی ہوں کہ تم میرا کل تک انتظار کر سکتے ہو۔ میں بہت ہی خوفناک بحری امراض میں مبتلا رہی۔ لیکن اب اس قابل ہوگئی ہوں کہ اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔ بیل اور طوطا اچھا ہے۔ زیادہ لکھنے کا وقت نہیں۔ کام بہت کرنا ہے ہزار بوسے۔

تمھاری خالہ

مسز پالم۔ اُنھوں نے یہ خط کب لکھا ہے۔

مسٹر پالم۔ (خط دیکھ کر) ارے تاریخ تو لکھی ہی نہیں ...... ٹھہرو میں لفافہ پر دیکھتا ہوں (مہر دیکھ کر) عجیب بات ہے۔ مہر ایسی خراب لگی ہے کہ پڑھی نہیں جاسکتی۔

مسز پالم۔ شاید وہ آج آجائیں گی ..... روپے کی نسبت کچھ نہیں لکھا؟

مسٹر پالم۔ کچھ نہیں۔

مسز پالم۔ کاش وہ ابھی نہ آتیں۔ خدا کرے ایسا نہ ہو کہ وہ مہمانوں کی موجودگی میں آجائیں۔

مسٹر پالم۔ ہُنہ۔ اسکی کچھ پروا نہیں۔ اپنے دوستوں سے ہم اُن کا تعارف کرادیں گے۔

مسز پالم۔ ہاں لیکن میں تو یہ چاہتی ہوں کہ وہ اُس وقت آئیں جب ہم اکیلے ہوں۔

مسٹر پالم۔ گھبراؤمت (ایک لمحہ کے بعد) کیا تم نے سُنا کہ ہمسائے بھی خالہ کو جانتے ہیں؟ میں نے ابھی اُن کی نسبت چند آوازے سُنے۔

مسز پالم۔ چند آوازے؟

مسٹر پالم۔ ہاں۔ ہمسائے مجھے سُناتے تھے، زرّیں خالہ، ہیرے کی خالہ، اس کے علاوہ اور بھی ایسے ہی فقرات تھے۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ وہ نہیں آئیں گی۔ لوگ یہ بھی مشہور کرتے ہیں کہ اُن کا تمام روپیہ ضائع ہوگیا۔ ہم کو دوسرا کرایہ کا مکان لینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ لونڈے بھی چڑاتے تھے اور ایک دوسرے سے آپس میں پوچھتے تھے کہ کیا زرّیں خالہ آ گئیں؟

مسز پالم۔ یہ تو بہت خوفناک بات ہے۔ فرض خیال تو کرو کہ اگر وہ مالدار نہیں ہیں تو ہم کو لامحالہ مکان تبدیل کرنا پڑے گا۔

مسٹر پالم (ذرا بگڑ کر) تمھارا بھی کیا خیال ہے ...... میں پھر کہتا ہوں گھبراؤمت .... کاش ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ کس وقت وہ آئیں گی۔　(کوئی زور سے گھنٹی بجاتا ہے)

مسز پالم (سہم کر) خدایا۔ کون ہے؟

مسٹر پالم۔ شاید مہمان ہیں۔

مسٹر پالم۔ ہاں مجھے اُن کا خیال ہی نہیں رہا۔ اچھا میری۔ دروازہ کھولو۔ کوئی گھنٹی بجاتا ہے۔ خدا کرے کہ خالہ آج نہ آئیں۔　(مسٹر اور مسز ہین۔ مسٹر اور مسز ڈالم آتے ہیں)

——••(پانچواں سین)••——

(مسٹر اور مسز پالم، مسٹر اور مسز ڈالم، مسٹر اور مسز ہین)

مسٹر ہین۔ گڈ ایوننگ، دلی مبارک باد۔

مسز ہین۔ ڈاکٹر کی سال گرہ پر دلی مبارک باد ہیں۔　(دونوں مسٹر اور مسز پالم سے ہاتھ ملاتے ہیں)

مسٹر ڈالم۔ گڈ ایوننگ۔ میں آپ کی صحت وتندرستی کی دعا کرتا ہوں۔

مسز ڈالم۔ ہزار مبارک بادیں۔ (یہ دونوں مسٹر اور مسز پالم سے ہاتھ ملاتے ہیں)

مسٹر پالم۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں

مسز پالم۔ میں آپ سب صاحبوں کی شکرگزار ہوں! تشریف رکھیے! تشریف رکھیے۔

(سب بیٹھ جاتے ہیں)

مسز پالم۔ مسٹر اسمتھ اور اُن کی بیوی نہیں آسکتے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے یہاں آئے تھے کہتے تھے کہ ہم اسٹروم جا رہے ہیں۔

مسز ہین۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔

مسٹر ہین۔ مجھے بھی افسوس ہے۔ کپتان نہایت دل لگی باز ہے۔ بغیر اُسکے کچھ لطف نہیں آیگا۔

مسز ڈالم۔ کوئی شبہہ نہیں۔

مسٹر ڈالم۔ اُن کی موجودگی سے مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ لیکن مثل ہے کہ "اول معاملات بعدۂ مزاحات" سچ ہے نا؟

مسٹر ہین۔ کیا سابق کپتان بھی نہیں آئے؟ دعوتوں میں تو وہ پہلے پہونچ جایا کرتے ہیں۔

مسٹر ڈالم۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔ وہ ایسے موقع پر پہلے پہونچتے ہیں۔ لیکن وہ .....

(کوئی گھنٹی بجاتا ہے) تو شاید وہی ہیں۔

مسز پالم (دروازے کی طرف ڈرتے ہوئے دیکھ کر آہستہ مسٹر پالم سے) خدا کرے خالہ نہ ہوں۔

مسٹر پالم (آہستہ سے) مت ڈرو۔ ہماری خالہ ابھی نہیں آئیں گی۔ آئیں گی تو کبھی میں آئیں گی۔ ہم پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سُن لیں گے۔ (مسٹر لاوڈ آتے ہیں)

چھٹا سین

(سابقہ سین کے اشخاص اور مسٹر لاوڈ)

مسٹر لاوڈ۔ کرم دوستو (سب سے مصافحہ کرکے) آپ کا مزاج کیسا ہے ...... ڈاکٹر صاحب میں آپ کو اور آپ کی بیوی کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ایسے بہت سے سال خوشی کے

نصیب ہوں اور بے شمار اسامیاں اور بہت جلد چھوٹا ڈاکٹر... ہاہاہا جس کی آپ کے گھر میں کمی ہے۔

مسٹر پالم۔ (مسکراکر) میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، بوڑھے دوست، میں دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مسز پالم۔ کپتان صاحب میں آپ کی مشکور ہوں۔ لیکن چھوٹے ڈاکٹر کے لیے ابھی ہم ...ف وقت ہے۔ تشریف رکھیے۔

مسٹر لاوُڈ۔ بہت خوب..... (بیٹھ کر) ہمارے دوست مسٹر اسمتھ اور اُنکی بیوی کہاں ہیں؟ کیا آپ اُن کا انتظار کر رہی ہیں؟

مسز پالم۔ وہ نہیں آسکتے اُن کو ایک ضروری کام کے لیے اسٹرڈم جانا ہے اُن کی عدم موجودگی کا ہم کو افسوس ہے۔

مسٹر لاوُڈ۔ ہاں بڑے افسوس کی بات ہے۔ (مسز ہین سے) آپ کی والدہ آپ کے ساتھ نہیں آئیں؟

مسز ہین۔ اُنھوں نے گھر ہی میں رہنا پسند کیا ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کچھ کام ہے۔ وہ ہمیشہ کام کرتی رہتی ہیں۔ اور اُن کا یہ خیال ہے کہ اگر وہ نگرانی نہ کریں تو تمام خانہ داری کا انتظام درہم برہم ہو جائے...... بوڑھی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں

مسٹر لاوُڈ۔ بالکل ایسی ہی جیسی میری اماں جان۔

مسز ڈالم۔ وہ اچھی تو ہیں؟

مسٹر لاوُڈ۔ خدا کا شکر ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ قوی ہیں۔ وہ بلا عینک لگائے پڑھ لیتی ہیں اور سوئی میں تاگا بھی پرو لیتی ہیں۔ گویا وہ بائیس برس کی ہیں۔ حالانکہ وہ اس وقت ۸۵ برس کی ہیں۔

مسز ڈالم۔ پچاسی برس کی..... تعجب ہے (خفیف خاموشی) (مسز ہالم معانوں کے آگے کھانا پیش کرتی ہیں

مسزڈالم۔ (مسٹرڈالم سے آہستہ) وہ ابھی آئیں گے ؟
مسٹرڈالم۔ (آہستہ سے) ہاں .... چپ رہو۔
مسزڈالم۔ (آہستہ سے) کوئی نہیں سنتا۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ کپتان اپنا پارٹ کیسے کریگا اور شیدی کا روپ کیوں کر بھرے گا۔
مسٹرڈالم۔ (آہستہ سے) خاموش رہو۔
مسٹرلاؤڈ۔ آپ نے اُس خوفناک قتل کا واقعہ سُنا ؟
سب۔ قتل
مسٹرلاؤڈ۔ ہاں۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ ہوا سنا کہ ایک بوڑھی عورت جو ریل میں ڈرڈم سے ہمارے شہر کو آ رہی تھی۔ راستے میں کسی بدمعاش نے اُس کو قتل کر دیا۔ اور بہت سا روپیہ جو اُسکے پاس تھا لے گیا۔ (تعجب سے) کیا تم نے یہ واقعہ بالکل نہیں سُنا۔
سب۔ مطلق نہیں۔ کس قدر جرم، کیسا قابلِ نفرت۔
مسز پالم۔ کیا وہ تنہا سفر کر رہی تھی۔
مسٹرلاؤڈ۔ جس قدر میں نے بیان کیا اُس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔
مسز پالم۔ مقتولہ خدا کرے ....
مسٹر پالم۔ مہمل، لغو، کُل واقعہ سراسر غلط۔ لوگ یوں ہی افواہیں اُڑایا کرتے ہیں۔
مسٹرلاؤڈ۔ لیکن یہ تواتر کے ساتھ سنا گیا ہے۔
مسٹر پالم۔ ارے کپتان صاحب بالکل غلط۔ آپ مطلق یقین نہ کیجیے۔
مسز ہین۔ (مسٹر ہین سے آہستہ) اُنھوں نے کیسی دیر لگائی۔ میں بہت دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔
مسٹر ہین۔ (آہستہ) چُپ رہو۔ نہیں تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔
مسٹرلاؤڈ۔ (مسٹر پالم سے) کیا آپ نے پھر بھی اپنی خالہ کی نسبت کچھ سُنا ؟
مسٹر پالم۔ جی ہاں کل تک وہ آجائیں گی۔ مجھے ابھی اُن کا خط ملا ہے۔

مسٹر ہین - یوں - یکایک ؟

مسز ہین - کل تک -

مسٹر اور مسز ڈالم - ارے -

مسٹر لاؤوڈ - افسوس ہے کہ آپ کی سال گرہ کی تاریخ کل کیوں نہ ہوئی - آپ کی خالہ کی موجودگی میں یہ دعوت ہوتی - (کوئی دور سے گھنٹی بجاتا ہے)

مسز پالم - (سہم کر) خدا خیر کرے -

مسٹر لاؤوڈ - شاید کوئی مریض ہے -

مسٹر پالم - مجھے کسی مریض کی اُمید نہیں - مریض کا اس وقت کیا کام -

(ڈیوڑھی میں آواز سُنائی دیتی ہے - کچھ لمحے کے بعد میری اندر آتی ہے)

(ساتواں سین)

میری - ڈاکٹر صاحب - ابھی ایک بوڑھی خاتون تشریف لائی ہیں وہ ایک بڑے شیدی کے ساتھ ڈیوڑھی میں کھڑی ہیں - آپ کو پوچھتی ہیں کہ وہ گھر میں ہیں - (خفیف خاموشی)

(مسز پالم گھبرا کر مہمانوں کو دیکھتی ہے گویا وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ سب چلے جاؤ)

میری - تو ڈاکٹر صاحب میں اُن سے کیا کہوں ؟

مسز پالم - فرٹس - استقبال کے لیے جاو ... شیدی کے ساتھ ہماری خالہ ہیں وہ ڈیوڑھی میں کھڑی نہیں رہ سکتیں -

مسٹر پالم - کیا میں اُن کو اندر لاؤں ؟ (گھبرا کے چاروں طرف دیکھتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ مہمان اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں، مایوسی کے ساتھ میری کے پیچھے پیچھے جاتا ہے)

مسز پالم - کیسے یکایک آگئیں - ہمیں تو کل کی خبر تھی -

(بوڑھی خاتون داخل ہوتی ہے - اُسکے ہاتھ میں ایک بڑا پنجرہ ہے جس میں طوطا ہے - اور پیچھے پیچھے ایک شیدی وردی پہنے ہوئے اور دو بڑے چمڑے کے بکس اُٹھائے ہوئے ہے -)

آٹھواں سین

(مسٹر اور مسز پالم - جملہ مہمان - مسز بلینوئل - (خالہ) - پیل (شیدی)

خالہ - تمھارے مہمانوں کو میری وجہ سے کچھ تکلیف نہ ہو۔

مسٹر پالم - جی نہیں - برخلاف اس کے وہ آپ سے مل کر بہت مسرور ہوں گے (اپنی بیوی کو بتا کر) یہ میری اہلیہ ہیں جو بہت عرصہ سے بےچینی کے ساتھ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

خالہ - اچھی بی بی ہے - پیاری بھانجی میں تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی (بوسہ لیتی ہے) اور میں امید کرتی ہوں کہ ہم دونوں بہت جلد دوست ہو جائیں گے - لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت نازک ہو - اطمینان سے بیٹھو اور میری وجہ سے تکلیف مت اُٹھاؤ (کُل مہمان کھڑے ہو جاتے ہیں)

مسز پالم - خالہ جان آپ کی تشریف آوری بہت بڑی برکت کا باعث ہے - مجھے اُمید ہے کہ یہ گھر آپ کو پسند آئے گا۔

خالہ - ہاں مجھے ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔

مسٹر پالم - خالہ جان آپ اجازت دیجیے کہ آپ سے اپنے دوستوں کا تعارف کراؤں۔ آپ مسٹر ہین ہیں اور یہ آپ کی اہلیہ ہیں مسٹر ہین وکالت کرتے ہیں اور عرصہ سے میرے دوست ہیں ..... آپ مسٹر ڈالم اور مسز ڈالم ہیں - مسٹر ڈالم سے میری شناسائی کو تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہے آپ جج ہیں ..... آپ مسٹر لاؤڈ سابق کپتان ہیں - یہ مجھ سے روزانہ ملنے آتے ہیں (خالہ کسی قدر جھکتی ہے اور کُل مہمان بھی کسی قدر جھکتے ہیں)

مسٹر پالم - خالہ جان کیا آپ میری اہلیہ کے پاس بیٹھنا چاہتی ہیں؟ معاف کیجیے کہ میں نے ابھی آپ کے ہاتھ سے پنجرہ نہیں لیا - کیا آپ اجازت دیتی ہیں کہ ایک گوشے میں میز کے اوپر اس کو رکھ دوں؟ کل اس کے لیے کوئی عمدہ جگہ تجویز کر لی جائے گی (پنجرے کو ایک چھوٹی میز پر اُٹھا کر رکھ دیتا ہے) کیسا پیارا طوطا ہے - کیا یہ بولتا بھی ہے جیسا آپ نے لکھا تھا؟

خالہ - یہ چند ہی الفاظ بولتا ہے وہ بھی جب اس کی خوشی ہوتی ہے - میرے شوہر نے اس کو یہ الفاظ سکھائے تھے - اُن کو پرندوں کا بہت شوق تھا۔

مسٹر پالم ۔ اس میں کیا شک ہے ۔ (شیدی کمبوں کو دوسری جگہ رکھکر پھر خالی کرسی کے پیچھے آکر کھڑا ہو جاتا ہے)

مسز پالم ۔ لیکن خالہ صاحبہ آپ کا شیدی ...... آپ کا ملازم میں کہنا چاہتی ہوں ....

خالہ ۔ اس کا نام بِیل ہے ۔

مسز پالم ۔ ہاں مجھے یاد آگیا ۔ آپ نے اپنے خطوں میں یہی نام لکھا تھا ۔ کیا میں بِیل کو اس کا کمرہ بتا دوں ؟ اس کو سفر کا تکان ہوگا ۔ اور میری ....

خالہ ۔ نہیں میری بھانجی ۔ بالکل نہیں ۔ اول تو وہ توانا ہے اور دوسرے (اگر آپ منظور کریں) میں چاہتی ہوں کہ آج شام کو میری ہی کرسی کے پیچھے رہے ۔ وہ اسی طرح میری خدمت کا عادی ہے اور ..... میں خیال کرتی ہوں کہ تمھارے دوست جو بلاشبہہ میرے بھی دوست ہو جائیں گے مہربانی فرما کر بِیل سے کچھ اپنا تعارف کرائیں ۔

مسز پالم ۔ کیا خود آپ کو کچھ تکان نہیں ہے ؟ کیا آپ چاء نوش فرمائیں گی یا آپ چاہتی ہیں میں اپنی ملازمہ سے آپ کے لیے ......

خالہ (مسکرا کر) میں نے ابھی کہا پیاری بھانجی میری وجہ سے کچھ تکلیف مت اُٹھاؤ ۔ میں اس پر قانع ہوں کہ میں ایسی اچھی سوسائٹی میں ہوں ۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں تمھارے پاس بہت دنوں سے ہوں ۔

مسز پالم ۔ خالہ جان اور بِیل ۔

خالہ ۔ میری موجودگی میں اس کو کسی چیز کی حاجت نہیں ہے وہ روٹرڈم میں خوب کھا پی چکا ہے ۔

مسز ہین (آہستہ سے) (مسٹر ہین سے) مجھے بڑا تعجب ہے کہ کپتان بالکل شیدی معلوم ہو رہا ہے اس نے یہ وردی کہاں سے لے لی ۔

مسٹر ہین ۔ (آہستہ سے) اور اُس کی بیوی کو دیکھو وہ سچ مچ امریکہ کی معلوم ہوتی ہے ۔ میں نے اُس کو نہیں پہچانا تھا ۔

مسز ہین ۔ (خالہ سے) امید ہے کہ یہ شہر آپ کو پسند آئے گا ۔

خالہ ۔ مجھے اس میں بالکل شبہہ نہیں ۔

مسز ہین۔ کتنا عرصہ ہوا جب آپ نے یورپ چھوڑا تھا؟
خالہ۔ بہت مدت ہوئی۔ میں صرف بیس برس کی تھی جب اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ گئی تھی۔
مسٹر ہین۔ آپ کے شوہر ایک ڈاکٹر تھے؟
خالہ۔ جی ہاں جیسے میرے بھانجے ہیں......
مسٹر پالم۔ لیکن وہ مجھ سے بہت زیادہ قابل تھے.........
گوشہ سے ایک آواز۔ "ڈاکٹر ہے بدمعاش" (مہمان زور سے ایک قہقہہ لگاتے ہیں)
مسز پالم۔ لو وہ طوطا بولا۔ یہ تو خوب صاف بولتا ہے۔
مسٹر لاؤڈ۔ کیا آپ کا طوطا ہمیشہ ایسی ہی اچھی طرح بولا کرتا ہے؟ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایسا طوطا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔
مسز ہین۔ لیکن اس کا نشانہ کون ڈاکٹر ہے؟
مسٹر ہین۔ شاید اس نے ہمارے دوست کو نشانہ بنایا۔ ہا ہا ہا (مہمان زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)
مسٹر پالم۔ (ہنسی سے) خالہ جان آپ کا طوطا بہت جلد میرا دشمن ہو جائے گا۔
خالہ۔ اُسے بولنے دو۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا کہتا ہے۔
گوشے سے ایک آواز۔ "فرٹس پیتا ہے شراب" (سب قہقہہ لگاتے ہیں)
مسز ڈالم۔ یہ کچھ اور زیادہ بھی بولنا جانتا ہے؟
خالہ۔ اور بھی چند جملے بولتا ہے۔ جس قدر کمرے میں لوگ باتیں کرتے ہیں اسی قدر وہ بھی بولتا ہے۔ بعض دفعہ وہ دن بھر منہ نہیں کھولتا۔
مسز ڈالم۔ عجیب۔
مسٹر پالم۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اسے ساتھ لے آئیں وہ محفل کا خوب دل بہلا سکتا ہے۔
گوشے سے ایک آواز۔ "ڈاکٹر ہے بدمعاش"۔ (مہمان قہقہہ لگاتے ہیں)
خالہ (بیل سے) بیل پنجرے پر کپڑا ڈال دو۔

بیل - بہت اچھا میڈم - (بیل چمڑے کا بکس کھولتا ہے اُس میں سے کپڑا نکال کر پنجرے پر ڈال دیتا ہے اور پھر خالہ کے پیچھے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

مسز ہین - (آہستہ) یہ عجیب بات ہے - میں نہیں سمجھتی کہ یہ بولتا ہوا طوطا کہاں سے لائے۔

مسٹر ہین - (آہستہ) یہ طوطا شاید کسی سے مستعار لیا ہے - لیکن وہ تو بولتا نہیں ......

مسز ہین - (آہستہ) ہم سب اس کی آوازیں سُن رہے ہیں -

مسٹر ہین - (آہستہ) یہ آواز اُس شخص کی ہے جو دروازے کے پیچھے چھپا ہوا ہے -

مسٹر لاؤڈ - (خالہ سے) جناب کیا آپ اپنا طوطا فروخت کرنا چاہتی ہیں؟ میں اس بولتے ہوئے طوطے کو خریدنا چاہتا ہوں -

خالہ - جناب یہ میرے پاس بیس برس سے ہے اور اپنی زندگی تک جدا کرنا نہیں چاہتی بشرطیکہ میرے بھانجے اور بھانجی اس سے دق نہ ہوں -

مسٹر پالم - برخلاف اس کے ......

مسز پالم - خالہ جان یہ آپ کا کیا خیال ہے - ہم کو خود پرندوں کا شوق ہے -

خالہ - طوطا بڑا پیارا جانور ہوتا ہے وہ کبھی کسی کو نہیں کاٹتا -

مسٹر پالم - طوطا اور ہم بہت جلد دوست ہو جائیں گے -

گوشے سے ایک آواز "ڈاکٹر ہے بدمعاش" (مہمان قہقہہ لگاتے ہیں)

مسٹر پالم - (ایک طرف) ملعون طوطے -

خالہ - بیل کیا تم نے کپڑا اچھی طرح منڈھ دیا؟

بیل - جی ہاں میڈم -

مسز ہین - (آہستہ مسٹر ہین سے) کپتان اصلی ایکٹر ہے دیکھو وہ کس طرح ہم کو دیکھ رہا ہے -

مسٹر ہین - (آہستہ) لیکن اُس کی بیوی اُس سے بڑھی ہوئی ہے - میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تھیٹر کے لیے اس قدر موزوں ہے -

مسز ڈالم۔ (خالہ سے) کیا آپ کا ملازم صرف انگریزی بولتا ہے؟

خالہ۔ جی ہاں صرف انگریزی۔

مسٹر لاؤڈ۔ اگر آپ منظور کریں تو ہم اسے اپنی زبان سکھا دیں۔

خالہ (مسکرا کر) میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ بیل بغیر کسی معلم کے ہماری زبان جلد سیکھ لے گا۔ وہ اچھی طرح سمجھ لیتا ہے، مَیں اپنے شوہر سے اپنی مادری زبان میں گفتگو کیا کرتی تھی کیوں بیل؟

بیل۔ جی ہاں میڈم۔

مسز ہین۔ (مسٹر ہین سے آہستہ) یہ کیا بات ہے کہ وہ اپنے روپے کا ذکر نہیں کرتی؟

مسٹر ہین (آہستہ) ذرا ٹھہرو۔

مسٹر ڈالم۔ کیا آپ کا بحری سفر نہایت عمدہ کٹا؟

خالہ۔ نہایت بُری طرح۔

مسز پالم۔ خالہ صاحبہ نے ہم کو خط نہیں لکھا تھا کہ رت بہت اچھی تھی لیکن آپ سخت بحری امراض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

مسٹر لاؤڈ۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت سخت مرض ہوتا ہے۔

مسٹر پالم۔ بہت سخت۔ لیکن خوش قسمتی سے خطرناک نہیں ہوتا۔

گوشے سے ایک آواز "ڈاکٹر ہے بدمعاش" (سب مہمان قہقہہ لگاتے ہیں)

مسٹر پالم (آہستہ) ملعون طوطے ٹھہر جا۔ میں بہت جلد بتا دوں گا میں ایسا ہی ہوں۔

خالہ۔ بیل طوطے کو کمرے سے باہر لے جاؤ۔

بیل۔ بہت اچھا میڈم۔ (پنجرے کو کمرے سے باہر لے جاتا ہے اور واپس آکر اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

مسٹر پالم۔ خالہ جان وہ ہم کو بالکل دق نہیں کرتا۔

خالہ - لیکن وہ مجھے بہت دق کرتا ہے وہ اب بہت شور کرنے لگا ہے اور مجھے پسند نہیں۔
مسٹر ہین (خالہ سے) یہ تو فرمایئے - کیا امریکہ میں کا میڈیاں بھی ہوتی ہیں ؟
خالہ - جی ہاں -
مسز ہین (خالہ سے) کیا شیدی بھی اُس میں پارٹ لیتے ہیں ؟
خالہ (حیران ہوکر) جی ہاں -
مسٹر ہین - کیا امریکہ میں سب شیدی سیہ فام ہوتے ہیں ؟ ہمارے مُلک میں سیہ فام آدمی ہیں لیکن وہ شیدی نہیں ہیں -
خالہ (کوئی جواب نہیں دیتی)
مسز ہین - ہمارے مُلک میں ایسے سیہ فام لوگ بھی ہیں جو کپتان ہیں - کیوں مسٹر لاؤڈ ہیں ؟
مسٹر لاؤڈ - بے شک - (خالہ سے) کیا آپ کے شوہر کو وفات پائے بہت مدت ہوئی ؟
خالہ - جی نہیں - میرے شوہر کو انتقال کیے ہوئے صرف چند مہینے ہوئے ہیں -
مسٹر ہین - میں نے سُنا ہے کہ امریکہ میں بیوائیں بہت جلد عقد ثانی کر لیتی ہیں ؟ (خالہ کوئی جواب نہیں دیتی اور مسٹر پالم مسٹر ہین کو غصہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے)
مسز ہین - یہ بیواؤں کی دولتمندی پر موقوف ہوگا - جیسے ہمارے مُلک میں -
مسٹر لاؤڈ - میں ابھی تک کنوارا ہوں اگرچہ بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میرے سینے میں جوان دل ہے - اگر کوئی اچھی بیوہ مجھے قبول کرے تو میں ......
مسٹر ہین - تو تم اُسے بیوی بنا لو ؟
لاؤڈ - نہایت خوشی سے ! لیکن صرف اس شرط سے کہ اُس بیوہ کے پاس ایک لاکھ ڈالر ہوں -
مسز ہین (خالہ کی طرف اشارہ کرکے) میں سمجھتی ہوں کہ خالہ کے پاس ہیں - تمہارا اور آپکا اچھا جوڑا ہے - (بہت زور سے گھنٹی بجتی ہے)
خالہ - (گھبرا کر مہمانوں کی طرف دیکھتی ہے اور کوئی جواب نہیں دیتی - پھر بل سے مخاطب ہو کر

کہتی ہے) بیل یہ گھر تو پاگل خانہ معلوم ہوتا ہے۔

بیل۔ جی ہاں میڈم۔

میری (دروازے سے باہر) ڈاکٹر صاحب پھر ایک بوڑھی خاتون شیدی کے ساتھ آئی ہیں وہ ڈیوڑھی میں کھڑی ہیں۔ کہتی ہیں کہ میں ڈاکٹر کی خالہ ہوں امریکہ سے آئی ہوں۔

مسٹر ذین۔ غضب ہو گیا۔ وہ اصلی خالہ آ گئیں۔

(سب گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پہلی خالہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے بیل غصہ سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اتنے میں دوسری خالہ عجب مضحکہ انگیز لباس پہنے اندر آتی ہے اس کے پیچھے ایک شیدی پنج رنگی وردی پہنے ہوئے اور پرانے زمانے کی چھوٹی چھوٹی چھتریاں اور ایک چمڑے کا بکس لیے آتا ہے۔ اندر آ کر چاروں طرف گھبرائی ہوئی نگاہ ڈالتا ہے)

(نواں سین)

(سابقہ سین کے لوگ۔ مسٹر اور مسز اسمتھ)

دوسری خالہ (شور کرتی ہوئی اندر آ کر) میرا پیارا بھانجا کہاں ہے؟ وہ مجھ سے بغل گیر ہونے کیوں نہیں آیا۔ ہاں میں سمجھ گئی میرا سب روپیہ چوری چلا گیا ہے۔

(یکایک اُس کی نظر پہلے شیدی اور اُس کی مالکہ پر پڑتی ہے۔ زور سے ایک چیخ مارتی ہے اور دوسرے شیدی کی گود میں گر پڑتی ہے۔ مہمانوں میں غل مچتا ہے اور سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

مسز پالم۔ یہ کیا ہے؟ کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا سب پاگل ہو گئے..... فرنس میری خالہ کو سنبھالو۔ اُن کو غش آ گیا۔ (مسٹر پالم پہلی خالہ کے پاس جاتا ہے اُس کو کچھ ہوش آتا جاتا ہے اسی طرح دوسری خالہ بھی ہوشیار ہو جاتی ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی ہے۔ جان ایک ایک کر کے چپکے سے کمرے کے باہر کھسک جاتے ہیں)

(دسواں سین)

(مسٹر اور مسز پالم۔ مسز فینلی۔ بیل۔ مسٹر اور مسز اسمتھ)

مسز پالم (دوسری خالہ سے) یہ کیا ہے، تم کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟

دوسری خالہ۔ (روکر) میں ہوں مسز اسمتھ۔

مسز پالم۔ اور یہ شیدی ؟

مسٹر اسمتھ۔ (دوسرا شیدی) مسز پالم معاف کرو میں ہوں اسمتھ۔

مسٹر پالم۔ تمہارا کیا مطلب ہے ؟

مسز اسمتھ۔ ہم صرف مذاق کرنا چاہتے تھے ہائے ..... ہم ایک مختصر سی کامیڈی کھیلنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بالکل خیال نہیں تھا کہ تمہاری خالہ آگئی ہیں۔ ہم صرف تم کو تھوڑا سا پریشان کرنا چاہتے تھے (اصلی خالہ سے) محترم خاتون! ہم کو آپ کی اہانت مدنظر نہیں تھی .... ہائے میں ندامت سے مرجاؤنگی! ...... ہم پر رحم کیجیے۔ معاف فرمائیے معاف فرمائیے معاف فرمائیے۔ (روتی ہے)

خالہ۔ (مہربانی سے) میں سب سمجھ گئی۔ میں سب کو دل سے معاف کرتی ہوں۔ یہی اپنے دوستوں سے بھی کہہ دیجیے۔ کیونکہ مجھے بہت افسوس ہوگا۔ اگر میری وجہ سے میرے بھانجے اور بھانجی کے دوستوں میں بدمزگی پیدا ہو۔ اب آپ اطمینان سے گھر تشریف لے جائیے۔ (مسٹر اور مسز اسمتھ شرمندہ ہو کر چلے جاتے ہیں)

(آخری سین)

(مسٹر اور مسز پالم، مسز لینول، بیل)

مسز پالم۔ خالہ جان آپ ہماری نسبت کیا خیال کرتی ہوں گی ؟ میں اب ......

مسٹر پالم۔ خالہ جان سنیے۔ اِن سب کو جنھوں نے آپ کی اہانت کی ہے میں منع کیے دیتا ہوں کہ کبھی میرے گھر پر قدم نہ رکھیں۔ میں ان کو اب اپنا دوست نہیں سمجھوں گا۔ کیونکہ میں ایسے بیہودہ مذاق کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ میں ابھی سب کو لکھتا ہوں۔

خالہ۔ (مسکرا کر) تم یہ لکھو کہ میں نے سب کو معاف کیا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ اتنے عرصے کی دوستی میں میری وجہ سے فرق آئے۔

مسز پالم۔ خالہ جان تو کیا آپ ہمارے یہاں نہیں رہیں گی ؟

خالہ۔ مجھے یہاں بہت راحت ملے گی کیونکہ یہ گھر مجھکو بہت پسند ہے۔ کیوں بیل

تمھارا بھی یہی خیال ہے:؟

بیل۔جی ہاں میڈم۔

مسز پالم۔(خالہ کو چوم کر) خالہ جان میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ بہت اچھی خاتون ہیں۔

مسٹر پالم۔ خالہ جان آپ آدمی نہیں فرشتہ ہیں۔

ڈیوڑھی سے ایک آواز "اور ڈاکٹر ہے بدمعاش"

محمد مہدی

غزلیات

نہ ہوگا وہ تغافل کیش رسوا بے وفائی کا
عجب پردہ ہے پردہ شیوۂ دیر آشنائی کا

میں ڈرتا ہوں تصور لے دل نہ اپنا ہی نکل آئے
گلہ کرنے کو تو کرتا ہوں اُس کی بے وفائی کا

دلِ آتش نفس تو آپ اپنے کو جلائے گا
نتیجہ اور کیا ہوگا تری آتش نوائی کا

کہیں ظالم اُبھر آئیں نہ میرے داغِ پنہاں بھی
کہ بے حد تجھ کو چسکا پڑ گیا ہے خودنمائی کا

ترے عشاق میں اک بانکپن کی شان پیدا ہے
اُنھوں نے بھی اُڑایا رنگ تیری خودنمائی کا

دلِ آفت طلب تو آپ اُس پر ٹوٹ کر آیا
اُدھر سے تو نہ تھا کچھ بھی اشارہ دلربائی کا

گر ہے نسبت! ہم کہ شہرا ہے زمانے میں
تری رنگیں ادائی کا مری رنگیں نوائی کا

خط اُس کو کیا لکھوں وحشتؔ نہ لکھ دوں مصرعِ غالبؔ؟
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

رضا علی وحشت

تنگ اُنھیں مجھ پہ کار دانی کا
کچھ ٹھکانا ہے بدگمانی کا

اک مرقع ہے حُسن شوخ ترا
کشمکش ہائے نوجوانی کا

تم جو کرتے تو ہم کو تھا کافی
اک اشارہ بھی مہربانی کا

مَیں وہ محرومِ عشق ہوں جو رہے
منتظر مرگِ ناگہانی کا

بے نیازی سے تیری مل نہ سکا
کچھ صلہ میری جاں فشانی کا

کھل گیا ہے ترے جمال سے رنگ — تیرے ملبوسِ ارغوانی کا
مرسے مٹ تجھ پہ ہو گیا حاصل — مدعا اپنی زندگانی کا
جو بظاہر سہی کہ ہوں میں ہلاک — شیوۂ پرسشِ نہانی کا
رنجِ شوق اک نمونہ ہے لاریب — راحتِ خلدِ جاودانی کا
ہو کے ناکام عشق نے لوٹا — بارہا عیش کامرانی کا
ہم جو بے خود رہے تو وہ محجوب — نہ اُٹھا لطف میہمانی کا
ناوکِ یار سے ہے دل میں بپا — ایک ہنگامہ شادمانی کا
لُٹ کے ہم کو ہے اب خطر نہ خیال — رہزنی کا نہ پاسبانی کا
شوق کامل جو ہو تو دے نہ جواب — اُن کے دعوائے لن ترانی کا
ایک حائل ہے وصل میں بھی پہاڑ — پردۂ شرمِ درمیانی کا
نہ سنو تم کہ میں نشانہ رہا — کن بلا ہائے آسمانی کا
کون لے عرضِ حال کرکے عذاب — جان پہ اُن کی سرگرانی کا

سچ تو یہ ہے کہ شعرِ حسرت بھی
ایک گنجینہ ہے معانی کا

فضل الحسن حسرت

بے بلائے روز ہم جاتے رہے — روز وہ محفل سے اُٹھواتے رہے
ہجر میں جھونکے ہوائے وصل کے — آہ کے شعلوں کو بھڑکاتے رہے
عشق میں ہم نے نہ مانی ایک کی — جن کو سمجھانا تھا سمجھاتے رہے
جب سے وہ متوالی آنکھیں پھر گئیں — اپنی مستی کے مزے جاتے رہے
ہستیِ اہلِ جہاں کچھ بھی نہیں — نقش بنتے اور مٹ جاتے رہے
ہم دعا دیتے رہے سہہ کر ستم — تم برا کہہ کر ستم ڈھاتے رہے
داغِ دل گھٹتے رہے جب رو دئے ہم — سینچنے سے پھول مرجھاتے رہے
ایک ہم پہنچے نہ بزمِ یار تک — سیکڑوں آتے رہے جاتے رہے

کم نہیں ہم طور والوں سے جگر
وہ ہمیں دیدار دکھلاتے رہے

حکیم جگر۔صدیقی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

بسلسلۂ ماہ اپریل ۱۹۱۶ء

(۳)

کانفرنس کے نظام عمل میں دو چیزیں سب سے مقدم رکھی گئی ہیں۔ ایک تو وہی مشغلۂ رزولیوشن سازی ہے جو بتقلید مجالس ہائے یورپ ہمارے ملک کی سب کانفرنسوں کا شیوۂ عام ہوگیا ہے۔ یورپ کی تمدنی حالت اس قدر منضبط، وہاں کی پبلک بلحاظ تعلیم و احساس عامہ کے اس درجہ بیدار اور اُنکی قوتِ عمل اس حد تک نشو و نما پا چکی ہے کہ رزولیوشنوں کے پاس ہونے اور عملی طور پر اُن کے روبراہ آنے میں چند ہی قدم کا فاصلہ ہوتا ہے جو بسرعت تمام طے کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اُس کے بالکل برعکس ہمارے ابنائے وطن کے ضوابط زندگی بالکل پراگندہ۔ اون کے حسیات ہمہ تن پژمردہ اور اون کا دامن عمل یک قلم تہی نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک سال اگر کوئی رزولیوشن پاس کیا جاتا ہے تو عموماً اُس پر عمل درآمد ہونے کے لیے سالہا سال کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس سُست رفتاری کی شکایت فضول ہے اس لیے کہ جب تک ہمارے پاؤں گذشتہ غلط کاریوں کے اثر سے پُر آبلہ، ہمارا جسم امراضِ موروثی کے بدولت ناتواں و ضعیف اور ہمارے دل و دماغ غفلت و عیش پرستی کے زہر سے مضمحل و ماؤف رہیں گے کوئی مفید اور نتیجہ بخش تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ تاہم ارباب بصیرت کے لیے یہ امر ناممکن العمل نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حتی الامکان باتیں کم کریں اور کام زیادہ۔ البتہ ہمیں یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ اس کانفرنس کے منتظمین نے ملک کی عام روش کی تابعیت کے ساتھ ساتھ دوسرا مقصد جو پیشِ نظر رکھا وہ بالکل عملی ہے اور بتوفیق خدائے ذوالجلال یہ عملی کام قیام کانفرنس کے سالِ اول ہی میں شروع بھی کر دیا گیا ہے یعنی نادار اور مستحق طلبا کی امداد کے لیے تعلیمی وظائف کا ایک فنڈ کھول دیا گیا ہے اور جس قدر اس شعبہ میں آمدنی ہوتی ہے وہ اسی مقصد نیک پر صرف کر دی جاتی ہے۔ اب یہ اہلِ مُلک کا کام ہے کہ پوری فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ اس بہترین کارِ خیر میں اعانت فرمائیں اور اس نہایت ضروری چندہ میں شرکت کرنے کی غرض سے نہایت بذل و ایثار کریں۔

تاکہ ملک کے وہ کثیر التعداد نوجوان جو ذوقِ تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے باوجود محض افلاس وغربت کی بدولت علم کی بیش بہا نعمت سے محروم رہتے ہیں اُن کے طفیل میں اس دولتِ لازوال سے متمتع ہوسکیں۔

اس موقع پر ہم یہ مشورہ دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری بعض دوسری مجالس کی طرح حیدرآباد کانفرنس کے اجلاسوں کا انعقاد بڑے اور دولتمند شہروں تک محدود نہ رہنا چاہیے کیونکہ تجربہ بتا رہا ہے کہ شہری عامۃ الناس کے ذوقِ تماشہ بینی اور شوقِ ہنگامہ پسندی کے بدولت اس قسم کے جلسوں کا اصلی فائدہ بہت کچھ زائل ہوجاتا ہے۔ اور پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اشاعتِ تعلیم کی ضرورت بڑے شہروں کے مقابل چھوٹے قصبات اور موضعوں میں زیادہ ہے۔

(۴)

کانفرنس کے پہلے سال کی کارروائی کا مختصر مگر جامع بیان ایک آٹھ صفحے کی رپورٹ میں درج کرکے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ رپورٹ چھاپ کر حاضرین کو تقسیم بھی کردی گئی تھی اور نہایت غور اور دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں ضابطۂ کانفرنس کی ترتیب۔ مجالس اضلاع کے قیام۔ تقسیمِ وظائف۔ سالانہ جمع خرچ اور بعض رزولیوشنوں کے متعلق محکمۂ سرکار سے جو جوابات وصول ہوے ہیں، غایت درجہ خوش اسلوبی کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ اگر اس میں کوئی کمی نظر آتی ہے تو صرف اس قدر کہ جن لوگوں کو وظائف دیے گئے ہیں اُن کے نام نہیں شایع کیے گئے اور نہ حساب کا تختہ منسلک کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں اگرچہ یہ بھی لکھا ہے کہ "چونکہ کانفرنس کا سال یکم خورداد سے شروع ہوگا لہذا ابھی پورے سال کا حساب مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس وقت تک کا حساب مجملاً ضمیمہ میں درج ہے۔" مگر یہ ضمیمہ یا تو رپورٹ کے ساتھ شایع نہ ہوسکا، یا جو رپورٹ ہمیں ملی اُس میں سہواً منسلک نہیں کیا گیا۔ آیندہ سالانہ رپورٹ میں ہمیں امید ہے کہ اس نقص کو رفع کردیا جائے گا جو ملک میں کانفرنس کا اعتماد بڑھانے اور اپنائے وطن کو اعانتِ مزید کی تحریص و ترغیب لانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

ضابطۂ کانفرنس کانفرنس کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اگرچہ ضابطہ مرتبہ ہر طرح پر مناسب و مکمل ہے۔ لیکن اس کی دفعہ ۲ کسی قدر توضیح چاہتی ہے۔ یہ کہ

ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ جو خواہانِ ترقیِ تعلیم مملکتِ آصفیہ ہوں اس کے (کانفرنس کے) رُکن ہو سکیں گے" ہر چند کہ اصولی حیثیت سے نہایت پسندیدہ قانون ہے مگر پہلے ہی سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ اس پر پورا پورا عمل درآمد ممکن نہیں ہے۔ ہمیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ قضاۃ ایلچ پور (برار) کے خاندان کے ایک پُر جوش اور معزز رکن نے اُن قدیم تعلقات کی بنا پر جو صوبۂ برار کو آستانہ نظام الملک کے ساتھ عرصۂ دراز تک رہے ہیں اور نیز اُس مخصوص الطاف و کرم کی وجہ سے جو دربار آصفی اس خاندان کے ساتھ ملحوظ رکھتا ہے کانفرنس کی رکنیت کا چندہ اور کچھ رقم بطور عطیہ بھیجی تھی جو منتظمین کانفرنس نے قبول نہیں کی۔ پھر جیسا کہ گذشتہ نمبر میں دلی افسوس کے ساتھ ظاہر کیا گیا تھا ایک حیدرآبادی تاجر کو جو کانفرنس کے رکن بھی ہیں محض اس سبب سے اجازتِ تقریر نہیں دی گئی کہ سرکاری طور پر وہ 'ملکی' تسلیم نہیں کیے گئے تھے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ 'ملکی' قرار نہ پائیں خواہ وہ ترقیِ تعلیم مملکتِ آصفیہ کے کتنے ہی خواہاں ہوں اس کانفرنس کے رکن نہیں قرار پا سکتے۔ پس ایسی صورت میں دفعہ ۳ میں تھوڑی سی تصریح یا ایک استثنائی جملہ کا اضافہ ازبسکہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ آیندہ اور بہی خواہانِ تعلیم کو بھی کانفرنس سے شکایت پیدا ہوگی، جو کسی طرح مفید و مناسب نہیں کہا جا سکتا۔

مجالس اضلاع مسرت کا مقام ہے کہ اورنگ آباد۔ محبوب نگر۔ نظام آباد۔ ناندیڑ۔ اور ورنگل میں پہلے ہی سال مجلسیں قائم ہو گئی ہیں۔ اور یہ امید رکھنا چاہیے کہ اس سال کل اندر بقیہ اضلاع میں بھی مجلسیں قائم ہو جائینگی۔ اضلاع کے علاوہ ایسی بستیوں میں بھی اس قسم کی مجالس کا قیام ضروری ہے جو اگرچہ انتظامی ضروریات کے لحاظ سے کسی ضلع سے وابستہ ہیں مگر فی الحقیقت کثرتِ آبادی۔ فروغ تجارت اور ازدیادِ تمدن کی بنا پر بجائے خود ایک ضلع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسے جالنہ۔ ہنگولی وغیرہ۔

وظائف کی تقسیم کے بارے میں کوئی صحیح رائے اُس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ کن کن اشخاص کو کس کس غرض سے وظیفہ دیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجمالی بیان بھی کچھ کم امید پرور نہیں کہ بی۔ ایس۔ سی کے لیے ایک وظیفہ ۵۰ کا۔ بی اے کے لیے چار وظیفے ۳۰ کے۔

ایف ملے کے لیے گیارہ وظیفے عہ کے اور اسکول فائنل کے لیے ۸ آٹھ وظیفے ستے کے اور زنانہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک وظیفہ مہ کا دیا گیا ہے۔ زنانہ اعلیٰ تعلیم سے کیا مراد لی گئی ہے، اس کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ اسی کے ضمن میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اس کانفرنس کے پیش نظر کسی علٰحدہ مدرسہ کا قیام نہیں ہے۔ یہ اچھا خیال ہے۔ اس لیے کہ جہاں نمونے کے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں کے حالات قلمروِ آصفیہ سے بالکل مختلف تھے اور تجربہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ ان مقامات پر اہل ملک کو بے دریغ روپیہ صرف کرنا پڑا ہے۔ اور سوائے معدودے چند استثنائی حالتوں کے عموماً نتائج کچھ ہمت افزا نہیں ہیں۔ لیکن اگر کانفرنس اپنا یہ نصب العین قرار دے کہ ریاست حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی جو تحریک و تجویز ہے اُس کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کی انتہائی کوشش کی جائے گی تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ حقیقت میں ایک ایسے حصۂ ملک میں جس کی آبادی تقریباً ایک کرور اور سالانہ آمدنی چھ کرور روپے کے قریب ہو کسی یونیورسٹی کا قائم نہ ہونا حد درجہ افسوسناک ہے اور اس بات کی دلیلِ بیّن ہے کہ وہاں کے لوگوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا رجحان مفقود یا نہایت ضعیف ہے۔

جمع خرچ

کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ "پہلے سال کا حساب حسب رائے آڈیٹر صاحبان خورداد پر ختم کیا گیا اور اس پہلے سال کا حساب بعد تنقیح آڈیٹر صاحبان منظوری صدر مجلس پہلی روئداد کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔" اس روئداد کے صفحات ۲۵۶-۲۵۷ پر جو گوشوارۂ آمد و صرف درج ہے اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر اردی بہشت ۱۳۲۲ف تک ا[illegible] سکہ عثمانیہ اور لعہ سکۂ انگریزی وصول ہوئے اور سامعہ سکۂ عثمانیہ صرف ہونے کے بعد [illegible] سکۂ عثمانیہ اور لعہ سکۂ انگریزی باقی رہے۔ آمدنی میں بڑی رقم اُن ۱۶۴ ارکین کے چندۂ سالانہ کی ہے جن کی فہرست اُسی روئداد میں درج ہے۔ اور مصارف میں بڑی رقمیں صرف طبع و روانگی کاغذات اور جلسۂ سالانہ کے اخراجات کی ہیں۔

رپورٹ کے آخر میں اُن رزولیوشنوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اجلاس اول منعقدۂ بلدۂ حیدرآباد میں منظور ہوئے تھے۔ منجملہ ۱۰ رزولیوشنوں کے آٹھ رزولیوشن ایسے تھے جن میں مختلف تعلیمی امور کی طرف سرکارِ عالی کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔ ان میں سے ۶ رزولیوشنوں کے بارے میں سرکار کی

---

* تعجب ہے کہ روئداد کے صفحہ ۲۵۵ پر چندۂ وظائف کے تحت میں جو رقوم درج ہیں اور جو آخر اردی بہشت ۱۳۲۲ف تک وصول ہو چکی تھیں وہ اس گوشوارہ کی آمدنی میں کیوں درج نہیں کی گئیں۔

جوابات رپورٹ کی تیاری تک وصول ہو چکے تھے وہ درج کر دیے گئے ہیں۔ بقیہ ریزولیوشنوں کا کچھ جواب نہیں ملا۔ ان رزولیوشنوں اور سرکاری جوابات کے متعلق کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے جسے ہم عدم گنجایش کی وجہ سے آیندہ نمبر کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔

اڈیٹر

نظرے خوش گزرے

مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کا اجلاس حسب قرارداد ۱۰ اپریل کو یہاں منعقد ہوا۔ اجلاس کے لیے جو زمانہ معین کر دیا گیا تھا وہ اس قدر بے موقع تھا کہ نہ صرف باہر کے زیادہ اصحاب نہیں شریک ہو سکے بلکہ اکثر مقامی تعلیم یافتہ حضرات بھی کسی تعطیل کے نہ ہونے کی وجہ سے شرکت سے محروم رہے۔ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ اور سکرٹری صاحب جن کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یونیورسٹی لینے کی منظوری حاصل کر لی جائے اسے پسندیدہ اور مفید مطلب پالیسی سمجھتے ہوں کہ اپنے اختیارات سے فائدہ اُٹھا کر قوم کے گروہ کثیر کو جسے ایک حد تک مُسلم یونیورسٹی کے مسئلہ سے دلچسپی ہے فاونڈیشن کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہونے کا موقع نہ دیں لیکن اُس درماندہ قوم کے لیے جس کا احساس ضعیف ہو اور جو اس قدر ایثار گوارا نہ کر سکتی ہو جس قدر ہماری ضروریات و حالات کے لحاظ سے درکار ہے۔ ان بزرگوں کا یہ طرز عمل ذرا بھی فیاضانہ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال جلسہ منعقد ہوا اور جیسی کہ توقع تھی ہندو یونیورسٹی ایکٹ کے اصولوں کو تسلیم کرکے اور بعض لوگوں کی سخت کوششوں کے بعد چند بودی شرطیں لگا کر یونیورسٹی قبول کرنے کی منظوری حاصل کر لی گئی۔

جلسہ سے ایک دن قبل جو اصحاب جمع ہو گئے تھے انھوں نے سارا وقت اس کوشش میں لگا دیا کہ دونوں جماعتوں (ایک وہ جو بے چون و چرا یونیورسٹی کا چارٹر لینا چاہتی ہے اور دوسری وہ جو دل سے اگرچہ ہندو یونیورسٹی ایکٹ کے اصولوں کو ناپسند کرتی ہے مگر زبان سے صاف طور پر انکار کرنا نہیں چاہتی اور بعض شرائط کی آڑ پکڑ کر اپنا اختلاف ظاہر کرتا اور کثیر التعداد افراد قوم کے دلوں پر

اپنی حریت و آزادی کا سکہ جمانا چاہتی ہے) کے درمیان مصالحت ہو جائے۔ یہ کوشش تو محض اس وجہ سے رائگاں گئی کہ بے چون وچرا یونیورسٹی لینے والوں کے اثر واقتدار یا خفیہ مواعید کو اس بات سے گزند پہونچنے کا اندیشہ تھا کہ مدعیانِ حریت کی کسی کمزور سی کمزور شرط کو قبول کیا جائے لیکن وہ دوسری تدبیر کارگر ہو گئی جس نے مختلف صورتوں اور مختلف وقتوں میں ٹرکی اور ایران اور دوسری اسلامی حکومتوں کو شدید ترین نقصانات پہونچائے ہیں اور جو ہندوستان میں بھی چلتے جادو کا اثر رکھتی ہے۔ یعنی ایک طرف مدعیانِ حریت کے ایک مخصوص جلسہ میں جب بعض اصحاب نے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیا اور متحدہ طور پر ایسی روش اختیار کرنے پر تیار ہو گئے جو گروہ والا کر کی خواہشات اور پالیسی کے موافق نہ تھی تو ڈنر کی میز پر چھری کانٹوں کی صداہاے ترنم اور لذیذ اغذیہ کی عطر بیزیوں نے اس مسئلہ کو ایک دوسری صورت میں حل کر دیا۔ چنانچہ دوسرے دن جب جلسہ ہوا تو بجاے اس کے کہ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کی ایک جماعت نے گزشتہ اکتوبر میں جو رزولیوشن فاونڈیشن کمیٹی کے آخری فیصلہ کے لیے پاس کیا تھا اُسے سب سے پہلے پیش کیا جاتا اور اُس پر حاضرین کو بحث کر کے کسی نتیجہ پر پہونچنے کا موقع دیا جاتا، مدعیانِ حریت کی جماعت کے دو ممتاز افراد کی آڑ میں ہندو یونیورسٹی ایکٹ کے مطابق مسلم یونیورسٹی کا چارٹر قبول کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اس ترکیب سے یونیورسٹی لینے یا نہ لینے کی بحث کا تو خاتمہ ہو ہی گیا۔ کیونکہ مدعیان حریت کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے میں کامیابی ہو چکی تھی۔ بقیۃ السیف کے لیے صرف یہ صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ اس تجویز میں خفیف سی ترمیم کیے جانے پر سارا زور صرف کر دیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مسٹر عبد المجید خواجہ نے ترمیم پیش کی اور تمام دن اُس پر بحث ہونے کے بعد جب یہ دیکھا گیا کہ فریقین میں سے کوئی اپنے دعاوی سے دست بردار ہوتا نظر نہیں آتا اور برابر کی بازی اُلٹنے والی ہے تو اُس وقت اُسی ترمیم کی کسی قدر صورت بدل کر ایک دوسری ترمیم پیش کی گئی جو بالآخر حاضرین کی تعداد کثیر کی ہم آہنگی کی وجہ سے منظور ہوئی۔ اس ترمیم نے اگرچہ مدعیان حریت کا مدعا ایک حد تک پورا کر دیا لیکن حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق جو خواب چالیس سال

ہوئے کہ دیکھا گیا تھا وہ غلط ثابت ہوا اور جو نصب العین قوم کے سامنے بزم تعلیمی کے سالانہ اجلاسوں اور یونیورسٹی کے لیے فراہمی چندہ کے جلسوں میں بڑی بلند آہنگی سے پیش کیا جاتا تھا اُس سے ہمیشہ کے لیے قوم کو سبکدوش کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جلسہ کی بدنظمی اور حاضرین کی تعداد کثیر کی ہنگامہ پسندی پر بعض حلقوں میں سخت اعتراضات کیے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ معترضین یا تو قومی حالات سے واقفیت نہیں رکھتے یا جان بوجھ کر انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی بدنصیب ہے جس کے بڑوں اور چھوٹوں سب نے اپنے اخلاق کو برباد کر دیا اور اپنی دینی روایات اور مذہبی خصوصیات کو بھلا دیا ہے فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ ایک کی غلط کاریاں تہذیب کا بھیس بدل کر نمودار ہوتی ہیں اور ظاہر بین اصحاب کو خوش اسلوبی کے دام فریب میں پھنسا کر تحسین و آفرین کے خلعت حاصل کرتی ہیں، اور دوسروں کی بداخلاقیاں اس وجہ سے منظر عام پر نمایاں ہو جاتی ہیں کہ وہ ابھی تک مصنوعی زندگی کے راستوں سے ایک حد تک نابلد اور اُس کوچہ سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں جو برادران یوسف کا رمنہ ہے۔

مشرقی تمدن کے دَور میں ہمارے اخلاق جس قدر پست ہو گئے تھے آج تہذیب جدید کے عروج و کمال کے عہد میں بھی افسوس ہے کہ ہماری حالت کچھ بہتر نہیں ہے۔ البتہ حالات میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے صورتِ واقعات کسی قدر متغیر ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجتماع لکھنؤ میں منعقد ہوا ہے تو ختم اجلاس کے بعد آنریبل راجہ صاحب جہانگیر آباد کے دولتکدہ پر ایک جلسہ میں اودھ پراونشل کانفرنس کے قیام کی تجویز قرار پائی تھی اور ہمارے کرم فرما آنریبل مرزا سمیع اللہ بیگ بی اے ایل ایل بی وکیل لکھنؤ اس کانفرنس کے عارضی سکرٹری بنائے گئے تھے۔ مرزا صاحب موصوف نے جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے

اسی ضرورت سے اکثر اصحاب لکھنؤ سے چندہ بھی وصول کیا تھا۔ لیکن نہ تو کانفرنس ہی قائم ہوئی اور نہ اُس کے قیام کی کوئی کوشش اب بظاہر ہورہی ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد کے قائم کردہ مدرسۂ اسلامیہ کا انتظام جس جماعت کے ہاتھ میں ہے اُس سے ہمارے آنریبل دوست کا بھی کچھ تعلق سُنا جاتا ہے۔ لیکن لکھنؤ میں اسلامیہ اسکول کے قائم ہوجانے سے صوبۂ اودھ تعلیمی کانفرنس سے مستغنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ پس کیا یہ مناسب موزوں نہ ہوگا اگر ہم مرزا صاحب کو اور نیز دیگر تعلیم یافتہ اربابِ اودھ کو یہ یاد دلائیں کہ جس تحریک کو آپ لوگوں نے آج سے تین سال پیشتر اُٹھایا تھا اُس کی اہلِ ملک کے لیے اب بھی بدستور ضرورت باقی ہے۔ معزز معاصر قیصرِ ہند، جو اس صوبہ کا واحد اسلامی اخبار کہا جا سکتا ہے اُسے اس بارے میں خاص توجہ کرنا چاہیے تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کی زبان پر بھی مُہر سکوت لگی ہوئی ہے۔

اسی سلسلے میں صوبۂ متحدہ کی پراونشیل کانفرنس کی یاد آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں کس جوش وخروش کے ساتھ مجلس مذکور کا پہلا جلسہ اٹاوہ میں ہوا تھا اور اُس جلسے کی رپورٹ جب مرکزی کانفرنس کے اجلاس منعقدۂ راولپنڈی میں سنائی جارہی تھی تو کس زور و شور کے ساتھ بارات کے دولھا یعنی پراونشیل کانفرنس کے سکرٹری خانصاحب مولوی بشیر الدین صاحب کے اس عظیم الشان قومی کارنامہ پر نعرہ ہائے تحسین وآفریں بلند کیے گئے تھے۔ اور ہمیں یہ توقع ہوچلی تھی کہ ہمارے محترم لیڈر کی عملی سرگرمیاں تھوڑے ہی عرصہ میں صوبۂ متحدہ میں ایسی تعلیمی روح پھونک دیں گی کہ کوئی قریہ اور چھوٹے سے چھوٹا پُروا بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہے گا۔ لیکن مقامِ حیرت و افسوس ہے کہ پہلے سال جس قدر جوش و مستعدی کا مظاہرہ کیا گیا تھا دوسرا سال اُس کے بالکل برعکس کلیۃً سکون وجمود کی حالت میں گزار دیا گیا اور عملی کارروائی تو درکنار رہی سالانہ اجتماع بھی ملتوی رہا۔ اور جن لوگوں نے پہلے سال رکنیت کے چندے ادا کیے تھے وہ اس وقت تک کانفرنس کی مطبوعہ رپورٹ کے لیے چشم براہ بیٹھے ہیں۔ مولانا البشیر صاحب ہمیں معاف کریں اگر ہم اس موقع پر یہ عرض

کرنے کی جرأت کریں کہ اس معاملہ میں اُن کا طرزِ عمل حد درجہ نا امید کُن ثابت ہو رہا ہے ۔

انجمن مفید الاسلام کلکتہ کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۱۵ء وصول ہوئی ہے ۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہُوا کہ انجمن نے سال بھر کے اندر ۲۰۴ لاوارث میتوں کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے ۔ جو بجائے خود ایک نہایت ہی قابلِ ستایش کام ہے ۔ اس کے علاوہ ایک خیراتی مدرسہ بھی انجمن کے زیرِ انتظام ہے جس میں مفت تعلیم دی جاتی ہے ۔ اور دینیات ۔ اُردو اور حساب کی تعلیم کے علاوہ اب ابتدائی درجہ انگریزی کا بھی کھول دیا گیا ہے ۔ اسی سلسلہ میں ایک کتب خانہ اور دارالمطالعہ بھی قائم ہے جس میں مختلف زبانوں کی ۲۰۰ کتابیں موجود ہیں اور تقریباً ۲۴ اخبارات و رسالہ جات آتے ہیں ۔

مُلک میں چند ہی مجالس ایسی ہیں جو اپنے مقاصد و عمل کے لحاظ سے یکساں طور پر سزاوارِ آفریں ہوں اور ان چند میں انجمن مفید الاسلام کو غالباً خاص امتیاز حاصل ہوگا کہ اُس کے منتظمین اپنی کارروائیوں کی ترتیب و اشاعت بھی بڑی خوش اسلوبی سے کر سکتے ہیں ۔ ہم کارکنانِ انجمن مفید الاسلام کلکتہ کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ اُن کی توجہ سے کلکتہ میں ایسا نیک کام ہو رہا ہے اور توقع رکھتے ہیں کہ کلکتہ اور دوسرے مقامات کے ہمدرد مسلمان اس مفید انجمن کی امداد میں دریغ نہ کریں گے ۔

رموزِ فطرت ۔ کائنات اور اُسکی موجودات کی تشریح و تفصیل بیان کرنا علوم سائنس کا مقصدِ اولیں ہے اور ہر سائنس کے طالب علم کو شروع میں انھیں کی ماہیت و حقیقت کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ انگریزی میں ایسی صدہا کتابیں موجود ہیں جن کے مطالعہ سے اس قسم کی ضروری معلومات بہ آسانی فراہم ہو سکتی ہیں مگر ہماری مادری زبان اب تک اس شدید ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے ۔ اب کرکے کچھ لوگوں کو اس کمی کے رفع کرنے پر توجہ ہوئی ہے ۔ چنانچہ رموزِ فطرت اسی قبیل کی ایک عمدہ کتاب ہے جو ہمارے عزیز دوست مسٹر محمد مہدی اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کے ذوقِ علمی اور علیا حضرۃ بیگم صاحبۂ بھوپال کی علمی سرپرستی کا بہترین نتیجہ ہے ۔ یہ کتاب مبتدیوں کیلیے علوم سائنس کا نہایت کارآمد دیباچہ ہے جس میں علم طبیعیات ۔ علم طبقات الارض ۔ جغرافیۂ طبعی اور ثوابت و سیارے کے بنیادی اصول نہایت آسان فہم زبان میں بیان کیے گئے ہیں ۔ کتاب کا حجم ۲۵۰ صفحے اور قیمت ۱۲ ہے ۔ شائقین منیجر الناظر بک ایجنسی سے طلب فرما سکتے ہیں ۔

الناظر

نمبر ۸۴ جلد ۱۴ یکم جون سنہ ۱۹۱۶ء

کان بہنے کی دوا

کان کے اندر سے ریم آتا ہو پرانا یا نیا ہو دو تین مراتب کے استعمال سے بہنا بند ہو جاتا ہے قیمت ۱۲ پچکاری کان صاف کرنے کی ۱۲ خرچ ہر دو چیز ۵

پیپرمنٹ کا تیل

پیپرمنٹ کا تیل درد بدہضمی اور ریاح کے لئے ایک بہت ہی مشہور دوا ہے - یہ پیپرمنٹ امریکہ سے منگایا جاتا ہے ولائتی پیپرمنٹ سے کہیں بڑھ کر بہتر اور مفید ہے اسی پیپرمنٹ میں تارپین کا تیل ملا کر ایک کی تین تین شیشیاں بنا کر لوگ چار چار آنہ اور چھ چھ آنہ پر فروخت کرتے ہیں قیمت آدھ اونس شیشی ۱۰ اور محصول ڈاک وغیرہ ۵

پرانا سوزاک

سوزاک پرانا ہو جاتا ہے تو پیشاب میں جلن نہیں ہوتی لیکن پیشاب میں کبھی کبھی چٹک پیدا ہو جاتی ہے پیشاب رک رک کر ہوتا ہے اور مواد تھوڑا تھوڑا گرتا ہے اسی حالت میں پرانے سوزاک کی دوا استعمال کرنا چاہیئے اگر علاج نہ کیا جائے تو زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ قیمت فی شیشی عہ محصول ڈاک ۵

کلوروڈائن

یہ انگریزوں کی ایک خانگی دوا ہے ریاحی درد مروڑ خواہ کسی صورت سے ہو اسکی ایک ہی دوا کی خوراک سے جاتی ہے اور دست پیچش کے لئے نہایت مفید ہے ڈاکٹر برمن نے انگلینڈ کے ایک دواخانہ سے بنوایا ہے دیگر کلوروڈائن سے کہیں بہتر ہے اس لئے بازاری کلوروڈائن نہ خرید کر کے اس کلوروڈائن کو خریدیں۔ قیمت ۶ر اور ایک درجن کے چار روپئے۔ محصول ڈاک ۵

گرمی و آتشک کی دوا

گرمی (آتشک) بدفعلی سے ہوتی ہے اسکی ابتدائی حالت میں زخم ہوتا ہے اور تھوڑے عرصہ میں دونوں پٹھوں کی گلٹیوں میں ورم ہوتا ہے جس کو لوگ باگی کہتے ہیں کچھ دن میں گرمی پھوٹ نکلتی ہے اور تمام جسم میں چھٹے گھاؤ پھنسیاں گرمٹے وغیرہ ہو جاتے ہیں رفتہ رفتہ گلے میں یا ناک میں زخم یا سر کے بال کا اڑنا اور گانٹھوں میں درد ہوتا ہے آخر میں ہڈی تک اس کا اثر پہونچ جاتا ہے۔ جوانی میں نکلی ہوئی آتشک کا زہر بڑھاپے میں ستاتا ہے اور باپ سے لڑکے اور پوتے تک کو آتشک کے زہر سے مصیبت جھیلنی پڑتی ہے افسوس ہے کہ اس بیماری کا علاج ہونا چاہیئے - نہیں ہوتا - زخم کے ہوتے ہی لوگ شرم سے بیماری کو چھپاتے ہیں پھر دوا بھی کرتے ہیں تو ~~ایسے~~ لوگوں کی ایسی دواؤں میں پارہ ملا رہتا ہے جس کا اثر مرض سے بھی زیادہ برا ہوتا ہے ان سب باتوں کو غور کر کے ڈاکٹر ایس کے برمن نے یہ دوا آتشک کی بنائی ہے جو چیزیں آتشک کے زہر کو بیکام کرتی ہیں۔ معروف و مشہور ہیں انکی خصوصاً آزمائش کر کے یہ دوا بنائی گئی ہے تھوڑے دن کے استعمال سے یہ دوا آتشک اور اس کے نقصوں کو دفع کرتی ہے زخم کے لئے ساتھ ہی مرہم لگانا چاہیئے قیمت فی شیشی عہ زخم کا مرہم پانچ آنہ۔ محصول ڈاک دونوں کا ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۸۴ جلد ۱۴ ــــــــــــــــ یکم جون سنہ ۱۹۱۶ء

زود پشیماں

عام طور پر ساری تعلیم یافتہ جماعت اس بارے میں متفق الرائے ہے کہ ہمارے ہاں جتنے ڈرامے اسٹیج پر نمودار ہوئے یا ہوتے ہیں وہ بلا استثنا سب کے سب نہایت ہی ادنیٰ درجے کے اور مبتذل ہیں۔ ان میں کے اکثر اگرچہ بعض مشہور اور بہترین ڈراموں کی نقل ہیں جن کے پلاٹ پر چنداں اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک طرف تو تھیٹروں کے مالک ڈراموں کی حقیقت و ضرورت سے محض بے خبر ہوتے ہیں اور دوسری طرف تماشہ بیں گروہ کا مذاق بالکل بگڑا ہوا ہو۔ جس کی وجہ سے ان ڈراموں کی مسخ شدہ حالت میں اور اندر سبھا کے ناچ اور کشمیری طائفوں کی نقلوں میں فی الاصل کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا۔ اور تھیٹروں کو جو تھوڑا بہت امتیاز حاصل بھی ہے وہ محض اس سبب سے کہ ان کے مالک سرمایہ دار ہوتے اور تماشوں کا انتظام بڑے پیمانے پر کر سکتے ہیں۔ ورنہ اُن کی کامیابی اور مقبولیت کا تمام تر دار و مدار خوش گلو اور صورت دار ایکٹروں پر ہے جنھیں وہ روپے کے زور سے فراہم کرتے اور زرق برق لباس سے آراستہ کر کے اسٹیج پر لاتے اور پبلک کے دربار سے قبول عام کی سند اور کثیر التعداد روپیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اصلاح کا خیال اب عام ہوتا جاتا ہے اور ہر شخص جس نے تھوڑی بہت انگریزی پڑھی ہے یا جسے انگریزی خواں اصحاب کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے وہ کوئی نہ کوئی اصلاحی تجویز ضرور پیش کرتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو یقیناً مبالغے سے خالی ہوگا کہ اس زمانے کا سب سے ہر دل عزیز فیشن دعوتِ اصلاح ہے۔ چنانچہ سالہا سال سے اکثر اصحاب کی زبانی ہم ڈراموں کی بُرائیاں اور اُن میں اصلاح کیے جانے کی شدید ضرورت سنتے رہے ہیں۔ لیکن ضرورت یہ بھی تھی کہ مدعیانِ اصلاح میدانِ عمل میں کوئی قدم بڑھائیں اور اہل ملک کے سامنے کوئی اچھا نمونہ پیش کریں جسے دیکھ کر وہ موجودہ تماشوں کی خرابیاں محسوس کر سکیں اور بہتر چیز کے خواہاں ہوں۔

اب ہمارے ایک لائق دوست مسٹر "ناظر" نے اُن اصلاحی تجاویز کی بنا پر جو مروجہ ڈراموں کے متعلق اُن کے ذہن میں تھیں ایک ڈراما لکھا ہے جس میں اپنے خیال کے مطابق اُنھوں نے اُن تمام معائب کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو رائج الوقت ڈراموں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور اس غرض سے کہ پبلک کے رجحان کا اندازہ ہو سکے، اُسے الناظر کی وساطت سے اربابِ نظر کے مطالعہ کے لیے پیش کیا ہے۔ اگر تعلیم یافتہ اصحاب کی معقول تعداد نے اس کو پسند کیا اور کم سے کم سَو درخواستیں خریداری کی موصول ہوئیں تو پھر اسے کتابی صورت میں شایع کر کے کسی کمپنی سے ایکٹ کرانے کی بھی کوشش کی جائے گی۔

ناظرینِ الناظر سے عام طور پر اور معزز معاصرین سے خاص طور پر التماس ہے کہ اپنی قیمتی رایوں سے مطلع فرمائیں اور جو صاحب کتابی صورت میں اس ڈرامے کی خریداری پسند فرمائیں وہ اپنے اسمائے گرامی ہمارے دفتر میں درج کرا دیں۔

ایڈیٹر

اشخاص ڈراما

نواب راحت حسین — خلد آباد کے رئیس،
نواب باقر حسین — ان کے چھوٹے بھائی

حسنی — باقر حسین کی تعلیم یافتہ لڑکی۔ (ہیروئن)

مشرف — راحت حسین کا ناتربیت لڑکا، حسنی کا منگیتر۔ (کامِک کیرکٹر)

یوسف — نواب باقر حسین کا ایک عزیز۔ نہایت تعلیم یافتہ نوجوان جو حسنی پر عاشق ہوتا ہے۔ (ہیرو)

مولوی ہدایت اللہ — باقر حسین اور اُن کے سارے خاندان کا خالص دوست و خیرخواہ۔

ماسٹر۔ اے بیسٹی — مشرف کے اتالیق (کامِک کیرکٹر)

جعفری،
گھوش،
واچا،
} ہارڈنگ کالج کے پروفیسر

خلیل — یوسف کا ایک دوست

عشرت — حسنی کی پھوپھی زاد بہن اُس سے کچھ بڑی۔

نزہت — حسنی کی خالہ زاد بہن، اُس سے کچھ چھوٹی۔

مصاحبین، خدمتگار، طوائفیں، بُواغفورن، وغیرہ

ایکٹ اوّل

سین (۱)[۱]

(رئیس خلد آباد نواب راحت حسین کے بھائی باقر حسین کے یہاں تقریب ولادتِ دخترِ حسنی ہے۔ بہت سے مہمان جمع ہیں۔ طوائفیں گاتی بجاتی نظر آتی ہیں)

ایک طوائف (گاتی ہے)

---

[۱] مقصود اس سین سے یہ دکھانا ہے کہ اصلاح و روشن خیالی کے زبانی دعویدار میدانِ عمل میں کتنے بودے ثابت ہوتے ہیں۔ باقر حسین کی عجلت مزاجی نیز ایک نعوذ تاثری وضع بیٹی ظاہر ہوتی ہے۔ نیز اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ اُمراء کے اطوار طوائفیں کس طرح کے خوشامدی ہوتے ہیں۔

مجھ کو محروم کرم میری وفا نے رکھا — اُن کو مشغولِ ستم اُن کی جفا نے رکھا
دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہو کیا، تیر ہو کیا — اس کو بسمل ترے انداز و ادا نے رکھا
یہ ترا شعلۂ رُخ گیسوئے مشکیں سے چھپا — یا چھپا کر مہِ تاباں کو گھٹا نے رکھا
ایک دم ہو نہ سکی ہم سے کبھی طاعتِ حق — ایسا پابند ہیں حرص و ہوا نے رکھا
شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پہ کبھی — تجھ کو دھوکے میں تری شرم و حیا نے رکھا
مرگ و انجام کا بھولے سے بھی آیا نہ خیال — دل کو غفلت میں سدا نشو و نما نے رکھا
کس زباں سے کہے اپنے تئیں ناظرؔ آزاد — قیدِ الفت میں تو اُس زلفِ دوتا نے رکھا

دوسری (گاتی ہے)

شوق کی ہرزہ کاریاں نہ گئیں — یعنی اُس بُت سے یاریاں نہ گئیں
رہی ہر چند عقل، صبر آموز — نہ گئیں، بے قراریاں نہ گئیں
لاکھ بے التفاتیوں پر بھی — میری الفت شعاریاں نہ گئیں
میری گستاخیوں سے کچھ نہ ہُوا — حُسن کی شرمساریاں نہ گئیں
دل نے چاہی ہمیشہ لذتِ غم — درد سے سازگاریاں نہ گئیں
بارہا ذلتیں سہیں، لیکن — دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
حُسن جب تک رہا فسوں پرداز — عشق کی سحر کاریاں نہ گئیں
گو رہی عمر وقفِ غم، ناظرؔ — میری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

راحت حسین - اچھا- اب رات زیادہ گئی - داروغہ، اس وقت کا انعام دے کر ان لوگوں کو رخصت کرو۔ صبح پھر محفل ہوگی۔ ان لوگوں سے تاکید کر دو، کہ ٹھیک وقت پر آ جائیں۔

داروغہ - بہت خوب، خداوند - (اربابِ نشاط جاتے ہیں۔ مہمان بھی رخصت ہوتے ہیں۔ مگر دو چار اعزہ احباب رہ جاتے ہیں)

ایک دوست - حضت - اس وقت کا جلسہ تو بہت ہی پُرلطف رہا - خدا جھوٹھ نہ بُلوائے ہم نے تو ایسا جلسہ عمر بھر نہیں دیکھا - ابھی اُس روز مہاراجہ سیتا نگر نے بھی تو جلسہ کیا تھا، مگر توبہ کیجیے، کہاں وہ، کہاں یہ - قسم

خدائے پاک کی، نواب صاحب آپ نے جلسہ دکھانے کا حق ادا کر دیا۔

دوسرے دوست ۔ اجی آپ نے بھی کس کا نام لیا۔ راجہ مہاراجہ ہونے سے کیا ہوتا ہے، وہ چاہے ہفت اقلیم کے بادشاہ ہو جائیں، مگر وہ دل کہاں سے لائیں گے، جو ہمارے نواب صاحب کا ہے۔

راحت حسین ۔ خیر، یہ آپ حضرات کی محبت وعنایت ہے، جو میری یوں قدر افزائی کرتے ہیں۔ ورنہ ہم لوگ کیا اور ہماری بساط کیا۔

باقر حسین ۔ مگر جلسہ میں ایک بات کی کمی رہ گئی۔ وہ یہ کہ بھابھی جان نہ شریک ہوئیں۔ اُن کے آنے سے یقیناً رونق دوبالا ہو جاتی۔

راحت حسین ۔ دیکھو۔ باقر۔ اگر تم اس طرح کی باتیں مذاق میں کرتے ہو، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ تمہاری بھاوج ہیں۔ اور تمھارے اُن کے مذاق کا رشتہ ہے۔ لیکن اگر سنجیدگی سے کہہ رہے ہو، تو تم جانتے ہو کہ میں کبھی اس خیال میں تم سے متفق نہیں ہو سکتا۔ ہماری شریف زادیوں کی فطرت ہی اس کے مخالف ہے کہ وہ کبھی اپنی خوشی سے غیر مردوں کے سامنے آئیں۔

باقر ۔ تعجب ہے کہ آپ کو میری گفتگو پر مذاق کا گمان ہُوا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ خود حُسنٰی کی والدہ اس جلسہ میں موجود ہیں۔ اس سے زیادہ آپ میری سنجیدگی کا کیا ثبوت چاہتے ہیں؟ رہا عورت کی فطرت کو پردہ کی بحث میں لانا، تو میرے آپ کے بارہا اس مسئلہ پر گفتگو آ چکی ہے۔ بھائی جان، معاف کیجیے گا۔ آپ کے خیالات اس بارہ میں سخت مشرقی واقع ہوے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں بھی ایک زمانہ میں آپ کا ہم خیال تھا۔ لیکن یورپ جا کر مجھے اندازہ ہوا، کہ جہاں ہم عورتوں پر اور سب طرح کے مظالم روا رکھتے ہیں، وہاں ایک یہ بھی ہے۔ اور میں نے وہیں یہ تہیہ کر لیا کہ اگر سارے ہندوستان میں نہیں تو کم از کم اپنے خاندان میں اس رفارم کو ضرور جاری کروں گا۔ اہل مشرق ان معاملات میں نہایت تاریک خیال واقع ہوے ہیں۔ ایک پردہ پر کیا موقوف ہے، نکاح، طلاق، تعلیم نسواں، غرض ہر ایسی رسم جس کا تعلق عورتوں سے ہے، شدید اصلاح کی محتاج ہے۔ روشن خیال گروہ کی کوئی سنتا نہیں۔

مولوی ہدایت اللہ ۔ خیر۔ وہ قدیم مشرقی گروہ تو قابلِ الزام ہئی ہے، مگر مجھے مغربی تعلیم یافتہ گروہ

کی بھی اخلاقی و معاشرتی حالت بہتر نہیں نظر آتی۔

باقر۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ باتیں کرنا سیکھ لیتے ہیں، مگر کام کرنا نہیں جانتے۔ میری عادت عام لوگوں کے برخلاف یہ ہے کہ میں کام کرنا جانتا ہوں، باتیں کم کرتا ہوں مگر کام زیادہ کرتا ہوں۔

ہدایت اللہ۔ بارہا یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کے کام نہ کرنے پر سب سے زیادہ معترض ہوتے ہیں، وہی خود سب سے کم کام کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ "عمل ہونا چاہیے" بھی قول ہی ہے، عمل نہیں ہے۔

راحت حسین۔ اچھا، اب اس بحث کو الگ کیجیے، اپنا اپنا خیال اور اپنی اپنی طبیعت ہے۔ ہاں باقر، مجھ کو تم سے اس وقت ایک خاص بات کہنا ہے۔ کہوں نہ؟ یہاں کوئی غیر تو نہیں ہے۔

باقر۔ شوق سے کہیے۔ غیر کون ہے۔ مولوی ہدایت اللہ کہنے کو غیر ہیں، مگر دراصل اپنوں سے بڑھ کر اپنے ہیں۔

راحت۔ اس وقت مجھے جو کچھ کہنا ہے اُس کی آرزو مدت سے دل میں تھی۔ خدا کے فضل سے آج وہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ خدا تمہارے دل میں بھی نیکی ڈال دے۔ ہاں وہ بات یہ ہے کہ ماشاءاللہ آج تو حسنیٰ کی والدہ کا چِلّہ بھی ہو گیا۔ میری خواہش ہے کہ مشرف کو تم اپنی فرزندی میں قبول کرو۔ وہ تمہارا لڑکا یوں بھی ہے، لیکن اگر ابھی سے حسنیٰ کے ساتھ نامزد ہو جائے، تو مجھے دل سے خوشی حاصل ہوگی۔ میری عین تمنا یہ ہے کہ جس طرح مجھ میں تم میں کبھی کسی قسم کا فرق نہیں ہوا، اسی طرح میری تمہاری اولاد بھی ہمیشہ ایک رہے۔

باقر (ذرا سوچ کر) آپ ہر طرح مالک ہیں، مشرف و حسنیٰ دونوں آپ ہی کی اولاد ہیں۔ حسنیٰ کی والدہ، تم بولو۔

حسنیٰ کی والدہ۔ میں کیا بولوں؟ بھائی جان کو ہر طرح اختیار ہے۔ جو ان کی خوشی وہی میری خوشی۔

راحت۔ نہیں۔ نہیں۔ محض میری خوشی کے خیال سے نہیں، بلکہ جو کچھ واقعی تمہارے دل میں ہو، وہ کہو۔ یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ میری خوشی کا اتنا خیال رکھتی ہو۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم بھی خوب سوچ سمجھ لو۔

حسنیٰ کی والدہ۔ مجھے اس سے اچھی نسبت اور کہاں مل سکتی ہے۔

باقر۔ اب اس میں سوچنا ہی کیا ہے۔ گھر کی بات میں یہی تو بڑی خوبی ہوتی ہے کہ نہ ذات پات کی بحث، نہ صورت شکل کے دیکھنے میں دقت۔

راحت۔ تو اس بات کو میں پختہ سمجھوں؟

باقر اور اُن کی بیوی۔ ہاں ہاں بالکل پختہ، اب اس میں شک و شبہ کی کیا بات ہے۔
ایک عزیز۔ مبارک، راحت بھائی، آپ کو یہ رشتہ مبارک۔ کیا خوب آپ نے یہ انتخاب فرمایا ہے۔ اس سے بہتر رشتہ ممکن ہی نہ تھا۔
دوسرا عزیز۔ سبحان اللہ۔ اس رشتہ کا کیا کہنا۔ میں نے تو جس دن سے حُسنی کی ولادت کی خبر سنی تھی اسی وقت سے اس نسبت کا خیال تھا، ہاں مُنھ سے نکالنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی۔
تیسرا عزیز۔ اور باقر بھائی، آپ کو بھی مبارک۔ لڑکا لڑکی، دونوں چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ واہ کیا اچھا جوڑ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ چراغ لے کر ڈھونڈھتے تو راحت بھائی آپ کو نہ ایسی بہو ملتی اور باقر بھائی نہ آپ کو ایسا داماد ملتا۔
راحت (آسمان کی طرف سر اُٹھا کر) پاک پروردگار، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ معاملہ اس خیر و خوبی سے طے پا گیا ..... ہاں مولوی صاحب آپ بالکل خاموش رہے۔
ہدایت اللہ۔ کاش مَیں اس وقت یہاں موجود نہ ہوتا۔
راحت۔ ایں! یہ آپ نے کیا فرمایا؟
ہدایت اللہ۔ یہ میں نے اس واسطے کہا کہ اگر اپنی اصلی رائے ظاہر کروں، تو شاید آپ لوگوں کو تکدر ہو۔
راحت۔ نہیں صاحب۔ اس میں ناخوشی کی کیا بات ہے، جو کچھ فرمانا ہو شوق سے فرمائیے۔
ہدایت اللہ۔ میری رائے ناقص میں ابھی یہ نسبت بالکل قبل از وقت ہے۔
راحت۔ نہیں، مولوی صاحب یہ نہ فرمائیے۔ آپ تو ان باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ مگر مجھے منشی حیدر حسین فلکی کی بات پر دل سے اعتقاد ہے۔ بارہا آزمایا، ہمیشہ اُن کے کام کو سچا پایا۔ اچھے اچھے پنڈت اُن کا لوہا مانتے ہیں۔ اُنھوں نے اس نسبت کے واسطے یہی ساعت سعید بتائی تھی۔
ہدایت اللہ۔ "ایں سخن را چہ جواب است تو خود می دانی"۔ لیکن مجھے شکایت کا حق باقر میاں زیادہ تر آپ سے ہے۔ آپ کی صاحبزادی کی عمر ابھی چند ہفتے سے زائد نہیں، آپ ابھی سے اُس کی قسمت کا فیصلہ کیے دیتے ہیں۔
باقر۔ مولوی صاحب ایک پہلو پر آپ نے بالکل غور نہیں کیا۔ دیر کرنے میں یہ ڈر ہے کہ دوسری جگہ سے پیام

آگیا تو ہمیں وہاں انکار کرنے میں دقت ہوگی، اور یہ ظاہر ہے کہ مشرف کے ہوتے ہوئے مجھے حُسنیٰ کو غیر جگہ کرنا منظور نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خاندانی جائداد جو کچھ ہے وہ اس وقت ماشاءاللہ بھائی جان کی مِلک میں ہے، اور بھائی جان کا وارث بجز مشرف کے اور کون ہوسکتا ہے؟ پس اگر حُسنیٰ بھائی جان کے یہاں بہو ہوکر جائے گی تو بجائے اس کے کہ باہر کی کوئی لڑکی آکر اس دولت پر قبضہ کرے، خاندانی جائداد ہم بھائیوں ہی کے پاس رہے گی۔

ہدایت اللہ۔ تعجب ہے کہ یہ الفاظ میں آپ کی زبان سے سُن رہا ہوں۔ ایک طرف تو آپ سوشل رفارم کا دعویٰ کرتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ ازدواج کے متعلق جتنے لغو مراسم ہمارے یہاں رائج ہیں وہ سب مٹ جائیں اور پھر اسی کے ساتھ آپ اپنے ذاتی معاملہ میں اس قدر تاریک خیالی کا اظہار کرتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک انتخابِ زوج میں لڑکے لڑکی کی آواز کو مطلقاً دخل نہ ہونا چاہیے۔ اور یہ صرف والدین کا کام ہے، کہ اپنے مال و اسباب کی طرح جہاں چاہیں، مناسب قیمت لے کر اپنی اولاد کو بیچ کردیں؟ مانا، کہ دنیا میں دولت سب کو عزیز ہوتی ہے، مگر کیا اسے اولاد سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے؟

باقر (برافروختہ ہوکر) میں نہیں سمجھتا اس تقریر سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اصلاحِ معاشرت کی تصویریاں پیش کرکر کے میرے ہاتھوں میری مصلحتوں کا خون کرادیں۔ اگر یہ منشا ہے تو اس میں ہرگز آپ کو کامیابی نہیں ہوسکتی۔

ہدایت اللہ۔ دیکھیے، آخر وہی پیش آیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں تو جانتا تھا کہ میرے الفاظ کے غلط معنی پہنائے جائیں گے۔ لیکن اگر آپ ہی لوگوں نے اصرار نہ کیا ہوتا، تو میں اپنی رائے کا اظہار بھی نہ کرتا۔ تاہم باقر میاں، آپ کے اوپر سے یہ الزام کسی طرح رفع نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف تو اصلاح کا مطالبہ، رفارم کا بزور دعویٰ، اور دوسری طرف اپنی ہی بیٹی پر یہ ظلم، کہ اُس کے بلوغ کا بھی انتظار نہیں، اور قبل اس کے کہ اُسے کچھ بھی شعور ہو، اُس کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں، کہ وہ بھی انسان ہے۔ ایک روز وہ بھی عقل و شعور رکھے گی، اور کسی شے کو پسند، کسی کو ناپسند کرسکے گی۔ کہاں وہ زبانی روشن خیالی و آزادی، اور کہاں یہ عملی استبداد و جبّاری!

باقر (اور برافروختہ ہوکر) مولوی ہدایت اللہ صاحب، میں آپ کے علم وفضل کے سبب اب تک آپ کا بہت لحاظ کرتا رہا۔ لیکن اب آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اولاد کی تقدیر کا فیصلہ بے شک والدین کے ہاتھ میں ہے۔ میں جہاں چاہوں اپنی لڑکی بیاہ دوں۔ اس کا پوری طرح مجاز ہوں۔ اور آپ کو دخل در معقولات کا کوئی حق نہیں۔

ہدایت اللہ۔ گفتگو میں بدمزگی بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ پھر حاضر ہونگا۔ آداب۔ آداب۔ (جاتا ہے)

باقر۔ جانے یا بیٹھنے کا آپ کو اختیار ہے، لیکن یاد رہے کہ اس بارے میں اگر ہزار مرتبہ گفتگو کیجیے گا، تو ہزار ہی مرتبہ ناکام رہیے گا۔

راحت۔ میں کہتا ہوں یہ مولوی صاحب کو سوجھی کیا، کہ بیٹھے بٹھائے ایک شگوفہ چھوڑ گئے۔

ایک عزیز۔ اور کچھ نہیں۔ بس ایک بنے چُنے گھر میں فساد ڈلوانا چاہتے تھے۔

حُسنیٰ کی والدہ۔ ایسے ہی آدمی تو آستین کے سانپ کہلاتے ہیں۔

دوسرا عزیز۔ مگر کیا مُنھ کی کھائی ہے۔ بھلا باقر بھائی ایسوں کے دَم میں کب آتے ہیں۔

راحت۔ خیر، اب چل کر سونا چاہیے۔ صبح دوسری محفل ہے۔ (سب جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

سین (۲)[1]

[ایڈورڈ کالج کا صحن۔ تین پروفیسر آکر جمع ہوتے ہیں]

جعفری۔ ہلو، مسٹر گھوش، مزاج اچھا؟

گھوش۔ آپ کی دعا سے سب اچھا ہے، لیکن مسٹر جعفری، آپ اس وقت کھوب (خوب) مل گئے۔ میں تو آپ کی تلاش ہی میں تھا۔ فورتھ ایر کے یوسف کو تو آپ جانتے ہوں گے۔ کیسا تیز، کیسا انٹیلیجنٹ (ذہین) اور کیسا پرامسنگ (ہونہار) ہے۔ پرسوں سے اگزامنیشن (امتحان) شروع ہے، اور وہ بیچارہ ہائی فیور (شدید بخار) میں پڑا ہوا ہے۔ (۱۰۴) ٹمپریچر رہتا ہے۔ اب بولیے کیا ہو؟ اپنے کالج کا معاملہ (معاملہ)

---

[1] مقصود اس سین سے یوسف کی بے مثل قابلیت کو اس کے پروفیسروں کی زبان سے ظاہر کرنا ہے۔

ہوتا، تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر آپ جانتے ہیں یونیورسٹی تو کسی بیماری کا بلی کی سمات (سماعت) نہیں کرتی۔

ڈاکٹر واچا۔ آپ ہی کچھ کہیے۔

جعفری۔ یہ خبر تو آپ نے بہت ہی افسوسناک سنائی۔ مجھے میتھیمٹکس (ریاضی) کی تعلیم دیتے ہوئے اکیس برس ہو چکے۔ لیکن میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اس قابلیت اور اس دماغ کا کوئی طالب علم اب تک میرے تجربہ میں نہیں آیا۔ وہ بیچارہ اگر محض اتفاقی علالت کے باعث امتحان نہ دے سکا، تو یہ ایک سخت اندوہناک واقعہ ہوگا۔ مگر ہم لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ چلیے، پرنسپل صاحب کے پاس چلیں۔ شاید وہ کوئی رائے بتائیں۔ وہ یوسف کے مداح تو بہت ہیں۔

واچا۔ مجھے ڈر ہے کہ پرنسپل بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ یونیورسٹی لاز (یونیورسٹی کے قوانین) اس بات میں بہت اسٹرکٹ (سخت) ہیں۔ لیکن اگر یوسف اگزامنیشن (امتحان) نہ دے سکا، تو اس کا رنج مجھے آپ دونوں صاحب سے جیاتی (زیادہ) ہوگا۔ میرے سبجکٹ (مضمون) میں جتنی لیاکت (لیاقت) اسکو ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی اسٹوڈنٹ (طالب علم) کو کیا، اچھے اچھے پروفیسرز کو نہیں ہوتی۔ مجھ سے پرائیوٹ طور پر جب وہ بیالوجی (علم الحیات) کے کسی ٹاپک (مسئلہ) پر بولنے لگتا ہے تو اُس کی اکل (عقل) اور لیاکت (لیاقت) کے آگے اپنے آپ کو (خود مجھے) شرم مالُم لگنے (معلوم ہونے) لگتی ہے۔ مسٹر جعفری میری پروفیسی (پیشین گوئی) ہے کہ وہ ایک دن کھالی (خالی) انڈیا (ہندوستان) میں نہیں، بلکہ سارے ورلڈ (دنیا) کے سائنٹسٹ (علمائے سائنس) میں اپنا نام پیدا کرے گا۔

جعفری۔ بے شک، بے شک، بہ شرطیکہ اُسے اپنی قابلیت کے نشوونما کا موقع ملتا رہے۔

گھوش۔ اچھا، باتیں تو ہوا کریں گی، مگر ہمیں پرنسپل کے پاس چلنا جرور (ضروری) ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ یونیورسٹی لا کے سامنے وہ بھی کچھ نہیں کرسکتا، لیکن ہمیں اپنی ڈیوٹی (فرض) پوری کرنی چاہیے۔ واچا، جعفری۔ چلیے (سب جاتے ہیں)

سین (۳)[1]

[حسنی اپنے کمرہ میں اپنی دو سہیلیوں عشرت و نزہت کے ساتھ بیٹھی ہے]

حُسنی۔ ہاں عشرت آپا، اس وقت میاں جان کے آجانے سے وہ باتیں رہ گئی تھیں۔۔ اب

---

[1] پڑھی لکھی شریف لڑکیوں کی آپس میں گفتگو۔ لڑکی خود حق انتخاب زوج چاہتی ہے۔

بیان تو کیجیے۔ لیڈی لاٹوش سے آپ سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟

عشرت۔ زیادہ تر تمھاری ہی باتیں رہیں۔ اسکول میں تمھارا امتحان لے کر وہ تم سے بہت خوش ہیں میں جب سہ پہر کو ملنے گئی، تو پہلے دیر تک تمھاری ذہانت و لیاقت کی تعریف کرتی رہیں، پھر یہ پوچھا کہ ان کی شادی کہیں ٹھہری ہے۔ (اس کے بعد کمرہ میں ایک آدھ منٹ خاموشی رہتی ہے)

حسنیٰ۔ یہ آپ باتیں کرتے کرتے چپ کیوں ہوگئیں۔

عشرت۔ شادی کی باتیں سننے کا بہت جی چاہتا ہے۔ اچھا سن۔ میں نے وہی جواب دیا جو سچی بات تھی۔

حسنیٰ۔ کیا، سچی بات کیا؟

عشرت۔ یہی کہ اُن کی منگنی بچپن سے اُن کے چچازاد بھائی مشرف کے ساتھ ہوچکی ہے۔

حسنیٰ۔ دیکھیے آپا، مجھے آپ کی یہ دلگی نہیں اچھی لگتی۔ میں کتنی دفعہ آپ سے منع کرچکی ہوں۔

عشرت۔ نزہت سنتی ہو حسنیٰ کی باتیں، کہتی ہیں یہ دلگی ہے، یہ نہیں کہتیں کہ دل کی لگی ہے۔

نزہت۔ جی ہاں، ان کے نزدیک یہ دلگی ہے۔ ماں باپ مدت ہوئی، ٹھیک ٹھاک کرچکے۔ اب اللہ رکھے اُدھر سے نکاح کی جلدی مچنے والی ہے۔ ان کے نزدیک یہ سب مذاق ہے۔

حسنیٰ۔ کیوں نزہت، تم بھی آپا کی طرح مجھ سے مذاق کرنے لگیں۔

عشرت۔ خیر، تم اپنی زبان سے اسے مذاق ہی کہے جاؤ۔ مذاق میں منگنی ہوئی، مذاق میں نکاح بھی ہوجائے گا۔ تم ایجاب و قبول کے وقت بھی مذاق ہی میں "ہاں" کہہ دینا۔

حسنیٰ۔ خدا نہ کرے، آپا آپ تو ایسی بات منھ سے نہ نکالیے۔ وہ کہتے نہیں یا فالِ قرآن یا فالِ زبان۔

نزہت۔ اے تو اس میں بدفالی کی کیا بات ہے، خدا سب کو دولھا مبارک کرے۔

حسنیٰ۔ جی ہاں، کسی کی زندگی تلخ ہوجائے اور آپ اپنے مبارک باد دیتی رہیں۔

عشرت۔ اے دور پار، تلخ تمھارے دشمنوں کی زندگی ہو، تمھاری زندگی خدانخواستہ کیوں تلخ ہونے لگی۔ لیکن آخر یہ تو سمجھو، اتنے دنوں کی پکی پکائی بات کہیں تمھارے انکار سے چھوٹ سکتی ہے، ماں باپ کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ بھلا ہم لوگ اُن کی بات کہیں کاٹ سکتے ہیں۔

نزہت۔ اور مشرف بھائی جان میں آخر برائی کیا ہے۔ شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی ہوگی۔ پھر مشرف بھائی جان نے کیا قصور کیا ہے؟

حسنیٰ۔ قصور وصور تو میں نہیں جانتی۔ ہاں یہ البتہ جانتی ہوں کہ جب دو آدمیوں کے مزاج میں فرق نہ ہو، تو اُن کا الگ ہی رہنا اچھا۔ تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ کا کبھی جوڑ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک سیدھی بات تھی، جو میں نے کہہ دی۔ پھر اور چال چلن وغیرہ کی جو باتیں زبان سے نکالنے والی نہیں، اُنھیں کوئی کیسے کہے۔ موے دماغ کی جو حالت ہے اُسے سارا زمانہ جانتا ہے۔ ایک میرے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔

عشرت۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن پھر بھی ماں باپ کا بڑا حق ہے۔ اُن کی مصلحت میں دخل دینا بدتمیزی ہے۔

حسنیٰ۔ جی ہاں، جس کو سابقہ نباہنا ہے، چاہے اُس کی جان پہ بن جائے، مگر منہ سے اُف نہ نکالے کیونکہ بدتمیزی ہے۔ ایسا ہی تمیزدار رکھنا تھا، تو مجھے اسکول میں تعلیم کیوں دلائی!

عشرت۔ تو اگر آپ تعلیم یافتہ ہیں، تو مشرف بھائی جان کو بھی کوئی جاہل نہیں کہہ سکتا، جب سے ماموں جان نے ایک نئے ماسٹر کو رکھا ہے، تب سے اُن کی لیاقت اعلیٰ درجہ کی ہوگئی ہے۔ یہ ماسٹر صاحب علیگڈھ کے پڑھے، اور ولایت کے ایل۔ ایل۔ ڈی ہیں۔

حسنیٰ۔ جی۔ کچھ وہ ماسٹر خود بہت لائق ہیں، کچھ اپنے شاگردوں کو لیاقت پلا دینگے۔ مجھے ماسٹر صاحب کی بھی لیاقت کا حال معلوم ہے

عشرت۔ تو یہ کہیے، اُن کی لیاقت بھی آپ کے جی پر نہیں ٹھیتی۔ اچھا آپ عرش معلّیٰ سے اپنی پسند کا تعلیم یافتہ شوہر لائیے گا۔ یہ بھی ایک بچپن کی حماقت ہے۔

نزہت۔ اچھا، عشرت آپا، اب اس ذکر کو جانے دو۔ اس سے کہیں جی میں رنج نہ آجائے۔ ہاں حسنیٰ باجی، تمہارا گانا کئی دن سے نہیں سُنا۔ اب کچھ گانا ہونا چاہیے۔

حسنیٰ۔ مجھ سے اس وقت گایا وایا نہ جائے گا۔

نزہت۔ حسنیٰ باجی، تم کو میرے سر کی قسم کچھ تھوڑا سا سنا دو۔

حسنیٰ۔ اچھا، اچھا، گا دونگی، قسمیں کیوں دلاتی ہو۔ اُدھر سے ہارمونیم اُٹھاؤ۔ ہاں کیا گاؤں؟

داغ کی کوئی غزل؟

نزہت - ہاں ہاں داغ ہی کی کہیے - داغ کے کلام میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے -

حسنیٰ - اصغری - دروازہ پر بیٹھی رہ - کوئی آنے لگے، تو مجھ سے دوڑ کر کہدینا - (گاتی ہے)

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے　　اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی　　بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے
یقیں ہے کہ ہوجائے آخر کو سچی　　مرے منھ میں اُنکی زباں آتے آتے
تمھارا ہی مشتاقِ دیدار ہوگا　　گیا جان سے اک جواں آتے آتے
ابھی سن ہی کیا ہے جو بیباکیاں ہوں　　اُنھیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے
نتیجہ نہ نکلا، تھکے سب پیامی　　وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو　　کہ آئے گی اُردو زباں آتے آتے

اصغری (دوڑی آتی ہے) بٹیا، میاں آرہے ہیں - (گانا رُکتا ہے، باقر حسین آتے ہیں)

باقر حسین - کیوں بٹیا - اس وقت کیا ہو رہا ہے؟

حسنیٰ - کچھ نہیں — میاں جان — ذرا ان لوگوں کو ڈاکٹر اقبال کا ترانہ سُنا رہی تھی، وہی، "مسلم ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"-

باقر - ہاں، ہاں یہ خوب چیز ہے - اسے ضرور پڑھتے رہنا چاہیے - ایسی چیزوں سے قومی حرارت وحمیت قائم رہتی ہے - اچھا تم لوگ بیٹھو - میں جاتا ہوں - (چلے گئے)

عشرت ونزہت خوب ہنستی ہیں، اور کہتی ہیں "واہ بہن حسنیٰ کیا بات بنائی ہے"

حسنیٰ - اے آج تو کچھ ہُوا ہی نہیں - پرسوں عجب تماشہ ہوا - میں باغ میں بیٹھی ہوئی زہرِ عشق کے کچھ اشعار دھیمے دھیمے گنگنا رہی تھی، اتنے میں اکبارگی میاں جان آگئے، اور پوچھنے لگے "کیا گا رہی ہو" میں نے فوراً جواب دیا کہ حالی کا وہ قصیدہ پڑھتی تھی، جو اُنھوں نے حضرت رسالت مآبؐ کو مخاطب کرکے لکھا ہے، وہی، "اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے"۔ میں نے جیسے ہی یہ کہا، میاں جان وہیں کرسی پر بیٹھ گئے، اور کہنے لگے

مجھے سناؤ، میں سنوں گا" تب تو میں بہت گھبرائی، کیونکہ مجھے صرف شروع کے دو ہی شعر یاد تھے - خیر وہ تو میں نے جوں توں کرکے سنائے، اور جی میں ڈر رہی تھی کہ اب کیا ہوگا - اتنے میں خالہ جان آگئیں، اور میاں جان اُن سے باتوں میں لگ گئے - اور وہ بات ٹل گئی - (سب ہنستے ہیں)

عشرت - اچھا - اب چلو - کھانے کا وقت آگیا - ممانی اماں انتظار کرتی ہوں گی - (سب جاتے ہیں)

سین (۴)[1]

[مشرف اپنے کمرہ میں مع دو مصاحبوں کے بیٹھے ہیں، ماسٹر صاحب داخل ہوتے ہیں]

ماسٹر - مشرف - حسب قاعدہ، پہلے مجھے تمھاری عام ذہانت کا امتحان لینا ہے - اس کے بعد آج کا درس ہوگا - اچھا، اس ہفتہ میں تم نے اگر کسی خاص موقع پر اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہو تو ہم سے بیان کرو -

مشرف - اجی ماسٹر صاحب، آپ کی دعا سے اس طرح کے واقعات تو دن بھر میں دو ایک نہیں، بلکہ بہت سے پیش آتے ہیں، جن پر لوگ مارے خوشی کے ہنسنے لگتے ہیں - اب میں اُنھیں کہاں تک بیان کروں -

ماسٹر - بطور نمونہ کے کوئی ایک، واقعہ بیان کرو -

ایک مصاحب - اے حضور، وہ کپڑے والا واقعہ بیان فرمائیے -

مشرف - ہاں خوب یاد دلایا - سُنیے ماسٹر صاحب - کل شام کو میں کپڑا خریدنے یہاں اسکوتھ اینڈ لارڈ کی دوکان پر گیا - جاتے ہی میں نے دُکان دار سے کہا، کہ ۲۰ فروری ۱۹۰۱ء، یوم یکشنبہ بوقت ۹½ بجے صبح خالو ابا نے جو کپڑا آپ کی دوکان سے خریدا تھا، وہ میں خریدوں گا - اس پر وہ حیرت سے میرا منھ دیکھنے لگا - میں تاڑ گیا کہ اسے میرے حافظہ پر حیرت ہے - میں نے کہا کہ عام طور پر تمھارے گاہکوں کا حافظہ خراب ہوتا ہوگا - لیکن ہم اُن میں نہیں - ہم کو دیکھو کہ اس واقعہ کو ۸ سال ۲ ماہ ۹ دن ۵ گھڑی ہو چکے، لیکن میری یادداشت میں ابھی بالکل تازہ ہے - اس پر وہ دُکاندار میری طرف سے مُنھ پھیر کر دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے لگا - تب تو مجھے بہت بُرا لگا - میں نے اپنے جی میں کہا کہ "اجی اگر ہم پڑھ لکھ کر بھی کپڑا تلاش

---

[1] کامک سین - حاضرین تماشہ سنجیدہ مناظر دیکھتے دیکھتے اُکتا گئے ہونگے تفنن و تفریح کے لیے یہ سامان ظرافت ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مشرف کے دماغ کی کیا حالت تھی، جسکے ساتھ غریب حسینی کی قسمت وابستہ کیجارہی تھی - نیز یہ کہ اسکے اتالیق کیسے نالائق تھے -

کرنے میں اس دُکاندار کے محتاج رہیں، تو تُف ہے ہماری تعلیم پر"۔ بس یہ سوچ کر میں نے خود تلاش شروع کر دی یا بندہ جوئندہ۔ پہلے ہی الماری میں وہ کپڑا مل گیا۔ اجی جناب وہی کپڑا مل گیا۔ کیونکہ اُس کپڑے پر پچاس روپیہ قیمت لکھی ہوئی تھی۔ اور خالو ابا نے جو کپڑا خریدا تھا، مجھے خوب یاد ہے کہ اُس کے دام بھی وہ پچاس ہی روپیہ بتاتے تھے۔ یہ (ایک مصاحب کی طرف اشارہ کرکے) خبطی مرزا صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ مجھے عقل سکھانے لگے کہ "میاں، رنگ ساخت وغیرہ تو ملا لیجیے" میں بھلا ان حماقت کی باتوں میں کب آنے والا تھا۔ میں نے کہا "ارے اُلو، یہ رنگ روپ سب اُڑ جانے والی چیزیں ہیں۔ اصل شے قیمت ہے قیمت۔ جب دام ایک تو مال ایک۔ ماسوا اس کے میں نے وہ پہلا کپڑا دیکھا کب تھا۔ میں نے تو صرف اُس روز خالو ابا کو یہ کہتے سُنا تھا، کہ آج ہم ایسکوتھ اینڈ لارڈ کے یہاں سے پچاس روپیہ کا کپڑا لائے ہیں۔ غرض یہ کہ میں نے وہ کپڑا خریدا، اور خرید کر اُسی دوکان پر ایک کوٹ سینے کے واسطے دے دیا لیکن آپ جانتے ہیں کہ کپڑے لتّے کے بارے میں میرے مزاج میں کیسی نفاست ہے۔ میں نے صاف صاف اپنی آزادانہ رائے اُس سے، یعنی دُکاندار سے بیان کر دی کہ، مجھے کپڑے میں کاٹ کوٹ پسند نہیں۔ اسے بغیر قطع کیے ہوے سی دو"۔ اس پر وہ میرا قطع کلام کرکے ہنسنے لگا۔ میں نے کہا "اگر تمہیں اتنی کاریگری بھی نہیں آتی، تو اپنا کپڑا واپس لے لو"۔ ہمیں تمہارے یہاں سودا کرنا منظور نہیں"۔ تب، وہ بولا، کہ نہیں میں آپ کے حکم کی تعمیل ابھی کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کے وہ اپنے درزی خانہ میں چلا گیا، اور مجھے ایک رنگین و چمکدار تصویروں کی کتاب دیکھنے کو دے گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر میرا کوٹ میرے ہاتھ میں دے گیا۔ اجی ماسٹر صاحب میں اُس دُکاندار کی کیا تعریف کروں۔ اُس نے کمال یہ کیا تھا کہ کپڑے کو قینچی سے قطع نظر کرکے فوراً ہی سی دیا تھا۔ گویا جوڑ لگا بھی، اور پھر نہیں لگا۔ میں نے تو آج تک ایسا کاریگر دیکھا نہیں۔ میں نے بھی خوش ہو کر جیب سے سَو روپیہ کا نوٹ نکال کر اسے انعام دیدیا اس پر وہ بہت ہنسا، اور کہنے لگا، "ہم آپ کا حال ولایت تک چھپوا دیں گے، اور یہ لکھ بھیجیں گے، کہ ہندوستان میں اس دماغ کے رئیس ہوتے ہیں، جو پچاس روپیہ کے سودے پر سو روپیہ انعام دیتے ہیں"۔ میں نے خوش ہو کر ایک نوٹ سو روپیہ کا اور انعام دیا، اور کہا کہ "ہاں ہمارے نام کے ساتھ نہیں ضرور

لکھ دینا، کہیں بھول نہ جانا"

مصاحب۔ اور حضور، جیسے ہی دکان سے باہر تشریف لائے، میں نے دیکھا کہ ما رے ہنسی کے سارے انگریز اوندھیں لوٹی جاتی تھیں۔

مشرف۔ تو کیا وہ میرے سامنے نہیں ہنستے تھے، ارے اُلو، دو سو کے نوٹ پائے، اب بھی نہ خوش ہوتے؟

ماسٹر۔ یہ قصہ تو بیشک تم نے بہت دلچسپ بیان کیا۔ اچھا اب میں اپنے سامنے تمھاری ذہانت کا امتحان لیتا ہوں۔ (مٹھی میں کوئی چیز بند کرکے) بتاؤ تو، میری مٹھی میں کیا ہے؟ پتہ یہ ہے کہ وہ شے لوہے کی ہے، نوک تیز ہے، اور نہایت مفید شے ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے کام اُس کے ذریعہ سے لیے جاتے ہیں۔ تم نے اُسے بارہا دیکھا ہے۔ بلکہ روزمرہ اُس سے کام لیتے ہو۔

مشرف۔ اچھا اتنا اور بتا دیجیے کہ انسان کام اُس سے کس عضو سے لیتا ہے؟ ہاتھ سے؟ پیر سے؟ آنکھ سے؟

ماسٹر۔ ہاتھ سے، بلکہ انگلیوں سے۔

مشرف۔ میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔ (اچھل کر) وہ شے برچھا ہے۔

ماسٹر۔ اور میری مٹھی کے اندر!

مشرف۔ جی، اور کیا باہر۔

ماسٹر۔ (مٹھی سے نِب نکال کر) افسوس ہے کہ یہ جواب تم نے صحیح نہیں دیا۔ مگر کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ کیونکہ تم نے بتایا نیزہ اور نکلی نِب۔ لیکن نیزہ اور نِب دونوں لفظ "نون" سے شروع ہوتے ہیں۔ اس واسطے تمھاری ذہانت پھر بھی قابلِ تعریف ہے۔ اچھا اب فنونِ لطیفہ کے درس کا وقت آگیا حسبِ معمول آج بھی شاعری و موسیقی کی تعلیم ساتھ ہوگی (ایک مصاحب سے) نظیر جان حاضر ہے نہ؟ بلاؤ اُسے۔

(مصاحب جاکر نظیر جان طوائف کو لاتے ہیں)

ماسٹر۔ کوئی اچھی سی غزل سناؤ۔ مشرف۔ تم شاعر کے کلام پر رائے زنی کرتے رہو۔

نظیر جان۔ سرکار کو جن شاعروں کا کلام پسند ہے، اُن کی تو کوئی چیز اب یاد نہیں رہی۔ حکم ہو تو ناظر کی ایک تازہ غزل سناؤں۔

ماسٹر ۔ اُنہہ، کس مہمل گو کا نام لیا، اچھا، خیر، یہی سناؤ۔

نظیر جان (گاتی ہے)

جاں بازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے
تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

پروا نہیں، نظارہ کا در شوق سی ہو بند
اب دل میں نقش ہم تری تصویر کر چلے

اہل وفا بھی ساتھ نہ پھر اُنکا دے سکے
اپنی روش کی ایسی وہ تغییر کر چلے

منتی ہے آپ کی کوئی فردِ قرارِ جُرم
مانا کہ ہم شکایتِ تقدیر کر چلے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں مری وحشتیں کہ اب
غمخوار مجھ کو بستۂ زنجیر کر چلے

غالب زبانِ شوق پہ آیا نہ رعبِ حُسن
لو، ہم تمھارے آگے بھی تقریر کر چلے

حیراں ہوں اُنکے حسن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

اگلا سا غیر سے نہیں اب لطف و التفات
بارے ہمارے نالے بھی تاثیر کر چلے

منسوب کرکے عشق کو اک بوالہوس سے تم
اس جذبۂ لطیف کی تحقیر کر چلے

یہ کیا ہوا کہ اُنکی جفاؤں کا ذکر چھوڑ
ناظر بھی شکوۂ فلکِ پیر کر چلے

ماسٹر ۔ کہو، مشرف، یہ غزل بلحاظِ شاعری کیسی تھی؟

مشرف ۔ میں کیا بتاؤں کیسی تھی۔ بہت سی شعریں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔

ماسٹر ۔ تم نے سچ کہا۔ واقعی مہمل کلام تھا۔ دتی میں غالب ایک بڑا مہمل گو ہوا ہے۔ مہمل گوئی کی کوئی کیا تقلید کرتا۔ اُس کا رنگ تو اچھا ہوا اُسی کے ساتھ ختم ہو گیا، گر اُسی زمانہ میں مومن، شیفتہ، حالی، دو چار شخص اور بھی مہمل گوئی کرنے لگے۔ ان سب کے مر جانے کے بعد میں تو خوش تھا کہ یہ رنگ دنیا سے اُٹھ گیا، گر حسرت و ناظر دو ایک شخص اب تک اُسی روش پر چل رہے ہیں۔ اب تم کوئی اچھا شعر سناؤ۔

مشرف ۔ مجھے تو امانت کا کلام نہایت پسند ہے، دیکھیے کیا بے مثل فرمایا ہے۔

میری تربت پر لگایا نیم کا اُسنے درخت
بعد مرنے کے مِری توقیر آدھی رہ گئی

ماسٹر۔ واقعی کیا خوب کہا ہے۔ ایسے ہی کلام کو سُن کر آدمی وجد میں آجاتا ہے۔ نیم۔ درخت۔ آدمی۔ تربت۔ دیکھو یہ سب لفظ کس شادابی کے ساتھ زمینِ شعر میں اُگ آئے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ درخت ہمیشہ زمین میں اُگتا ہے، اور تربت بھی ہمیشہ زمین ہی میں ہوتی ہے۔ اس لیے کیا اچھا درخت کا اُگنا ثابت کیا ہے۔ بلاغت اسے کہتے ہیں۔

مشرف۔ اس سے بھی بڑھ کر حضرتِ قزاق کا رنگ پسند ہے۔ شعر سُنیے۔

جو تو مل جائے جاڑے میں تو پھر کیا غم ہے سردی کا — ماسٹر
تری زلفیں ہوں شانہ پر دوشالہ ہو نہ کمل ہو — کیا معاملہ بندی ہے۔
ہمیں رشک آئے اپنے پر ہمیں سے غیر پیدا ہو
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو — اسے مضمون آفرینی کہتے ہیں
تکلف برطرف صاحب اگر ایسے ہی نازک ہو
پہن لو نور کے کپڑے نہ جالی ہو نہ ململ ہو — نازک خیالی کی انتہا کر دی۔
بس اے قزاق بس طبعِ قیامت خیز کو روکو
غضب ہو جائے گا فوجِ مضامیں میں جو ہلچل ہو — مقطع غضب کا زوردار ہے۔

ماسٹر۔ مشرف۔ میں بہت خوش ہوا کہ میری تعلیم رائگاں نہیں گئی، اور تمہارا مذاق شاعری ہر طرح پر درست ہو گیا۔ اچھا آج ایک ضرورت سے میں سویرے رخصت ہوتا ہوں۔ (جاتے ہیں)

مشرف۔ یہ ماسٹر کمبخت کہاں کو دپڑے تھے۔ میں اپنی پیاری نظیر جان سے بات کرنے کو ترس گیا۔ اب تو پیاری تم پہلو میں آؤ...... مرزا جانی صاحب کل جو ولایت سے شرابیں آئی ہیں، انھیں جلد لاؤ۔

(لاتے ہیں)

[شراب کا دور۔ مصاحبین مخمور۔ مشرف بدمست ہو کر نظیر جان سے زیادہ اختلاط کرنا چاہتا ہے۔ ادب و لحاظ، شرم و حیا کا پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے]

تاثیر صحبت

منتخب از مثنوی "فغانِ جگر" زیرِ تصنیف حکیم جگر صدیقی

متفق ہیں بخاریؒ و مسلمؒ ۔ کہ انسؓ تھے رسولؐ کے خادم
کرتے تھے جان و دل سے خدمتِ شاہ ۔ تھے سفر میں حضر میں وہ ہمراہ
کی بسرِ عمر ظلِ حضرت میں ۔ رہے بارہ برس وہ خدمت میں
یہ انسؓ کا یہ قول ہے سچا ۔ سیدِ پاک نے کبھی نہ کہا
اے انسؓ کام کیوں کیا ایسا ۔ کام کیوں اس طرح نہ تو نے کیا
کارِ خدمت جو کچھ انسؓ نے کیا ۔ سب وہ سرکار کو پسند آیا
کی برائے انسؓ بلطف و عطا ۔ بہر اولاد و مال و عمر دعا
ایک سو بیس انسؓ کے لڑکے تھے ۔ ایک سو بیس سال زندہ رہے
ان کے خرمے کے جتنے تھے اشجار ۔ پھلتے تھے ایک سال میں دو بار
صحبتِ پاک پاک کرتی ہے ۔ زندگی تابناک کرتی ہے
نہ پڑیں شمس کی شعاعیں گر ۔ لعل کس طرح ہو سکے پتھر
بزمِ ساقی سے ہو جو بیگانہ ۔ ہو نہ لبریز مے سے پیمانہ
جس سے حسنِ کمال ہو حاصل ۔ دہر میں ہے وہ صحبتِ کامل
جس سے دونوں جہاں میں راحت ہو ۔ کاملوں کا وہ فیض صحبت ہے

اے جگر کاملوں کی خدمت کر
صحبتِ نیک کا ہے نیک اثر

بھرت

راماین، ہند و اخلاق اور تہذیب کے بلند ترین معیاروں کا مخزن ہے۔ محبت اور وفا، حلم اور عصمت، استقلال اور عہد کی یہاں انتہائی حدیں کھینچدی گئی ہیں۔ رام کو راماین نے معبود بنا دیا۔ سیتا دیوی بن گئیں۔ مگر تعجب ہو کہ باوجودیکہ بھرت حلم اور ضبط، بےنفسی اور علو ہمت میں رام سے کوسوں آگے ہیں، انھیں اُس عام ہر دل عزیزی اور لافانی شہرت کا شمہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ گمنامی میں جیے۔ اور صرف گمنامی ہی میں نہیں، بلکہ جب تک اُن کی بےغرض نفس کشی عوام الناس پر اچھی طرح روشن نہ ہو گئی، وہ بدگمانیوں کا شکار بنے رہے۔ اس کا الزام خود اُن کی ہوس پرست ماں کیکئی پر ہے۔ اور یہ قدرتی امر ہے کہ ایک ایسی سازش میں جس کا مدعا بھرت کو تخت نشیں کرنا ہو اُنکا شریک ہونا عام طور پر باور کر لیا جائے عام پبلک کو اس کا یقین دلانا آسان نہ تھا کہ جو کچھ کیکئی نے کیا وہ بھرت کی لاعلمی میں کیا۔ اور اگر یہ بدگمانی عوام تک محدود رہتی تو چنداں تعجب نہ تھا۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو بھرت کے عاداتِ حمیدہ سے بخوبی واقف تھے اُن کی طرف سے اپنے باطن کو صاف نہ رکھ سکے۔ راجہ دسرتھ نے ایک بار کہا تھا " میں بھرت کو دھرم میں رام سے بھی مضبوط سمجھتا ہوں "۔ مگر رامچندر کے بن باس کے بعد جب دسرتھ بسترِ مرگ پر پڑے ہوے تھے تو انھوں نے صاف طور پر کہدیا تھا کہ میں بھرت کو ترک کرتا ہوں اور وہ اس قابل نہیں کہ میرے مراسمِ تکفین ادا کرسکے۔ یہ انتہا درجہ کی بدگمانی ہے جو ایک باپ کے دل میں بیٹے کی جانب سے پیدا ہو سکتی ہے۔ رانی کوسلیا جو رامچندر کی ماں تھیں اور جنھیں حلم و تسلیم کی دیوی کہنا نازیبا نہ ہوگا وہ بھی بھرت پر طعن وطنز کرنے سے باز نہ آئیں۔ بھرت کو رام سے وہی عقیدت نہ تھی جو چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی سے ہوتی ہے۔ ان کی عقیدت میں تعظیم و احترام کو بہت زیادہ دخل تھا۔ وہ عقیدت نہ تھی پرستش تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ رامچندر اگر بھرت کی جگہ ہوتے، اور بھرت رامچندر کی جگہ، تو راماین کی کتھا کیا صورت اختیار کرتی۔ رامچندر نے بن باس اس لیے قبول کیا کہ

وہ ان کے قابلِ تعظیم باپ کا حکم تھا۔ اور والدین کی نافرمانی ایک اخلاقی گناہ ہوتا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ نافرمانی کی حالت میں راجہ دسرتھ پر عہد شکنی کا الزام عائد ہوا جاتا تھا۔ ان حالات میں اگر رامچندر نے بن باس قبول کیا تو یہ ایک اعلیٰ درجہ کی نفس کشی کے باوجود بھی ایسا فعل نہیں ہے جو دائرۂ بشریت سے خارج کہا جا سکے۔ یا جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں معدوم ہو۔ مگر بھرت نے بغیر کسی ایسی پُرزور اخلاقی تحریک کے زاہدانہ ریاضت اختیار کی۔ اجودھیا کا راج اُن کے لیے خالی تھا۔ وزیر اور مشیر اور اعیانِ سلطنت اُن سے سنگھاسن پر بیٹھنے کے لیے استدعا اور اصرار کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ آخر میں کوسلیا نے بھی اُن سے تخت پر جلوہ افروز ہونے کی خواہش کی۔ مگر بھرت کا قدم ایک لمحے کے لیے بھی نہ ڈگا۔ ان کے دل میں یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ رامچندر کی موجودگی میں جبکہ وہ جنگلوں میں انواع و اقسام کی سختیاں جھیل رہے ہوں گے، کیونکر راج پر بیٹھیں۔ اور کیونکر شاہانہ تزک و احتشام کا لطف اُٹھائیں۔ وہ رامچندر کو واپس لانے کے ارادہ سے چلے۔ مگر جب اس کوشش میں ناکامی ہوئی تو اُنھوں نے چودہ برس اجودھیا کے باہر ایک گوشۂ تنہائی میں کاٹ دیے۔ برادرانہ عقیدت کی مثال اس سے بہتر کہیں نہیں مل سکتی۔

مگر رامچندر بھرت کو بدگمانی سے دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ وہی رامچندر جنھوں نے اجودھیا سے چلتے ہوئے اپنی والدہ کو سمجھا کر کہا تھا "بھرت کی موجودگی میں تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی"۔ سیتا جی کو سمجھاتے وقت ان الفاظ میں اپنی بدگمانی کا اظہار کرنے سے نہ رُک سکے۔ "میری غیر حاضری میں بھرت کے روبرو میری تعریف مت کرنا۔ کیونکہ اہلِ ثروت دوسروں کی بڑائی سننا پسند نہیں کرتے" رامچندر کے دل میں بھرت کی جانب سے ایسا خیال پیدا ہونا اُس حلم و انکسار کے دیوتا پر ظلم و ستم سے کم نہیں۔ زیادہ افسوسناک یہ امر ہے کہ چودہ سال کے بعد اجودھیا کو واپس آتے وقت، جب کہ بھرت کی طرف سے فاسد شبہات رکھنے کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ رامچندر نے ہنومان کو اپنی واپسی کی خبر دے کر بھرت کے پاس بھیجا تو یہ ہدایت کی "میری واپسی کی خبر سنکر بھرت کے چہرہ کا رنگ کچھ متغیر تو نہیں ہوا۔ یہ اچھی طرح غور سے دیکھنا"۔ یہ جانتے ہوئے کہ بھرت نے چودہ سال تک ریاضت و قناعت

میں بسر کیے ہیں، رامچندر کے دل میں ایسے بے رحمانہ خیالات کا پیدا ہونا بشریت کا کوئی بہت اونچا معیار نہیں پیش کرتا۔ صبر و شکر والے برگزیدوں کو بڑی بڑی آزمائشیں جھیلنی پڑی ہیں۔ مگر اس بے نفس، عالی ہمت، بے لوث بزرگ کے ساتھ اپنے اور بیگانوں نے جو ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کیے اُس کی نظیر نہیں مل سکی۔ اور یہ سب کیکئی کے احمقانہ فعل کی برکت تھی۔ اس کا داغ ایسا اٹِ رہا کہ چودہ سال کی اشک شوئی کے باوجود بھی صاف نہ ہو سکا۔

جب رامچندر جیسا روشن خیال شخص اس بدگمانی سے پاک نہ رہ سکا تو لچھمن سے کیا اُمید ہو سکتی تھی۔ جس وقت بھرت اجودھیا والوں کا جم غفیر ساتھ لیے ہوئے رامچندر کو منانے چلے اور تینوں بن باسیوں نے جنگلی جانوروں کو چونک چونک کر بھاگتے دیکھا، آسمان پر گرد و غبار کے بادل نظر آئے، تو لچھمن کے دل میں فوراً خیال پیدا ہوا کہ بھرت اُن کی جان لینے کے ارادہ سے فوج لیے آ رہے ہیں۔ اور انھوں نے رام سے بھرت کو نشانۂ تیر بنانے کی اجازت مانگی۔ مگر شاید رامچندر اس حد تک فرومایہ خیال کو دل میں جگہ نہ دے سکتے تھے۔ اُنھوں نے لچھمن کو سمجھایا کہ بھرت ہم لوگوں کو واپس لے جانے کے لیے آ رہے ہیں۔ اسی کے مقابلہ میں بھرت کے وہ الفاظ رکھیے جو اُنھوں نے لچھمن سے ملاقات ہوتے ہی کہے "لچھمن تم بڑے خوش نصیب ہو کہ روز رامچندر کے کنول کی سی آنکھ والے روشن چہرہ کا دیدار کرتے ہو"۔ اجودھیا کے عوام کا بھرت سے بدگمان ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک ایسی بڑی سازش میں جس کا اُنھیں کے لیے وجود ہوا ہو، اُن کا بے تعلق رہنا بعید از قیاس نظر آتا ہے۔ مگر جو لوگ بھرت کو جانتے تھے، اور اُن کے پاکیزہ اوصاف سے واقف تھے اُن کی جانب سے زیادہ فیاضی اور ہمدردی کی امید کی جا سکتی تھی۔

جس وقت اجودھیا میں رام کا بن باس ہو رہا تھا، بھرت اور سترہن کشمیر میں گئے ہوئے تھے، جہاں بھرت کی ننہال تھی۔ بھرت نے رات کو ایک بُرا خواب دیکھا تھا۔ اور ان نیرنگیوں کے الہامی اثر نے اُنھیں مضمحل بنا دیا تھا۔ وہ اُداس، اور دل گرفتہ ہیں۔ احباب بیٹھے ہوئے خیریت مزاج پوچھ رہے ہیں۔ اُن کا دل خوش کرنے کے لیے عیش و طرب کی محفل آراستہ کی جا رہی ہے۔ کہ اسی اثنا میں

اجودھیا سے انھیں واپس لے جانے کے لیے پیغام بر آتے ہیں۔ بھرت نے بیتاب ہو کر اجودھیا کی خیر و عافیت دریافت کی۔ اس پر پیغام بروں نے طنز آمیز انداز سے کہا "جن کی خیریت آپ چاہتے ہیں وہ خیریت سے ہیں" نامہ بروں کی زبان سے یہ پُرمعنی جواب سُن کر بھرت ضرور چونکے ہونگے۔ انھیں زیادہ استفسار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بے دلی کے عالم میں اس معمہ صفت جواب نے اور بھی افسردہ کر دیا۔ با خاطرِ پریشاں وہ اجودھیا کو چلے۔ اور کتنی ہی ندیوں، جنگلوں، اور پہاڑوں کو طے کرکے وہ جب اجودھیا کے قریب پہونچے تو شہر میں پہلے کی سی رونق اور زندہ دلی نہ پائی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ دوکانیں بند پڑی ہوئی تھیں۔ باغیچوں میں خوش پوش، رنگیں طبع عورت و مرد محوِ سیر نہ نظر آئے۔ سڑکوں پر چندن کا چھڑکاؤ نہ تھا۔ ہر چہار طرف بیدلی اور افسردگی غالب تھی۔ بھرت کو دیکھ کر بعض اجودھیا والوں نے سرِ تعظیم خم کیا۔ گر منھ سے کچھ نہ بولے۔ ان کے چہروں پر رنج و غم کے آثار دیکھ کر بھرت کو یہ پوچھنے کا حوصلہ بھی نہ ہوا۔ اجودھیا کا ایسی حالت میں ہونا بالکل مناسب حال تھا۔ اس کی امیدوں کے نونہال رامچندر کا بن باس ہو گیا تھا۔ رعایا پرور راجہ دسرتھ فرزند کے صدمۂ فراق سے جان دے چکے تھے۔ وہ رامچندر، جن کے لیے دنیا کے عیش و تنعم کے سامان مہیا تھے، جنگل و بیابان میں خاک چھانتے پھرتے تھے۔ عفت مآب سیتا جو پھولوں کی سیج پر سوتی تھی، مخملی غالیچوں پر چلتی تھی، اُس وقت بھکارنی کا بھیس بنائے اپنے بھکاری پتی کے ساتھ جا چکی تھی۔ اگر ساری اجودھیا کی حالت نامراد کوسلیا کے دل کی طرح ہو رہی تھی تو کیا تعجب تھا۔ بھرت کو اب تک ان واقعات کا ذرا بھی علم نہ تھا۔ وہ سیدھے راجہ دسرتھ کے کمرہ میں گئے۔ اور انھیں وہاں نہ پا کر ڈھونڈھتے ہوے کیکئی کے کمرہ میں آئے۔ کیکئی اپنی آنکھوں کے تارے بھرت کو راج سنگھاسن پر بٹھانے کی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ بھرت کو دیکھکر باغ باغ ہو گئی۔ اور جب بھرت نے راجہ دسرتھ کی خیریت پوچھی تو کیکئی نے عالمانہ متانت کے ساتھ جواب دیا۔ "سب جانداروں کی جو گت ہوتی ہے وہی گت تمھارے والد کی بھی ہوئی ہے"۔ یہ سانحۂ المناک سنتے ہی بھرت غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ آسمان چاند کے بغیر جس طرح تاریک ہوتا ہے اسی طرح بھرت کو

اجودھیا تاریک معلوم ہوئی۔ جب ذرا ہوش میں آئے تو انھوں نے کیکئی سے کہا "رام کہاں ہیں؟
باپ کے بعد اب وہی میرے باپ کی جگہ ہیں۔ اب میں اُنھیں کا غلام ہوں۔ اور اُنھیں کے درشنوں
کے لیے آنکھیں بے قرار ہورہا ہیں" کیکئی نے اس کے جواب میں کہا کہ رام کو لچھمن اور سیتا کے ساتھ
بن باس دیا گیا ہے۔ یہ سُن کر ذرا دیر تک بھرت سناٹے میں رہے۔ اس کے بعد حیرت سے پوچھا
"ایسا کیوں؟ کیا رام نے کسی برہمن کا مال چُرایا تھا۔ کیا انھوں نے کسی دُکھیا کو ستایا تھا۔ کیا
کسی پرائی عورت پر بُری نگاہ ڈالی تھی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اُنھیں دیس نکالے کی سزا کیوں دی گئی"
اس کے جواب میں کیکئی نے پہلے بھرت کو اطمینان دلایا کہ رامچندر سے ایسے کمینہ فعل نہیں ہوسکتے اور
تب ساری داستان مفصل بیان کی۔ بعد ازاں بڑے اشتیاق سے بھرت کے چہرہ کی طرف داد طلب
نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

آسمان پر اندھیری گھٹا چھا گئی۔ بھرت باوجود حلم اور صبر و متانت کے غصہ کو ضبط نہ کر سکے
وہ طیش میں آکر بولے "تم نے میرے حق میں یہ کانٹے بوئے ہیں۔ تم نے میرے راستباز والد کی گردن
پر خنجر چلایا۔ تم نے میرے بھائیوں کو بھکاری بنا دیا ہے۔ پرماتما تمھیں نرک میں لے جائے"

بھرت کی غصہ اور رنج سے کانپتی ہوئی آواز کوسلیا کے کان میں پہونچی تو انھوں نے
بھرت کو بُلایا اور بولیں "تمھاری ماں تمھیں لے کر چین سے راج کرے۔ مجھے تو تم رامچندر کے
پاس پہونچا دو" یہ الفاظ بھرت کے جگر میں تیر کی طرح لگے۔ اُنھوں نے بہت قسمیں کھائیں کہ مجھے
ان حالات کا ذرہ بھر بھی علم نہ تھا۔ اور رو رو کر اپنے تئیں نفریں کرنے لگے۔ آخر رنج اور ندامت
سے بیتاب ہوکر وہ بیہوش ہوگئے۔ بدن پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ اور چہرہ پر مردنی چھا گئی۔ تب کوسلیا
کو ان کی بے گناہی کا یقین ہوا اور وہ بھرت کو گود میں لیکر رونے لگیں۔

دوسرے دن سویرا ہوتے ہی سازندوں نے بھرت کی تخت نشینی کے شادیانے بجانے شروع
کیے۔ بھرت حزن و ملال کے دریا میں غرق تھے۔ کہا "یہ تم کیا کرتے ہو؟ تخت میرے بڑے بھائی
کا ہے۔ میں اُن کا غلام ہوں۔ میری مبارک باد گانا بالکل بے موقع ہے"

راجہ دسرتھ کی وفات کے چودھویں دن مراسم تقریب ختم ہونے کے بعد خاندان کے پیرومرشد بششٹ نے دیگر اراکین سلطنت کے ساتھ آکر بھرت کو تخت نشیں ہونے کے لیے سمجھانا شروع کیا۔ مگر بھرت نے باربار اپنے تئیں اس اعلیٰ رتبہ کے ناقابل بتایا۔ آخر اُنھوں نے ان الفاظ میں فیصلہ کیا: "میں اجودھیا باسیوں کے ساتھ جا کر رامچندر کو منا لاؤں گا اور اُنھیں گدی پر بٹھاوں گا اور اگر وہ نہ آئے تو میں بھی چودہ برس تک جنگلوں میں رہوں گا۔"

بھرت کے ساتھ اجودھیا والوں کا ایک انبوہِ کثیر رامچندر کو واپس لانے کے لیے چلا۔ کئی دن کے بعد وہ ایک دریا کے کنارے پہونچے جہاں پھوس کی ایک چٹائی پر رامچندر نے رات بسر کی تھی۔ اس پر سیتا جی کی اوڑھنی سے گرے ہوے سونے کے تارے بکھرے پڑے ہوے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر بھرت فرطِ اندوہ و ملال سے بے حس و حرکت ہوگئے۔ سترہن اُن کے سینہ سے لپٹ کر رونے لگے۔ رانیوں میں بھی کہرام مچا۔ جب بھرت کو ہوش آیا تو وہ روتے ہوے بولے: "کیا یہی اُن کا سیج ہے؟ جن کو ہمیشہ سربفلک محلوں میں رہنے کی عادت تھی۔ جن کا محل گُل و صندل سے معطر تھا، جن کے قصرِ شاہی کی چوٹیوں پر مور اور مینا ناچا کرتے تھے۔ ان محلوں میں آرام کرنے والے رام اور لچھمن اور سیتا کیا اس فرشِ خاک پر پڑے ہوے تھے! یہ مجھے خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔ آہ! میں کون سا منھ لیکر راج سنگھاسن پر بیٹھوں۔ اب مجھے عیش و آرام سے کوئی علاقہ نہیں۔ آج سے میں جٹا بڑھاؤں گا۔ بھبھوت رماؤں گا۔ جنگل کے پھل کھاؤں گا اور فرشِ زمیں پر سوؤں گا۔ جب میرے لیے رامچندر یہ سب دُکھ اُٹھا رہے ہیں تو میں کس طرح آرام کروں!"

اس کے بعد بھرت بھردواج رشی کی قیام گاہ میں پہونچے۔ اور رامچندر کے حالات دریافت کیے۔ اس روشن ضمیر رشی کے دل میں بھی پہلے شبہ ہوا۔ جس سے بھرت کو بے حد روحانی تکلیف ہوئی گویا دنیا میں اب کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کے ارادوں کی صفائی اور خلوصِ نیت کا شاہد ہو۔ اس مقام پر بھرت صرف ایک شب رہے۔ جب بھردواج رشی نے رانیوں سے متعارف ہونا چاہا تو

تو بھرت نے ان الفاظ میں شناسائی کروائی: "یہ جو غم اور فاقہ کشی سے لاغر ہو رہی ہیں اور جن کے چہرہ پر روحانی جلوہ ہے، یہ میرے بڑے بھائی رامچندر کی ماں ہیں - اُن کے بائیں ہاتھ کا سہارا لیے جو خاتون اُداس کھڑی ہیں اور جو کمھلائے ہوئے پھول کی طرح مُرجھائی ہوئی ہیں وہ لکشمن اور شترہن کی ماں سمترا ہیں - اور ان سے ذرا ہٹ کر جو عورت کھڑی ہے وہ اجودھیا کو خاک میں ملانے والی، سب شر و فساد کی بانی، ثروت کے نشہ سے مخمور، مجھ بدنصیب کی ماں ہے"؛ یہ کہتے کہتے بھرت کی آنکھیں آنسو سے لبریز ہو گئیں اور کچلے ہوئے سانپ کی طرح ایک بار اُنھوں نے اپنی ماں کو پُر اشک آنکھوں سے دیکھا -

چترکوٹ کے قریب پہونچ کر بھرت رتھ سے اُتر کے پیادہ پا رام کے استقبال کو چلے جنگل کے چرند و پرند یہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر چونک پڑے - اور اُن میں بھگدڑ پڑ گئی - گرد و غبار آسمان پر چھا گیا رامچندر نے لچھمن سے کہا شاید کوئی راجہ شکار کھیلنے آیا ہے - اُسی نے اس گوشۂ عافیت میں ہیجان پیدا کیا ہے - لچھمن نے ایک اونچے درخت پر چڑھ کر دیکھا - پورب کی طرف انھیں فوجوں کی پہلی صف نظر آئی - وہ رامچندر سے بولے "آگ بجھا دو - سیتا جی کو گپھا میں چھپا دو - اور اسلحہ لے کر تیار ہو جاؤ"۔ رامچندر نے پوچھا "کچھ معلوم ہوا کس کی فوج آ رہی ہے؟" لچھمن بولے "اسی درخت کے قریب بھرت کے رتھ کے پھریرے لہراتے چلے آتے ہیں - شاید گدی سے آسودہ نہ ہو کر اب بھرت بے غل و غش راج کرنے کے لیے ہم لوگوں کو مارنا چاہتا ہے - اسی ارادہ سے وہ فوج سجائے چلا آتا ہے - آج میں اس مایۂ شر کو خاک میں ملا دوں گا"؛

یہ سُن کر رامچندر نے کہا "لچھمن! تمھارا یہ شبہ بے جا ہے - بھرت میرا پیارا بھائی ہے - وہ راجہ دسرتھ کو منا کر ہم لوگوں کو واپس لے جانے کے لیے چلا آتا ہے - بھرت نے کبھی ہماری بُرائی نہیں کی - تم اُس کی شان میں کیوں ایسے دل شکن الفاظ استعمال کرتے ہو - اگر تم کو راج کی خواہش ہو تو میں بھرت سے کہ کر راج تمھیں دلوا دوں گا - بھرت یقیناً میرا کہنا نہ ٹالیں گے"؛ لچھمن یہ پھٹکار سُنکر بہت نادم اور خفیف ہوئے - اور شرم سے سر جھکا لیا -

اس کے ذرا دیر بعد بھرت خود ہی وہاں پہونچ گئے - اور رامچندر کو زمین پر بیٹھا ہوا دیکھ کر
بےنفس اور پاک باطن بھرت بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے - اور کہا "آہ! جس سر پر
جواہرات سے مرصع افسرِ شاہی زیب دیتا تھا، اُس پر آج یہ جٹا ہے - جس کُندن سے جسم پر چندن
اور عطریات کی مالش ہوتی تھی وہ آج خاک میں لپٹا ہُوا ہے - میرے پیارے بھائی - آپ کو میری
وجہ سے یہ سب دُکھ بھگتنا پڑا ہے - میرے جینے پر لعنت ہے!" یہ کہتے کہتے بھرت رامچندر کے پیروں
پر لوٹنے لگے - ان دو پاک نفس، عالی ہمت، ملکوتی صفت، بزرگوں کے ملاپ کا نظارہ نہایت
پُردرد اور حسرتناک ہے - بھرت کا چہرہ سوکھ گیا ہے - سر پر بڑے بڑے بال ہیں - بدن پر صرف ایک
چادر ہے - وہ بڑے بھائی کے قدموں پر پڑے رو رہے ہیں - وہ ایسے نحیف ہو گئے تھے کہ رامچندر
پہلے اُنھیں مشکل سے پہچان سکے - پھر بڑی شفقت سے اُنھوں نے بھرت کو اُٹھا کر سینہ سے لگایا اور
اُن کی پیشانی پر بوسہ دیکر اور انھیں محبت سے گود میں بٹھا کر بولے "پیارے! تم نے یہ بھیس کیوں
بنایا ہے - تمھارا اس طرح جنگل میں آنا مناسب نہیں"

بھرت نے نہایت منت آمیز الفاظ میں رامچندر سے اجودھیا چلنے کی استدعا کی - مگر جب بہت
اصرار کے بعد بھی رامچندر چلنے پر راضی نہ ہوے یہاں تک کہ بھرت خود چودہ سال تک رامچندر کے
عوض بن باس پر آمادہ تھے - تو بھرت اس کمرہ کے دروازہ پر سر جھکا کر رونے لگے - رامچندر نے
بھرت کی تشفی کی اور اپنے کھڑاؤں دیکر لوٹنے کے لیے کہا - بھرت نے بھائی کے کھڑاؤں کو سر
اور آنکھوں سے لگایا - یہ برادرانہ عقیدت اور حمیت کا روحانی نظارہ ہے - یہ کاٹھ کے کھڑاؤں
بھرت کے سر پر ہزاروں جواہرات سے بھی زیادہ زیب دیتے ہیں - لوٹتے وقت بھرت بولے "اجودھیا
کا راج ان کھڑاؤں کی نذر کرکے میں چودہ سال تک آپ کا انتظار کروں گا - اور اگر اسکے بعد آپ
نہ آئے تو آگ میں کود کر اس زندگی کا خاتمہ کردوں گا"

اجودھیا کے قریب پہونچ کر بھرت ایک گاؤں میں ٹھہر گئے - اجودھیا میں قدم نہ رکھ سکے -
یہی گاؤں راج کا پایۂ تخت بنا - نہیں - بلکہ اُسے ایک درویش کامل کا گوشۂ قناعت کہنا چاہیے یہیں

جٹا دھاری، جنگلی پھل کھانے والے بھرت نے چودہ برس کھڑاؤں پر مورچھل ہلا کر راج کا نظم ونسق کیا۔ اہل دربار بھی راجہ کو اس صورت میں دیکھ کر سادہ موٹے لباس پہنتے۔ اس برادرانہ عقیدت کی مثال بشریت کے معیار سے کہیں بلند تر ہے۔ شاید دیوتاؤں میں بھی اس کی نظیر نہ ملیگی۔

بھرت کی یہ حسرتناک غم انگیز صورت رامچندر کی آنکھوں میں ہمیشہ کھنچی رہی۔ سیتا کے ہر لیے جانے کے بعد جب وہ سراسیمگی کے عالم میں پمپا کے کنارے گھوم رہے تھے تو یہ الفاظ اُن کی زبان سے نکلے تھے۔ "یہ دلفریب ساحل اور یہ فرحت بخش نظارہ سیتا کے فراق اور بھرت کے رنج وغم کے باعث مجھے بالکل سہانا نہیں معلوم ہوتا۔" ایک دن لنکا میں انھوں نے سگریو سے کہا تھا "بھرت جیسا بھائی دنیا میں کہاں مل سکتا ہے۔"

جب رامچندر اجودھیا واپس آئے تو بھرت نے اُن کی کھڑاؤں اُن کے پیروں میں پہنا دیے اور سر نیاز خم کرکے کہا۔ "آپ نے زمام سلطنت چودہ سال کے لیے اِن ناسزاوار ہاتھوں میں دے رکھی تھی، اسے آج آپ قبول کیجیے۔ اس دوران میں خزانۂ شاہی دس گنا ہو گیا ہے۔"

رامائن میں کوئی کیرکٹر ایسا بلند نہیں ہے۔ سیتا جی نے ایک بار لکشمن کو غصہ میں بیجا سخت الفاظ سنائے تھے۔ رامچندر کا بالی کو قتل کرنا اور سروپ نکھا کی ناک کاٹنا وغیرہ ایسے فعل ہیں جن کی تاویل یا توجیہ کرنا غیر ممکن ہے۔ لکشمن جی کی باتیں اکثر غصہ سے پُر ہوتی ہیں۔ اور وہ عادۃً کچھ زود رنج اور گرم مزاج واقع ہوئے ہیں۔ کوسلیا بھی الزام سے بری نہیں ہیں۔ اُنھوں نے راجہ دسرتھ کو رامچندر کے بن باس پر نفریں کرتے ہوئے کہا تھا "بعض دریائی جانور جس طرح اپنے ہی بچوں کو کھا جاتے ہیں اُسی طرح تم نے بھی کیا ہے۔" مگر بھرت کی تصویر اول سے آخر تک بےعیب، بے داغ، بے لوث ہے۔ اس گوشۂ قناعت میں زندگی بسر کرنے والے، بے نفس، راج رشی کی تصویر سے رامائن کا منظر نہایت پاکیزہ ہو گیا ہے۔ وہ رامائن کے باغ کا سدابہار پھول ہے۔ جہاں کوئی خار نہیں۔ اس کا کیرکٹر ایک دلاویز روحانی جوت ہے، افسردہ رنگ کے ساتھ یہ ضبط اور انکسار، اور یہ خلوص اور ایثار غالباً تاریخ عالم میں بے مثال ہے۔

کیکئی کے ہزاروں عیبوں پر پردہ پڑ جاتا ہے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایسے ملکوتی صفات بیٹے کی ماں ہے۔ اور اگر دنیاوی معیار سے دیکھیے تو کیکئی کا یہ فعل چنداں قابلِ سرزنش نہیں رہتا۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ بھرت کے اوصاف حمیدہ سے واقف ہی نہ تھی۔ بلکہ اِغوا اور تحریف کا شکار بنائی گئی تھی۔

پریم چند

آئینِ نظّارہ

پہن کر جب لباسِ نور، آجاتے ہیں گردوں پہ
وہ تارے، جن سے ہوجاتی ہے دردِ دل کو کچھ تسکیں
تو اپنے گوشۂ تنہائی سے آتا ہوں میں باہر
سمجھکر یہ، کہ ان سے کچھ بہل جائے دلِ غمگیں

نظر میں ڈالتا ہوں جس گھڑی تاروں کی محفل پہ
جب اُن کی روشنی پڑتی ہے میرے قلب محزوں پہ
تو پیدا ہوتی ہے کیفیتِ جذبِ نہاں دل پہ
کشش کا کوئی مرکز ہے نشاط انگیز گردوں پر

سمجھتا ہوں کہ تم بھی جبکہ ہوجاتی ہو افسردہ
تو اپنے جی کو بہلاتی ہو تھوڑی دیر تاروں سے
تمھارے سامنے ہیں یہ تو میری طرح پژمردہ
مٹایا چاہتی ہو حُسن ان کا تم اشاروں سے

مگر جب دیکھتی ہو تم انھیں پوری نظر بھر کے
تو آنکھوں کا تمھاری کچھ اثر یہ جذب کرتے ہیں
مقابل ہوتے ہیں یہ جبکہ میرے دیدۂ تر کے
تمھاری آنکھوں کا لیکر اثر دل میں اُترتے ہیں

اسی صورت سے ملنے جُلنے کی راہیں نکل آئیں
کہ جس تارے کو میں ہوں دیکھتا، تم بھی اُسے دیکھو
نگاہیں اس طرح میری تمھاری مل کے لڑ جائیں
یُونہیں تم مجھ کو دیکھو اور میں دیکھا کروں تم کو

ابو نواب قیصر

ہندوستانی زبانوںمیں تعلیم

نظامِ قدرت تو اسی کا مقتضی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اُنکی مادری زبان ہی میں تعلیم دی جائے لیکن ہندوستان کی صورتِ واقعات ایسی ہے کہ یہاں تعلیم دینے کے لیے مادری زبان کی موزونیت اور ناموزونیت کا مسئلہ چھیڑنے اور اسپر بحث کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم ہندوستان میں بھی تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں بچوں کو اُنکی مادری زبان میں تعلیم دیجاتی ہے۔ درحقیقت میں نے سُنا ہے کہ پنجاب میں باوجود مادری زبان پنجابی ہونے کے بعض مدارس میں اُردو ہی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ مجھکو علم نہیں کہ یہ کس حد تک صحیح ہے لیکن اگر صحیح ہے تو یہ ہندوستان کے عام رواج کے خلاف ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر قوم کے بہترین خیالات و اصول اُسکی اپنی زبان کے ادب میں نہایت عمدہ طریقے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ہر قوم۔ ہر جماعت اور ہر نسل بعض جداگانہ ذاتی اصول اور خیالات رکھتی ہے اور تمام اقوام عالم کے خیالات یکجا ہو کر تصورات اور اصولِ انسانی کا مجموعہ بنجاتے ہیں اس طرح یہ ظاہر ہے کہ اس مجموعہ میں ہر قوم کا کچھ حصہ ہوتا ہے اور یہ حصہ وہ اُسی وقت لے سکتی ہے جب وہ اپنی مادری زبان پر قادر ہو اور اُسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ اس لیے مادری زبان کو ترقی دینا اور اُسمیں اصلاح کرنا ہندوستان کے ہر فرد بشر کا فرض ہے جب تک کہ زیادہ تر علم غیر زبان میں حاصل کیا جاتا ہے صرف یہی نہیں کہ اسمیں دقتیں پیش آتی ہیں اور زیادہ وقت صرف ہوتا ہے بلکہ سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اُسپر طالبعلم کو ہرگز قدرت نہیں ہوتی۔ برخلاف اسکے مادری زبان میں اکتسابِ علم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک پائدار اور دائمی ملکیت بنجاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۰۸ء کے "کلکتہ ریویو" میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے کہ "تاریخ ہمکو بتلاتی ہے کہ کوئی قوم کسی غیر زبان میں علم حاصل کرکے آج تک اوج تہذیب کمال تعلیم کو نہیں پہنچی۔ مادری زبان کی بیخکنی کرنا گویا کل قوم یا کم از کم اسکی خاص ذاتی خوبیوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنا ہے۔ گفتگو۔ تصویر۔

اور وجود آپس میں ایک دوسرے سے اس قدر متعلق ہیں کہ انکو علٰحدہ کرنا ناممکنات قطعی سے ہے۔ پس تعلیم دینے کے لیے مادری زبان کی موزونیت اور اسکی اصلاح کی ناگزیری سے غالبًا کوئی اختلاف نہ رکھتا ہوگا۔

لیکن چونکہ ہندوستان پر ایک غیر قوم حکمراں ہے اس لیے ہم کو اُسکی زبان سیکھنے کی ضرورت ہے۔ علوم جدیدہ کے اکتساب کے لیے کوئی ہندوستانی زبان تنہا کافی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے سب سے زیادہ مقدم اور مروج غیر زبان میں مہارت پیدا کرنے کی اور زیادہ حاجت درپیش ہے۔ مختلف صوبہ جات میں باہم تبدیلِ خیالات کا وسیلہ پیدا کرنے، ہندوستان میں رسوم اور علوم جدید کی ترویج کرنے۔ جمہوریت اور اتحاد کا بیج بونے، بین الاقوامی ملاقات کو آسان بنانے، مختلف اقوام کے تعلقات کو وسعت دینے اور کسی صوبہ یا کُل ہندوستان کی حدود سے باہر کاروبار چلانے کے لیے ایک ایجُ العام زبان کا سیکھنا لازمی ہے۔ چونکہ تمام متذکرۂ صدر مقاصد انگریزی سیکھنے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ اسلیے اہلِ ہند کے لیے اس زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت بالکل عیاں ہے۔ حضور وایسرائے بہادر کی کونسل میں جو حال میں رزولیوشن پیش ہوا ہے اور جس نے مسئلۂ زیر بحث میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا کردی ہے اُس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ زبانِ انگریزی کا بالکل اخراج کردیا جائے بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ انگریزی کو بطور (سکنڈ لینگویج) دوسری زبان کے سکنڈری مدارس میں پڑھایا جائے۔ اور دیگر مضامین کا درس اُردو ہی میں ہو۔ اس رزولیوشن نے درحقیقت اس بحث کو ایک حد تک سہل اور صاف کردیا ہے۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ وہ مضامین جو مٹرکولیشن تک پڑھائے جاتے ہیں ہندوستانی زبانوں میں بھی پڑھائے جاسکتے ہیں یا نہیں۔ ہائی اسکولز کی ادنیٰ جماعتوں میں اُردو کی کتابیں زیرِ استعمال ہیں: اور اعلیٰ جماعتوں میں اگرچہ کتابیں انگریزی میں ہیں لیکن عمومًا اسکا مطلب اُستاد ہندی زبانوں میں طلبہ کو سمجھاتے ہیں۔ اپنے صوبۂ بنگال کے تجربہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض نہایت کامیاب پروفیسروں نے ریاضی اور طبعیات کے درس دینے میں مادری زبان کو کالج کے درجوں

میں استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب بنگالی تشریح مطالب میں کام آسکتی ہے تو وہ تحریر کتب کے کام میں بھی ضرور کامیاب ثابت ہوگی۔ اور جو کچھ بنگالی کے متعلق کہا جاتا ہے وہ ہندستان کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے۔

بنگال میں مڈل اسکولز اور اُستادوں کے ٹریننگ سکولز میں پڑھائی جانے کے لیے تاریخ۔ جغرافیہ۔ طبیعیات۔ معدنیات۔ جغرافیۂ طبعی۔ علم نباتات۔ جبر مقابلہ۔ ٹرگنومیٹری اور ڈائنامکس کی کتابیں بنگالی میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ بنگال کے اُستادوں کے ٹریننگ سکولز میں یونیورسٹی کے امتحان ایف اے کے معیار تک مادری زبان میں ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ کتب زیر مشق سب بنگالی میں ہیں۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اسی قسم کی کتابیں دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں اور اگر موجود نہیں ہیں تو طیار کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتابیں مٹرکولیشن کے طلبہ کے استعمال کے لیے موزوں بتائی جا سکتی ہیں۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں جسکو نصف صدی سے زیادہ گذرا سرسید احمد خاں مرحوم نے ایک انجمن ترجمہ قائم کی تھی جس نے چند کتابیں جیسے "ٹاڈہنٹر کا الجبرا" اُردو میں ترجمہ کی تھیں۔ درانحالیکہ پچاس سال قبل یہ کارروائی ممکن تھی اس میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا کہ اب ہم سائنس اور ریاضی کی کتابیں میٹرکولیشن کے طلبہ کے لیے طیار کر سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے ڈاکٹر برجندر ناتھ سیال کے اُن مضامین کا مطالعہ کیا ہے جو اُنھوں نے قدیم ہندوؤں کی ریاضی اور علوم طبعی پر لکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سنسکرت میں بعض ایسی اصطلاحیں موجود ہیں جو کیمسٹری اور دوسرے سائنسوں میں بخوبی مستعمل ہو سکتی ہیں۔ گذشتہ کچھ عرصہ سے اعلیٰ سائنٹیفک مضامین پر بنگالی میں لکھے ہوئے رسائل بنگال لٹریری کانفرنس کے شعبۂ سائنس کو دیے جا رہے ہیں۔ ایسے مضامین سائنس وغیرہ پر بنگالی رسائل میں بھی زبان بنگالی میں شایع کیے گئے ہیں۔ یہ کہنا یقیناً مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ علوم فلسفہ پر ہندوستانی زبانوں میں آسانی کے ساتھ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

یہ مشہور ہے کہ مغربی دنیا سے تعلقات پیدا ہونے سے پہلے زبان کا لٹریچر، ہندوستان کے خاص علمی

زبانوں سے زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اور چین کا لٹریچر جس سے کہ ضرورت کے وقت جاپانی لفظ چُراتے اور گڑھتے ہیں سنسکرت۔ عربی یا فارسی ادب سے زیادہ وسیع اور بڑھا ہوا نہیں ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کر یہ ایک عظیم الشان بات معلوم ہوتی ہے کہ جاپان کے وزیر اعظم کونٹ اوکما نے ۱۸۸۲ء میں وسیدا یونیورسٹی اس غرض کو پورا کرنے کے لیے کہ وہاں تمام کام جاپانی میں ہو قائم کردی اس یونیورسٹی کے قائم کرنے میں اور دیگر مقاصد بھی شامل تھے۔

ڈبلو۔ ڈبلو۔ شارپ اپنی کتاب 'جاپان کا طرز تعلیم' میں لکھتے ہیں کہ "موزوں کتابیں نہ ہونے کی کمی کو اس طرح پورا کیا گیا کہ ہر مدرسہ کے ایک حصہ کو، ایسی کتابوں کا مطبع بنا دیا گیا۔ ۱۹۰۵ء کے آغاز میں یہ مطابع نہایت نتیجہ خیز اور بار آور ثابت ہوے ہیں۔"

قریب ایک سال کے گزرا کہ وسیدا یونیورسٹی میں ۱۸۰ پروفیسر اور معلم اور سات ہزار سے زیادہ طلبہ موجود تھے۔ اس میں سیاست۔ قانون۔ علم الاقتصاد۔ تجارت۔ طبیعات۔ انجنیری اور درحقیقت تمام علوم کا سوائے ڈاکٹری کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ تک درس دیا جاتا ہے۔ جاپان میں اور بھی یونیورسٹیاں ہیں جہاں جاپانی زبان میں تعلیم دیجاتی ہے اگرچہ برخلاف وسیدا کے جرمن۔ فرانسیسی اور انگریزی کتابیں بھی ان میں پڑھائی جاتی ہیں۔

اگر جاپانی زبان میں یونیورسٹی کی تعلیم دیجا سکتی ہے اور ریاضی اور سائنس کی کتابیں اعلیٰ پیمانہ پر لکھی جاتی ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی خاص زبانیں بھی ضرور مٹرکولیشن تک کتابیں لکھے جانے اور سکنڈری مدارس میں بڑے سے بڑے درجوں تک تعلیمی زبان بننے کے لیے نہایت کافی ہیں۔ اگر ریاضی اور سائنس کی کتابوں میں اصطلاحیں انگریزی اور ہندی زبان دونوں میں دی ہوئی ہوں تو مٹرکولیشن پاس کرنے کے بعد طالب علم نہایت آسانی سے کالج کے لکچر جو انگریزی میں دیے جاتے ہیں سمجھ سکتا ہے۔

اعتراض کیا گیا ہے کہ انگریزی ہمارے ہائی اسکولوں میں صرف بطور (سکنڈ لنگویج) زبان ثانی کے پڑھائی جائے تو (۱) طلبہ کی انگریزی قابلیت بہت کم رہے گی (۲) وہ کالج کے انگریزی لکچر دل کو نہیں سمجھ سکیں گے اور (۳) دنیاوی کاروبار اور سرکاری ملازمت کے لیے اس قدر موزوں نہ ہوں گے جیسے

موجودہ تعلیم یافتہ لوگ ہیں - میں مختصراً ان تمام اعتراضات سے فرداً فرداً بحث کروں گا -

انگریزی کی قابلیت کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکا انحصار بہت زیادہ اُستادوں کی قابلیت انکے طریقۂ تعلیم اور ضروریاتِ امتحان پر ہے - اگر اُستاد قابل ہوں - طرزِ تعلیم مستحسن ہو اور امتحان میں کسی خاص مجوزہ انگریزی "ادب" کی کتاب یاد کرنے کے بجاے عمر کے مطابق طالب علم کے لیے اسی زبان اُور ادب میں ایک معیار تک جو نہایت غور و فکر کے بعد قائم کیا گیا ہو قابلیت رکھنا لازمی ہو تو میرا خیال ہے کہ ہمارے طلبا اب سے زیادہ انگریزی میں قابل ثابت ہوں گے - اس مضمون میں مَیں یہ نہیں ظاہر کر سکتا کہ یہ مقصد کس طریقہ سے حاصل ہونا چاہیے بلکہ میں صرف یہ دکھاؤں گا کہ جرمن مدارس اب تک کیا کر سکے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں - مختلف اقسام کے جرمن مدارس میں انگریزی پڑھائے جانے کا مفصل حال لکھنے کے لیے میرے پاس وقت ہے نہ وسعتِ مضمون اسکی اجازت دیتی ہے - میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ خاص مدرسوں میں انگریزی کی تعلیم کس طرح ہوتی ہے -

"یہاں زندگی - بیداری اور قابلیت کے آثار پائے جاتے ہیں اور درحقیقت نہایت اچھے نتائج ظہور میں آتے ہیں" لیکن سوال یہ ہے کہ ان عمدہ نتائج حاصل کرنے کے لیئے انگریزی کی تعلیم کو کس قدر وقت دیا جاتا ہے ؟ یہ معلوم کرکے نہایت تعجب ہوگا کہ اول درجہ میں چار - دوم میں چار اور سوم میں پانچ گھنٹے فی ہفتہ انگریزی کی تعلیم دیجاتی ہے - سوم درجہ سے نیچے انگریزی کی تعلیم نہیں ہوتی - رسل (Russell) کی کتاب میں وہاں کا طرزِ تعلیم اور مستعملہ کتابیں بھی بیان کی گئی ہیں - پرشیا کے مدارس میں چھ اعلیٰ درجوں میں تین گھنٹے ہر ہفتہ انگریزی کو دیے جاتے ہیں - جرمنوں کی مدرسہ کی پڑھی ہوئی انگریزی صرف اسی قدر ہوتی ہے - اور ہماری طرح وہ یونیورسٹیوں میں تعلیم اس زبان میں نہیں حاصل کرتے - لیکن باوجود اسقدر کم انگریزی مدرسہ میں سیکھنے کے جرمن پروفیسر ہندوستان کے کالجوں میں مختلف مضامین پر نہایت خوبی سے لکچر دیتے ہیں اور دوسرے تمام محکموں میں اعلیٰ عہدہ دار ہیں - یہ لوگ انگریزی میں رپورٹ لکھتے اور خط و کتابت کرتے ہیں - صرف ہندوستان ہی میں جرمن پروفیسر انگریزی میں لکچر دینے کے لیے نہیں رکھے جاتے بلکہ امریکہ کی یونیورسٹیاں بہت زیادہ انکی

خدمات سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور انکے کام کی ہر جگہ تعریف ہوتی ہے۔

ان مثالوں کو پیش نظر رکھ کر ہم کو اسکا خوف نہ کرنا چاہیے کہ اگر انگریزی سکنڈری مدارس میں دوسری زبان کی طرح پڑھائی جائے گی تو ہماری علمیت انگریزی میں کم ہو جائے گی۔ نہیں۔ بلکہ صرف اسکی ضرورت ہے کہ انگریزی بہتر طریقہ سے پڑھائی جائے۔

ہندوستانی زبانوں میں پڑھنا اور یاد کرنا زیادہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مڈل یا انگریزی مڈل پاس لوگ جو عموماً مڈرک پاس لوگوں سے عمر میں کچھ ہی چھوٹے ہوتے ہیں حساب۔ تاریخ اور سائنس میں اُن سے کم استعداد نہیں رکھتے۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربہ سے کہتا ہوں۔ کٹک کے پروفیسر جوگیش چندرائے اپنے پریسیڈنشل اڈریس میں جو اُنھوں نے بنگالی لٹریری کانفرنس کے شعبہ سائنس میں پڑھا تھا بیان کرتے ہیں کہ برسوں مجھکو کٹک میڈیکل اسکول کے طلبہ کو ایف۔ اے کے معیار تک کمسٹری پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ تمام کورس ۲۰ روز کے عرصہ میں پورا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن چونکہ میں ہندوستانی میں پڑھاتا تھا، اس لیے مجھکو کامیابی ہوئی۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دینے سے وقت اور محنت دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ اس طرح جو وقت بچے اُسکو حسب ضرورت انگریزی پڑھنے میں خرچ کیا جائے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ طلبہ مختلف مضامین پر کالج کے لکچر جو انگریزی میں دیے جاتے ہیں نہیں سمجھ سکینگے۔ اگر جرمن گریجویٹ جو اسکول میں تھوڑی ہی وقت تک انگریزی پڑھتے ہیں کالج میں انگریزی میں لکچر دے سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے طلبہ انگریزی کو دوسری زبان کی طرح پڑھ کر کیوں نہ کالج کے لکچر سمجھ سکیں گے۔

اب ہم جاپان کی مثال لیتے ہیں۔ جاپان کے مڈل اسکولوں میں انگریزی دوسری زبان کی طرح پانچ سال تک چند گھنٹہ فی ہفتہ پڑھائی جاتی ہے۔ ان سے اعلیٰ مدرسوں میں طلبہ کو ۳ سال تک چند گھنٹہ فی ہفتہ انگریزی۔ جرمن اور فرانسیسی میں سے کوئی دو زبانیں پڑھنا پڑتی ہیں۔ مسٹر ڈبلو۔ ایچ شارپ لکھتے ہیں کہ "چند مڈل اسکول کے لڑکے صحیح انگریزی لکھ سکتے ہیں۔ ان سے بھی کم انگریزی بمشکل

بول سکتے ہیں"۔ تاہم یہی طالب علم یونیورسٹی کے لکچر جنکو انگریز فرانسیسی یا جرمن پروفیسر اپنی مادری یورپین زبانوں میں دیتے ہیں بخوبی سمجھتے ہیں۔ اگر جاپانی طلبہ لکچروں کو نہ سمجھتے تو وہ ایسے تعلیم یافتہ نہ ہوتے۔ نہ جاپان کی گورنمنٹ غیر ملکوں کے اُستادوں کو ملازم رکھتی۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے طلبہ کم ازکم جاپانیوں کی طرح کالج کے لکچر سمجھ سکیں گے۔ اسکول سے نکلتے ہی اول اول انکو شاید مشکل پڑے جیسی کہ اب بھی پڑتی ہے لیکن واقفیت ہونے پر چند ماہ میں ہی یہ مشکل رفع ہو جائے گی۔

آخری اعتراض کاروبار دنیاوی میں موزونی کا ہے۔ ہندوستان کے کثیر التداد کامیاب کاروباری لوگ انگریزی نہیں جانتے اور جو انگریزی داں ہیں وہ زباندانی میں شہرت نہیں رکھتے۔ انگریزی کی اس قدر استعداد جو طلبہ کو ہائی اسکولوں میں حاصل کرلینی چاہئے معمولی کاروبار چلانے کے لیے بالکل کافی ہے۔ جاپانی بیشک اس قدر جرمن، فرانسیسی یا انگریزی نہیں جانتے جس قدر ہندوستانی انگریزی جانتے ہیں لیکن وہ صنعت وحرفت۔ ایجاد۔ تجارت وغیرہ کے میدان میں ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔

کاروبار میں ضرب المثل کامیابی حاصل کرنے کے لیے جہاں انگریزی فرانسیسی یا جرمن زبان کے جاننے کی ضرورت ہے وہاں یہ بھی ضرور ہے کہ زباندانی صنعت وحرفت میں کامیابی کی وجہ خاص نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسری قسم کی تربیت یہ رتبہ رکھتی ہے۔

ہندوستان میں بہت سے اخبار نویس ایسے ہوے ہیں اور ہیں جنھوں نے مٹرک یا بی-اے۔ پاس نہیں کیا۔ اسی درجہ کے لوگ لیجسلیٹو کونسل کے مفید ممبر، قابل میونسپل کمشنر اور مشہور کانگریس کے لیڈر ہوے ہیں۔ انمیں سے بعض کی انگریزی میں غلطی نکالنا مشکل نہیں ہے۔ مفید ثابت ہونے اور کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے عیب انگریزی بولنے اور لکھنے کی قابلیت ناگزیر نہیں ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ انسان کرے اچھا کرے اور اس لحاظ سے اپنے خیالات اور جذبات کو صاف صحیح اور خوشنما انگریزی میں ظاہر کرنے کا حوصلہ قابلِ اعتراض امر نہیں ہے۔ لیکن ہمارے بہت سے

اہل وطن اچھی انگریزی لکھنے اور بولنے پر نہایت زور دیتے ہیں اور علمیت۔ طرز۔ صحیح اندازہ۔ اعلیٰ مقاصد اور بڑے اصولوں کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے۔ جاپانی ہمارے اہل ملک سے زیادہ انگریزی داں نہیں ہیں۔ لیکن وہ اپنے ملک اور بیرونجات میں نہایت زبردست سفیر اور سیاست داں ثابت ہوے ہیں۔ بعض نے نہایت مفید کتابیں لکھی ہیں اور سائنس میں ہندوستانیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کی ہے۔

اگر تمام مضامین ہندوستانی زبانوں میں پڑھائے جائیں اور انگریزی کو بہتر طریقہ سے پڑھایا جائے تو آیندہ اسکول اور کالج کے طلبہ موجودہ طلبہ سے انگریزی میں کم نہ رہینگے اور اُنکا دوسرے مضمونوں کا علم ان سے زیادہ گہرا اور دیرپا ہوگا۔

ایک اور بھی اعتراض ہے جو ہم نے خود اپریل سنہ ۱۹۱۴ع کے "ماڈرن ریویو" میں قائم کیا تھا۔ جسنے بیان کیا تھا کہ "ہماری ٹکسٹ بک کمیٹیاں ان تمام کتابوں پر جو انکے سامنے پیش کیجاتی ہیں ایک قسم کی سیاسی نگرانی اور اختیار رکھتی ہیں"۔ جسنے قوانین مطابع کے اثر کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔ اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پابند کرنے والے اثرات ہندوستانی زبانوں پر برابر ناقص اثر ڈالتے رہیں گے خواہ وہ تعلیمی زبان قرار دی جائیں یا نہیں۔ کورس کی کتابوں میں صرف تاریخ۔ علم الاقتصاد اور علم سیاست کی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنکا تعلق ایک حد تک سیاست سے ہے۔ آخری دو مضمون تو اسکولوں میں پڑھائے بھی نہیں جاتے۔ انگریزی میں لکھی ہوئی ہندوستان کی تواریخ ہندوستان میں ہی طبع کیجاتی ہیں اور اس اعتبار سے متذکرۂ بالا اثرات سے اسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتیں جیسی کہ وہ تواریخ جو ہندوستانی زبانوں میں لکھی جائیں۔ تواریخ انگلستان ہمارے مدارس میں انگلستان سے آیا کرتی ہیں۔ پس اگر وہ ہندستانی زبانوں میں یہاں پر طبع کی جائیں تو کم مفید اور قیمتی ثابت ہونگی۔ لیکن صرف اسی قلیل کمی کی وجہ سے ان تمام فوائد کو جو ہندی زبانوں میں تعلیم سے مقصود ہیں قربان نہ کرنا چاہیے۔

خاص خاص اعتراضات پر اب میں تنقیحی نظر ڈال چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ کثیر التعداد ہندوستانی زبانوں میں سے کونسی زبانیں تعلیم کے لیے منتخب کی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں بہت دقت پیش آئیگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اس قدر زبانیں نہیں بولی جاتیں جس قدر

کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ یہ مشہور بات ہے کہ ایک خاص طبقہ کے ہندستانی انگریز ہندوستان کی نااتفاقی کے نئے نئے ثبوت تلاش کرتے رہتے ہیں اور اس سے انکو نہایت مسرت ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ ایک زبان کی مختلف شاخوں کو بھی پوری زبان مان لیتے ہیں۔ اس طریقہ سے ہندوستانی زبانوں کی تعداد ۲۲۰ بتلائی جاتی ہے۔ رپورٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء میں یہی تعداد بتلائی گئی ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں ۱۴۷ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں ہندوستان کی زبانوں میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۱ء تک شاید ان لوگوں کی جستجو اور تلاش ۳۳۰ تک تعداد کو پہنچا دے۔ منجملہ ۲۲۰ زبانوں کے ۹۷۱۷۶ آدمی ۲: ۱۷۴۵۵۵-۷: ۳۸۴۳۲۲۳-۱۲:
: ۱ - ۱۵۲۷۱۵۰ : ۱۱-۳۷۰۹۴۳۹۳ : ۲۰-۲۰۳۹۷۳۶ : ۱۲۱ - ۱۰۹۳۲۷۷۵
۱-۲۸۲۹۴/۹۱ : ۱-۱۳۲۴ : ۳۲ - ۲۳۰۷۵۵۸۵۷ : ۵ - ۲۰۶۶۶۵۴ : ۳ - ۲۴۰۹۷۴۱۱
زبان بولتے ہیں۔ مسٹر کولیشن کے درجہ تک ۲۲۰ زبانوں میں تعلیم دینا تو ناممکن ہے اور نہ اسکی ضرورت ہے۔ سرکاری اہلکار مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری کو تین زبانیں مانتے ہیں۔ لیکن ایک ماہر السنہ ان تینوں زبانوں کو ایک ہی زبان ہندی کہے گا۔ مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ "کم از کم ۱۲۰۰۰۰۰۰ آدمی ہندی کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں" پس ان لوگوں کو ہندی میں تعلیم دی جائے۔ اگر ۸۴۸۰۰۰ پنجاب کے آدمی پنجابی بولتے ہیں تو انکو اس زبان میں تعلیم دی جائے۔ علیٰ ہذا۔

مردم شماری کی رپورٹ سے مترشح ہوتا ہے کہ منڈا زبانیں بولنے والے آدمیوں کی تعداد تیس لاکھ کے قریب ہے۔ "لیکن بعض علامات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انکی تعداد بہت زیادہ تھی"۔ اس بیان سے اُن بعض تعلیم یافتہ لوگوں کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ کچھ ہندوستانی زبانیں آہستہ آہستہ ضرور مفقود ہو جانے والی ہیں۔ اب انکو زندہ کرنے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اسکاچ۔ آئرش۔ ویلش جیسی مہذب اور بیدار قوموں میں بھی انکی مادری زبان بہت کم لوگ بولتے ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں قریب ۴۶ فیصدی ویلش اپنی اصلی زبان بولتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ۴۳ء۵ بول سکتے تھے ۱۸۹۱ء ۱۹۰۱ء و ۱۹۱۱ء میں قریب ۳ء۶ و ۲ء۵ و ۳ء۴ فیصدی اسکاٹ لینڈ کے باشندے گالک زبان بول سکتے تھے۔

اور آئرلینڈ کے باشندوں میں ان سالوں میں ۱۳، ۳ و ۱۴، ۴ و ۱۴، ۵ فی صدی اپنی اصلی مادری زبان جانتے تھے باوجودیکہ یہ زبانیں خود بہت بڑا ذخیرہ مفید اور بیش بہا علم ادب کا رکھتی ہیں، روز بروز تنزل پذیر ہیں۔

اسی قسم کے اعداد ہندوستان کی زبانوں کے متعلق بھی طیار ہو سکتے تھے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں اپنے نہائے خیال سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہندوستان کی بہت سی زبانیں بالتدریج متروک ہو جائیں گی اور ان میں بکثرت وہ وحشی لوگوں کی زبانیں ہیں جنکو لٹریچر سے کچھ تعلق و نسبت نہیں۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر سررشتہ تعلیم ہندوستان کی خاص سولہ زبانوں (بھوٹیا۔ برمئی۔ تامیل۔ ٹیلیگو۔ پنجابی۔ سندھی۔ مرہٹی۔ اوریا۔ بنگالی۔ آسامی۔ ہندی۔ اُردو۔ گجراتی۔ نیپالی) میں تعلیم دینا میٹرکولیشن تک منظور فرمائے تو ہندوستان کی تمام موجودہ مشکلات حل ہو جائیں گی۔ مدارس کے ابتدائی درجوں میں دوسری زبانوں میں بھی تعلیم دی جائے۔ اگر اس عرصہ میں ان میں سے کوئی زبان مفید لٹریچر فراہم کرلے تو اُسکو اعلیٰ درجوں میں بھی کام میں لایا جائے۔ اسی طرح اگر منتخب سولہ زبانوں میں سے کوئی متروک ہو جائے تو اُسکو اُس فہرست سے نکال دیا جائے۔ تیس کرور پندرہ لاکھ آدمیوں کی آبادی کے لیے سولہ مختلف زبانیں تعلیم کے لیے روا رکھنا ہرگز بیجا نہیں ہوگا۔

میٹرکولیشن تک ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دینے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہاں بھی سیدٔ یونیورسٹی کیطرح دیسی یونیورسٹیوں کی بنیا قائم ہو جائیگی تمام ہندوستان کے لیے ایسی سولہ یا بیس یونیورسٹیاں ضرورت سے زیادہ نہ ہونگی۔ ان یونیورسٹیوں میں کوئی دیسی زبان تعلیم کے لیے منتخب کر لیجائیگی۔ ان میں انگریزی تو پڑھانی ضرور ہوگی علاوہ اسکے دو اور غیر زبانیں مثلاً جرمن۔ فرنچ۔ ٹیلین اور لاتین یا سوائے عربی اور سنسکرت کے پڑھانی لازمی ہونگی۔ اس سلسلہ میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جرمنی کے مدارس میں علاوہ دیسی زبان اور دیگر مضامین کے دو غیر زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں ایسلیے ہماری تجویز آئندہ نسلوں پر بہت زیادہ بار دینے والی نہیں خیال کیجا سکتی۔ یہ مسئلہ تو درحقیقت خالی از مشکلات نہیں ہے لیکن جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے ان مشکلات کا حل کرنا ناممکن نہیں ہے۔ اول اول بہت سی اور عمدہ کتابیں نہیں میسر ہونگی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ انکی تعداد اور قسم میں بہت جلد ترقی کیجا سکتی ہے۔

(ترجمہ) عبدالسمیع

طالب علم اور محبت

کیوں طبیعت ہے پریشاں کس لیے ہو اضطراب کس لیے رہ رہ کے کھاتا ہوں میں یارب پیچ و تاب
کیوں تڑپ اٹھتا ہے پہلو میں دلِ خانہ خراب کس لیے نظریں مری جاتیں نہیں سوئے کتاب
شمع ساں میں آج یوں کس واسطے خاموش ہوں
آج کس کی یاد میں مَیں اس قدر مدہوش ہوں

یہ کتابیں کام دیتی تھیں مجھے اُستاد کا کون تنہائی میں پُرساں تھا دلِ ناشاد کا
مرتبہ ایسا بڑھایا مجھ سے بھی آزاد کا دوستوں کو وقت ہاتھ آیا مبارک باد کا
دل لُبھا لیتی تھیں میرا ان کی شکلیں دلفریب
تھیں ہر اک حالت میں مجھ کو مایۂ صبر و شکیب

مجھ سے سرگرمِ تعلُّم کی بلاشک جاں تھیں یہ حال بتلاتی تھیں سب آئینۂ دوراں تھیں یہ
زندگی کا لطف کا آٹھوں پہر ساماں تھیں یہ میرے ہر اک درد کی سچ پوچھیے درماں تھیں یہ
غم غلط ہوتا تھا ان کی شکل زیبا دیکھکر
ہوتے تھے خوش شاہدِ معنی کا جلوہ دیکھکر

بھر دیے آداب اور اخلاق مجھ میں کوٹ کر کھول دیں آنکھیں۔ بنائی نکتہ رس میری نظر
جامۂ انسانیت مجھکو پنھایا سربسر ہر زمانے کا مرقع کر دیا پیش نظر
فلسفے کے راستے پُرپیچ دکھلائے مجھے
حکمت و دانش کے صدہا راز سکھلائے مجھے

پڑھتے پڑھتے کیوں مرا جی ہائے یوں گھبرا گیا سامنے آنکھوں کے میری کیوں اندھیرا چھا گیا
یک بیک کس فتنہ گر کا دھیان دل میں آگیا چپکے چپکے جو کلیجے کو مرے برما گیا

کیوں ہٹا دی شمع بالیں سے تڑپ کر میں نے ہائے
نام منھ سے لے لیا کس کا مکرر میں نے ہائے

ہاں تصور بندھ گیا روئے کتابی کا مجھے ہو گیا عالم بلا کی اضطرابی کا مجھے
رنگ دکھلائے گا دل خانہ خرابی کا مجھے عشق نے موقع دیا ہے باریابی کا مجھے
درس الفت کے لیے مجھکو کیا ہے انتخاب
ہے مجھے مدِ نظر درسِ وفا کا اکتساب

ہسٹری رکھی الگ ہے مجھ سے اب دیوانے کی چاہ ہے مجھکو فقط اب عشق کے افسانے کی
لیلیِ محمل نشیں کی قیس سے دیوانے کی داستاں شیریں کی ہے فرہاد کے مرجانے کی
ذکر پروانے کا ہو یا عندلیب زار کا
جی بہلتا ہے یوں ہی اب اس دلِ بیمار کا

دیدۂ بیدار کو اختر شماری ہے نصیب ابر کے مانند ہر دم اشکباری ہے نصیب
برق کی صورت سے مجھکو بیقراری ہے نصیب رات ہو یا دن ہو مجھ کو آہ و زاری ہے نصیب
رحم کر اے سوز الفت۔ اُف۔ پھُنکا جاتا ہوں میں
ہاں خبر لے اے مسیحا۔ اب مرا جاتا ہوں میں

واقفیت جغرافیہ کی اس طرح بڑھتی رہی سیکھنے کا طرز اولیٰ یعنے سیاحی رہی
ہو بھلا وحشت کا کیا کیا دشت پیمائی رہی کوہ و صحرا میں پھرا پیشِ نظر وادی رہی
کوئے جاناں میں لگاتار رات دن چکر رہا
ہاں بتا دے کوئی میں کس جا کہاں تھک کر رہا

اور ریاضی میں بھی میں کچھ کم نہیں کوشاں رہا ہاں متاعِ دل گئی باقی ہے نقدِ جاں رہا
نقش دل سے بھول کر نکلے نہ یہ ارماں رہا فارمولا جو بتایا یار نے برآں رہا
گفتگو سنتا تھا سب کی نہایت ذوق سے

میں ہمہ تن گوش رہتا تھا ہجومِ شوق سے

ہاں تصور کی بدولت کون آکر رہ گیا کون اپنے حسن کی جھلکی دکھا کر رہ گیا
پیچھے ہٹ کر شرم کھا کر منھ چھپا کر رہ گیا حسرتِ دیدار سے میں تلملا کر رہ گیا

کیا بتاؤں دردِ دل ہے یا کہ ہے دردِ جگر
کوئی سینے میں مرے چھریاں چلاتا ہے مگر

پھر کسی کی یاد آئی پھر ہوا میں بے قرار دل تڑپتا درد سے ہے۔ ہے جگر اُمیدوار
لوٹنے دے تلملانے دے مجھے اے غمگسار دردِ دل جائے گا اپنے ساتھ لے کر جانِ زار

چارہ ساز و چارہ سازی جتنی ہے باطل ہے سب
اور طبیبوں کی بھی کوشش سعی لاحاصل ہے سب

میری نظروں میں یہ دنیا خاک ہے یا گرد ہے سرد مہریِ جہاں سے دل سراسر سرد ہے
دیکھ کر رنگ خزاں خطرہ سے چہرہ زرد ہے کیا کہوں باسط کہ کس جا اور کہاں پر درد ہے

محفلِ دنیا کی میں نے بے وفائی دیکھ لی
ان حسینانِ جہاں کی کج ادائی دیکھ لی

باسط۔ بسواں

وہ عشق پاک و جذبۂ کامل نہیں رہا میں ہوں وہی مگر وہ مرا دل نہیں رہا
جب ہم نے جان دینے کو آساں سمجھ لیا پھر کوئی کام بھی ہمیں مشکل نہیں رہا
ہر وقت سامنے ہیں حسینانِ شوخ و شنگ پہلو میں میرے خوب ہوا دل نہیں رہا
تشبیہ دیتے ہیں رُخِ جاناں کو ماہ سے اب امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وہ محوِ خواب بھی ہے مست شراب بھی اے رُعبِ حُسن تو کبھی غافل نہیں رہا
پوچھا کچھ اس ادا سے مرا حالِ دل کہ میں اظہارِ مدعا کے بھی قابل نہیں رہا
انجامِ ظلم یہ ہے کہ پردے میں ہیں حسیں اب کوئی مُنھ دکھانے کے قابل نہیں رہا
جب ہجرِ یار میں بھی نہ نکلی یہ جانِ زار اے زندگی میں موت کا قائل نہیں رہا
اب کام کچھ نہیں ہے تری یاد کے سوا صد شکر وہ ہجومِ مشاغل نہیں رہا
قربان اُسکی بندہ نوازی کے اے رقم بھولا میں اُسکو، مجھ سے وہ غافل نہیں رہا

زندگی میں کامیاب اور خوش حال رہنے کے ذرائع

زندگی میں کامیاب اور خوش حال رہنے کے لیے تین باتوں کی ضرورت ہے:-

(۱) صحت

(۲) صداقت

(۳) محنت

اس میں ذرا شک نہیں کہ کوئی آدمی بغیر اپنی دماغی قوتوں کی اعانت کے ہرگز کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ ایک معمولی سے معمولی لیاقت کا آدمی بھی اگر وہ صفاتِ مذکورۂ بالا سے متصف ہو تو یقیناً خاطر خواہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن تاوقتیکہ اُس میں یہ صفات معدوم ہیں، اُس کو اپنی کامیابی کی ہرگز امید نہ رکھنی چاہیے۔

وہ آدمی جو زندہ دلی اور دانائی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اُس کو چاہیے کہ شق اول یعنی "صحت" کے لیے کوشاں رہے، اور باقی کی دو صفتوں کو حاصل کرنا خود اُس پر موقوف و منحصر ہے۔

بیمار اور کمزور آدمی اس کلیہ سے مستثنیٰ سمجھے جا سکتے ہیں، جن کا حصول صحت کے لیے کوشش کرنا، ان کے مرض میں کسی قسم کا افاقہ نہیں کر سکتا، تاہم اگر وہ حفظانِ صحت کے قواعد کی پوری پابندی کرنے والے، باقاعدہ ورزش وریاضت کرنے والے، اور اعتدال کے ساتھ رہنے والے ہیں تو اُن کو ڈاکٹر یا طبیب کے بلانے کی دقتیں کبھی ضرورت نہ پڑے گی، بلکہ وہ تندرستی کا پورا لطف اُٹھا سکنے کے قابل ہو جائیں گے۔

محنت اور صداقت اکتسابی چیزیں ہیں، اور انسان جب چاہے ان کو حاصل کر سکتا ہے۔ غرضکہ تفصیل اور اجمال اس مضمون کا سامع، ناظر، اور راقم، تینوں کو اس نتیجہ پر پہونچا دیتا ہے کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا مادّہ خود انسانی قبضۂ اقتدار میں ہے، اور وہ صرف محنت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

انسان کی ناکامی کے دو بڑے وجوہات یہ ہو سکتے ہیں :-

(۱) ناعاقبت اندیشی

(۲) نادانی

لیکن وہ لوگ جو اپنے عزائم میں ناکام رہنے کے باعث اپنے مقدر کا قصور تصور کرتے ہیں اُنکا یہ خیال محض غلط اور بے بنیاد ہے اگر انسان اپنے روزمرہ پیش آنے والے اسباب و واقعات پر نظر رکھے تو یقین ہے کہ وہ اپنی ناعاقبت اندیشی و نادانی کا قائل ہو کر اپنی بدنصیبی سے مایوس ہو جائے گا، لیکن اگر وہ اپنی تقدیر پر کسی قسم کا الزام رکھے یا عطیۂ فطرت کا نقص تصور کرے تو یہ سراسر لغو اور مہمل ہوگا۔

عام طور پر ایک جسمانی طاقت والا آدمی دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال دیکھا جاتا ہے اور فی الواقع اُس کی یہ جسمانی طاقت اُس کی خوش حالی کا باعث اور مدعائے اصلی ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہ حالت مرض و علالت میں بھی اپنے مخالف ابنائے جنس کے سامنے (اپنی بیماری و کمزوری ظاہر نہ ہونے دینے کے لیے) حسب معمول خندہ پیشانی کے ساتھ رہنے کا التزام کرتے ہیں، جس سے بلاشبہ اُن کی فطری دلیری ثابت ہوتی ہے۔ اور یوں وہ خوش حالی و مسرت کا ایک لمحہ حاصل کر لیتے ہیں؛ لیکن ہر شخص اس قسم کی ہمت و عزیمت سے سرفراز نہیں ہوتا۔

اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ خود "تندرستی" خوش حالی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جو شخص اپنی کامیابی اور خوش حالی کا (جو صرف بحالتِ صحتِ اعضاء و درستی ہاضمہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے) خواہاں ہے تو اُس کو چاہیے کہ اپنے جسم کو ریاضت اور ورزش کے ساتھ رکھے اور جس قسم کی تربیت

کی اُس کو ضرورت ہو دے، پاک و صاف رہے، اور مستقل طور پر اُن نقائص و عیوب سے محترز رہے جو اُس کے قوٰے کو مضمحل اور خستہ کر دینے والے ہوں۔

خوش حالی کا دوسرا ذریعہ مکمل تعلیم ہے۔ ایک صحیح و تعلیم یافتہ دماغ، ایک صحیح اور تربیت یافتہ جسم کی رہنمائی اور رہبری میں بہت بڑی اعانت کرتا ہے۔

خوشیوں اور مسرتوں کے فوت ہو جانے پر لٹریچر کا ذریعۂ خوشحالی بننا ایک ایسا ذریعہ ہے جو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چونکہ کامیابی، پیشہ ور خواہ تجارتی زندگی میں، ہر شخص کو بقدر اُسکی وسعتِ معلومات کے حاصل ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے تعلیم یافتہ شخص (اس لیے کہ اس کا دماغ تربیت یافتہ ہے) بڑے بڑے مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے بہت بڑی خوش حالی حاصل کر سکتا ہے۔

ابنائے جنس کی ہمدردی، مسرت و خوشحالی کا تیسرا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے اختیار کرنے میں اُن امور کا پورا خیال رکھنا چاہیے جو اس کے اختیار کرنے والے کے لیے ناپسندیدگی و ازدیادِ نفرت کا باعث ہوں، اور اس سبب سے وہ اس میں ناکام رہے۔ مثلاً وہ ہمدردی کو نہایت دشوار اور ناقابلِ استراحت امر سمجھتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ اُس کی خوش حالی کی کسی طرح معاون نہیں ہو سکتی۔ ہمدردی انسان میں فطرتاً مودع ہوتی ہے جو مرتے دم تک بدستور جاری رہتی ہے، لیکن اگر یہ انسان کے کسی حصۂ عمر میں، اس کی عادت میں کسی سبب سے، داخل ہو جائے تو اور بھی زیادہ قابلِ تعریف بات ہے۔

اگر کوئی آدمی اپنے کسی قابلِ قدر کام کے ذریعہ سے کامیابی کے ساتھ کوئی اعلیٰ وجہِ معاش حاصل کر لے تو یہ بھی ایک چوتھا ذریعہ اُس کی خوشحالی کا ہے۔ مگر صرف کسی مہم کی سرانجام دہی، یا کسی اہم فرض کی بجاآوری ہی مسرت و خوشحالی کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہی مال و دولت، اور عزت و آبرو کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اعلیٰ وجہِ معیشت آدمی کی عیش و راحت کا ایک ذریعہ ہے،

مگر اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ وہ محض جاہ و ثروت اور تمکنت دکھانے کے زعم میں اُن فضول خرچیوں کو روا رکھے جن کا وہ مستحق نہیں ہے۔

اب ہم اگر یہ خیال کر لیں کہ صرف دولت اور عزت ہی بڑا ذریعہ ہو سکتی ہیں خوشحالی کا تو یہ بالکل غلط ہوگا، کیونکہ دولت اور عزت ہی کے سبب سے آدمی خوشحال، اور کامیاب رہنے کا مزا وار اور مستحق نہیں بن سکتا، بلکہ ایسا آدمی خوشحالی کے صحیح معیار سے قابل نفریں خیال کیا جائے گا۔

سب سے بڑا ذریعہ انسان کے خوشحال رہنے کا خود اُس کی "طاقت" میں مضمر ہے۔ صاف باطنی، زندہ دلی، تہذیب و درستیِ اخلاق، اہل خانہ کا عمدہ برتاؤ وغیرہ حصول مسرت و خوشحالی کے سچے ذرایع خیال کیے جاتے ہیں۔ سچی محبت، سچی دوستی، سچی عزت اور اس طرح کی عارضی باتیں بھی مذکورۂ بالا ذرایع خوشحالی میں ایزاد کیے جانے کے قابل ہیں۔

اختر (جوناگڑھی)

غزلیات حسرت موہانی

(۱) بتاریخ ۹ اپریل ۱۹۱۶ء در اثنائے راہ للت پور نوشتہ شُد

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

دانشِ بخت ہے بیدانشیِ شوق کا نام
لوگ دیوانہ نہ سمجھیں ترے دیوانے کو

بھول جاؤں میں اُنھیں ہو نہیں سکتا ناصح
"آگ لگ جائیو ظالم ترے سمجھانے کو"

دیکھ لیں شمع کو تاثیرِ وفا کے منکر
جل بجھی خود بھی جلایا تھا جو پروانے کو

ہو کے سیرابِ کرم دل نے عادت ساقی
ایک بار اور بھی بھر دے مرے پیمانے کو

فرقتِ یار میں بے وقت اُٹھی ہو جو گھٹا
اشکِ خوں آنکھ بھی آمادہ ہو برسانے کو

دل یہ کہتا ہو میں ہوں دردِ محبت کا غلام
جس نے آباد کیا ہو مرے ویرانے کو

رُوح کہتی ہو مری جان ہو وہ نورِ جمال
کردیا جس نے منور مرے کاشانے کو

برق کا قول مجھے یاد ہو اب تک حسرت
"زندگی کہتے ہیں دُنیا سے گذر جانے کو"

---

(۳) ولہٗ دیگر نوشتہ ماہ مئی ۱۹۱۶ء بمقام للت پور

توئی دل شادماں دل باصفا دل
ترے عاشق نے بھی پایا ہو کیا دل

لگا دو آگ عُذرِ مصلحت کو
کہ ہو بیزار اس شے سے مرا دل

جفا کاری ہے تسلیم ستم بھی
نہ ہوگا تابعِ جور و جفا دل

غلط ہے قولِ عقلِ مصلحت کوش
نہ اُس جانب کرے گا اعتنا دل

لگا کر آنکھ اُس جانِ جہاں سے
نہ ہوگا اب کسی سے آشنا دل

مٹے افکارِ گوناگوں کے جھگڑے
ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل

نہ پہنچے گی کبھی کیا گوشِ گل تک
قفس سے اُڑ کے فریادِ عنادل

توانا سے صداقت ہے تو ہرگز
نہ ہوگا پیرو باطل مرا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری بڑا دل

سلہ مصداق "الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون"

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

بسلسلۂ مئی سنہ ۱۹۱۶ء

(۵)

رزولیوشنوں کے سرکاری جوابات

کانفرنس کے اجلاس اول کی پہلی تحریک یہ تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں ملک میں ابتدائی تعلیم پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے تاکہ تعلیم جلد عام ہو سکے"۔ اس رزولیوشن کے متعلق سرکار سے مندرجۂ ذیل جواب موصول ہوا ہے

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے جو رزولیوشن ملک میں ابتدائی تعلیم پر زیادہ توجہ کی ضرورت کے لیے سرکار میں پیش کیا تھا اسکی نسبت واضح ہو کہ خود سرکار عالی کو ابتدائی تعلیم کی اشاعت کی جانب پوری توجہ ہے۔ چنانچہ اسکیم مدارس پرائمری پیشگاہ اقدس و اعلیٰ سے شرف منظوری حاصل کر چکی ہے۔ جس کو منظور فرماتے ہوئے خود ملازمان اقدس و اعلیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "ہر طور اب وقت آگیا ہے کہ ہر طرح سے کوشش بلیغ کی جائے کہ صیغۂ تعلیمات کے کام اور اسکے نتائج میں ایسی نمایاں ترقی ہو کہ ہماری ریاست باعتبار تعلیم کے کسی دوسری ریاست سے پیچھے نہ رہے" ایسے مواضع میں جہاں مدارس نہیں ہیں قیام مدارس کی کارروائی کی جارہی ہے۔ چند سال کے عرصہ میں تعلیم پرائمری میں نمایاں ترقی ہو جائے گی۔"

یہ جواب کس قدر دل خوش کن اور ہمت افزا ہے؟ اور ہمیں ذاتی علم کی بنا پر وثوق کامل ہے کہ سرکاری تحریر میں جو اطمینان بخش وعدہ مضمر ہے وہ پورا ہو کے رہے گا۔ اور حال ہی میں جو تبدیلیاں محکمۂ تعلیمات کے نظم و نسق میں کی گئی ہیں اُن کا نہایت مفید اثر یہ ہوگا کہ مملکتِ آصفیہ کے خوشنما چہرہ سے جہالتِ عامہ کی جھائیاں دُور ہو جائیں گی۔ جدید اسکیم کے نفاذ سے قبل (۱۳۲۳ف کے اعداد ظاہر کرتے ہیں) ابتدائی تعلیم کے لیے ساری مملکت میں ۹۴۷ مدارس تھے جن میں مجموعی طور پر ۲۹۵۲۵ طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ جس کے معنی یہ ہوے کہ اب تک ابتدائی تعلیم پانے والوں کی تعداد ہزار میں

۴ کی نسبت تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئے انتظام سے آیندہ سالوں میں کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد کی وسعت اور تعداد آبادی کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو جو کیفیت کہ ۱۳۲۲ف کے شمار و اعداد سے ظاہر ہوتی ہے وہ حد درجہ افسوسناک و قابل اصلاح تھی اور مقام شکر ہے کہ رئیس و رعایا۔ حاکم و محکوم دونوں کو اس حالت کا احساس ہے اور دونوں اپنے اپنے طور پر اس بلائے مہیب کے دفعیہ پر آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی کوششوں میں برکت دے۔

دوسری تحریک یہ تھی کہ "اس کانفرنس کو اُردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس لیے یہ جلسہ سرکار عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ مخففہ سررشتہ علوم و فنون کے اخراجات سالانہ عہ بہترین علمی تراجم و تصانیف اُردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لیے منظور فرمائے جائیں۔"

سرکاری جواب

کانفرنس نے جو رزولیوشن اُردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کے لیے سالانہ انعامات عطا ہونے کے لیے سرکار میں پیش کیا تھا اُس کی نسبت واضح ہو کہ سرکار عالی امدادِ مصنفین وغیرہ پر تخمیناً بیس ہزار سالانہ خرچ کرتی ہے۔ سررشتۂ تعلیمات کے لیے جو کتابیں ضروری ہیں اُن کے ترجمہ کا انتظام کیا جائے گا۔ مثلاً امتحانات السنۂ مشرقیہ جن میں علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے ہونا قرار پایا ہے ان کی نسبت ایک خاص مجلس کے ذریعہ سے غور کیا جا رہا ہے کہ کن کتابوں کے ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کے بعد ان کے ترجمہ کا مناسب انتظام عمل میں آئے گا۔ عملی کام انتخاب کتب کا مجلس نصاب امتحانات مشرقیہ نے پورا کر دیا ہے اور ایک فہرست ان کتابوں کی مرتب کی گئی ہے امید کی جاتی ہے کہ سالِ حال میں تراجم کا کام عملی طور سے آغاز ہو جائے گا۔

یہ جواب ہرچند کہ اُس فیاضانہ دلچسپی کا مظاہرہ کرنے کے لیے کافی ہے جو امدادِ مصنفین میں سرکار عالی کی طرف سے صادر ہوتی رہتی ہے لیکن افسوس ہے کہ کانفرنس کے اصلی معروضہ پر

اس میں کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ مانا کہ بیس ہزار روپیہ سالانہ کی گراں قدر رقم امدادِ مصنفین میں صرف ہوتی ہے لیکن اس متفرق اور غیر منضبط تقسیم میں اور ایک باضابطہ محکمۂ تراجم کے قیام میں بہت بڑا فرق ہے۔ موجودہ حالت میں سرکارِ عالی کی فیاضانہ امداد کچھ مصنفینِ اُردو کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اور نہ اس بات کا التزام ہے کہ اس میں سے کوئی معتدبہ اور مشخص رقم علوم و فنون کے تراجم پر صرف کی جائے حالانکہ اس وقت ضرورت اسی کی مقتضی ہے کہ جو جواہرِ علمی غیر زبانوں اور خصوصاً السنۂ مغربی کے معادن میں موجود ہیں اُن کو ترجمہ یا تالیف کے ذریعہ سے اُردو میں منتقل کیا جائے۔ اور ہمیں امید ہے کہ منتظمین کانفرنس سرکارِ عالی کے اس جواب سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں گے بلکہ مسلسل اپنے نہایت اہم اور ضروری مطالبہ کو پیش کرتے رہیں گے۔ سرکارِ عالی کی طرف سے انجمن ترقی اُردو کو اسی غرض کے لیے بارہ سو روپیہ سالانہ کی امداد ملتی ہے اور یہ آسانی سے ممکن ہے کہ انجمن کی امداد میں معقول اضافہ کر دیا جائے جس سے وہی نتائج بہ احسنِ وجوہ مترتب ہو سکتے ہیں جو ایک محکمہ کے قیام کی خواہش سے مقصود ہیں۔

تیسری تحریک یہ تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں ہر ضلع کے صدر مقام پر ایک مختصر کتب خانہ اُردو انگریزی وغیرہ کتابوں کا کھولا جانا ملک میں علمی ترقی کے لیے مناسب و ضروری ہے اور کانفرنس کی رائے میں لوکل فنڈ کے مدِ محفوظ سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔"

اس کے متعلق سرکاری تحریر اگرچہ سکرٹری صاحب کی رپورٹ میں درج نہیں ہے تاہم وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ رزولیوشن "اصولاً قابلِ منظوری قرار دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد عملی کارروائی ہونے لگے گی۔"

چوتھی تحریک یہ تھی کہ "سرکار سے استدعا کی جائے کہ تعلیم نسواں کے وسیع پیمانہ پر ہونے کی تدابیر اور اُن کے عمل میں لانے کے طریقوں کی دریافت کے لیے ایک خاص کمیشن مقرر کیا جائے۔"

سرکاری جواب

کانفرنس نے جو رزولیوشن تعلیم نسواں کے لیے ایک کمیشن کے تقرر کے لیے سرکار میں پیش کیا تھا

اس کی نسبت واضح ہو کہ سرکار عالی کو تعلیم نسواں کے وسیع پیمانہ پر لائے جانے اور اس کے عام پسند بنانے سے پوری ہمدردی ہے۔ چنانچہ ایک مہتممۂ مدارس نسواں کا تقرر بھی عمل میں آیا ہے۔ عورتوں کے لیے جداگانہ نصاب کا مسئلہ بھی زیر غور ہے اور اس بارہ میں کارروائی جاری ہے کسی خاص کمیشن کے تقرر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر کانفرنس کوئی تجاویز اس بارہ میں پیش کرنا چاہے تو بخوشی اُس پر غور کیا جائے گا۔

کانفرنس کی درخواست کو اگرچہ یہاں بھی درجۂ قبولیت حاصل نہیں ہوا۔ لیکن اس جواب سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ "سرکار عالی کو تعلیم نسواں کے وسیع پیمانہ پر لائے جانے اور اسکے عام پسند بنانے سے پوری ہمدردی ہے" اب کانفرنس کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ تعلیم نسواں کے مسئلہ پر غور اور مناسب عملی تجاویز پیش کرنے کے لیے اپنے طور پر ایک مجلس قائم کرے اور اُسکی تحریکات کو وقتاً فوقتاً سرکار عالی کے لحاظ کے واسطے بھیجتی رہے۔

پانچویں تحریک یہ تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں تعلیم صنعت و حرفت پر کافی توجہ کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے لیے جس طرح برٹش انڈیا میں ایک خاص عہدہ دار مقرر کیا گیا ہے اسی طرح ضرورت ہے کہ سرکار عالی بھی ایک افسر مقرر کرے اور اس امر کی تحقیقات کی جائے کہ کون سے صنائع و حرفت اور کس قسم کی تجارتی تعلیم سرکار عالی کی رعایا کے لیے مناسب ہے۔ اور اُن صنائع کے فروغ دینے کا کیا طریقہ ہو۔ کانفرنس کی رائے میں انجینیرنگ اسکول کو ترقی دے کر سول۔ میکانکل۔ الکٹریکل۔ انجینیرنگ تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جانا مناسب ہے۔ جس میں ورکشاپ اور سررشتۂ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بندوبست ہو اور عام فائدہ کی غرض سے تعلیم اُردو میں ہونا چاہیے۔"

سرکاری جواب

(۱) صنعت و حرفت کی کارروائی جاری ہے۔ ناظم زراعت بمبئی اسی غرض سے روانہ کیے گئے تھے کہ چیمبر آف کامرس کے حالات وغیرہ دریافت کرکے مطلع کریں تاکہ ممالک محروسۂ سرکار عالی میں بھی چیمبر آف کامرس اسی نہج پر قائم ہو کہ سرکار عالی کو وقتاً فوقتاً صنعت و حرفت کے بارے میں

مطلع کرتا رہے۔

(۲) اس مدرسہ (انجینیرنگ سکول) کا تعلق اب سررشتۂ تعلیمات سے ہو چکا ہے۔ مدرسہ کی حالت بہت کچھ اصلاح طلب ہے۔ چنانچہ اس کی اصلاحی تجاویز زیر کارروائی ہیں۔ میکانکل تعلیم کا بھی بندوبست کیا جارہا ہے۔ الکٹریکل تعلیم دارالضرب میں جاری ہے۔

انجینیرنگ سکول کے بارے میں سرکاری جواب نہایت اطمینان بخش ہے۔ اور اگر محکمۂ تعلیم نے اس بارے میں پوری مستعدی ظاہر کی تو کوئی وجہ نہیں کہ جلد اُس کی حالت نہ سُدھر جائے۔ لیکن مدرسۂ صنعت و حرفت اورنگ آباد کی طرح اگر اُسکے ساتھ بھی بے التفاتی برتی گئی تو نتیجہ یقینی طور پر مایوس کن ہوگا۔ رزولیوشن کے حصۂ اول کا جو جواب معتمدی مالگزاری سے ملا ہے وہ البتہ کئی مضحکہ انگیز پہلو رکھتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے (سکرٹری صاحب بُرا نہ مانیں) کہ خود رزولیوشن کے الفاظ بھی مدعاے اصلی کو پورا نہیں کرتے۔ اس بات کی تحقیقات کیے جانے کی تحریک بیجا نہیں کہ "کون سے حِرَف و صنائع اور کس قسم کی تجارتی تعلیم سرکار عالی کی رعایا کے لیے مناسب ہے۔ اور اُن صنائع کے فروغ دینے کا کیا طریقہ ہو" مگر ساتھ ہی اُسکے یہ بھی درخواست کرنا چاہیے تھی کہ ملک کے موجودہ مدارس صنعت کو وسعت و ترقی دینا چاہیے اور ریاست کی جو مشہور و معروف قدیم مصنوعات ہیں اُنکو زندہ کرنے اور فروغ دینے کی خاص کوشش ہونا چاہیے۔ لیکن جو لوگ چیمبر آف کامرس کے قیام کو صنعت و حرفت کی ترقی کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہوں اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی مجالس اگر سرکاری تحریک سے قائم ہوئیں اور سرکاری اثر میں رہیں تو چنداں مفید نہیں ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر جہاں جہاں اس قسم کی مجلسیں قائم ہیں اُنکی غایت و غرض اور اُنکا کام فی الاصل تجارت پیشہ گروہ کی نمایندگی اور اُن کے حقوق و فوائد کی نگہداشت سے زیادہ نہیں۔ اور کسی صورت میں بھی صلاح و مشورہ سے قدم آگے نہیں بڑھتا۔ اور یہاں ضرورت ہے عملی کام کی جس کے لیے چیمبر کے قیام کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ زمانہ کی رفتار سرعت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ صنعت و تجارت میں میدان مقابلہ دن بدن سخت ہوتا جاتا ہے۔ پس جنھیں کچھ کرنا ہے اُن کو مشورہ و صلاح کے پھیر و پھیر پر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجاے فوراً عملی کارروائی شروع کردینا چاہیے۔

ناظم صاحب زراعت نے اب تک ملک کی زراعت کو اپنی واقفیت اور تجربہ سے کیا فائدہ پہنچایا ہے جو صنعت و حرفت کے کاموں میں بھی خواہ مخواہ اُن کو دخیل بنایا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ گورمنٹ انگریزی تو اُن ہندوستانیوں کو جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو اور جو زمیندار ہونے کی حیثیت میں ملک کے زراعتی حالات سے عملی طور پر ایک حد تک واقف سمجھے جاتے ہیں خاص اس فن شریف کی تعلیم دلانا چاہتی ہے اور اس کے لیے اس ملک میں مدارس اور مزروعات تجربی قائم کرتی ہے اور وظیفے دے دیگر یورپ کو بھیجتی ہے اور گورمنٹ نظام اسکو بھی ضروری نہیں تصور کرتی کہ جو شخص محکمۂ زراعت کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا جائے وہ یورپ کے کسی زراعتی کالج کا اگر سند یافتہ نہ ہو تو کم سے کم ہندوستان کے زراعتی مدارس ہی کا تعلیم یافتہ ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ منتظمین و کارکنان کانفرنس اس مسئلہ کو یوں ہی تشنہ نہ چھوڑ دیں گے بلکہ حقیقی حالات و ضروریات پر سرکار عالی کو بار بار توجہ دلاتے رہیں گے اور جب تک اس ضروری شعبہ کے متعلق ایک وسیع پیمانہ پر عملی کام نہ ہونے لگے اپنے معروضات سے دستکش نہ ہوں گے۔

چھٹی تحریک یہ تھی کہ " کانفرنس کی رائے میں اس امر کی ضرورت ہے کہ سرکار عالی ذریعہ کمیشن کے اس امر کی تحقیقات فرمائے کہ کیوں سرکار عالی کے مدارس ثانویہ اور کالج کو چھوڑ کر طلبہ کا ایک کثیر حصہ بیرونِ ممالکِ محروسہ کالج و اسکول کی تعلیم کے لیے چلا جاتا ہے۔ یا ممالکِ محروسہ کی خانگی جماعتوں میں دوسری یونیورسٹیوں کے امتحان کی تیاری کرتا ہے۔ اور بعد تحقیقات اس بارے میں مناسب انتظامات عمل میں لائے جائیں "۔

اس کے متعلق محکمۂ سرکار سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں آیندہ بھی اسکے جواب کی امید نہ رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر سچائی اور آزادی کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی گئی تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب تک سرکاری محکمۂ تعلیم اور نظام کالج دونوں کی حالت اس قدر ابتر رہی ہے کہ ضرورت شناس والدین کو اُن پر پورا اعتماد نہیں ہو سکا اور وہ اپنی اولاد کو مقاماتِ غیر کے مدارس اور کالجوں میں تعلیم دلانے کے لیے مجبور ہوے۔ اس سلسلہ میں شاید اس اصولی

غلطی کا اعتراف بھی کرنا پڑے جو مدراس یونیورسٹی سے اپنے دامنِ تعلیم کو وابستہ کرنے میں گورنمنٹ نظام سے سرزد ہوئی ہے۔ اسے عام طور پر اب سب علم دوست اصحاب محسوس کرتے ہیں کہ یہی غلطی ممالک محروسہ کے باشندوں کی تعلیمی ترقی میں ایک بڑی حد تک سدراہ ہے۔ اور غالباً اب وقت آگیا ہے کہ محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار عہدہ داران اور نظام کالج کی منتظم جماعت دونوں متحدہ طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ یہ بھاری جُوا اُن کے کندھوں سے اُتر جائے اور اسکے بجائے کسی زیادہ فیاض اور معتدل یونیورسٹی سے اُن کا الحاقی رشتہ قائم ہو جائے۔ تا آنکہ اپنی مُلکی یونیورسٹی کے قائم ہو جانے کے بعد اس قسم کے تعلقات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

ساتویں تحریک یہ تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں مذہبی اوقاف و معاشوں کی تحقیقات ہو کر ایسے اوقاف و معاش جن کے مقصد میں تعلیم بھی شامل ہو سکتی ہو ان کی آمدنی کا مناسب حصہ تعلیم مذہبی میں صرف ہونا مناسب ہے۔"

سرکاری جواب

اس سے اصولاً سرکار عالی کو اتفاق ہے کہ جو معاش یا اوقاف ایسے ہوں جن کے مقصد میں تعلیم بھی داخل ہو سکتی ہے تو اُس سے تعلیم مذہبی کا بندوبست ہونا ضروری ہے۔ ایسے اوقاف و معاشوں کی تحقیقات کی غرض سے ایک مہتمم اوقاف مقرر ہے۔ نیز مخبروں کے لیے انعام مقرر کیا گیا ہے۔ جو جدید معاشیں بحال ہوں ان کی اطلاع صدر محاسبی و مالگذاری سے بغرض نگرانی سررشتۂ امور مذہبی کو ملنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ایک خاص کمیٹی بغرض ترتیب قانون اوقاف مقرر ہوئی ہے جس کے بعد اس بارے میں مکمل انتظامات عمل میں آسکیں گے۔

یہ جواب صد درجہ طمانیت بخش اور مسرت انگیز ہے اور اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عالیجناب مولانا انوار اللہ شاہ صاحب معین المہام صیغۂ امور مذہبی کو ایسے مفید اور ضروری کاموں کی طرف پوری توجہ ہے۔ اور ہمیں یقین کامل ہے کہ صاحب موصوف کا اثر و اقتدار اور مذہبی جوش و احساس اُن خرابیوں کا استیصالِ کلی کرنے میں کامیاب ہوگا جن کی وجہ سے ملک کی دولت کا ایک حصۂ وافر

بیکار رہتا اور بیسا اوقات نہایت قبیح و مذموم طور پر صرف ہوتا ہی اور جو مسلمانوں کی عام معاشرتی زندگی پر بہت ہی بُرا اثر ڈال رہا ہے۔

آٹھویں تحریک یہ تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں طبی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہنچنے کی غرض سے کم از کم اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسب سابق اُردو میں ہونا مناسب ہی" اس کا جواب بھی محکمۂ سرکار نے نہیں دیا۔ مطالبہ کی موزونیت اور حق بجانب ہونے میں تو انکار ہو ہی نہیں سکتا اور اہل ملک کے صحیح جذبات کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ "تمام تحریکوں میں جو کانفرنس میں پیش ہوئیں اس تحریک پر نہایت ہمدردی کے ساتھ سب سے زیادہ مباحثہ ہوا" ایسی صورت میں محکمہ سرکار کی خاموشی موجب حیرت ہی اور اُسکی کوئی مناسب تاویل بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال ہمیں اُمید ہی کہ کانفرنس اس تجویز سے دست کش نہ ہوگی اور سال بسال محکمۂ سرکار کے دروازے کھٹکھٹاتی رہے گی۔

(۶)

خاتمہ سرکاری جوابات کے اس اجمالی تذکرہ کے بعد سر دست ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق ہم اپنا تبصرہ ختم کرتے ہیں۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا یہ حقیقت میں اُس کا ایک عشر عشیر بھی نہیں جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ اجلاس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے پھر ایک دفعہ ہم اپنے معروضات منتظمین کانفرنس اور ارباب دکن کی خدمت میں پیش کریں گے۔ تاہم چند سطور میں تمام ہی خواہانِ مملکتِ آصفیہ کی طرف مخاطب ہو کر ہم بصد ادب یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ حیدرآباد میں اس قسم کی یہ پہلی قومی و ملکی مجلس قائم ہوئی ہی۔ اگر سب حضرات فراخ حوصلگی کے ساتھ اسکی اعانت کرتے رہے اور کشادہ دلی۔ یکجہتی اور رواداری کے ساتھ اُس کے مقاصد کی تکمیل میں کوشش کی گئی تو چند ہی سال کے عرصہ میں نہایت قابل قدر اور حد درجہ نفع رساں نتائج ظاہر ہوں گے لیکن اگر مذہبی یا مسلکی تعصبات کا اسے گہوارہ بنایا گیا اور رقابت و حسد کی آگ اسکی وساطت سے بھڑکائی گئی تو نہ صرف یہ کہ وقت۔ روپیہ۔ اور بہترین قوتیں عرصہ تک باہمی کشاکش اور ناا تفاقیوں کی بدولت رائگاں ہوتی رہیں گی بلکہ اندیشہ ہی کہ منافرت اور رقابت کی آب و ہوا میں جو شجر تعلیم پھلے پھولے گا اُسکے ثمر قومی یا ملکی فلاح و بہبود کا ذریعہ بننے کے بجائے اُن کی تخریب کا سبب بنکر رعیت و رعایا دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوں گے۔

مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو

بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

(۱) حسب ذیل حضرات نے چندۂ رکنیت روانہ فرماکر انجمن کو ممنون فرمایا۔ اسماء مع چندہ درج ذیل ہیں :-

جناب مولوی عبدالرشید صاحب پیرزادہ درگاہ قلندر صاحب پانی پت۔		عہ ر	سکۂ قیصریہ
جناب مسٹر محفوظ علی بی اے - بدایوں		عہ ر	"
جناب مسٹر ظفر عمر بی اے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس - کھیری		عہ ر	"
جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب ڈویزنل افیسر سونی پت		عہ ر	"
جناب منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ - بھوپال		عہ ر	"
جناب مولوی تفضل حسین صاحب ناثر صدر مدرس مدرسۂ مڈل ہنگولی دکن		عہ ر	سکۂ عثمانیہ
جناب مولوی محمد اسداللہ خاں صاحب بی اے رجسٹرار مجلس وضع قوانین حیدرآباد دکن		عہ ر	"
جناب مولوی ظہور الحسن صاحب کنٹراکٹر ضلع محبوب نگر	"	عہ ر	"
جناب رنگا رڈی صاحب تحصیلدار کریم نگر	"	عہ ر	"
جناب مولوی حمیدالدین صاحب بی اے صدر دارالعلوم حیدرآباد	"	عہ ر	"
جناب مولوی فخرالدین علیخاں صاحب مددگار مال ضلع نلگنڈہ	"	عہ ر	"
جناب احمد خاں صاحب ہڈکوارٹر انسپکٹر پولیس نلگنڈہ	"	عہ ر	"
جناب خان عالم خاں صاحب اسسٹنٹ انجنیر بیدر	"	عہ ر	"
جناب مولوی احمدالدین صاحب رجسٹرار تعلقہ جنتور	"	عہ ر	"

جناب مولوی جمیل احمد ڈسٹرکٹ انجنیر عثمان آباد	دکن	عہ	سکۂ عثمانیہ
جناب مولوی سردار علی خاں صاحب دوم تعلقدار ضلع رائچور	"	عہ	"
جناب مولوی معشوق حسن خاں صاحب بی اے معتمد مالگزاری حیدرآباد	"	عہ	"
جناب مولوی نذیر محمد صاحب ڈرائنگ ماسٹر مدرسۂ صنعت حرفت نظام آباد	"	عمہ	"
جناب مولوی خان محمد یوسف صاحب سول انجنیر محکمۂ تعمیرات حیدرآباد	"	عمہ	"
جناب مولوی محمد شرف الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ "	"	عا	"
جناب نواب فخر جنگ بہادر تعلقدار بھونگیر	"	عمہ	"
جناب مولوی سید شاہ پیران صاحب بی اے مہتمم محبس نظام آباد	"	عہ	"
جناب سید زین الدین صاحب انجنیر شاخ عام آبپاشی بھونگیر	"	عمہ	"

(۲) حضرات ذیل نے کتب مندرجہ بطور عطیہ انجمن کو مرحمت فرمائیں جن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(۱) جناب سید عبدالرزاق صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ نے اپنی تصنیف برکاتِ عثمانیہ المعروف مخزن الادویہ کا ایک نسخہ انجمن کو مرحمت فرمایا۔

(۲) جناب مولوی منشی محمد جان صاحب میر منشی ڈویژن ضلع رائچور نے واقعات مملکت بیجاپور کے ہر سہ حصہ جو مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقدار کی تصنیف ہیں انجمن کو عطا فرمائے۔

(۳) جناب لفٹنٹ کرنل بھولاناتھ نے اپنی نایاب تصنیف علم و عمل طب کا ایک نسخہ انجمن کو روانہ فرمایا۔

(۴) جناب مفتی مولوی انوار الحق صاحب ایم اے ناظم تعلیمات بھوپال نے اپنی مفید تصنیف انتظامِ خانہ داری کے ہر چہار حصہ کی سو سو جلدیں انجمن کو مرحمت فرمائی ہیں۔ صاحب موصوف ہمیشہ کسی نہ کسی طریقہ سے کچھ نہ کچھ امداد ضرور فرماتے رہتے ہیں۔ انجمن صاحب مذکور کی خاص طور پر ممنون ہے۔ فقط

عبد الحق
آنریری سکرٹری

رموز فطرت

کائنات اور اُسکی موجودات کی تشریح و تفصیل بیان کرنا علوم سائنس کا مقصد اولین ہے۔ اور ہر سائنس کے طالب علم کو ابتدا میں انہیں کی ماہیت و حقیقت کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں سائنس کا علم ابھی بہت ہی محدود حالت میں ہے۔ پھر بھی وہ لوگ جو انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں اُس سے بہت کچھ مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن سائنس کا تھوڑا بہت علم تو ہر انسان کے واسطے بطور لازمۂ حیات کے ہے۔ اس لیے کہ ہماری روزانہ زندگی۔ ہمارے اسباب راحت۔ ہمارے ذرائع معیشت۔ ہماری تجارت۔ صنعت و حرفت غرضکہ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو علوم سائنس کے تحت میں نہ آتا ہو اور جسے ان کی اعلےٰ تعلیم کی مدد سے ہم اپنے لیے بہتر اور زیادہ کارآمد نہ بنا سکتے ہوں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان علوم کا نشر عام اُسی وقت ممکن ہے جب وہ ہماری مادری زبان (اردو) میں منتقل ہو کر آجائیں۔ اسی غرض سے ہمارے سب سے بڑے تعلیمی رہبر سر سید احمد خاں مرحوم نے ایک سائنٹفک سوسائٹی بمقام علی گڑھ قائم کی تھی جس نے بعض نہایت قیمتی کتب سائنس شایع کیں۔ اور انجمن ترقی اُردو کے پیش نظر بھی سب سے زیادہ یہی غرض ہے۔ اور بعض علم دوست اصحاب اپنے طور پر بھی اس قسم کے کاموں کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی سرپرستی میں مسٹر محمد مہدی اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ ریاست مذکور نے **رموز فطرت** کے نام سے جو کتاب حال ہی میں شایع کی ہے وہ اس سلسلہ میں خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ یہ کتاب مبتدیوں کے لیے علوم سائنس کا نہایت کارآمد دیباچہ ہے جس میں علم طبیعیات۔ علم طبقات الارض۔ جغرافیۂ طبعی اور ثوابت و سیارکے ابتدائی اور بنیادی اصول نہایت آسان فہم عبارت میں بیان کیے گئے ہیں اور سوال و جواب کی صورت میں اُن تمام مسائل کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کیگئی ہے جو عام طور پر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جنکا تشفی بخش جواب ملنے کے بعد بکثرت روزانہ مشاہدات کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمی رفع ہو جاتی اور سائنس کا مزید علم حاصل کرنے کی طرف خاص رغبت ہوتی ہے۔ کتاب کو زیادہ کارآمد بنانے کے لیے اُن اصطلاحات کا ایک فرہنگ بھی شامل کر دیا گیا ہے جو اس کتاب میں مستعمل ہوئی ہیں۔ اور ان باطنی محاسن کے ساتھ اُسکی ظاہری زیب و زینت میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہوا۔ باایں ہمہ قیمت صرف عــہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸۵ جلد ۱۵ — یکم جولائی سنہ ۱۶ ۱۹ء

دوائیون کے تیل نمبر ۲

مذکورہ ذیل دوائیون کے تیل کے دو۔ تین بوند یا آدہ سیر دوا کے فائدہ دیتے ہیں اور کوٹنے پیسنے کی تکلیف سے بچتے ہیں اور آسانی سے پی سکتے ہیں۔

(۱) روغن صندل۔ سوزاک کے لئے نہایت درجہ مفید ہے قیمت فی شیشی ۶ر محصول ۱/ ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ ۔ ۵ر

(۲) اجوائن کا تیل۔ قے بدہضمی کے لئے ایک ہی دوا ہے۔ قیمت فی شیشی ۶ر محصول ۵ر

(۳) روغن سونٹھ۔ یہ بھوک کو بڑہاتا ہے۔ اور ریاح کو خارج کرتا ہے قیمت فی شیشی ۵ر محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ ۵ر

(۴) روغن سونف۔ پیٹ پھولنا اور دست وغیرہ کے لئے مفید ثابت ہوا ہے قیمت فی شیشی پانچ ۵ر۔ محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ ۔ ۵ر

(۵) روغن دال چینی۔ یہ دال چینی کے ملائم چھلکون سے بنا ہے اور یہ چیز نہایت خوشبودار ہے قیمت فی شیشی ۶ر محصول ایک سے چار تک ۔ ۵ر

(۶) روغن لونگ۔ متلی اور ریاح کو دفع کرتا ہے اور درد شکم و بدہضمی کو مفید ہے۔ قیمت فی شیشی چار آنہ محصول ۔ ۵ر

(۷) روغن لیمو۔ ہرے گویا ابھی درخت سے ٹوٹے ہوے لیمو کا خوشبو دیتا ہے قیمت فی شیشی آٹھ آنہ محصول ۔ ۵ر

(۸) روغن پیپرمنٹ۔ پیٹ کے درد بدہضمی اور ریاح کے خارج کرنے میں یہ ایک بہت مشہور دوا ہے قیمت فی شیشی ۱۰ر۔ محصول ۔ ۵ر

(۹) روغن الائچی۔ متلی اور ہچکی کو بند کرتی ہے اور بھوک بڑہاتی ہے قیمت ۶ر محصول ۵ر

ڈاکٹر ایس کے برمن تاراچند دت نمبر ۵ و ۶ اسٹریٹ کلکتہ

الناظر

نمبر ۸۵ جلد ۱۵ ———— یکم جولائی سنہ ۱۹۱۶ء

کیمیا کا ارتقا

مندرجہ ذیل مضمون ہمارے کرم فرما مسٹر نورالحسن بی اے مہتمم مدارس ضلع بیر کا لکھا ہوا ہے جو مدرسہ فوقانیہ شرقیہ اورنگ آباد دکن کے سلسلۂ لکچرز میں پڑھا گیا تھا۔ مدرسۂ مذکور کی بنیاد ہمارے رفیق شفیق مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے تقریباً ڈیڑھ سال قبل قائم کی تھی اور اس کا افتتاح دولت آصفیہ کے نامور ہوم سکرٹری جناب مسٹر حیدری بی اے کے مبارک ہاتھوں نے کیا تھا جنکی توجہ سے ریاست حیدرآباد کی تمام علمی تحریکات کم و بیش متمتع ہوتی رہتی ہیں۔

اس قسم کے قیمتی لکچروں کا سلسلہ اگر تمام مدارس میں قائم ہو جائے تو حد درجہ مفید ثابت ہوگا اور علم کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں اس طریقہ سے بڑی مدد ملے گی جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ایڈیٹر

مضمون ایسا وسیع ہو کہ بہت بڑے عالم کی ضرورت ہو جو پورے طور سے اسکی تشریح کر سکے
[illegible]

صاحب ایم اے[1] کے اصرار سے مجبور ہو کر اس علمی جلسہ کے روبرو حاضر ہونے کی جرأت کی۔ علمی مضمون ہونے کی وجہ سے عام فہم بنانے میں بڑی دقت پیش آئی ہے۔ حتی الامکان میں نے اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور معزز سامعین سے امید ہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں گے۔

زمانۂ وسطی میں کیمیاگری ایک مشہور و معروف فن تھا۔ مغربی اور مشرقی ممالک یکساں طور پر اسکے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ کیمیا کا حصول دونوں کے پیش نظر تھا۔ حصول کے ذرائع اگرچہ کچھ مختلف تھے لیکن ہر جگہ رواج پا گئے تھے۔ اس لحاظ سے جو تاریخ میں بیان کروں گا وہ مشرقی ممالک پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔

مادی اشیا کے تغیرات اور تبدلات کے علم کو کیمیا کہتے ہیں۔ اس کا ماخذ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پیالیاں، کٹوریاں، یا ایسے ظروف جن کو کیمیاگر اپنے تجربوں میں استعمال کرتے تھے۔ اہل عرب کے زمانۂ عروج میں اپنی تحقیقات سے دیگر علوم کی طرح اس کو بھی اپنا علم بنا لیا اور اس کا نام الکیمیا رکھ دیا۔ الکیمیا ایک فن تھا جس کا مقصد ایک خاص شئے کا حصول تھا۔ اس شے کو عرفِ عام میں کیمیا کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے بہت سے نام ہیں۔ منجملہ ان کے فلاسوفرز سٹون (یعنی حکما کا پتھر) مشہور ہے۔ اس شے کا خاصہ یہ قرار دیا گیا ہو کہ اس کے ذریعہ سے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یعنی کیمیاگروں کا مقصد یہ تھا کہ ایسی شے حاصل کریں جس کے ذریعہ سے سونا بنا سکیں۔ برخلاف اس کے کیمیاء جدید ایک علم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مادی اشیا کے تغیرات کا علم حاصل ہو۔

میں اپنے مضمون میں اس پر بحث کروں گا کہ الکیمیا کی حقیقت بحیثیت ایک فن کے کیا تھی۔ اور آخر میں مجملاً بیان کرونگا کہ ترقی یافتہ حالت میں بحیثیت ایک علم کے اس کی کیا صورت ہے۔

مادی اشیا کے تغیرات تو اُسی وقت سے ظہور پذیر ہونے لگے جب دنیا پیدا ہوئی اور اس علم کی بنیاد اُسی وقت سے پڑی جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے۔ لیکن تاریخ کے رُو سے باقاعدہ جد و جہد اہل یونان نے شروع کی۔ حکمائے یونان نے جو تقریباً کل علوم کے اُستادِ اوّل مانے جاتے ہیں،

---

[1] ملا صاحب مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ایڈیٹر

اس میں بھی ایسے انکشافات کیے جو زمانۂ حال کی تحقیقات سے مسلم ثابت ہوئے ہیں۔

جو تغیرات آسمان و زمین پر روزمرہ واقع ہوتے رہتے ہیں اُن کے مشاہدہ سے ازمنۂ قدیم میں لوگوں کے دلوں میں ضرور یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ آیا ان تغیرات کی کوئی حد بھی ہے۔ پیشہ ورں دستکاریوں میں خود بہت سے تغیرات پیدا کر لیتے تھے۔ مثلاً مختلف قسم کے کھانے پکانا، رنگ بنانا اور ایسی چیزیں تیار کرنا جن کی بُو اور ذائقہ معمولی چیزوں سے مختلف تھا۔ ان پیشوں سے ان کو بہت سے تغیرات کی کیفیت معلوم ہوئی۔ اب ان کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ کیا ہر چیز دوسری چیز میں تبدیل ہو سکتی ہے یا چیزوں کی مختلف جماعتیں ہیں کہ ایک جماعت کی چیزیں تو آپس میں تبدیل ہو سکتی ہیں مگر دوسری جماعت کی چیزوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ یا یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ ہر مادہ کئی مختلف چیزوں سے بنا ہے یا یہ کہ کُل مادی اشیا کی بناء ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

حکماء یونان نے اپنے مشاہدات پر غور و خوض کر کے مادّہ کے تغیرات کا ایک نظریہ قائم کیا اور یہ نظریہ حکماء حال کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ یہ حکما حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے چار پانسو برس پیشتر زندہ تھے۔ اور کہتے تھے کہ مادّہ کی اصل جواہرِ مفردہ ہیں یعنی ایسے ذرات جو ناقابلِ تقسیم ہیں۔ انکو انگریزی میں ایٹم کہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جواہر مفردہ کے قد و قامت، شکل، حالت اور حرکت میں جو اختلاف ہے وہی چیزوں کے خواص کے اختلاف کی وجہ ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ چیزوں کے خواص جو مختلف ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں کہ ان کے جواہر کے قد، شکل اور حرکت میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تمام چیزیں ناقابلِ تبدیل، ناقابلِ تقسیم اور غیر فانی ذرّات سے مل کر بنی ہیں۔ جن کو جواہر کہتے ہیں۔ جواہر مفردہ کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے نہ تو کوئی جوہر ضائع کیا جا سکتا ہے نہ کوئی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور جب کبھی کوئی چیز غائب ہو جاتی ہے تو مادّہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ جواہر مفردہ کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر جواہر مفردہ غیر فانی نہ ہوتے تو دنیا تو لاکھوں کروڑوں برس سے قائم ہے اس عرصۂ دراز میں تمام چیزوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

ٹھوس اجسام کی نسبت ان حکما کا خیال تھا کہ ان میں بے شمار جواہر مفردہ پاس پاس

ملے ہوئے ہیں۔ مائعات میں جواہرِ مفردہ کی مقدار کم ہوا اور کم دبے ہوئے ہیں۔ گیس میں جواہرِ مفردہ کی مقدار بہت کم ہے اور بہت آسانی سے حرکت کر سکتے ہیں۔

اس نظریہ پر بہت سے اعتراض وارد ہوئے۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ یہ جواہر دکھائی کیوں نہیں دیتے۔ اس کا جواب اُنھوں نے یہ دیا کہ گرمی، سردی، بُو، ہوا بھی تو نہیں دکھائی دیتی۔ برسات میں کپڑے نم ہو جاتے ہیں، لیکن پانی کے ذرّے داخل ہوتے ہوئے نہیں دکھائی دیتے۔ پتھر کا فرش چند سالوں میں گھس جاتا ہے لیکن پتھر کے ذرّے گھستے ہوئے نہیں دکھائی دیتے۔ دراصل یہ جواہرِ مفردہ اس قدر باریک ہیں کہ قوی سے قوی خُردبین سے بھی نہیں دکھائی دے سکتے۔

ایک اور اعتراض اِن جواہر کی حرکت پر تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک جسم کے ذرات متحرک ہوں اور جسم خود ساکن ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر مویشی کے ریوڑ کو دیکھو ایک دھبا سا دکھائی دے گا۔ اگرچہ گائے بیل گلہ میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں لیکن ہم کو پورا گلہ ساکن معلوم ہوتا ہے۔ یا گھڑی کو دیکھو۔ اس کا ہر پُرزہ متحرک ہے لیکن گھڑی خود ساکن ہے۔

حکماءِ یونان کا نظریۂ جواہر قدرتی واقعات سے اخذ کیا گیا تھا وہ نظری علوم Theoretical Science کے اثبات میں مشاہدات کو پیش کرتے تھے اور منطق کے ذریعہ سے ضعیف دلائل کو باطل کرتے تھے۔

اس نظریہ کے ذریعہ سے مادی دنیا کی ایک تصویر پیش کرنے کے علاوہ اُنھوں نے بعض کیمیاوی تغیرات کی تشریح بھی کی تھی لیکن تجربہ کے آلات اور ذرائع اُس زمانہ میں اس قدر نایاب تھے کہ دقیق تغیرات پر اس نظریہ کو چسپاں نہیں کر سکتے تھے۔ اب دو ہزار سال کی مدت کے بعد حکماءِ مغرب نے جدید آلات کے ذریعہ سے کیمیاوی تغیرات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ ان آلات میں سے اُنھیں سب سے زیادہ مدد ترازو سے ملی۔ کیمیاوی ترازوئیں اس قدر نازک ہوتی ہیں کہ ان میں ایک چاول کا سوال اور ہزارواں حصہ پوری صحت کے ساتھ تولا جا سکتا ہے۔ ان کی مدد سے کسی تجربہ میں جتنی اشیا استعمال ہوئیں اُن کو تولا اور جو نئی چیزیں بنیں اُن کا وزن کیا۔ اس طرح سے حکماءِ مغرب نے ہر کیمیاوی تغیر پر نظریۂ جواہرِ مفردہ کو چسپاں کر کے دیکھا اور پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے۔ کیمیاوی تغیرات میں جن چیزوں پر

اثر پڑتا ہے ان کی صحیح صحیح مقدار معلوم کیے بغیر نظریۂ ماہر مفروضہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ ان تغیرات کا ایک سرسری خاکہ کھینچ دے۔

علمی نظریہ کی تعریف ہے اپنے خیالات کو قدرتی واقعات پر منطبق کر دینا۔ جب تک ہم سرسری اور اوپری طور سے مشاہدہ کریں گے ہمارے خیالات بھی اوپری ہوں گے۔ حکماء یونان کے کمال کی یہ دلیل ہے کہ ان کے مشاہدات جس حد تک تھے صحیح تھے اور جو نظریہ اُنھوں نے قائم کیا اس کی بناء واقعات کے کمزور پہلو پر نہیں تھی بلکہ نہایت اہم پہلو پر رکھی گئی تھی۔

نظریۂ الکیمیا

یہاں تک تو میں نے حکماء یونان کی جد و جہد کے نتائج کا خلاصہ بیان کیا۔ اب علماء الکیمیا کی کوشش کا مختصر حال بیان کرتا ہوں جن کو میں نے پہلے کیمیا گر کہا ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے علمی نظریہ کی بالکل اُلٹی تعریف کی۔ علماء کیمیا کے نزدیک علمی نظریہ کی تعریف تھی اپنے خیالات کو قدرتی واقعات پر منطبق کرنا۔ برخلاف اس کے کیمیا گروں کی تعریف تھی قدرتی واقعات کو اپنے خیالات پر منطبق کرنا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ علماء کیمیا کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مادی اشیا کے ملنے پر تبدیلیاں کیونکر واقع ہوتی ہیں اور کیمیا گروں کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ہر شے میں غیر تربیت یافتہ خواص پوشیدہ ہیں اور اُس کے خواص کو تربیت دیکر کمال کو پہنچایا جا سکتا ہے۔

اپنے اِرد گرد کی چیزوں کو دیکھ کر کیمیا گروں کے دل پر جانوروں اور پودوں کے بڑھنے اور شکل بدلنے کا بہت اثر پڑا۔ انھوں نے نتیجہ نکالا کہ معدنیات اور دھاتیں بھی بڑھتی، شکل بدلتی اور تربیت پاتی ہیں۔ قوانین قدرت چونکہ ایک ہیں تمام اختلافات میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے۔ جب اناج کا دانہ مٹی میں ڈالا جاتا ہے تو وہ مرجاتا ہے لیکن اس کی موت ہی نئی زندگی کی طرف پہلا قدم ہے۔ مُردہ بیج مل کر زندہ پودہ بن جاتا ہے۔ یہی حال دوسری چیزوں کا بھی ہونا چاہیے۔ دھاتیں جب مٹی میں مل جاتی ہیں تو گو وہ معلوم ہوتی ہیں [illegible] لیکن درحقیقت وہ بڑھ رہی ہیں اور مل کر زیادہ کامل ہو رہی ہیں۔

بیج کا کامل پودا بنجاتا ہے۔ اور سونا کامل دھات ہے اس سبب معمولی دھاتیں سونا بننے کی کوشش کررہی ہیں۔ پودے بیجوں کی وجہ سے قائم ہیں اسی طرح دھاتوں کا بھی بیج ہونا چاہیے جو انکی اصل ہو۔ اگر ہم بیج علیحدہ کریں اور اُس کے موافق حالات میں اُس کی پرورش کریں تو وہ بڑھکر کامل دھات ہوجائے گا۔

یہ نتیجہ تو پودوں کے بڑھنے سے نکالا۔ اب ہم فرض کرسکتے ہیں کہ جانوروں اور انسان کے بڑھنے سے بھی ایسا ہی نتیجہ نکالا ہوگا۔ آدمی اور جانوروں کی زندگی بھی اسی طرح۔ قائم ہتی ہو جس طرح پودوں کی زندگی تمام جان دار ہستیاں بیج سے پیدا ہوتی ہیں اور بیج نر اور مادہ کے میل سے بارآور ہوتا ہو۔ دھاتوں میں بھی دو جنسیں ہونی چاہییں۔ نئی دھاتوں کی پیدائش کے واسطے ان دونوں کا ملنا ضرور ہو۔ پیشتر اسکے کہ کامل دھات پیدا ہو نر اور مادہ دھاتیں ملنی چاہییں۔

آگے چل کر ان کی دلیل اس طرح ہے کہ ناقص سے کامل بننا آسان نہیں ہو۔ نیکی کے نسبت بدی کرنا آسان ہو۔ آدمی کو نیکی قدرتی طور پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے لیے خدا تعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہو۔ پس ادنیٰ درجہ کی دھات کو اعلیٰ درجہ کی دھات میں تبدیل کرنا اور ناقص دھات کا کامل سونا بنانا آسان نہیں ہو۔ قدرت اس عمل کو آہستہ آہستہ انجام دیتی ہو۔ اگر معمولی دھاتوں کو کامل بنانا ہو تو صرف آدمی کی مدد سے ہی بن سکتی ہیں۔

کیمیا گروں کے دلائل کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ ان دلائل کی بنیاد قوانین قدرت کے فرضی علم پر رکھی ہو۔ ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو قوانین قدرت کی سادگی پر اور ان قوانین کے عام پر کامل اطمینان تھا۔

کیمیا گروں کو جب یہ یقین ہوگیا کہ قوانین قدرت سادہ ہیں اور تمام قدرتی واقعات ایک ہی طرز پر ظہور میں آتے ہیں اور یہ کہ وہ طرز و طریقہ پودوں اور جانوروں کے بڑھنے میں ظاہر ہو۔ تو انھوں نے مشاہدوں اور تجربوں سے اول تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قدرتی واقعات کی نسبت

ان کا خیال درست ہو اور دوئم اس آلہ کی دریافت اور حاصل کرنے کی کوشش کی جسکے ذریعے قدرت اپنی تبدیلیاں عمل میں لاکر اپنے کاموں کو مکمل کرتی ہو۔ اس آلہ کے حصول سے وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ ہر دھات کو سونا بنالیں۔ اور تمام بیماریوں کو اچھا کریں۔

کیمیا گروں کی تحقیقات کا مرکز ایک ایسی چیز تھی جس کی کبھی تعریف نہ ہو سکی اور نہ وہ تعریف کے قابل ہو۔ اس عجیب شے میں زندگی کی تمام قوتیں فرض کرلی گئی تھیں۔ جتنے خواص ان میں فرض کیے گئے تھے اُتنے ہی اُس کے نام رکھے گئے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیمیا گروں کی تحقیقات کا مقصد ایک ایسی چیز تھی جو تمام اشیا کی روح یا سَت ہو۔ تو بالکل درست ہوگا۔ اس مفروضہ روح کی شکل جسمانی تھی۔ زندگی روحانی تھی اور خواص درمیانی۔

ان کا قول تھا کہ کوئی شخص اس روح کو ایک ہی چیز سے نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ یہ خدا کی صفت ہے کہ ایک ہی شے سے دوسری شے پیدا کردے۔ یہ روح افزائش کے قدرتی قوانین کے مطابق دو چیزوں سے مل کر پیدا ہو سکتی ہو۔ اُنھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم سونے کو پیدا یا خلق کر سکتے ہیں۔ صرف یہ کہتے تھے کہ دوسری چیزوں سے سونا بنا سکتے ہیں۔

یہ روح صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ قدرت جو طریقہ ناقص بیج سے کامل پودا بنانے میں اختیار کرتی ہو اس کا اتباع کیا جائے یعنی بیج کو دریافت کرکے علٰحدہ کیا جائے اور اس کو ان حالات میں رکھا جائے جو اس کے بڑھنے کے موافق ہوں۔ کیمیا گر کہتے تھے کہ دھاتوں کا بیج ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ فرض کرنا کہ اُن کا بیج نہیں ہوتا ایک مہمل سی بات ہو۔ پودوں کو معدنیات پر کیا ترجیح ہے کہ خدا تعالیٰ ایک کو بیج عطا کرے اور دوسرے کو اس سے محروم رکھے۔

اب جبکہ دھاتوں کا بیج ہونا ثابت ہو تو ظاہر ہو کہ اس کو کسی طرح اُگانا چاہیے۔ کسی پودے کا بیج جب مٹی میں دبایا جاتا ہے تو اُگ آتا ہو۔ پس دھاتوں کے بیج کو بار ور کرنے کے واسطے پہلے اسکا مناسخ کرنا ضرور ہے۔

اگرچہ کیمیا گروں کا یہ خیال تھا کہ ہر چیز دوسری چیزوں پر اثر کرتی ہو اور ان سے اثر پذیر ہوتی ہو

لیکن وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر نئے دھاتی چیزوں کے خواص ملتے جلتے ہوں تو سب سے زیادہ شیمیائی گا
اسی بنا پر اکثر کیمیا گروں کا عقیدہ تھا کہ دھاتوں کا پیچ دھاتوں ہی پر عمل کرنے سے حاصل ہو گا
نہ کہ نباتی یا حیوانی اجزا کے عمل سے۔

الکیمیا کے عناصر اور اصول

کیمیا گروں کو یقین تھا کہ دھاتوں کے متعلق قدرت کا منشا یہ ہے کہ وہ سونا بن جائیں کیونکہ سونا کامل ترین دھات سمجھا جاتا ہے اور قدرت کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ہر شے کو کمال پر پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ انھوں نے دریافت کر لیا تھا کہ دھاتیں تیزاب کے اثر سے گل جاتی ہیں اور ان پہ زنگ لگ جاتا ہے۔ صرف سونا تیزاب کے اثر سے محفوظ تھا اس پر نہ تو آگ کا اثر ہوتا تھا اور نہ گندھک کا۔ حالانکہ گندھک کے اثر سے پارہ جیسی سیال چیز سیاہ رنگ کا ٹھوس ڈلا بن جاتی ہے۔ پس الکیمیا کے رُو سے سونا ہر دھات کی نسبت زیادہ کامل تھا۔

اب چونکہ سونا کامل ترین دھات ثابت ہو گیا تو کیمیا گروں نے نتیجہ نکالا کہ قدرت ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر رہی ہے اور یہ عمل آہستہ آہستہ زمین کے اندر واقع ہو رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سونے اور دوسری دھاتوں میں سوائے اسکے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ سونا زیادہ پختہ ہے اور دوسری دھاتیں خام ہیں اور ان میں کثافتیں ملی ہوئی ہیں۔ اگر کسی طریقہ سے یہ کثافتیں دور کر دی جائیں تو کل دھاتیں سونا اور چاندی بن جائیں گی۔

انھوں نے کان کنی کے چند واقعات کو اپنے خیالات کا مؤید بنا لیا۔ اکثر سیسہ اور رانگ یعنی قلعی کی کانوں سے چاندی برآمد ہوئی ہے اور چاندی کی کانوں سے سونے کی ڈلیاں ملی ہیں اور بعض سونے کی کانوں میں جو زمانہ دراز پہلے کھود دی گئی تھیں دوبارہ تلاش کرنے پر سونا پایا گیا ہے۔ ان واقعات نے ان کے تخیل کو اور مدد دی اور وہ کہنے لگے کہ جو کچھ قدرت زمین کے اندر کر رہی ہے آدمی اپنے کارخانہ میں کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔

کیمیا گروں نے دھاتوں کی تبدیلی کا نظریہ چونکہ قوانین قدرت سے تنباط کیا تھا اس وجہ سے

یہ خیال اُن کے دل میں ایسا راسخ ہوگیا تھا کہ مذہبی عقیدے کا ایک جزو بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ اگر یہ خیال باطل ثابت کر دیا جاتا تو وہ یقیناً خدا کے وجود سے انکار کر دیتے۔

ان کے نزدیک دھاتیں چونکہ جان دار چیزیں تھیں ادنیٰ دھات سے اعلیٰ دھات بنانے کے واسطے وہی عمل کرنا چاہیے جو حیوانات اور نباتات کی تربیت میں برتا جاتا ہے، پودے اور جانور چونکہ رفتہ رفتہ کمال کے درجے کو پہنچتے ہیں۔ دھاتیں بھی ایک دم سے سونا نہیں بن سکتیں، بلکہ رفتہ رفتہ بنیں گی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا درجۂ کمال معراجِ روحانی ہے۔ آدمی روحانی ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے تو جسمانی تعلقات سے کشیدگی اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح دھاتوں کی روح اُسی وقت پاک اور تبدیلی کا اثر ڈالنے کے قابل ہو سکتی ہے جب ان کا جسم ہلاک کیا جائے۔ پس سب سے پہلے ہمیں دھاتوں کے وہ خواص دُور کرنے چاہییں جو ہمارے حواس کو محسوس ہوتے ہیں۔ تو روح حاصل ہو جائے گی۔ لیکن روح کے حصول سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ صرف یہ ہو سکے گا کہ اسکے ذریعہ سے ہم ایک دھات کو اس کی مانند دوسری دھات میں تبدیل کرلیں۔ سب سے اہم تبدیلی کے لیے جس سے کوئی دھات سونے میں بدل سکے ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہیے۔ اسی غرض کے لیے روح بھی علحدہ کر دینی چاہیے اور اُس کا جوہر یا مغز حاصل کر لینا چاہیے۔

دھاتوں کی طرح دوسری چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی ہر چیز میں تین قسم کے خواص ہوتے ہیں ایک وہ جو اسی چیز کی مخصوص جسمانی تشکل کا باعث ہیں انکو **اصول** کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو چند چیزوں میں عام ہیں ان کو **عناصر** کہتے ہیں اور اصول اور عناصر کی تہوں میں چھپی ہوئی ایک تیسری شے ہے جو کل چیزوں میں عام ہے اُس کو جوہر یا مغز کہتے ہیں۔ اسی کے حصول کے لیے کیمیاگر کوشاں تھے۔

اب میں عناصر اور اصول کے متعلق علماء الکیمیا کے خیالات بیان کرتا ہوں ان کے خیالات کی ترجمانی کرنا اور سمجھنا بہت مشکل ہے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ پیش کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں جو

عام خیال ہے وہ یہ ہے کہ عناصر چار ہیں - ہوا، پانی، خاک، اور آگ - یہی خیال علماء الکیمیا کا بھی تھا مگر عنصر کی تعریف میں ہم میں اور اُن میں اختلاف ہے - ہم عنصر کو مادّی چیز سمجھتے ہیں اور وہ عنصر کو خاصیت مانتے ہیں - ان علماء کی بہت بڑی غلطی یہ تھی کہ اُنھوں نے علیحدہ نام تجویز نہیں کیے - اسی وجہ سے گڑبڑ واقع ہو گئی - ایک ہی لفظ جو خاصیت کے معنی میں استعمال ہوتا تھا ایک مادّی چیز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا یا ہونے لگا -

علماء الکیمیا کے نزدیک اصول تین تھے - نمک، گندھک، اور پارہ - ان اصول کا منبع عناصر تھے جو چار تھے - خاک، آگ، پانی، اور ہوا -

خاک کی نسبت ان کا خیال تھا کہ اس میں باقی تین عناصر خاص کر آگ پوشیدہ ہے - بظاہر یہ عنصر نظر آتا ہے اور منجمد ہے لیکن اندرونی طور سے قابل تبخیر ہے - اور نظر نہیں آتا -

پانی کے متعلق کہتے تھے کہ بظاہر قابلِ تبخیر ہے لیکن اندرونی طور سے منجمد اور سرد ہے - اسکی نفاست کے تین درجے ہیں - نفیس ترین پانی سے عالم بالا کی تخلیق ہوئی ہے - نفیس تر پانی سے ہوا بنی ہے اور محض پانی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے -

ہوا کا عنصر قابل تبخیر ہے لیکن منجمد بنایا جا سکتا ہے -

آگ کا عنصر تمام عناصر سے پاک اور شریف ہے اندرونی طور سے منجمد، گرم اور خشک ہے اور بیرونی طور سے نظر آتا ہے - یہ تمام عناصر سے سُست ہے - ٹھیری ہوئی گاڑی کے مانند ہے کہ کوئی کھینچتا ہے تو حرکت کرتی ہے ورنہ ساکن رہتی ہے -

تین اصول کے متعلق ان حکما کا خیال تھا کہ یہ عناصر سے نکلے ہیں - آگ اور ہوا کے عمل سے گندھک کا اصل بنا - ہوا اور پانی کے عمل سے پارہ کا اصل بنا - پانی اور خاک کے عمل سے نمک کا - ان اصولوں کو ضروری خیال کرتے تھے کیونکہ یہ دھاتوں کے نزدیک ترین جزو ہیں - دھاتوں کے بعید ترین اجزا عناصر ہیں لیکن سوائے خدا کے ان سے کوئی آدمی کچھ نہیں بنا سکتا - اور خدا نے بھی ان سے صرف اصول بنائے ہیں - وہ کہتے تھے کہ عناصر کو خالص حالت میں حاصل کرنا ناممکن ہے -

لیکن کیمیا گر کے ہاتھ میں تین اصول ہیں انھیں کی مدد سے کامیاب ہوسکتا ہے۔

یہ خیالات بالکل معمہ ہیں اور ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اپنے خیالات کو معمہ کی صورت میں بیان کرنے میں ان کا ایک مقصد بھی تھا۔ وہ یہ کہ دوسرے لوگ نہ سمجھ سکیں صرف ماہرین فائدہ اُٹھا سکیں۔ علماء حال نے جو تشریح کی ہے اُس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کیمیا گر عناصر کو مادی چیز نہیں مانتے تھے بلکہ خواص سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جتنے مائعات ہیں ان میں ایک خاصیت عام ہے جس کو پانی کہتے ہیں۔ اسی طرح جتنی چیزیں جلتی ہیں ان میں ایک خاصیت عام ہے جسے آگ کہتے ہیں۔

اکثر کیمیا گروں کا خیال تھا کہ عناصر کے ملنے سے بیج پیدا ہوتے ہیں اور اصول ان بیجوں کی پرورش کرکے کامل کردیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اشیاء چند جماعتوں میں منقسم ہیں اور ہر جماعت کا بیج الگ ہوتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ تمام چیزیں ایک ہی بیج سے بنی ہیں اور اس بیج کی پیداوار کی خاصیت اُن حالات پر منحصر ہے جن میں اس کی پرورش ہو۔ ایک مثال سے انھوں نے اس خیال کو واضح کیا تھا۔ فرض کیجیے کہ میز کے بیچ میں پانی کا گلاس رکھا ہوا ہے اور کناروں پر نمک، شکر، نیلا تھوتھا اور دوسری رنگین چیزوں کے سفوف رکھے ہوئے ہیں۔ اب پانی کا گلاس اُلٹ دیا جائے تو ہر طرف بہنے لگے گا۔ اور جس سفوف میں سے ہو کر گذرے گا ویسا ہی رنگ اور خاصیت اختیار کرے گا۔ یہی حال بیج کا ہے۔ چاروں عناصر بیج پیدا کرکے زمین کے اندرونی جانب روانہ کردیتے ہیں۔ مرکز میں پہنچ کر یہ بیج ہضم ہو جاتا ہے اور وہاں سے اُگنا شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ زمین کی سطح پر آ پہنچتا ہے۔ اب اس کو جیسے عناصر اور اصول یہاں ملیں گے ویسی ہی چیز اُس سے پیدا ہو جائے گی۔

علماء الکیمیا کے نزدیک تمام مادی چیزیں چار بڑی جماعتوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔ یعنی گرم، سرد، خشک، اور تر اور یہ خواص چار عناصر میں پوشیدہ ہیں۔ ہر چیز ان چار عناصر سے بنی ہے۔ لیکن براہ راست نہیں بلکہ تین اصول کے ذریعہ سے جن کے نام پہلے بیان ہو چکے ہیں یعنی پارہ،

گندھک اور نمک - یہ اصول نہ تو مادّی چیز سمجھے جاتے تھے اور نہ کسی خاص مادّہ کی خاصیت بلکہ چیزوں کی بڑی بڑی جماعتوں کے خواص سمجھے جاتے تھے۔

مادّی اشیا کی ابتدائی تقسیم کو علماء الکیمیا اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ چند اشیا میں گندھک کا اصل زیادہ ہے چند میں پارہ کا اصل زیادہ ہے اور باقی میں نمک کا اصل زیادہ ہے۔ اور اشیا کی عام تقسیم کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ اس جماعت کی اشیا خشک ہیں، دوسری جماعت کی تر، تیسری جماعت کی سرد اور چوتھی جماعت کی گرم - خشک اشیا میں خاک کا عنصر غالب ہے- تر میں پانی کا عنصر غالب ہے۔ سرد میں ہوا کا عنصر اور گرم میں آگ کا عنصر۔

اس ابتدائی اور عام تقسیم کے علاوہ علماء الکیمیا کا خیال تھا کہ تمام اشیا میں ایک چیز عام ہے اور ہر شے میں اس عام چیز کے خواص کم و بیش ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کو جوہر کہتے ہیں - اور کیمیا گروں کا مقصد یہ تھا کہ جوہر حاصل کیا جائے یہ نہ صرف تمام مادّی چیزوں کی ملاوٹ سے پاک ہو بلکہ چاروں عناصر اور تینوں اصول سے بھی پاک ہو۔ اس حالت میں جوہر اپنی کامل ترین صورت میں ہوگا اور اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی تبدیلی ممکن ہو جائے گی۔

اس جوہر کے حصول میں نہایت احتیاط برتی جاتی تھی - امیدواری اور کارآموزی کی دراز مدتیں بڑے صبر کے ساتھ بسر کرنی پڑتی تھیں۔ کیونکہ اگر کسی ناواقف شخص کے ہاتھ لگ جائے تو جہان کو تہ و بالا کر ڈالے۔ اس جوہر سے ماہر ہونے کے واسطے بیشمار تجارب کرنے چاہییں اور مختلف اشیا کے باہمی میل سے جو اثرات پیدا ہوں ان کو غور سے مشاہدہ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اُن حالات کا بھی علم ہونا چاہیے جن میں قدرت اپنی عجیب غریب تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔

اس جوہر کامل کی تلاش میں مادی اشیا کے خواص اور ترکیب کے متعلق بے انتہا تجربے ہوئے۔ تجربے کیمیاء جدید کی بنیاد ہیں، اور ان ہی کی بدولت ستر اور اسّی کے درمیان یعنی ۷۵ عناصر دریافت ہو چکے ہیں۔ ان عناصر میں سے کوئی عنصر دو یا زیادہ مادّوں سے مل کر نہیں بنا اور نہ کوئی عنصر دو یا زیادہ مادّوں میں تقسیم ہو سکا ہے۔ یعنی عناصر میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی سوائے

اس لئے کہ ایک عنصر دوسرے عنصر سے مل کر ایک مرکب بن جائے یا ایک عنصر کسی مرکب سے مل کر ایک علیحدہ مرکب بن جائے۔

یہ ممکن ہے کہ آئندہ زمانہ میں یہ سب عناصر مرکب ثابت ہوں اور بعض علماء کیمیا کا خیال ہے کہ یہ سب عناصر ایک عنصرِ واحد سے بنے ہیں۔ اگر زمانہ آئندہ میں یہ ثابت ہو جائے اور عنصرِ واحد کا پتہ لگ جائے تو ہم کو کیمیا گروں کا مقصد حاصل ہو جائے گا کیونکہ وہ بھی ایک جوہر کامل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

الکیمیا کے تجارب

کیمیاے جدید کے علما اور حامیوں کو اس بات پر ناز ہے کہ جو کلیہ وہ قائم کرتے ہیں جو نظریہ وہ پیش کرتے ہیں اُس کے ثبوت میں تجارب ہیں جن سے وہ نظریہ یا کلیہ مستنبط ہوا ہے۔ کیمیا گروں کو بھی اسی پر ناز تھا وہ بھی ثبوت میں تجربہ پیش کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کیمیا گر موجودات پر سرسری نظر ڈال کر ایک کلیہ قائم کر لیتے ہیں اور اہل کیمیاء جدید بہت تحقیق سے کام لیتے ہیں۔ کلیہ قائم کرنے سے پیشتر مختلف تجربے کرتے ہیں اور جب ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے تو کلیہ قائم کرتے ہیں۔

اب میں علماء الکیمیا کے تجربوں کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ تجربہ کے ساتھ ساتھ ان کا نتیجہ اخذ کرنے کا طریقہ بیان کروں گا پھر کیمیاء جدید کی رُو سے ان کی تشریح کروں گا۔

تجربہ۔ شیشہ کے کھلے برتن میں پانی جوش کیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے اور برتن میں سفید رنگ کا مٹی جیسا ایک سفوف باقی رہ جاتا ہے۔

الکیمیا کا نتیجہ۔ پانی ہوا اور مٹی میں تبدیل ہو گیا یعنی ایک عنصر دوسرے عنصر میں بدل گیا۔
کیمیا کی تشریح۔ ہر قسم کے پانی میں کچھ نہ کچھ چیز گھلی ہوئی رہتی ہے جب پانی کے بخارات بن جاتے ہیں تو یہ چیز برتن میں باقی رہ جاتی ہے۔ علاوہ اس کے پانی کا اثر شیشہ پر بھی ہوتا ہے۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کیمیا گروں کا عقیدہ تھا کہ چار عناصر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ

عناصر آپس میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ہوا، خاک اور پانی کے متعلق تو ایک تجربہ بیان ہو چکا اب آگ کی تبدیلی باقی رہ گئی اس کے لیے بھی ثبوت موجود ہے۔

تجربہ۔ پانی کے برتن میں شیشہ کا گلاس پانی سے بھر کر اوندھا دیا جاتا ہے پھر لوہے کو سرخ کر کے پانی میں ٹھنڈا کرتے ہیں تو گلاس کا پانی کچھ نیچے اُتر آتا ہے۔ اب گلاس میں جلتی ہوئی شمع لے جاتے ہیں تو گلاس میں ایک شعلہ نظر آتا ہے۔

الکیمیا کا نتیجہ۔ پانی آگ میں تبدیل ہو گیا۔

کیمیا کی تشریح۔ پانی مرکب ہے دو گیسوں سے ایک اوکسیجن دوسرے ہیڈروجن (انگریزی لفظ ہائڈروجن ہے میں نے ثقالت دُور کرنے کے واسطے (ر) کو حذف کر دیا ہے) گرم لوہا جب پانی میں ڈالا جاتا ہے تو پانی کی اوکسیجن لوہے کے ساتھ مل جاتی ہے اور ہیڈروجن الگ ہو کر گلاس میں جمع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلاس کا پانی نیچے اُتر آیا۔ ہیڈروجن کی خاصیت ہے جب اسکے قریب روشنی لائی جاتی ہے تو بھڑک اُٹھتی ہے اس وجہ سے شعلہ پیدا ہوا۔

تجربہ۔ شیشہ کو پگھلا کر تھوڑی دیر تک آگ پر گرم کرتے ہیں تو مٹیلے رنگ کی ٹھوس ڈلی بن جاتی ہے پھر اُس ڈلی کو گیہوں کے دانوں کے ساتھ گرم کیا جاتا ہے تو پھر سیسہ نکل آتا ہے۔

الکیمیا کا نتیجہ۔ سیسہ گرم کرنے سے کشتہ یعنی مردہ ہو گیا پھر گیہوں اور آگ کے اثر سے زندہ ہو گیا۔ یہ ان کے نزدیک ایک معجزہ تھا کہ مردہ زندہ ہو گیا۔

کیمیا کی تشریح۔ سیسہ جب گرم کیا جاتا ہے تو ہوا کی اوکسیجن سے مل کر ایک مرکب بنجاتا ہے جب اس مرکب کو گیہوں کے ساتھ گرم کیا جاتا ہے تو گیہوں اوکسیجن کو جذب کر لیتا ہے اور خالص سیسہ نکل آتا ہے۔ گیہوں کے بجائے کوئلہ بھی استعمال کر سکتے ہیں گیہوں میں بھی کوئلہ موجود ہے۔

تجربہ۔ تیزاب میں تانبے کا ٹکڑا ڈالا جاتا ہے۔ تانبا غائب ہو جاتا ہے اور تیزاب کا رنگ سبز ہو جاتا ہے۔ اب اس عرق میں لوہے کا ٹکڑا ڈالتے ہیں تو لوہا غائب ہو جاتا ہے اور اسکے بجائے تانبا نکل آتا ہے۔ تانبے کے بجائے سونا یا چاندی استعمال کی جائے تو سونا اور چاندی

نکل آئے گی۔

الکیمیا کا نتیجہ - لوہا تانبے میں یا سونے چاندی میں تبدیل ہو گیا۔

کیمیا کی تشریح - تیزاب میں تانبا گھل جاتا ہے جب لوہے کا ٹکڑا ڈالا جاتا ہے تو لوہا گھلنے لگتا ہے اور اس پر تانبے کی تہ چڑھنے لگتی ہے۔ جتنا لوہا گھل گیا اتنا ہی تانبا اس پر چڑھ گیا۔

تجربہ - ایک قسم کی سفید رنگ کی مٹی کوئلہ کے ٹکڑے پر رکھ کر سنار کی پھکنی سے آگ پر پھونکتے ہیں۔ تو چاندی کی سفید ڈلی نکل آتی ہے۔

الکیمیا کا نتیجہ - مٹی سے چاندی بن گئی۔

کیمیا کی تشریح - یہ سفید رنگ کی مٹی چاندی کا مرکب ہے جس میں دو اور عناصر ملے ہوئے ہیں۔ جب کوئلہ پر اس کو گرم کرتے ہیں تو کوئلہ ان دونوں عناصر کو جذب کر لیتا ہے۔ اور چاندی الگ ہو جاتی ہے۔ اگر سونے کا مرکب استعمال کیا جائے تو سونا نکل آئے گا۔

اس قسم کے تجربے دھوکہ باز کیمیا گر عام لوگوں کو دکھا کر کیمیا گری کا قائل بنا لیتے ہیں اور بہت کچھ اینٹھ لیتے ہیں۔

کیمیا گروں نے جوہر کامل کی تلاش میں تجربے کرتے کرتے اپنی عمریں بسر کر دیں۔ اگرچہ جوہر کامل حاصل نہیں ہوا لیکن ان کے تجربوں سے علم و فن کو بہت فائدہ پہنچا۔ بہت سی ایجادیں عمل میں آئیں نئی صنعتیں قائم ہوئیں۔ انھیں کے زمانہ میں بارود ایجاد ہوئی۔ چھاپہ کا فن دریافت ہوا۔ شیشہ پر روغن کرنے کا فن کمال کو پہنچا۔ کاغذ بنانے کی صنعت دریافت ہوئی۔ شیشہ کے آئینے بنائے گئے۔ دھاتوں کی آمیزش سے مرکب دھاتیں دریافت ہوئیں۔ کان کنی کو عروج ہوا اور ان کے علاوہ بہت سی مفید معلومات بہم پہنچیں۔

الکیمیا کو اس آدمی سے مشابہت دے سکتے ہیں جس نے اپنے بیٹوں کو کہا تھا کہ انگور کے باغ میں دولت گڑی ہوئی ہے۔ باپ کے مرنے پر بیٹوں نے تمام باغ کی زمین کھود ڈالی مگر دولت نہ ملی۔ لیکن زمین کھودنے سے انگور کی پیداوار بہت بڑھ گئی [illegible] کیمیا گروں نے سونے کی تلاش میں بہت سی مفید ایجادیں کر ڈالیں اور اس طرح علم و فن کو فائدہ پہنچایا۔

(باقی آئندہ)　　　نور الحسن

غزل

کبھی جو دل کو اُٹھایا قدم اُٹھا نہ سکا
غرض میں کوچۂ جاناں سے اُٹھ کے جا نہ سکا

کہیں نہ مجھ کو تغافل سے اب وہ تنگ کرے
جفا و جور سے تو دل مراد کھا نہ سکا

بنی ہوئی تھی کچھ ایسی ہاں رقیب کی بات
کہ رنگ اپنا میں اُس بزم میں جما نہ سکا

کچھ اس طرح سے بگاڑا اُنھا میں نے اپنا کام
کہ پھر وہ بن نہ سکا اور میں بنا نہ سکا

کشش اُدھر سے بھی کچھ تھی اِدھر سے بھی کچھ تھی
خدنگِ یار کی زد سے میں بچ کے جا نہ سکا

برابر ایک رہا حال ربطِ باہم کا
کہ تم بڑھا نہ سکے اور میں گھٹا نہ سکا

بھر آئے آنکھوں میں بھی تنکِ دل بھی بھر آیا
میں دردِ دل اُسے دل کھول کر سنا نہ سکا

شکستِ دل کی صدا تو پہنچ گئی تجھ تک
اگرچہ میں تری محفل میں بار پا نہ سکا

غمِ جہاں سے ہیں فارغ شکستگانِ فراق
ترے ستائے ہوؤں کو فلک ستا نہ سکا

حریفِ سوزِ دروں سیلِ اشک ہو نہ سکی
لگی وہ آگ کہ دریا جسے بجھا نہ سکا

بہت ہی حوصلہ افزا ہے ایسی مجبوری
تم آپ آ نہ سکے اور میں بلا نہ سکا

جھلک تو داغِ دروں کی جبیں سے پیدا ہے
دل و جگر کو اگرچہ چیر کر دکھا نہ سکا

حجابِ عشق سے کیا دستِ شوق کی چلتی
خدا گواہ ہے میں آنکھ بھی ملا نہ سکا

ترے وصال کا دل میں سرور کیسا تھا
میں جس کو سختیِ ہجراں میں بھی بھلا نہ سکا

میں تیری بزم سے کچھ نامراد بھی نہ پھرا
مقدرِ شوق اگر با مراد آ نہ سکا

یہ شاعری تری وحشت ہے کس غرض کی ہوا
جو ایک شعر بھی تو یار کو سنا نہ سکا

رضا علی وحشت (کلکتہ)

زود پشیماں

{سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الناظر بابت ماہ جون ۱۹۱۶ء}

ایکٹ دوم

سین (۱)[1]

[یوسف اپنے کمرہ میں مطالعہ میں مشغول ہے، اس کے دوست خلیل آتے ہیں]

یوسف۔ تسلیم۔ آپ خوب آگئے۔ میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کہیے آپ نے ڈاکٹر ولیم کا پریسیڈنشل ایڈرس پڑھا۔

خلیل۔ ہاں، وہ تو میں نے پرسوں ہی پڑھ ڈالا تھا۔ اُس کی خوبیاں اندازہ سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ ولیم باتیں دقیق کہے گا، مگر یہ بالکل خیال نہ تھا کہ وہ اس قدر دلنشیں پیرایہ ادا بھی اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض خیالات تو اس نے بالکل وہ ظاہر کیے [illegible] میں آپ کی زبان سے سُن چکا تھا۔

یوسف۔ جی ہاں، آج صبح پروفیسر واچا سے ملا تھا، وہ بھی اس عجیب توارد سے حیران تھے۔

خلیل۔ کیا قیامت ہے کہ ایک خیال آپ کی زبان سے ادا ہو تو کوئی اُس پر اعتنا نہ کرے، لیکن وہی خیال جب یورپ کے کسی فاضل کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو لوگ اُس پر آمنّا وصدّقنا کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

یوسف۔ یہی تو حاکم و محکوم جماعتوں میں فرق ہوتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مُلک کے سپاہی دوسرے ملک کے سپاہیوں کو مغلوب کرلیں، تو وہ اس ملک کے حاکم ہو جاتے ہیں۔ لیکن واقعات تاریخ بتاتے ہیں کہ یہ فتح مندی محض سطحی اور یہ حکمرانی بالکل اوچھی ہوتی ہے۔ اصلی حکومت وہ ہوتی ہے، جو محکوم جماعت کی جائدادوں اور جانوں پر نہیں، بلکہ اُس کے افکار و خیالات، جذبات و معتقدات، اور دل و دماغ

---

[1] [illegible] حقیقت [illegible] اس سین سے ظاہر ہوگی۔

سے قوّتی پر ہوتی ہے۔ یورپ نے ایشیا کو اسی طرز پر مسخر کرنا چاہا، اور آپ دیکھتے ہیں وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو گیا۔

خلیل۔ جی ہاں، یہ تو ہے ہی۔ ہاں ایک بات تو بتائیے۔ اِزدِواج پر جو ولیم نے رائے دی ہے اُس سے آپ کہاں تک متفق ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمدن کے حق میں سب سے بڑی لعنت تجرد، اور سب سے بڑی رحمت تاہّل ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

یوسف۔ اس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔

خلیل۔ کیا کہا؟ اتفاق!

یوسف۔ جی۔ حرف بحرف اتفاق۔

خلیل۔ تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ یا صرف زبان ہی سے اتفاق ہے؟

یوسف۔ یعنی، یہ میری ذات کی طرف اشارہ ہے؟

خلیل۔ ہاں ہاں صاحب آپ ہی کی طرف۔ جب آپ ایک رائے کو بالکل صحیح مانتے ہیں، تو اُس پر خود عمل کیوں نہیں کرتے۔ زبان سے تو آپ یہ کہتے ہیں، کہ ہر شخص کو شادی کرنا چاہیے، لیکن عملاً یہ حالت ہے کہ جہاں بچپن سے نسبت لگی ہوئی تھی، وہاں بیٹھے بٹھائے انکار کر دیا، اور نہ آئندہ کے لیے والدین کی کوئی اسکیم چلنے دیتے ہیں۔

یوسف۔ میں اپنے نقطۂ خیال کی شاید پوری توضیح نہ کر سکا۔ پروفیسر ولیم کی رائے کی تائید کے یہ معنی ہیں کہ میرے نزدیک سوسائٹی کے لیے بہ حیثیتِ مجموعی تجرد، لوازمِ حیات سے ہے، جس کے بغیر کوئی قوم عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرض کیجیے، ایک قوم ایسی ہے جو من حیث القوم تجرد کی زندگی بسر کرتی ہے، مثلاً اہلِ فرانس۔ تو ایسی قوم کارزارِ حیات میں اُس قوم سے یقیناً مغلوب ہو جائے گی، جس میں شادی کی رسم عام طور پر جاری ہے، کیونکہ جیسا میرے آپ کے درمیان بارہا گفتگو ہو چکی ہے، اجتماعی زندگی مشروط ہے خانگی زندگی پر، اور خانگی زندگی کی فلاح اس میں ہے کہ رسمِ ازدِواج کو قائم رکھا جائے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ تو کسی طرح نہیں نکلتا کہ ہر فرد کے لیے شادی کرنا لازمی ہے۔

خلیل - آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی - ایک شے کو آپ ایک مجموعہ کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن خود ہی اُسے اُس کے افراد کے لیے غیر ضروری بتاتے ہیں - سوسائٹی تو کوئی الگ شے نہیں، افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے - پس جب افراد کے لیے فرداً فرداً شادی لازمی نہیں، تو اسکے مجموعہ کے لیے، جسے آپ سوسائٹی کہتے ہیں، اس کی ضرورت کہاں سے ثابت ہو جائیگی؟ جو شے کل پر صادق آتی ہے، ضرور ہے کہ اُس کے ہر جزو پر بھی صادق آئے - یہ تو ایک کُھلی ہوئی بات ہے -

یوسف - تعجب ہے کہ ایسی سیدھی سی بات میں آپ کو ایسا موٹا مغالطہ ہو - یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ جو شے کُل کے لیے لازمی ہے، وہ ہر جزو کے لیے بھی لازمی ہے! مِل نے Fallacy of Composition پر جو کچھ لکھا ہے، اُسے اتنی جلد بُھلا دیا؟ خیر - یہ تو ایک دوسرا سوال تھا میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا، کہ شادی افراد کے لیے بہ حیثیتِ افراد کوئی معنی ہی نہیں رکھتی محض ایک مہمل شے ہے - لیکن چونکہ یہ رسم سوسائٹی کے لیے مفید ہے، لہٰذا افراد کو بہ حیثیت اجزاء سوسائٹی اسکی پابندی کرتے رہنا چاہیے - مگر اب فرض کیجیے، زید ایک فرد ہے، جو فرائض زوجی کو زیادہ خوبی سے انجام نہیں دے سکتا، یا یہ کہ وہ مجرد رہ کر سوسائٹی کو جس قدر فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس قدر متاہل ہو کر کبھی نہیں پہنچا سکتا - تو ایسی حالت میں زید کے لیے شادی کرنا نہ صرف بیکار و غیر مفید ہے، بلکہ ایک صریح جُرم ہے، کیونکہ شادی کرکے اُس نے اپنے وجود کو سوسائٹی کے لیے کم مفید بنا دیا -

خلیل - تو آپ کی تقریر کا ماحصل یہ نکلا، کہ نکاح تمام تر ایک اجتماعی ضرورت ہے، اور آپ چونکہ اجتماعی ضروریات کو بغیر نکاح کے بہتر طریقہ پر پورا کر سکتے ہیں، اس لیے شادی کرنا آپ کے لیے جرم ہے -

یوسف - بس بس، بالکل یہی میرا مطلب ہے -

خلیل - اس خیال کے وجوہ و اسباب؟

یوسف - ایک کُھلی ہوئی وجہ تو یہ ہے کہ میں اپنی علمی خدمات سے دنیا کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجرد ہی رہ کر - متاہل زندگی، علمی زندگی کے حق میں سم قاتل ہے - آج بیوی کی طبیعت نادرست ہے - کل بچہ بیمار ہے - بیوی زیورات کے لیے ضد کر رہی ہیں، بچہ کھلونوں کے لیے مچل رہا ہے - غرض شادی کرکے

سیکڑوں جھگڑے آدمی کے سر لگ جاتے ہیں۔ غم خانہ داری بزنجر۔ ایسی حالت میں میں تو کم از کم اپنے دماغ کو کسی گہرے کام کے قابل نہیں پاتا۔

خلیل۔ ایک اور سوال کر کے اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ کیا آپ کے نزدیک خود افراد کے ذاتی جذبات اس معاملہ میں کوئی وزن نہیں رکھتے؟

یوسف۔ "نہیں رکھتے" یا "نہیں رکھنا چاہیے"۔ رکھتے تو بہرحال ہیں، جس کا ثبوت آپ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا وزن ہونا چاہیے نہیں۔

خلیل۔ تو صاف الفاظ میں یہ کہیے، کہ تقاضائے جنسیت جو فطرت نے ہر انسان میں ودیعت کر رکھا ہے، ایک بے معنی شے ہے، اور عشق و محبت زوجی مہمل الفاظ ہیں؟

یوسف۔ بے شک۔ گو حیوانیت کے نقطۂ خیال سے اعلیٰ و افضل، لیکن انسانیت کی عینک سے دیکھیے تو پست و مہمل۔

خلیل۔ یہ کیا۔ ذرا اسے اور صاف کیجیے۔

یوسف۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ حیوانی میں بے شبہ جذبۂ جنسی کا درجہ نہایت اہم و ضروری ہوتا ہے، کیونکہ اُس وقت تک احساس فرض شناسی ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر افراد پر اس جذبہ کی حکومت نہ ہو تو نسل جاری ہی نہ رہ سکے۔ لیکن انسان جوں جوں مرتبۂ انسانیت میں ترقی کرتا جاتا ہے، اُسی نسبت سے اُسے جذبات کی قید سے آزاد ہوتے رہنا چاہیے، اور اپنی زندگی کو صرف عقل کے دکھلائے ہوئے شاہراہ فرض پر چلانا چاہیے۔ رہا عشق و محبت، تو اس کے افسانے میں نے بھی بہت سے سُنے ہیں۔ دیکھیے، انسان کی زندگی حقائق سے کس قدر دُور، اور وہم پرستیوں میں کس قدر گرفتار رہتی ہے۔ بچپن میں بھوت پریت، دیو و جن کے افسانے سنتے رہے۔ ہوش سنبھالا، تو لیجیے عشق و محبت، حسن و جمال، لیلیٰ و مجنوں کے افسانوں سے طبیعت بہلانے لگے۔ کہولت کے دن آئے، تو یہ ورق بھی اُلٹ دیا۔ اب کیا ہے؟ اب بہشت و دوزخ، حور و غلماں، جبرئیل و عزرائیل کے چرچے ہو رہے ہیں۔ غرض ساری عمر اسی خرافات پرستی میں گزر جاتی ہے، اور یہ کبھی بھولے سے بھی نہیں خیال آتا، کہ یہ سب مزخرفات ایک ہی داستان

کی مختلف حکایتیں ہیں۔ اصلیت نہ ان کی نہ اُن کی۔ ہاں عشق سے متعلق مولانا حالی کی رُباعی آپ نے سنی ہو؟

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا　　یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر　　اک مشغلہ دلچسپ ہو بیکاروں کا

کیا اچھی ماہیت عشق بیان کردی ہے۔ ایک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا۔

خلیل۔ درست ہے!

یوسف۔ اصل یہ ہو کہ جن دماغوں کو کسی علمی وبہتر قسم کی مصروفیت میسر نہیں آتی، یا اُن میں ان مصروفیتوں کی قابلیت نہیں ہوتی، وہ لامحالہ جذبات حیوانی کی سیری میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن جن کی توجہ ان حوائج حیوانی سے بالاتر ولطیف تر افکار کی طرف رہتی ہو، اُن میں ایسے خیالات کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ پس جناب والا، اگر آپ چاہتے ہیں، کہ میری ناچیز کوششیں، علم کی ترقی و اضافہ میں کچھ بھی کام آسکیں، تو میرے لیے بہترین مشورہ یہ ہو کہ میں شادی وادی کے جنجال میں نہ پڑوں۔ ان بکھیڑوں میں پڑکر میں اپنی توجہ کو یکسو نہیں رکھ سکتا، اور بغیر یکسوئی کے اب تک تو کسی نے کچھ کام کیا نہیں ہے۔

خلیل۔ خیر۔ خدا آپ کے ان خیالات کو مبارک کرے۔ زندگی ہے، تو ہم بھی انشاءاللہ یہ تماشہ دیکھیں گے، کہ یہ خیالات کب تک قائم رہتے ہیں۔ (گھڑی دیکھ کر) افوہ، باتوں میں وقت ہی نہیں معلوم ہوا۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ کل پھر ملاقات ہوگی۔ تسلیم۔ [جاتا ہے]

یوسف۔ تسلیم　　[نواب باقر حسین کا آدمی داخل ہوتا ہے]

نوکر۔ سرکار نے آپ کو یاد کیا ہو۔ کہا ہو کہ فرصت ہو تو کھڑے کھڑے ہو جائیں، کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں

یوسف۔ اچھا۔ تم چلو۔ میں ابھی آیا۔　　[دونوں دو مختلف راستوں سے جاتے ہیں]

سین (۲)[1]

[نواب باقر حسین کا زنانہ مکان۔ گھر کی عورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یوسف داخل ہوتا ہے]

یوسف۔ آداب عرض ہے۔

---

[1] باقر حسین کی سیرت پر اس سین سے مزید روشنی پڑتی ہو۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ ان کے تعلقات یوسف کے ساتھ کیسے تھے۔

باقر حسین۔ اہا، میاں یوسف ہیں۔ آج تو مدت دراز کے بعد دکھائی دیے ہو، اور وہ بھی میرے بُلانے سے آئے ہو، آخر ہم لوگ بھی تمھارے عزیز ہیں یا نہیں؟ اور اب تو تم ماشاءاللہ بی۔ اے کے امتحان میں پاس بھی ہو گئے ہو۔ اب کس شغل میں مشغول رہتے ہو۔ کل تمھارے والد سے ملاقات ہوئی تھی، وہ کہتے تھے تم خود اپنے گھر میں بھی بے بُلائے نہیں جاتے ہو۔ آخر ہم نے بھی طالب علمی کی ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں کیا، کہ پڑھنے کے پیچھے گھر بار کو بھول جائیں۔ اور دیکھو اس محنت کا تمھاری صحت پر کیسا اثر پڑ رہا ہے۔ کس قدر دُبلے ہو گئے ہو!

یوسف۔ بجا ہے۔

باقر حسین۔ بجا ہے کیا معنی؟ کیا تم کو اس میں کچھ شک ہے؟ خیر۔ اس کے جواب کی تکلیف نہ گوارا کرو، یہ بتاؤ کہ تم نے میرے جدید تقرر کا حال تو سُنا ہوگا۔

یوسف۔ کیسا تقرر؟ مجھے بالکل خبر نہیں۔

باقر حسین۔ عجب آدمی ہو۔ معلوم نہیں کس دنیا میں رہتے ہو۔ سارے شہر کو خبر ہو گئی، بچہ بچہ جان گیا، اخبارات میں شایع ہو گیا، اور تمھیں خبر ہی نہیں ہوئی کتابوں میں پڑ کر ایسا بے خبر ہو جاتے ہو، کہ کسی چیز کی خبر ہی نہیں۔ مہاراجہ راجگڈھ نے مجھے اپنی وزارت کے لیے طلب کیا ہے۔ ان کی ریاست کی بد انتظامیوں کو دیکھ کر لاٹ صاحب نے عرصہ ہوا، اُنھیں لکھا تھا کہ ہم تمھیں ایک نہایت ہوشیار و تجربہ کار وزیر دے سکتے ہیں، جس نے اپنی ذاتی جائداد کا بہتر سے بہتر انتظام کیا ہے۔ یہ سن کر مہاراجہ صاحب پھڑک گئے، اور مجھے دو ہزار ماہوار کے مشاہرہ پر طلب کیا ہے۔

یوسف۔ خوب۔ تو پھر کب تک تشریف لے جانے کا قصد ہے؟

باقر حسین۔ پہلی کو یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اُن کو تار دے دیا ہے۔

یوسف۔ بہتر ہے۔

باقر حسین۔ میں نے تم سے اس کا ذکر اس لیے کر دیا، کہ تمھارا جی چاہے، تو میرے ہمراہ چلو۔ راجگڈھ کے آب و ہوا و موسم کا کیا کہنا، جنت نظیر خطہ ہے۔ نینی تال و شملہ اس کے آگے گرد ہیں۔ وہاں

چلنے سے تمھاری تفریح بھی ہو جائے گی۔ اور ذرا سیر بھی کرنا۔ یہاں خالی کتابوں کو لیے پڑے رہتے ہو۔

یوسف۔ خالی تو میں آج کل بالکل نہیں ہوں۔ آپ کو شاید اس کا علم نہیں ہوا، کہ گورنمنٹ نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ پانچ سال کے لیے اس شرط پر دیا ہے، کہ میں بیالوجی کے کسی مسئلہ پر ایک اور یجنل مضمون تیار کروں۔ مجھے جو کچھ نوٹ لینا تھے، یہاں کی لائبریری و یونیورسٹی سے لے چکا، اب زیادہ وقت اُن کی ترتیب میں صرف ہوگا۔ راجگڈھ میں نسبتًہ تنہائی ہوگی، یہاں تو احباب و اعزہ کی خاطر داری میں بہت وقت ضایع ہو جاتا ہے۔ اس لیے تعمیل ارشاد میں مجھے عذر نہیں۔

باقر حسین۔ اچھا۔ اچھا۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ بس اب اپنا سامان سفر درست کرو۔ مجھے اس وقت کمشنر صاحب کے یہاں جانا ہے۔ (یوسف اُٹھتا ہے) ہاں ایک بات تو تم سے کہنا رہ ہی گئی۔ راجگڈھ کا قیام تمھارے لیے اس واسطے اور بھی دلچسپ ہوگا، کہ وہاں مشرف کے اتالیق، ڈاکٹر رائے، بسنتی بھی ہوں گے۔ وہ آج کل رخصت پر گئے ہوے ہیں۔ وہیں راجگڈھ میں آکر ملیں گے۔ تمھیں شاید اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ نہایت قابل آدمی ہیں۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اسی سے کر سکتے ہو کہ سالہا سال علی گڈھ کالج میں بسر کیے ہیں۔ کیمبرج کے گریجویٹ ہیں۔ امریکہ کے ال۔ ال۔ ڈی ہیں۔ طریقۂ تعلیم ان کا بالکل جرمن اصول پر ہے، یعنی کتابی خواندگی کم، اور زبانی تعلیم زیادہ۔ تم اُن سے مل کر یقینًا بہت خوش ہوگے۔ لوگوں نے مشرف کو بدنام کرنا چاہا تھا۔ یہ مشہور کر دیا تھا کہ خدانخواستہ وہ فاتر العقل ہے۔ مگر جب سے میں نے ان ماسٹر صاحب کو رکھ دیا ہے، ماشاءاللہ اُس کی ذہانت پر جلا ہو گئی ہے۔ حُسنیٰ کو تم جانتے ہو، ماشاءاللہ کیسی تیز و ذہین ہے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہوتی اگر اُس کا شوہر کوئی نالائق یا غبی ہوتا، مگر خوش قسمتی سے مجھے مشرف سا لائق داماد ملا جاتا ہے۔ مشرف، حُسنیٰ وغیرہ سب لڑکے لڑکیاں میرے ہمراہ ہوں گی، اور مشرف ہی کے سبب سے اُن کے اتالیق صاحب بھی ہمراہ رہیں گے۔ تم جانتے ہو میں کس قدر آزاد خیال واقع ہوا ہوں۔ بھلا ہمارے یہاں کا کوئی شریف اسے گوارا کریگا، کہ شادی کے قبل لڑکی اپنے منگیتر کے سامنے برابر آتی جاتی رہے۔ لیکن مجھے دیکھو کہ میں نے کسی کے طنز و تشنیع کی پروا نہیں کی، حُسنیٰ و مشرف میں کوئی پردہ نہ رکھا۔ اور یہاں تو خیر، بھائی جان، بھابھی جان

کا بہت کچھ لحاظ کرجانا پڑتا ہے۔ وہاں راج گڈھ میں دیکھا۔ مجھے ہر طرح پر آزادی حاصل ہوگی۔ یہ معنی ہیں روشن خیالی کے، یہ نہیں کہ آدمی کیے سب کچھ، مگر عمل کے نام سے خیر سلا۔

یوسف۔ بہتر ہے۔ تسلیم۔ [جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے]

سین (۳)[1]

[راجگڈھ میں مشرف اوران کے ماسٹر ایک کمرہ میں بیٹھے ہیں۔ یوسف کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے]

ماسٹر۔ (خدمت گار سے جو کارڈ لایا تھا) اچھا سلام دو۔ (یوسف داخل ہوتا ہے)

یوسف۔ تسلیمات۔

ماسٹر۔ (سلام کا جواب اشارہ سے دیتے ہیں) آپ کو کوئی خاص کام؟

یوسف۔ جی نہیں، کوئی خاص کام نہیں۔ بجز اس کے کہ نواب صاحب نے آپ کی قابلیت کی خاص تعریف کی تھی۔ اسی سے میں بھی مشتاق ہو کر آپ کی ملاقات کے لیے چلا آیا۔

ماسٹر۔ آپ نے کچھ ایجوکیشن (تعلیم) پایا ہے؟

یوسف۔ جی۔ بی۔ اے پاس کیا ہے۔

ماسٹر۔ یہیں انڈیا (ہندوستان) کے کسی کالج سے؟

یوسف۔ جی ہاں، ہارڈنگ کالج خلد آباد سے۔

ماسٹر۔ افسوس ہے، کہ انڈیا کا ایجوکیشنل سسٹم (نظام تعلیم) اتنا خراب ہے کہ ہم یہاں کے کسی بی۔ اے، ایم۔ اے کو ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) نہیں کہہ سکتا۔

یوسف۔ ہاں نقائص اور بہ کثرت نقائص کے موجود ہونے سے تو مجھے بھی انکار نہیں، لیکن اس سے اتنا وسیع نتیجہ نکالنا شاید صحیح نہ ہو۔

ماسٹر۔ کیا آپ اس پوائنٹ (مسئلہ) پر مجھ سے ڈسکس (بحث) کر سکتا ہے، جبکہ آپ جانتا ہے کہ آپ کے یہاں اورینٹل لینگویجز (مشرقی زبانیں) کمپلسری (لازمی) ہیں۔

---

[1] ظریفانہ نہیں۔ ماسٹر کی قابلیت کا پردہ فاش ہوتا ہے۔

یوسف۔ اولاً، تو یہ واقعہ نہیں، کہ مشرقی زبانوں کی تحصیل ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں لازمی ہے، دوسرے ابھی مجھے یہ سمجھنا باقی ہے، کہ مشرقی زبانوں کی تحصیل، انسان کو تعلیم یافتہ بنانے کے منافی ہے۔
ماسٹر۔ او۔ آپ کے خیالات کیسے تنگ تاریک ہیں۔ آپ ہرگز اُردو، فارسی، عربی، سنسکرت سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتے، دنیا میں اب تک جتنے گریٹ مین (بڑے لوگ) گزرے ہیں سب کی یہی رائے تھی۔
یوسف۔ مجھے بدقسمتی سے ایسے بڑے لوگوں کے نہ نام سے واقفیت ہے، نہ اُن کے دلائل سے۔
ماسٹر۔ سرسید، ملٹن، نپولین، نیوٹن، سب کی یہی رائے تھی۔ ان لوگوں کا نام شاید انڈین یونیورسٹیز میں کبھی نہیں آتا۔
یوسف۔ یہ جناب نے کیا ارشاد فرمایا۔ نپولین، ملٹن، و نیوٹن کو اس بحث سے کیا تعلق ہے دیکھے ایک سرسید کا نام البتہ اس بحث میں لیا جا سکتا ہے، لیکن جناب فرمائیں کہ انھوں نے اپنی کس تحریر میں یہ رائے ظاہر کی ہے۔
ماسٹر۔ اور آپ کیا کہتا ہے۔ میں سرسید کا خاص پرائیوٹ دوست تھا۔ مجھے ان کے ورکس (تصانیف) کے پڑھنے کی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی۔
یوسف۔ جناب علیگڈھ تشریف کس زمانہ میں رکھتے تھے؟
ماسٹر۔ ۱۸۹۹ء (۱۸۹۹) سے ۱۹۰۵ء (۱۹۰۵) تک۔
یوسف۔ تو شاید سرسید کی رُوح سے آپ کی دوستی ہوگی، کیونکہ وہ تو ۹۸ء میں زندہ نہ تھے۔ اور ہاں، جناب نے وہاں تعلیم کس درجہ میں پائی؟ بی۔ اے، وہیں سے کیا؟
ماسٹر۔ نہیں، کسی انڈین یونیورسٹی سے بی اے کرنا بیکار تھا۔ میں نے وہاں اسکول میں پڑھا، سکستھ (چھٹے درجہ) کلاس سے لے کر ایٹھ (آٹھویں) تک۔
یوسف۔ ماشاء اللہ۔ اور کیمبرج سے بی اے کس مضمون میں کیا؟
ماسٹر۔ وہاں کے لوگ جس سبجکٹ (مضمون) کو سب سے زیادہ مشکل سمجھتے تھے اُس میں، یعنی اُردو میں۔

یوسف۔ بجا ارشاد ہوا۔ تو اس میں آنرز حاصل کیے ہوں گے؟

ماسٹر۔ نہیں۔ میں نے خالی "پاس" لینا کافی سمجھا۔ عقلمند آدمی کبھی کسی چیز کا زیادہ لالچ نہیں کرتا علم بھی ایک دولت ہے۔ کبھی اس کا زیادہ لالچ نہ کرنا چاہیے۔

یوسف۔ کیا خوب ارشاد ہوا۔ اور جناب نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری کہاں سے حاصل کی ہے؟

ماسٹر۔ یہ امریکہ کی آنریری ڈگری ہے۔

یوسف۔ کسی علمی خدمت کے صلہ میں؟

ماسٹر۔ او۔ آپ کس طرح کی بات کرتا ہے؟ جب ہم نے بی۔ اے۔ کر لیا، اور اس کے بعد امریکہ کی ایک یونیورسٹی کو پانچ سو روپیہ بھیج دیا، تو صاف معلوم ہو گیا، کہ ہم یونیورسٹی میٹرز (یونیورسٹی کے معاملا) میں پورا انٹرسٹ (دلچسپی) لیتا ہے، اور اسی پر ہم کو ایل۔ ایل۔ ڈی کا آنریری ڈگری مل گیا۔

یوسف۔ (علیحدہ) افسوس، دنیا کس قدر ظاہر پرست ہے، اور اسے دھوکا دینا کس قدر آسان ہے! ایک شخص جہالت کا پتلا ہے، مگر علی گڈھ، کیمبرج، و امریکہ کے نام سے دنیا کو مرعوب کیے ہوئے ہے! (بہ آواز بلند) آپ کو اب تک کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ واقعی آپ تو عجیب غریب اوصاف کا مجموعہ ہیں۔ ہاں، یہ تو فرمائیے، کہ یوں تو جناب کو جملہ علوم و فنون پر عبور ہوگا۔ مگر کسی مضمون سے خاص طور پر دلچسپی ہے؟

ماسٹر۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم کو ہر سبجکٹ (مضمون) سے انٹرسٹ (دلچسپی) لیکن ہمارے اسپشل انٹرسٹ (خاص دلچسپی) کا سبجکٹ ایجوکیشن (فن تعلیم) ہے۔ آپ ہمارا حال سنئے، اس طرح پر ہے، کہ ہمارا ماموں بہت امیر آدمی تھا۔ اُس نے ہم کو بیرسٹری کے لے لنڈن بھیجا، ہم کئی برس یورپ میں رہا، اور لنڈن، پیرس، و برلن کی خوب سیر کیا، لیکن امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ کئی برس کے بعد ہم نے کیمبرج یونیورسٹی جوائین (شریک ہوا) کیا، اور وہاں سے اُردو میں بی اے کی پاس ڈگری لیا۔ اتنے میں ہمارے ماموں نے ایک رنڈی کے پیچھے سارا روپیہ لٹا کر اپنا دیوالہ نکال دیا۔ تب ہم کو انگلینڈ سے لوٹنا پڑا۔ پھر ہم نے امریکہ کی ایک پرائیوٹ یونیورسٹی کو ۵۰۰ روپیہ بھیج کر ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری لی۔ پھر ہم نے ایجوکیشنل (صیغۂ تعلیم) سروس میں آنا چاہا، لیکن یہاں کا انگریز لوگ امریکہ سے

بہت جلتا ہے، وہاں کی ڈگری کو بوگس (فرضی و مصنوعی) ڈگری بتاتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے ماموں نے ہم کو انسپکٹر جنرل پولیس سے انٹروڈیوس (ملا دیا) کر دیا۔ اُس کی میم کا انھوں نے ایک دفعہ جان بچایا تھا۔ وہ اُن کی بات کو بہت مانتا تھا۔ اُس نے ہم کو سال بھر کے لیے آنریری انسپکٹر پولیس کر دیا۔ ہم کو شکار کا بہت شوق ہے۔ ہم ایک دفعہ شکار کر رہا تھا، سامنے ہم کو ایک ڈارک آبجکٹ (سیاہ چیز) ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ ہم سمجھا کہ سور ہے، اور فیر کر دیا۔ جب وہ چلایا، تو معلوم ہوا کہ وہ ڈارک آبجکٹ (کالی چیز) سور نہیں، کالا آدمی تھا۔ کسی راجہ کا گراس کٹ (گھسیارہ) تھا۔ ہم نے اُس کی عورت کو چار سو روپیہ دے کر چپ کر دیا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ہم نے اپنے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی، جنھوں نے اس کیس (معاملہ) کو ہش اپ (دبا دیا تھا) کر دیا تھا، شکریہ میں دعوت کی، جب وہ کھانے پر آئے، تو ہم نے سب آدمیوں کے سامنے اُن سے کہہ دیا، کہ آپ کا ٹائی بہت میلا ہے، ہم ایسے آدمی کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا۔ اس پر وہ خفا ہو کر چلا گیا، اور ہماری رپوٹ کر دی۔ تب سے ہم نے وہ نوکری چھوڑ دیا۔ اور اب یہ پڑھانے کی نوکری کرتا ہے۔

یوسف۔ سبحان اللہ۔ آپ نے تو بہت ہی دلچسپ سوانح عمری بیان فرما دی۔ نواب صاحب کو غالباً جناب کے ان کمالات کا علم نہیں۔ ہاں، جناب یہ تو فرمائیں، کہ جناب اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ کا اس قدر اسرافِ بیجا کیوں کرتے ہیں؟

ماسٹر۔ اُو۔ آپ کے سامنے تو ہم بہت کم انگلش ورڈز (انگریزی الفاظ) بولا۔ پہلے ہمارا یہ عادت تھا، کہ ہم چپراسی، کانسٹبل، چوکیدار، سب سے انگریزی میں بات کرتا، جب دیکھتا کہ وہ نہیں سمجھتا، تب اُردو میں اُس کا ترجمہ کر دیتا۔ البتہ مشرف سے بات کرنے میں ہمیں بالکل اُردو بولنا پڑتا ہے، وہ ابھی انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتا۔

یوسف۔ ناگوار نہ ہو تو یہ بھی بیان فرما دیجیے، کہ جناب کا اسمِ مبارک کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

ماسٹر۔ اُو۔ آپ مینرز (آدابِ تہذیب) بالکل نہیں جانتا، جو کسی سے اُس کے پرائیوٹ (خانگی) حال پوچھتا ہے۔ اچھا، ہم آپ کو یہ بھی بتائے دیتا ہے۔ ماں باپ نے ہمارا نام عبد الباسط رکھا تھا۔

انگلینڈ میں ہم کو ایک اٹالین میڈ (خادمہ) کے ساتھ محبت ہوگیا۔ بہت آدمی محبت میں اپنا ریلیجن (مذہب) بدل دیتے ہیں، ہم نے اپنا نام بدل کر اٹالین کردیا۔ اس طرح کہ "باسط" کو بیسٹی Baoita اور "عبدل" کو "الما" کردیا۔ اب سب لوگ اسے، بیسٹی کہتے ہیں۔

یوسف ۔ ماشاءاللہ۔ کیا خوب اُستاد اور کیا خوب شاگرد ہیں۔ اچھا اب بہت دیر ہوگئی، رخصت ہوتا ہوں۔ لیکن ماسٹر صاحب، آپ کا بہت ممنون ہوں، کہ آپ کی وجہ سے میرے تجربات میں اس قدر اضافہ ہوگیا۔ تسلیم [جاتا ہے]

[ایک خدمتگار دوڑا ہوا آتا ہے]

خدمتگار۔ یہاں میاں یوسف تو نہیں ہیں ؟

ماسٹر۔ کیوں، خیر تو ہے ؟

خدمتگار۔ اس وقت بٹیا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ سر میں درد تو صبح سے تھا، لیکن اس وقت بہت تیز ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی دوا کئی دفعہ لگا چکی ہیں، مگر کچھ آرام ہی نہیں ہوتا۔ سرکار نے حکم دیا کہ میاں یوسف کو بلا لاؤ۔ وہ کوئی عمل جانتے ہیں۔ اسمریزم، مسمریزم کچھ ایسا ہی نام ہے، شاید اُس سے آرام ہو جائے۔ سنتے ہیں اُس سے بیماری فوراً اُتر جاتی ہے۔

مشرف۔ اُنھ، ہوگا بھی۔ جاؤ یہاں یوسف ووسف کہاں۔

ماسٹر۔ چلو، مشرف، گھوڑ دوڑ میں چلیں۔ وقت آگیا۔ کہو آج بازی لگانے کے لیے کتنا روپیہ ہے۔

مشرف۔ آج تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی پانچ ہزار ہوگا۔

ماسٹر۔ خیر۔ کیا ہرج ہے۔ ابھی تو گھوڑ دوڑ کئی روز رہے گی، آج پہلا دن ہے۔ [دونوں جاتے ہیں]

سین (۴)

[باقر حسین کے مکان کا ایک حصہ۔ ایک طرف سے ایک خدمتگار، دوسری طرف سے انا آتی ہے]

خدمتگار۔ کہو، بوا غفورن۔ اب تو بٹیا کی طبیعت بحال رہتی ہے نہ ؟

سلہ یوسف مبتلائے عشق ہوتا ہے۔ نوکروں میں یہ خبر پھیلتی ہے۔

غفورن - ہاں رمجانی (رمضانی)، اب تو اللہ کا فجل (فضل) رہتا ہے ایسی نیک لڑکی ہم نے تو آج تک نہیں دیکھی
رمضانی - ہاں، مجاز (مزاج) تو بہت ہی اچھا ہے - اپنے بھی دل سے دعا نکلتی ہے کہ پروردگار اُنھیں خوش رکھے - لیکن بُوا، ایک بات کہوں جو بُرا نہ مانو -
غفورن - کہو -
رمضانی - نہیں - مجھے کہتے ڈر لگتا ہے تم بُرا مان جاؤگی -
غفورن - نہیں - میں نہیں بُرا ماننے کی - تُو کہہ تو -
رمضانی - اچھا ادھر آؤ، تو کان میں کہوں - [سرگوشیاں کرتا ہے]
غفورن - (غضب آلود حیرت کے ساتھ) ارے یہ یوسف! دیکھنے میں کیسا نیک بخت (نیکبخت) معلوم ہوتا تھا - اللہ اس کو گارت (غارت) کرے، جو میری بیٹی کو بُری نظر سے دیکھے - لیکن رمجانی مجھے اب تک اس بات کا اَکین (یقین) نہیں آتا - اگر کہیں یہ گلت (غلط) نکلا، تب؟
رمضانی - مجال تھی جو اتنی بڑی بات میرے مُنھ سے خلاف نکل سکتی - قسم اللہ کی، غفورن بُوا جب اپنی آنکھوں دیکھ لیا، تب تمھارے آگے زبان کھولی - بھلا جب شرافوں نے یہ حرکتیں شروع کر دیں، تو ہم لوگوں کو کون بُرا کہہ سکتا ہے؟
غفورن - اچھا، اب اس وَکت (وقت) تو بیگم صاحبہ کے پاس مجھے بڑی جلدی ہے - تھوڑی دیر میں آؤں گی، تب کھلاصہ (خلاصہ یعنی مفصل) باتیں ہوں گی - میرے تو جیسے ہوش اُڑے جاتے ہیں -
رمضانی - بات ہی ایسی ہے - [دونوں جاتے ہیں] [یوسف آتا ہے]

[نواب باقر حسین کے مکان کا کوئی حصہ]

یوسف (ٹہل ٹہل کر گاتا ہوا نظر آتا ہے)

شورشِ جوشِ جنوں اب جلد دکھلانے کو ہے
یعنی جو کچھ دل میں تھا اب لب پہ آ جانے کو ہے
رخصت اے ضبط و تحمل الوداع اے پاسِ وضع
بند شوں سے اب زبان آزاد ہو جانے کو ہے
ہو چکی صبر و سکون و خامشی کی انتہا
جامِ ضبطِ آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے

لو مبارک تم کو اے اہلِ تماشا، سیرِ نو — دستِ بسمل سے عنانِ صبر چھٹ جانے کو ہے
خوب کر مشقِ جفا، لیکن ستمگر یہ بھی سوچ — کیا وفا کیشی کا جذبہ اس سے مٹ جانے کو ہے
بے ادب لب، اُن سے کچھ کہنے کو ہیں پھر مضطرب — اُن کے چہرہ پر حیا کی پھر جھلک آنے کو ہے
سچ بتا، ناظر، مسرت تجھ کو اتنی کیوں ہے، کیا — اُن کی محفل میں کوئی تیری غزل گانے کو ہے

یوسف، یوسف، کیا میں وہی یوسف ہوں جو آج سے دو ہفتہ پیشتر تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر میں وہی ہوتا، تو اس وقت اپنے تئیں کسی علمی صحبت یا خلوت کدہ میں پاتا، یہاں اس وقت یہ عاشقانہ اشعار گاتا ہوا نہ ہوتا۔ یہ آخر کیا بات ہوئی؟ کسی نے مجھ پر سحر کر دیا؟ کسی سخت مرض نے مجھے گھیر لیا؟ نہیں، یہ کچھ بھی نہیں۔ پھر آخر کیا ہے؟ ٹھہرو، میں خود، علامات کی مدد سے اپنے مرض کی تشخیص کرونگا۔ سب سے بڑا تغیر اپنی حالت میں، میں یہ پاتا ہوں، کہ پہلے جن مشاغل میں میں ہمہ تن مصروف ومنہمک رہتا تھا، جن کے لیے ہر طرح کا عیش وآرام اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، اور جن مشاغل میں انہماک کے آگے مجھے نہ موسم کی تکلیف ستاتی تھی، نہ بھوک پیاس کی۔ اب انھیں مشاغل کی طرف سے طبیعت اُچاٹ ہوگئی ہے، سائنس کے مسائل کی تحقیقات کو میں نے اپنا مقصدِ زندگی بنایا تھا، اور کل تک اُن کی اُدھیڑ بُن میں نہ رات کو رات سمجھتا تھا، نہ دن کو دن۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ گھنٹہ دو گھنٹہ بھی اپنی توجہ ان پر یکسوئی کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتا۔ پھر آخر ذہن کس شے پر جمتا ہے؟ ایک صورت پر؟ کس کی صورت؟ عزیز ومحبوب حُسنیٰ کی صورت پر۔ یہ صورت میرے لیے کوئی نئی نہیں، اس سے پیشتر میں نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن یہ جذبہ جو اب پیدا ہوا ہے، میرے لیے بالکل نیا ہے، بالکل انوکھا ہے۔ پھر صورت کی دلکشی پر غور کرتا ہوں، تو بھی کوئی غیر معمولی خوبی ذہن کے سامنے نہیں آتی۔ اعضا کا تناسب، جسم کی نزاکت، اطوار کی نفاست، ان میں سے الگ الگ کوئی شے ایسی نہیں نظر آتی، جس کے لحاظ سے حُسنیٰ یگانۂ روزگار ہو، مگر پھر یہ کیا ہے، کہ یہ سمجھنے کے باوجود بھی، حُسنیٰ کی طرف اپنے میں ایک خاص کشش، ایک غیر معمولی میلان پاتا ہوں؟ کچھ عقل ہی نہیں کام کرتی۔ لیکن، آخر، میں چاہتا کیا ہوں؟ صرف یہ کہ ہر وقت حُسنیٰ سے یکجائی رہے۔ ہر وقت اُس کی صورت میرے پیشِ نظر رہے۔ میں اُس سے کسی وقت

بھی جدا نہ ہوں۔ کیا یہ میری خواہش، اخلاقی، شرعی، قانونی، کسی حیثیت سے معیوب ہے؟ مجھے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن کیا مجھے اس خواہش میں کامیاب ہونا ممکن ہے؟ کیا ایسی کوئی صورت نکل سکتی ہے، کہ میرے اور حسنی کے درمیان ایک ناقابل انفصال وابستگی قائم ہو جائے؟ اس کی صورت عقد ہے۔ تو کیا میں عقد کر لوں گا؟ کیا شادی کر کے خانگی زندگی کے جھگڑوں میں پڑ جاؤں گا؟ کیا میں جس شے سے ہمیشہ بچتا رہا، اب مجبوراً اس میں پڑنا پڑے گا؟ میں شادی کو اپنے لیے جرم سمجھتا تھا، تو کیا اب اس جرم کا مرتکب بنوں گا؟ کیا فطرت نے میرے غرور کو توڑنے کے لیے یہ سامان اکٹھا کر دیا ہے؟ نہیں، اے فیاض و رحیم فطرت! رحم۔ مجھ پر رحم! مجھے ان مصائب میں نہ ڈال۔ ان آفتوں میں نہ پھنسا۔ میں انھیں نہیں جھیل سکتا۔ میرے پیر میں یہ بیڑیاں نہ پہنا۔ میں انھیں نہیں اُٹھا سکتا۔ مگر میں یہ کیا کہ رہا ہوں؟ مجھے ان آفتوں میں کون پھنسا رہا ہے؟ میں خود ہی تو دانستہ اس آگ میں کود رہا ہوں، اور خود ہی فریاد کرتا ہوں کہ "مجھے بچاؤ" "مجھے بچاؤ"۔ اچھا، اب دل کو مضبوط کر کے اس طرف سے اپنی طبیعت ہٹائے لیتا ہوں۔ لیکن کیا میں اس پر قادر ہو سکوں گا؟ افسوس کہ مجھ میں اعتماد نفس نہیں رہا۔ پہلے مجھے اپنی ذات پر اعتماد تھا، اپنی قوت پر بھروسہ تھا، لیکن اب میں اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہوں۔ اے جذباتِ انسانی! میں نے تمھاری قوت کو ہمیشہ ذلیل سمجھا۔ میں تمھارے سامنے اپنے دل و دماغ کو بے حس پاتا تھا، لیکن یہ کیا ہے کہ میری عقل تمھارے پہلے ہی حملہ میں تم سے مغلوب ہو گئی؟ کیا، واقعی انسان کی عقل ایسی ہی بودی شے ہے؟ افسوس یہ مسئلہ آج میری سمجھ میں آیا۔ دلائل کی مدد سے نہیں، ذاتی تجربہ سے۔ کتابوں کے مطالعہ سے نہیں، آپ بیتی سے۔ او مغرور و پر خود غلط انسان! کیا تیری انسانیت و شائستگی، فرزانگی و تدبر کی یہی بساط ہے! اے عشق و محبت کی پاک و مجرد ہستیو! میں نے تمھاری شان میں ہمیشہ گستاخی کی، تمھیں ہمیشہ بے حقیقت سمجھا، تمھارے وجود سے ہمیشہ انکار کیا، لیکن اب حقائقِ زندگی یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں، کہ حقیقی وجود تمھارا ہی ہے۔ ایسی قوت جو انسان سے کام لے سکے، وہ صرف تمھیں میں ہے۔ عقل و علم، فلسفہ و منطق یہ سب الفاظ ہیں، جو صرف کتابوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں، برتنے کے لائق نہیں۔ ہاں میں بہکا جاتا ہوں

حُسنیٰ، عزیز حُسنیٰ کا تصور کرتے کرتے کہاں پہنچ گیا۔ حُسنیٰ، کیا تو مجھے میری خواہش میں کامیاب ہونے دے گی! ہا۔ ہا۔ یہ کس قدر طفلانہ خیال ہے۔ کہاں حُسنیٰ، کہاں مَیں! دولت و افلاس کا کہیں جوڑ مِل سکا ہے؟ لیکن نہیں، مجھے خیال ہوتا ہے، کہ تیری خاموش نگاہوں نے بھی مجھے پیامِ محبت دیا ہے۔ کاش، یہ سچ ہو! مگر میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ سب میرا وہم ہے۔ اُفوہ۔ کس قدر متناقض خیالات دماغ میں چکر کھاتے ہیں۔ کیا یہ جنون ہے؟ ہاں شاید جنون کی وہی قسم ہے، جسے عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب میرے سر میں چکر۔۔ آ۔ آ۔۔ (کُرسی پر گر پڑتا ہے) [پردہ گرتا ہے]

"ناظر"

رو رہے ہیں ہمنفس اک اک کی صورت دیکھ کر — یہ اِنھیں کیا ہوگیا میری مصیبت دیکھکر
دے دیا افسوس تاثیرِ دوا نے بھی جواب — صورتِ بیمار و اندازِ طبیعت دیکھکر
ہے دلِ مجبور ابھی سے مضطرب اے صبحِ ہجر! — دیکھیے کیا رنگ لائے شامِ فرقت دیکھکر
آئے تھے کس شوق سے پامال کرنے وہ مگر — بیکسی پر رو پڑے ٹوٹی سی تربت دیکھکر
ہے رواں غیروں کی آنکھوں سے بھی اک دریائے خوں — میرے مٹنے پر عزیزوں کی مسرت دیکھکر
ہائے اُس کا میرے شکوے پر یہ کہنا ناز سے — کوئی دیوانہ ہی کیوں ہو اچھی صورت دیکھکر
ہوگیا قصہ کہانی دل کا یہ بھی واقعہ — بیکسی سے جان دینا شامِ غربت دیکھکر
او تغافل کیش مجبور شوق سے کر تو ستم — لیکن آئینِ وفا۔ رنگِ محبت دیکھکر
وائے قسمت ہوگئے صَرفِ غمِ جاوید ہم — خواب میں دھندلی سی اک تصویرِ عشرت دیکھکر
سُن کے جو دل کا مرض ہنستے تھے وہ بھی رو دیے — ہجر کا درد اور بیتابی کی حالت دیکھکر
کچھ تجھے بھی چاہیے انصاف اے محوِ جفا — بیکسوں کا رنج اور اپنی مسرت دیکھکر
ہوگئے تصنیف دردانگیز افسانے کئی — اس دلِ مرحوم کا انجامِ الفت دیکھکر
آہ! اپنی زندگی کیونکر وبالِ جاں نہ ہو — دوست کو، آمادۂ ترکِ رفاقت دیکھکر
وہ شبِ وعدہ مرے گھر آکے یارب! پھر گئے — سوچ کر کیا بات دل میں کیا قباحت دیکھکر

درسِ عبرت لیجیے، چشمِ بصیرت کھولیے!
محوِ مایوس کی "تصویرِ حسرت" دیکھکر

مانٹی کارلو کا قمار خانہ

کہتے ہیں کہ یورپ تمدن و مُعاشرت میں جس قدر ترقی کر رہا ہے، اُسی نسبت سے اُس کا اخلاق زوال پذیر ہو رہا ہے۔ بظاہر یہ دو ایسی متضاد باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو باہم جمع نہیں ہو سکتیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کیونکہ یورپ کی تمدنی و معاشرتی ترقی سے عموماً اس کی صنعتی، حرفتی اور تجارتی ترقی سمجھی جاتی ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اِسے اخلاقی ترقی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اہلِ مشرق کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو بلاشبہ اگر مغربی تہذیب میں بہت سے فضائل ہیں، تو اسی کے ساتھ بہت سے نقائص بھی ہیں۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں، جنھیں مشرقی لوگ بد اخلاقی پر محمول کرتے ہیں، لیکن مغربؔ والوں نے اُنھیں باتوں کو اپنے یہاں جائز کر لیا ہے۔ منجملہ اُن کے ایک قمار بازی ہے۔ مشرق میں قمار بازی کی وہی حیثیت ہے، جو کسی بدمعاش کی (ہندوستان میں قمار بازی بجز خاص حالتوں کے، جُرم سمجھا جاتا ہے) لیکن یورپ میں وہ اُسی نظر سے دیکھا جاتا ہے جس طرح دوسرے دولتمند اشخاص۔

تاریخ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قمار بازی کا رواج کم از کم ہزار برس سے ہے۔ غالباً اس ایجاد کے محرک انسان کے وہ فطرتی خصائل ہیں، جنھیں ہم طمع، لالچ یا کسبِ معاش کی فکر کہہ سکتے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر علماے مغرب کے نزدیک یہ بھی انسان کی ایک شریفانہ عادت ہے۔ ایک یورپین فلاسفر لکھتا ہے کہ قمار بازی کا اثر صرف اُس چیز تک محدود نہیں رہتا، جس پر جُوا کھیلا جاتا ہے، بلکہ اس کا اثر قمار باز کے ہر فعل سے ظاہر ہوتا ہے؛ اُس کے ہر کام سے اُسکی ذہانت، ذکاوت، و چالاکی اور تیز فہمی کا پتہ چلتا ہے؛ وہ جس طرح اپنے روپیہ سے جُوا کھیلتا ہے، اسی طرح اپنے اقوال و افعال سے۔ یورپ کا ایک عالم جُوے کے فضائل و مناقب ثابت کرنے کی غرض سے اس فعلِ قبیح کی اِس طرح تائید کرتا ہے "قمار بازی کسبِ معاش کی ایک صورت ہے، جس کے

کرنے نہ کرنے پر کوئی شخص مجبور نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ محض اس کا شوق ہے، جو اسے جوئے کی میز کی طرف لے جاتا ہے، پس کوئی وجہ نہیں کہ اسے ناجائز سمجھا جائے، اور لوگوں کو اس سے زبردستی باز رکھا جائے۔"

یورپ کے ہر ملک، اور قریب قریب ہر شہر میں خاص مقامات پر قمار خانے بنے ہوئے ہیں۔ ۱۸۰۰ء میں یورپ کا سب سے مشہور قمار خانہ پیرس کا فریس کانی تھا، جہاں تمام ملک کے اور خصوصاً پیرس کے امرا جمع ہوا کرتے تھے۔ یہاں صرف وہی لوگ جوا کھیل سکتے تھے، جنھیں حکومت فرانس اجازت دیتی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں جب یہاں فواحشات اور بداخلاقیوں کی کثرت ہوئی تو گورنمنٹ نے ٹیکس کا مطالبہ کیا۔ اور منتظمانِ فریسکانی کو نوے لاکھ فرانک ٹیکس ادا کرنا پڑا۔ لیکن حکومتِ فرانس، چونکہ قماربازی کا استیصال کرنا چاہتی تھی، لہٰذا ۱۸۳۹ء میں گورنمنٹ کا دوسرا فرمان صادر ہوا، اور تمام قمار خانے بند ہو گئے۔ فریسکانی بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اسی سال مسٹر بناریٹ، جو فریسکانی کے منیجر تھے، جرمنی چلے گئے، جہاں پہنچ کر شہر بیڈن کو اُنھوں نے اپنا قیام گاہ بنایا، اور وہیں اپنا قمار خانہ جاری کیا۔ رفتہ رفتہ جب جرمنی کے بہت سے امرا و شرفا بھی اُن کے شریک ہو گئے، پھر تو ہر شہر میں قمار خانے کھل گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد، جرمنی کی سرزمین بھی قماربازی کے راس نہ آئی، اور پرنس بسمارک، صدرِ اعظم جرمنی کے حکم سے تمام قمار خانے بند کر دیے گئے۔

۱۸۶۳ء میں ایک شخص مسمی مسٹر بلانک اور اُن کے بھائی نے ریاست مناکو[1] میں جا کر جوا کھیلنا شروع کیا، پھر دو برس بعد مانٹ کارلو اس کھیل کے لیے منتخب کیا۔ لیکن یہاں گنجایش بہت محدود تھی، اس لیے انھوں نے اپنا قمار خانہ علٰحدہ طیار کیا، جسے کازینو کہتے ہیں۔ یہاں انھوں نے جوئے کا ایک نیا کھیل ایجاد کیا، جسے رولیٹ کہتے ہیں، ۱۸۹۳ء میں کازینو انگریزوں کی شرکت میں آیا، اور امیر مناکو اس کے منتظم مقرر ہوے۔ انگریزوں کے شریک ہوتے ہی اسے ترقی ہوئی اور آمدنی

[1] یہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے، جو ملک فرانس کے مشرقی گوشہ میں سرحد اٹلی کے متصل واقع ہے۔ یہاں کا حاکم، جو شاہزادہ کے لقب سے پکارا جاتا ہے، اپنی ریاست کے اندرونی انتظام میں بالکل خود مختار ہے۔

بڑھ گئی، کیونکہ بہت جلد یہ دنیا کے مشہور جواریوں اور سیاحوں کا آماجگاہ بن گیا۔

کازینو کی آمدنی کا اندازہ صرف اِس سے ہو سکتا ہے کہ وہاں ملازمین کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں ہو۔ باغ کا خرچ تیس ہزار پونڈ سالانہ ہی، گانے بجانے اور دوسرے دلچسپ مشاغل میں دس ہزار پونڈ سالانہ صرف ہوتا ہی، اور پھر اُس کے سرمایۂ محفوظ سے ملک کو بھی خاصی امداد ملتی ہے، چنانچہ اس کی آمدنی سے میونسپلٹی، اسکول، گرجا گھر، اور دوسری مذہبی عبادت گاہوں اور انجمنوں کو معقول مدد پہنچتی ہے۔ اسی سبب سے حکومت مناکو نے اسے ٹیکس معاف کر دیا ہی۔ کازینو کے ممبروں کی حکومت کی طرف سے اس سے بڑھ کر اور کیا حوصلہ افزائی ہو سکتی تھی۔

کازینو میں جوا کھیلنے والے اکثر ایک ایک دن میں ہزارہا پونڈ جیت لیتے ہیں۔ گزشتہ چھ سات سال سے اِس کو اس قدر ترقی ہو گئی کہ امریکہ کے بہت سے نوجوان قماربازیہاں سے کروروں روپیہ پیدا کر لے گئے۔ (موجودہ جنگ یورپ کے باعث یہاں بھی آج کل سرد بازاری ہی) انگلستان کے مشہور جواری مسٹر ولس نے ایک ہی دن میں کازینو کے بنک کا دیوالہ نکال دیا۔ مسٹر موصوف نے دو روز میں پچاس ہزار پونڈ جیتے، اور انھیں کے ہم وطن مسٹر سام وئس نے ۱۹۰۰ء میں ایک ہی دن ایک لاکھ اشرفیاں جیتیں۔

کازینو کا انتظام ایک خاص جماعت کے ہاتھ میں ہی۔ جس کے ممبر سال میں ایک مرتبہ، امیر مناکو کی سالگرہ کے دن اُس کا معائنہ کرتے ہیں، اُس دن کازینو بہت ہی آراستہ کیا جاتا ہی، تمام شہر میں روشنی ہوتی ہی، اور بڑی بڑی بازیاں بدکر جوا کھیلا جاتا ہی، جیسے ہندوستان میں ہولی اور دیوالی کے موقع پر۔ اکثر امیر مناکو خود بھی شریک جشن ہو کر، جواریوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

مانٹی کارلو (Monte-Carlo)

مانٹی کارلو کی شہرت اگرچہ دنیا میں اپنے مشہور قمار خانہ، کازینو کی وجہ سے ہی، لیکن حقیقت یہ ہی کہ یہ مقام بھی بہ حیثیت مجموعی، اپنی بناوٹ اور خوشنمائی میں فردوس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ مانٹی کارلو کا باغ یورپ کے معماروں اور باغبانوں کی اعلیٰ کاریگری کا بہترین نمونہ ہی۔ باغ کے اندر

چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانات ہیں، جو معطر جھاڑیوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ جھاڑیوں کے بنگلے ایسے گھنے بنائے گئے ہیں، کہ آفتاب کی کرنوں کا گذر اُن کے اندر قطعی ناممکن ہے۔ فوارے اس قدر باموقع اور خوش اسلوبی سے لگائے گئے ہیں، کہ اُن کی پھواریں ہر وقت ساون بھادوں کا سماں پیش کرتی ہیں، نفیس اور خوشبودار پھولوں کے چھوٹے چھوٹے درخت روشوں کے کنارے کنارے کچھ اس سلیقہ سے لگے ہوئے ہیں کہ اُن کے گچھے ہر وقت روشوں پر گُل پاشی کیا کرتے ہیں۔ قرب وجوار کی حسین پری جمال کنواری لڑکیاں، گویا اُس کوہِ قاف کی پریاں ہیں۔ جو ہر طرف اٹکھیلیاں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ باغ کے مقابل کازینو (قمارخانہ) ہے۔ اس عالیشان اور خوبصورت عمارت کی سُنہری قبیں، ملند اور چمکدار برجیں، اور سفید سنگِ مرمر کی دیواریں، دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی ہیں، اور بے اختیار اس کے صناعوں اور کاریگروں کی خداداد قابلیت پر مرحبا، مرحبا کہنے کو دل چاہتا ہے۔

کازینو کے اندر ہر وقت کئی سو آدمی قماربازی میں مشغول رہتے ہیں، اور اس کے علاوہ بھی یہاں کے زائرین کے لیے طرح طرح کے سامان لہو ولعب مہیا کیے جاتے ہیں، مثلاً ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے، وہاں چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا شکار کیا جاتا ہے، لیکن ان پرندوں کا شکار اس قدر مشکل ہوتا ہے کہ کامیاب شکاری کو بیس ہزار فرانک بطور انعام دیا جاتا ہے، دوڑ دھوپ کے کھیلوں کے لیے علیحدہ میدان بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کے پُرجوش اور مستعد کھلاڑیوں میں، اٹلی اور فرانس کے لوگ زیادہ مشہور ہیں۔ رقص وسرود کی انجمنیں بھی قائم ہیں، جس کے ہر ممبر کو دس ہزار گنی سالانہ بطور چندہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ناچ گھر اس قدر دلکش اور آراستہ ہے کہ اُس کے اندر قدم رکھتے ہی انسان دنیا ومافیہا بالکل بھول جاتا ہے اور خود بخود ناچنے پر طیار ہو جاتا ہے، اور اکثر اوقات انتہائی بداخلاقی اور فحش کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اسی عمارت (کازینو) کے گوشہ میں ایک لائبریری بھی ہے، جہاں دنیا کے تمام مشہور اخبارات ورسالے منگائے جاتے ہیں۔ لائبریری کے ایک حصہ میں بے تار کی تار برقی لگی ہوئی، جس کے ذریعہ سے، تمام دنیا کے تازہ اور اہم واقعات کی خبر یہاں فوراً پہنچ جاتی ہے۔

کازینو میں داخل ہونے والوں کو خاص شرائط اور قوانین کی پابندی کرنا ہوتی ہے، مثلاً وہاں

جانے والوں کو پہلے سکرٹری کے دفتر میں جاکر اپنا پورا نام اور پتہ لکھانا ہوتا ہے، وہاں کا مخصوص لباس پہننا پڑتا ہے۔ اس میں بھی صبح وشام کے جدا جدا کپڑے ہوتے ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی خاص پوشاک ہے، اور اس میں بھی صبح وشام کی تفریق ہے۔ عورتوں کے کپڑے خوشبو میں اس قدر بسے ہوتے ہیں کہ برقی پنکھوں کے ہوائی جھونکوں سے تمام عمارت خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے۔

کازینو کے تمام کمرے ہر وقت سیاحوں اور جواریوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ اور صبح وشام عورتوں اور مردوں کا اژدہام رہتا ہے۔ یہاں عورتوں کی پوشاک نہایت دلفریب ہوتی ہے جس میں چمکدار الماس جڑے ہوتے ہیں، اور سینہ پر زردوزی کا کام بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہی لباس، جب یہاں کی کنواری اور نازنین لڑکیاں پہن کر شریکِ جلسہ ہوتی ہیں، تو اپنی ترچھی نظروں، بانکی اداؤں اور کافرادا دلربائیوں سے تمام مجمع کو ایسا متوالا کر دیتی ہیں کہ ہر شخص اپنا نقدِ دل پیش کرنے کو طیار ہو جاتا ہے۔ نوجوانوں سے ہاتھ ملانا، بھولی بھولی باتیں کرنا، اور اپنی چشمِ فسوں ساز کے اثر سے، اپنے شیداؤں کے شوق و اضطراب کو بڑھانا، ان کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ اور بعض اوقات تو ان سے ایسی خلافِ تہذیب اور حیا سوز حرکات صادر ہوتی ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ یہاں عورتوں کی تعداد بھی ہمیشہ مردوں سے زیادہ رہتی ہے۔

کازینو میں عموماً فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے، جس کی وجہ شاید کچھ تو یہ ہے کہ یہ مقام (مانٹی کارلو) فرانس سے بالکل ملحق ہے، اور فرانسیسیوں کی آبادی بھی بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ ہے اور کچھ سبب یہ ہے کہ فرانسیسی ہی زبان آج کل یورپ کی بین الاقوامی زبان مانی جاتی ہے۔ سات برس ہوئے کہ کازینو کی محدود گنجایش اور زائرین کی کثرت دیکھ کر اس عمارت میں ایک بڑے کمرے کا اور اضافہ کیا گیا ہے۔ کازینو کے ایجنٹ یورپ کی ہر بڑی اور چھوٹی سلطنت کے پایۂ تخت میں پائے جاتے ہیں، اور ان کے ذریعہ سے کازینو جانے میں آسانی ہوتی ہے۔

جب یہاں کھیل شروع ہوتا ہے، تو منتظمین کازینو شہر کے رئیسوں کی حسین و جمیل کنواری لڑکیوں کو کھیل میں شریک ہونے کی دعوت دیتے، اور اکثر انھیں شرکت پر مجبور کیا جاتا ہے، تاکہ

کھلاڑیوں کو اُن سے لطفِ صحبت حاصل ہو، اور کازینو کی آمدنی بڑھے۔ کھیل کا زمانہ یہاں موسمِ خزاں سے شروع ہو کر موسم گرما میں ختم ہو جاتا ہے۔ جب کھیل شروع ہوتا ہے تو لوگ میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، اور ملازمین کازینو کھیل کا سامان سونے کے صندوقوں میں لاکر میز پر چُن دیتے ہیں۔ اسکے بعد ہی ایک شخص گھنٹی بجاتا ہے اور فوراً کھیل شروع ہو جاتا ہے (اور ہر شخص نہایت ذوق وشوق سے کھیل میں مشغول ہو جاتا ہے)، مختلف کھیلوں کے لیے علٰحدہ علٰحدہ رنگ کے میز ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی حسب حیثیت بازی لگاتا ہے۔ جیتنے والوں کے نام اخباروں میں شایع کردیے جاتے ہیں، لیکن بدقسمت ہارنے والوں کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہیں کی جاتی۔ کازینو کے بنک (بیت المال) کی طرف سے بھی ڈیڑھ لاکھ فرانک تک بازی بدی جاتی ہے۔ بنک اگر برابر ہارتا رہا تو اُسے "دیوالیہ بنک" کہتے ہیں، لیکن اس کازینو کے منتظمین کے جوش میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا، بلکہ برخلاف اس کے وہ ہر طرح کوشش کرتے ہیں کہ کھیلنے والوں کی تعداد بڑھتی رہے۔

اکثر لوگ، اگرچہ محض تماشہ دیکھنے کی غرض سے آتے ہیں، لیکن اشرفیوں کی چمک دمک اُنکی آنکھوں کو ایسا خیرہ کردیتی ہے کہ وہ بھی ادھا دُھند اس میں شریک ہو کر اکثر اپنی عمر بھر کی کمائی لُٹا دیتے ہیں۔ یہاں ہارنے والوں کی تعداد ۹۵ فی صدی سے کم نہ ہوتی۔ اور ایسا ہونا لازمی بھی ہے، کیونکہ یہ ہارنے والوں ہی کا روپیہ ہوتا ہے، جس سے کازینو کے کثیر اخراجات چلتے ہیں۔ یہاں خرچ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہاں کے ملازمین و متعلقین بیس لاکھ فرانک سالانہ بطور تنخواہ و وظائف پاتے ہیں، اور کازینو کے سرمایۂ محفوظ کی مقدار مسٹر بلانک (بانیِ کازینو) کی وفات کے وقت ساڑھے چھ کرور فرانک تھی۔

کازینو کے باغ میں داخل ہوتے وقت یہاں کی خاص پولیس کا ایک سپاہی ساتھ ہو جاتا ہے۔ کسی قسم کا آلۂ حرب اندر لے جانے کی سخت ممانعت ہے کیونکہ اس سے خودکشی کا احتمال ہوتا ہے، اور اس قسم کے واقعات کازینو کے باہر ہزارہا ہو چکے ہیں۔ یہاں سے ایک میل پر ایک قبرستان ہے، جو اُنھیں بدنصیب خودکشی کرنے والوں نے آباد کیا ہے، جنھوں نے غربت کی زندگی بسر کرنے سے مرجانا بہتر سمجھا ---

غرضکہ کازینو کا قمار خانہ بھی یورپ کے عجائبات میں شامل ہے، اور یورپ کے شوقین سیاح کے لیے یہ بھی ایک چھوٹا سا پیرس ہے -

(ماخوذ) ایچ - احمد - دیدی - (مالدیوی)

امین آباد پارک لکھنؤ

کے عنوان سے ایک نظم الناظر کے اپریل نمبر میں شائع ہوئی ہے - جس نے مجھے یاد دلایا کہ اسی عنوان پر ۱۹۱۱ء میں بزمانۂ قیام لکھنؤ میں نے بھی چند شعر سرسری طور پر موزوں کیئے تھے اور اب پانچ سال بعد شائع ہوتے ہیں

رکھتا ہے دلچسپیاں بیحد امین آباد پارک ۔۔۔ ہے مجھے دل سے پسند ارشد امین آباد پارک
تین سمتوں میں ودیٔر زینت دو کانوں کی قطار ۔۔۔ بیچ میں اک خوبصورت لہلہاتا سبزہ زار
اک طرف کو حوض جس میں خوشنما فوارہ ہے ۔۔۔ دلکشی سے اپنی جو دامن کش نظارہ ہے
شام کا منظر بھی ہوجاتا ہے کتنا دلفریب ۔۔۔ ہو گا دنیا کا کوئی حصہ نہ اتنا دلفریب
لطف آبادی بھی حاصل ہے سیر سبزہ زار بھی ۔۔۔ خامشی جنگل کی بھی ہنگامۂ بازار بھی
ساتھ نادر[1] کے ٹہلنا روز میرا بعد عصر ۔۔۔ کرنا گھنٹہ گھر کے گرداگرد پھیرا بعد عصر
بعد مغرب آکے پھر مسلم کلب میں بیٹھنا ۔۔۔ شائقین علم کی بزم ادب میں بیٹھنا
یا پہنچنا حضرت شبلی نعمانی کے پاس ۔۔۔ یعنی اک ذرہ کا جانا شمس نورانی کے پاس
اور عزیز میرزا صاحب کا مل جانا وہاں ۔۔۔ گفتگو سے اُن کی اکثر دل کا کھل جانا وہاں
سچ تو یہ ہے خوش نصیبی کے یہ سب حالات ہیں ۔۔۔ یوں جو گذریں زندگی کے بہترین اوقات ہیں

پارک میں ہے لطف نظارہ بھی ذوق علم بھی
بخشتا فطرت پرستی بھی ہے شوق علم بھی

---

[1] منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی مرحوم

ماتم کا سرگم

سا (پہلا مہینہ)

جناب محترم!

میں آپ کی مسلسل ہمدردانہ تسلیوں اور تشفیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور یہ ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ میں کلیتہً اور ہمیشہ کے واسطے اپنے صدمۂ عظیم پر وقف ہو گئی ہوں اور پُرشور دُنیا اب میرے لیے نہیں ہے۔ بیوگی کے فرض نے مجھ کو مجبور کر دیا ہے کہ میں تنہائی میں اُس کی یاد دل میں تازہ رکھوں۔ جو اس دنیائے دنی سے سفر کر چکا ہے۔ اب سیاہ گون اور لانبا کریپ کا نقاب میرا رسمی لباس ہوگا۔ اور کوئی خیال مجھ کو میرے غم سے جدا نہیں کرے گا۔ یاد آوری کا شکریہ قبول فرمائیے فقط۔

پرنسز گاف برگ

رے (دوسرا مہینہ)

نہایت ہی اچھے جناب ن، ن، صاحب!

آپ کی یہ خواہش جس پر آپ کو اصرار ہے کہ میں آپ کی ملاقات منظور کروں میری خوشامد کرتی ہے اور ساتھ ہی اس کے ڈراتی ہے۔ ذرا غور کرنے سے غالباً آپ میری تنہائی کے علل و اسباب کو سمجھ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری نسبت رائے قائم کرے۔ انجیل میں ہے کہ الزام مت لگاؤ کہ تم پر بھی الزام لگایا جائے۔ مجھ کو اُن وارستہ مزاج بیواؤں پر ہمیشہ غصہ آیا جن کو صرف دلچسپیوں اور تفریحوں کی دُھن رہتی ہے۔ حالانکہ اُن کو یہ چیزیں بُھلا دینا چاہیے تھیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی میں ایسی عورتوں کی تقلید کرنے کی خواہش نہیں کرتی۔ البتہ اگر کبھی دل بہلانا اور تھوڑی دیر کے لیے غموں سے خالی ہونا چاہتی ہوں تو صرف یہ کرتی ہوں کہ ایک پھولوں کا گلدستہ اس پیاری

قبر پر جا کر چڑھاتی ہوں جہاں میری محبت سو رہی ہے۔ اور کچھ دیر اُس کے پاس ٹھہرتی ہوں جو ہمیشہ کے لیے مجھے داغ مفارقت دے گیا۔ میں آپ کے نیک ارادوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور خیال کرتی ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔

پرنسز ای گاف برگ

گا　(تیسرا مہینہ)

اچھے دوست！

آپ مجھ سے بغیر ملاقات کیے نہ مانیں گے؟ میں بیان نہیں کر سکتی کہ ماتم پرسی سے میرے دل پر کیا گذرتی ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ اس عورت کی یاد دل سے نکال دیجیے، جو دنیا کی دلچسپیوں کو الوداع کہہ چکی ہے۔ جب میرا پیارا شوہر زندہ تھا تو میرے لیے انکی کچھ کمی نہ تھی۔ میرے پاس آپ ماتم اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہ پائیں گے۔ آپ اُس شراب انگوری سے لطف اُٹھایئے جو آپ کی طرف مسکراتی ہے۔ اور اپنی شگفتہ جوانی کو اس ناقابلِ تسکین بیوہ کی مصاحبت سے زہر آلود نہ کیجیے، جو اس کو صرف غبار آلود کرے گی۔ میں ایسی خودغرض نہیں ہوں کہ دوسروں کو اپنے ساتھ افسردہ ہونے اور رونے پر مجبور کروں۔ میں آپ سے ہاتھ ملاتی ہوں

پرنسز ایوور گاف برگ

ما　(چوتھا مہینہ)

پیارے دوست！

مجھے اعتراف ہے کہ آپ کی دلیلیں اصولی ہیں۔ مثل ایک دانشمند اور تجربہ کار آدمی کے آپ نے میرے کل توہمات پر فتح پائی۔ اچھا تو پھر! اگر یہی ہے .... تو آیئے۔ لیکن میں آپ کو خبردار کرتی ہوں کہ میرے پاس آپ کو نہ دلچسپیاں ملیں گی نہ تفریح۔ سنجیدہ گفتگو، غم کے افسانے، بس یہی وہ چیزیں ہیں جن کا آپ کو انتظار ہے۔ شاید میں ملاقات کی اجازت دیتے ہوئے خود غرضانہ طریقہ سے ایک بُرائی کر رہی ہوں۔ اس امید میں کہ آپ کی رونق افروزی سے تھوڑی دیر کے لیے مجھ کو دینے

غموں سے نجات مل جائے گی۔ اور آپ ایک سیاہ لباس والی کی ملاقات سے ملول ہو جائیں گے؟ لیکن خود آپ ہی نے اس کی خواہش کی تھی۔ آپ ہی اس قصور کے ذمہ دار ہیں۔ آج شام کو میں گھر ہی پر رہوں گی۔

تمہاری دوست ایلیو نور گاف برک

پا (پانچواں مہینہ)

میرے پیارے دوست!

آپ سچ فرماتے ہیں کہ آپ کی ملاقات میرے لیے بہت نفع بخش ثابت ہوئی۔ اس نے میرے زخم دل پر مرہم کا کام دیا۔ میرے درد کو تسکین ہوئی اور میرے خیالات و افکار کی تلخی کم ہوگئی۔ آپ اکثر مجھ سے ملتے رہیے۔ اس سے آپ ہمدردی کا ایک رستمانہ کام انجام دیں گے۔ مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ آپ کو ایک غمزدہ عزلت گزیں کی مصاحبت سے بجز ملال و افسردگی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہی ہے تو آپ اپنے ایثار کو خرچ نہ کیجیے۔ اگر نہیں تو میرے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں اور آپ اُس میں ایسے مہمان ہوں گے جن کی آرزو کی جاتی ہے۔

آپ کی وفادار دوست ایلیو نور جی

دھا (چھٹا مہینہ)

میرے پیارے اور شیریں دوست!

کیا تم شادی کے آرزومند ہو؟ تم اپنے ۲۷ درخشاں سالوں کو میرے ۲۸ پیرانہ سالوں سے جوڑنا چاہتے ہو؟ کیا یہ ممکن ہے؟ اس قدر نیکی اور اس قدر رحم و ہمدردی ایک انسانی دل میں نہیں سما سکتی۔ لیکن ایک اہم سوال ہے۔ کیا میں تمہاری قربانی قبول کرنے کا حق رکھتی ہوں؟ کیا میں اپنے غبار آلود خزاں کے دنوں میں تمہارے روشن موسم بہار کے پھولوں کو قبول کرنے کی جرأت کروں گی؟ اور خود تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ قانوناً دس مہینے کا ماتم ختم ہونے سے پہلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ تمہارے لیے بھی کافی وقت ہے کہ تم اپنے ارادہ کو خیرباد کہہ دو۔ میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے لیے اپنے دل میں ہمیشہ جگہ محفوظ رکھوں گی۔

تمہاری ایلیو نور

نی (ساتواں مہینہ)

میرے صنم !

تین مہینے آہ طولانی تین مہینے کی مدت کے بعد آخر میں ہمیشہ کے لیے تیری لونڈی ہو جاؤں گی۔ ہائے گستاؤ، کیا تو تھوڑے ہی عرصہ تک غمزدہ عورت کو مائل کرنے کا جس کو جوش نے بے تاب کر دیا ہے انتظار نہ کر سکا۔ ابھی تین مہینے ہیں۔ پھر تبا میرے پیارے، ہم شادی کے لیے انگلستان چلیں؟ شاید وہاں متاہل پادری مل جائیں گے، جو میرے اضطراب کی تہ کو پہونچ جائیں گے۔ لیکن میں کیا کہتی ہوں! میں بالکل دیوانی ہو گئی۔ کاش میری ماں کو خبر ہو جاتی نہیں نہیں گستاؤ۔ قانون کے احترام اور دنیا کی بدنامی کے خیال سے مجھ کو ماتم پورا کرنا چاہیے کیا میرا فرشتہ جس کی میں پرستش کرتی ہوں ہر دم میرے پاس نہیں ہے؟ بہشت کے دروازے ہمارے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کیا ہم کو اُس میں داخل ہونے کے لیے جلدی نہیں کرنا چاہیے، جبکہ اُس کی دہلیز ہی پر ہم کو ایسے لطف میسر ہیں۔ یونور

مہدی

"وائے برما و گرفتاری ما"

کیا ہوا آج الٰہی دل کو — چین اک دم نہیں اس بسمل کو
آنکھ آمادۂ زاری کیوں ہے — بیخودی مجھ پہ یہ طاری کیوں ہے
کیوں پریشان ہوں مثلِ سنبل — نالہ زن باغ میں شکلِ بلبل
ایک چکر میں ہے ہر وقت دماغ — مجھ کو جنگل ہی خوش آتا ہے نہ باغ
حسرت و درد سے الفت کیوں ہے — رنج و غم سے یہ محبت کیوں ہے
دل ہے ماتمکدۂ صد حسرت — نام سے میرے سکوں کو نفرت

دیکھیے پھر مجھے غش آتا ہے — دل کہیں اور لیے جاتا ہے
اشک خوں آنکھ سے بھر بہنے لگے — لوگ دیوانہ مجھے کہنے لگے
بات کرتا ہو کوئی مجھ سے اگر — دل پہ اک پڑتا ہے گویا نشتر
لوگ اس وقت مرے پاس نہ آئیں — ملک الموت سے کہ دو ہٹ جائیں
کیا پریشان ہیں غمخوار و ندیم — دیکھ کر روز مرا حال سقیم
مجھ سے کہتے ہیں بتا اپنا حال — کون سی بات ہو جس کا ہو ملال
کس سے ملنے کے لیے ہے بیتاب — کیوں تڑپتا ہے مثالِ سیماب
کون سی شمع کا پروانہ ہے — کس پری زاد کا دیوانہ ہے
کس کا غم ہے ترا یہ حال ہو کیوں — اشکِ خونی سے یہ رُخ لال ہو کیوں
اپنے بیگانے سے کیوں نفرت ہے — سچ بتا کس سے تجھے الفت ہے
آہ۔ ان باتوں کا کیا دوں میں جواب — سوزِ فرقت سے کلیجا ہو کباب
مجھ سے محبوب مرا چھُٹتا ہے — خرمنِ صبر و سکوں لُٹتا ہے
موت آجائے تو ہے اچھی بات — کہ غمِ ہجر سے پا جاؤں نجات
کوئی قابو جو نہیں چلتا ہو — دل کو سینے میں کوئی ملتا ہو
آہ اے چرخ ستمگر بے پیر — ظالم و شعبدہ پرداز و شریر

چیست حاصل ز دلآزاریِ ما
وائے بر ما و گرفتاریِ ما

رئیس احمد جعفری (کاکوری)

سارا گلا جفاؤں کا دل سے بھلا دیا — تو نے تو اے فریب تسلی مٹا دیا
کیا کیا اُڑائی گریۂ خوں بار کی ہنسی — ظالم نے میرے حال پہ مجھ کو ہنسا دیا
خوابیدہ بخت خاک نشیں خانماں خراب — تو نے بگاڑ کر مجھے کیا کیا بنا دیا
وہ پوچھتے تھے تیر کے پیکان کیا ہوئے — چپ ہو گئے جو میں نے کلیجہ دکھا دیا
اظہارِ دردِ دل کوئی مہندی کا رنگ تھا — تم نے تو چٹکیوں ہی میں اس کو اڑا دیا

نظرے خوش گزرے

محترم ناظرین کو غالباً یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ اب الناظر نے بفضلہ تعالیٰ اپنی زندگی کے آٹھویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اس سات برس کی طویل مدت میں اگر زمانہ مساعدت کرتا تو الناظر کے ذریعہ سے ملک و قوم کی کافی خدمت کی جاسکتی تھی لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا گیا منزل کی دشواریاں اور باد مخالف کی مزاحمتیں بڑھتی رہیں یہاں تک کہ ادھر کچھ عرصے سے اس کی حالت اُس بیمار کے مانند ہوگئی تھی جس کے روز افزوں ضعف اور ترقی پذیر مرض کو دیکھ کر تیماردار مایوسی کے عالم میں علاج سے بے پروا ہوگئے ہوں اور اُس گھڑی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں کہ فرشتۂ اجل کی مہمان نوازیوں سے اُس کی مشکلات اور مصیبتوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ لیکن جس طرح بے بس انسانوں کی بقا و فنا اُس حکیم مطلق کی مرضی سے وابستہ ہے اور ممکن نہیں کہ ساعت معینہ سے یک سرِ مو بھی تفاوت ہوسکے، بعینہٖ اسی طرح انسانی تحریکات کی زندگی و موت بھی اُسی قادر و توانا کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب تک وقت نہ آجائے ہمارے امکان میں نہیں کہ اپنے کاموں کو چھوڑ کر اطمینان کی نیند سوئیں۔

یہ صحیح ہے کہ الناظر کی حالت مرزا کے اس مشہور شعر کے مصداق ہو رہی ہے کہ ؎

ہوا مخالف و شب تار و موج طوفاں خیز
گستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خُفت است

مگر سال گزشتہ کے واقعات مجبوریوں اور افتادوں اور موجودہ خیالات و حالات پر غائر نظر ڈالنے کے بعد ہم الناظر کی زبان حال سے مرزا کی رُوح پر فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ شعر بھی عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ

کشتی بے ناخدایم، سرگذشتِ من مپرس
از شکست خویش، بہ دریا کنار افتادہ ام

شکسپیر یہ کہتا ہے اور بالکل سچ کہتا ہے کہ نا امیدیوں سے امید اور ناکامیوں سے کامیابی پیدا ہوتی ہے۔ اس بیان کی تصدیق آئے دن کے واقعات و مشاہدات تو کرتے ہی رہتے تھے لیکن الناظر کی کیفیت جو ہمارے دیکھنے میں آئی اُس سے اس خیال کی صداقت پر ہمیں پورا پورا یقین ہو گیا ہے۔ بہر حال الناظر کا آٹھواں سال شروع ہوتا ہے اور مستقبل خود بتا دے گا کہ اس کے ماضی و حال کو کس نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ ہم اپنی طرف سے دعاوی و مواعید کی کوئی فہرست پیش نہیں کرنا چاہتے اور اللہ جل شانہ کے فیض عمیم پر بھروسہ کرکے اُس کے لطف و احسانِ بے نہایت کے امیدوار رہیں گے۔

البتہ بعض خفیف تبدیلیوں کے متعلق ناظرین معاونین کو اطلاع دینا ضروری سمجھتے ہیں جو حسب ذیل ہیں :-

(۱) کاغذ کی گرانی کا حال اُن تمام اصحاب کو معلوم ہی ہے جو موجودہ نازک زمانے کے حوادث و واقعات سے واقف ہیں۔ الناظر کے لیے جو کاغذ ابتدا سے ہم نے تجویز کیا تھا وہ اب بھی نایاب نہیں ہے لیکن قیمت میں دو چند سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور ابھی اور اضافہ کی اُمید ہے۔ ممکن تھا کہ اسی دبازت اور وزن کا بادامی کاغذ استعمال کیا جاتا، یا وہ جو بازار میں جرمنی کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس صورت میں یقیناً کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا۔ لیکن ابھی تک اس کے لیے ہم چنداں مجبور نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے دبازت و وزن میں صرف اس قدر ترمیم پر اکتفا کریں گے کہ بجاے ۲۰ پونڈ کے ۱۶ پونڈ کا کاغذ لگائیں گے۔ اس کی بھی قیمت اگرچہ سابقہ حالات کے لحاظ سے زیادہ ہے اور الناظر کی مالی حالت کے اندازے سے تو یقیناً بہت زیادہ، تاہم حتی المقدور اس خسارے کو برداشت کیا جاے گا تاکہ الناظر کی ظاہری حالت میں کوئی نمایاں فرق جو مائل بہ خرابی ہو، نہ پیدا ہونے پائے۔ مصارف کی یہ بیشی اگرچہ ایک حد تک اضافۂ قیمت کی سفارشی ہے لیکن جہاں ہم نے آج تک الناظر کی خاطر بہت سی مالی قربانی گوارا کی ہے وہاں تا امکان اس سے بھی قطع نظر کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا ناظرین کرام اطمینان رکھیں کہ کاغذ اور سامانِ طبع کی گرانی سے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اُن پر کوئی

اثر پڑنے نہ دیں گے بے شبہہ یہ خواہش ہماری ضرور ہی کہ قدردانان الناظر ان حالات کو پیش نظر رکھ کر توسیع اشاعت میں سعی فرمائیں تاکہ ہمیں اپنے عزائم پر بہ استقلال قائم رہنے کی ترغیب ہو اور موقع ملے۔

(۲) ابتدا سے الناظر دو قسم کے کاغذ پر چھپا کرتا تھا۔ مگر اب صرف یہی ایک قسم کا کاغذ لگایا جائیگا اور اگرچہ وہ حضرات جو اب تک الناظر کو چکنے ولایتی کاغذ پر دیکھتے رہے ہیں اس تغیر سے شاید کسی قدر آزردہ ہوں گے۔ لیکن حالات اور رجحانات کے لحاظ سے ہم معذور ہیں اور اپنے اُن کرم فرماؤں سے بمنت عذر خواہی کرتے ہیں۔

(۳) الناظر کے ساتھ سالہاے ماسبق میں بھی بعض کتابیں شایع ہوتی رہی ہیں، اور اب پھر یہ سلسلہ شروع کیا جاتا ہی۔ چنانچہ مولوی احمد میاں اختر جوناگڈھی کی مرتبہ حیات نظامی کے چند اوراق اسی پرچے میں ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

ہاجرہ کی کامیابی کے عنوان سے جو ناول عزیزی منشی انیس احمد عباسی کا شایع ہو رہا تھا وہ چونکہ اب بصورت کتاب طبع ہو رہا ہی اس لیے الناظر میں اُس کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا ہی اور عزیز موصوف اطلاع دیتے ہیں کہ ناول جولائی میں تیار ہو جاے گا۔ پورا ناول ۱۹ بابوں پر ختم ہوا ہی جس میں سے ۱۲ باب الناظر میں شایع ہو چکے ہیں۔ جن اصحاب نے اس دلچسپ سلسلہ کو مطالعہ فرمایا ہے وہ یقیناً تکمیل کے بعد پورے ناول کو ملاحظہ فرمانے کے شایق ہوں گے اس لیے انھیں چاہیے کہ منیجر صاحب الناظر بک ایجنسی کو ایک کارڈ لکھ کر اپنے قصد سے مطلع فرمائیں تاکہ تیار ہوتے ہی ناول سب سے پہلے اُنھیں کے ہاتھوں میں پہنچے۔ ہاجرہ کی کامیابی کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ۱۲ر مقرر کی گئی ہے۔

مسٹر سلطان حیدر جوش کا ناول "ابن مسلم" جس کے زیر طبع ہونے کی اطلاع دسمبر میں دی گئی تھی

آخر بہت دنوں کے انتظار کے بعد شائع ہو گیا ہے۔ مسٹر روش کے دلچسپ فسانوں سے ناظرین کرام ہمیشہ لذت اندوز ہوتے رہے ہیں اور اگرچہ "ابنِ مسلم" نسبتاً بہت ضخیم ہے تاہم مسرت کی بات ہے کہ اس کو دلچسپ بنانے میں مصنف نے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا ہے۔ ابن مسلم پر کسی تفصیلی تبصرہ کے لیے ہم بالکل تیار نہیں ہیں۔ تاہم یہ عرض کر دینے میں کچھ ہرج نہیں سمجھتے کہ پلاٹ کی جدت۔ خیالات کی پاکیزگی اور طرزِ بیان کی خوبی کے لحاظ سے ہونہار ناولسٹ ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ حجاج ابن یوسف کے ظلم و استبداد اور عبدالرحمن ابن مسلم کی شجاعت۔ نصفت پسندی اور پاکیزہ زندگی کی داستان ایسے دلچسپ۔ عبرت انگیز اور سبق آموز طریقے سے بیان کی گئی ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہ تو یقینی ہے کہ کتاب کو شروع کرنے کے بعد ختم سے پہلے چھوڑ دینا ناممکن ہے۔

ناظرین الناظر کے ذوقِ مطالعہ کو پورا کرنے کے لیے ابنِ مسلم کی کچھ جلدیں الناظر بک ایجنسی میں رہیں گی، جو عہ فی جلد کے حساب سے فروخت کی جائیں گی۔

ہمارے مکرم دوست مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے جو چند روز قبل تک للت پور میں زیرِ حراست تھے، ۳۰ مئی کو اسی حالت میں حسبِ ذیل غزلیات تحریر فرمائی ہیں جو بغرضِ اشاعت ہمارے پاس موصول ہوئی ہیں:-

(۱)

لطف تو نے جو کیا بھی تو عجب کام کیا — دلِ دیوانہ کو سرگشتۂ اوہام کیا
جس کو جو شے تھی سزاوار خدا نے بخشی — مجھ کو جانباز کیا تجھ کو دلآرام کیا
بھر گئی نور سے تاریکیٔ شبِ منتظراں — جلوۂ اس رخِ روشن نے جو سربام کیا
ہوس و عشق میں کچھ فرق نہ رکھا تو نے — غمزۂ خاص کو بدنام کیا عام کیا
یہ بھی اک ڈھب ہے ستانے کا کہ ہنگامِ سحر — گئے وہ آنے کا وعدہ جو سرِ شام کیا
بڑھ گئی آج سے میری فقیری اپنی — کہ شہِ حق نے مجھے اہلِ خدام کیا
کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرت سا غیور
اور اسے آپ نے خوگر دشنام کیا

(۲)

قبولِ ستم سے ہے انکار صالح — کروں کیوں نہ میں اس کا اقرار صالح
رضا کاری حق پہ رحمت خدا کی — اسی کا ہوں میں اک طلبگار صالح
بہت ہم نے دیکھے ہیں عبّاد فاجر — بہت ہم نے پائے ہیں فجار صالح
مصائب کی برداشت ردِ جفا میں — اسی کو تو کہتے ہیں ایثار صالح
تمنائے مرحوم وہ بھی جو دل میں — اسی کا ہوں میں اک عزادار صالح
ولایت کا دعویٰ نہیں مجھ کو لیکن — ہوں اتنا کہ ہوں اک گنہگار صالح
میں بیزار ہوں عقلِ بیباک سے حسرت
دلِ مضطرب ہے مرا یار صالح

حیاتِ نظامی

سلجوقیوں کا عہدِ سلطنت اسلامی تاریخ میں ایک شاندار اور ممتاز درجہ رکھتا ہے[ا]۔ اس خاندان کے اوجِ شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے، اور یہی دَور فارسی شاعری کا معراجِ شباب ہے۔ خصوصاً سلطانِ سنجر کے عہدِ فرخ عہد میں لٹریچر اور سائنس کو جو ترقی حاصل ہوئی اسکی نظیر کسی دوسرے کے عہدِ سلطنت قبل یا بعد میں نہیں پائی جاتی۔ جبکہ ایران میں عربی کی نہایت اہم اور ضروری تصانیف مہیا کی جا رہی تھیں، سنجر کے عہد میں فارسی مصنفین نظم و نثر کی تعداد روز افزوں تھی۔ اسی عہدِ زرّیں میں فارسی کے بےمثل اور زبردست شاعر حضرت نظامی گنجوی پیدا ہوے۔

نام و نسب و ولادت — الیاس نام، ابو محمد کنیت، اور نظام الدین انکا لقب تھا جس پر سے انھوں نے اپنا تخلص نظامی اختیار کیا۔ انکے باپ کا نام یوسف بن زکی مؤید تھا[۲]۔

ا؎ محمڈن ڈینیسٹیز از اسٹنلی لین پول صفحہ ۱۲۹

۲؎ انکے نام میں تذکرہ نویسوں کا بہت کچھ اختلاف ہے:-

(۱) دولت شاہ (تذکرہ صفحہ ۱۲۵ مطبوعۂ یورپ): "شیخ نظامی ہو ابو محمد الیاس یوسف ابن موید"

(۲) حاجی خلیفہ (کشف الظنون جزء الثانی صفحہ ۱۴) "نظامی و ہو الشیخ جمال الدین ابو محمد یوسف بن موید"

(۳) آذر اصفہانی (آتشکدہ صفحہ ۲۴۲ مطبوعۂ بمبئی) "ابو محمد نظام الدین احمد یوسف"

(۴) سر گور اوسلی (تذکرۂ شعرائے فارسی صفحہ ۴۳) "ابو محمد بن یوسف بن موید شیخ نظام الدین"

(۵) ڈاکٹر ریو (فہرست برٹش میوزیم) "نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسف"

(۶) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۹ صفحہ ۵۲۱) "نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسف"

اصل وطن انکا تفرش (اعمال قم سے) ہے۔ والد یا جد انکے گنجہ[1] میں جو آذربائجان کے کے معتبر شہروں میں سے ہے آکر رہے۔ اور وہیں نظامی پیدا ہوئے۔ خود سکندرنامہ بحری میں فرماتے ہیں

"نظامی ز گنجینہ بکشاے گنج گرفتاری گنجہ تا چند چند
چو دُر گرچہ در بحر گنجہ گمم ولے از قہستان شہر قمم[2]"

انکی تاریخ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ نظامی نے سنہ ۵۹۹ھ مطابق سنہ ۳-۱۲۰۲ء وفات پائی[3]۔ اور چونکہ اُنھوں نے ۶۳½ برس کی عمر پائی اس لیے سالِ ولادت سنہ ۵۳۵ھ مطابق سنہ ۴۱-۱۱۴۰ء سمجھنی چاہیے[4]۔

---

(۷) ڈاکٹر ولیم باخر (لٹریری ہسٹری آف پرشیا از پروفیسر براؤن جلد دوم صفحہ ۴۰۱) "الیاس بن یوسف بن زکی مؤید"۔

ان سب میں موخرالذکر زیادہ صحیح ہے کیونکہ خود نظامی نے لیلیٰ مجنوں میں اپنے نام کی تشریح کردی ہے۔

"در خطِ نظامی ار نہی گام بینی عدد ہزار و یک نام
والیاس کالف بری ز نامش ہم با نود و نہ است نامش
گر شد پدرم بہ نسبتِ جد یوسف پسرِ زکی مؤید"

[1] روس کا ایک قصبہ ہے، اور اب Elizabethpol الزابتھ پول کہلاتا ہے۔

[2] آغا احمد علی (ہفت آسماں صفحہ ۲۷) لکھتے ہیں کہ جتنے نسخے سکندرنامۂ بحری کے میری نظر سے گزرے، کسی میں میں نے یہ شعر نہیں پایا۔

[3] (۱) دولت شاہ (تذکرہ صفحہ ۱۳۱) سنہ ۵۷۶ھ
(۲) حاجی خلیفہ (کشف الظنون صفحہ ۲) سنہ ۹۷-۵۹۶ھ
(۳) تاریخ جہاں آرا ...... سنہ ۵۹۶ھ
(۴) حبیب السیر ...... سنہ ۵۹۲ھ
(۵) وان ہیمر (ہسٹری آف پرشین لٹریچر)
(۶) وان ارڈمین (فردوان ڈینیٹی)
(۷) ایتھ (ریفیس ٹوشاہنامہ)
} سنہ ۵۷۶ھ
(۸) تقی کاشی (۹) ڈاکٹر اسپرنگر سنہ ۶۰۶ھ
(۱۰) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۷ صفحہ ۵۲۱) سنہ ۵۹۹ھ۔ ان سب میں موخرالذکر صحیح ہے۔

[4] نظامی نے لیلیٰ مجنوں کے دیباچہ میں جو [illegible] میں لکھی گئی لکھا ہے کہ اسوقت انکی عمر ۴۹ برس کی ہے۔ سکندرنامہ پورا ہوا اسوقت انکی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ اور چونکہ اسکے چند مہینوں بعد ہی نظامی نے وفات پائی اس لحاظ سے سالِ وفات سنہ ۵۹۹ھ ہوئی تو سالِ ولادت [illegible] ہونی چاہیے۔

اعزہ واولاد

ایامِ طفولیت ہی میں سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا، ساتھ ہی انکی والدہ نے بھی جو کردی نسل کی ایک رئیسہ تھیں اپنے شوہر کی پیروی کی۔ نظامی کی تعلیم و تربیت کا بار ان کے ماموں خواجہ عمر کے سر پڑا لیکن اُس نے انکی چنداں خبرگیری نہیں کی۔ چنانچہ ان واقعات کی نسبت خود لیلیٰ مجنوں میں فرماتے ہیں :-

"با [illegible] پدرم کہ ماند زادم ... تا خونِ پدر خورم زعالم
گر مادرِ من رئیسۂ کرد ... مادر صفتانہ پیشِ من مُرد
کو خواجہ عمر کہ خالِ من بود ... حالی شد نشش وبالِ من بود"

نظامی کے ایک بھائی قوامی مطرزی بہت بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے ایک نہایت مشہور قصیدہ لکھا ہے۔ اس قصیدہ میں تمام صنائع وبدائع استعمال کیے گئے ہیں[۱]۔ یہ ۱۰۱ ابیات کا مرصع قصیدہ جو یورپ میں "Ornate Eulogy" قصیدۂ مصنعہ کے نام سے مشہور ہے کتابِ خرابات مصنفۂ ضیا پاشا جلد اول صفحہ ۱۹۸-۲۰۱ پر مرقوم ہے۔ جسکا پہلا شعر یہ ہے :-

"اے فلک را ہوائے قدر تو بار ... وے ملک را ثنائے صدر تو کار[۲]"

اس میں صنعتِ ترصیع کے علاوہ حُسنِ مطلع بھی ہے۔ قوامی کے اشعار کا مجموعہ جو تقریباً ۶۴۴۶۴ ہے فی زماننا عجائب خانۂ لندن میں محفوظ ہے[۳]۔

خود نظامی کی تصانیف مُظہر ہیں کہ انھوں نے تین شادیاں کیں۔ اولاد میں ایک لڑکا محمد نامی تھا جو غالباً ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴-۷۵ء میں پیدا ہوا ہوگا، کیونکہ جب نظامی نے مثنوی لیلیٰ و مجنوں (۵۸۴ھ) ختم کی اُس وقت اُسکی عمر ۱۴ برس کی تھی، چنانچہ اسی مثنوی میں اپنے فرزندِ دلبند کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

---

۱؎۔ تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۱۲ مطبوعۂ یورپ۔

۲؎ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۴۰۲ -

۳؎ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۴۰۳ -

"اے چاردہ سالہ قرۃ العین! بالغ نظرِ علوم کونین
آں روز کہ ہفت سالہ بودی چوں گُل بچمن حوالہ بودی
واکنوں کہ بچاردہ رسیدی چوں سرو باوج سرکشیدی"

انکی ایک لڑکی بھی تھی۔ چنانچہ سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ پر جبکہ انھوں نے اپنی لڑکی اور لڑکے محمد کو ملک نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا لکھتے ہیں :-

"دو گوہر برآمد ز دریائے من فروزندہ از روئے شاں رائے من
یکے عصمت مریمی یافتہ یکے نورِ عیسیٰ بر و تافتہ"

تحصیل علوم نظامی نے درسی علوم کی تحصیل کی۔ انکے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام مروجہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ خود بھی دعوے کرتے ہیں :-

"ہر ورقے دفتر آراستہ ہر نکتۂ خامۂ خواستہ
پذیرفتہ از ہر فنے روشنی جدا گانہ از ہر فنے یک فنی"

مولانا جامی[1] لکھتے ہیں کہ شیخ نظامی کو علومِ ظاہری، اور مصطلحاتِ رسمی سے بہرۂ وافی حاصل تھا۔ لیکن وہ سب سے دست بردار ہو کر حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"ہرچہ ہست از دقیقہائے نجوم بایکایک نہفتہائے علوم
خواندم وسرِّ ہر ورق جستم چوں ترا یافتم ورق شستم
ہمہ را روئے در خدا دیدم وال خدا بر ہمہ ترا دیدم"

عام حالات، اخلاق و عادات شاعری کا مادّہ نظامی میں فطرتاً مودَع تھا۔ شاعر ماں کے پیٹ ہی سے "شاعر پیدا ہوتا ہے" گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا اس لیے علوم درسی سے فارغ ہو کر شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دن بدن مشق بڑھتی گئی، اور انکے کلام کا شہرہ چاروں طرف پھیل گیا، جس نے سلاطینِ وقت کو اپنی طرف ملتفت کر لیا۔ وہ انکی بہت قدر و منزلت کرتے تھے، اور اُن میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ نظامی اپنی کوئی تصنیف ہمارے نام پر معنون کرے۔

[1] نفحات الانس۔

نظامی صوفی مشرب تھے، اور انھیں شیخ اخی فرج زنجانی سے بیعت تھی[۱]۔ عادات و اخلاق کے لحاظ سے انکا کیرکٹر بالکل صاف و بے لوث ہے۔ وہ نہایت پرہیزگار، اور امورِ مذہبی میں محتاط تھے۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ سب سے زیادہ قابلِ تعریف یہ بات ہے کہ وہ دخترِ رز سے عمر بھر نا آشنا رہے، جو اکثر شعرائے فارس کا غالب عنصر رہ چکی ہے۔ اسکا ذکر وہ خود سکندرنامۂ برّی میں قسمیہ کرتے ہیں:-

"وگرنہ بہ ایزد کہ تا بودہ ام ... بہ مے دامنِ لب نیالودہ ام
گر از مے شدم ہرگز آلودہ کام ... حلالِ خدا بر نظامی حرام"

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شیخ نے خلوت نشینی اختیار کرلی تھی، اور لوگوں سے بالکل اختلاط نہ رکھتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"گلِ رعنا درونِ غنچہ حزیں ... ہمچو من گشتہ اعتکاف نشیں[۲]"

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اتابک قزل ارسلان کو شیخ نظامی سے ملنے کی خواہش ہوئی، اور اپنا آدمی انکے بلانے کو بھیجا۔ معلوم ہوا کہ شیخ نے گوشہ نشینی اختیار کی ہے، اور صحبتِ حکام و سلاطین سے محترز ہیں۔ چنانچہ اتابک خود امتحاناً شیخ کے دیکھنے کو گیا۔ انھوں نے از روے کرامت معلوم کرلیا کہ اتابک میرے امتحان کو آتا ہے، اور مجھے درویش بینوا و گوشہ نشیں سمجھ کر حقارت سے دیکھتا ہے۔ شیخ نے اپنی کرامت کا ایک شمہ اُسکو دکھلادیا۔ اُس نے دیکھا کہ زر و جواہر سے مرصع ایک تخت شاہانہ بچھا ہوا ہے اور شیخ اُس تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ ایک لاکھ غلام مع مصاحبوں اور ندیموں کے صف بستہ کھڑے ہیں۔ اتابک نے بکمال عجز و عقیدت مندی شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، اور اُس کا اعتقاد شیخ کے بارے میں زیادہ راسخ ہوگیا، اور اسکے بعد سے شیخ کی نظر التفات بھی اُسپر رہا کرتی گاہ بگاہ اُس سے ملنے جایا کرتے تھے[۳]

[۱] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۲۵ مطبوعۂ یورپ۔ [۲] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۲۸ [۳] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۲۹ آتشکدہ صفحہ ۲۶۲۔ تذکرہ مرآۃ الخیال صفحہ ۷۵-۷۶ Dole Persian poets صفحہ ۹۰

مولانا جامیؒ لکھتے ہیں :-

"شیخ نظامیؒ نے عمر گرانمایا اول سے آخر تک قناعت و تقوی، اور عزلت وانزوا میں گزری اور ہرگز تمام شاعروں کی طرح غلبۂ حرص وہوا سے اربابِ دنیا کی ملازمت اختیار نہیں کی بلکہ سلاطینِ روزگار اُن سے برکت اور فیض حاصل کرتے تھے" ؎۱

چنانچہ خود ہفت پیکر میں فرماتے ہیں :-

"چوں بعہدِ جوانی از برِ تو | بدرِ کس نرفتم از درِ تو
ہمہ را بر درم فرستادی | من نمی خواستم تو میدادی
چونکہ بر درگہِ تو گشتم پیر | زانچہ ترسید نیست دستم گیر"

نظامیؒ کی عزلت گزینی کا خاص سبب تقاضائے سِن ہے جسکی نسبت وہ سکندرنامہ بری میں کہتے ہیں

"توانم در زہد بر دوختن | بہ بزم آمدن مجلس افروختن
ولیکن درختِ من از گوشہ رست | زجا گر بہ جنبم شود بیخ سُست
چلہ چوں چہل گشت خلوت ہزار | بہ بزم آمدن دُور باشد زکار
. . . . | . . . .
ہاں بہ کہ با ایں چنیں بادِ سخت | بروں نا ورم چوں گل از گوشہ رخت
بخود گم شوم خلق را از ہنماے | ہمایوں زکم دیدن آمد ہُماے
سرم پیچد از خفتن و تاختن | نہ دانم دِگر چارۂ ساختن
ملالت گرفت از من ایام را | بہ کُنجِ ارم بردم آرام را
درِ خانہ را چوں سپہرِ بلند | ز دم بر جہاں قفل دربِ خلق بند"

مدح گوئی | مذکورۂ بالا نکلنش کے علاوہ نظامیؒ کے حالات بہت کم دریافت ہوئے ہیں جس کا سبب تذکرہ نویسوں نے انکی گوشہ نشینی قرار دیا ہے۔ لیکن ایک حد تک یہ صحیح نہیں، ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ نظامی نے اپنی اواخر زندگی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی اسلیے انکے مزید حالات

؎۱ نفحات الانس

وسوانح کا دریافت ہونا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ لیکن نہایت ہی قابل افسوس امر یہ ہے کہ جو تذکرہ نویس خود نظامی کے معاصرین تھے یا انکے بعد ہوئے اُنھوں نے نظامی ایسے بلند پایہ شاعر کے ساتھ بالکل اعتنا[1] نہیں کیا، اور محض چند بے سروپا باتوں، اور لفاظی کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ ان میں سے ایک محمد عوفی بھی ہے۔

نظامی کے حالات میں سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر تذکرہ نویس انکے اس وصف کا مداح ہے کہ وہ بادشاہوں کی بیجا خوشامد اور مدح سرائی سے پاک تھے[2] لیکن نظامی کی مثنویات میں جو مدحیات سلاطین کی پائی جاتی ہیں، ان میں اس قدر مبالغہ اور خوشامد پائی جاتی ہے جو عموماً درباری شعراء اور مداحوں کا طریقہ ہے۔

"اس سے بڑھ کر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انکو اُسکے سوا، کسی دربار سے تعلق نہیں، اور وہ اسکو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں۔ بے شبہ اُنھوں نے مدحیہ قصائد نہیں لکھے، لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جنکے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں"[3] ملاحظہ ہو:-

"ولایت ستان شاہ گیتی پناہ — فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ
ستارہ کہ بر چرخ سایہ سرش — زدہ سکۂ عبدہٗ بر درش
چو تیر از کمان کمیں افگند — سر آسماں بر زمیں افگند
ز زنگ و فلسطین و رہبان و روم — پذیرائے فرمان مہرش چو موم"

---

[1] عوفی چھٹی صدی ہجری میں گزرا ہے اور نظامی کا معاصر ہے اس نے تاریخ "لباب الالباب" لکھی ہے جسمیں ایک حصہ خاص شاعروں کے حالات میں ہے کتاب کو نایاب تھی پروفیسر براؤن نے اسکی تصحیح کرکے لنڈن میں طبع کرائی ہے۔

[2] آتشکدہ۔ دولت شاہ۔ نفحات الانس۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ "فارسی شعراء" وغیرہ

[3] شعر العجم جلد اول صفحہ ۲۹۹ (مصنفہ علامہ شبلی)

نظامی کی مثنویاں

ویس و رامین آذر اصفہانی لکھتے ہیں کہ "سب سے پہلے نظامی نے "ویس و رامین"[1] کے قصہ کو نظم کیا، یہ اُس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ ہنوز انکے کلام میں پختگی کا رنگ پیدا نہ ہوا تھا[2]" اور آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "لیکن فقیر کے زعم میں یہ جناب شیخ ہی کی تصنیف ہے بہرحال انکی دیگر تصانیف پر نظر کرتے ہوے قصہ مذکور کو شیخ سے نسبت دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی[3]" بعض تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ یہ قصہ نظامی عروضی سمرقندی نے نظم کیا ہے[4] لیکن عوفی، جامی، امین رازی، والہ داغستانی، آزاد بلگرامی، وغیرہ تذکرہ نویس اس قصہ کو فخرالدین اسعد جرجانی کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ پروفیسر براؤن بھی لکھتے ہیں :-

"ویس و رامین" کو فخرالدین اسعد جرجانی نے نظم کیا ہے یہ ۱۰۴۸ء کی تصنیف ہے جبکہ سلطان طغرل اہل رومہ پر فتح پا چکا تھا، اور طغرل کے وزیر عمیدالدین ابوالفتح مظفر نیشاپوری کے نام پر معنون کی گئی ہے[5]"

مثنوی "ویس و رامین" مذکور، ایک قلمی مسودہ پر سے بتصحیح و ترتیب آغا احمد علی صاحب، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سلسلۂ "ببلوتھیکا انڈیکا"[6] میں ۱۸۶۵ء میں بمقام کلکتہ طبع ہو چکی ہے[7] جسکی نسبت آغا صاحب موصوف لکھتے ہیں :-

---

[1] یہ قصہ اصل میں پہلوی زبان کا ہے جو نظم میں لکھ گیا تھا ۔

[2] آتشکدہ صفحہ ۲۴۲

[3] آتشکدہ صفحہ ۲۴۲

[4] دولت شاہ صفحہ ۶۰ و صفحہ ۱۳۰ - مطبوعۂ یورپ - کشف الظنون جزو ثانی صفحہ ۶۴۴ مطبوعۂ مصر -

[5] اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۲۷۴ مطبوعۂ یورپ

[6] "Bibliotheca Indica Series"

[7] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۲۷۴-۷۵

مختصر رپورٹ انجمن ترقی اُردو

اورنگ آباد دکن

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء

(۱) حسب ذیل حضرات نے اپنا چندۂ رکنیت روانہ فرما کر انجمن کو ممنون فرمایا - اسماء مع چندہ درج ذیل ہیں -

(۱) مسٹر داراب جی باپوجی چنائی مددگار معتمد مالگزاری	حیدرآباد دکن	عہ	سکۂ عثمانیہ
(۲) جناب مولوی غلام اکبر خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ	"	عہ	"
(۳) جناب مولوی نذیر محمد صاحب ڈرائینگ ماسٹر مدرسۂ صنعت و حرفت	نظام آباد	عہ	"
(۴) جناب مولوی مرزا منظور احمد خاں صاحب جنرل انسپکٹر پائگاہ		عہ	"
(۵) جناب مولوی محمد اسد اللہ خاں صاحب بی اے رجسٹرار مجلس وضع قوانین سرکار عالی		عہ	"
(۶) جناب پروفیسر قادر حسین خاں صاحب ایم اے سول سروس کلاس حیدرآباد دکن		عہ	"
(۷) جناب مولوی احمد خاں صاحب ہڈ کوارٹر انسپکٹر پولیس نلگنڈہ		عہ	"
(۸) جناب مولوی مصطفےٰ علی صاحب وکیل جالنہ		عہ	"
(۹) جناب مولوی طاہر حسین صاحب بی اے صدر مدرس مڈل جالنہ		صمہ	سکۂ قیصری
(۱۰) جناب مولوی منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال		عہ	"
(۱۱) جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب ڈویژنل افسیر سونی پت		عہ	"
(۱۲) جناب مولوی عبدالوحید صاحب ایم اے پیرزادہ درگاہ اجمیر		عہ	"
(۱۳) جناب مولوی سیٹھ یعقوب حسن صاحب مدراس		عہ	"
(۱۴) جناب مولوی عبدالرزاق صاحب تحصیلدار دیوان گنج بھوپال		عہ	"

(۱۵) جناب نواب غلام احمد صاحب کلامی کورومنڈل بنگلور — عہ — سکۂ قیصریہ

(۱۶) جناب سید محفوظ علی صاحب بی اے بدایوں — عہ — ״

(۲) حضراتِ ذیل نے جدید ارکانِ انجمن ہونا منظور فرمایا۔ اسماء مع چندہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جناب مرزا مقصود احمد خاں صاحب ہڈکوارٹر انسپکٹر پولیس نانڈیر — عہ — سکۂ عثمانیہ

(۲) جناب قاضی فیاض حسین صاحب وکیل بھوپال — عہ — سکۂ قیصریہ

(۳) حضرات نے مندرجہ ذیل کتب بطور عطیہ انجمن کو مرحمت فرمائیں۔ شکریہ ادا کیا جاتا ہے

(۱) جناب حاجی نواب اسحٰق خاں صاحب آنریری سکرٹری علی گڑھ کالج نے حال ہی میں اپنے نامور والد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ مرحوم کا فارسی و اردو کلام جمع کرکے طبع کیا ہے اور اس کے ابتدا میں مرحوم کے حالات بھی درج ہیں، جناب نواب صاحب ممدوح نے اس کا ایک نسخہ انجمن کو بھی عنایت فرمایا۔

(۲) جناب منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال نے حسب ذیل کتب روانہ فرمائیں۔ پہیلیاں آغوشِ مادر۔ ہندوستانی گھروں میں تیمارداری۔ نٹنگ یعنی بننے کا رسالہ۔ حفظ صحت خانہ داری کا دوسرا رسالہ۔ آغاز اسلام۔ تفریح الاطفال۔ رموز فطرت۔

(۴) انجمن عالی جناب نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) کی بے انتہا ممنون ہے کہ آپ نے سرتاج حکمائے اسلام محمدؒ ابن الہیثم کی عدیم النظیر و نادر الوجود کتاب تنقیح المناظر عطا فرمائی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس پر پانچ صدی تک یورپ میں علم مناظر کا دارومدار رہا ہے۔ اور دنیا کے تمام بڑے بڑے سائنس داں اس کے زیر بارِ منت رہے ہیں۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ اس کے ترجمہ و ترتیب کے لیے خاص انتظام کرے۔ کیونکہ یہ ایک بہت اہم اور عظیم الشان کام ہے۔

(۵) علم المعیشت (مولفہ مسٹر محمد الیاس برنی ایم اے) مطبع علی گڑھ انسٹیٹیوٹ میں طبع ہو رہی ہے اور تقریباً نصف کتاب ہو چکی ہے۔ فقط

عبد الحق بی اے (علیگ)
آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن

مختصر رپورٹ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

بابت مئی سنہ ۱۹۱۶ء

(۱) حسب ذیل حضرات نے اپنا چندہ رکنیت روانہ فرما کر انجمن کو ممنون فرمایا اسماء مع چندہ درج ذیل ہیں

(۱) جناب مولوی منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال (عہ/) سکۂ قیصریہ

(۲) جناب مولوی ظہور الحسن صاحب کنٹراکٹر محبوب نگر (عہ/) سکۂ عثمانیہ

(۳) جناب رنگا رڈی صاحب تحصیلدار پرکال (عہ/) ″

(۴) جناب مسٹر ڈی۔ بی کامٹ بی۔ اے مہتمم تعلیمات پربھنی (للعہ) ″ منقدما تاریخ لغایت جون سنہ ۱۹۱۶ء

(۵) جناب مولوی عباس علی صاحب ناظم مدارس ضلع پربھنی (لے) بابت ششماہی اول سنہ ۱۹۱۶ء

(۲) جناب مولوی محمد مہدی صاحب نے جدید رکن انجمن ہونا قبول فرمایا اور اپنا چندہ سال تمام بابت سنہ ۱۹۱۶ء مبلغ (عہ) سکۂ قیصریہ عنایت فرمائے۔ تشکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(۳) جناب مولوی سید محی الدین خاں صاحب (جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن) نے جو مشہور عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اپنی تصانیف میں سے حسب ذیل کتب انجمن کو عنایت فرمائیں۔

(۱) اسرار الانفاس (۲) عین الیقین (۳) تعلیم الفرائض (۴) سلک السلام (۵) منتخبات العہدین (۶) عقائد محمدیہ (۷) مظہر الاسرار ہر سہ حصہ (۸) تحقیق الابہام (۹) محبوب القلوب (۱۰) فخر الاذکار (۱۱) معارف الٰہیہ (۱۲) صحیفۂ عثمانیہ۔

(۴) جناب سید محی الدین صاحب نے علاوہ اپنی اُن مطبوعہ تصانیف کے جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے اپنی غیر مطبوعہ تالیف بھی عنایت فرمائی ہے جس میں اُن مندروں کا حال درج ہے جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں غاروں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے شروع میں ایک مبسوط اور ضخیم مقدمہ ہے جس میں ہندو مذہب اور ہائی ہقالوجی کا مفصل تذکرہ ہے۔ انجمن جناب ممدوح کی بیحد شکر گزار ہے۔

عبدالحق آنریری سکرٹری

مطبوعاتِ جدید

فلسفۂ اجتماع مسٹر عبد الماجد بی اے مصنف فلسفۂ جذبات نے علم النفس کی یہ دوسری کتاب انجمن کے لیے لکھی ہے جس کا انگریزی ایڈیشن تھوڑے سے تغیر کے ساتھ انگلستان کے مشہور کارخانہ فشر انون کمپنی کے یہاں چھپا ہے۔ فلسفۂ جذبات میں جہاں افراد انسانی کے نفسیاتی ادراک اور اُس کے زیر اثر جو افعال سرزد ہوتے ہیں اُن سے بحث کی گئی تھی یہاں فلسفۂ اجتماع میں اُن کیفیات وحیاتِ نفس کا بیان ہے جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں فاضل مصنف نے بڑی خوبی و امثال کے ساتھ اُن تعلقات کا ذکر کیا ہے جو لیڈروں اور عوام میں پایا جاتا ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ

البیرونی اس میں مسٹر سید حسن برنی بی۔ اے (علیگ) نے بڑی کوشش و جستجو سے علامہ ابو ریحان بیرونی کے حالات جمع کیے ہیں اور اس علامۂ اجل کی سوانح عمری مرتب کرکے اہل ملک کو کتاب الہند کے مصنف کی زندگی کے اہم واقعات اور اُس کے کمال ذوق علمی اور طالبعلمانہ تجسس و تلاش سے آشنا کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے اس بات کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی علم و فن کے حاصل کرنے کے لیے کس قدر استقلال۔ ہمت اور جفاکشی کی ضرورت ہے۔ بیرونی کی حقیقی عظمت کا زیادہ صحیح اندازہ اُردو خواں اصحاب کو اُس وقت ہو سکے گا جب کتاب الہند کا ترجمہ ہماری زبان میں ہو جائیگا مگر اس نسبتاً مختصر سوانح عمری اور تبصرہ سے بھی ایک حد تک اس جلیل القدر محقق کے مرتبہ اور مدارج کمال کا اندازہ ہو جائے گا۔ مجلد قیمت عہ

مقدمات الطبیعات مولفۂ عالیجناب مرزا مہدی خاں صاحب کوکب، ایم۔ آر۔ ایس۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ای، ایف۔ جی۔ ایس، سابق ناظم محکمۂ مردم شماری ریاست حیدرآباد دکن۔ مرزا صاحب موصوف کو دولتِ آصفیہ نے خاص علوم طبیعیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجا تھا۔ یہ لاجواب تالیف جو اُردو زبان میں اپنی صنعت کی پہلی ہی کتاب ہے، تکمیل تعلیم کے بعد عرصہ تک اس فن کے مطالعہ اور کامل غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ وہ اصحاب جو اُردو میں اعلیٰ درجہ کی کتب کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں اس سے پوری طرح استفادہ کریں۔ محترم مولف چونکہ قدیم اور جدید علوم و السنہ کے یکساں طور پر ماہر ہیں اس وجہ سے اصطلاحاتِ علمیہ کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا ہے اور اُن اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ حجم ۲۰ جزو۔ قیمت عہ مجلد عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۵ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء

بمنٹ ۳۷

گھیگھے کی دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی

گھیگھا سخت اور بہت بڑا یا بہت دنوں کا ہو جانے سے آرام نہیں ہوتا مگر تھوڑے دن کا ورم رہتے ہی علاج برابر کرنے سے چھوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر برمن کی دوا ایسے گھیگھے کو آرام کرنے کا دعوے رکھتی ہے دوا ایک ماہ تک کرنا چاہئے اسمیں صرفہ بھی بہت کم ہے۔ دوا ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی ملتی ہے۔ جو کہ ہفتہ کے لئے کافی ہوتی ہے۔ قیمت کھانے کی دوا بارہ آنہ ۱۲؍ لگانے کی دوا چار آنہ ۴؍ محصول ڈاک پانچ آنہ ۵؍

دانت کے درد کی دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی

لگاتے ہی درد مٹاتی ہے۔ روتے کو ہنساتی ہے ایک باریک و مضبوط تنکے یا سینک کے سرے پر روئی لپیٹ کر اسے اس دوا میں ڈبو کے ٹھیک درد کے مقام پر لگائیے، اور اگر دانت کی جڑ میں درد ہو تو ذرا سی روئی ڈبو کے اسمیں بھر دیں فوراً درد بند ہوتا ہے قیمت چار آنہ ۴؍ محصول ڈاک ایک سے (۸) شیشی تک ۶؍

فصلی بخار و تلی کی دوا

آجکل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہونگے اُس میں عموماً کونین رہتی ہے اس لیئے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک روک دیتی ہیں۔ لیکن آرام نہیں دے سکتی ایسے بخار کے لئے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار کی دوا چند روز میں ایکدم آرام کرنے کا دعویٰ رکھتی ہے اور عوام کا فائدہ مدنظر رکھکر قیمت بھی کم رکھی گئی ہے اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) یہ ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے اس لئے چار پانچ خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اسکی خرابیوں کو مٹاتی ہے۔ (۳) یہ تلی کو گلاتی ہے۔ قیمت شیشی کلاں ۸؍ شیشی خورد ۶؍ محصول ڈاک ۵؍ دو شیشی ۶؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۷ جلد ۱۵ ــــــــــــ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء

دایرۂ معارف مشرقیہ

اخی محترم مولوی ظفر علی خاں بی اے کی علمی و ادبی خدمات اور کمال انشا پردازی سے اس وسیع ملک کے کم لوگ ہون گے جو واقف نہ ہوں۔ اور ہماری قوم کا تو بچہ بچہ پوری طرح پر روشناس ہو چکا ہے بے شبہہ اُن کی شہرتِ عام کا ذریعہ اخبارِ زمیندار ہوا جو ہماری زبان کا نہ صرف سب سے کثیرالاشاعت اخبار تھا بلکہ عامۃ الناس میں ذوقِ اخبار بینی کی پیدائش و افزایش کا بھی سب سے بڑا آلہ ثابت ہُوا ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس پر اُسکے مالک ایڈیٹر کو ہم حد درجہ قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ لیکن مولوی ظفر علی خاں کی جس قدر عظمت ہمارے دل میں ہے۔ ذاتی تعلقاتِ عزیزانہ سے قطع نظر کرکے۔ ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی بنیاد "زمیندار" کے معرض وجود میں آنے سے قبل ہی پڑ چکی تھی۔ اور جو حقیقت میں اُن کے متعدد تراجم اور مضامین نظم و نثر کا نتیجہ ہے جو صاحب موصوف نے بہ زمانۂ قیام حیدرآباد دکن لکھے اور شایع کیے۔ خیابان فارس۔ جنگل میں منگل۔ سیرِ ظلمات۔ معرکۂ مذہب و سائنس اور فسانۂ لندن کو جن اصحاب نے بہ نظرِ غور پڑھا ہے وہ اس بات میں یقیناً ہم سے متفق ہوں گے

کہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی جو مہارت مولوی ظفر علی خاں کو ہے وہ اُنھیں کا حصہ ہے
اس میدان میں اور کوئی دوسرا شخص اُن کا ہمسر اور مد مقابل نہیں نظر آتا۔

بد قسمتی سے ایڈیٹر زمیندار کی مقبولیت عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں جس قدر بڑھتی گئی اُسی قدر حکمراں جماعت کے اعلیٰ افراد کے دلوں میں بدگمانیوں کی جڑ مضبوط ہوتی گئی اور پامال و شکست خوردہ رقیبوں اور بدنفس و کمینہ سرشت حاسدوں کی تعداد میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ یورپ میں جنگ شروع ہو جانے کے بعد مولوی ظفر علی خاں کو اُس عجیب الخلقت قانون کی رو سے جو قانون تحفظ ہند کے نام سے اہل ہند کی آزادی کا گلا گھونٹنے کے واسطے اب تک رواج پذیر ہے اپنے وطن کرم آباد میں خانہ نشیں ہونے اور اخباری دُنیا۔ ملکی تحریکات اور علمی و ادبی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

تقریباً دو سال تک گمنامی اور بیکاری کی زندگی بسر کرنے کے بعد حال ہی میں گورنمنٹ پنجاب نے اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب اپنی علمی و ادبی خدمات کو جاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اُٹھا کر ہمارے عزیز بھائی نے اپنے کمالات انشاپردازی و ترجمہ نگاری سے قوم و ملک کو مستفیض کرنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے وطن کرم آباد میں "دائرۂ معارفِ مشرقیہ" قائم کیا ہے۔ جس کے متعلق حسب ذیل اعلان ہمارے پاس بغرض اشاعت موصول ہوا ہے:۔

اعلان

بگرامی ملاحظہ جناب ایڈیٹر صاحب الناظر لکھنؤ

جناب مکرم بندہ زاد مجدکم السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

"دائرۂ معارفِ مشرقیہ" کا ابتدائی اعلان خدمت عالی میں اس امید کے ساتھ بھیجا

جاتا ہے کہ نہ صرف اُن حقوقِ دیرینہ کو مدنظر رکھ کر جو اخبار نویسانہ حیثیت سے کسی زمانہ میں مجھے آپ کے دائرۂ نیاز مندی میں داخل کیے ہوئے تھے بلکہ علوم وفنون کی سرپرستی کے خیال سے جو آپ کا فرضِ اوّلیں ہے۔ آپ اس اعلان کو اپنے معزز صحیفے میں نمایاں جگہ دیں گے۔ اور اپنی رائے گرامی سے اس کو محشی فرمائیے میں نے ترجمہ کے لیے مشہور امریکن فاضل ایس۔ پی اسکاٹ کی معرکۃ الآرا تاریخ "ہسٹری آف دی مورش ایمپائران یورپ" تجویز کی ہے۔ میری رائے میں اسلام اور اُس کے تمدن پر یہ بہترین کتاب ہے جو انگریزی زبان میں اب تک لکھی گئی ہے مصنف کا قلم تعصب کی آلایش سے بالکل پاک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہو کہ گویا ایک آزاد خیال مسلمان اس کتاب کو لکھ رہا ہے۔ یہ کتاب جو تین ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے مصنف کی بست سالہ تحقیق وتدقیق اور جاں کاہی وعرق ریزی کا نتیجہ ہے اور اس کا نچوڑ یہ ہے کہ یورپ نے تہذیب وتمدن اور علوم فنون، غرض ترقی کے ہر شعبہ میں جو کچھ بھی ترقی کی ہے اُس کے لحاظ سے وہ اسلام اور مسلمانوں کا شرمندۂ احسان ہے۔

اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ ایک وقت میں شایع نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی تو اس کی قیمت اس قدر ہوگی کہ ہمارا مفلس مُلک اُس کے ادا کرنے پر قادر نہیں۔ اصل کتاب کی قیمت جو تین جلدوں میں ہے پینتالیس روپیہ ہے۔ دائرۂ معارف شرقیہ کی تجویز ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات کی جلدوں میں جو ہر مہینے تیار ہوا کریں شایع ہو اور فی جلد آج کل کے گراں نرخوں کے لحاظ سے ایک روپیہ رکھی جائے اور شایقین کو جن کے نام درج رجسٹر ہو چکے ہوں تیار ہوتے ہی بذریعۂ وی پی یا قیمت وصول ہونے پر بھیج دی جائے۔ پہلے ڈیڑھ سو صفحے تیار رکھے ہیں اور کتابت ہو رہی ہے غالباً یکم اکتوبر تک یہ پہلی جلد اہل مُلک کے ملاحظہ سے گذر سکے گی

براہِ نوازش ان تمام مراتب کو اپنے قلم سے ملک کے گوش گذار فرما دیجیے۔
ایک ٹکڑا اُس کتاب کا نمونہ کے طور پر خدمتِ عالی میں بھیجا جاتا ہے اگر آپ کے
قیمتی صفحات میں اسے جگہ مل سکے تو میری عزت افزائی کا موجب ہوگا۔
یہ کام جیسا آپ پر بخوبی روشن ہے روپیہ کا محتاج ہے۔ اور مجھے آپ کی عنایات
سے پوری اُمید ہے کہ "قرضۂ علمی" کی فراہمی میں آپ کی مساعی جمیلہ جن کا موجودہ
حالت میں مجبوراً محتاج ہوں میری مدد معاون ہوں گی۔

کرم آباد — نیازکیش

۱۴ اگست ۱۹۱۶ء — ظفر علی خاں

دائرۂ معارفِ مشرقیہ اور نیز اُس "علمی قرضہ" کے متعلق جس کی فراہمی کی اعلان مندرجۂ بالا کی آخری سطور میں خواہش کی گئی ہے ضروری تشریحات ذیل کے اشتہار سے معلوم ہوں گی جو مولوی ظفر علی خاں اور اُن کے لائق مددگار مولانا عبداللہ العمادی کے دستخطوں سے شایع ہوا ہے:۔

دائرۂ معارفِ مشرقیہ

خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم سے دائرۂ معارف مشرقیہ کا افتتاح حسب صوابدید ہز آنر سر میکائیل اوڈوائر فرماں روائے کشورِ پنجاب (کرم آباد۔ ڈاک خانۂ وزیر آباد۔ ضلع گوجرانوالہ میں) ہوگیا۔ کتابیں طیار ہو رہی ہیں جو اہلِ ملک کی خدمت میں جلد پیش ہوں گی۔ تشریح کسی دوسرے اعلان میں کی جائے گی۔

دائرہ کے مقاصد ملخصاً یہ ہیں:۔

(الف) انگریزی عربی۔ فارسی۔ سنسکرت کی معرکۃ الآرا تصانیف قدیم و جدید کا اُردو زبان میں ترجمہ کرکے شایع کرنا۔

(ب) مشرق و مغرب کے بہترین لٹریچر کی اشاعت سے اِن دونوں دنیاؤں میں اتصال پیدا کرنا

(ج) ہندوستان قدیم وجدید کے متعلق ہر ایک پہلو سے تاریخی و علمی تنقیح و اکتشاف۔

(د) علمی و ادبی اکتشافات کے بہترین نمونے پیش کرنے سے ملک میں محققین کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو اپنے آپ کو خدمتِ علم کے لیے وقف کردے۔

(ھ) قدیم وجدید لٹریچر پر حکیمانہ تبصرہ۔

(و) ایسا لٹریچر شایع کرنا جو تہذیب و تمدن و حسن معاشرت و تعلیم و تربیت رجال و نسا، میں معاون ہو۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے دائرہ کا طریق عمل یہ ہوگا:۔

(۱) دائرہ کا سرمایہ بالفعل ۲۵ ہزار روپیہ قرار پایا ہے جس کی فراہمی میں اہل ملک کی علمی سرپرستی سے استمداد کی جائے گی اور اس غرض سے کہ عوام و خواص اور ہر طبقہ و درجہ کے لوگ اس سرمایہ کے جمع کرنے میں دائرہ کو مدد دے سکیں۔ سرمایۂ مطلوبہ کو پانچ پانچ روپے کے پانچ ہزار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۲) ہر ایک شخص مجاز ہوگا کہ ایک یا اُس سے زائد حصے خریدے۔

(۳) یہ حصص "علمی قرضہ" کے نام سے تعبیر ہوں گے۔

(۴) علمی قرضہ کے ادا کرنے کی میعاد دو سال ہوگی۔

(۵) میعاد ختم ہونے پر علمی قرضہ کی اصل رقم مع زر فائدہ کے ادا کردی جائے گی۔

(۶) فائدہ یا منافع پانچ روپیہ کی مالیت کی مطبوعات کی شکل میں ادا کیا جائے گا جو دائرہ کے زیر اہتمام شائع ہوں گی۔

(۷) ایک سے زائد حصہ کے خریداروں کو مطبوعاتِ دائرہ بقدر اُن کی مالیتِ زرِ حصص کے دی جائیں گی۔ اور اگر زرِ حصص مطبوعاتِ دوسالہ کی قیمت سے زیادہ ہو تو اُن کے منافع کا سلسلہ بعد انقضاے میعاد بھی اُس وقت تک جاری رہے گا کہ مطبوعات کی مالیت حصص کے مساوی ہو جائے۔

اغراض و مقاصد دائرہ کی تکمیل و اشاعت کے لیے ایک اخبار بھی ہوگا جو بالفعل ہفتہ وار

شایع ہوا کرے گا، اور جس کا دائرۂ عمل صرف اپنے مقاصد مذکورہ ہی تک محدود رہے گا۔ اس اخبار کے خریدار باختلاف مراتب دائرہ کے رکن متصور ہوں گے۔

خریداران حصص اپنے اپنے حصوں کے روپے "مہتمم دائرہ معارف مشرقیہ۔ کرم آباد۔ ڈاکخانہ وزیرآباد۔ ضلع گوجرانوالہ" کے نام بھیجیں اور اسی عنوان سے خط و کتابت کریں۔ زرِ حصص کی باقاعدہ رسید دی جائے گی اور اُس کا اعلان دائرہ کے اخبار میں ہوا کریگا۔ وباللہ التوفیق

کرم آباد — ظفر علی خاں

۱۵ اگست ۱۹۱۶ء — عمادی

یہ امر باخبر اصحابِ مُلک سے مخفی نہیں کہ اعلیٰ درجہ کی اور ضخیم کتابوں کی تیاری و اشاعت کس قدر دشوار کام ہے۔ ہم لوگ مفلسی، عام بے حسی اور علوم و فنون کی طرف سے عام بے التفاتی کی بنا پر مجبور ہی ہیں لیکن یورپ و امریکہ جو اس زمانہ میں جنس علمی کی سب سے بڑی منڈیاں ہیں اور جہاں فراوانیٔ سرمایہ اور عام دولتمندی و ذوق علمی کی وجہ سے اشاعت کتب میں ہر قسم کی آسانی ہے وہاں بھی عام طور پر یہی دستور ہے کہ ضخیم کتابیں چھوٹے چھوٹے حصوں میں شایع کی جاتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی خریداری میں بڑی آسانی یہ ہوتی ہے کہ ہر مہینے ایک چھوٹی سی رقم دینا پڑتی ہے جس کی ادائی بار نہیں معلوم ہوتی اور تھوڑے دنوں میں مکمل کتاب ہاتھ میں آجاتی ہے جس کو یکمشت خریدنا پڑے تو اچھے اچھوں کے چھکّے چھوٹ جائیں۔

مولوی ظفر علی خاں صاحب نے "علمی قرضہ" کے جو اصول معیّن کیے ہیں اُن میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس وقت جس قدر روپیہ اُن کو حصوں کی قیمت میں دیں گے وہ روپیہ بھی آپکو دو سال کے بعد واپس مل جائے گا اور اُسی مالیت کی کتابیں بطور منافع کے آپ کے ہاتھ آئیں گی۔ اس طور پر آپ ایک علمی تحریک کی اعانت بھی کریں گے اور اپنے روپے کے نفع سے بھی متمتع ہوں گے جو پچاس فی صدی کے حساب سے بصورتِ کتاب آپ کو وصول ہوگا جو درحقیقت "ہم خرما و ہم ثواب" کا پورا پورا مصداق ہوگا۔

ہم نے خود بھی اس قرضہ میں شرکت کا تہیّہ کر لیا ہے اور دس حصوں کی قیمت عنقریب "دائرۂ معارفِ مشرقیہ" کو ارسال کر دیں گے اور ناظرین الناظر سے جن کی علم دوستی پر ہمیں پورا اعتماد ہے درخواست کرتے ہیں کہ اس علمی قرضہ کی فراہمی اور نیز " ہسٹری آف دی موہمڈن ایمپائر ان یورپ " (یورپ میں اسلامی حکومت کی تاریخ) کی خریداری میں پورا حصّہ لیں گے۔

مولوی ظفر علی خاں صاحب سزاوار صد تحسین و آفریں ہیں کہ توقعات کے مطابق اُنھوں نے اپنی بیش بہا علمی خدمات سے ملک و قوم کو مستفیض کرنے کی یہ قابل قدر کوشش شروع کی ہے اور ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا فضل و کرم اُن کے شامل حال رہے اور اُن کی خدمات مقبول اور ان کی مساعی مشکور ہوں۔ آمین۔

ذیل میں اس کتاب کا وہ جزو درج کیا جاتا ہے جو نمونتاً ہمیں بغرض اشاعت موصول ہوا ہے اس سے ناظرین کرام کو کتاب کی قدر و قیمت اور ترجمہ کی روانی اور خوبی کا نہایت صحیح اندازہ ہو جائیگا وہو ہذا:-

دائرۂ معارفِ مشرقیّہ کی پہلی کتاب کا ایک ورق

مولوی ظفر علی خاں بی-اے کے قلم سے

عربوں کی شاعری

(۱)

اگرچہ عہد قدیم کے عربوں کی علمی بے بضاعتی اس سے ظاہر ہے کہ نہ تو اُن کی کوئی مستند قومی تاریخ تھی اور نہ اُن فنونِ عامّہ ہی میں وہ درخور رکھتے تھے جن سے کسی قوم کی داستانِ عظمت

ہمیشہ تازہ رہ سکتی ہے لیکن ایک خاص قسم کی ادیبانہ قابلیت جن میں وحشی اقوام نے ہمیشہ بہت بڑا کمال بہم پہونچایا ہے مبدء فیاض نے اُنھیں ضرور عطا کی تھی۔ فن شاعری نے سب سے زیادہ فروغ اُنھیں قوموں میں پایا ہے جن پر تمدن نے اپنے عمل اندوزانکار اور سلیقہ آموز بُرائیوں کا سایہ نہیں ڈالا۔ اسی لیے دَورِ جاہلیت کا بدو اس فن کو کمالات انسانی کا افضل ترین شعبہ تصور کرتا تھا۔ افتادِ طبیعت حالات گرد وپیش اور مشاغل زندگی کے لحاظ سے ممکن نہ تھا کہ شعر کا اُس پر ایک خاص اثر نہ پڑے۔ اُس کے جوش طبیعت کی عناں گیری کا فطرت کو حوصلہ نہ تھا اُس کی معنی آفرینیوں کا جدت طراز سلسلہ غیر متناہی تھا۔ اُس کی فکرِ فلک پیما کی رنگینی اپنا بہارستان آپ تھی۔ چونکہ قدرت نے اُس کے نظام عصبی کی ساخت میں ذکاوتِ احساس کا خاصہ ودیعت کرتے وقت غیر معمولی فیاضی سے کام لیا تھا۔ لہذا بعض اوقات جب اُس کے قلب پر دیر تک جوش کی حالت طاری رہتی تھی تو وجد کی خود رفتگی کا ایک عالم اُس کے گرد وپیش پیدا ہوجاتا تھا۔ اور یہ وہ کیفیت ہے جسے مشاہیر شعرا کمال شاعری کا لازمہ قرار دیتے ہیں ریگستان کے اثر انگیز مناظر۔ اس کی سنسان پہنائیاں۔ سراب کا افسوں گرانہ فریب۔ منطقۂ حارّہ کے آسمانوں کے شاندار کوکبی بروج۔ مسلسل خطرات کی زندگی۔ جاں بازانہ سپہ گری کے کارنامے۔ غنیم کے خیمہ گاہ پر نیم شبی تاخت۔ ناگہانی حملے کی جھپٹ۔ فریقین کی جاں ستاں آویزش۔ مجبورانہ پسپائی۔ وقت پر کمک کی رسائی۔ یہ تمام باتیں بادیہ نشیں عرب کے سمندِ تخیل کے لیے تازیانے کا حکم رکھتی تھیں اور اس کمال کی تحصیل پر اُسے اُبھارتی تھیں جو اُس کی آیندہ نسلوں تک اُن واقعات کو منتقل کرسکے جن کا دوام اُس کی ذاتی شہرت کا ذریعہ۔ اُس کی خیمہ گاہ کے الاؤ کا تفریحی مشغلہ اور اُس کے قبیلہ کی عظمت وشکوہ کا سامان تھا۔ شاعری کو سخن سرائی کے جو قدرتی وسائل میسر تھے وہ بھی اپنی نوعیت میں لاجواب تھے۔ عربی زبان اپنے زور وقوت۔ اپنی نرمی وشیرینی۔ اپنے توازن اور موسیقیت اور اپنے استعارات وتشبیہات کی فراوانی وبوقلمونی کے لحاظ سے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ شاید دنیا کی اور کوئی زبان

ایسی نہیں جس کے سانچے میں شعراس آسانی سے ڈھل سکتا ہو اس لیے کہ اس کی نثر بھی بسا اوقات ترنم سے لبریز ہوتی ہے۔ موجودہ علم اللسان کے اکتشافات نے یورپ کو بتا دیا ہو کہ عربی کا پیچیدہ نظام نحوی ہر طرح کامل و مکمل ہے اور جہاں اس زبان کی لغت کا ذخیرہ ایک گنجِ گراں مایہ ہے وہاں معنوی محاسن اور غیر محدود لفظی امکانات کے اعتبار سے بھی یہ زبان ایک متاعِ بے بہا ہے۔ محمد الدمیری نے اپنے ہم وطنوں کی فصیح اللسانی اور عذب البیانی کا کا ذکر اپنے فلسفیانہ انداز میں کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے کہ حکمت تین چیزوں پر اُتری ہے۔ فرنگیوں کے دماغوں پر۔ چینیوں کے ہاتھوں پر۔ اور عربوں کی زبان پر۔

عربوں کی تاریخ قدیم پر تو ظلمت کا پردہ پڑا ہی ہوا ہے لیکن اُن کی شاعری کی ابتدا اور بھی زیادہ تاریک ہے۔ کسی زبان کا ادب خواہ کیسا ہی مقبول خاص و عام کیوں نہ ہو سپرد قلم ہوئے بغیر ایک نسل کے خاتمہ تک بھی اپنی اصلی شان برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ اہل عرب کی قوتِ حافظہ نہایت زبردست تھی اور اس خداداد ملکہ کا فیض اس قدر عام تھا کہ ایک غیر معمولی سی بات سمجھ کر کسی کو اس پر ناز کرنے کا خیال بھی نہ پیدا ہوتا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ عام پسند نظموں کے ہر روز دوہرائے جانے سے اس قوّت کا انضباط اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ لیکن کس طرح ممکن ہے کہ انسان کی یادداشت خواہ وہ کیسی ہی زبردست کیوں نہ ہو مستقل اور معتبر اندراجات کی قائم مقام ہو سکے۔ اسی لیے عربی نظموں کی شکل ہمیشہ بدلتی رہتی تھی۔ ایک موضوعِ سخن اور بحر میں تو تغیر واقع نہ ہوتا تھا لیکن الفاظ کو راوی کے تصرفات کا ہیر پھیر کچھ کا کچھ کر دیتا تھا۔ نظموں میں عموماً قصائد کا رنگ اختیار کیا جاتا تھا اور بعض دفعہ مراثی پر طبع آزمائی کی جاتی تھی کہ متوفی کے محامد و محاسن اور اسی ضمن میں اُس کے قبیلے کے کارناموں کے گنانے کے لیے یہ صنفِ سخن موزوں واقع ہوئی ہے۔ مثنوی کی طرف جس میں افسانہ نگار کے بے پایاں تخیلات اس خوبی سے صرف ہو سکتے ہیں۔ شعرائے جاہلیت نے کبھی توجہ نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی حقیقت ہی کا وہ کما حقہٗ ادراک نہیں کر سکے

ورنہ اس کے لیے عرب کی زمین میں پورا مسالہ موجود تھا۔ بہرحال شعرائے عرب جس مضمون کو جس طرح بھی ادا کرتے تھے وہ سننے والوں پر محویت کا عالم طاری کر دیتا تھا۔ سامعین کو شاعر کے کلام میں اپنی شورو شر بھری روزانہ زندگی کی جوش انگیز تصویر کھنچی ہوئی نظر آتی تھی اور اُن کا قومی غرور اُنھیں یہی سکھاتا تھا کہ انسانیت کے وقار کو بحسن الوجوہ برقرار رکھنے میں اُن کا طرز ماندوبود حیاتِ متمدنہ کے فساد وجمود پر ہزار درجہ مرجّح ہے۔ شاعری عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ہر چھوٹا بڑا اس فیضانِ عام سے بہرہ ور نظر آتا تھا۔ عرب کا بچہ بچہ شعر کہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ عروض کے قواعد موجود نہ تھے اور شعر گوئی کے ابتدائی ضوابط کا بھی کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن اُن کا مذاق فطرۃً ایسا درست اور اُن کا وجدان طبعاً ایسا صحیح واقع ہوا تھا کہ ایک عامی کا کلام بھی حُسنِ ادا اور لطافتِ بیاں کی جان ہوتا تھا اور یہی وہ اوصاف ہیں جنھوں نے صحرائے عرب کی شاندار نظموں کو حدّتِ جوش۔ غایتِ اثر۔ بلندیِ فکر اور دلگدازی ودلفریبی کا مرقع بنا رکھا ہے۔ بہت سی نظمیں نغمۂ سلیمان علیہ السلام سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں۔ بعض میں خطابیات کا رنگ شوخی سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض میں حکیمانہ وقار و تمکنت نمودار ہے۔ اور بعض میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

(۲)

سبعۂ معلقات پر تبصرہ

"سبعہ معلقات" دورِ جاہلیت کے شاعرانہ کمال کا ہمیشہ سے بہترین نمونہ متصور ہوتے چلے آئے ہیں اور عربی شاعری کے معارج تک ہمارے تصوّر کی رسائی کے لیے یہی سب سے اونچا نردبان ہے۔ معلّقات ایک مبہم المعنی لفظ ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ شعرائے عرب میں باہم مسابقت ہوتی تھی اور جو شاعر اس امتحانِ مقابلہ میں اول نکلتا تھا اُسے حق حاصل ہوتا تھا کہ اپنی نظم کو خانۂ کعبہ میں آویزاں کرے۔ اسی مناسبت سے یہ ساتوں نظمیں جنھیں کعبہ میں لٹکائے جانے کا شرف حاصل ہوا معلّقات کہلاتی ہیں۔ یہ تو ایک عامیانہ عقیدہ ہوا۔ جو توجیہ

زیادہ تر معقول اور قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ لفظ معلقات کو موتیوں کی مالا سے ایک معنوی مناسبت ہے۔ ہر نظم کو ایک درخشندہ گوہر سمجھنا چاہیے جو ابھی سلک مروارید میں پرویا ہوا تھا اور معشوقۂ سخن کے گلے کا زیور تھا۔ اہل مشرق ادبیات میں اس قسم کے استعارات کو برتنے کے خوگر ہیں اور شعراء و مورخین تو اپنی تصنیفات کے ناموں میں خصوصیت کے ساتھ ایسی مناسبتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پس سبعہ معلقات کی حقیقی و اصلی وجہ تسمیہ یہی سمجھنی چاہیے۔ "سبعہ معلقات" پر جب ناقدانہ حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعۂ نظم گویا ایک چوکھٹا ہے جس میں عربوں کی حیاتِ قومی کی بولتی ہوئی تصویریں جڑی ہیں۔ روایت کے تمام پرانے دفتروں اور تمام اُن واقعات کی بھی اگر چھان بین کی جائے جنھیں بعد کے زمانہ میں ہر قوم و مذہب کے مصنفین کی محققانہ سرگرمی نے ہمارے لیے جمع کیا ہے تو جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں کی بیرونی و خانگی زندگی اُن کے مروجہ جذبات و میلانات اور اُن کے عادات و رواجات کے متعلق ہماری معلومات میں اتنا گہرا اضافہ نہیں ہوسکتا جتنا ایک سبعہ معلقات کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ ان نظموں کی مدد سے ہم عرب جاہلیت کے سیاسی و مذہبی نظامات کا خاکہ از سر نو کھینچ سکتے ہیں اور جن مقامات میں اسلام کی تلوار بت پرستی کی قابل نفرت رسم کا قلع قمع آج تک نہیں کرسکی وہاں کے موجودہ حالات زندگی کے ساتھ بر سبیل مقابلہ نظاماتِ مذکورہ کے تطابق کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھو تو صحرائے عرب کی خاموش عظمت کی جیتی جاگتی تصویر تمھاری آنکھوں میں پھر جائے گی اور اس کے لاجوردی آسمان کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردینے والی تابانی۔ اس کے لرزتے ہوئے انجروں کی موجوں کی روانی۔ اس کے ریتیلے ویرانوں کی یک رنگ بے پایانی کا منظر تمھارے سامنے آجائے گا۔ تم بدوی خیمہ گاہ میں داخل ہوکر اُس زندگی کے نظارے دیکھو گے جس کی کاہلی و سکون کا سلسلہ اگر ٹوٹتا تھا تو حریف کی شبخون کے ہنگامہ یا کسی عاشقانہ منصوبہ کی حوصلہ آزما سرگرمی سے۔ تم ایک قبیلے پر دوسرے قبیلے کی غارت گرانہ تاخت کے جوش انگیز واقعات پر نظر ڈال کر گمان کرنے لگو گے کہ یہ

واقعات گویا خود تمھارے سامنے گذر رہے ہیں۔ ان نظموں میں اُس بے حجابانہ آزادی سے جو تغزل کا حق ہے مہ جمال عرب دوشیزہ کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ جب بہ لطائف الحیل یا علیٰ وجہ المبادلہ ایک حور وش قید ہو کر کسی قبیلہ کے تصرف میں آگئی تو اُس پر کیا گذری۔ ان میں پوری شرح و بسط کے ساتھ تاروں بھرے آسمان کا نقشہ کھینچا گیا ہے جسے مشرقی عبارت آرائی بردِ یمانی سے تشبیہ دیتی ہے جس میں رنگ رنگ کے جواہرات ٹکے ہوئے ہوں اور ساتھ ہی نیم شبی تاخت کا کُل قصہ دوہرایا گیا ہے۔ سبعہ معلقات کی خوبی شستگیِ بیان یا حسنِ ادا ہی پر موقوف نہیں۔ انھیں معانی کا بھی گنجینہ سمجھنا چاہیے۔ عرب شاعر ازراہِ تعلّی کبھی اُن کارناموں پر اپنا زورِ طبیعت صرف کرتا ہے جو یورپ کے دَورِ شجاعت کی روایات کے لیے بھی سرمایۂ ناز ہوسکتے ہیں (اور حقیقت تو یہ ہے کہ اخلاق کا وہ تصور جو دَورِ شجاعت سے وابستہ ہے۔ یورپ نے عرب ہی سے لیا ہے) کبھی وہ اپنے اشعار میں کریمانہ مہماں نوازی کے مقدس فرائض کی تصریح کرتا ہے۔ کبھی وہ کسی عزیز الوجود گھوڑے یا اونٹ کی نادر صفات پر قلم اُٹھاتا ہے۔ کبھی وہ عشق و عاشقی کی گھاتوں، اُس کے خطروں اور اُس کی لذتوں کی دلکش روداد میں محو ہو جاتا ہے کہ بزمِ کائنات کی اصلی رونق اسی سے ہے۔ اور اسی ذیل میں اُن جواں مَردوں کے پُرغرور کارناموں کی داستانیں سُناتا ہے جو کس بل میں اپنے وقت کے رُستم و ہرقلس تھے۔ اُس کے اشعار میں جا بجا اخلاقی نکتے اور فلسفیانہ معارف پائے جاتے ہیں جن کی دانش آموزی کیا باعتبار الفاظ اور کیا بلحاظ رمز شناسیِ فطرتِ انسانی قرآن کی سورتوں اور سلیمان کی ضرب المثلوں کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن اخلاقی نکات کے پہلو بہ پہلو ان اشعار میں ایسے مضامین بھی بکثرت موجود ہیں جن کو پڑھ کر گھن آتی ہے اور جن سے سفّاکی اور وحشیانہ پن پڑا ٹپکتا ہے لیکن "معلقات" کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان سے عیش پرستی کا سبق ملتا ہے اور معلقات پر ہی کچھ موقوف نہیں جاہلیت کا جس قدر کلام ہم تک پہونچا ہے اُس میں یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ شراب گلرنگ اور حسینانِ شوخ و شنگ کے دل آویز تذکروں سے ہر نظم معمور ہے اور سیہ مستانہ بادہ گساریوں کی حکایات کو

بیان کرنے میں شاعر کی وارستہ مزاجی نے خلیع العذاری کا جو بے باکانہ رنگ دکھایا ہے وہ قطعاً اور مارشل کی ناپاک ترین نظموں کو بھی شرماتا ہے۔ عشق و محبت کی کسی داستان کے سپرد قلم کرنے میں شاعر جب کسی حریف قبیلے کی خیمہ گاہ میں کسی وعدۂ نیم شبی کے پورا ہونے کا منظر دکھاتا ہے۔ جہاں انکشاف حقیقت کو ہر وقت موت کا کھٹکا لگا ہوا ہے تو وہ عاشق جاں باز کے محسوسات کو اُسی نگاہِ احترام سے دیکھتا ہے جو میدانِ جنگ میں سپاہی کے مقدس سرفروشانہ جذبات کا حصہ ہونا چاہیے۔ عاشق اپنی محبوبہ دل نواز کے آستانۂ نیاز پر جبیں سائی کرتے وقت جس انداز سے معشوق کا ذکر کرتا ہے اس میں لا بہ گرانہ صنعت آرائی کی کوئی شان نہیں جو نہ پائی جاتی ہو۔ معشوق کا سراپا کھینچنے میں شاعر نے جن جزئیات کو اپنی تفصیل کی رنگینیوں میں شامل کیا ہے اُن کے تذکرہ کی موجودہ تہذیب اجازت نہیں دیسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ان سراپاؤں کے تراجم موجود ہیں مگر وہ لفظی ترجمے نہیں بلکہ محض تلخیصات ہیں۔ شاعر کے تخیل کی ولولہ انگیز تصویر ابھی تک اپنی عریانی کو اصل عربیت کی چادر میں ڈھانپے ہوے ہے۔

دعاے عید

یہ صبح عید ہے کس شان کی کیا جانفزا دن ہے
یہ دن ہے خیر و برکت کا خوشی کا عید کا دن ہے
مسلمانوں کے دل یا بادۂ عرفاں کے ساغر ہیں
مسلمانوں کے چہرے نورِ ایماں سے منور ہیں
ضیاے نورِ دیں پھیلی ہوئی آج گاؤں پر
نزولِ رحمتِ باری ہے سب ایمان والوں پر
دعاے عید ہے کیا پُر اثر قربان ہیں دل سے
محمد مصطفےٰ کے نام پر قربان ہیں دل سے

محمدؐ کون جو کُل انبیا میں حق کا پیارا ہے
محمدؐ کون جو ہم بے سہاروں کا سہارا ہے

محمد کون جس کا خدمتی جبریلؑ رہتا تھا
محمدؐ کون جو اللہ کا پیغام کہتا تھا

محمد کو ن جو بھیجا ہوا اللہ کا آیا
خدا کے گھر سے فرمانِ نجاتِ عاصیاں لایا

نہیں نکلا تھا اُس سے پہلے چاند ایسا خدائی میں
اُجالا کر دیا اُس نے اندھیرا تھا خدائی میں

چلے سب اُس کے پیچھے سر جھکائے گردنیں ڈالے
جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے تھے قافلے والے

اخوت سے چکایا دہر میں ہر بات کا قصہ
یتیموں بیکسوں کو بھی برابر کا دیا حصہ

ملا اللہ سے جو کچھ دیا بندوں کو سب اُس نے
نہ کھائی خشک روٹی پیٹ بھر کر ایک شب اُس نے

خدا کے رازِ وحدت سے ہمیں ماہر کیا اُس نے
خدا کا نور تھا نورِ خدا ظاہر کیا اُس نے

ملی راہِ حقیقت ہم کو اُس کی رہنمائی سے
صدا اللہ اکبر کی اُٹھی ساری خدائی سے

خبر لے ہم سیہ بختوں کی مہرِ برتری تو ہے
عرب کا چاند تو ہے آفتابِ ہاشمی تو ہے

وہی پہلا اُجالا پھر ہمیں او دل آرا دے
ہماری مشکلوں کو کاٹ دے ہم کو سہارا دے

دعاے عید میں لیتے ہیں شاہا نام ہم تیرا
کرم ہو جاے ہم پر آج اے مہرِ کرم تیرا

بُلا لے اپنے در پر اے حبیبِ کبریا ہم کو
تقرب آستانِ پاک کا کر دے عطا ہم کو

دکھائیں یا الٰہی خیر خواہی و رفاقت ہم
کریں فرماں روائے وقت کی دل سے اطاعت ہم

رہے آباد شاہِ جاہ نجم باغِ دنیا میں
رہیں آرام سے ہم سایۂ داماں والا میں

نہ کچھ نقصان پہونچائے کبھی اعدا کا شر اُسکو
میسر اُسکو نصرت ہو میسر ہو ظفر اُسکو

وہ شاہنشاہِ عالم ہے وہ اعلیٰ ہے وہ برتر ہے
جگر آقا ہمارا بادشاہِ ہفت کشور ہے

جگر۔ صدیقی۔

زود پشیماں

بسلسلۂ الناظر ماہ جولائی ۱۹۱۶ء

ایکٹ سوم

سین (۱)

[رائگڈھ میں نواب قمر حسین کی کوٹھی کا پائیں باغ]

یوسف (گاتا ہوا آتا ہے)

مدت ہوئی ہے پا بہ زنجیر آہ کیے ہوئے
آہ و فغاں سے شورِ قیامت کیے ہوئے

لو، دیکھو آگیا نہ زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبطِ محبت کیے ہوئے

اگلا سا وہ سکون و متانت کہاں کہ اب
شوریدگی ہے بندہ وحشت کیے ہوئے

پھرتا ہے پھر نظر میں کسی کا خرامِ ناز
سامانِ فتنہائے قیامت کیے ہوئے

وہ دل کہ جلوہ گاہِ سرور و نشاط تھا
اب غم ہے اُس کو مدفنِ حسرت کیے ہوئے

یہ شوقِ دید ہے کہ چلا میں عدو کے گھر
خودداری و غرور سے فرصت کیے ہوئے

پھر دل میں ہے کہ دیجیے جرأت کا امتحاں
انجام کو حوالۂ قسمت کیے ہوئے

اب دل میں ولولہ بھی نہیں کوئی ہے کہ ہوں
اندازۂ زبونیِ قسمت کیے ہوئے

بیگانہ وار در پہ کسی کے کھڑا ہوں پھر
سامانِ صد نہفتنِ الفت کیے ہوئے

تا غیر کے ہوش و عقل بجا اب کہاں درست
بے مست اسکو بادۂ الفت کیے ہوئے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیا کروں۔ پرسوں جرأت کر کے حسنی کو جو خط میں نے لکھ بھیجا تھا، اُس کا جواب تو خاطر خواہ آگیا تھا، لیکن دل کو اب بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ممکن ہے یہ سب اُس نے محض میری تشفی کے لیے لکھ دیا ہو۔ لیکن نہیں، اُسکی سی معصوم لڑکی سے یہ بدگمانی صحیح نہیں۔ بے شک اسکی

زبان اور اُس کا دل ایک ہے۔ وہ کبھی اپنے جذبات کا غلط اظہار نہیں کرے گی۔ اور ایسا کرنے کی اُسے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اگر وہ میرے پُر ارمان دل کو ٹھکرا دینا چاہتی ہے، تو اُسے روک کون سکتا ہے؟ لیکن شاید اُسے میری محبت کی قدر ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں، کہ سچی محبت بے اثر نہیں رہتی۔ ممکن ہے یہ مقولہ صحیح ہو۔ بہرحال اس وقت اس کا فیصلہ ہُوا جاتا ہے۔ اس نے یہاں اسی وقت تو آنے کو کہا تھا۔ (گھڑی دیکھ کر) ابھی چند منٹ باقی ہیں، میں ہی ذرا وقت سے پہلے چلا آیا۔ خیر۔ حُسنیٰ اگر تو نہیں آئی تو تیرا تصور تو میرے پاس موجود ہے۔ اُسے مجھ سے کون جدا کر سکتا ہے؟ مگر حسنیٰ سے میں اس وقت گفتگو کیا کروں گا؟ اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں، تو اب بھی خاص شادی کا کوئی ارمان نہیں پاتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ حسنیٰ سے ایک دائمی یکجائی رہے، جس میں کسی کو دخل و تصرف کا اختیار نہ ہو۔ مگر ظاہر ہے، کہ ایسی مالکانہ یکجائی کا حق، بجز شادی کے اور کس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے؟ اور آخر شادی میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ حسنِ صورت و حسنِ سیرت کی یہ جامعیت اور کہاں مل سکتی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے مذاق کے مطابق کوئی بیوی تصنیف بھی کرتا، تو یہی حُسنیٰ ہوتی۔ لیکن بالفرض خود حُسنیٰ رضامند بھی ہو گئی تو کیا اُس کے والدین پسند کریں گے؟ بڑا مسئلہ مشرف کا ہے: بچپن کی نسبت، اور وہ بھی کس کے ساتھ؟ حقیقی چچا کے لڑکے کے ساتھ۔ اُسے چھُڑا دینا کچھ آسان نہیں۔ اور پھر اُسے چھُڑا کر میرے ساتھ کس توقع پر کریں گے؟ مشرف جاہل سہی، بدچلن سہی، فاترالعقل سہی، میخوار سہی، لیکن دولتمند تو ہے۔ مگر میں نے تو اس حیثیت سے ...... (حُسنیٰ آتی ہے)

حسنیٰ - بھائی۔ تسلیم عرض کرتی ہوں۔ آپ کس خیال میں محو کھڑے ہیں؟

یوسف (چونک کر) آہا۔ کیا وہ صورت میرے سامنے آ گئی، جس کی خیالی تصویر سے میں ابھی باتیں کر رہا تھا۔ میں کس خیال میں محو تھا؟ اس کا جواب میری زبان سے نہیں، اپنے دل سے مانگو۔ لیکن ہاں یہ بتاؤ، تم نے مجھے ابھی بھائی کے لقب سے کیوں یاد کیا تھا؟

حسنیٰ - کیوں کیا آپ میرے بھائی نہیں؟ چاہے کتنی دُور کا رشتہ ہو، مگر ہے تو آخر بھائی ہی۔

کا رشتہ ۔ اور اگر یہ رشتہ نہ ہوتا، تو ذرا یہ سوچیے، کہ میں آپ کے سامنے یہاں اس طرح کھڑی کیونکر ہوتی؟ خدا مجھے اُس دن کے واسطے زندہ نہ رکھے، جب میں کسی محض اجنبی مرد کے سامنے یوں آزادی سے بے پردہ کھڑی ہوں۔

یوسف ۔ میری عزیزہ بہن حُسنیٰ، بے شک تمھاری رگوں میں شرافت کا اصلی خون ہے۔ میں اپنے سوال کو واپس لیتا ہوں۔ واقعی اب تک میرے تمھارے سوا اس کے اور کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن — فرض کرو — میرا دل — کسی جدید — رشتہ — کا آرزومند ہو، تو — کیا مجھے اُس خواہش میں کامیابی ہو سکتی ہے؟ [حُسنیٰ شرم سے چپ ہے]

یوسف ۔ میں اپنے سوال کے جواب کا منتظر ہوں۔ فرصت کم اور خطرات درپیش۔ مجھے امید ہے کہ عقل و دور اندیشی، رسمی شرم و حیا سے مغلوب نہ ہو گی۔

حُسنیٰ ۔ ایسی باتوں کا جواب مَیں اس سے زیادہ نہیں دے سکتی، جو اپنے خط میں لکھ چکی ہوں لاکھ اپنی طبیعت کو مضبوط کرتی ہوں، مگر بے شرمی کی باتوں کے لیے زبان ہی نہیں کھلتی۔

یوسف ۔ یہ تمھاری شریفانہ تربیت کا دوسرا ثبوت ہے۔ لیکن اگر میں بھی اسی قدسی شرم و حیا کو ملحوظ رکھوں، تو یہ معاملہ قیامت تک نہیں سلجھے گا۔ اس لیے اگر اجازت ہو تو میں ایک آدھ سوال زیادہ صفائی کے ساتھ کروں۔

حُسنیٰ ۔ آپ کو اختیار ہے۔

یوسف ۔ اچھا۔ تو کیا تم کسی ایسی صورت کو دل سے پسند کرو گی، جس سے میرے تمھارے جائز طور پر دائمی یکجائی کا سامان ہو جائے۔

حُسنیٰ ۔ میں اقرار تو کر چکی ہوں کہ آپ کی صحبت کو، آپکے ساتھ رہنے کو دل سے پسند کرتی ہوں۔

یوسف ۔ نہیں۔ نہیں۔ میرے سوال کے جواب میں "ہاں" یا "نہیں" کہو۔

حُسنیٰ ۔ اچھا، آپ ہی کی لفظوں میں "ہاں"۔

یوسف ۔ بس، بس۔ حُسنیٰ۔ تم نے اس جواب سے گویا تازہ زندگی بخش دی۔ اگر میں تمھارے

سامنے زیادہ چرب زبانی سے اظہارِ شوق نہ کرسکا، تو اسے شوق کی کمی پر محمول نہ کرنا۔ کوئی جذبہ جب حدِّ کمال کو پہونچ جاتا ہے، تو اُس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا ایسے موقع پر شاید سکوت، کلام سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے، اور خامُشی گفتگو سے بہتر ترجمانِ شوق بن سکتی ہے۔ لیکن، ہاں، ابھی تم نے میرے سوال کے جواب میں "ہاں" کہا تھا اسے دوبارہ کہو۔ درد مند دل ہر تازہ اقرار سے تازہ لطف حاصل کرتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو تم جلد اپنے اقرار کو بھول جاؤ۔

حُسنیٰ - افسوس ہے کہ آپ مجھ سے ایسی بدگمانی رکھتے ہیں۔ میں ابھی تو آپ کے سامنے اقرار کر چکی، اور شریف لڑکی کبھی اپنے عہد سے نہیں پھر سکتی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ کی خوشی کے لیے اپنے الفاظ کو بار بار دوہراتی رہوں۔

یوسف - نہیں۔ اب تجدید عہد کی ضرورت نہیں۔ مجھے اطمینان ہوگیا۔ مگر ابھی ایک سوال اس سے زیادہ اہم باقی ہے۔

حُسنیٰ - اُسے بھی فرمائیے۔

یوسف - وہ یہ کہ تمھارے والدین اس رشتہ کو کہاں تک پسند کریں گے؟

حُسنیٰ - ہاں میاں جان کی طرف سے مجھے بھی ڈر ہے۔ لیکن اول تو سمجھانے بُجھانے سے وہ خود ہی راضی ہو جائیں گے۔ دوسرے، یہ معاملہ تو اپنی خوشی کا ہے۔ اس میں والدین کہیں زبردستی کر سکتے ہیں؟

یوسف - لیکن فرض کرو، تمھارے والد نہ راضی ہوے، اور اُنھوں نے مشرف ہی کے ساتھ نسبت قائم رکھی، تب کیا ہوگا؟

حُسنیٰ - شرع نے ایجاب و قبول میں تو ہر مرد و عورت کو آزادی دی ہی۔ تو جس بات میں خدا کا کوئی گناہ نہیں، اُس میں بندوں کے ہنسنے کا کیا ڈر؟

یوسف - آفریں۔ اے باہمت لڑکی تیری ہمت پر آفریں۔ میں تجھ کو نازک و کمزور جسم والی

لڑکی سمجھا تھا۔ لیکن اب معلوم ہُوا کہ اس نازک جسم کے اندر تو شیر کا جگر رکھتی ہے۔ قابل رشک ہے وہ شوہر جسے ایسی بیوی ملے۔ مگر معاف کرنا اگر میں گفتگو ختم کرنے سے پیشتر تمھیں اپنی مالی حالت سے مطلع کر دینے کی جرأت کروں، تاکہ تم کسی غلط فہمی میں نہ رہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ مشرف کے ذاتی حالات چاہے کیسے ہی ہوں، تاہم وہ ایک دولتمند شخص کا لڑکا ہے جو ایک بڑی جائداد کا وارث ہونے والا ہے۔ مگر میں اُس کے دیکھتے ہوئے بہت ہی مفلس ہوں۔ میری آمدنی کُل اس وقت سو روپیہ ماہوار کی ہے، اور شاید آیندہ بھی ......

حُسنیٰ۔ بس۔ بس۔ اب گفتگو کو ختم کیجیے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے، کہ شادی فریقین کی موافقتِ مزاج پر کی جاتی ہے، تجارت کی غرض سے نہیں، اور میں سمجھتی ہوں کہ جس لڑکی میں کچھ بھی شرافت کا اثر ہے، وہ اس مقولہ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ اگر آپ محبت کی قیمت سونے چاندی کے ٹھیکروں سے دینا چاہتے ہیں، تو میں یقین کر لوں گی، کہ آپ کو محبت کی قدر نہیں، اور نہ آپ محبت کا مفہوم سمجھتے ہیں، بلکہ آپ ایک بددیانت دوکاندار ہیں، جو محبت کی لطیف و نادر جنس کا سودا کوڑیوں کے مول کر رہے ہیں۔

یوسف۔ حُسنیٰ، تمھاری تقریر کا ہر جملہ تمھارے دل و دماغ کی اعلیٰ خوبیوں کا سکہ میرے ذہن میں بٹھاتا جاتا ہے، اور میں نہیں جانتا کہ اپنے درجۂ محبت کا اظہار کن لفظوں میں کروں۔ بہرحال اس وقت کی گفتگو نے میرے دماغ کے اوپر سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا۔ اب جب تم نے خود اپنی زبان سے مجھے اپنی رضامندی کا یقین دلا دیا، تو مجھے زمانہ بھر میں کسی کی مخالفت کی ناخوشی کی پروا نہیں۔ لیکن جان سے زیادہ عزیز حسنیٰ۔ بُرا نہ مانو، تو ایک بات کہوں۔ میرے دل کو اب بھی پورا اطمینان نہیں ہوتا۔ ہرچند اپنی طبیعت کو سمجھاتا ہوں، کہ جب تم نے مستحکم عہد کر لیا، تو پھر کیا خوف رہا۔ لیکن اسے کیا کروں، کہ میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے، کہ اس پیمانِ محبت کا انجام نیک ہوتا نظر نہیں آتا۔ عشق کا خاتمہ عموماً ٹریجڈی پر ہوتا ہے۔ کاش ہمارا افسانۂ محبت اس کلیہ میں استثنا ثابت ہو۔

حُسنیٰ۔ ان وہم پرستیوں کا جواب تو مجھے آتا نہیں.... (آہٹ پاکر) اچھا اب رخصت۔
[جاتی ہے۔ نواب کا ایک خدمتگار آتا ہے]
خدمتگار۔ کہیے۔ یوسف میاں۔ اس وقت آپ یہاں باغ میں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟
یوسف۔ کچھ نہیں۔ آج کتاب دیکھتے دیکھتے طبیعت اُکتا گئی تھی۔ ذرا ادھر تفریح کے لیے چلا آیا۔ اب جاتا ہوں۔ [جاتا ہے]
خدمتگار۔ ہاں اب کیوں نہ جائیے گا۔ اب تو میں آ کے آپکے مزے میں خلل ڈال دیا تھا۔ اچھا، اب مجھ سے کہاں بچتے ہو۔ اس وقت تو میں نے سارا حال دیکھ لیا۔ ابھی جا کر سرکار کو تمھارا کچّا چٹھا سُناتا ہوں۔ [جاتا ہے]

سین (۲)

[نواب باقر حسین ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے ہوے ہیں]

باقر حسین (خود بخود) اُفوہ۔ یہ عیاری، یہ مکّاری، یہ غدّاری۔ اور کس سے؟ مجھ سے! مجھ سے، جس کی فرزانگی، تدبّر، وڈپلومیسی کا اچھے اچھے انگریز بہادر لوہا مانے ہوے ہیں۔ حُسنیٰ کل کی چھوکری، اور یوسف کل کا لونڈا، جو دیکھنے میں کیسا بھولا بھالا، سیدھا سادھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں مجھ سے اُڑنا چاہتے ہیں، مگر میں نے بھی واللہ وہ چال چلی ہے کہ یوسف کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے ..... [خدمتگار آتا ہے]
خدمتگار۔ حضور خلد آباد سے مولوی ہدایت اللہ صاحب رات کی گاڑی سے آئے ہیں۔ سرکار اُس وقت محلسرا میں تشریف لے جا چکے تھے۔ اب وہ سلام کے منتظر بیٹھے ہیں۔
باقر حسین (دل میں) اُف، یہ کہاں سے آپڑے۔ یہ جب آتے ہیں، ہمیشہ میری کسی نہ کسی مصلحت کا خون کر جاتے ہیں۔ مگر اب میں بھی ان کو خوب سمجھ گیا ہوں۔ ان کے سے ہزار ہدایت اللہ آجائیں تو میرا کیا کر سکتے ہیں (خدمتگار سے) اچھا، بلاؤ۔ [وہ جاتا ہے۔ اور ہدایت اللہ آتے ہیں]
ہدایت اللہ۔ السّلام علیکم۔

باقر حسین۔ آداب عرض، جناب۔ (بغل گیر ہو کر) بڑی عنایت کی، جو قدم رنجہ فرمایا۔ یہاں تو وطن کا آدمی دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔ بھائی جان کو بارہا لکھا، کہ آپ کو کچھ روز کے لیے یہاں بھیج دیں۔ بارے آپ خدا خدا کر کے تشریف لائے۔ کہیے سب خیریت؟ آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟ اور ہاں یہ آپ نے کیا غضب کیا، کہ مجھے رات ہی کو نہ جگا دیا۔ مجھے ابھی یہ معلوم ہوا۔ خدمتگاروں کو میں نے سخت ڈانٹا۔ آپ اور مجھ سے تکلف! اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

ہدایت اللہ۔ آپ کی یہ مہربانی ہے۔ وطن میں سب لوگ خیریت سے ہیں۔

باقر حسین۔ اور فرمائیے۔ مولانا کیا حال ہے؟

ہدایت اللہ۔ اب تو میں یہاں آیا ہوں۔ بہرحال دو چار روز قیام کروں گا، تب آپ سے مفصل باتیں ہوتی رہیں گی، اس وقت سب سے پہلے ایک امر خاص میں آپ سے گفتگو کرنی ہے۔

باقر حسین۔ ارشاد فرمائیے۔ یہاں تخلیہ ہے۔ کوئی آنے والا نہیں۔

ہدایت اللہ۔ مجھے اس معاملہ میں لب کشائی کرتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو محبت آپ سے اور آپ کے خاندان سے ہے، وہ مجبور کرتی ہے۔ کہ جو کچھ میرے فہم ناقص میں آتا ہے، آپ کے گوش گذار کر دوں عمل کرنا نہ کرنا آپ کا فعل ہے۔ لیکن کم از کم میں تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

باقر حسین۔ تو فرمائیے نہ۔ اس قدر تمہید اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

ہدایت اللہ۔ بات یہ ہے، کہ میں جس کمرے میں شب کو سویا تھا، اس کے برآمدے میں آپ کے خدمتگار آپس میں باتیں کر رہے تھے اس وقت میں جاگ رہا تھا، اس لیے ان کی آواز میرے کانوں میں بھی پڑی۔ جس واقعہ کا وہ ذکر کر رہے تھے، اس کے سننے سے مجھے روحی تکلیف ہوئی۔ آپ پر گو انگریزیت بہت چھائی ہوئی ہے، تاہم خمیر تو مشرقی ہی ہے۔ اسے آپ کہاں بدل سکتے ہیں۔ پھر میں ایک غیر شخص ہوں، جب مجھے اتنا رنج ہوا، تو آپ تو والد ہیں، آپ کو کیا کچھ صدمہ ہوا ہوگا۔ میں اس واقعہ پر اپنی دلی ہمدردی پیش کرنے کے بعد یہ دریافت کرنا چاہتا

ہوں، کہ جناب نے اس کا علاج کیا تجویز کیا ہے؟
باقر حسین۔ آپ بھی مولانا، لونڈوں کی شرارت سے ڈر گئے۔ جو کچھ ہوا، بیشک افسوس کے قابل ہے، لیکن اس پر زیادہ اعتنا کرنا، اور علاج و لاج سوچنا ایک فضول حرکت ہے۔
ہدایت اللہ۔ معاف کیجیے گا، آپ نے شاید معاملہ کی اہمیت و نزاکت پر کافی غور نہیں کیا۔ یوسف کی طبیعت سے آپ خوب واقف ہیں۔ وہ کیسا مستقل مزاج اور بات کا پکّا ہے۔ جو جی پر رکھ لیتا ہے، کر ہی ڈالتا ہے۔ اسی طرح حُسنیٰ کو بھی آپ نے ایسی آزادانہ تعلیم و تربیت دی ہے، کہ اُس کا روکنا بھی آپ لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ پس قبل اس کے کہ کوئی قطعی فیصلہ کیجیے ان پہلوؤں پر غور کر لیجیے۔
باقر حسین۔ سب غور کر لیا ہے۔ ایسی خفیف الحرکتی ہم بھی اپنے بچپن میں بہت دیکھ چکے ہیں، اور دیکھ کیا چکے، خود کر ہی چکے ہیں۔ حُسنیٰ کی کیا مجال، جو میرے حکم میں ذرا بھی دخل دے سکے۔ رہا یوسف، تو اُن صاحبزادے نے ابھی دنیا کی ہوا نہیں کھائی ہے۔ ایک ہی جھٹکے میں ان کے کس بل نکل جائیں گے۔
ہدایت اللہ۔ یہ میں آپ کی زبان سے کیا سُن رہا ہوں؟ مانا کہ حُسنیٰ ازراہِ سعادت مندی آپ کے حکم سے سرتابی نہ کرے، لیکن کیا شرع نے اُسے اس معاملہ میں پوری آزادی نہیں دی ہے؟ کیا قانون نے اس آزادی کو برقرار نہیں رکھا ہے؟ کیا یورپ نے، جس کی تقلید میں آپ نے حُسنیٰ کو یہ تعلیم دلائی ہے، اس آزادی کو عورت کے لیے نہ صرف جائز، بلکہ فرض نہیں قرار دیا ہے؟ پھر آپ کس بنا پر حُسنیٰ کو اُس حق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں، جو اُسے قانوناً، اخلاقاً، شرعاً، ہر طرح حاصل ہے؟
باقر حسین۔ یہ لگے آپ منطقیوں کی طرح بحث کرنے۔ آپ کی ساری حُجّتوں کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ میرا حُکم ہے، اور اولاد کو میرا حُکم ماننا لازم ہے۔
ہدایت اللہ۔ تو یہ حُرّیتِ نسواں کا دعوٰے محض زبانی ہے۔ سوشل رفارم محض ایک کھلونا ہے

روشن خیالی صرف ایک ٹٹی ہے، جس کی آڑ میں ہر شخص کو خود غرضیوں کے برتنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔

باقر حسین۔ ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے طرز سے مشتعل ہو کر کتابی اصولوں کے پیچھے میں واقعی مصالح کا خون کر دوں۔

ہدایت اللہ۔ آفریں آپ کی ہمت پر۔ آپ نے اصلاح و روشن خیالی کے لمبے چوڑے دعوے رکھنے والوں کے اصلی کیریکٹر کے متعلق مجھے بہت ہی اچھا سبق دیا۔ لیکن ہاں، ایک بات یہ تو بتائیے کہ کیا آپ واقعی مشرف کو یوسف سے بہتر شوہر سمجھتے ہیں؟ کیا مشرف کی آوارگی، بدچلنی[1]، فاتر العقلی، میخواری، سب چیزیں آپ کے لیے راز ہیں؟ اور کیا اس کے مقابلہ میں یوسف کی شریف الخیالی، علم و فضل، اخلاقی قوت میں سے کوئی شئے اُس کی سفارش نہیں کر سکتی؟

باقر حسین۔ بس۔ مولوی صاحب، بس۔ میں اس سے زیادہ نہیں سُن سکتا۔ کہاں مشرف میرا حقیقی بھتیجا، خاندانی جائداد کا وارث، اور کہاں یوسف ایک مفلس کا لڑکا، جس کی آمدنی چند روپیہ ماہوار سے زائد نہیں۔ خدا کے لیے اب آپ اس پر زیادہ گفتگو نہ کیجیے۔

ہدایت اللہ۔ بہتر ہے۔ آپ کی تعمیل ارشاد میں خاموش ہوتا ہوں۔ جو کچھ میرا فرض تھا میں نے ادا کر دیا۔ میں صریح دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک ناعاقبت اندیشی کے غار کی طرف اپنی اولاد کو لیے جا رہے ہیں، جو بنیاد آپ کی زندگی کو ہمیشہ تلخ کر دینے کا آلہ ثابت ہو۔ اس پر آپ کو متنبہ کر دینا میرا فرض تھا، جو میں نے ادا کر دیا۔

باقر حسین۔ معاف کیجیے۔ ایسے وعظ و پند اور اداے فرض سے۔

ہدایت اللہ۔ اکبر الہ آبادی کا ایک شعر میں نے بارہا سُنا، مگر اُس کے اصلی معنی آج روشن ہوے۔

درجے[2] دیکھتے ہیں وہ نہ سیئر[3] دیکھتے ہیں
فرنیچر دیکھتے ہیں اور ڈِنر دیکھتے ہیں

آج معلوم ہوا کہ اس "وہ" کی ضمیر ہمارے ہندوستان کے والدین کی طرف رجوع ہوتی ہے۔

---

[1] نیک چلن۔ با اخلاق۔ [2] بد اخلاق۔ گنہگار۔

باقر حسین۔ بہت سُنے ہیں اس طرح کے شعر۔ شاعری کرکے آپ مجھ سے اولاد کی شادی کے سے اہم معاملات میں میری رائے تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔ چہ خوش!

ہدایت اللہ۔ اب آپ دفتر کے کام دیکھیے۔ میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔ [جاتے ہیں]

باقر حسین (خود بخود) بے وقوف، فدّی، حجّتی۔ نہ کسی کی مصلحت کا خیال کریں، نہ معاملات کی تہ تک پہونچیں، ہر بات میں دخل دینے کو مستعد۔ پوچھیے آپ سے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟ فرماتے ہیں مشرف میں فلاں خرابی ہے، اور فلاں خرابی ہے۔ گویا مجھے خبر ہی نہیں۔ ارے صاحب مانا وہ چور ہے، ڈاکو ہے، اُچکّا ہے، پھر آخر اس میں میرا کیا بگڑتا ہے؟ کوئی اسے جائداد سے تو بے دخل نہیں کرسکتا۔ جب یہ نہیں تو مجھے اُس کے چال چلن سے کیا بحث؟ خیر۔ اور تو اور۔ اپنے ممدوح یوسف کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ پڑھا لکھا ہے، ہمیشہ سچ بولتا ہے، کبھی شراب کو مُنھ سے نہیں لگاتا، کبھی رنڈی کے یہاں نہیں گیا۔ ارے صاحب، گیا ہو یا نہ گیا ہو۔ ہمیں اس سے کیا سروکار؟ یہ دیکھیے کہ آخر وہ کماتا کیا ہے۔ بہت نیک و پارسا ہے تو جاکر کسی خانقاہ میں بیٹھے۔ کسی مسجد میں بیٹھ کر تسبیح پڑھے۔ میرے یہاں شادی کا کیوں حوصلہ کرتا ہے؟ اخبار میں اس کی تعریف چھپتی ہے چھپا کرے۔ دو چار اسکولوں کے میاں جی اُس کے نام پر واہ واہ کرتے ہیں، کیا کریں۔ ہم کو اس سے کیا غرض؟ ہم کو وہ کون خزانہ لا دے گا؟ خیر دفان کرو اس قصہ کو۔ مگر ہاں اس وقت ہدایت اللہ کا روٹھ کر، چلا جانا اچھا نہیں ہوا، ممکن ہے یہ خبر یوسف کو پہونچ جائے۔ اچھا، یہ خطرہ بھی میں ابھی مٹائے دیتا ہوں۔ (گھنٹی بجتی ہے۔ خدمتگار آتا ہے) مولوی ہدایت اللہ کو بُلاؤ [آتے ہیں] مولانا معاف فرمائیے گا۔ میں نے آدھ گھنٹہ پیشتر جو گستاخانہ کلمے کہے تھے، اُنھیں معاف کردیجیے۔ اُس وقت مجھے اشتعال آگیا تھا۔ لیکن اب مَیں اپنی حرکت پر دل سے نادم، اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔

ہدایت اللہ۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی ملال ہوا ہی نہیں، جو میں معاف کروں۔ البتہ اگر آپ اپنی اصل رائے میں ترمیم کردیں، تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔

باقر حسین - میں نے اسے بھی منظور کر لیا - اتنے عرصہ کے غور کے بعد، مجھے آپ کی رائے بہت پسند آئی - اور اب میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری پہلی رائے غلط تھی -

ہدایت اللہ - الحمد للہ - یہ واقعی آپ نے بڑی خوش خبری سنائی - تو اب میں مطمئن ہو جاؤں ؟

باقر حسین - بالکل، اب انشاءاللہ میں آپ ہی کی رائے پر کاربند رہوں گا -

[ایک خدمتگار تار لیے ہوئے آتا ہے]

باقر حسین - یہ دوسرا تار یوسف کے نام ہے - [آدمی اُسے لے گیا] (اپنا تار کھولتے ہوئے) خدا خیر کرے، معلوم نہیں کس کا تار ہے - (پڑھ کر) او ہو، خلد آباد سے آیا ہے، یوسف کے والد کا ہے - لکھا ہے " میں سخت علیل ہوں، معالجین نے جواب دے دیا ہے، یوسف کو فوراً بھیج دو " دیکھیے مولوی صاحب کسی کی زندگی کا کیا اعتبار ہے ؟ [یوسف اپنا تار ہاتھ میں لیے ہوئے آتا ہے] بیٹا یوسف، تمھارے تار کا بھی غالباً وہی مضمون ہو، جو میرے تار کا ہے - ہا، تمھارے والد میرے کس قدر گہرے دوست ہیں، خدا اُنھیں شفا دے - ایسے مخلص دوست اس زمانہ میں کہاں ملتے ہیں - اگر خدانخواستہ اُن کی حالت دگرگوں ہوئی تو (آبدیدہ ہو کر) میری زندگی ہمیشہ کے لیے بے لطف ہو جائے گی -

یوسف - میرے تار میں مرضِ فالج کی تصریح ہے -

باقر حسین - ضعیفی کا فالج، اور جوانی کی تپ ! خدا ہی ان امراض سے کسی کو اچھا کرے، تو کرے - اچھا، بیٹا، اب تم دیر نہ کرو - ٹرین کے وقت میں دو ہی گھنٹے باقی ہیں - کیا کہوں، آج کل سرکاری کام ایسے درپیش ہیں، ورنہ میں خود تمھارے ساتھ چلتا - تم ابھی لڑکے ہو میں تمھارے والد کو بچپن سے جانتا ہوں - ایک بے مثل شخص ہیں - انسان کاہے کو ہیں، فرشتہ ہیں فرشتہ - بجز دعا کے اور کیا کر سکتا ہوں، خدا تمھیں جلد خوش و خرم لائے - بس بیٹا، اب رخصت ہو - میری طرف سے اپنے والد کی بہت بہت مزاج پرسی کر دینا - خدا حافظ - [یوسف آہستہ آہستہ دروازے کی طرف قدم اُٹھاتا ہے - مولوی ہدایت اللہ اُٹھ کر چلتے ہیں - تو آپ بھی اندر جاتے ہیں - کمرہ خالی دیکھ کر یوسف پھر واپس آتا ہے]

یوسف (خودبخود) حسنیٰ، عزیز و محبوب حسنیٰ ! میں دیکھتا ہوں کہ تیری محبت نے مجھے فرض فراموش بنا دیا ہے۔ والد کی یہ حالت، وہ اپنے آخری دیدار کے لیے بلاتے ہیں، مگر میرے قدم نہیں اٹھتے۔ اٹھتے ہیں اور اٹھ اٹھ کر رک رک جاتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں نہ جاؤں؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ابھی میرے ہوش و حواس اس قدر درست ہیں، کہ والدین کے سارے حقوق بھول نہیں گیا ہوں۔ خیر۔ جانا تو پڑے ہی گا، لیکن ..... [آہٹ پا کر] کون؟ آیا، میری مایۂ تسکین، میری سکون خاطر کی دیوی، تو کہاں ؟

حسنیٰ (غمگین لہجے میں) ابھی ابھی میاں جان سے مجھے ان منحوس تاروں کا حال معلوم ہوا۔ خیر، جائیے اور اپنے زادِ راہ میں میری دعاؤں کا انبار لیتے جائیے۔ خدا پھر کسی دن، جلد ہنسی خوشی ملائے۔ بس زیادہ گفتگو کا موقع نہیں۔ رخصت۔ پیار... (جلدی سے اس لفظ کو بدل دیتی ہے) اے غمگین دل کے غمگین دل آرا، رخصت [جاتی ہے۔ ایک خدمتگار آتا ہے]

خدمتگار۔ میاں آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہوے ہیں۔ تانگہ والا جلدی کر رہا ہے، ریل کا وقت تو آ گیا [دونوں جاتے ہیں]

سین (۳)

[نواب باقر حسین کا پائیں باغ]

حسنیٰ (خودبخود) عجب مشکل میں جان پڑی ہے، یوسف کو سدھارے ابھی چند گھنٹے ہوے ہوں گے، کہ میرے دل میں اس کی طرف سے کیسے کیسے منصوبے آنے لگے۔ دیکھنے میں کیسا بھولا بھالا سچائی کا پتلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خوب ہوا جو اس وقت میں نے میاں جان اور باجی کی باتیں سن لیں۔ نہیں تو ہمیشہ اسی دھوکے میں پڑی رہتی۔ میاں جان کو کیا معلوم تھا کہ میں آڑ میں کھڑی ہوں۔ وہ بالکل اکیلا سمجھ کر باجی سے ذکر کر رہے تھے کہ اس یوسف کو سیدھا نہ سمجھنا۔ یہ بڑا دغاباز ہے۔ کئی برس ہوے یہ ایک غریب لڑکی کو ہمیشہ کے لیے خراب کر چکا ہے، اور آج کل بھی کسی عیسائی لڑکی کے پھیر میں ہے۔ کیا میاں جان کی باتوں پر میں

یقین کروں؟ شاید اُنھوں نے غلط سُنا ہو۔ مگر میاں جان کے پاس تو اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اصلی خط موجود ہیں۔ اُفّہ، وہ بھی کسی نے فرضی بنائے ہوں گے، لیکن نہیں میاں جان کیسے دھوکا کھا سکتے ہیں؟ وہ یوسف کا خط خوب پہچانتے ہیں۔ یا اللہ، میری تو جان حیران ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ تو دل سے یوسف کی محبت جاتی ہے، اور نہ اُس کی ان حرکتوں کا جواب ملتا ہے۔ (عشرت آتی ہے) آئیے عشرت آپا، آئیے۔ میں تو آپ کا راستہ ہی دیکھ رہی تھی۔

عشرت۔ کیوں، کچھ کام تھا؟

حُسنیٰ۔ نہیں، کوئی ایسا کام تو نہیں ہے۔ ذرا اس وقت طبیعت خود بخود پریشان تھی، اور جی چاہتا تھا، کہ آپ آ جائیں، تو کچھ باتیں ہوں۔

عشرت۔ بٹیا، یہ پریشانی تو تم نے خود اپنے ہاتھوں پیدا کی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کی عقل کیا کام دے سکتی ہے؟ اور تم ماشاءاللہ اپنی عقل کے سامنے دوسروں کی سُنتی کب ہو۔

حُسنیٰ۔ نہیں، آپا یہ تو کوئی بات ہی نہیں، اور خاص کر آپ کا کہنا تو شاید میں نے کبھی ٹالا ہی نہیں۔ مگر آج کل تو ایسی مصیبت میں ہوں، کہ جیسے آئے گئے حواس گم ہیں۔

عشرت۔ مصیبت اُصیبت تو کچھ بھی نہیں، ہاں یہ کہو۔ کہ تمھیں اپنے ہاتھوں مصیبت پیدا کرنے کا شوق ہے۔ ماں باپ کا حکم نہ مانو۔ رفیقوں عزیزوں کی بات خاطر میں نہ لاؤ، مدت کی پکی پکائی بات کو توڑ کر سارے خاندان کی بدنامی کراؤ، ایک بے جانے بے پہچانے مرد کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر شیطان کو فرشتہ اور فرشتہ کو شیطان سمجھنے لگو۔ اور پھر چاہو کہ کوئی پریشانی پاس نہ پھٹکنے پائے، یہ سودا نہیں تو اور کیا ہے۔

حُسنیٰ۔ آپا، آج سے دو روز پیشتر آپ یہ باتیں میرے سامنے کرتیں تو میں سچ کہتی ہوں کہ سارا ادب، لحاظ بالائے طاق رکھ کر آپ کو سخت جواب دیتی۔ لیکن اب اِدھر جو نئی باتیں معلوم ہوئیں، اُنھیں سُن سُن کر سوچ میں رہا کرتی ہوں کہ کہیں میری ہی نظر نے تو دھوکا نہیں کھایا

عشرت۔ اے ابھی کیا؟ ابھی تو دو ہی روز ہوئے اتنا فرق ہو گیا۔ ماشاءاللہ جوں جوں

سمجھ آتی جائے گی، آنکھیں کھلتی جائیں گی۔ مگر تم نے سُنا کیا ہے؟

حُسنیٰ ۔ پہلے تو میاں جان کو باجی سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ...

عشرت ۔ اچھا، وہ حال تو میں بھی سُن چکی ہوں۔

حُسنیٰ ۔ پھر آج صبح غفورن نے داروغہ کی زبانی بیان کیا کہ اُس نے اُن کے بکس میں (یا اللہ، توبہ۔ میں توبہ کرکے کہتی ہوں کہ) میموں کی ننگی تصویریں دیکھیں۔ بہ قول بُوا غفورن کے کسی شریف کے بکس میں ایسی تصویریں کیسے ہو سکتی ہیں، جب تک اُس مرد کی طبیعت خود ہی خراب نہ ہو۔

عشرت ۔ تم ہی سوچو۔ تم ہی سمجھو۔ میری تو اول دن سے یہی رائے ہے۔ اچھا، میری ایک بات کا جواب دو۔

حُسنیٰ ۔ کہیے۔

عشرت ۔ یہ بتاؤ، کہ دُنیا میں کسی طرح کا عیش و آرام بغیر روپئے کے ممکن ہے؟ اچھا کھانا کھانے کو، اچھا کپڑا پہننے کو، نوکر چاکر کام کرنے کو، یا تم کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، تو اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو، بھلا ان میں سے کوئی چیز بے روپے کے آدمی کو مل سکتی ہے؟

حُسنیٰ ۔ اچھا تو۔

عشرت ۔ تو یہ کہ تم جو یوسف پر رکھی ہوئی تھیں، تو مجھے یہ بتاؤ کہ اُس کے پاس کوئی خزانہ، کوئی جائداد، کوئی علاقہ ہے؟ پھر وہ کہاں سے خود کھاتا، اور کہاں سے تم کو کھلاتا؟ رہے میاں مشرّف، تو اوّل تو خدا کے فضل سے اُن میں کوئی ایسی بُرائی نہیں اور اگر جیسا دشمنوں نے مشہور کیا ہے۔ کوئی ایک آدھ بات ایسی ویسی ہوئی بھی، تو یہ نہیں دیکھتیں، کہ سو علاجوں کا ایک علاج اُن کے پاس روپیہ کیسا موجود ہے۔ مانا کہ اُن کی طبیعت لااُبالی ہے، علاقہ کا انتظام نہ کریں گے، تمہاری جُوتی سے۔ آخر مختار، کارندے، دیوان تو رکھ سکتے ہیں؟ وہ سب دیکھ لیں گے، دستخط یہ کر دیں گے۔ پھر بیماری کا ہلی سب کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ کسی دن تمہارے دشمنوں کا جی ماندہ ہوا، اُس وقت بڑی بڑی فیس دے کر حکیم ڈاکٹر کو بُلانا، یہ پیسہ والے کا کام ہے

یا بے پیسہ والے کا؟ بولو، میں سچ کہتی ہوں یا جھوٹ؟

حُسنیٰ ۔ ہاں اب تو یہ باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگیں ۔

عشرت ۔ "کچھ کچھ" اب بھی کچھ کچھ ، تو پوری کس دن سمجھ میں آئیں گی ۔ تمھاری باتوں پر غصہ بھی معلوم ہوتا ہے ، اور ہنسی بھی آتی ہے ۔ ہاں دیکھو ایک بات تو میرے خیال سے اُتر ہی گئی تھی ۔ نسبت ناتا کرتے وقت اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے ، کہ لڑکا آپس کا ہے ، یا پرایا ہے۔ اپنے گھر کا لڑکا چاہے نالایق ہو ، مگر پھر اپنا ہوتا ہے ۔ اُس پر چار عزیزوں کا زور دباو ہوتا ہے ۔ اور اگر غیر کا لڑکا ہوا ۔ تو چاہے جیسا ہو ، پھر آخر غیر ہی ہے ۔ اور کچھ نہیں ، تو ہمارے اُن کے یہاں کی ریت رسم ہی میں فرق ہوگا ۔ وہ غیریت کہاں جا سکتی ہے ۔ اُس کی کوئی بات ہمیں ناپسند ہوئی ۔ ہمارے یہاں کا کوئی طور طریقہ اُسے ناپسند ہوا ، تو کوئی بیچ میں سمجھانے بجھانے والا نہیں ، کسی کا اُس کے اوپر دباؤ نہیں ۔ بتاؤ ایسی حالت میں کیسی مشکل پڑتی ہے ؟ تم ابھی بچہ ہو ۔ میں تمھارے دیکھتے پھر کچھ دنیا کا تجربہ رکھتی ہوں ۔ آخر دو چار سال تم سے بڑی ہی ہوں ۔ پھر اللہ رکھے پیارے کے باپ کا سابقہ دو برس سے نباہ رہی ہوں ۔

حُسنیٰ ۔ ہاں ۔ یہ بات تو ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ [نزہت آتی ہے]

نزہت [حُسنیٰ کو مخاطب کرکے] مبارک ۔ چھوٹی باجی ۔ بیاہ مبارک ۔

حُسنیٰ ۔ کیا بکتی ہے ۔

نزہت ۔ بکتی کیا ہوں ۔ تمھیں مبارک باد دینے آئی ہوں ۔ لیکن اللہ ، باجی ہم سے اتنا پردہ ۔ پرسوں نکاح اور ہمیں آج معلوم ہوا ۔

حُسنیٰ ۔ یہ چھوکری سچ مچ سڑن ہوگئی ہے ۔

عشرت ۔ ہاں نزہت ، اس وقت باتیں تم کچھ بہکی بہکی کر رہی ہو ۔

نزہت ۔ نہیں ۔ آپا ۔ بہکی بہکی باتیں نہیں ، ابھی خالو ابا کی زبان سے سُنے چلی آتی ہوں ، کہ پرسوں عشرت بھائی جان کے ساتھ چھوٹی باجی کا بیاہ ہے ۔ مانجھے دانجھے کی رسم کچھ نہیں ہوگی ،

بس قاضی صاحب آکر چُپ چاپ دو بول پڑھ دیں گے، پھر دھوم دھام پیچھے کو ہوتی رہیگی۔

حُسنیٰ - میں جاگتی ہوں یا خواب دیکھ رہی ہوں -

عشرت - ہاں یہ بات تو واقعی بڑے اچنبھے کی ہے۔ ماموں جان کو ایسی کیا جلدی پڑی ہے۔ لیکن کہہ نہیں سکتی۔ شاید اس میں اُن کی کوئی مصلحت ہو۔ زمانہ کا اونچ نیچ وہ ہم لوگوں سے اچھا جانتے ہیں۔

نزہت - تو آپا چلو نہ۔ خود چل کر ماموں جان سے دریافت کر لو۔

عشرت - ہاں چلو [حسنیٰ سے] تمھارے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں بھی آکر تم سے مفصل حال کہتی ہوں۔ [عشرت و نزہت جاتی ہیں]

حُسنیٰ - یا اللہ رحم، میری حالت پر رحم۔ پرسوں نرسوں تک۔ ہ کیا تھی، اور آج کیا ہو گئی ہوں۔ کہاں یوسف سے وہ عہد و پیمان، اور کہاں آج میاں جان کے پسند کیے ہوے گھر میں جانے کا ساز و سامان! یوسف، تو مجھے بیوفا و بدعہد تو نہ کہے گا۔ لیکن نہیں، اصل الزام میرے اوپر نہیں، تیرے اوپر ہے۔ تو نے خود ہی تو مجھے بیوفائی و بدعہدی کا سبق دیا۔ پھر اگر وہی داؤں میں تیرے ساتھ چلی، تو مجھے کیا گناہ ہو سکتا ہے؟ پروردگار، اس معاملہ کا انصاف تیرے ہاتھ ہے۔ میں بے قصور دُنیا کی چالوں سے ناواقف ہوں۔۔ [عشرت نزہت آتی ہیں]

عشرت - میں جا کر تحقیق کر آئی۔ وہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے، کہ شاید مہاراجہ صاحب اسی ہفتہ میں ماموں جان کو کسی بڑے ضروری سرکاری کام پر ولایت بھیجیں، اس واسطے ماموں جان چاہتے ہیں، کہ تمھارے فرض سے ادا ہو جائیں۔ دھوم دھام بعد کو ہوتی رہے گی۔ مشرف تو یہاں موجود ہی ہیں، اُن کے والد سے بھی اُنھوں نے تار پر اجازت منگا لی ہے۔ ولایت کا جانا کچھ مُنھ کا نوالہ تو ہے نہیں۔ ڈیڑھ دو مہینے تو آنے ہی جانے میں لگ جاتے ہیں۔ اور جس کام کے لیے جاتے ہیں وہ بھی جلدی کا نہیں۔ اُس کے طے کرنے میں چھ مہینے لگیں، سال بھر لگ جائے۔ اتنے بیچ میں نہ معلوم یہاں دشمن کیا کچھ فساد

کھڑا کردیں۔ انھیں سب مصلحتوں کو سوچ کر ماموں جان تمھاری طرف سے اطمینان کرلینا چاہتے ہیں۔ اور ہاں مہراجہ صاحب اُن کے اس سفر کو راز رکھنا چاہتے ہیں۔ اس واسطے ماموں جان اپنے اس ارادے کو ہر ایک پر ظاہر بھی نہیں کرسکتے۔ خیر، نیک کام میں جتنی جلدی ہو، بہتر ہے۔ خدا مبارک کرے۔ اب چلو اپنی باجی کے پاس، وہ تمھیں بلاتی ہیں۔ تم چلو۔ ہم لوگ بھی آتے ہیں۔ [حُسنیٰ گئی]

عشرت ۔ میں کہتی ہوں ماموں جان کے برابر عقل دنیا میں کسی کی نہ ہوگی۔ ہم لوگ ڈر رہے تھے کہ دیکھا چاہیے حُسنیٰ کا بیاہ کیسے اور کہاں ہوتا ہے۔ لیکن ماموں جان نے کیسی عقلمندی سے سارا انتظام کرلیا۔

نزہت ۔ چلو، یہ بھی اچھا ہے کہ آج کل یوسف یہاں نہیں ہیں۔ نہیں شاید کوئی اور خرابی پڑتی۔

عشرت ۔ ہاں یہ کہو خدا کو اس خاندان پر فضل کرنا تھا، جو سارا معاملہ اس طرح طے ہوگیا۔

نزہت ۔ کل میں نے اُن سے یہ بھی کہا تھا کہ ہم نے تو سنا ہے یوسف کے مذہب کا کچھ ٹھیک نہیں۔ وہ خدا رسول کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں ہر چیز قدرت سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے کے ساتھ تو نکاح درست نہیں۔ تو بتاؤ حُسنیٰ باجی تم کیا کروگی۔ یہ سن کر سوچ میں آگئیں۔ [دونوں گئیں]

سین (۴)

[حُسنیٰ تنہا اپنے کمرے میں ہے۔ تبدیل لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی ہوچکی]

حُسنیٰ (خود بخود) یا اللہ، کیا میری بدنصیبیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی؟ کیا میری مصیبتوں کا تار کبھی نہ ٹوٹے گا؟ میں تو سمجھتی تھی، کہ اب الگ کی ہوکے بیٹھوں گی، پریشانیوں سے نجات ملے گی۔ لیکن دیکھتی ہوں تو پریشانیاں دوگنی چوگنی بڑھ گئی ہیں۔ ابھی شادی ہوئے پورے چار دن بھی نہیں ہوئے، کہ یہ بے پروائی شروع ہوگئی۔ کل صبح سے غائب ہیں، آج شام ہوا چاہتی ہے، ابھی تک پتہ نہیں۔ گھر میں اپنے جانے کی کسی کو اطلاع تک نہیں دی۔ یہ آخر ماجرا کیا ہے؟ عجب اسرار ہے۔ لاؤ اس میز کے درائرز میں دیکھوں، شاید کوئی خط چھوڑ گئے ہوں۔

اور سب جگہوں میں تو ڈھونڈھ چکی ہوں (ڈرائرز میں تلاش کرتی ہے) یہاں خط وَط تو کوئی نہیں مگر ہاں، یہ رجسٹری کیسی ہے۔ اسے پڑھتی ہوں۔ او ہو یہ تو کسی دُکان دار نے نوٹس دیا ہے کہ "میرے قرضہ کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی ہے، ایک ہفتہ کے اندر سب بیباق کرو ورنہ مقدمہ دائر کرتا ہوں۔" اور یہ نوٹس ہے کس کا؟ اکن وال اینڈ کمپنی تاجران شراب و جنرل مرچنٹ کا۔ ساٹھ ہزار! غضب خدا کا، نہ دو ہزار نہ چار ہزار! اور وہ بھی صرف ایک دوکان دار کے ہیں۔ معلوم نہیں دوسروں کا کتنا حساب ہو۔ گھر کی جائداد ہزار ڈیڑھ ہزار ماہوار کی، اور قرضداری کی یہ حالت! گھر کی ساری جائداد، خدانخواستہ نیلام پر چڑھا دی جائے تب شاید یہ قرضہ ادا ہو۔ اور پھر یہ قرض پہلی دفعہ کا نہیں۔ بہت سی رقمیں تو میاں جان و چچا جان اپنے پاس سے چکا چکے ہیں، لیکن اتنی بڑی رقم تو اُن کے بس کی بھی نہیں۔ پھر آخر کیا ہوگا؟ نالش ہوگی، ڈگری ہوگی، گھر کی قرقی ہوگی، جائداد نیلام پر چڑھے گی، اور ساری دنیا میں بدنامی و رسوائی جو ہوگی وہ الگ۔ یا اللہ تو ہی اس مشکل کو آسان کر۔ تیرے ہی ہاتھ میں اس گھر کی آبرو ہے (روتی ہے) آخر یہ کل صبح سے کہاں غائب ہیں؟ شاید کہیں اسی روپیہ کی فکر میں گئے ہوں، مگر توبہ، اتنی سمجھ کہاں! یا شاید کہیں بدنامی کے ڈر سے چھپ گئے ہوں، مگر میرا دل، اندر سے کیوں اتنی زور زور سے دھڑک رہا ہے؟ کیا کوئی خاص حادثہ پیش آنیوالا ہے؟

[عشرت دوڑی ہوئی آتی ہے]

حسنیٰ کیوں آیا خیر تو ہے؟

عشرت۔ نہیں ..... ہاں .... مگر زیادہ پریشاں ہونے کی بات نہیں۔ خدا اچھا رہے گا، انجام اچھا ہوگا۔

حسنیٰ (بے حد گھبرا کر) کچھ آخر کہو تو کیا ہوا؟

عشرت۔ تم اس سرکاری چٹھی کو پڑھ لو۔ اس میں بھائی عشرت کا کچھ حال لکھا ہے۔

حسنیٰ۔ (نہایت پریشان لہجہ میں) بس اس وقت باؤلی ہو رہی ہوں۔ مجھ سے کچھ پڑھا وڑھا نہیں

تم ہی خدا کے لیے جلدی کچھ حال بیان کرو۔

عشرت۔ (روتی ہوئی) سکندرآباد کے کلٹر (کلکٹر) کی چٹھی ماموں جان کے نام ہے۔ کمبخت کو خدا غارت کرے۔ لکھتا ہے کہ "کل ایک نووارد شخص جو بظاہر فاتر العقل معلوم ہوتا ہے مع اپنے ملازمین کے یہاں ایک طوائف کے مکان پر پہنچا، جہاں ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ نووارد نے اُس سے سخت کلامی کی، جس کا اُس نے بھی جواب دیا۔ شور و غل کو سُن کر ایک کانسٹبل نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا، مگر نووارد نے اس پر ریوالور فیر کر دیا، جس سے وہ فوراً مر گیا۔ فیر کی آواز سُن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے، جنھوں نے مل کر نووارد کو بہت مارا۔ اب وہ سخت زخمی ہو کر پولیس اسپتال میں ہے۔ اس پر بلوہ، قتل عمد، وغیرہ کے کئی مقدمے چلائے جائیں گے۔ یہ شخص اپنا نام مشرف بیان کرتا ہے، اور اپنے تئیں وزیر راجگڈھو کا عزیز بتاتا ہے۔ اُمید کہ آپ اس کی شخصیت پر روشنی ڈالیں گے۔ اس کے ہمراہی مفرور ہو گئے ہیں۔

حسنی۔ بہن عشرت، تم نے دوست ہو کر میری قسمت پھوڑ دی۔ میں تو شروع ہی سے ....

[غش کھا کر گر پڑتی ہے۔ عشرت چند خواصوں کی مدد سے اٹھا لیجاتی ہے]

سین (۵)

[حسنی اپنی خوابگاہ میں سوتی ہوئی خواب دیکھ رہی ہے]

"یوسف، مظلوم یوسف۔ میں بے شک تیری گنہگار ہوں۔ تو وفادار تھا، مگر میں نے دشمنوں کے کہنے میں آکر تجھ سے بیوفائی کی۔ تو نے میرے آگے محبت کا تحفہ پیش کیا، لیکن مجھ نصیبوں جلی نے اسے بد عہدی کی ٹھوکروں سے پامال کر دیا۔ یہ قصور میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ لیکن آخر کیا تو۔ میں ہر طرح تیری گنہگار ہوں۔ تو جو چاہے مجھے سزا دے۔ کیا تو مجھے قتل کر ڈالے گا؟ ہاں یہ تلوار لیے تو میرے اوپر کیوں جھپٹتا ہے؟ کیا واقعی مجھے جان سے مار ڈالیگا۔ ہائے تو کس بے دردی سے جواب دیتا ہے کہ "تم نے میری ارمان بھرے دل کا خون کیا ہے۔ کیوں نہ میں اپنی شمشیر تیرے گنہگار جسم کے ناپاک خون سے رنگوں؟" اچھا، یوسف، میری جان لیتا ہے؟

تو نے، لیکن میاں جان پر کیوں وار کرتا ہے؟ کیا ایک ایک جرم کی دو دو آدمیوں کو سزا دیگا؛ میاں جان آپ ہٹ جائیے۔ میں کہتی ہوں آپ ہٹ جائیے۔ ارے کوئی بچانے والا بھی نہیں دوڑتا" [جاگتی ہے!] [گہری سانس لے کر] اُوہ! میں نے کیسا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ ابھی تک کلیجہ دہل رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھوں اس کی کیا تعبیر نکلتی ہے؟ میرے خواب ذرا غلط کم ہوتے ہیں۔ [یوسف دفعتًہ داخل ہوتا ہے] ارے یوسف تم کہاں!

یوسف (ریوالور ہاتھ میں بلند کر کے) شریف لڑکی اپنا عہد پورا کر۔

[حسنٰی لاجواب و حیران سر نیچے جھکا لیتی ہے]

یوسف۔ میں کہتا ہوں، شریف لڑکی، اپنا عہد پورا کر۔

حسنٰی۔ اور یہ آپ ریوالور لے کر یہاں کس ارادہ سے آئے ہیں؟

یوسف۔ اپنی جان دینے اور اپنی عہد شکن کی جان لینے۔

حسنٰی۔ لیکن میں پہلے اپنی سرگذشت تو سنالوں۔

یوسف۔ اب گفتگو کی گنجائش نہیں۔ فرصتوں کا زمانہ، گفت و شنود کا وقت ختم ہوگیا۔ مہلتوں کا خاتمہ ہے، اور فرشتگانِ اجل کو اپنے کام کی جلدی۔

حسنٰی۔ (گھٹنوں کے بل جھک کر) تو لے یہ سر حاضر ہے۔ اس پر فیر کر۔ خودکشی پھر بھی حرام موت تھی۔ قتل ہو جانا اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔

یوسف۔ نہیں، نہیں، حسنٰی، جسے ایک زمانہ میں عزیز و محبوب کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اپنا سر اُٹھا۔ یہ ہاتھ جس سے ایک مرتبہ پیمانِ محبت باندھ چکا، پھر اُس پر کبھی نہیں اُٹھ سکتا۔ یہ ریوالور، میری، اور صرف میری جان لینے کے لیے ہے۔

حسنٰی۔ نہیں یوسف تو خدا کے لیے مجھے زندہ نہ چھوڑ۔ قتل ہونا، اور پھر تیرے ہاتھ سے قتل ہونا شاید یہی میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ کاش مجھے دنیا ہی میں سزا مل جائے کہ آخرت کے عذاب سے بچ جاؤں۔

یوسف۔ تیری پشیمانی دیکھ کر تو تیری طرف سے میرا دل اور صاف ہو گیا۔ میں جس گہری سازش کا شکار ہوا ہوں، پیشتر میرا خیال تھا، کہ اس میں تیرا ہاتھ بھی شریک ہے، لیکن تیری پشیمانی نے یہ شبہ میرے دل سے نکال دیا۔ اب یہ ہاتھ قیامت تک تجھ پر نہیں اٹھ سکتا۔

اور یہ ریوالور۔ ہاں بے شک فیر ہوگا، اور ابھی فیر ہوگا، لیکن تیرے سینہ پر نہیں، میرے سینہ پر۔ داغِ حسرت و ناکامی اٹھانا اربابِ وفا کا حصہ ہے، اہلِ جفا کا نہیں۔ ٹریجڈی کے لیے موزوں سین، عشق کا میدان ہے، حسن کی جفا نہیں۔ حسنیٰ، اس نکتہ کو یاد رکھ۔ اس پر خود عمل کر، اور مجھے کرنے دے۔ خود زندہ رہ، اور مجھے مرنے دے۔ ہم دونوں اہلِ بصیرت کے لیے عبرت کا بہت بڑا مواد چھوڑتے ہیں، لیکن تو اپنی زندگی سے اور میں اپنی موت سے۔ اے اہلِ دنیا، اگر تم آیندہ کبھی عشق کی مظلومیت، ناکامی، و حسرت آمیزی پر توجہ کرنا، تو قسم ہے تمھیں اپنے درد کی، کہ اس کے ساتھ حسن کی سادگی، بے بسی، اور زود پشیمانی کو نہ بھول جانا۔ اچھا، حسنیٰ، رخصت۔ دیکھ میرے بعد دنیا کو میرا یہ پیام پہونچا دینا۔

[گاتا ہے]

زینتِ حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا ۔۔۔ نازشِ زخمِ جگر، رہنِ نمکداں ہونا
عاشقی کیا ہے، بجز کشمکشِ عقل و جنوں ۔۔۔ دل کو آفت میں پھنسا آپ ہی حیراں ہونا
زندگی اصل میں ہے اک قفسِ طائرِ روح ۔۔۔ موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا
نامرادی مری ہمزاد تھی تو کیوں یا رب ۔۔۔ میری قسمت میں لکھا صاحبِ ساماں ہونا
ہم شہیدانِ وفا موت کے خود ہیں مشتاق ۔۔۔ کفر اس شرع میں ہے طالبِ درماں ہونا
اے اجل آس ہے تیری ہی دمِ یاس و الم ۔۔۔ تجھ سے زیبا نہیں انساں کو ہراساں ہونا
رازِ ہستی وہ گرہ ہے جو کسی کھل نہ سکی ۔۔۔ فلسفی کے لیے آخر ہے پشیماں ہونا
اُس جفاکار نے اب کی بھی تلافی تو کیا ۔۔۔ اب مقدر میں تو ہے قبر کا مہماں ہونا
میرا انجام ہے دنیا کو اک عبرت کا سبق ۔۔۔ دوستو، تم نہ کبھی عشق میں غلطاں ہونا

سب کو آخر ہے فنا حسن ہو، یا عشق و وفا ـــــ اہل ہستی، کبھی ہستی پہ نہ نازاں ہوتے
لذت درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر ـــــ (ناظر آسار، نہیں غالبِ سخنداں ہوتا)
"کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ـــــ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

حسنی، تو میرے لیے زیادہ رنج نہ کر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ خارِ انفعال کی خلش سے تیرے جسم کا رویاں رویاں چھلنی ہو رہا ہے۔ تو اتنی نادم نہ ہو، اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ تو شاید یہ سمجھ رہی ہے، کہ تو نے میری خطا کی ہے، اور اس لیے میرے سامنے اپنی خطاؤں پر اس قدر متاسف ہے۔ لیکن اگر تو خطاوار ہے، تو کیا میں معصوم ہوں؟ ہرگز نہیں۔ ہم دونوں قصوروار ہیں، اور برابر درجے کے۔ بلکہ شاید میرا جُرم تیرے جُرم سے زیادہ سنگین ہے۔ لیکن کس کے مجرم ہیں؟ مشرف کے نہیں۔ نواب باقر حسین کے نہیں۔ بلکہ اُس قوت کے، جس کے اشارے پر یہ نظامِ عالم چل رہا ہے۔ فطرت چاہے اور سب گناہوں کو معاف کر دے، لیکن بغاوت کو کبھی نہیں معاف کرتی اس کا وہ ہمیشہ سخت سے سخت انتقام لیتی ہے۔ میرا جُرم یہ ہے کہ میں نے فطرت سے بغاوت کی۔ جس آئین پر نظام کائنات چل رہا تھا، اُس میں میں نے رخنہ ڈالنا چاہا۔ جس اسلوب پر عالم کی اسکیم جاری تھی اُس میں میں نے خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ اور آہ، آج اس جرم کی پاداش میں مجھے اپنی جان نذر کرنی پڑتی ہے۔ ہاں، بے شک میں نے وہی جُرم کیا جس کے مجرم قیس، فرہاد، رومیو ہوئے ہیں، اور مجھے سزا بھی وہی ملی، جو انھیں ملی تھی۔ اس جُرم کے ارتکاب کی، اگر نہیں، تو کم از کم اس کی اعانت کی، حسنی تم بھی مجرم ہو۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ انتقام گیر فطرت کی تعزیر سے تم بھی نہیں بچ سکتی۔ رومیو نے اگر جان دی تو جولیٹ کب زندہ رہ سکی؟ آہ حسنی! تو نے استغفار کیا، مگر کب؟ جب توبہ بند ہو چکا تھا۔ عید آئی۔ مگر کب؟ جب آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ علمی دنیا میں انکشافات کی حوصلہ مندیو، رخصت۔ دنیاوی نام و نمود کی خواہشو، رخصت۔ کسے خبر تھی، کہ تمھارا اسقدر جلد پُرحسرت خاتمہ ہوگا۔ رخصت، اے نیک نیت و سادہ دل لڑکی، رخصت۔ میں نے تجھے دل سے معاف کیا، اور اگر کوئی دعاؤں کی سُننے والی ہستی ہے، تو اُس سے دعا ہے کہ وہ بھی

تجھے معاف کرے۔ لیکن میری تقریر کا یہ آخری جملہ یاد رکھو، کہ جو لوگ میری اور تیری بربادی کا باعث ہوئے ہیں، آج سے اُن کے نصیب میں ایک گھڑی کی بھی خوشی نہیں، بلکہ کیا عجب ہے کہ ملامتِ غیر اُن کی زندگی کو اب چند گھنٹوں سے آگے نہ بڑھنے دے۔ مرنے والے کے بول میں قیامت کی سچائی ہوتی ہے۔

[ریوالور اپنے سینہ پر فیر کرتا ہے۔ حُسنی جو اس وقت تک بہوت کھڑی تھی، دوڑ کر بچانا چاہتی ہے۔ مگر گولی اپنا کام کر چکی ہے۔ اور یوسف حُسنی کے قدموں پر گر کر جان دیتا ہے]

حُسنی (نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ جیسے ایک پڑیا نکالتی ہوئی) خیر، کچھ ہرج نہیں، چند منٹ کے آگے پیچھے میں کچھ ہرج نہیں۔ ہاے، یہ وہ زہر تھا، جو اس واسطے خریدا گیا تھا، کہ اگر میاں جان نے مشرف کے واسطے زبردستی کی، تو ایجاب و قبول کے وقت اسے کھا کر ہمیشہ کے لیے اپنی زبان بند کر لوں گی۔ کیا خبر تھی کہ آج اس سے یہ کام لیا جائے گا۔ وفادار یوسف خدارا، صرف چند منٹ کے لیے داورِ محشر کے سامنے میری بے وفائیوں کے شکوے سے خاموش رہ، میں ابھی آ کر تجھے بتاتی ہوں، کہ تو نے بھی میری وفاداری کو مشکوک سمجھنے میں جلدی کی [باقر حسین آتے ہیں]

باقر حسین (بہت ہی گھبرائے ہوئے) حُسنی! یہ فیر کی آواز کہاں سے آئی؟ ارے یہ کیا یوسف کی لاش ہے؟ کیا اس نے خودکشی کر لی!

حُسنی۔ جی ہاں، اور میں بھی آپ سے رخصت ہوتی ہوں۔ میاں جان میری خطا قصور معاف کیجیے اور باجی سے میری طرف سے ہاتھ جوڑ کے کہہ دیجیے گا۔ کہ وہ بھی معاف کر دیں۔ جو زہر میں نے کھایا وہ شاید اب ۱۰ منٹ سے زیادہ مہلت نہ دے۔

باقر حسین۔ (بے حد گھبرا کر) ہائیں یہ کیا غضب ہے ایکا ایکی قہر آگیا ہے۔ ارے کوئی حکیم مسیح الملک کو فوراً ...... [ایک خدمتگار تار ہاتھ میں لیے داخل ہوتا ہے]

ارے پھینکو اس تار کو۔ فوراً حکیم مسیح الملک کو اپنے ہمراہ لاؤ۔ ہائے کیا غضب ہو گیا، کہیں یہ تار اُس جوابی تار کا جواب تو نہیں، جو دوپہر کو سکندر آباد بھیجا تھا۔ [تار کھول کر پڑھتا ہے] اُف۔ اُف۔

میں مرگیا۔ ہائے میرا لختِ جگر مشرف، اور پھانسی !

حسنیٰ ۔ میاں جان، ایک وصیت، ایک آخری التجا، مجھے یوسف کے ساتھ ایک قبر میں۔۔۔

اب کلمہ پڑھیے [یوسف کی لاش پر گر کے جان دیتی ہے]

باقر حسین ۔ یا الٰہی رحم ۔ یا الٰہی تیرا قہر دیکھ لیا۔ اکلوتی جوان لڑکی، یوں میرے سامنے جان دے، اور میں زندہ رہوں۔ ناممکن۔ ناممکن۔ جس کے واسطے سارے جوڑ توڑ چلے، وہی یوں دغا دے جائے۔ خلد آباد سے یوسف کے نام جعلی تار بھجوایا، تاکہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ اور میری کارروائیوں کے لیے میدان صاف ہو جائے۔ بھولی حسنیٰ، اپنی بھولی حسنیٰ کو طرح طرح کے فریب دیے۔ اُسے سُنا سُنا کر اُس کی والدہ سے خوب جی بھر کے، اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر یوسف پر اتہامات لگائے۔ بہت سے بے بُنیاد قصّے اُس کے متعلق نوکروں چاکروں کی زبان سے مشہور کرائے۔ مطلب یہ تھا کہ حسنیٰ کا دِل یوسف کی طرف سے پھر جائے۔ ہائے میں کیسا کمبخت تھا۔ اپنی اولاد کو ایسے ایسے فریب دیے کہ وہ بیچاری آخر میرے فریب میں آگئی۔ تب ایکا ایکی میں نے اپنے ولایت جانے کا بہانہ کرکے اُس کی شادی مشرف کے ساتھ کر دی۔ آہ، میری عقل پر کیسے پردے پڑ گئے تھے۔ یوسف، کیسا نیک، لائق، سعید لڑکا تھا، مگر دولت کی طمع نے مجھے اندھا کر دیا۔ اُف، اُف، میں کس قدر گنہگار ہوں۔ میں مرنے کو تو مرتا ہوں، لیکن موت کے بعد کیا حشر ہوگا ؟ کیا ایسے دغاباز، جعل ساز کو خدا معاف کرے گا ؟ لیکن نہیں، مجھے فوراً مرنا چاہیے۔ شاید میرے بدنصیب انجام سے دنیا میں ایک نظیر و مثال قائم ہو جائے۔ اور صدہا والدین میرے حال سے عبرت پکڑ کے لڑکیوں کی جان پر رحم کرنا سیکھیں۔ یہ سامنے سے مولوی ہدایت احمد آ رہے ہیں، مگر قبل اس کے کہ یہ اپنے پند و نصائح سے میرے زخم پر نمک چھڑکیں، میں اپنا خاتمہ کیے لیتا ہوں۔ یوسف کے ریوالور کی ایک نلی اب تک بھری ہوئی ہے۔ [فیر کر لیتا ہے]

ڈراپ

ناظرؔ

نویدِ مسرت

گذشتہ جون میں جب ہمارے لایق دوست مسٹر عبدالماجد بی اے کی شادی ہوئی ہے تو مندرجۂ ذیل نظم حضرتِ عزیز نے لکھی تھی۔ افسوس ہے کہ نظم کی تکمیل نہ ہو سکی جو کسی جلسہ میں پڑھنے کی نوبت آتی۔ اب بھی مکمل نہیں ہے۔ بہرصورت جس حال میں ہے شایع کی جاتی ہے۔

ساقیا مجلس فروزی ہو خاص انداز سے
چھیڑ نغمے قلقلِ مینائے مے کے ساز سے

طرح اندازِ سرِ ہنگامہ آرائی ہے تو
چشمِ مستِ ساغر و مینا کی بینائی ہے تو

ہے سہارا میکشوں کو صرف تیری ذات کا
کر دے حسنِ رخ سے زندہ فلسفہ جذبات کا

مے پلا کر حسنِ رخ کی گل فشانی دیکھنا
بادۂ گلرنگ میں رنگِ جوانی دیکھنا

ہے مرا پیرِ مغاں ساقی وہ اُمّی فلسفی
میکدے سے جس کے دُردِ فانکوا مجکو ملی

ہو اُسی پیرِ مغاں کے بادۂ صافی کا دور
تا کہ موجوداتِ عالم پر کروں کافی میں غور

مے کے ساغر پہ طبیعت کی روانی دیکھنا
منہ میں کوثر کے بھی بھر آئے گا پانی دیکھنا

آج تو فرقت زدہ بھی نشہ میں یوں چُور ہوں
دل کے چھالے میفروشِ دانۂ انگور ہوں

جلوۂ بنت العنب پردے ہی میں کھلا دے آج
ہو گی جاری میکدے میں راہ و رسمِ ازدواج

دیر سے بیٹھا ہوں قسمت آزمائی کے لیے
دل جگر لایا ہوں ساقی رونمائی کے لیے

گردشِ ایام کا ساقی مجھے کچھ غم نہیں
حلقۂ رندانِ میکش دورِ مے سے کم نہیں

دیکھ کر جس کو تصدق شانِ محبوبی ہوئی
سادگی محفل کی رنگِ شوخ میں ڈوبی ہوئی

صدر میں ہے رونق افزا ماجدِ والا گہر
جس کی دستارِ فضیلت پر ہے سہرا جلوہ گر

علم پرور آج اس محفل میں خوش ہوں گے ضرور
رونقِ بزمِ ادب ہے زینتِ بزمِ سرور

گل فشانی کا عزیز اب دل میں کب تک ولولہ
لڑ نہ جائے اُس کے سہرے سے سخن کا سلسلہ

عزیز لکھنوی

تہذیب اور شعائرِ تہذیب

دنیا میں اگر ایک طرف توحّد اور یکسانیت پر زور دیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس دعوے اور اس خواہش کے پہلو بہ پہلو ضد اور مُغائرت کا بھی زور ہوتا ہے اگرچہ خواہشات اور اغراض میں بہت کچھ توافق اور توحّد ہوتا ہے، مگر پھر بھی اغراض کی تمیز اور تاویل میں اس قدر مغائرت اور تضاد ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اغراض و خواہشات میں بھی کوئی توحّد اور تناسب نہیں۔ دنیا میں ایک انسانی ہستی ہی ایسی ہے جس میں باوجود ایک نوع ہونے کے بھی اس قدر تضاد اور اختلاف ہے۔ انسانیت کے ایک ہونے پر بھی اس قدر تخالف ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انسانیت یا اغراض انسانیت کبھی ایک تھے یا کبھی ایک ہو سکتے ہیں۔

بے شک اُن اغراض، اُن ضروریات، اور اُن امور میں یکسانیت اور توافق بھی پایا جاتا ہے جو قدرت کے ہاتھوں میں رہتے یا پرورش پاتے ہیں، وہ بھی اُس حد تک جو نوعیت کے اعتبار سے یکسانیت اور توافق رکھتے ہیں۔ ان حدود سے باہر ہو کر اگرچہ یکسانیت اور توافق و توحد کی کوشش کی جاتی ہے، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ مغائرت رہ ہی جاتی ہے۔ گو انسان اپنی ضروریات کے ماتحت قانونِ موافقت کی بہت کچھ خواہش ظاہر کرتا ہے اور ایک بڑی حد تک اُس کا عمل بھی ہے لیکن پھر بھی قانونِ مخالفت سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ایک کافی توافق اور توحد کی صورت میں بھی تخالف پایا جاتا ہے اور ایک بڑے تخالف کی حالت میں بھی توافق اور توحد موجود ہوتا ہے۔ یہ قولِ اکثر خود انسان کی ہستی ہی دو متضاد نوعیتوں مادہ اور مجرّدات سے وابستہ ہے۔ دنیا کی مہذب نسلوں اور وحشی ذریات میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے یہاں تک کہ مہذب نسلیں وحشی نسلوں کو دائرہ انسانیت سے دور تر یا خارج سمجھتی ہیں، لیکن پھر بھی

ان دونوں میں وہ باتیں مشترک ہوتی ہیں جن کا اشتراک باوجود ادّعاے تہذیب اور سکوتِ وحشت کے بھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ روزمرہ زندگی میں دونوں قسم کی نسلوں کو چند ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں تہذیب اور وحشت ایک ہی اسٹیج پر آجاتی ہے۔ ایک مہذّب بمقتضیاتِ قدرت یا مقتضیاتِ فطرت سے اُسی طرح مجبور ہوتا ہے جس طرح ایک وحشی۔ ایک وحشی اُسی رنگ میں طالبِ آسایش ہے جس طرح ایک مہذّب۔ قدرت کی جانب سے جو اشیا مہذبوں کو مفت دی گئی ہیں وہی وحشیوں کے حصہ میں بھی رکھی گئی ہیں۔ ایک مہذب بھی ذہن رکھتا ہے اور ایک وحشی بھی، گو دونوں کے ذہنی پیمانے اور طریقِ استعمال میں فرق ہے لیکن عطیہ میں کوئی فرق نہیں۔

دنیا میں وہ طاقت یا وہ طریقہ جو ہمیشہ انسانی نسلوں کے درمیان تفاوت اور تخالیف کا موجب ثابت ہوتا ہے وہ عمل یا طریقِ عمل اور استعمالی کیفیت ہے۔

یہی ایک موجب ہے جو مہذب اور ایک وحشی کو دو نمونے کے انسان بناتا اور ثابت کرتا ہے۔ یہی بات ہے جو دنیا میں تفریقی پہلو سے حکمراں ہے۔ گو عوارض اشکالیہ اور خواصِ حواسیہ قدرتاً متبائن اور متخالف ہیں لیکن عملی اور کسبی پہلو سے یہی ایک طریقہ ہے جو ایک جماعت کو دوسری جماعت سے بکھیرتا اور تمیز دیتا ہے۔ زید اور بکر دونوں انسان ہیں۔ اشکالی اور وجدانی اختلافات کے ماسوا۔۔۔ دونوں میں ایسے چند امتیازات بھی پائے جاتے ہیں جو دونوں کو آپس میں جدا کرتے ہیں اور یہ تفریق قدرتی تفریقات سے اکثر اوقات زیادہ تر مؤثر ہوتی ہے زید عالم ہے اور بکر جاہل ہے۔ زید صاف پاک شستہ رہتا ہے، بکر گندہ رہنے کا عادی ہے۔ یہ باتیں قدرتی نہیں ہیں بلکہ عملی اور کسبی ہیں۔ زید غصہ اور غضب پر ضابط نہیں خالد ضابط ہے زید جلد بازی کا عادی ہے اور بکر باوجود جلد بازی رکھنے کے پھر بھی اپنے تئیں قابو اور ضبط میں رکھتا ہے۔ ایک کا عمل اُسے مہذب اور بااخلاق ثابت کرتا ہے اور دوسرے کا اُس کی وحشت اور جہالت پر دال ہے۔

قدرتی اختلافات اُس وقت بہت کم محسوس ہوتے ہیں جب کسبی اور عملی رنگ میں دو شخص یا دو نسلیں ایک ہی پہلو اور ایک ہی رنگ رکھتی ہوں جب دو شخص ایک ہی سکے اور ایک ہی درجے کے دولتمند صاحب کمال صاحبِ تکلف اور صاحب تدبّر ہوں تو ان دونوں میں باوجود بعض قدرتی تباین کے بھی ایک وحدت اور ایک یکسانیت پائی جائے گی اور ہر ایک کی نگاہوں میں دوسرا محقر نہیں ہوگا - عمل ہی ایک ایسی طاقت ہے جو جامع بھی ہے اور فارق بھی. ایک وحشی قدرتاً وحشی نہیں ہے بلکہ عملی پہلو سے. ایک مہذب بھی عملی رنگ میں جامۂ تہذیب زیبِ تن کیے ہوے ہے - ترکِ عمل سے وہ بھی وحشی کا سا ہو جاتا ہے۔

تہذیب کیا ہے؟ ایک ایسا طریقہ جو مادّی اور وجدانی پہلو سے ایک ایسے انتہائی درجے پر انسانی نفاست، انسانی آسایش، انسانی کمال، انسانی وجاہت، انسانی کرامت انسانی شرافت، انسانی اخلاق، انسانی ذہانت اور انسانی تدبّر و تفکر اور انسانی تعامل کا کفیل ہو۔ جس نسل، جس قوم اور جس ذرّیات میں یہ طریقہ، یہ عمل پایا جاتا ہے، وہ نسل وہ قوم اور وہ ذُرّیات مہذب ہے، دوسرے الفاظ میں تہذیب کہا ہے۔

انسان کا خود کو اُن مراتب اور اُن مدارج تک پہونچانا جو قدرت کی جانب سے اُسکی ذات میں علیٰ قدر مراتب مودّع ہیں اور دنیا کی اشیا کی نسبتوں کو معلوم کرکے آسایش اور مفید رنگ میں اُن سے کام لینا اور اُن حکمتوں اور اُن رموز کا اظہار جو انسان کے اِردگرد کی کائنات اور مخلوقات میں پائی جاتی ہیں۔

جو شخص روزمرہ کھانے کے برتن کبھی صاف نہیں کرتا اور مکان ہمیشہ ناصاف اور گندہ رکھتا ہے وہ بمقابلہ اُس شخص کے غیر مہذب ہے جو ہمیشہ گھر کے برتن صاف اور گھر ستھرا رکھتا ہے۔

اس عام اور چھوٹی سی مثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ تہذیب سے کیا مراد ہے اور وحشت کیا ہے۔ تہذیب کے لفظی معنی خود کو پاک صاف رکھنے یا پاک صاف رہنے کے ہیں۔

صفائی اور پاکی کا مفہوم جب ہم محدود معنوں میں لیتے ہیں تب بھی ہم دائرۂ تہذیب سے نکل جاتے ہیں۔ صفائی اور پاکی ظاہری اور باطنی دونوں نسبتوں سے وابستہ ہے۔ جو شخص صبح ہی صبح ہاتھ منھ دھوتا اور صاف کرتا ہے اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے دل و دماغ پر بھی بستر سے اُٹھتے ہوے خیال اور غور کرے۔ بعض دفعہ منھ کا نہ دھونا معاف کیا جا سکتا ہے لیکن بد خیالی معاف نہیں ہو سکتی۔ خود اپنا ضمیر ہی معافی نہیں دیتا۔

تہذیب یا خواہش کسبی نہیں ہے بلکہ اس کی محرک خود فطرت ہے۔ دیکھو جب ہم کبھی کسی ایسے گھر میں جاتے ہیں جس کا اثاثہ اشیاء، ظروف، کتابیں اور پارچہ جات اِدھر اُدھر منتشر یا بکھرے ہوتے ہیں اور گھر کے بال بچے گندے اور میلے کچیلے ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے دیکھے جاتے ہیں۔ تو ہماری طبیعت اور دل و دماغ میں دیکھتے ہی ایک کدورت اور ایک نفرت سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس واسطے کہ ہماری فطرت پسند نہیں کرتی اور ہمارے دماغ پر اس کا بُرا اثر ہوتا ہے۔ اگر فطرت اس کی متقاضی نہ ہو تو ہم نا فراد کر نہیں ہو سکتے۔ خلاف اس کے جب ہم ایک گھر ایک مکان میں ایک ترتیب اور ایک خوش وضعی پاتے ہیں تو ہمارے دل و دماغ میں ایک قسم کی بشاشت اور فرحت پیدا ہونے لگتی ہے جس سے انسان کیوں خوش ہوتا اور کیوں اُس کا ہر فرد بشر دلدادہ ہے؟ اس واسطے کہ اس میں ایک عمدگی، ایک ترتیب، ایک خوش وضعی اور ایک خوش ادائی پائی جاتی ہے، جو فطرتاً انسان کو پسند ہے۔

اس قسم کی تمام چھوٹی بڑی مثالیں ثابت اور ظاہر کرتی ہیں کہ انسان فطرتاً تہذیب پسند اور خواہانِ تہذیب ہے۔ بایں نقطۂ خیال پھر کیا کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر انسان اور ہر نسل انسانی مہذب ہو سکتی اور تہذیب سے حصہ لے سکتی ہے۔ یہ نرا دعوٰے ہی نہیں بلکہ اس کی نظیریں بھی ہیں۔ وہ قومیں جو آج بہرۂ تہذیب پر فاخر ہیں وہ کچھ دنوں پہلے یہ بہرۂ تہذیب نہیں رکھتی تھیں اور اُس وقت کی مہذب یا ترقی یافتہ قومیں اُنھیں اُسی طرح وحشی کہتی

جس طرح وہ آج بعض دوسری قوموں کو غیر مہذب کہتی ہیں یا ایسا کہنے سے دریغ نہیں کرتیں

تہذیب کا دوسرے الفاظ میں ترقی پانا بھی ایک مفہوم ہے۔ جب کوئی قوم متنزل ہوتی ہے تو وہ جادۂ تہذیب سے کچھ فاصلہ دُور جا رہتی ہے اور جب ترقی پاتی ہے تو رفتہ رفتہ اُس کا پایہ بھی مہذب ہو جاتا ہے۔

تہذیب کی عملی رنگ میں دو قسمیں ہیں:-

(الف) اصولی تہذیب۔

(ب) اعتباری تہذیب۔

اگرچہ اصولی اعتبارات کے ماتحت تہذیب کا وہ سبب اور مفہوم عموماً ایک ہی یا متحد ہونا چاہیے لیکن فروعی اعتبارات سے مدارجِ تہذیب میں گونہ امتیاز اور فرق بھی ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ نوعی اجتہاد ہے اور کچھ ملکوں کی ضروریات اور تخالفِ آب و ہوا بھی ہے۔ اس مرحلہ پر پہونچ کر تعریفِ تہذیب میں کچھ ترمیم کرنی پڑتی ہے۔

بہ ایں ضرورت یہ کہا جائے گا کہ "تہذیب سے مراد اُن مراسم اور اُن قیود کا عملی رنگ میں تہیہ یا پورا کرنا ہے جو بہ لحاظِ تمدن، آسائش، اخلاقی ضروریات اور نظم و نسق قومی اور ضروریاتِ قومی کے ماتحت لازمی اور ضروری سمجھ لی جاتی ہیں۔ یا واجبی اور رسمی رنگ میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ان امور اور ان امور کے سوائے کوئی قوم مہذب نہیں ہو سکتی یا مہذب نہیں کہلا سکتی۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ قید اور یہ شرط بھی لگا دی جاتی ہے کہ ایسا کرنا تہذیب ہے اور ایسا کرنا بدتہذیبی ہے۔ ایسی تہذیب گویا ایک مقید اور مشروط تہذیب ہوتی ہے۔

گو اُس کا سکہ اور عمل ایک خاص مسلک یا ایک خاص قوم کے اندر ہی اندر ایک تقید کے ساتھ ہوتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ کوئی دوسری قوم بھی اُس کی اس حد تک مقتدی اور پیرو ہو۔

جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم اور فلاں نسل مہذب نہیں ہے تو بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات اُس کا وہ سبب بھی ہوتا ہے کہ وہ قیود اور وہ شرائط جو ایک دوسری

قوم نے اپنے نقطۂ خیال یا اپنی ضروریات اور اپنے اجتہاد کے ماتحت اپنے اوپر لازم اور عائد کر رکھی ہیں جو دوسری قوم میں جس پر بدتہذیبی کا الزام دیا جاتا ہے اُس کی پابندی اُور تکلیف روا نہیں رکھی گئی اور قومی روایات میں اُن کی تعظیم اور تقدیس نہیں کی جاتی، یا بہت ہی کم کی جاتی ہے۔ یہ بات اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمیشہ ہر ملک اور ہر قوم کی تہذیب سوائے اصولی تہذیب کے ایک ہی شکل اور ایک ہی عمل نہیں رکھتی۔ ملکوں اور قوموں کی تہذیبوں میں کبھی کبھی بہت کچھ فرق بیّن ہوتا ہے۔ جو بات ایک قوم کے نقطۂ خیال یا اجتہاد کے رُو سے دائرۂ تہذیب میں داخل ہوتی ہے وہی بات کسی دوسری قوم کے نزدیک ایک بدتہذیبی ہوتی ہے۔

ہمیں اس کی وضاحت کے واسطے شاید مذہبی قوانین اور مذہبی قیود سے زیادہ تر واضح اور روشن پہلو نہیں ملے گا۔ دیکھو بعض باتیں اور بعض عمل ایک مذہب کے اجتہاد کے ماتحت جائز اور روا ہیں اور وہی باتیں ایک دوسرے مذہب میں ایک پاپ اور گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔ ہر گھر میں اگرچہ لیمپ اور دیا جلتا ہے، لیکن روشنی گھر کی نوعیت اور وسعت کے لائق ہوتی ہے۔ کوئی تہذیب یہ دعوے نہیں کرسکتی کہ اُس کے اجتہاد اور اس کے قیود و شروط کی ہر جگہ یکساں عزت ہوتی ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ بجائے خود اُس کا اجتہاد قابلِ وقعت اور قابلِ عزت ہو۔ یہاں بحث ماننے اور نہ ماننے کی ہے۔ وہ مذہب بھی جو خود کو ساری دنیا کے مذاہب سے فائق اور صادق سمجھتا ہے، یہ دعوے نہیں کرسکتا کہ اُس کی تمام باتیں اور تمام اصول اور تمام احکام ساری دنیا میں ایک ہی صداقت کے ماتحت دیکھے جاتے ہیں اور سب لوگ اُن کے معتقد ہیں۔ بازار اور منڈی میں ہزاروں اشیا ستھری اور خوبصورت بکتی ہیں لیکن ہر شخص اُن کا گاہک اور خواہاں نہیں ہوتا۔ ہر چیز اپنے گاہک کی خود تلاش کرتی ہے اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق خریدار بنتا ہے۔

بسا اوقات خریدار اپنی ضروریات، اپنے اجتہاد اور اپنی رسوم اور اپنے رواجات کے

ماتحت اشیا پسند کرتا ہے۔ بعض وقت وہ اگرچہ بعض اشیا پسند کرتا ہے لیکن اُس کی ضرورت اُس کی حالت اور اُس کا اجتہاد، اُس کی رسمیں اور اُس کے رواجات اُسے فراخ دلی سے اُس کی خرید کی اجازت نہیں دیتے۔ چونکہ اکثر کیا، کُل تہذیبیں یا شعائرِ تہذیب اجتہادات کے سوائے بعض رسوم اور درجات کے بھی پابند اور مقید ہو چکے ہیں اس واسطے دوسری قومیں اُن کے قبول کرنے سے گھبراتی یا تامل کرتی ہیں۔ بعض باتیں اپنے ذاتی اجتہاد کے ماتحت غیر مفید یا زائد معلوم ہوتی ہیں لیکن قومی یا سوشل پابندیاں فوراً اُن کے ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔ یہ بات کم و بیش تقریباً تمام قوموں میں پائی جاتی ہے۔ انگلستان اول ممالک یورپ میں سے ہے جو تہذیبی دوڑ میں کسی دوسری یورپین قوم سے پیچھے نہیں، لیکن انگلستان میں قدامت پسندی کی پرستش اس شد و مد سے ہوتی ہے کہ بہت سی مفید باتیں اس کی کشمکش ہو جاتی ہیں۔

جو قومیں نشۂ تہذیب میں دوسری قوموں کو وحشی، نیم وحشی، یا غیر مہذب کہتی ہیں، اُن کا یہ الزام عموماً بہ وجوہِ ذیل ہوتا ہے۔

(۱) بہ اعتبارِ بعض امورِ نفسیہ۔

(۲) بہ اعتبارِ بعض ترقیات۔

(۳) بہ اعتبارِ بعض اجتہاداتِ عالیہ۔

(۴) بہ اعتبارِ بعض اخلاق۔

(۵) بہ اعتبارِ بعض اطوارِ زندگی۔

(۶) بہ اعتبارِ بعض رسوم۔

(۷) بہ اعتبارِ بعض رواجات۔

(۸) بہ اعتبارِ بعض مسلّمات۔

(۹) بہ اعتبارِ بعض زوائد۔

ایک قوم ہمیشہ اور تقلیداً اپنے گھروں، اپنے ابدان اور اپنے لباس کو صاف ستھرا اور پاکیزہ، صحت آور رکھنے کی عادی ہے۔ اُس کا کوئی بھی ایسا کام نہیں ہوتا جس میں کسی نہ کسی پہلو سے نفاست اور لطافت نہ ہو، یا جو اوروں کی نظروں میں ایک عام نقطۂ خیال کے ماتحت خوش آمیند نہ ہو۔ ایسی قوم کسی ایسی دوسری قوم کو غیر مہذب کہنے کا حق رکھتی یا رکھ سکتی ہے کہ جو ایسی نفاست اور ایسی نفاست نہ رکھتی ہو۔

اسی طرح دوسری نسلوں کی صورت میں بھی ایک قوم دوسری قوم کو یہ الزام دے سکتی یا دیتی ہے کہ جو ایسی ترقیات اور ایسی باتوں سے محروم اور عاری ہو یا جس کا رجحان اور توجہ ایسے امور کی جانب نہ ہو۔

اگرچہ بعض الزامات اور بعض باتیں صحیح بھی ہوں گی لیکن ہر پہلو سے ایسے الزامات مقابلۃً درست ثابت ہونے مشکل ہیں۔ کیونکہ جب اجتہادات اور ضروریات میں دوسری قوموں کی بحث آپڑے گی تو الزامات کا وزن کچھ دُور ہو جائے گا۔

جب ہم اس مرحلہ پر پہونچتے ہیں کہ دنیا کے پردہ پر کوئی ایسی قوم نہیں جس میں باوجود وحشی اور نیم وحشی ہونے کے بھی کوئی نہ کوئی بات اچھی نہ پائی جاتی ہو تو ہمیں مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک تحکم کے ساتھ کوئی دوسری قوم ایسا حق نہیں رکھتی جو کسی دوسری قوم کو کلیتہً غیر مہذب اور وحشی کہہ سکے۔ جس طرح ایک مہذب قوم کسی دوسری قوم میں بعض باتیں تہذیب یا شعائر تہذیب کے خلاف نکالتی ہے اسی طرح دوسری قوم بھی چند باتوں پر حرف رکھتی ہے۔ اور بعض وقت ایسی حرف گیری یا ایسی نکتہ چینی حق بجانب بھی ہوتی ہے۔

اس مرحلہ پر پہونچ کر ہمیں یہ سوجھتی ہے کہ "بعض ایسی رسمیں اور ایسے رواجات جو کسی قوم کی تہذیب میں رل کر پیوند تہذیب ہوگئے ہیں اور جو کسی دوسری قوم میں نہیں پائے جاتے اُن کے اختلاف یا نہ پائے جانے سے کوئی دوسری قوم غیر مہذب نہیں کہی جاسکتی"۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑے گا کہ "ایسی باتیں اور ایسے رواجات اور رسوم

اصولی تہذیب کا ضمیمہ یا جزو نہیں ہوتیں بلکہ اُس تہذیب کی جو اعتباری تہذیب ہے اور اس پہلو سے کوئی شخص اعتباری تہذیب کے زور پر کسی دوسری قوم کو وحشی یا غیر مہذب نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اگر اُس کے بعض امور اور بعض عملیات چند اعتبارات کے ماتحت معمولی ہیں تو کیوں دوسری قوم کے بعض اجتہادی اعتبارات معمولی نہیں ہو سکتے۔

ہر شخص ایک مذہبی پرستار کو اپنے اجتہاد کے ماتحت یہ تو کہہ سکتا ہے کہ اُس کا عقیدہ باطل ہے لیکن یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ وہ بلا رضامندی خود ایسا عقیدہ چھوڑ ہی دے۔

ہر قوم اخلاق کا دعوےٰ کرتی ہے، اور تمام اخلاق اصولاً ایک ہی تعریف کے ماتحت آنے چاہییں، لیکن پھر بھی بعض قوموں کے بعض رسمی اور اجتہادی اخلاق میں فرق اور تمیز ہوتی ہے۔ انگلستان میں بغیر واقفیت کرانے کے کسی دوسرے اجنبی شخص سے علیک سلیک کرنا اٹی کٹ کے خلاف ہے۔ اور بعض قوموں میں یہ قید ضروری نہیں۔ مثلاً مسلمانوں میں وہ شخص مذہبی نقطۂ خیال سے زیادہ تر مستحقِ کشادہ دلی ہے جو سلام علیکم کہنے میں تقدیم کرے چاہے پہلی واقفیت ہو یا نہ ہو۔

مشرقی طریق عمل یہ ہے کہ جب کوئی روٹی کھاتا ہو تو دوسرے کو بھی چاہے کتنا ہی اجنبی ہو، صلاح کرے۔ لیکن یورپ کی بعض اقوام میں یہ بات ضروری نہیں۔

مشرق میں جب کوئی مسافر کسی دوسرے شہر میں جاوے تو شہر والوں کا فرض ہے کہ اُس سے ملنے جائیں اور اُس سے پوچھیں کہ اُسے کوئی تکلیف تو نہیں؟ لیکن انگریزی اٹی کٹ یہ ہے کہ مسافر اور نووارد خود لوگوں سے ملنے جائے۔

مشرق میں دستور ہے کہ جب کوئی مہمان چاہے اجنبی اور ناواقف ہی ہو، گھر میں آ جائے تو اُس کی حتی الامکان خاطر تواضع نہ کرنا اور اُس سے روٹی کی قیمت لینا اخلاق اور مروت سے بعید ہے۔ لیکن یورپ میں بیٹے اور بھائی سے بھی کھانے کی قیمت لینا کوئی بُرائی اور کوئی عیب نہیں۔ یہ نہیں کہ یورپ کے لوگ دوستوں یا رشتہ داروں کو مفت کھلاتے پھرتے

نہیں بلکہ یہ کہ اگر وہ ایسا کریں تو وہاں کی تہذیبِ اعتباری کے رُو سے اُن پر کوئی الزام نہیں رکھ سکتا۔ ہر مُلکے و ہر رسمے۔

بعض اقوام دنیا میں عورتوں کے سامنے اگر مرد کا ٹخنہ بھی ننگا ہو جائے تو ایک بدتہذیبی ہے۔ لیکن مَردوں اور عورتوں کا پہلو بہ پہلو ننگے بدن نہانا کوئی عیب نہیں اور عورتوں کا سینہ ننگا کر کے مَردوں میں بیٹھنا کوئی بدتہذیبی نہیں ہے۔ اور بعض قوموں خصوص مشرق میں عورت کوئی بھی اپنا عضو مردوں کے سامنے ننگا نہیں کر سکتی۔ بعض اقوام دنیا میں زید کی عورت بکر کے ساتھ بھری محفل میں ناچ سکتی ہے اور بعض اقوام میں عورت کا کسی غیر مرد سے شوخی کے ساتھ آنکھ ملانا بھی ایک تہذیبی غلطی ہے۔

جب ایسی باتوں پر اعتراض کیا جاتا ہے تو ہر قوم دوسری قوم سے یہ کہ کر پیچھا چھڑاتی ہے کہ یہ طریق عمل اُس کی تہذیب یا اُس کی رسم تہذیب کے خلاف نہیں ہے۔

کیا ہم ایسی مثالوں سے یہ کہنے یا یہ قیاس کرنے کے مجاز نہیں ہیں کہ اعتباری رنگ میں تہذیب کوئی جامع مانع تعریف نہیں رکھتی۔ ایک دفعہ ایک انگریز نے کسی دیسی کو یہ کہا

عورتوں کا زیور پہننا تہذیب کے خلاف ہے۔

دیسی نے سُن کر کہا زیور کی ضرورت اور عدم ضرورت پر تو بعد میں بحث ہو گی لیکن یورپین عورتوں کا سر پر سالم مور اور بگلا باندھ لینا کون سی تہذیب ہے۔ اگر سونے چاندی اور جواہرات و موتیوں کی نسبت سوال ہو سکتا ہے تو جانوروں کے سفید و سیاہ اور سُرخ و زرد پروں کی نسبت بھی یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اور آج کل یہ پر تو سونے کے برابر قیمت پاتے ہیں اور استعمال کے بعد اُن کی کچھ قیمت بھی باقی نہیں رہتی۔ سونا چاندی کانوں سے نکل کر ہاتھوں اور کانوں کی زیب و زینت ہوتا ہے اور ایک بے جان شئے ہے۔ لیکن پروں کے واسطے صدہا جانوروں کی جانیں بھی لی جاتی ہیں۔ ایک جان جانے کے بعد ایک لیڈی کا سر زینت پاتا ہے۔

کیا دنیا کی مختلف تبدیلیوں کو مدنظر رکھ کر ایسی اُلجھنوں کے ہوتے ہم کوئی فیصلہ کرنے کے قابل رہتے ہیں۔ اعتباری تہذیب کبھی بھی ہمیں ایک پہلو پر بیٹھنے نہیں دیتی اسکا تعلق زیادہ تر نمایش، اور اعتباری زیب و زینت یا اچھا دسے ہے۔ لیکن با ایں ہمہ ایک قول مشترک بھی نکلتا ہے جو ہمیں ایک صحیح پہلو پر لے جانے کی دعوت دیتا ہے۔

ہر اعتباری تہذیب کے اختیار کرنے سے پہلے ہمیں خود اپنے آپ سے یہ سوالات کرنے لازمی ہیں۔

(۰) کیا جو بات ہم اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اُس میں کوئی ذاتی اور حقیقی خوبی ہے۔

(۲) وہ کوئی ذاتی اور حقیقی حُسن رکھتی ہے۔

(۳) خود اپنے لیے اور دیگر ابنائے جنس کے واسطے اُس میں کوئی قابلِ حصول اور قابل وقعت آسایش ہے۔

(۴) انسانی زندگی کے واسطے باعتبار آسایش، حُسن عمل، حسنِ اثر، اور حُسن نتیجہ اُس کی ضرورت ہے۔

(۵) ذاتیتاً اور عملاً وہ کوئی قیمت رکھتی ہے۔

(۶) اُس سے تہذیب نفس، تہذیب خیال اور تہذیب قوت اور تہذیب بدان کی امید ہے؟

(۷) وہ اخلاقی پہلو سے قابل تمسک اور قابل تقلید ہے؟

جو تہذیب اور جو شعائر تہذیب ایک خوبی اور ایک جامعیت کے ساتھ ہمیں ان امور اور ان فضائل سے آشنا کرتا اور ملاتا ہے وہی ہمارے واسطے مفید اور مستحسن ہے چاہے وہ یورپ کا ہو اور چاہے مشرق کا۔ چاہے اُس کا دینے والا زید ہے اور چاہے بکر۔ خود کو کمزوریوں اور آلودگیوں سے پاک کرنے اور اُن سے پاک رہنے کا نام تہذیب ہے جو اِن حدود سے باہر ہے وہ ایک فیشن اور ایک نمایش ہے۔ خودداری کے ماتحت ہر نیک عمل اور ہر مفید تحریک ایک

مکمل تہذیب ہے۔ غیرت اور حمیت تہذیب کا شروع اور خاتمہ ہے۔ جو تہذیب انسانی غیرت اور فطرتی حمیت سے دُور لے جاتی ہے وہ تہذیب نہیں بلکہ تکثیف اور تغلیظ۔ اور مختصر الفاظ میں تہذیب کیا ہے؟ حسنِ عمل۔ اور قومی زندگی۔ جو قوم قومی پہلو سے زندہ نہیں وہ باوجود مہذب ہونے کے بھی مردہ اور غیر مہذب ہے۔

سلطان احمد (جہلم)

غزلیات

جو راہِ غم میں ترا پائمال ہو نہ سکا — وہ باریابِ مقامِ کمال ہو نہ سکا
انھیں منا کے بھی اظہارِ حال ہو نہ سکا — قبول عذر سے رفعِ ملال ہو نہ سکا
جفا سے باز نہ آئے تم اور کیوں آتے — کہ ہم سے ترکِ وفا کا خیال ہو نہ سکا
وہ جب ملے تو مجھے شادمانِ غم پایا — مرے ملال سے اُن کو ملال ہو نہ سکا
قبول سب نے وہی کی سُنی جو آپ کی بات — کسی کو حوصلۂ قیل و قال ہو نہ سکا
وہ ابتدائے محبت وہ انتہا کے مزے — کہ جن میں پڑ کے خیالِ مآل ہو نہ سکا
کدھر سے آئی خدا جانے زلفِ یار کی بُو — کچھ امتیازِ نسیم و شمال ہو نہ سکا
بڑھا تو خوب مگر نازِ عاشقی کا جلال — حریفِ جلوۂ نورِ جمال ہو نہ سکا
جنونِ عشق میں حیرت سے کچھ کمی نہ ہوئی — وہ رنگِ رُخ جو اُڑا تھا بحال ہو نہ سکا

حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا حسرت
سلام کر نہ سکے ہم سوال ہو نہ سکا

فضل الحسن حسرت موہانی

یہ جذبِ شوق کہ جس کا خیال ہوتا ہے — مری بغل میں وہی خوش جمال ہوتا ہے
قدم کہیں پڑے اُس مست ناز کا اے دل — یہ کیا ستم ہے کہ تو پائمال ہوتا ہے
حنا پسند نہیں اُن کو خونِ دل ہے پسند — کہ اس سے ہاتھ بہت جلد لال ہوتا ہے

نہ دل کی فکر نہ عاشق کو جان کی پروا — ترے خیال میں کس کا خیال ہوتا ہے
سبیل رکھی ہے نے کی خدا سے پائیں گے اجر — کہ نیک کام میں صرف اپنا مال ہوتا ہے
یہ کیا نگاہ ہے اپنے ہی دست و بازو پر — اُسے تو دیکھ جو ناحق حلال ہوتا ہے
مجھے فراق میں کرتا ہے قتل عید کا چاند — نیا ستم ہے کہ خنجر ہلال ہوتا ہے
تڑپ کے جاتا ہے دل پائے نازنک اُس تک — یہ راہ شوق میں خود پائمال ہوتا ہے
لپٹ کے شمع سے پروانے نے کہی کیا بات — جلے کسی کے لیے تو وصال ہوتا ہے
وہ مستِ ناز۔ رواں تیغ ادا کی۔ کس کو خبر — کوئی حلال ہوا یا حلال ہوتا ہے
فضا ملامتِ ناصح کا دوں جواب مگر — یہ اک بزرگ ہیں اس کا خیال ہوتا ہے

شیخ محمد عالیجاہ فضا

یہ ہر دم کیا تماشا اے نگاہِ یار ہوتا ہے — کبھی اقرار ہوتا ہے کبھی انکار ہوتا ہے
مگر ہے امتحاں منظور میرے ظرفِ عالی کا — فلک دیتا ہے مجھ کو کام جو دشوار ہوتا ہے
کوئی پوچھے دلِ مجروحِ اربابِ مروت سے — کہ یاں دوستی بھی کس قدر دشوار ہوتا ہے
حجاب اُس کا اُدھر اور اضطرابِ دل اِدھر اپنا — نہ جانے کون اِن میں مانعِ دیدار ہوتا ہے
میسر جب نہیں ہوتا ہے تکیہ تیرے زانو کا — سرِ شوریدہ قربانِ در و دیوار ہوتا ہے
سُرورِ عیش سے بدمست ہو جاتا ہے دل میرا — ترا تیرِ نظر جس دم جگر کے پار ہوتا ہے
کہاں موقع مجھے ملتا ہے اظہارِ تمنا کا — کہ مدہوشی سی چھا جاتی ہے جب بیدار ہوتا ہے
نہ فکرِ چارہ خود اُس کو نہ کچھ تجھ کو پُرسش — خدا حافظ ہے اُس کا جو ترا بیمار ہوتا ہے
نہ کر اے دل تو پردہ فاش اپنی تیرہ روزی کا — مری جاں کون کس کا دہر میں غمخوار ہوتا ہے
تری شرمِ نزاکت آفریں کا اب خدا حافظ — مرے شوقِ بلا انگیز کا اصرار ہوتا ہے
شبِ مہتاب بھی ہوتی ہے وحشت کیا سرور افزا — فلک کے ہاتھ میں اک ساغرِ سرشار ہوتا ہے

رضا علی۔ وحشت

نظرے خوش گزرے

زود پشیماں کے لائق مصنف کی اجازت سے اُس کا آخری ایکٹ بھی درج الناظر کیا جاتا ہے۔ اس کی طوالت نے افسوس ہے کہ اب کی بعض دوسرے ضروری مضامین کے لیے گنجایش نہ چھوڑی۔ لیکن ایکٹ کے ٹکڑے پارچے کرنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ جن احباب کے مضامین موعودہ رہ گئے ہیں وہ معاف فرمائیں۔ انشاء اللہ اکتوبر نمبر میں تلافی کردی جائے گی۔

الناظر میں اس سے قبل بھی بہت سے مضامین 'ناظر' کے نام سے شایع ہوے ہیں اور لوگ یقیناً یہ سمجھتے ہوں گے کہ زود پشیماں بھی اُنھیں صاحب کا لکھا ہوا ہے جنھوں نے "سنہ ۱۹۱۲ء میں محمود نے کیا کہا تھا" اور دوسرے متعدد مضامین اسی نام سے لکھے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ زود پشیماں کے مصنف کو خود اس کا افسوس ہے کہ اُنھوں نے ایسا نام کیوں اختیار کیا جس سے لوگوں کو اس قسم کی غلط فہمی ہو۔ مگر اتفاق سے قبل اشاعت اُنھیں اس بات کا خیال نہ آیا۔ اور بعد کو اس معنی خیز تخلص کا مرادف وہم وزن نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً اسی کو قائم رکھنا پڑا۔ بہرحال ناظرین کرام اس بارے میں اپنی غلط فہمی رفع کرلیں۔

ہاجرہ کی کامیابی کی تیاری میں بعض اسباب کی وجہ سے دیر ہوئی۔ یعنی جولائی کے بجائے آخر اگست میں شایع ہوا۔ ابتدا میں عزیز مصنف نے ایک مختصر سا مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ایک جماعت کے اعتراضات سے متاثر ہوکر اُنھوں نے اس بات کے باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ لوگ اس کو محض ایک فسانہ کی نظر سے دیکھیں اور معتقداتِ معاشرتی کی بنا پر اس کے اچھے یا بُرے ہونے کے متعلق رائے قائم نہ کریں۔ ہمارے نزدیک ذمہ داری کو اپنے سر سے ہٹانے کی یہ کوشش چنداں محبوب نہیں۔ مصلحین و مجددینِ وقت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ جن باتوں کو

بجائے خود مسلّمہ اصول زندگی سمجھتے ہیں افسوس ہے کہ ذرا سی مخالف ہوا سے گھبرا کر وہ اُن سے مختلف صورتوں میں گریز کرنے لگتے ہیں۔

ہاجرہ کی کامیابی کا بقیہ حصہ پڑھنے کی ہمیں مہلت نہیں ملی۔ لیکن ابتدائی حصہ میں جو اصولی بحثیں چھیڑی گئی ہیں، آخری ابواب میں اُن کی اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ اس لیے کہ اس قسم کے خیالات مغرب کے مادّی اثر سے مُلک میں عام طور پر پھیلتے جاتے ہیں۔ اگرچہ حقیقتیں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور تہذیب جدید کی ابلہ فریبیاں نمایاں طور پر محسوس ہونے لگی ہیں لیکن اب بھی ایک جماعت ہے کہ وہ مال و دولت کی فراوانی، علوم و فنون کی گرم بازاری اور اہل مغرب کی بیباکانہ آزادی کے سراب کو ایشیائی تمدن و تہذیب کے لیے بمنزلہ چشمہ آبِ حیوان تصور کرتی ہے۔ بہرحال یہ بحث طویل اس مختصر میں نہیں سما سکتی۔ انشاءاللہ کسی دوسرے موقع پر اور ناول کے بقیہ اجزا کو مطالعہ کر لینے کے بعد ہم اس بارے میں پھر قلم اُٹھائیں گے اور اُن مغالطوں کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کریں گے جو ہمارے بہت سے نوجوانوں کو بے راہ کر کے مسئلۂ اصلاحِ معاشرتِ قومی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کا باعث ہو رہے ہیں۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی

کے محبوس ہونے کی خبر نے عام طور پر شاید لوگوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ تذکرۃ الشعرا کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اُن کا کاروبار بھی بند ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایسی صورت میں کہ صیغۂ اوقاف سے جو پچاس روپے ماہوار کا وظیفہ اُن کو دیا جانا تجویز تھا اُسکے لینے سے اُنھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ سیّد ہیں اور آلِ ہاشم پر صدقہ حرام ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ اُن کے احباب اور اُن کی ادبی و سیاسی خدمات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس وقت پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ دفتر تذکرۃ الشعرا کی کتابوں اور سُودیشی اسٹورس کے مال کو خرید فرماتے تاکہ اُن کے زمانۂ قید میں اُن کے متعلقین کے دلی صدمات پر جسمانی تکالیف کا اضافہ نہ ہونے پاتا۔

بعض ضعیف القلب اصحاب ڈرتے ہوں گے کہ کہیں یہ ہمدردی ارباب سیاست کی بدمزگی کا باعث نہ ہو لیکن جس منشا سے مولانا موصوف کو وظیفہ دیا جا رہا تھا اُسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اور ہمیں یقین واثق ہے کہ ان بے گناہ متعلقین کے ساتھ اظہار ہمدردی کرکے کوئی شخص مبتلائے مصیبت اور ہدف ملامت نہیں بن سکتا۔

دفتر تذکرۃ الشعراء میں حسب ذیل کتابیں بغرض فروخت موجود ہیں :-

(اردوے معلی جلد ۱۰ و ۱۱) اکتوبر ۱۹۰۹ء لغایت دسمبر ۱۹۱۰ء مجلد قیمت ۴ (اردوے معلی جلد ۱۲) جنوری لغایت دسمبر ۱۹۱۱ء مجلد قیمت عہ، (اردوے معلی جلد ۱۳) جنوری لغایت جون ۱۹۱۲ء مجلد عہ، (اردوے معلی جلد ۱۴) جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۲ء مجلد قیمت ۱۲، (اردوے معلی جلد ۱۵) جنوری لغایت جون ۱۹۱۳ء مجلد عہ، انتخاب اردوے معلی (جولائی ۱۹۱۳ء لغایت اپریل ۱۹۱۴ء کے پرچوں کا انتخاب) مجلد قیمت عہ، خطوط منشی امیر احمد (مجلد) ۴ - دیوان حسرت ناجرات ۱۲، دیوان سوز ۲ - دیوان قائم ۱۲، انتخاب دیوان جرأت ۱۰، انتخاب دیوان مائل دہلوی ۲، انتخاب دیوان میر حسن ۵، انتخاب دیوان اشرف ۵، انتخاب دیوان ہوس ۱ - انتخاب دواوین مومن، تسنیم و تسلیم ۵، انتخاب دیوان سید علی حیدر طباطبائی ۲، مجموعہ انتخابات دواوین مجلد صہ، دیوان غالب بشرح حسرت موہانی عہ، مجموعہ مثنوی (سراپا سوز - اسرار محبت - طلعۃ الشمس قیمت ۱۲ - حیات جاودانی (حیات تسلیم) ۸، گلستان ادب (مجموعہ مضامین نظم و نثر) ۱۲ - آزادی مصر پر مصطفیٰ کامل پاشا کی تقریر ۱ - وحدت وجود ۱، تنقیح العبادت ۶ - مولود مصطفوی ۴، شہادت نامہ سید الشہدا ۸، انوار العیون فی سر المکنون ۸، ملفوظات حضرت شیخ العالم مخدوم عبد الحق قدس سرہ ۸، یہ کتابیں براہ راست دفتر تذکرۃ الشعرا علی گڑھ سے یا منیجر الناظر بک ایجنسی سے مل سکتی ہیں، جنھوں نے ساحرانہ ہمدردی کی بنا پر دفتر تذکرۃ الشعرا کی کتابوں کو بلا کمیشن فروخت کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ تاجران کتب اور زیادہ تعداد کے خریداروں کے ساتھ خاص رعایت کی جائے گی۔

عہ یہ چلبلوں کتابیں سید آل حسن رضوی موہانی کی تصنیفات ہیں۔

سودیشی اسٹورس میں ہر قسم کے کپڑے - تولیے - رومال - تہمدیں وغیرہ موجود ہیں جن کی خریداری کے متعلق تمام مراسلت براہ راست سودیشی اسٹورس علی گڑھ کے پتہ پر ہونا چاہیے - مقامی اصحاب بطور

مرزا غالب کے مزار کی مرمت

کئی مرتبہ ملک کے بعض دیگر معزز اخبارات پاینیر وغیرہ اور خاص کر خود ذوالقرنین میں مرزا غالب مرحوم کی قبر کی مرمت کی آواز اٹھائی جا چکی ہے لیکن افسوس کہ اب تک اُس کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں ہوئی ہمدرد مرحوم جب دہلی میں جیتا جاگتا موجود تھا اُس وقت غالباً کچھ چندہ کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا اس کا بھی کچھ عملی نتیجہ نہ نکلا۔ اس ہفتہ روزانہ کسان لاہور نے جناب خلیق دہلوی کی ایک پُردرد نظم لکھ کر اس مسئلہ کو پھر چھیڑا ہے۔ مرزا مرحوم کا مزار جو ابھی بالکل بے نشان نہیں ہوا اور جو ایک مشہور اور مقدس درگاہ کے احاطہ کے اندر واقع ہے اُس کا مرمت ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں اور نہ اسکے لیے کسی خاص چندے اور بڑے بڑے عطیوں کی ضرورت ہے۔ تمام ہندوستان میں دلدادگان کلام غالب کی تعداد اس وقت کچھ کم نہیں ہے اگر وہ سب تھوڑا تھوڑا چندہ دیں جب بھی یہ کام آسانی سے پورا ہو سکتا ہے۔ میں اپنی طرف سے اُردو دیوان غالب کے خاص اڈیشن کی بقیہ ۳۰۰ جلدیں اس ضروری کام کے لیے اس طریقہ سے پیش کرتا ہوں کہ وہ تمام ارباب درد و احساس جو مرزا غالب جیسے اُردو ادب کے محسن کی یاد کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اجازت دیں کہ ۱۲ میں اُردو دیوان غالب کا خاص اڈیشن جو بجائے خود مرزائے مرحوم کی یادگار ہے اور جو نہایت اہتمام اور خوش سلیقگی سے عالیجناب سید راس مسعود صاحب بی اے آکسن آئی ای ایس کی تحریک سے شایع کیا گیا ہے کاغذ سفید چکنا۔ قلم جلی۔ ٹائٹل خوشنما مع مرزا کے مستند فوٹو کے۔ بذریعہ وی پی اُن کے نام نامی پر بھیج دیا جائے اور جس وقت یہ سب کتابیں فروخت ہو جائیں تو کُل روپیہ بعد وضع کمیشن و مصارف ڈاک وغیرہ حضرت خلیق دہلوی یا کسی دوسرے دوست کے جو دہلی میں مقیم ہوں سپرد کر دیا جائے کہ وہ اس تاجدار سخن کے ٹوٹے ہوئے مزار کی جس کا نظارہ اہل نظر اور اہل دل کے لیے ایک عبرتناک سین کا کام دیتا ہے مرمت کرا کے آثار سلف کی بقا و حفاظت کے فرض کفایہ کو انجام دیں۔

(خاکسار نظامی عفی عنہ ایڈیٹر ذوالقرنین بدایون)

نوٹ درخواستیں منیجر نظامی پریس بدایوں کے نام آنی چاہئیں۔ جو صاحب اس سے قبل اس کتاب کو خرید چکے ہوں وہ اپنے دوسرے دوستوں کے نام وی پی روانہ کرا کر اس کار خیر میں شرکت فرما سکتے ہیں۔

(۵) ہفت پیکر۔ یہ مثنوی سلطان علاؤالدین قسنقری کی فرمائش سے لکھی گئی[۵۱] اور ۱۴ رمضان سنہ ۵۹۳ھ کو انجام پذیر ہوئی :-

" از پسِ پانصد و نود و سہ قراں گفتم ایں نامہ را چو ناموراں
روزِ چاردہ زماہِ صیام چار ساعت ز روز رفتہ تمام "

اس مثنوی کا دوسرا نام "بہرام نامہ" ہے۔ اس لیے کہ یہ ساسانی خانداں کے بادشاہ بہرام گور† کے متعلق ہے۔ اس میں بہت سی داستانیں ہیں جو اس بادشاہ کی شجاعت، جوانمردی، اور شکار بازی کے متعلق ہیں جن میں سے اکثر سچی، پرانی حکایات و روایات یا کم از کم تاریخی واقعات پر مبنی ہیں جن کو طبری ایسے مشہور مورخ نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے، اور جو خود نظامی کا ماخذ ہے[۵۲]۔ بہ نسبت ہفت پیکر کے "بہرام نامہ" اس مثنوی کی ماہیت اور موضوع کا بخوبی پتہ دیتا ہے۔

ہفت پیکر کی ساتوں داستانوں میں نہایت دلچسپ، اور پُر لطف چوتھی حکایت روس کی شہزادی کی ہے۔ اس کا بعینہ نمونہ جوزی (Gozzy) کی "تورانڈوٹ" (Turandot) ہے جس کو بعد میں شلر صاحب (Schiller) نے جرمن اسٹیج کے لیے منتقل کی تھی[۵۳]

---

۵۱ ڈاکٹر باخرنے ملک نصرۃ الدین کا نام لکھا ہے۔ اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں نورالدین ارسلان بن عزالدین مسعود زنگی والئ موصل مرقوم ہے، لیکن اس مثنوی میں سوائے علاؤالدین کے کسی کا نام مذکور نہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی کے نام پر لکھی گئی۔

۵۲ چنانچہ ہفت پیکر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

" باز جستم ز نامہائے نہاں کہ پراگندہ بود گردِ جہاں
زاں سخنہا کہ تازی است و دری در سوادِ بخاری و طبری "

۵۳ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا صفحہ ۸۲۳ جلد ۱۱ — † بہرام گور ۴۲۰ء میں اپنے باپ یزدگرد کی وفات پر تخت نشیں ہوا اور ۴۳۸ء میں فوت ہوا

(۵) **سکندرنامہ** - نظامی کی آخری تصنیف جس میں انھوں نے فردوسی کا
مقابلہ کیا ہے، سکندرنامہ ہے۔ شاہنامہ کے بعد کوئی رزمیہ داستان ایسی نہیں تھی جو
کے شجاعانہ جذبات کو زندہ رکھتی۔ اس لیے دوسرے شاہنامہ کی ضرورت ہوئی، چنا
وہ سکندرنامہ کے قالب میں نمودار ہوا" نظامی نے سکندر ایسے مشہور کشورستاں کی دا
اختیار کی جس کو یورپ اور ایشیا دونوں مانتے تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے انھوں نے
ذوالقرنین کو سکندر بنادیا جو صریحًا قرآن مجید کے خلاف ہے۔

قزل ارسلاں کی وفات کے بعد اُس کا بھتیجا ابوبکر نصرۃ الدین بن محمد تخت نشی
ہوا۔ چونکہ نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا اس لیے یہ مثنوی انھوں نے ا
خواہش سے لکھ کر نصرۃ الدین کے نام پر معنون کی[1]۔ لیکن مندرجہ ذیل اشعار سے ظا
ہوتا ہے کہ اور مثنویوں کی طرح یہ بھی بادشاہ کی فرمایش سے لکھی گئی:-

"چو فرماں چنیں آمد از شہریار — کہ برنام من نقشبند ایں نگار
بگفتار شہ مغز را تر کنم — بگفتِ کساں مغز در سر کنم
فرستم عروسے بآں رز مگاہ — کزو چشم روشن شود بزم شاہ"

سکندرنامہ کے دو حصے ہیں[2]۔ (۱) شرف نامہ۔ (۲) اقبال نامہ (یا) خردنامہ
ہندوستان میں وہ سکندرنامۂ بری و بحری کے نام سے موسوم ہیں۔ سکندرنامہ بری میں

[1] شعرالعجم حصہ اول

[2] خان آرزو نے اپنی شرح [illegible] سکندرنامہ میں لکھا ہے :- "نظامی کے اس شعر،

"سہ دریا ختم ہر دُرے کانِ گنج — جدا گانہ بر ہر درے بردہ رنج"

سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندرنامہ تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، ایک بری دوسرا بحری
تیسرے کا پتہ نہیں۔ لیکن ظن غالب ہے کہ وہ زیادہ مروج نہیں رہا جس میں شاید سکندر
پیغمبری کا حال بیان کیا ہوگا۔"

ستانی ہے، اور سکندر نامہ بحری میں پیغمبری کے واقعات اور فلسفیانہ بحثیں ہیں۔ ان میں سے حصہ اول ۲۴ محرم ۵۹۷ھ مطابق اکتوبر ۱۲۰۰ء میں، اور حصہ دوم ۵۹۹ھ میں اتمام کو پہونچا۔

(۱) "نوشتم من این نامہ را در جہاں | کہ تا دور آخر بود جاوداں
بتاریخ پانصد، نود ہفت سال | چہارم محرم بوقت زوال"

(۲) × × × × × × × ×

"بپایاں شد این داستان دری | بفیروز فالی و نیک اختری
ز ہجرت چناں بردہم یادگار | نود نہ گذشتہ ز پانصد شمار"

اس کے صلہ میں مقررہ رقم (ایک ہزار نقد) کے علاوہ سواری کا گھوڑا، اور بیش قیمت خلعت بادشاہ کی طرف سے عطا ہوئی[1]

سکندرنامہ کا تاریخی مواد — نظامی نے سکندرنامہ میں جو کچھ شاعرانہ رنگ آمیزیاں کی ہیں اس سے اصل واقعات کی صحت میں بہت کچھ نقص پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس لیے تاریخی حیثیت سے ہماری نظر میں سکندرنامہ کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ خود نظامی بھی اس کے قائل ہیں:۔

دگر راست خواہی سخنہاے راست | نشاید در آرایش نظم خواست
گر آرایش نظم زو کم کنم | بکم مایہ بیتش فراہم کنم
ہمہ کردہ شاہ گیتی خرام | دریں یک ورق کا غذ آرم تمام

یعنی اگر سچ پوچھو تو نظم کی آرایش میں سچی باتیں نہیں آسکتیں اس لیے کہ نظم کی بنیاد مبالغہ، اور دوراز کار واقعات پر مبنی ہے، تو اگر میں آرایش نظم کو چھوڑ کر صرف اہم اور ضروری باتیں لکھنے پر اکتفا کروں تو سکندر کے تمام حالات اس کے ایک ورق میں ختم ہو جائیں۔

سکندرنامہ کے تاریخی ماخذ کی نسبت خود نظامی کا بیان ہے کہ انھوں نے سکندر کے تمام

---

[1] سکندرنامۂ بحری کے خاتمہ میں یہ سب مفصلاً مرقوم ہے۔

واقعات کسی تاریخ میں یکجا لکھے ہوے نہ پائے۔ تمام تواریخ قدیم وجدید جن میں سے اکثر لاطینی، یونانی، اور پہلوی زبانوں میں تھیں اُنھوں نے اُن سب کو یکجا کیا، اور تحقیق وتدقیق سے اس کے صحیح حالات دریافت کرکے اُن سے اپنی نظم کو آراستہ کیا۔

"چو می کردم ایں داستاں را بسیج — سخن راست روبود و رہ پیچ پیچ
اثرہاے آں شاہ آفاق گرد — ندیدم نگارندہ دریک نورد
سخنہا کہ چوں گنج آگندہ بود — ہر نسخہ در پراگندہ بود
زہر نسخہ بر داشتم مایہا — بروبستم از نظم پیرایہا
زیادت زتاریخہاے نوی — یہودی، و نصرانی و پہلوی"

لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہو کہ سکندر کے واقعات شاہنامہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور غالباً نظامی نے اُن واقعات کو، جن کو فردوسی نے چھوڑ دیے ہیں، مزید اضافہ کرکے سکندرنامہ کی ترتیب کی ہو۔ ان کے مندرجۂ ذیل اشعار سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہو:۔

"سخن گوے پیشینہ دانائے طوس — کہ آراست روے سخن چوں عروس
دراں نامہ کاں گوہر سفتہ راند — بسے گفتنیہا کہ ناگفتہ ماند
دگر ہرچہ گفتندے از باستاں — بگفتن دراز آمدے داستاں
نگفت آنچہ رغبت پذیرش نبود — ہماں گفت کز وے گزیرش نبود
دگر از پے دوستاں زلہ کرد — کہ حلوا بہ تنہا نبایست خورد
نظامی کہ در رشتہ گوہر کشید — قلم دیدہا را قلم در کشید
بنا سفتہ دُرہاے کز گنج یافت — ترازوے خود را سخن سنج یافت
شرف نامہ را فرخ آوازہ کرد — حدیث کہن را بد و تازہ کرد"

اگرچہ ظاہر میں سکندرنامہ شاہنامہ کا توڑ نظر آتا ہو، مگر دونوں کے انداز کلام میں بہت فرق ہو۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ فردوسی کی بے تکلفی اور سادہ گوئی نے تشبیہوں اور استعاروں

یں جو چیزیں آس پاس نظر آتی تھیں وہ سب خرچ کر دیں، نظامی نے جب انھیں مستعمل دیکھا تو ان پر نقاشی کر کے کام میں لائے۔ فردوسی کے کلام میں استعارہ اس قدر کم تھا کہ گویا نہ تھا، نظامی نے تشبیہ کو استعارہ اور استعارہ در استعارہ کر دیا۔ اس سے مضمون رنگین ہو گیا مگر بجائے صفائی کے باریکی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی اصلیت گم ہو گئی۔[1]

صاحب آتشکدہ کی رائے ہے کہ نظامی کے بعد ایسی مثنویاں کسی نے نہیں لکھیں۔ ان مثنویوں کی قبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متوسطین، اور متاخرین میں سے اکثر شعراء نے ان مثنویوں کی طرز پر مثنویاں لکھنے کو اپنا فخر سمجھا۔ خمسۂ نظامی کے تتبع میں مثنویاں لکھنے والوں کی تعداد اتنی ہے کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ یہاں ہم غیر معروف شاعروں کو چھوڑ کر صرف چند مشہور شعرا کے نام مع ان کی مثنویوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں:-

نظامی:- مخزن اسرار - خسرو شیریں - لیلیٰ و مجنوں - ہفت پیکر - سکندر نامہ

امیر خسرو:- مطلع الانوار - شیریں و خسرو - لیلیٰ و مجنوں - ہشت بہشت - آئین سکندری

خواجوی کرمانی:- روضۃ الانوار - گل و نوروز - - - ہمای و ہمایوں۔

جامی:- تحفۃ الاحرار - یوسف و زلیخا - لیلیٰ و مجنوں - سلسلۃ الذہب - خرد نامۂ اسکندری

ہاتفی:- ... - خسرو شیریں - لیلیٰ و مجنوں - ہفت منظر - تیمور نامہ

نوائی:- حیرۃ الابرار - فرہاد و شیریں - لیلیٰ و مجنوں - سبعۂ سیارہ - اسکندر نامہ

فیضی:- مرکز ادوار - نل دمن - سلیمان و بلقیس (ناتمام) ہفت کشور (ناتمام) اکبر نامہ (ناتمام)

فارسی کے علاوہ ترکی، چغتائی، اور ہندوستانی زبانوں میں اس کے تتبع میں بہت سی مثنویاں لکھی گئی ہیں[2] - جن کے نام بھی آج کوئی نہیں جانتا۔ لیکن آج تک کوئی نظامی کی برابری

[1] سخندان فارس مصنفہ شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی صفحہ ۲۲۸

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

نہ کرسکا، اور "الفضل للمتقدم" کا سہرا نظامی ہی کے سر رہا۔ مسٹر اد تبغات لکھتے ہیں کہ مولانا جامی کا "ہفت اورنگ" "خمسۂ نظامی" کے برابر تسلیم کیا گیا ہو۔ لیکن خود مولانا جامی کی یہ دلی آرزو تھی کہ میں نظامی کا ہم پایہ ہو جاؤں چنانچہ فرماتے ہیں :-

"اہل دل از فکر چو محفل نہند   بادۂ را از قدح دل نہند
رشحۂ از آں بادہ بجامی رساں   رونق نطقش بہ نظامی رساں"[1]

مولانا جامی فرماتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا[2] لیکن خسرو کی مثنویات کی نسبت عبید یہ رائے ظاہر کرتا ہے :-

"غلط افتاد خسرو را ز خامی   کہ سکبا پخت در دیگ نظامی"

خود امیر خسرو بھی لیلیٰ مجنوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں :-

"می داد چو نظم نامہ را پیچ   باقی نگذاشت بہر ما ہیچ"

بقول بعض مصنفین خسرو اور جامی کو نظامی کی ابیات و مضامین میں اکثر جگہ توارد ہوا ہے[3]۔

نظامی	خسرو
اے صفت بندہ نوازندگی	دو کار است با فروفرخندگی
از تو خدائی و ز ما بندگی	خداوندی از تو ز ما بندگی
× × × × ×	× × × × ×

نظامی	جامی
خداوندا در توفیق بکشاے	الٰہی غنچۂ امید بکشاے
نظامی را رہ توفیق بنماے	گلے از روضۂ جاوید بنماے
. . . .	. . . .
چو ابراہیم با بت عشق می باز	خلیل آسا در ملک یقیں زن
ولے بتخانہ را از خود مپرداز	نوائے لا احب الآفلیں زن

---

[1] حیات جامی از مولانا اسلم صفحہ [2] بہارستان جامی صفحہ ۹۲ [3] مطلع العلوم صفحہ ۵۳-۱۵۲

جامی	نظامی
خوشا وقتے و خرم روزگارے	چہ خوشتر زاں کہ بعد از انتظارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے	بامیدے رسد امیدوارے
. . . .	. . . .
ز غمزہ تیر و از ابرو کمان کن	ز غمزہ تیر و از ابرو کماں ساز
شکار آں نگار دلستاں کن	ہمہ باریک بین و راست انداز
. . . .	. . . .
مرا اے کاشکے مادر نمی زاد	مرا اے کاشکے مادر نزادے
وگر می زاد کس شیرم نمی داد	وگر زادے بخوردِ سگ بدادے
. . . .	. . . .
زن از پہلوے چپ شد آفریدہ	زن از پہلوے چپ گویند برخاست
کس از چپ راستی ہرگز ندیدہ	نیاید ہرگز از چپ راستی راست

گو ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہی کہ دونوں نے نظامی کے کلام کا نظر غائر مطالعہ کیا ہی کیونکہ جو کلام کبھی نظر سے نہ گزرا ہو اُس میں توارد ہونا محال ہی، اور احیاناً اگر ہو بھی گیا ہو تو معیوب نہ سمجھا جائے گا بلکہ یہ بھی اُس کی بلندی طبع اور رسائی فکر پر دلالت کرتا ہے۔

یورپ کی زبانوں میں نظامی کی مثنویات کے ترجمے

اہل یورپ نے نظامی کے کلام کے جو حصے شایع اور ترجمہ کیے اُس کا مختصر حال یہ ہے:۔

مخزن اسرار، جی۔ ایچ۔ ہنڈلی صاحب (G. H. Hindley) نے انگریزی میں ترجمہ کیا جس کا قلمی سودہ عجائب خانۂ لنڈن میں محفوظ ہے۔

" متن مرتبۂ نیتھنیل بلینڈ صاحب (Nathaniel Bland) بمقام

لندن ۱۸۴۴ء

لیلیٰ و مجنوں، جیمس اٹکنسن صاحب (James Atkinson) کا ترجمہ در زبانِ انگریزی، لندن ۱۸۳۶ء

ہفت پیکر، سات حکایتوں میں سے ایک حکایت مع ترجمہ در زبانِ جرمن، ایف - ارڈمین صاحب F. Erdmann نے شایع کیا بمقام کاسان (Kasan) ۱۸۴۴ء

سکندر نامۂ برّی، کپتان، ایچ، ولبر فورس کلارک صاحب (Capt. H. Wilberforce Clarke) نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لندن ۱۸۸۱ء

" ایف - ارڈمین صاحب (F. Erdmann) کا انتخاب بزبان جرمن بمقام کاسان (Kasan) ۱۸۲۸ء

" خرموے صاحب (Chormoy) کا انتخاب در زبانِ روسی بمقام سینٹ پٹرزبرگ (St. Petersburg) ۱۸۲۹ء

" اسپیگل صاحب (Spiegel) کا انتخاب بزبان جرمن بمقام لیپزگ (Leipzig)

سکندر نامۂ بحری، ڈاکٹر ایتھ (Dr. Ethé) کا انتخاب در زبانِ جرمن ۱۸۷۱ء

" متن مرتبۂ ڈاکٹر اسپرنگر Dr. Sprenger کلکتہ ۱۸۵۲ء و ۱۸۶۹ء۔

کلام | مثنویاتِ خمسہ کے علاوہ نظامی کا اور بھی کلام ہے، چنانچہ دولت شاہ نے ان کی ایک غزل جس میں ان کا تخلص بھی موجود ہے، نقل کی ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے قصائد، غزلیات، موشحات، اور صنائع کے بیس ہزار شعر ہیں، عوفی کا بیان ہے کہ "بجز ان چند مثنویوں کے نظامی نے کچھ نہیں لکھا۔ نیشاپور میں میں نے ایک فاضل شخص کی زبانی ایک غزل سنی[1] اسکے

---

[1] لباب الالباب جلد ۲ صفحہ ۳۹۷ مطبوعۂ یورپ۔

مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو

بابت جون و جولائی سنہ ۱۹۱۶ء

۱ - ماہ جون سنہ ۱۶ء میں حسب ذیل حضرات کی جانب سے چندہ کی رقم وصول ہوئی -

رقم چندہ یا عطیہ

(۱) مولوی ظہور الحسن صاحب کسٹم کلکٹر محبوب نگر عہ، حالی
(۲) جناب نگا ریڈی صاحب تحصیلدار پرکال عہ، ،،
(۳) مولوی محمد مہدی صاحب از بھوپال عــے، کلدار
(۴) مسٹر ڈی - بی کالسٹ مہتمم تعلیمات ضلع پربھنی للعہ، حالی
(۵) مولوی میر عباس علی صاحب ناظر مدارس ضلع پربھنی نے ،،
(۶) جناب وارث دیا بھائی ملجی سوداگر احمد نگر مار کلدار عطیہ
(۷) مولوی عبد الوحید صاحب ایم - اے از اجمیر عہ، ،،
(۸) مولوی سیٹھ یعقوب حسن صاحب مدراس عمار ،،
(۹) مولوی محمد ظفر عمر صاحب بی اے از کھیری عمار ،،
(۱۰) میاں تکلین محمد خاں صاحب از بھوپال عہ، ،،
(۱۱) مولوی عبد الرشید صاحب میرزادہ و گماشتہ ملندیانی عہ، ،،
(۱۲) قاضی فیاض حسین صاحب وکیل از بھوپال عہ، ،،
(۱۳) میاں محمد قاسم صاحب جاگیردار از بھوپال عہ، ،،
(۱۴) مولوی عبد الرزاق صاحب تحصیلدار دیوان گنج ،، عہ، ،،
(۱۵) نواب غلام احمد خاں صاحب کلامی کارمنڈل کوسٹ کلکٹوریٹ کلدار
(۱۶) مسٹر وارب جی صاحب بابو جی چنائی مددگار معتمد مالگذاری عہ حالی
(۱۷) مولوی جان عالم اسسٹنٹ انجنیر بیدر عہ ،،
(۱۸) مولوی شرف الدین وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد عہ ،،
(۱۹) مولوی سردار علی خاں صاحب دوم تعلقدار رائچور عہ ،،
(۲۰) مولوی تفضل حسین صاحب مہتمم سررشتہ نظامت تعلیمات عہ، ،،
(۲۱) مولوی حبیب اللہ صاحب ڈپٹی ناظم عدالت بیڑ عہ ،،
(۲۲) مولوی جمیل احمد صاحب ڈسٹرکٹ انجنیر عثمان آباد عہ ،،
(۲۳) مولوی احمد خاں صاحب ہیڈ کوارٹر انسپکٹر نلگنڈہ عہ ،،
(۲۴) نواب فخر جنگ بہادر دوم تعلقدار محبوب نگر عہ، ،،
(۲۵) مولوی سید زین الدین صاحب انجنیر شاخ آبپاشی محبوب نگر عہ، ،،
(۲۶) مولوی سید اللہ خاں صاحب بی اے جسٹس انجمن ضلع ؟ عہ، ،،
(۲۷) پروفیسر قاضی حسین علی خاں صاحب ایم اے سول انجنیرنگ کالج عہ ،،
(۲۸) مولوی نذیر محمد صاحب ڈرائینگ ماسٹر نظام آباد عہ، ،،

(۲۹) مولوی مصطفیٰ علی صاحب وکیل جالنہ عہ حالی

(۳۰) مولوی شاہ پیراں صاحب بی اے مہتمم محبس نظام آباد عہ ،،

(۳۱) مولوی مرزا منظور احمد خاں صاحب جنرل انسپکٹر پائیگاہ عہ ،،

(۳۲) مولوی خیر الدین احمد صاحب اسسٹنٹ انجینیر گنڈھی پیٹھ عہ ،،

(۳۳) مولوی غلام اکبر خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد عہ حالی

(۳۴) جناب نگا ریڈی صاحب تحصیل پرکال عہ ،،

(۳۵) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب سونی پت عہ کلدار

(۳۶) مولوی فخر الدین احمد خاں صاحب مددگار مال نلگنڈہ عہ حالی

کلدار ماللعہ حالی ءسہ میزان ماسہ

۲ - ماہ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء میں حسب تفصیل ذیل حضرات نے چندہ انجمن ترقی اردو کو روانہ فرما کر مشکور فرمایا ہے

(۱) مولوی منشی منہاج الدین صاحب انجینیر مظفرگڑھ عہ کلدار

(۲) مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال عہ ،،

(۳) مولوی نور المنیب اللہ صاحب منصف لاسور عہ حالی

(۴) مولوی مرزا غلام محمود بیگ صاحب مددگار صوبہ گلبرگہ عہ ،،

(۵) مولوی مرزا مقصود احمد صاحب کورٹ انسپکٹر پولیس نلگنڈہ عہ ،،

(۶) مولوی سیٹھ یعقوب حسن صاحب مدراس عہ کلدار

(۷) مولوی سلطان حید صاحب جوش نائب تحصیلدار ہیردونی عہ ،،

(۸) مولوی قاضی فیاض حسن صاحب وکیل بیرون دروازہ بھوپال عہ ،،

(۹) نواب غلام احمد صاحب کلامی کار وپنڈل کوسٹ بنگلور عہ ،،

(۱۰) مولوی مسٹر عبد الوحید صاحب ایم اے پیرزادہ گاہ اجمیر عہ ،،

(۱۱) مولوی سید افتخار حسین صاحب مہتمم ٹیلیفون کنندہ گوشہ محل حیدرآباد عہ حالی

(۱۲) مولوی مرزا منظور احمد خاں صاحب جنرل انسپکٹر پائیگاہ عہ ،،

(۱۳) مولوی نذیر محمد صاحب ڈرائنگ ماسٹر نظام آباد عہ ،،

(۱۴) مولوی غلام اکبر خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد عہ ،،

(۱۵) مولوی شرف الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد عہ حالی

(۱۶) مولوی محمد تقی حسن صاحب مہتمم تعلقدار صرف خاص حیدرآباد عہ ،،

(۱۷) مولوی سید اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی رجسٹرار عہ ،،

(۱۸) مولوی مصطفیٰ علی صاحب وکیل جالنہ عہ ،،

(۱۹) مولوی شاہ پیراں صاحب بی اے مہتمم صدر محبس نظام آباد عہ ،،

(۲۰) مولوی عبد الرشید صاحب پیرزادہ درگاہ پاک پتن عہ ،،

(۲۱) مولوی محفوظ علی صاحب بی اے بدایوں عہ کلدار

(۲۲) مولوی محمد ابراہیم صاحب بی اے انبا ڑی مدراس عہ ،،

(۲۳) مولوی عبد القادر صاحب سابق صوبہ دار صوبہ گلبرگہ عہ حالی

(۲۴) مولوی جمیل احمد صاحب مہتمم تعمیرات عثمان آباد عہ ،،

(۲۵) پروفیسر قادر حسین صاحب ایم اے سول سروس کالج خیرت آباد عہ

(۲۶) مولوی احمد خاں صاحب نائب کوتوال نلگنڈہ عہ ،،

(۲۷) مسٹر داراب جی نوروجی جیتانی مددگار معتمد مالگزاری حیدرآباد عہ ،،

(۲۸) مولوی فخر الدین علی خاں صاحب مددگار مال نلگنڈہ عہ ،،

(۲۹) جناب ینگا ریڈی صاحب تحصیلدار پرکال عہ حالی

(۳۰) مولوی تفضل حسین صاحب مترجم صدر دفتر نظامت تعلیمات عہ "

(۳۱) مولوی جان عالم صاحب اسسٹنٹ انجنیر بیدر عہ "

(۳۲) مولوی سید زین الدین صاحب انجنیر شاخ آبپاشی میدک عہ "

(۳۳) مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال عہ کلدار

(۳۴) مولوی مقصود احمد خاں صاحب نصاب ہیڈ کوارٹر انسپکٹر کوتوالی عہ حالی

(۳۵) مولوی علاء الدین حسن صاحب ناظم عدالت ضلع عادل آباد عہ "

(۳۶) مولوی احمد الدین صاحب جسٹرار جتور ضلع پربھنی عہ "

میزان .... للعہ

سکہ کلدار	حالی
لہ عہ	للعہ

۳۔ پلوٹارکس لائیوز کی پہلی جلد چھپ چکی ہے۔ اور ایک ہفتہ کے بعد شایع ہو جائے گی۔

۴۔ انجمن نے دارالعلوم حیدرآباد کے نصاب تعلیم کے لیے ایک کتاب سائنس (طبیعیات) میں تیار کرائی ہے، جو زیر غور ہے۔

۵۔ اُردو کا قاعدہ اور اُس کی کلید جس میں قاعدہ کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ہدایات درج ہیں چھپ چکے ہیں اور عنقریب شایع کیے جائیں گے۔

۶۔ مسٹر عبد الماجد صاحب بی۔ اے تاریخ اخلاقِ یورپ کا ترجمہ ختم کر چکے ہیں۔

۷۔ انجمن کی ایک شاخ جالنہ ضلع اورنگ آباد (حیدرآباد دکن) میں مولوی مصطفےٰ علی صاحب و دیگر حضرات کی سعی و توجہ سے قائم کی گئی ہے۔

۸۔ منشی دیبی پرشاد بشاش (جودھ پور) نے اپنے جواں مرگ فرزند تیمبر پرشاد اختر کا دیوان اور اُن کا دوسرا کلام انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے کو عنایت فرمایا۔

عبد الحق

آنریری سکرٹری

جدید مطبوعات

انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ بابت ۱۹۱۵ء میں جن کتابوں کے زیر طبع ہونے کا اعلان کیا گیا تھا اُن میں سے کتب ذیل اسی ماہ ستمبر میں شایع ہو جائیں گی۔

دریائے لطافت

سید انشاء اللہ خاں انشا اور مرزا قتیل جن کی متحدہ افکار سے دریائے لطافت لکھی گئی تھی کسی تعارف و تعریف کے محتاج نہیں۔ یہ کتاب پہلے مطبع آفتاب عالمتاب مرشدآباد میں سیسے کے حروف میں چھپی تھی اور اب تقریباً نایاب ہو گئی تھی۔ مولوی عبد الحق صاحب آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی کوششوں سے اب دوبارہ نظر افروز ہوتی ہے۔ اور مولوی صاحب ممدوح نے یہی نہیں کیا کہ کتاب کے متعدد نسخوں سے ایک صحیح نسخہ مرتب کر کے شایع فرمایا بلکہ اُس کے بعض غیر ضروری حصص کو حذف کرنے اور موقع موقع پر حالات موجودہ کے مناسب ترمیم کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے، جسے امید ہے کہ اربابِ ذوق بہت پسند کریں گے۔ ابتدا میں ایک مختصر مگر دلچسپ مقدمہ بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ غرضکہ اب یہ کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ ادبی اور شاعرانہ معلومات حاصل کرنے اور زبان کے متعلق بہت سی کارآمد بحثوں کا تصفیہ کرنے میں سب اہلِ زبان اور اہل زبان حضرات اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ حجم ۵۰۰ صفحے قیمت عہ مجلد عہ

مشاہیر یونان و روما

یعنی حکیم پلوٹارک یونانی کی شہرۂ آفاق کتاب بیرے لالوز کا اُردو ترجمہ (حصہ اول) جس میں یونان و روما کے اولو العزم مدبرین کے سوانحی حالات اور اُنکے بیش بہا خیالات درج کر کے ازراہ تبصرہ ایک دوسرے کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ یورپ میں یہ کتاب اس درجہ عظمت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے کہ بڑے بڑے فلسفی، شاعر اور مدبرین سلطنت کو اس سے استفادہ کرنے پر ناز ہے اور اسکی ادبی خوبیوں کا اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ ملک الشعرا شیکسپیر اسی خوان کا زلہ ربا کہا جاتا ہے۔ کتاب کے شروع میں لایق مترجم سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے ایک مبسوط تاریخی مقدمہ اضافہ کیا ہے جس کے مطالعہ سے یونان و روما کی تاریخ کا وسیع میدان پیش نظر ہو جائیگا۔ حجم ۵۷۰ صفحے مع نقشہ جات رنگین قیمت عہ مجلد عہ

المشتہر مہتمم دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو۔ کٹرہ سید حسین خاں۔ چوک لکھنو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۵ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء

خود۔ڈاکٹر بن جائے

نمبر ۱۱۴

اگر آپ خود ڈاکٹر بنکر اپنے اور اپنے عزیزون کو وبائی امراض کے زمانہ مین محفوظ رکھنا چاہتے ہین یا اپنے غریب پڑوسیون کو اونکے نازک وقت مین امداد کرکے حق انسانیت سے ادا ہونا چاہتے ہین تو اوسکا ایک نہایت عمدہ طریقہ ہے۔جس مین نہ زیادہ دولت کی ضرورت ہے اور نہ وقت کی اور وہ یہ ہے کہ کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کے مشہور آزمایشی بکس کو خرید لیجئے۔

اس مین جملہ ایسی مفید اور مجرب مفصل ذیل دوائین ہین جو آپ کو ہر وقت اور ہر موقع پر کام دینگی۔

تفصیل ادویات

عرق کافور۔ہیضہ وگرمی کے دست کی ایک ہی دوا ہے۔دمہ کی دوا فوراً دم کو دبا دیتی ہے۔کولاٹانک ہر ایک کے لئے طاقت بڑہانے کی دوا۔مقوی باہ کی گولیان۔جیسا نام ویسا فائدہ۔جلاب کی گولیان آسانی سے پیٹ صاف کرتی ہے۔عرق پودینہ سبز۔دردشکم ڈباحی درد کی دوا قیمت فی بکس ایک روپیہ اٹھ آنہ محصول ڈاک چار آنہ-۱۲ ؍

ادویات ہر جگہ دوکان دارون اور دوا فروشون سے مل سکتی ہین۔ورنہ کارخانہ سے طلب کیجئے۔

قوت کی گولیان

اس ۲۰ برس سے تمام ہندوستان مین مشہور ہو رہی ہین طاقت دینے والی مشہور دوائین فاسفورس شکینا ڈامیانا ملاکر یہ گولیان بنی ہین اسلئے معزز پٹرہ۔رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعوی رکھتی ہین زیادہ محنت جوانی کی خرابی دبلے اعتدالیون کے استعمال سے اول ہی روز مین فائدہ نظر آتا ہے۔بدنمین قوت اور مزاج مین گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔چہرہ پر رونق اور جوانی مین ضعیفی کی سی حالت ٹوٹے ہوئے جسم مین دوبارہ جوش لاتی ہے قیمت ۳۰۔گولیون کی شیشی دو ہفتہ کی خوراک کا ایک روپیہ محصول ڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵ ؍

دیکھئے جناب ایڈیٹر صاحب مجزدکن کیا تحریر فرماتے ہین ہمنے ڈاکٹر صاحب کی تعریف پر خیال کرکے تیس گولیان منگائین اس کے تیر بہدف اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہین تو ان گولیون قیمت بجائے ایک روپیہ کے ۱۰ روپیہ رکھنی چاہئے تھی۔

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸ جلد ۱۵ — یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء

ماشی

(مترجمہ مولوی نور الرحمن صاحب بھرایونی)

ذیل کا قصہ سر رابندرناتھ ٹیگور کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں مسٹر پیرسن نے کیا اور اس انگریزی ترجمہ کو میں نے اردو میں لانے کی کوشش کی ہے۔ انگریزی زبان میں اس قسم کے بہت سے قصے میری نظر سے گزرے ہیں اور میں نے ان کو دلچسپی سے پڑھا ہے مگر ہندوستان کے اس ادیب شاعر نے جو تصویریں اپنے خیالات کی کاغذ پر کھینچی ہیں ان سے زیادہ دلچسپ، موثر اور حسین نقش دوسرے خاکوں میں نظر نہیں آتے۔ تیمارداری کی لیاقت، جذبات محبت کا ہیجان، مسئلہ موت و حیات پر فلسفیانہ خیالات اور پھر شاعرانہ تخیل اس قصہ کی خصوصیات ہیں۔ اگر اس عبارت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تو میں سمجھوں گا کہ ٹیگور کا جادو کام کر رہا ہے۔ کیونکہ ترجمہ ہرگز قابل تعریف نہیں ہے۔

نور الرحمن۔

ماشی*

"ماشی"

---

* ماشی [illegible]

"جوتن، سو رہو۔ رات جا رہی ہے۔"

"خیر! جانے دو، میں بھی اب کچھ دن کا مہمان ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ مونی اپنے باپ کے پاس ہو آئے ——— مگر وہ اب کہاں ہوں گے؟"

"سیتارام پور۔"

"ہاں! سیتارام پور۔ پھر اُس کو بھیج دو۔ اُس کو بیمار کے پاس زیادہ نہیں رہنا چاہیے۔ وہ خود بھی تو ضعیف ہے۔"

"اے لڑکے کی باتیں تو سنو! ایسے میں وہ تمھیں چھوڑ کر کیونکر چلی جائے؟"

"کیا اُسے نہیں معلوم کہ ڈاکٹروں نے کیا ———؟"

"یہ تو اُسے بھی نظر آتا ہے، اُس روز باپ کے گھر جانے کی اُس کے کان میں بھنک پڑ گئی تھی کہ بس اُس نے روتے روتے اپنی آنکھیں لال کر لیں۔"

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس گفتگو کے اعادہ میں ماشی نے اگر غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو اصل واقعہ کے معنی بالکل ہی غلط بنائے ہیں۔ ذیل میں مونی کی اصل گفتگو درج کی جاتی ہے۔

"بہو! کیا تمھارے باپ نے کچھ کہلا بھیجا ہے۔ اَننت کو میں نے کل یہاں دیکھا تھا۔"

"ہاں، اگلے جمعہ کو میری ننھی بہن کا اَنپر اشن* ہے۔ میرا قصد ہے کہ ———"

"بہت اچھا، بیٹی اُس کے لیے ایک سونے کی مالا بھیج دو۔ تمھاری ماں خوش ہو جائینگی۔"

"میں خود ہی جانے کا ارادہ کر رہی ہوں، جی بہت چاہتا ہے اور میں نے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا بھی نہیں۔"

"جو کچھ بھی تم کرو، مگر ایسی حالت میں تو جوتن کو چھوڑ کر تم نہ جاؤگی، تم نے تو سُنا تھا کہ ڈاکٹروں نے کیا کہہ دیا ہے؟"

"مگر اُس نے کہا تھا کہ فی الحال کوئی خاص وجہ ———"

* بچہ کو پہلی مرتبہ جب غذا (چاول) دی جاتی ہے اُسی وقت عموماً اُس کا نام رکھا جاتا ہے اصطلاحاً ہم کا نام اَنپر اشن ہے۔

"اگرچہ کہا بھی تو کیا ہوا! تم خود تو اُسکی حالت دیکھو!"

"میں سن رہی ہوں کہ تقریب بہت بڑی ہوگی۔ ویسے بھی تین بھائیوں کے بعد ایک یہی لڑکی ہے۔ اگر میں نہ گئی تو ضرور اماں کو ——"

"ہاں، ٹھیک ہے۔ میں تمھاری اماں سے تو پورے طور پر واقف نہیں، لیکن یہ جانتی ہوں کہ اگر تمھارے والد کو معلوم ہوا کہ تم جو تن کو کس حالت میں چھوڑ کر آئی ہو تو وہ ضرور ناخوش ہوں گے۔"

"آپ ایک دو سطریں اس مضمون کی لکھ بھیجیے گا کہ کوئی خاص تردد کی بات نہیں ہے اور اگر میں جاؤں بھی تو کوئی خاص —— کاموں میں فرق نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو، اگر تم چلی بھی جاؤ تو کوئی خاص نقصان نہ ہوگا۔ لیکن اگر میں تمھارے والد کو لکھوں گی تو جو کچھ میرا خیال ہے میں صاف لکھ دوں گی۔"

"تو آپ تکلیف نہ کیجیے! میں اُن سے کہوں گی اور وہ یقینی ——"

"لڑکی! میں بہت برداشت کر چکی! لیکن اگر تم نے ایسا کیا تو میں چپ نہ رہوں گی، تمھارے والد تم سے خوب واقف ہیں، اس لیے تم اُن کو دھوکا نہیں دے سکتیں!"

ناشی اُدھر گئی اور موتی اپنے پلنگ پر غصہ میں لیٹ رہی۔ اُس کی ہمسایہ بیٹیلی آئی، اور پوچھنے لگی کہ کیا بات ہے؟

"دیکھو تو! اللہ کیسی شرم کی بات ہے! میرے ایک ہی بہن، اور اس کی اپریشن میں مجھے جانے نہیں دیتے!"

"بی بی! کیا تم "اُن" کو ایسی حالت میں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو؟"

"میں اُن کو کیا آرام پہونچا رہی ہوں؟ اور پہونچانا چاہوں بھی تو کیا کروں؟ یہ گھری کچھ ایسا بھیانک ہے، بس میرا تو جی اُکھڑ گیا۔"

"تم بھی عجیب قسم کی عورت ہو!"

"ہاں! اگر مجھے تم لوگوں کی طرح دھوکا اور فریب تو آتا نہیں، کہ لوگوں کے ڈر سے سوگ منانے منھ بنا کر بیٹھ جاؤں۔"

"کیسی خود مختار عورت ہے!"

(۲)

یہ سن کر کہ مانی اپنے باپ کے گھر جانے کا ذکر سنتے ہی رونے لگی اُس کو اس درجہ مسرت ہوئی کہ وہ اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تکیوں کو اپنی طرف سرکا کر پھر اُن سے سہارا لگا لیا اور کہا "ماشی، اس کھڑکی کو ذرا سا کھول دو، اور روشنی ہٹا لو۔"

خاموش رات مسافر عدم کی طرح کھڑکی پر سکوت میں کھڑی تھی۔ تارے جو غیر محدود زمانہ سے سیکڑوں موت کے منظر دیکھ چکے ہیں، اب بھی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ جو تن مونی کی صورت اُس شب تاریک پر نقش پاتا تھا اور اُس کی دونوں مخمور آنکھیں، آہ! آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں! ماشی اُس کو اس طرح خاموش پاکر مطمئن ہو گئی اور یہ سمجھی کہ شاید وہ سو گیا۔ یکبارگی وہ چونکا اور کہنے لگا "ماشی! تم کہتی تھیں کہ مونی ایسی نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں خوش رہ سکے۔ اب تم نے دیکھا "

"ہاں۔ بابا، اب میں دیکھتی ہوں۔ بے شک میرا خیال غلط نکلا، تجربہ ہی سے آدمی کا حال کھلتا ہے۔"

"ماشی"

"پیارے، اب سو رہو"

"تھوڑی دیر رہنے دو، ماشی خفا نہ ہو ذرا [illegible] باتیں کر لوں"

"اچھا، بہت اچھا۔"

"ایک مرتبہ جب میں سمجھتا تھا کہ مونی مجھ سے محبت نہیں کر سکتی تو میں تو اُس کو خاموشی سے برداشت کرتا تھا۔ مگر تم ـــــ"

"نہیں، پیارے- میں تمھیں یہ نہ کہنے دوں گی، میں نے بھی برابر برداشت کیا ؟"

"ہاں تم جانتی ہو، اُسے دماغ مٹی کے ڈلے تو ہیں نہیں کہ ہاتھ میں اُٹھاتے ہی تم اپنے قبضہ میں کر لوگے- میں خود محسوس کرتا تھا کہ موتی ابھی تو نہیں سمجھتی مگر جب کوئی صدمہ ——"

"ہاں، جوتن تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"اسی لیے میں نے اُس کی بے پروائی کا بہت خیال نہیں کیا۔"

ناشی نے اپنی آہ سرد کو روکا، اور خاموش رہی- ایک مرتبہ نہیں، بارہا، اُس نے جوتن کو برآمدہ میں مینہ کی بوچھار میں پڑے ہوئے دیکھا مگر وہ اپنے سونے کے کمرہ میں نہیں گیا- بارہا وہ پڑا ہوا کروٹیں بدلتا رہتا اور وہ جانتی کہ موتی کا انتظار کر رہا ہے کہ وہ آئے اور اُس کو منائے مگر وہ تھیٹر جانے کی طیاری میں مشغول ہوتی- پھر بھی اگر ناشی اُس کے پاس جاکر اُسے پنکھا جھلنے لگتی تو وہ بگڑ کر اُسے واپس بھیج دیتا- بار بار ناشی اُس سے کہنا چاہتی کہ" جوتن تم کیوں اس قدر اُس بیوقوف لڑکی کا خیال کرتے ہو- اُس کے جذبۂ طلب کو بڑھاؤ، اور اُس کو سبق سیکھنے دو" مگر یہ باتیں کہنے کی نہ تھیں- اور ان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا جوتن کا دل حسن کی دیوی کا مندر تھا اور اُس کے تخت پر موتی متمکن- وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خود اُس کی قسمت اُسے اُس جامِ محبت سے محروم کردے گی جس کا دَور کسی دیوتی کی نگہ سے چلتا تھا- اور اسی لیے پرستش جاری رہی، قربانیاں برابر چڑھائی گئیں، اور امید کبھی منقطع ہونا

ناشی پھر یہ ہی سمجھ رہی تھی کہ جوتن سو رہا ہے کہ وہ یکبارگی بولا" میں جانتا ہوں کہ تمھارا یہ خیال تھا کہ میں موتی سے خوش نہیں اور اس لیے تم اُس سے ناراض تھیں- لیکن ناشی! مسرت اُن ستاروں کے مانند ہے- دیکھو، وہ ساری تاریکی پر غالب نہیں ہیں، بیچ بیچ میں بہت سا تاریک حصہ باقی ہے- ہم زندگی میں غلطیاں کرتے ہیں اور اُس کو پوری طرح نہیں سمجھتے، تاہم بعض حصے باقی رہ جاتے ہیں اور اُن میں صداقت چمکتی ہے —— میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے دل میں مسرت کہاں سے جاگزیں ہوگئی" ناشی ہلکے ہلکے اُس کا سر سہلا رہی تھی اُر

اپنے آنسوؤں کو تاریکی کے پردہ میں چھپائے ہوئے تھی۔

"ہاشی، وہ بہت کم عمر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُس کی زندگی کس طرح گزرے گی جب کہ میں ــــــ؟"

"کم عمر؟ جو تن وہ تو خاصی بڑی چڑھی ہے۔ میں بھی جوان ہی تھی کہ میرا سرتاج میرے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ مگر اُس روز سے آج تک وہ میرے دل میں ہے۔ ایسی صورت میں مجھ کو کیا نقصان ہوا؟ اور علاوہ اس کے کیا زندگی کے لیے مسرت ایک جزوِ غیر منفک ہے؟"

"ہاشی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مونی التفات پر مائل ہوئی ہے تو میں دُنیا سے ــــــ"

"جو تن اس کا خیال مت کرو، کیا یہ کوئی بُری بات نہیں کہ وہ اب مائلِ التفات ہے؟"

دفعتاً جو تن کو ایک گیت یاد آگیا جو اُس نے بہت دن ہوئے ایک گاؤں میں سُنا تھا:

اے میرے دل! تو اُس وقت نہ جاگا جبکہ میرے دل کا مالک میرے دروازہ پر آیا تھا،

اُس کے قدم واپسیں کی آواز پر تو جاگا،

آہ! تو جاگا تو، مگر تاریکی میں!"

"ہاشی، اب کیا بجا ہوگا؟"

"قریب نو کے وقت ہے"

"ابھی تو بہت سویرا ہے! میں تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی دو یا تین بجے ہوں گے۔ تم جانو میری آدھی رات تو غروبِ آفتاب سے شروع ہو جاتی ہے، مگر تم کیوں میرے سونے کے لیئے اسقدر مُصر تھیں؟"

"یوں ہی، کل تم کتنی رات تک جاگے اور باتیں کرتے رہے، آج سویرے سے سو جاؤ۔"

"کیا مونی سو گئی؟"

"نہیں، وہ تمھارے لیے شوربہ پکانے میں لگی ہوئی ہے۔"

"ہاشی، تم ہنسی تو نہیں کر رہی ہو، کیا واقعی وہ ــــــ"

ں، ہاں! کیوں؟ وہ بیچاری تو تمھارا سارا کھانا طیار کرتی ہے۔"
ں سمجھا تھا کہ شاید مونی کو پکانا نہیں ــــــ"
رتوں کو یہ کام آتے کچھ دیر لگتی ہے، جب وقت پڑتا ہے آپ سے آپ سب آ جاتا ہے۔"
ج کو جو میں نے شوربہ پیا وہ تو بڑے مزے کا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ تم نے پکایا ہے"
ں۔ میں کہاں سے پکاتی۔ مونی مجھے تمھارا کام کب کرنے دیتی ہے؟ سارے کپڑے
خود دھوتی ہے۔ یہ تو اُسے معلوم ہی ہے کہ میلی کوئی چیز تم اپنے پاس نہیں آنے دیتے
دیکھتے کہ تمھارا کمرہ وہ کیسا صاف ستھرا رکھتی ہے۔ اگر میں اُسے تمھارے پاس
دوں تو وہ بیٹھے بیٹھے اپنی جان کو ہلکان کرلے اور اُٹھنے کا نام نہ لے۔"
ا مونی کی صحت ــــــ"
اکٹروں کا خیال ہے کہ مریض کے پاس اُسے بار بار نہ جانے دیا جائے، اُس کا قلب
ہے۔"
اشی، تم اُسے یہاں آنے سے کس طرح روکتی ہو؟"
ں وہ ہدایات مان لیتی ہے اور میں بھی اُسے دم دم کی خبر دیتی رہتی ہوں۔"
ے آسمان پر آنسوؤں کے قطروں کی طرح چمک رہے تھے، جوتن نے اپنا سر اُس
ار تفکر میں جھکا دیا جو عنقریب رخصت ہونے والی تھی، اور جب موت نے اپنا ہاتھ
بڑھایا تو اُس نے اُس کو کامل اطمینان و سکون کے ساتھ قبول کیا۔
ں نے ایک آہ کھینچی اور کسی قدر اضطراب کے ساتھ کہنے لگا
ی! اگر مونی اب تک جاگ رہی ہو تو کیا وہ یہاں ــــــ صرف تھوڑی دیر ــــــ؟"
ت اچھا۔ میں ابھی جا کر بلاتی ہوں۔"
ں اُسے دیر تک نہ ٹھیراؤں گا۔ صرف پانچ منٹ کے لیے۔ مجھے کچھ اُس سے ضروری
۔" تاشی نے ٹھنڈی سانس بھری اور مونی کو بلانے چلی گئی۔

اس عرصہ میں جوتن کی نبض کی حرکت بڑھ گئی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کو کبھی بھی موتی سے راز و نیاز کی گفتگو کرنا نصیب نہیں ہوئی اس لیے کہ دونوں باجوں کا راگ جدا تھا۔ اور دونوں سے ایک آواز کا نکلنا نا ممکن، جب کبھی اُس نے موتی کو اپنی ہم جلیس لڑکیوں میں ٹھٹھے مارتے اور بے تکلف باتیں کرتے سُنا تو اُس کا سینہ آتشِ رشک سے مشتعل ہوگیا،

مگر جوتن اپنے آپ ہی کو الزام دیتا تھا —— کیوں نہیں وہ بھی اُسی طرح اِدھر اُدھر کی بےتکی باتیں ملاتا؟ یہ نہیں کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا اس لیے کہ اپنے احباب میں وہ بھی اکثر ایسی ہی ذرا ذرا سی باتوں پر بحثیں کرتا ہے۔ مگر ذرا ذرا سی باتیں جو عورتوں کو پسند ہیں مردوں کو پسند نہیں۔ کتنی مرتبہ جوتن نے، جبکہ وہ موتی کے ساتھ کھلے برآمدے میں بیٹھا ہوتا، سلسلۂ گفتگو قائم کرنا چاہا مگر ہر مرتبہ رشتۂ الفاظ شکستہ ہی نظر آتا۔ جس سے خاموشی وقت بھی شرمندہ ہی رہتی۔ جوتن خوب سمجھ لیتا کہ موتی جانا چاہتی ہے، اس لیے وہ دل سے چاہتا کہ کوئی تیسرا ہی آدمی آجائے، اُس وقت شاید گفتگو کا موقع ملے۔ اس لیے کہ دو سے تین آدمی زیادہ سہولت سے باتیں کر سکتے ہیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ موتی آئے تو میں کیا گفتگو کروں؟ مگر ان مصنوعی باتوں سے اُس کا دل کب خوش ہونے لگا تھا۔ وہ متفکر تھا کہ کہیں آج کی رات کے پانچ منٹ بھی معلوم نہ جائیں مگر اس قسم کی گفتگو کے لیے اُس کے پاس صرف چند لمحے باقی ہیں۔

(۳)

"بٹیا، یہ کیا کر رہی ہو، تم تو کہیں جانے والی نہ تھیں"

"جی ہاں، میں سیتا رام پور جا رہی ہوں"

"وہ آخر کیسے؟ ساتھ کون جا رہا ہے؟"

"اننت"

"بیٹی آج نہ جاؤ، کسی دوسرے دن چلی جانا۔"

"مگر درجہ تو کرایہ کر لیا گیا"

"خیر، ہو جانے دو۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ کل صبح سویرے چلی جانا۔"

"ماشی، میں آپ کے منحوس دنوں کی قائل نہیں ہوں۔ آج چلی جاؤں تو کیا بگڑا جاتا ہے؟"

"جو تن تم سے باتیں کرنا چاہتا ہے"

"اچھا! ابھی تو بہت وقت ہے۔ میں فوراً جاتی ہوں اور مل لیتی ہوں"

"مگر یہ نہ کہنا کہ تم جا رہی ہو"

"بہت اچھا، میں نہ کہوں گی۔ مگر میں بہت دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ کل میری بہن کا اپریشن ہے اور آج میں جا کے رہوں گی"

"آہ میری بچی! خدا کے لیے اس مرتبہ تو کہنا مان لو۔ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاؤ اور اُس کے پاس اطمینان سے جا بیٹھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمھاری عجلت کو سمجھ جائے"

"میں کیا کر سکتی ہوں! ریل تو میرا انتظار کرے گی نہیں۔ انت ابھی دس منٹ میں لوٹ آئے گا۔ میں اتنی دیر وہاں جا کر بیٹھی جاتی ہوں"

"نہیں۔ تو بس رہنے دو۔ میں تمھیں اس گھبراہٹ میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔ او بدنصیب لڑکی! جس شخص پر تو ظلم کر رہی ہے وہ جلد اس دُنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ مگر میں سچ کہتی ہوں کہ تو بھی اس وقت کو اپنی آخری گھڑی تک نہ بھولے گی! خدا سے ڈر اور اُس کے غضب سے ڈر!"

"ماشی! آپ مجھے اس طرح نہیں کوس سکتیں"

"اے میرے پیارے بیٹے! پیارے بیٹے!! اب تو کس لیے زندہ ہے؟ اس ظلم کی کوئی انتہا نہیں، مگر آہ! میرے بس کی کوئی بات نہیں!"

ماشی اس خیال سے تھوڑا وقت ٹال کر بیمار کے کمرہ میں گئی کہ وہ اب سو گیا ہوگا۔

مگر جوں ہی وہ داخل ہوئی کہ جوتن نے حرکت کی۔ ناشی چلّائی کہ "دیکھا۔ وہ کیا کر رہی ہے!
"کیا ہُوا؟ موتی نہیں آئی؟ ناشی تم نے کہاں اتنی دیر لگا دی؟"
اَے۔ میں جو پہونچی تو وہ زارزار رو رہی تھی اور صرف اس لیے کہ تمھارے حریرے
کا دودھ چولھے پر جل گیا! میں نے بہت کچھ سمجھایا کہ دودھ اور آجائے گا مگر یہ خیال کہ
تمھارے حریرے کے دودھ سے وہ اتنی غافل ہو جائے، اُس کی آنکھ سے آنسو رُکنے
نہیں دیتا تھا ——— بڑی مصیبت سے میں نے اُسے تسلّی دی اور سُلا دیا۔ بس اسی
میں نہ لا سکی۔ اچھا ہے اب سونے دو۔"
اگرچہ موتی کے نہ آنے پر جوتن کو سخت تکلیف ہوئی مگر پھر بھی اُس کو ایک قسم کی تسکین
تھی۔ اُس کو بہت کچھ یقین ہو گیا تھا کہ موتی کا جسم اس کی خیالی تصویر کے لیے بار ہوگا۔ ایسے
واقعات اس سے قبل بھی اُس کو دنیا میں پیش آچکے تھے۔ اور یہ خیال کہ اُس کے
دودھ کے جل جانے پر موتی کو اس درجہ رنج ہوا اُسکی بے نہایت دلی مسرت کا باعث تھا۔
"ناشی۔"
"کیوں، بابا کیا ہے؟"
"مجھے یقین ہے کہ اب میرا وقت آگیا ہے۔ مگر مجھے کچھ افسوس نہیں۔ تم بھی میرے لیے
رنج نہ کرنا۔"
"نہیں، بابا میں کچھ رنج نہ کروں گی۔ میرا یہ اعتقاد نہیں کہ صرف زندگی ہی باعث مسرت
ہے اور موت نہیں
"ناشی۔ میں سچ کہتا ہوں، مَوت نہایت شیریں ہے۔"
جوتن آسمان کی تاریکی پر نظر جمائے ہوئے تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ گویا موتی خود موت
کے بہانے سے آرہی ہے۔ وہ حسن ہے غیر فانی و مجسم، اور ستارے امن و عافیت کے پھول
ہیں جو مادرِ دہر کے ہاتھوں سے اُس کی لانبی اور سیاہ زلفوں پر برسائے جا رہے ہیں۔ ایسے

معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر وہ رُونمائی میں اپنی دُلھن کا چہرہ دیکھ رہا ہے !
فضائے شب میں موتی کی محبت بھری آنکھوں کی کیفیت چھاگئی تھی، مونی اُس کے گھر کی روشنی، اُس کے دل کی مالک، موتی اُس کی حسین دُلھن تمام عالم کے ہر حصہ میں نظر آنے لگی، اور اُس کا تخت ستاروں کی قرباں گاہ اور موت وحیات کے اتصال پر نظر آتا تھا۔
جوتن کا دل خوشی سے بھرا ہوا تھا اور وہ فرطِ مسرت سے کہہ رہا تھا " آخر کار حجاب اُٹھ گیا اور تاریکی میں روشنی نظر آرہی ہے۔ او حُسن کی دیوی ! تو نے مدتوں میرے دل کو تکلیفیں دیں مگر اب تو مجھ سے جدا نہیں ہو سکتی ! "

(۴)

ماشی۔ مجھے بہت تکلیف ہے مگر اُس قسم کی نہیں جیسی تم سمجھتی ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری تکالیف اب رفتہ رفتہ میری زندگی سے رخصت ہو رہی ہیں۔ میری زندگی اُس بادبان کشتی کی طرح تھی جس کو مدتوں بہاؤ کے خلاف چلانے کی کوشش کی گئی مگر اُس کی رسّی اب ٹوٹ گئی ہے اور وہ تیزی کے ساتھ آگے کو بہتی چلی جاتی ہے۔ میں اب اُس کو دیکھ رہا ہوں مگر اب وہ میری نہیں ہے.......... لیکن ماشی، اس دو دن میں تو موتی ایک مرتبہ بھی نظر نہیں پڑی۔"

" جوتن لاؤ میں دوسرا تکیہ لگا دوں "

" ماشی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مونی نے بھی مجھے اُس کشتیِ غم کی طرح چھوڑ دیا ہے جو اب مجھ سے دُور بہی چلی جاتی ہے۔"

" بیٹا، ایک ذرا سا یہ عرق پی لو۔ تمھارا حلق خشک ہو گیا ہو گا۔"

" میں نے کل اپنا وصیت نامہ لکھا ہے۔ کیا تمھیں نہیں دکھایا؟ مجھے یاد نہیں پڑتا۔"

" مجھے دکھانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔"

" جب اماں کا انتقال ہوا تو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ تم نے مجھے پرورش کیا، کھلایا،

پلایا، اس لیے میں سوچ رہا تھا ـــــ"
"بیٹا، کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو، میرے پاس صرف یہ مکان تھا اور تھوڑی سی جائداد تھی۔ باقی سب تم نے ہی پیدا کی"
"مگر یہ مکان ــــ"
"یہ کچھ بات نہیں، تم نے بھی تو اس میں اتنا لگا دیا ہے کہ اب تو یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ میرا مکان تھا کدھر"
"میں سمجھتا ہوں کہ موتی تم سے محبت کرے ــــ"
"ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اب تم سو رہو۔"
"اگرچہ میں اپنی ساری جائداد موتی کو دے رہا ہوں مگر عملاً وہ تمہارے ہی قبضہ میں رہے گی۔ اور موتی اپنی ماشی کے کبھی خلاف نہ کرے گی۔"
"بیٹا، تم کیوں اس کے پیچھے اپنا سر کھپا رہے ہو؟"
"میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہاری ہی بدولت ہے۔ اس لیے جب تم میرے وصیت نامہ کو دیکھو تو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال ــــ"
"جوتن! تم کیا کہہ رہے ہو، کیا مجھے اتنا کم ظرف سمجھتے ہو کہ مجھے اس کا خیال ہوگا کہ تم اپنی جائداد موتی کو کیوں دے رہے ہو؟"
"مگر نہیں تم کو بھی ــــ"
"دیکھو جوتن! میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔ تم مجھے روپیہ دے کے تسکین دینا چاہتے ہو!"
"ماشی، کاش میں روپیہ سے زیادہ بہتر کوئی چیز دے سکتا!"
"جوتن! وہ تو تم کافی سے زیادہ دے چکے ہو۔ کیا تم میرے ویران گھر کی رونق نہ تھے، تم نے تو مجھے اس قدر دے دیا ہے کہ اگر میری قسمت مجھے کچھ بھی نہ دے سکے تو بھی مجھے مطلق پروا نہیں۔ تم موتی کو سب چیزیں دے دو۔ مکان، جائداد، گاڑی، گھوڑا،

اس لیے کہ یہ سب چیزیں اب میرے لیے بار ہیں اور ناقابلِ برداشت بار!"

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ تمھارے لیے اب زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ مگر موتی بھی نوجوان ہے اور ــــــــ"

"نہیں۔ یہ مت کہو۔ اگر تم اُس کو جائداد دے رہے ہو تو بالکل ٹھیک ہے، مگر لطف و مسرت ــــــــ"

"ماشی، اگر وہ اپنی زندگی لطف و مسرت میں گزارے تو اس میں کیا ہرج ہے۔"

"نہیں، نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ اُس کے لیے عیش و آرام مصیبت و الم ہو جائیگا۔"

جوتن خاموش تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ صحیح ہے یا غلط اور آیا یہ قابلِ افسوس ہے یا نہیں کہ موتی کی زندگی صرف اُس کے نہ ہونے سے تلخ ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ستارے اُس کے کان میں کہہ رہے ہیں:

واقعی یہ ٹھیک ہے۔ ہم ہزارہا برس سے دیکھ رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ عیش و عشرت کے یہ سارے سامان محض طلسم فریب ہیں۔

"جوتن نے ایک آہ کھینچی اور کہنے لگا "حقیقت میں ہم اپنے بعد وہ چیزیں نہیں چھوڑ سکتے جو چھوڑنے کے قابل ہیں۔"

"پیارے، یہ بھی کچھ کم نہیں جو تم اُسے دے رہے ہو! بس یہ ہی دُعا کرو کہ خدا اُسے اس ترکہ کی قدر کرنے کی توفیق دے۔"

"ماشی، ذرا وہ اناناس کا عرق اور دینا۔ مجھے پیاس معلوم ہوتی ہے، کیا موتی کل میرے پاس آئی تھی؟ مجھے خیال نہیں رہا۔"

"ہاں، آئی تھی مگر تم سو رہے تھے، بہت دیر تک وہ یہاں بیٹھی تمھیں پنکھا جھلتی رہی، پھر اٹھ کر تمھارے کپڑے دھونے چلی گئی۔"

"آہ! عجب اتفاق ہے۔ مجھے یاد ہوتا ہے کہ میں اُس وقت یہ ہی خواب دیکھ رہا تھا

کہ موتی میرے کمرے میں آنے کو ہے۔ دروازہ ذرا سا کھل رہا تھا اُس نے اور کھولنا چاہا، مگر وہ کھلا نہیں ...... مگر ماشی، میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری احتیاط حد سے گزر گئی۔ تم موتی کو میرے آخری وقت تو آنے دو، ورنہ وہ اس صدمہ کو بڑی مشکل سے برداشت کر سکے گی۔"

"بابا، تمھارے پیر ٹھنڈے ہو رہے ہیں، لاؤ یہ شال ڈال دوں۔"

"نہیں، ماشی میں کوئی چیز نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"جوتن، تم نہیں جانتے، یہ شال تمھارے لیے موتی نے بنایا ہے۔ سب تو سوتے ہوتے مگر وہ بیٹھی اس کو بنایا کرتی۔ کل ہی تو یہ طیار ہوا ہے۔"

جوتن نے شال پر نظر ڈالی اور محبت سے ہاتھ میں لے لیا، اُس کو اُون کی نرمی خود موتی کا گداز جسم معلوم ہوتا تھا، موتی کے جذباتِ محبت اُس شال کے تاروں میں راتوں کو بُنتے وقت پیوستہ ہو گئے تھے، وہ صرف اُون کا ہی بنا ہُوا نہ تھا بلکہ موتی کے ہاتھ نے بھی اُس کو مَس کیا تھا۔ اس لیے جب ماشی نے اُس کے پیروں پر ڈال دیا تو وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ گویا موتی ہی کا ہاتھ اُس کو تھپکتا، تسلّی دیتا، اور پیار کرتا ہے۔

"مگر ماشی، میں سمجھتا ہوں کہ موتی کو تو بُننا نہیں آتا۔ کم از کم اُس کا جی تو نہیں لگتا۔"

"کسی چیز کا سیکھنا کئی دن کا کام ہے۔ میں نے ہی سکھایا تھا۔ اور اس میں غلطیاں بھی تو بہت ہیں۔"

"ہونے دو غلطیاں ہیں تو۔ ہمیں پیرس کی نمائش گاہ میں تو بھیجنا ہی نہیں۔ اس وقت میرا پاؤں گرم کر ہی دیا۔"

جوتن کے دماغ نے موتی کی وہ تصویر پیش کی جبکہ وہ شال بُن رہی ہے۔ غلطیاں کرتی ہے، اُلجھتی ہے، پریشان ہوتی ہے مگر راتوں رات استقلال سے بیٹھی کام کر رہی ہے۔ آہ! یہ کیسی دلکش و محزون تصویر تھی۔ اُس نے پھر شال ہاتھ میں لے لیا اور کہنے لگا:

"ماشی کیا ڈاکٹر نیچے ہے؟"

"ہاں وہ رات کو یہیں رہے گا۔"

"اُس سے کہہ دو کہ اب خواب آور دوا دینا فضول ہے۔ اُس سے مجھے کچھ آرام نہیں ملتا اُلٹی تکلیف بڑھتی ہے۔ مجھے جاگنے ہی دو۔ ماشی تمھیں معلوم ہے کہ میری شادی بیساکھ کی چودھویں شب کو ہوئی تھی۔ صبح کو وہی دن ہوگا اور وہی ستارے آسمان پر چمک رہے ہوں گے۔ موتی شاید بھول گئی ہو، میں اُسے یاد دلانا چاہتا ہوں۔ ذرا اُسے ایک دو منٹ کے لیے بلا لو .... کیوں، چپ کیوں ہو رہیں؟ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر نے تم سے کہہ دیا ہے کہ ضعف کی حالت میں ذرا سا کسل ——— مگر نہیں ماشی میں سچ کہتا ہوں کہ اگر تم دو منٹ کے لیے موتی سے گفتگو کرنے دو تو پھر میرے سُلانے کے لیے دوا کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں بالکل اچھا ہوں اور آج میرا دل اس درجہ مطمئن ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اسی لیے میں موتی کو بلاتا ہوں ..... نہیں ماشی! میں تمھیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ آخر آج رات کیا ہو گیا، اب تک تو تم خاموش تھیں۔"

"آہ جوتن - میں جانتی تھی کہ میرے سارے آنسو خرچ ہو چکے ہیں، مگر نہیں بہت باقی ہیں۔ آہ! اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"موتی کو بلاؤ، میں آج اُس کو اپنی شادی کا دن یاد دلاؤں گا تاکہ کل وہ ——"

"اچھا، میں جا رہی ہوں۔ شمبھو دروازہ پر ہے اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو پکار لینا۔"

ماشی، موتی کے کمرہ میں پہونچی اور زمین پر بیٹھ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ "اے بدنصیب، ظالم! اب بھی آجا، جس نے تجھ کو سب کچھ دیا ہے اُس کی آخری تمنا تو بھی پوری کر دے! جو خود مر رہا ہو اُس کی حالت پر تو رحم کر!"

پاؤں کی آہٹ سُن کر جوتن چونک پڑا "موتی"

"میں شمبھو ہوں، کیا سرکار نے بلایا؟"

"سونی کو بلاؤ"

"کس کو، حضور؟"

"سونی کو"

"وہ تو ابھی واپس نہیں آئیں"

"واپس؟ —— کہاں سے نہیں آئیں؟"

"سیتارام پور سے"

"کب گئی ہیں؟"

"حضور، آج تین روز ہوئے"

فوراً ہی جوتن سر سے پیر تک سرد پڑ گیا اور اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ تکیہ سے ذرا نیچے کھِسکا اور شال کو پاؤں سے نیچے گرا دیا،

جب ناشی بڑی دیر کے بعد واپس ہوئی تو جوتن نے سونی کا ذکر نہیں کیا اور وہ سمجھی کہ وہ اس ذکر کو بھول گیا ہے۔ یکبارگی جوتن بولا۔

"ناشی تمھیں میں نے اُس خواب کا حال سُنایا تھا جو کل میں نے دیکھا تھا؟"

"کون سا خواب؟"

"کہ موتی دروازہ کھول رہی ہے اور دروازہ ایک انچ سے زیادہ نہیں کھُلا ہے اور وہ باہر ہی کھڑی رہی اور اندر نہ آسکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُسے آخر وقت تک باہر ہی کھڑا رہنا پڑے گا"۔

ناشی خاموش رہی۔ وہ سمجھ گئی کہ جوتن کو جو سبز باغ وہ جھوٹ سچ بنا کر دکھا رہی تھی یکبارگی غائب ہو گیا ہے۔ مشیتِ ایزدی سے لڑنا بے سود ہے اور جب مصیبت آ جائے تو سرِ تسلیم خم کرنا ہی بہتر ہے"۔

"ناشی مجھے جو تم سے محبت ہے، ہر جنم میں میرے ساتھ رہے گی۔ میں نے اس زندگی

میں اُسے عہد کر لیا ہے کہ وہ اگلی زندگیوں میں میرے پاس رہے۔ اگلے جنم میں یقیناً تم میری ہوگی اور میں انتہائے محبت سے تمھاری پرورش کروں گا۔"

"جوتن۔ اب سو رہو۔ باتیں کر چکے۔"

"میں تمھارا نام لکشمی رکھوں گا"

"مگر یہ تو پرانے زمانے کا نام ہے"

"ہاں، مگر تم بھی میری پرانے زمانے کی ماشی ہو۔"

"نہیں۔ میں لڑکی ہو کے تمھارے گھر کے لیے مصیبت نہ بنوں گی"

"ماشی کیا میں مصیبتوں کے برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ــــــکیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہمیشہ تم میری مصیبت ہلکی کرتی رہو؟"

"پیارے جوتن! میں عورت ہوں اور اس لیے کمزور۔ یہی وجہ ہے کہ ساری عمر تم کو تکلیف سے بچانے کی کوشش کی، مگر نتیجہ کیا نکلا؟ــــــناکامی!"

"ماشی! وہ کون ہے؟ کون ہے؟"

"کون؟ وہاں تو کوئی نہیں"

"مگر مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ وہــــــ"

"نہیں، جوتن کچھ نہیں ہے۔ خاموش رہو، ڈاکٹر آرہا ہے"

"دیکھیے آپ کو بیمار کے پاس اتنا بیٹھنا نہیں چاہیے۔ آپ جائیے، آرام کیجیے۔ میرا اسسٹنٹ یہاں رہے گا۔"

"نہیں، ماشی! میں نہ جانے دوں گا۔"

"اچھا۔ بابا۔ میں یہاں کونے میں چپ بیٹھی رہوں گی"

"نہیں، نہیں! تم میرے پاس ہی بیٹھی رہو، میں تمھارا ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے تمھارے ہی ہاتھ سے پرورش پائی ہے اور اسی ہاتھ سے خدا مجھ کو لے گا"

"بہت مناسب۔ آپ یہاں رہیے۔ مگر جوتن بابو آپ باتیں نہ کریں۔ دوا پی لیجیے وقت ہو گیا ہے۔"

"میرے لیے دوا؟ حماقت! اس کا وقت ختم ہو گیا۔ اب دوا پلانا محض دھوکا دینا ہے! علاوہ اس کے مجھے موت سے ہراس نہیں۔ ماشی! موت اپنے کام میں مشغول ہے پھر اس ڈاکٹر کی مصیبت کیوں بلائی ہے۔ بھیج دو، اسے بھیج دو۔ مجھے اب صرف تمھاری ضرورت ہے، اور کسی کی نہیں! خواہ کوئی ہو، مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ اب دھوکا اور فریب کا وقت نہیں رہا!!"

"میں بہ حیثیت طبیب ہونے کے آپ کے اس ہیجانِ جذبات کو سخت تردد کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"

"ڈاکٹر، جا۔ میرے تردد بڑھانے کے لیے کیوں کھڑا ہے؟ ماشی۔ وہ گیا؟ اچھا، تو اب میرے سر کو اپنی گود میں رکھ لو"

"اچھا، بابا اب نیند کا خیال کرو"

"نہیں، ماشی! مجھے سونے کو مت کہو، اب اگر میں سویا تو پھر کبھی نہ اٹھوں گا مجھے بس تھوڑی دیر اور جاگنا ہے۔ کیا تم آواز سنتی ہو؟ کوئی آرہا ہے؟"

(۵)

"جوتن پیارے - ذرا آنکھ کھولو، وہ آگئی - ایک دفعہ دیکھ لو!"

"کس کو دیکھوں؟ خواب کو؟"

"کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟ یہ تمھاری موتی ہے!"

"موتی؟ کیا دروازہ کھل گیا"

"ہاں، بابا - وہ تو کبھی کا کھل گیا"

"نہیں، ماشی وہ شال ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، وہ دھوکا ہے، فریب ہے!"

"جوتن یہ شال نہیں۔ یہ موتی ہے جو تمھارے پیروں پر پڑی ہے۔ ذرا اس کے سر پر ہاتھ تو پھیرو .... موتی اب نہ روؤ۔ رونے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ اس وقت تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاؤ"

دشمن پر احسان

(منتخب از مثنوی فغانِ جگر - زیر تصنیف حکیم جگر صدیقی)

دی ہے مجھ کو محدثوں نے خبر — متفق نیز ہیں سب اہلِ سیر
سیدِ مرسلاں امام ہدا — مصطفےٰ مجتبےٰ حبیب خدا
آرہے تھے جہاد سے گھر کو — کسل سے نیند آئی سرور کو
یار و اصحاب سے جدا ہو کر — سو گئے مصطفےٰ بہ زیرِ شجر
ناگہاں اک قریش دشمنِ دیں — آگیا سر پہ لے کے تیغِ کیں
ہاتھ اُٹھتے ہی جاگ ماہ اُٹھے — دونوں عالم کے بادشاہ اُٹھے
اُس کو آمادہ قتل پر دیکھا — آپ نے غور سے اُدھر دیکھا
اُس نے پوچھا غرور سے ہنس کر — یا محمد بچے گا تو کیوں کر
آپ نے مہربان ہو کے کہا — نہیں ڈرتا کسی سے حق کے سوا
وہ خدا جس نے جان مجھ کو دی — جان کا ہے وہی محافظ بھی
تیرے شر سے مجھے بچائے گا — وہ ضرر سے مجھے بچائے گا
دل ہوا موم گو کہ پتھر تھا — گر پڑا ہاتھ میں جو خنجر تھا
آپ نے لے کے ہاتھ میں شمشیر — پوچھا، بچنے کی اب ہے کیا تدبیر
بولا وہ خوف کھا کے یا حضرت — نہیں بچنے کی اب کوئی صورت
آپ نے مسکرا کے فرمایا — میں ہدایت کو ہوں یہاں آیا
ہادیِ راہِ دیں ہے نام مرا — قتل کرنا نہیں ہے کام مرا
میں نے بخشی تری خطا گھر جا — اپنی تلوار مجھ سے لے کر جا

لے کے پھر نامِ قادرِ جبار — پھینک دی اُس کے سامنے تلوار
دیکھ کر یہ محمدی اخلاق — ہو گیا دل سے بندۂ اشفاق
قدمِ پاک پر گرا وہ عرب — جادۂ کفر سے پھرا وہ عرب
پھر کہا لا الٰہ الا اللہ — یا محمدؐ ہے تو رسول اللہ
ساری دنیا کو یاد ہے تا حال — حُسن اخلاق کی یہ نیک مثال
خواہشِ نفس پر رہے غالب — نہ ہوئے انتقام کے طالب
دل تھا آئینے سے زیادہ صاف — کیا کتنا بڑا قصور معاف
نہ ہوئے ہیں نہ ہونگے ایسے خلیق — دشمنِ جاں پہ بھی رہے وہ شفیق
خارِ کلفت سے تو ہوا نہ ملول — یا محمد تو ہے گلاب کا پھول

فیض تیرا ہے چشمۂ اخلاق
یا محمد جگر پہ کر اشفاق

نشاط انگیز ہے انجامِ غفلت پر نظر ہونا — خیالِ مبتدا رکھنا خبر سے با خبر ہونا
بجا ہے عشق میں تیرے خودی سے بے خبر ہونا — نہیں بیجا محبت میں تری شوریدہ سر ہونا
نہ پوچھ اے ہمنشیں طولِ شبِ فرقت کے افسانے — یہ وہ قصہ نہیں ممکن ہو جس کا مختصر ہونا
وہ اُن کی چاند سی صورت مرے پیشِ نظر رہنا — وہ تارے گنتے گنتے رات کا پچھلا پہر ہونا
یہ جملے ایک ہی معنی میں ہو سکتے ہیں مستعمل — خبر آنا خبر پانا خبر ملنا خبر ہونا
اثر رنگ خودی چھوڑو بقولِ حضرتِ اکبر — اگر تم چاہتے ہو دوستوں میں با اثر ہونا

اثر جمتے ہی جمتے رنگ جمتا ہے زمانہ میں
ذرا مشکل ہے بازارِ سخن میں معتبر ہونا

سید آغا حیدر اثر

خیال

۱- خیال کیا چیز ہے؟ یہ بھی اس قدر اہم سوال ہے جس کے جواب کے لیے الفاظ بالکل ناکافی ہیں۔ ناکافی مگر ایسے ناکافی نہیں جیسے عشاق کو عموماً اپنے دردِ محبت کے اظہار یا ایک زیر بار احسان دل کو شکریہ ادا کرنے کے لیے خاطر خواہ الفاظ ملنے کی حسرت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ ابھی تک کسی دماغ نے اختراع ہی نہیں کیے جو قوتِ خیال کی غیر محدود قلمرو کا پتہ دے سکیں یا اُس کی دل فریب اور سحر طراز فطرت کی مکمل قلمی تصویر کھینچ سکیں۔ لیکن اگر کسی قسم کی تعریف خیال کی ممکن ہے تو وہ اُن الفاظ کے ساتھ جن کو کچھ بھولے بھالے دلوں نے ایسے زمانہ میں وضع کیا تھا جب خیال کی اہمیت اُن کے خیال میں آئی ہی نہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس وقت سوا اُن اشیا کے جن کا وہ مشاہدہ کرتے تھے یا جن کے وجود سے وہ مختلف قوٰی کے ذریعہ سے آگاہ ہوتے تھے وہ لوگ اور کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لیے طیار نہ تھے۔ ہاں اُس زمانے میں اگر کسی چیز کا وجود بلا ذرایع مذکورہ کے وہ لوگ مانتے تھے تو وہ بس ایک خدا کی ذات تھی۔ لیکن اس وجود کے اعتراف کے لیے بھی وہ لوگ تیار نہ تھے بلکہ قدرت کے ہر مختلف عظیم الشان مظاہرِ فطرت Phenomena کے وقوع کے لیے وہ ایک قوت مانتے تھے۔ وہ اُس کو خدا کہتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جب کھیت میں پانی دینا ہوتا ہے تو اس کے لیے ایک شخص پُر چلاتا ہے اور پانی کنوئیں سے نکال کر کھیتوں میں بہاتا ہے وہ ہمیشہ دیکھتے تھے کہ جب اُن کو کسی چیز کو گرم کرنا ہوتا ہے تو پہلے آگ جلانی پڑتی ہے اور پھر اس کے بعد وہ چیز اُس میں گرم کی جاتی ہے۔ اُسی کے ساتھ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آگ کا اپنے آپ جل اُٹھنا محال ہے۔ غرض اسی طرح سے اور واقعات و موجوداتِ عالم میں بھی اُن کو یہ ہر وقت

کے تجربے سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ہر چیز بلا سبب کے وقوع میں نہیں آسکتی۔ اس نتیجہ پر آنے کے بعد اُنھوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کی نہایت مہیب شئے آسمان پر ظاہر ہوئی اور اُس نے ہر طرف سے آسمان کو گھیر لیا اور اس کے ہمراہ اس قدر شور و چمک پیدا ہوئی جس سے اُن کے دل دہلنے اور آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ اِن واقعات کے مشاہدے کے بعد وہ اُن کے اسباب کی تلاش میں سرگرداں ہوئے اور اپنی عقل کے موافق اُنھوں نے ایک خدا تصور کر لیا جس کا فعل صرف اس قدر تھا کہ وہ ابر لائے اور اس سے دنیا کے رہنے والوں کو مستفیض کرے۔

۲۔ اسی طرح اُنھوں نے سورج کو دیکھا کہ وہ روزانہ ظاہر ہو کر نہایت ہی روشنی اور گرمی کے ساتھ دن بھر چمکتا اور پھر شام کو غائب ہو جاتا ہے۔ اس تحیر خیز منظر کی نہ سمجھ میں آنے والی صنعت نے اُن کے عاجز خیال کو سورج پر حکومت کرنے والا ایک دوسرا خدا منوا دیا۔ یوں ہی اُنھیں اکثر قدرت کے کرشمے نظر آتے رہتے تھے اور وہ ہر ایک کے لیے ایک نیا خدا تصور کر لیتے تھے۔ مثلاً اُن کے خیال کو بہلانے کے لیے ایک خدا زراعت کا تھا تو ایک خدا زمین کا۔ ایک خدا رنج کا تھا تو ایک خوشی کا۔ ایک عشق کا تو ایک حسن کا۔ اپنے گرد و پیش کے واقعات، انسانی زندگی، اور تیرنگی پسند اسباب عالم کے انقلابات پر قیاس کر کے یہ لوگ خدا کی ہستی کا تصور اس طرح کرتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ خدا بھی مثل اُن کے آپس میں لڑتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور اُن میں بھی مثل انسانوں کے عشق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ اُن خداؤں میں بعض مرد ہیں اور بعض عورت۔

۳۔ یہ مثالیں اس موقع پر اس لیے پیش کی گئیں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کا دماغ خیال نہایت تنگ تھا اور وہ سوا اُن باتوں کے جو ان میں خود پائی جاتی تھیں اور کوئی نئی قوت تصور کرنے سے عاجز تھے۔ اسی وجہ سے خیال ایسی نازک چیز کا تصور جس کا تصور اب بھی پورے طور پر ممکن نہیں ان لوگوں کے دماغ میں کیونکر آسکتا تھا۔ مگر الفاظ

اسی زمانے کے ایجاد شدہ ہیں اور ہم لوگوں کو صرف میراث میں ملے ہیں۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ الفاظ صرف خیال کے اظہار کے لیے استعمال لیے جاتے ہیں اور جب خیال صرف مشاہدہ کے ساتھ محدود ہو گا تو اس کا یہ نتیجہ لازمی ہے کہ الفاظ بھی ایسے ہی ہوں گے اور تخیل کی بلند پروازیوں کے اظہار میں قاصر ہوں گے۔ پس جب تک کہ ہم ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم خیال ایسی نازک چیز کی پورے طور سے تعریف نہیں کر سکتے اگر تعریف ہو سکتی ہے تو صرف مثالوں سے اور موازنہ سے۔

۵۔ انسان جب عدم سے عالم وجود میں آتا ہے تو اُس وقت اُس کے دماغ کی طاقت بہت محدود ہوتی ہے اور اس وقت سوا چند حسیات کے مثلاً قوتِ باصرہ قوتِ سامعہ اور کسی قسم کے تخیل پر وہ قادر نہیں ہوتا اور یہ حسیات بھی بہت ہی ابتدائی نشوونما کی حالت میں ہوتی ہے۔ یعنی اگر بچہ ایک روشنی کو دیکھتا ہے اور وہ روشنی اپنی جگہ سے ہٹائی جاتی ہے تو اُس میں اتنی طاقت ابتداءً نہیں ہوتی کہ وہ روشنی پر اپنی آنکھیں قائم رکھے۔ انسان میں اپنی زندگی کی اس منزل پر قوتِ ارادی کا بالکل پتہ نہیں چلتا۔ بہت سے فعل اس طاقت کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں جس کا نام میلان خلقی Instincts ہے۔ مثلاً بچے کا بھوک کے وقت رونا یا جو چیز منہ میں ڈالی جائے اُس کا پکڑ لینا۔ یا کسی چلتی ہوئی چیز کو لینے کی کوشش کرنا۔ ان سب افعال میں گو ایک قسم کا ارادہ ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ مسئلہ طے ہو گیا ہے کہ ان میں قوتِ ارادی کا مطلق کوئی جز نہیں ہے۔ بلکہ ان افعال کے کرنے پر بچہ قریب قریب فطرتاً مجبور ہوتا ہے۔ یہ درجہ بچہ کا بہت کم عرصہ تک باقی رہتا ہے بعض حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ پہلے مہینہ کے گذرنے پر بچہ میں قوتِ ارادی کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی قوتِ احساس بہت زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ اکثر اوقات بچہ اپنے ہاتھ پاؤں کو جنبش دیا کرتا ہے اور اِدھر اُدھر پھینکتا رہتا ہے۔ بادی النظر میں اس فعل کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا لیکن فی الحقیقت یہ ایک بہت مفید فعل ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان میں وہ قوت آ جاتی ہے جو یہ بتلاتی ہے کہ جسم کے کون سے حصہ سے کسی شے کا اتصال ہوا ہے۔ کیونکہ جس وقت کوئی

شخص کسی چیز کو ہاتھ سے چھوتا ہے ۔ اس وقت اس بات کا علم کہ ہاتھ ہی ملحق ہوا ہے اور پیر نہیں صرف تجربہ پر منحصر ہے اور یہی وہ اہم تجربہ ہے جو ایک بچہ حاصل کرنے کے لیے ہر وقت فطرتاً کوشاں رہتا ہے اور اپنے جسم کے مختلف حصوں کو چھو کر یہ معلوم کرتا رہتا ہے کہ کون سے حصہ کے چھونے سے کس قسم کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اس منزلِ زندگانی کی بابت اتنا کہنا اور ضروری ہے کہ اب وہ خیال کہ بچہ کا دماغ مثل ایک لوحِ سادہ کے ہوتا ہے جس پر وہ اپنے تجربوں کو نقش کرتا رہتا ہے بالکل ترک کر دیا گیا ہے اب اکثر فلسفیوں نے یہ مان لیا ہے کہ دماغ مثل ایک ایسی لوح کے ہوتا ہے جس پر پہلے کچھ لکھا ہوا اور پھر مٹا دیا گیا ہو۔ لیکن اس پر ہلکے نشان باقی رہ گئے ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت سی باتیں میراث میں پا جاتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکو کے لڑکے میں اس بات کی استعداد زیادہ ہوگی کہ وہ بھی ڈاکو ہو اور اُس کے لیے ایمان داری کی زندگی بسر کرنا اگر محال نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگا۔ اور یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ باپ کی بیماریاں لڑکوں میں منتقل ہو آتی ہیں۔ اور اس کا سبب وہی اثرِ وراثت ہے جو ہر جانور اور نباتات میں یکے بعد دیگرے چلا آتا ہے۔

۷۔ غرض لڑکے کا دماغ اسی طور سے برابر تجربات سے متاثر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس میں حافظہ کی قوت ظاہر ہونا شروع ہوتی ہے اور وہ اپنے تجربات کو آپس میں مقابلہ کرتا ہے مثلاً وہ ایک چیز کو دیکھتا ہے اور اُس کو یاد رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر پھر کبھی وہ چیز اُس کے سامنے آتی ہے تو اُس بچہ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ حافظہ کی طاقت شروع میں نہایت کمزور ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ محسوسات جن کو انسان ایک مرتبہ محسوس کرتا ہے اور پھر دوبارہ پہچان لیتا ہے وہ اس دوران میں دماغ میں کس حالت میں رہتے ہیں۔ اس کا جواب ایک نہایت مختلف فیہ اور خارج از بحث مسئلہ ہے اس لیے یہاں پر اس کا لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اب بچہ کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب وہ کلام کرنے لگتا ہے اور اُن الفاظ کو جو اُس کے گرد و پیش بولے جاتے ہیں اور وہ خیال جو اُن کے ساتھ دماغ میں پیدا ہوتے

ہیں اُن کو وہ سیکھنا شروع کرتا ہو۔ اور رفتہ رفتہ بلا کسی خاص کوشش کے بہت سی ایسی باتیں جن کو اُن کے پیشیرووں نے سالہاسال میں حاصل کیا تھا اپنی روزانہ کی زندگی میں معلوم کرلیتا ہو چونکہ ہر ایک انسان کا دماغ اور قوتِ تخیّل ہر دوسرے شخص سے مختلف ہوتی ہو اس لیے یہ خیالات اُس کے دماغ میں ایک خاص اثر پیدا کرتے ہیں اور وہ بچہ ان سب خیالات سے ہزارہا مختلف طرح کی اور بہت سی باتیں اختراع کرتا ہو اور یہ سب مل کر اُس کو وہ تعلیم بہم پہونچاتے ہیں جو اس کی آیندہ زندگی کا زینہ ہوتی ہے۔ اس منزل کے بعد وہ بچہ ایک مکتب میں جاتا ہے اور وہاں اُس تعلیم کی جس کی ابتدا بچہ کے گہوارہ میں شروع ہوئی تھی تکمیل ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں اس قدر کثرت اسباب ہر طرف سے جمع ہو جاتے ہیں کہ اُن کا شمار کرنا بالکل احاطۂ امکان سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص کہ جس سے ملاقات ہوتی ہو اور ہر وہ شے جو نظر کے سامنے آتی ہو اور ہر وہ مضمون جو کتاب یا اور کسی ذریعہ سے کان میں پڑتے ہیں اور ان کے علاوہ و بے نہتا اسباب درشاہدے مل کر ہر وقت اثر ڈالتے رہتے ہیں اور احاطۂ خیال کی توسیع کرتے رہتے ہیں اور اس توسیع کی اہمیت اظہر من الشمس ہے کیونکہ انھیں خیالات اور ان کے ان اثر کی (جو فعل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں) شیرازہ بندی کا نام زندگی ہے۔ کوئی ایسا فعل انسان کی زندگی کا جس کے لیے وہ جواب دہ قرار دیا جا سکے بغیر وجود خیال قبل کے ظہور میں نہیں آسکتا اور اکثر تو ایسا ہوتا ہو کہ ایک خیال دماغ میں آیا اور فوراً قبل اس کے کہ انسان اس کے کرنے پر آمادہ ہو وہ فعل کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات انسان کو ایسی حرکتوں کے لیے شرمندہ ہونا پڑتا ہو اور اوقات قوتِ خیال اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ آدمی بالکل مجبور ہوتا ہو اور گو کہ وہ ایک فعل کرنا نہیں چاہتا لیکن پھر بھی اپنے آپ کو اُس کے کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اس قسم کی بیماری کا نام خبط سرقہ kleptomania ہو جس میں آدمی بلا خواہش اور ضرورت کے چوری کرنے لگتا ہو۔ ایک نہایت امیر آدمی جس کو اس قسم کی بیماری تھی پانچویں مرتبہ گرفتار ہونے پر اپنی حالت یوں بیان کرتا ہو کہ مجھے بالکل خبر نہیں کہ میں نے کیوں چوری کی۔ مجھے ایسا

معلوم ہوا کہ جب میں اس جوہری کی دوکان سے گذرا تو گویا کسی شخص نے مجھ سے یہ کہا کہ جاؤ اور جا کر ایک انگوٹھی چرا لاؤ۔ میں مجبوراً گیا اور جا کر چرا لایا۔ کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے کسی طرح آرام نہ ملتا۔

یہ وہ حالت ہے کہ انسان کے اوپر خیال حاوی ہو جاتا ہے اور اس کی قوت ارادی بالکل زائل ہو جاتی ہے لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا بلکہ جس وقت انسان کے دماغ میں کوئی خیال آتا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی قوتِ ارادی بھی کام کرتی ہے۔ اور اگر یہ مسئلہ طے پا گیا کہ یہ کام ہونا چاہیے تو اس وقت اس کا اثر فعل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کسی کام میں مشغول ہوں۔ شام کا وقت ہے۔ دل میں یہ خیال گذرا کہ چل کے سیر کرنا چاہیے۔ اگر یہ خیال اپنے آپ چھوڑ دیا جائے تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ میں فوراً کھڑا ہو جاؤں اور چلنے لگوں۔ لیکن رفتہ رفتہ خیال قبضہ میں آ جاتا ہے اور انسان پہلے خیال پر کوئی حرکت نہیں کرتا اس لیے میں نے پوچھنا شروع کیا کہ آیا میرا جانا مفید ہوگا یا مضر۔ اگر میرا کام نہایت ضروری نہیں ہے اور ملتوی کرنے سے بہت زیادہ ہرج نہ ہوگا تو غالباً میرے (سیر کے جانے والے) خیال کو تقویت ہو جائے گی اور میں اُٹھ کر چلتا ہوں گا۔ لیکن برخلاف اس کے اگر میرا کام ضروری ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ اگر اس وقت یہ کام نہ ہوا تو سخت ہرج ہوگا تو میرا پہلا خیال کمزور ہو جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ زائل ہو جائے گا۔ اسی طور سے نہایت اہم معاملات میں بھی جب کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی طور سے تقویت پاتا ہے یا کمزور ہو جاتا ہے۔ بلحاظ اس کے کہ اگر وہ ہمارے اس خیال کے مطابق ہے تو یہ مضبوط ورنہ کمزور ہوتا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس کو انگریزی میں Ideal self یا اپنا مطمح نظر کہتے ہیں اور اس کے معنی ہیں سب سے اچھا اپنا وہ تصور جو امکان میں ہے۔ ہر شخص کی ایک حیثیت ہوتی ہے اور وہ اسی حیثیت کے لحاظ سے اپنی زندگی کے تمام آئندہ ترقی اور بہبودی کا خیال قائم کرتا ہے۔ اس میں یہ لازمی نہیں کہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی بادشاہوں کا خواب دیکھے

اور جب تک تا عروج حاصل نہ ہو وہ اپنی زندگی کو کامیاب نہ تصور کرے۔ نہیں۔ بلکہ اس کے خواب اسی حیثیت کے ہوں گے جیسا وہ آدمی ہے۔ مثلاً ایک مزدور ہے جو صبح کو اٹھتا ہے اور اپنے کام میں سرگرم ہو جاتا ہے اور شام کو اپنی مزدوری لے کر آتا ہے اور نہایت قناعت سے بسر کرتا ہے اس کا اپنا مطمح نظر یعنی Ideal بھی ایسا ہی ہوگا یعنے اس کی خواہشات اور امیدیں محدود ہوں گی چند خیالات کے ساتھ جن کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فرض کیجیے اُس کی خواہش یہ ہے کہ وہ ایک جھونپڑا تیار کرے اور مع اپنے بال بچوں کے اس میں زندگی بسر کرے بس اس کی زندگی کی رہبری کرنے والا ستارا یہی خیال ہوگا۔ اور جتنی باتیں کہ اس خیال کی تکمیل میں مدد پہونچائیں گی وہ اس کی عین خوشی اور راحت کا باعث ہوں گی۔ برخلاف اس کے جتنی باتیں اس Ideal مطمح نظر کے پوری ہونے میں رکاوٹ پیدا کریں گی وہ اس کی نہایت رنج اور افسوس کا سبب ہوں گی۔ یہ ایک ایسا معیار ہے کہ اس پر مزدور سے لے کر جلیل القدر سلطان تک جانچے جا سکتے ہیں اور ہر شخص کی زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن اس قدر واضح رہے کہ یہ مطمح نظر Ideal کبھی منتقل نہیں ہوتا اور مثل اُس جگنو کے ہوتا ہے جو اندھیری رات میں چمکتا ہے متلاشی اس کی تلاش میں دوڑتا ہے اور جہاں وہ ایک دفعہ چمکا تھا وہاں پہونچ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھ گیا ہے۔ غرض یوں ہی اُس کی تلاش میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں کہنا پڑتا ہے کہ

"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ قوتِ خیال انسان کی زندگی کا ایک نہایت اہم اور غیر قابل تفریق جز ہے۔ اور اس اہمیت کی حد اس قدر ہے کہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ زندگی کا انحصار خیال پر ہے اور اگر خیال کی روانی رک جائے تو یہ علامت اس بات کی ہوگی کہ زندگی ختم ہو گئی کیونکہ جب تک روح جسم میں موجود رہتی ہے اس وقت تک کوئی نہ کوئی

خیال دماغ میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ خیال کبھی تو نہایت واضح اور صاف ہوتا ہے اور کبھی نہایت دھندلا اور ہلکا۔ مثلاً سونے میں خیال کی روانی نہایت ہلکی اور آہستہ ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ بالکل روانی باقی ہی نہیں رہتی مگر اکثر واقعات اور مشاہدات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ روانی بالکل بند نہیں ہوتی بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ ایک شخص کسی نہایت اہم معاملہ پر غور کرتا ہوا سو گیا اور جب اُٹھا تو وہ مسئلہ سوتے ہی میں حل ہو گیا تھا اور اُس کے حل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ خواب کا دیکھنا بھی بطریق ثبوت کے اس امر کی تصدیق میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور سب سے بڑا ثبوت اس بات کا کہ سلسلۂ خیال سونے میں بند نہیں ہوتا جو دیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے دو شخص زید اور بکر آپس میں باتیں کرتے ہوئے سو جاتے ہیں اور جب سو کر اُٹھتے ہیں تو زید زید کے خیالات کا سلسلہ قائم رکھتا ہے اور بکر بکر کے۔ اور گو کہ زید کو یہ یاد ہو کہ بکر سوتے وقت کیا سوچ رہا تھا اور بکر کو یہ معلوم ہو کہ زید سونے کے وقت کن خیالات میں غرق تھا لیکن ہر ایک یہ جانتا ہے کہ یہ دوسرے کا خیال ہے اور یہ اُس کا نہیں ہے۔ اب اس بات کی وجہ کہ زید اپنے خیال کا اور بکر اپنے خیال کا سلسلہ اُٹھا لیتا ہے سوا اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا تعلق اس زمانہ میں جو ظاہراً غفلت کا تھا ضرور موجود تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ کیوں بعض اوقات ایسا حادثہ نہ پیش آئے کہ زید بکر ہو جائے اور بکر زید۔

اب تک تو صرف قوّتِ خیال کی چند خصوصیات کا ذکر ہوا ہے لیکن اس کے ہمراہ اس کی وسعت کا تھوڑا سا بیان بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے ہرگز تذکرہ خیال مکمل نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس کا مفصل کرنا تو سخت دشوار بلکہ ناممکن ہے لیکن تھوڑا سا تذکرہ اس مقام پر بے موقع نہ ہو گا وہی خیال جس کی وسعت اس قدر ہے کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی اس قدر محدود بھی ہے کہ سوا اُن باتوں کے جن کو اس نے بذریعہ حسیات کے محسوس کیا ہے یا اُن کی مختلف ممکن ترکیبوں کے اور کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے

سونا دیکھا ہے اور پہاڑ بھی دیکھا ہے اس لیے سونے کے پہاڑ کا تصور گو کہ کبھی دیکھا نہ ہو لیکن ممکن ہے۔ برخلاف اس کے ایک شخص مربع اور دائرہ کی شکل کو جانتا ہے لیکن کسی ایسی شکل کا تصور کہ مربع اور دائرہ دونوں ہوں غیر ممکن ہے۔ اسی طور سے بڑے سے بڑا شاعر بھی کسی بالکل نئی بات کا تصور نہیں کر سکتا۔ شاعری کے معنی یہ نہیں کہ مثل مصوری کے ایک خیالی اور بے اصل چیز کی تصویر بغیر کسی نمونہ کے کھینچی جائے۔ بلکہ تخئیل شاعرانہ کی سب سے اچھی مثال موسائک مصوری Mosaic work کی ہوگی جہاں مختلف قسم کے پتھر جن پر طرح طرح کی شکلیں بنی ہوتی ہیں موجود ہوں اور شاعر کا کام یہ ہوتا ہے کہ ان پتھر کے ٹکڑوں کو مختلف طریقے سے لگا کر ایک شکل پیدا کر دے۔ شاعر کی بلند پروازی اور طاقت تخئیل اس طور سے بنی ہوئی شکل کے حسن اور جدت پر منحصر ہوگی۔ (شاعر کا) تخئیل اکثر دو طرح پر صورت گری کرتا ہے۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کسی دوسرے واقعہ کے ساتھ بوجہ ایک وقت میں واقع ہونے کے وابستہ ہو جاتا ہے اور جب پہلا واقعہ یا اُس کے کسی حصّہ کا دوبارہ ظہور ہوتا ہے تو وہ پہلا واقعہ پورے طور سے نگاہِ خیال کے سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً میں اپنا بکس کھولتا ہوں اور اُس میں میرے سامنے ایک چیز آ جاتی ہے جس کو میں نے کشمیر میں خریدا تھا۔ اس چیز کو دیکھتے ہی مجھے اکثر واقعاتِ کشمیر یاد آ جاتے ہیں اور بہت سی باتیں جن کو میں بھول گیا تھا پھر یاد آ آ کر نہایت لُطف پیدا کر دیتی ہیں۔ قوتِ شامہ کی طاقت اس طرح کے خیالات پیدا کرنے میں نہایت حیرت انگیز ہے جو خوشبو کہ ایک خاص حالت میں ناک میں آ چکی ہے اگر پھر سونگھی جائے تو وہ خاص موقع نہایت ہی شدت کے ساتھ چشمِ خیال کے سامنے آ موجود ہوتا ہے اور اکثر وہ جذبات بھی جو اس موقع پر محسوس ہوئے تھے عود کر آتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس وقت ایک شے کسی دوسری شے سے مشابہ ہوتی ہے اُس وقت اگر ایک چیز کا خیال آتا ہے یا وہ چیز سامنے آتی ہے اُس وقت اس کی مشابہ شے کا تصور بھی سامنے موجود ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں سڑک پر چلا جا رہا ہوں کہ یکایک مجھے ایک بہت عرصہ کے چھوٹے ہوئے

دوست کا خیال آتا ہے اور دل میں بہت سے پرانے اور بھولے ہوئے خیالات کا دریا موجزن ہو جاتا ہے۔ میں ٹھہر جاتا ہوں اور غور کرنے لگتا ہوں کہ آخر وہ کون سی شے تھی جس نے اس قدر ہیجان پیدا کر دیا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اتفاقاً اُس شخص میں جو ابھی میرے پاس سے گذرا اور میرے دوست میں کسی قسم کی مشابہت تھی۔ میرے سلسلۂ خیال نے اس طور سے کام کیا کہ میں نے اُس شخص کو دیکھا اور فوراً مشابہت کا اثر میرے دماغ پر ہوا جس سے مجھے اپنے دوست کا خیال پیدا ہوا اور اس خیال کے ساتھ ہی اور بھی بہت سی باتیں اور واقعات جو ہمارے درمیان میں پیش آئے تھے یاد آگئے۔ اور میرے خیالات میں اس قدر ہنگامہ برپا کر گئے۔ یہی وہ قسم تخیل کی ہے جس سے اکثر شعرا استفادہ اُٹھاتے ہیں اور اُن کی تمام شاعری کی بنا اسی پر ہوتی ہے جیسا میں پہلے لکھ رہا ہوں۔ ہر چیز کا اثر ہر دماغ پر مختلف ہوتا ہے اور بالکل دماغ کی کیفیت اور طبیعت پر منحصر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شاعر پانی برسنے کو دیکھتا ہے اور اسی کرشمۂ قدرت کو ایک عالم علم طبیعی بھی Scientist بھی دیکھتا ہے لیکن دونوں کے دماغوں پر اس کا مختلف اثر ہوتا ہے پس جو شخص کہ قدرتاً شاعر ہے وہ ایک مظاہر فطرت یا واقعہ کو دیکھ کر یا خیال کر کے اُس کی ایک تشبیہ تلاش کرتا ہے اور یہ تشبیہ اُس کا دماغ جو خلقتاً اس کام کے لیے موضوع ہوا ہے بہم پہونچاتا ہے۔ ایک شاعر آمدِ پیری کو اور سیاہ بال کے سفید ہو جانے کو نظم کرنا چاہتا ہے اس خیال کے ساتھ ہی اس کو سیاہیٔ شب اور روشنیٔ صبح کا بھی خیال پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی طبیعت شاعرانہ دونوں قدرت کے کرشموں کو یوں نظم کرتی ہے۔

کہتے ہیں زبانِ حال سے یہ موئے سفید   اُٹھ نور کا تڑکا ہے شفق پھولی ہے

اس قسم کے نمونۂ تخیل سے تمام دنیا کی شاعری بھری پڑی ہے اور ہر طرف اچھی اچھی تشبیہات موجود ہیں جو کہ صرف دماغ کی اس ایک خاص قوت کا نتیجہ ہیں۔ اسی قوت خیال کا انتہائی کرشمہ Hypnotism کہلاتا ہے جو زبانِ اردو میں مسمریزم کے نام سے

مشہور ہے اور جو مغربی ممالک میں بعض اوقات نہایت کامیابی کے ساتھ بعض مہلک امراض کے دفع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ مسمریزم کی وجہ تسمیہ اس علم کے بانی آسٹریا Austrian ڈاکٹر مسمر کے نام سے منسوب ہے۔ یہ غریب ڈاکٹر ۱۷۷۸ء میں پیرس پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو کچھ عرصہ تک فائدہ پہونچاتا رہا۔ لیکن بوجہ ناتجربہ کاری کے طریقہ علاج ابتدائً نہایت خراب تھا اور اس وجہ سے بہت زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اوائل میں مسمر نے ایک بہت کم روشن کمرہ میں چند کرسیاں ایک دائرہ میں رکھی تھیں اور بیچ میں ایک مقناطیسی طشت تھا۔ مریض کو کرسیوں پر بٹھلا کر ایسا آہنی تار دے دیا جاتا تھا جس کا اتصال طشت مذکور سے ہوتا تھا اور جس کو وہ اپنے جسم کے ہر حصہ سے ملا سکتا تھا۔ رقت لانے یا صرف اضطراب پیدا کر دینے کو مسمر اپنے علاج کا جزوِ ضروری خیال کرتا تھا۔ اور وہ خود زعفرانی جُبہ پہن کر اور ایک چوب ہاتھ میں لے کر سامنے آتا تھا اور مرض کے دُور ہو جانے کی تجاویز پیش کرتا تھا اور اپنی قوتِ خیال سے اکثر کامیاب بھی ہوتا تھا۔ مگر چونکہ یہ طرزِ علاج مشابہ بہ تسخیر ہو جاتا تھا اس لیے شکوک پیدا ہو گئے۔ اور ایک مجلس استفساریہ کی غیر مفید رپورٹ پر اس قابل قدر شخص کو پیرس کو خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن جو درخت اس نے علم کا اس نے لگایا تھا وہ اس قدر کمزور نہ تھا کہ صرف ایک غیر موافق ہوا کا جھونکا اسے جڑ سے اکھیڑ سکتا۔ اور گو تھوڑے زمانہ کے لیے اس طوفانِ بلاخیز نے اس کو انقلاب فرانس French Austrian کہتے ہیں اس نئے پودے کو پنپنے نہ دیا لیکن جیسے ہی وہ طوفان کم ہوا اور پہلا موافق ہواؤں کا جھونکا اسے لگا۔ یہ ہونہار پودا بڑھنے لگا۔ اور چونکہ اب وہ پُرانا فاسد خیال بھی دفع ہو چکا تھا اس لیے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی روز افزوں ترقی شروع ہو گئی۔

آج کل مسمریزم کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو مادیات سے اور دوسرا خیالات سے۔ پہلا طریقہ عمل میں لانے کے لیے کوئی چمکدار شئے آنکھوں کے قریب قائم کر دیتے ہیں اور معمول سے اُدھر

دیکھنے کو کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بالکل بے حس و بے ہوش ہو جاتا ہے اُس وقت ایسی باتیں کرتا ہے کہ اس کی شکایت دفع ہو جائے۔

دوسرا طریقہ خیالات سے عمل کرنے کا یہ ہے کہ معمول کو پہلے نہایت آرام کے ساتھ کرسی پر بٹھلاتے ہیں اور اسکے بعد خود عامل سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسی باتیں کرنا شروع کرتا ہے مثلاً "تمھاری آنکھوں میں غنودگی ہے تمھیں نیند آرہی ہے آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں" اس طرح سے چند منٹ کہنے سے غنودگی درحقیقت طاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی غنودگی میں جو بات معمول سے کہی جاتی ہے اس کا اثر اُس پر بہت جلد پڑتا ہے اور اس وجہ سے بیماری یا مرض آسانی سے دفع ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں معمول بالکل عامل کے کہنے پر عمل کرتا ہے اور اسکی قوتِ ارادی بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ اب میں ایک قصہ اس قوتِ خیال کی خاص قسم کا لکھ کر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک لیڈی ڈاکٹر مسمریزم کے پاس آئی جو بالکل عرض جنون کی سرحد پر تھی اور یہ خیال بجائے خود اُس کا جنون تھا کہ اُس کے رخسار میں چند دانے نکل آئے ہیں جو اس قدر ساری و متعدی ہیں کہ جو شخص قریب آتا ہے اُس پر اُن کا اثر پہونچ جاتا ہے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ وہ کسی عورت سے بات کر رہی تھی کہ اتنے میں اپنا ہاتھ اپنے گال تک کھجلانے کے لیے لے گئی۔ اس کے بعد اُسے یہ خیال ہوا کہ اسی کے باعث سے ہُوا۔ اس کے دماغ میں اتنا راسخ ہو گیا کہ اس نے جس شخص کو چاہے سو گز کے فاصلہ پر کیوں نہ ہو اپنا ہاتھ گال پر لے جاتے دیکھا کہ بس یقین ہو گیا کہ وہ خود اس کی بانی ہے۔ ڈاکٹر نے عرصہ تک اُس سے باتیں کیں اور اُسے یہ یقین دلا دیا کہ یہ خیال اُس کا بالکل غلط ہے کیونکہ ہزارہا آدمیوں سے وہ ملتی ہے اور کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اُس کی حالت اچھی ہو گئی اور جنون میں بہت کچھ کمی ہو گئی۔ لیکن دو ہفتے گذرنے پر وہ واپس آئی اور اس مرتبہ اُس کی حالت اور خراب ہو گئی تھی اور وہ خیال بہت زیادہ قوی ہو گیا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر نے مسمریزم سے علاج کرنا تجویز کیا

چند مرتبہ اُس پر مسمریزم کیا اور بیہوشی کے عالم میں اُس کے خیالات کو قبضہ میں لانے کی تجویزیں پیش کیں۔ اسی حالت میں اُس سے یہ بھی کہا گیا کہ اُس کا خیال کس قدر بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اس مرض کا اثر کسی شخص پر جس سے وہ ملتی ہے نہیں ہوتا۔ اس علاج کے بعد اس کی وہ جنون کی حالت بالکل جاتی رہی اور خیالات قبضہ میں آگئے اور اپنی حالت وہ یوں لکھتی ہے کہ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ اور اب صرف یہ حالت ہے کہ وہ پرانا خیال بالکل دُور ہو گیا ہے بلکہ میرے خیالات اس قدر میرے قبضہ میں ہیں کہ اگر میں چاہوں تو اپنے کام میں مشغول ہونے کے لیے لطیف خیالات کو بھی دفع کر سکتی ہوں۔

یہ ہیں خیالات کی قوت کے چند نمونے۔

علی ظہیر بی اے

دلِ ناداں کی ہوس کاریوں سے کیا ہوگا
اُس کو منظور جو ہوگا وہی اچھا ہوگا

شادیِ وصل و غمِ ہجر میں لکھنے کے لیے
جب دوئی ہوگی تو ہر حال میں رونا ہوگا

غیر اپنا ہو کسی طرح سے۔ ممکن ہی نہیں
تفرقے لاکھ پڑیں غیر نہ اپنا ہوگا

آفتاب آ گیا سر پر تو ہیں پھر ایک کے ایک
گو گھڑی بھر کو جدا جسم سے سایا ہوگا

عارضی فصل ہے تمہیدِ وصالِ جاوید
قطرہ سَو گردشوں کے بعد بھی دریا ہوگا

ذرّہ ذرّہ میں وہی شکل نظر آئے گی
عشق گر سرمہ کشِ چشمِ تماشا ہوگا

محفل آرائے تصور مری غفلت ہو گی
چشم سربند۔ مگر دیدۂ دل وا ہوگا

اُس کا عشرت کدہ ہوگا دلِ تیر نگاہ سا ہی
اُس کا خلوت کدہ۔ آغوشِ تمنا ہوگا

عکس جس طرح سے ہے شخص کی ہستی کی دلیل
قیس اک آئینۂ صورتِ لیلا ہوگا

پھونک دے گی خس و خاشاک ہوس برقِ جمال
نیّرِ چرخِ وفا داغِ سویدا ہوگا

ہو گا حائل نہ حجابِ من و تو گر فنا من
جلوہ گر رابطۂ صورت و معنا ہوگا

ماتم کیسر

دیکھتے دیکھتے محفل ہوئی درہم برہم — رنگِ عشرت نہ رہا۔ چھا گیا رنگِ ماتم
لب پہ ہے آہ و فغاں دل میں غم و درد و الم — وقفِ عزا دہیں زندانِ قدح نوش بہم

نہ صراحی ہے نہ ساغر ہے نہ پیمانہ ہے
اُٹھ گیا ساقیِ محفل یہی افسانہ ہے

دل یہ کہتا ہے کہ نالہ کریں فریاد کریں — آہ کی طرز جو موزوں ہو وہ ایجاد کریں
ہے بجا پیروی خاطرِ ناشاد کریں — مرنے والے مرے رو رو کے تجھے یاد کریں

ظلم ڈھایا تجھے صیادِ اجل نے مارا
ساتھ تیرے ہمیں صیادِ اجل نے مارا

آج سنسان ہیں ویرانہ و گلشن دونوں — قصر امیروں کے غریبوں کے نشیمن دونوں
آج ہیں وقفِ الم شیخ و برہمن دونوں — آج ماتم کدہ ہیں دہلی و لندن دونوں

گلشنِ دہر میں ہنگامۂ محشر دیکھا
جس طرف آنکھ اُٹھی ماتمِ کیسر دیکھا

ہم کو پہونچی نہ خبر بھی تری بیماری کی — اس قدر جلد عدم کے لیے تیاری کی
ظاہرا بات تو کوئی نہیں بیزاری کی — ملک نے بھی تری تسلیم وفاداری کی

مایۂ نازشی ہر طرح ہمیں ذات تری
قوم سے پوچھے کوئی مرگِ مفاجات تری

ہاں سُنا ہم نے کہ تو کچھ بھی تو بیمار نہ تھا — موت آزار بنی خود۔ کوئی آزار نہ تھا
خبرِ بد کے لیے دل مرا طیار نہ تھا — برق تھا ہائے تری موت کا یہ تار نہ تھا

خرمنِ حسرت و ارماں کو جلایا اس نے

اپنی ہستی کا کرشمہ یہ دکھایا اس نے

فوجِ انگریز کو تیرے لیے نالاں دیکھا　　ہر مسلمان کو ہندو کو بھی گریاں دیکھا
جنرلوں کو بھی وہاں سر بگریباں دیکھا　　عرصۂ جنگ نہیں حشر کا میداں دیکھا

صفِ افواج بھی بن کر صفِ ماتم نکلیں
ماتمی ہاتھ میں اپنے لیے پرچم نکلیں

کوئی طوفاں نہ تھا - ہو جو سمندر کی خطا　　راستہ ٹھیک تھا کیونکر کہیں رہبر کی خطا
دشمنِ بد گہر و غیرِ ستمگر کی خطا　　یا تو کہیے اسے اپنے ہی مقدر کی خطا

چل دیے سوئے عدم روس کو جاتے جاتے
دیر کچھ بھی نہ لگی موت کو آتے آتے

بحرِ غم میں ترے غرقاب سمندر دیکھا　　دامنِ آبِ رواں آنسوؤں سے تر دیکھا
تیرے ماتم میں ہر اک موج کو مضطر دیکھا　　ساحلِ خشک سے ٹکراتے ہوئے سر دیکھا

آج طوفان اُٹھائے نہ صبا - خیر کرے
بلبلے پھوٹ کے روتے ہیں خدا خیر کرے

نام کیا قوّتِ بحری کا اُچھالا تو نے　　پھر میں کہتا ہوں کہ برطانیہ عظمیٰ تو نے
امتیاز اور شرف خوب ہی بخشا تو نے　　کس نے دریا کو بنایا ہے یہ دریا - تو نے

بے سبب بحر کا یہ رنج نہیں جوش نہیں
اس سے ثابت ہے کہ احسان فراموش نہیں

غم نے چھینی ہے مری تاب و توانائی بھی　　باسط اب بیٹھ گیا ہے دل سودائی بھی
تنگ کرتی ہے مجھے قافیہ پیمائی بھی　　ساتھ دیتی نہیں کچھ قوتِ گویائی بھی

غم سے بے خود میں ہوا - عالمِ مدہوشی ہے
غیرتِ حسنِ تکلم مری خاموشی ہے

باسط بسوانی

جدید دوستی

مانئے یا نہ مانیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیائے جدید کی کینچلی اُترنے کے ساتھ قریب قریب کُل معتقدات، مفروضات، توہمات، اور نظریات - علیٰ قدر مراتب - نئی روشنی کی نئی شعاعوں سے جگمگا اُٹھے ہیں! طرزِ معاشرت ہندوستانِ جہالت نشان میں بدقسمتی سے ۱۹۱۶ء میں زبردستی ۱۹۱۶ء کا قائم رکھا جاتا ہو، لیکن پھر بھی تہذیب یافتہ دل و دماغ اور ترقی پذیر طبائع روز بروز المضاعف ہوتی جاتی ہیں! خدا توفیق نیک دے تو اکثر منچلے نئے خیالات کو عمل کی صورت میں لانے میں بھی تامل نہیں کریں گے!

تمام خیالاتِ جدید کی فہرست الف سے "ی" تک بیان کرنا نہ میرا مقصود ہے اور نہ اس سے کوئی فائدہ! حضرتِ دل کی رام کہانیوں سے سینکڑوں دیوان اور ہزاروں مثنویاں رنگی پڑی ہیں۔ مگر آج کل یہ حضرت بھی اس درجہ کاروباری چیز بن گئے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے! "دل آنا" اسی لحاظ سے نہایت سائنٹیفک بزنیس۔ یا حکمت آمیز بیوپار۔ ہو گیا ہے! نقدِ حُسن جس آزادی اور خوش اسلوبی کے ساتھ آئے دن پرکھی جاتی ہے۔ اور معاملے سے پہلے کھرا کھوٹا سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ بھی ان ہی حضرت کی نئی رفتارِ عشق کے اصولوں پر مبنی ہے! پہلے یہ تخیلِ دماغی کے بَل پر آتے تھے لیکن اب آپ کی نقل و حرکت بجلی سے چلنے والی گاڑیوں پر ہوتی ہے! آتے آپ اب بھی ہیں لیکن اب آپ کا آنا اور جانا۔ سب کچھ۔ محض سطحی ہوتا ہے "بسمل و نیم جاں ہونا" "فرقت میں بیتاب ہونا" اور ایسی ہی تمام استقلالِ جذبات سے پیدا ہونے والی حرکات ضابطۂ تعشقِ جدید کی رُو سے کمزوریِ اخلاق کی مترادف اور قابلِ نفرت سمجھی جانے لگی ہیں!

اسی سلسلہ میں محبت کا نقشِ اولیں۔ دوستی۔ بھی اس قطع و برید سے نہ بچ سکا! دوستی

ایک ایسی چیز بن گئی جس کی تعریف ۔ کم از کم میرے دماغِ بوسیدہ میں باوجود کوشش و تجربہ کے کہیں نظر نہیں آتی! "دوست" کو ایرانی شعرا معشوق کے معنی میں ضرور استعمال کرتے آئے ہیں لیکن ہندوستان کی حدودِ اربعہ کے اندر دوست و معشوق میں زمین آسمان کا فرق برابر قائم رہا: میری عقل اگر غلطی نہیں کرتی تو "دوست" کا اطلاق ہمیشہ ہمدم اور خصوصاً طبقۂ ذکور تک محدود رہا! لیکن "بیک گردشِ چرخِ نیلوفری + نہ نادر بجا ماند و نے نادری": نئے زمانہ کے ساتھ "دوست" کا اطلاق صرف صنفِ نازک کے ایسے پاک نفوس تک محدود ہو گیا جو جوان اور دلکش ہونے کے ساتھ ہی دوست نوازی پر اچھی خاصی حد تک مائل ہوں! تہذیب یافتہ دنیا کے سیاح آپ کو روزمرہ کے مشاہدات سے آپ کو اچھی طرح مطمئن کر سکتے ہیں! اب رہا وہ دوستانہ جو طبقۂ ذکور سے تعلق رکھتا ہے: اس کی نسبت بھی بہت کچھ رد و قدح ہو اگر تعلیم و تعلّم کا زمانہ بھی شامل کر لیا جائے، مگر اس کو محض آپ کے انقباضِ طبع کے خاطر چھوڑ بھی دیا جائے تو بھی "دوست" ایک عجیب و غریب ہستی نظر آتا ہے! فی الحقیقت "دوستی" کی اقلیمِ جدید کے حدودِ اربعہ خود غرضی، مطلب پرستی، خود نمائی، اور وقت پرستی کے سوائے اور کچھ نہیں معلوم ہوتے! "دوستی" اب ایسی چیز نہیں ہے جس کا مستقل اثر موت و زیست پر حاوی ہو: زبان سے اگرچہ بعض کہنے والے اب بھی خدا کے بعد۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔ دوست کا مرتبہ بیان کرتے ہیں لیکن عمل میں دوستی کی جھول نہایت آسانی کے ساتھ ۔ حسبِ ضرورت ۔ اُوڑھی اور اُتاری جا سکتی ہے! اتحادِ ثلاثہ اور ائتلافِ ثلاثہ کا دوستانہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ غور کیجیے اور سمجھیے! جرمنی کی روشِ جدید نے تعلقاتِ خوش گوار اور معاہداتِ ارتباط آمیز کو ایسا ناقابل ثبات بنا دیا ہے جیسا ۱۷ اِنچ کی توپوں نے سنگین سے سنگین قلعہ کو! امید کی جاتی ہے کہ موجودہ جنگ عظیم الشان کے بعد "دوستی" کی تعریف صاف الفاظ میں کر دی جائے گی اور غالباً اُسے کسی قدر مضبوط اور دیرپا بنیادوں پر کھڑا کیا جائے گا! لیکن تاریخ کہتی ہے کہ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"! بہرحال مان لیجیے کہ موجودہ جنگ دشمنی پر نہیں بلکہ جدید دوستی پر مبنی ہے اور اسی کے خاطر لڑی جا رہی ہے!

دائرۂ تخیلات کو محدود کیا جائے تو میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ دوست کی تعریف کیا ہو؟ سُنا جاتا ہے کہ اگلے وقتوں میں ایک خود مختار بادشاہ کو اپنی تمام عمر کی کوشش سے صرف ڈھائی عدد دوست میسر آسکے تھے اور اِس پر اُسے مرتے وقت تک ناز رہا؛ آج کل اگر آپ کی تنخواہ ڈھائی سَو ہے تو بلا مبالغہ ڈھائی سَو نئے دوست ہر چوبیس گھنٹے میں بہ آسانی آپ کو مل سکتے ہیں اور پھر بھی آپ کو کوئی افتخار نہیں ہوتا! واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم کی معاشرت ایسی بنجر زمین تھی جس میں دوستی کی کاشت سخت محنت و دقّت کے ساتھ ہو سکتی تھی، اور نوخیز پودہ اگر برابر راست بازی و یکرنگی سے نہ سینچا جاتا تو کبھی بارآور نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن آج کل آب و ہوا کی موافقت کے زیرِ سایہ "دوستی" ایک خودرَو چیز ہو گئی ہے جو برسات کے پہلے چھینٹے کے ساتھ بلا ارادہ و کوشش خود بخود پھوٹ آتی ہے اور اسی طرح تھوڑی سی تمازتِ آفتاب کے ساتھ جہاں سے آئی تھی وہیں پہنچ جاتی ہے!

سچ تو یہ ہے کہ موجودہ دنیا۔ مادّی دنیا ہے اور تخیلات کی بیخ کنی اس کا فرض ہے! مادّی حیثیت سے وہ کاروباری تعلقات جن کو آج کل دوستی کہا جاتا ہے زیادہ قابلِ عمل اور آرام دہ ہیں! مقصدِ حیات مسرت ہے اور بس! کوئی وجہ نہیں کہ دوستی کی چادر ایسی زبردست ہو کہ مسرت میں خلل ڈالے؛ خواہ مخواہ "غم؛ داری بز بخر" اپنی ہستی کے سوا کسی دوسرے کی خاطر جنجال مول لیا جائے! میں ہی نہیں۔ تمام عقل سے معمور دماغ اسی بیوپاری تعلقات پر کاربند ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ عملی دنیا اس ترقی کو علیحدہ کر دے تو یقین کیجیے معاشرت کی کم و بیش آدھی رونق آج سے ایک صدی پرانی ہو جائے گی!

میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو، میرے ایک عنایت فرمانے۔ چند روز کا عرصہ ہوا۔ مجھے دوستی کی صحیح تعریف الفاظ میں سمجھائی تھی اور عمل سے بھی بتائی تھی! میری محدود معلومات میں اس تجربہ سے جس قدر اضافہ ہوا ہے اُس کے شکریہ کے مستحق وہی عنایت فرما ہیں! اُن کے اکثر الفاظ بہ تغیرِ خفیف۔ بالکل بجا اور درست تھے؛ کم از کم میں اُن کا ہم خیال اور ہم نوا ہوں!

وہ فرماتے تھے کہ "دوست وہ ہے جو دوست کے ساتھ کبھی کسی قسم کا مذاق نہ کرے اور شریف شخص دشمن کے ساتھ بھی مذاق نہیں کرتے" یہ سنتے ہی مجھے تو بیحد ہنسی آئی تھی۔ لیکن اب میں اسے صحیح سمجھتا ہوں: دوسرے حصّہ کو چھوڑنا پڑتا ہے اور محض اس لحاظ سے کہ اُس کی وجہ سے "شریف" کی نئی بحث چھڑ جائے گی!

دوست گویا۔ جہاں تک میں اس تعریف کے لحاظ سے تصور کرتا ہوں۔ نہایت ہی خاموش، روکھی، مطلب سے مطلب رکھنے والی، اور بسورتی ہوئی صورت نظر آتا ہے! لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج سے کئی صدی پیشتر حکیم شیراز نے بھی یہی فرمایا تھا۔

"دوست آں باشد کہ گیرد دست دو + در پریشاں حالی و در ماندگی"

..... قطع کلام ہوتا ہے اس کا ترجمۂ منظوم جو ایک عنایت فرمانے کیا ہے سننے کے قابل ہے، مصرعۂ اولیٰ مصرعۂ ثانی سے اس قدر چپاں ہے کہ اگر آپ دونوں کے درمیان میں سانس لینے کے لیے بھی ٹھہر جائیں تو سامعین خدا جانے کیا کر گذریں۔ ملاحظہ ہو ۔

دوست وہ ہووے جو پکڑے دوست کا + ماندگی میں اور پریشانی میں، ہاتھ!"

...... خیر، اس قدر تو صاف ظاہر ہے کہ سعدیِ شیرازی نے بھی کہیں بیان نہیں فرمایا ہے کہ دوست دوست کے ساتھ مذاق بھی کر سکتا ہے! اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ "پھر کیا دشمن مذاق کے لیے سمجھا جائے"؟ ہر بات پر رد و قدح کرنا جہالت ہے۔ اس لیے صرف سنیے اور مانیے! شریا دری صاحبان نجات بھی اسی اصول پر مبنی بتاتے ہیں!

اپنی تضئیع اوقات اور آپ کی دماغ خراشی کے بعد سوچتا ہوں کہ دوستی کیا ہے تو پھر ہنوز روز اول" کچھ نہ سمجھ سکتا ہوں نہ بیان کر سکتا ہوں! معلوم ہوتا ہے کہ دوستی بھی زمین کی طرح گول ہے۔ جہاں سے چلے۔ بلا کسی موڑ توڑ کے اُسی جگہ آگئے! اور یہ دوستی کا دل جسیم آفتاب مطلب پرستی کے گرد چکر کھاتا ہے۔ ۳۶۵ دن میں اس کا طواف پورا پورا تم ہو جاتا ہے اور ہر چوبیس گھنٹہ میں ایک گردش "خودنمائی" کے محور پر بھی ہوتی رہتی ہے!

اب تو معلوم ہوا کہ دوستی کیا ہے؟ .... آپ سمجھے ہوں تو سمجھے ہوں لیکن میں خود اگر مطلق بھی سمجھا ہوں تو خدا سمجھے !!!

سلطان حیدر جوش

رازونیاز

کیا عشق سے باز آئیں گے ہم ۔ اس کی تو قسم نہ کھائیں گے ہم
ہاں ضد یہ یہ کر دکھائیں گے ہم ۔ اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

پوچھیں گے نہ اب کہ کیوں خفا ہو ۔ اچھا، نہیں بولتے ، نہ بولو
ہم بھی ہیں غیور یاد رکھو ۔ دل دے کے اک اور لالہ رُو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

دل ہوگا جو زندگی سے عاری ۔ بہلائیں گے کرکے آہ وزاری
چھوڑیں گے نہ پاس وضعداری ۔ گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

آنکھوں میں بھر آئیں گے جو آنسو ۔ پی جائیں گے دیکھ کر ہر اک سُو
بالغرض کسی دن اے جفا جُو ۔ گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تُو
مُنھ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

جو کچھ کہ بھی گذرے صدق واللہ ۔ در سے ترا اُٹھا ہی لیں گے بستر
تیری ہی قسم مگر ستمگر ۔ تجھا نہ چیں سہی ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

صدق جائسی

نثرِ اُردو

اُردو کی تاریخ پر نظر کرو اور دیکھو کہ قدرت نے اس فصیح و شیریں زبان کو عربی، فارسی اور ہندی وغیرہا کے اختلاط سے کیونکر پیدا کیا۔ کیا کیا اس کی زندگی کے اسباب جمع کیے اور کیسے کیسے اس کی تربیت و ترقی کے وسائل بہم پہونچائے کہ باوجود طرح طرح کی مخالفتوں اور رُکاوٹوں کے جو اس کے ننھیال والوں یعنی ہندوؤں کی طرف سے ہوتی رہی ہیں؛ آج اس درجہ پر پہونچی اور یہ رتبہ پایا کہ ایک مُلک کی مستقل زبان قرار پائی اور اس کے سایۂ عاطفت میں تصنیف و تالیف پرورش پانے لگیں۔

اُنیسویں صدی سے کچھ پہلے اس کا (تصنیف و تالیف کا) آغاز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس حد کو پہونچ گئی کہ آج اس کی کُل کتابوں کی فہرست طیار کرنا ایک ناممکن فعل ہوگیا۔

اگر اس کی ترقی کی یہی رفتار رہی (اور انشاءاللہ العزیز رہے گی) تو اُمید قوی کیا، بلکہ یقین کامل کہہ سکتے ہیں کہ آگے چل کے ایک نہ ایک دن میں یہ علمی مجلس میں کسی ممتاز مقام پر جلوہ گر نظر آئے گی۔ اور دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں گنی جانے لگے گی۔ اگر آج سے سو برس پہلے رفتارِ ترقی کی یہی حالت ہوتی جو اب ہے تو یقین ہے کہ اُردو اس وقت السنۂ علمیہ میں شمار ہونے لگتی۔ مگر افسوس! کہ ایشیائی سست رفتاری نے ترقی کا موقع نہ دیا بلکہ خوابِ خرگوش میں مبتلا رکھا

"کُل امر مرہون باوقاتہا"

ہر چیز کی ابتدا بالکل خفیف اور ایسی معمولی ہوتی ہے کہ اُس وقت اس بات کا سان گمان تک نہیں ہوتا کہ آیندہ یہ کسی شمار و قطار میں ہوجائے گی، لیکن جب وہ کسی حد تک نشو و نما پا جاتی ہے تب لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی ہیں اور اُس کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ اس نیچرل قاعدہ کے موافق اُردو کی ابتدا بھی ایسی ہی خفیف تھی۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری

کے وقت میں اس کی ابتدا ہوئی مگر اس وقت کس کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ مسلمانوں کے تسلط سے ایک نئی زبان پیدا ہوگی اور ترقی کرکے علمی زبانوں کے ہمپایہ وہم پلہ ہو جائے گی ؟۔ علاوہ بریں "اُردو" کے لفظ ہی کو لیجیے، اس کے لغوی معنی اور وجہ تسمیہ پر نظر کر لیجیے کہ اس کی ابتدا کیسی معمولی اور "تنکے کی اوٹ پہاڑ" تھی۔

"اُردو" ترکی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی "بازارِ لشکر" کے ہیں۔ جاہل سپاہی جو مختلف الاقوام ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبان سے بالکل ناواقف اور ناآشنائے محض تھے، خرید و فروخت کے وقت رفعِ ضرورت کے لیے کچھ اپنی اور کچھ دوسروں کی زبان کے الفاظ سے (جن کے معنی باہمی بود و باش کی وجہ سے جان گئے تھے) اپنے مافی الضمیر سے مخاطب کو آگاہ کرکے لین دین کر لیتے تھے اس لیے اس "آدھا تیتر آدھی بٹیر" بات چیت اور عربی، فارسی، ہندی وغیرہ کی بےمیل کھچڑی کا نام "زبانِ اُردو" (بازارِ لشکر کی زبان) پڑ گیا۔ پھر "زبان" کی بھی تخفیف ہوگئی اور صرف "اُردو" ہی "اُردو" رہ گیا۔[ع]

خیال کیجیے کہ اس ابتدائی حالت میں کسے یہ خیال ہوا ہوگا کہ اس "آدھے تیتر آدھے بٹیر" سے شعر و شاعری کا رنگین طاؤس پیدا ہوگا اور اس کھچڑی کے دامن میں تصانیف کا پلاؤ و دم ہوگا۔

مدتوں تک کس مپرسی کی حالت رہی اور اس ہونہار پودے کی طرف کسی نے ذرا بھی توجہ نہ کی کہ "ہے کس کھیت کی تھبوی"۔ لیکن قدرت اپنے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ایک غیر محسوس طریقے سے اس کا نشو و نما کرتی رہی۔ یہاں تک کہ امیر خسروؒ کا زمانہ آیا۔ آپ کو یہ بےمیل بہت پسند آئی۔ اور کچھ ایسی بھائی کہ "خالق باری" اور غزلیں وغیرہ کہہ کے ایک نئی

[ع] اُردو کا ایک اور نام بھی ہے "ریختہ"۔ اسے ریختہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مختلف زبانوں کے پریشان و پراگندہ الفاظ جمع کرکے بنی ہے۔ متقدمین اس کو اس نام سے نام سے یاد کرتے تھے۔ سودا۔
ع شعرِ ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ۔ اس ریختہ کی مادہ ریختی ہے جو سید انشا کی ظرافت آگیں طبیعت کی ایجاد ہے ۱۲۔

شاخ لگائی اور اس میں مقبولیت کے پھول کھلائے۔

پھر رفتہ رفتہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کا قدم آگے بڑھتا گیا اور یہ عہد بعہد ترقی کرتی گئی۔ خصوصًا اکبری عہد میں بہت فروغ ہوا، اُردو ٹکسال کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا ایک حد تک درست ہے کہ "اکبر کے زمانہ میں اُردو کا سنگِ بنیاد رکھا گیا"۔ ہندو مسلمانوں کے میل جول اور باہم شیر و شکر ہو جانے سے مال و دولت کی طرح اُردو کے خزانے بھی خوب پُر ہوے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح اکبری دَور اور چیزوں کے لیے مبارک تھا اُسی طرح اُردو کے واسطے بھی ہمایوں تھا۔ اس کے بعد جہانگیر کے زمانہ میں تو اُردو کی گاڑی اپنی معمولی رفتار سے چلتی رہی اور کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ شاہجہانی دَور جب آیا تو اُردو کے لیے مبارک و سعید ہو کے آیا۔ اکبر کی مستحکم کی ہوئی بنیادوں پر محل بنے، بُستاں سرا طیار ہوے اور اُردو، ترقی کے دو منزلے سہ منزلے پر پہونچ گئی۔ آخر کو یہ علو مرتبہ حاصل ہوا کہ شاہجہانی دربار سے اردوعہ معلّی کا خطاب پایا۔

عالمگیر کے زمانہ میں وَلیعٖہ نے (جن کو نظمِ اُردو کا باوا آدم کہا گیا ہے) اُردوے معلّی کو نظم کا چست لباس پہنایا اور اس جال میں ایسا مسخر کیا کہ ایک زمانہ دراز تک اس چار دیواری

عہ ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آباد" آباد کر چکنے کے بعد شاہجہاں نے اُردو کو یہ خطاب دیا ہے۔ میر یحییٰ کاشی نے اس کی کیا خوب تاریخ کہی ہے ؎ شد شاہجہان آباد از شاہ جہاں آباد۔

عٖہ وَلی دکنی اُردوے معلّی کا پہلا شاعر مانا گیا ہے۔ مگر سر سید نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں اس سے اختلاف کیا ہے۔ فرماتے ہیں "اگرچہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس زبان میں (اُردوے معلّی میں) وَلی نے شعر کہا ہے مگر خود وَلی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی نے اس زبان میں شعر کہا ہے۔ کیونکہ اسکے شعروں میں اور شاعروں کی زبان پر طنز ہے"۔ لیکن اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ وَلی سے پہلے اور بھی شاعر تھے بلکہ جن پر طنز ہے وہ اُسی زمانہ کے شاعر اور وَلی کے ہمعصر تھے۔ اور اُردوے معلّی میں وَلی سے کے بعد اُنھوں نے شعر کہنا شروع کیے ہیں۔ جیسا کہ آزاد مرحوم کا بیان ہے۔" اپنے ہمعصروں پر چوٹیں کی ہیں"۔ ۱۲

کے باہر قدم نہ رکھ سکی، ایشیائی عورتوں کی طرح اس پردہ میں منہ چھپائے رہی لیکن تا کجا بقول

نکوروتاب مستوری ندارد چو در بندی سر از روزن بر آرد

انیسویں صدی سے پہلے تو کبھی کبھی اس پردہ سے منہ نکال کے جھانک لیا کرتی تھی مگر جب انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے۔ انگریزی تعلیم اور اُس کے ساتھ ساتھ آزادی و روشن خیالی پھیلنے لگی پھر تو یہ کھُل کھیلی "اندھا کیا مانگے؛ دو آنکھیں۔ قیدی کیا چاہے؟ رہائی۔" "اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ"۔ ابھی پردہ کا ایک مخالف بھی نہیں پیدا ہوا تھا کہ یہ اُس کو طلاق دے دلا، نثر کے میدانوں میں ہوا کھانے لگی۔

کہاں کا پردہ، کہاں کا جھگڑا؟ اُٹھاؤ اسکو، مٹاؤ اسکو

ولی کے اخلاف نے اُردو کو "اُردوئے معلیٰ" ہی بنا دیا۔ خوب خوب دادِ سخن دی۔ اور پھر تو یہ "ہر کہ آمد برآں مزید کرد" کا سلسلہ قائم ہوگیا۔

مولانا آزاد مرحوم کی رائے کے موافق غالباً ۱۷۳۱ء (۱۱۴۴ھ) تک اُردو بلا شرکتِ غیرے شاعروں کے مِلک و تصرف میں رہی اور انھیں کے مشغلۂ طبع آزمائی میں رہی۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی اور کوئی کتاب اُردو میں لکھی گئی ہو مگر امتدادِ زمانہ نے یا یوں کہیے کہ ہماری غفلت نے اس کا نام تک بتانے سے دریغ کیا ہو۔

۱۷۳۲ء (۱۱۴۵ھ) میں فضلی تخلص ایک صاحب نے دہ مجلس لکھ کے نثر نگاری کا دروازہ کھولا[۵] کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔

سودا نے میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو نثر میں لکھ کے اس کی (نثر اُردو کی) عزت افزائی کی۔

---

[۵] اس نام کی ایک کتاب مولوی عبد الحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے سید حیدر بخش حیدری کی تصانیف میں گنائی ہے۔ اور اس کا دوسرا نام "گلِ مغفرت" بتایا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک فضلی کی ایک حیدری کی۔ واللہ اعلم بالصواب منہ ام الکتاب۔

۱۱۹۵ھ میں میر عطا حسین صاحب تحسین متوطن اٹاوہ نے امیر خسروؒ کی "چہار درویش" کا ترجمہ کیا اور "نوطرزِ مرصع" نام رکھا۔

اٹھارویں صدی تک تو یہ دو تین کتابیں "خون لگاکے شہیدوں میں داخل" کے طور پر برائے نام اُردو میں لکھی گئیں جو نظم کے آگے نہ کسی شمار میں نہ قطار میں۔ لیکن اُنیسویں صدی کا شروع ہونا تھا کہ نثرِ اُردو کی قسمت جاگ اُٹھی۔

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں کی طوائف الملوکی نے ان کا اقتدار دن دونا رات چوگنا بڑھانا شروع کیا آخر کو بہت جلد سارے ہندوستان پر چھاگئے یہ بڑے نظرباز تھے، فوراً تاڑ گئے کہ یہ ہونہار، ملنسار زبان اعلےٰ سے اعلےٰ ترقی کی پذیرائی رکھتی ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کرنا بڑا ظلم ہے۔ "استعدادِ بے تربیت دریغ است و تربیت نااستعد ضائع" اور صرف اسی خیال سے نہیں بلکہ اس میں اُن کے مصالح بھی تھے۔ کیونکہ ہندوستان کے تمدن، معاشرت اور رسم و رواج سے آگاہی حاصل کرنے کا آلہ، اور یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں داخل ہونے کا ذریعہ یہی اُردو بن سکتی تھی۔ جب یہ تھا تو بس پھر کیا تھا، اُردو کے حامی بن گئے۔ اپنا فائدہ، مُلک و زبان پر احسان سوا الگ" ایک پنتھ دو کاج" زمانہ اِن کے ساتھ، گردشِ فلک ان کے موافق۔ پھر یہ جس کی مدد کریں وہ کیوں نہ کامیاب ہو، اور جس بات کی یہ خواہش کریں کس لیے نہ پوری ہو۔ اُردو پر ان کی توجہ ہوتا تھی کہ نثر نگاری کا راستہ کھُلا اور شارع عام بن گیا۔ فورٹ ولیم کلکتہ میں حامی اُردو جان گلگرسٹ صاحب نے ایک محکمہ کھولا جس کا مقصد وہی تھا۔ یعنی انگلستان کے نو وارد انگریزوں کی اُردو تعلیم، یہاں کی بود و باش، طرزِ معاشرت اور آدابِ اخلاق سے واقفیت پیدا کرنا اور مہذب سوسائٹی میں داخل ہونے کے قابل بنانا۔

اس محکمہ نے دہلی اور لکھنو کے مشہور العصر شعرا اور ادبا کو معقول تنخواہوں پر بلوا بلوا کے فخرِ روزگار اصحاب کا ایک گروہ کلکتہ میں جمع کر لیا تھا۔ ان حضرات سے حسب منشاء اپنے مقصد کے موافق کتابیں لکھوائیں۔ جن میں میر امّن دہلوی کی کتاب "باغ و بہار" سب سے بہتر اور مشہور تر ہے

اس محکمہ نے جو جو کتابیں لکھوائی ہیں، یہاں ہم مختصر طور سے اُن کے نام بتائے دیتے ہیں۔

"باغ و بہار" امیر خسرو کی کتاب چہار درویش کا ترجمہ ہے ع "گنج خوبی" اخلاق محسنی کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں میر امن دہلوی نے ترجمہ کی ہیں۔ ترجمہ میں اصل کا لطف بلکہ اُس سے زیادہ مزا پیدا کر دیا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو! جس کی نثر کا اعلیٰ درجوں میں شمار ہو اور میر تقی میر کی نظم کے ہم پلہ مانی جاتی ہو، اس کا ترجمہ تو ایسا ہونا ہی چاہیے۔

"آرائش محفل" یہ کتاب ہندوستان کے حالات میں ہے۔ "باغ اُردو" یہ گلستاں کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں میر شیر علی صاحب افسوس لکھنوی کی ہیں۔ "آرائش محفل" قصۂ حاتم طائی "گل مغفرت" "یادہ مجلس" اولیائے کرام کے حالات میں ہے۔ "گلزار دانش" "بہار دانش" کا ترجمہ ہے۔ "تاریخ نادری" "طوطا کہانی" یہ کتابیں سید محمد حیدر بخش حیدری سے یادگار ہیں۔ "نثر بینظیر" بدر منیر و بے نظیر کا قصہ ہے۔ "اخلاق ہندی" یہ دو کتابیں میر بہادر علی حسینی کی تصنیف سے ہیں۔ "گلشن ہند" یہ مرزا علی لطف نے تذکرۂ شعرائے اُردو "گلزار ابراہیمی" کا فارسی سے

ع مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو "باغ و بہار کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس کتاب کا (باغ و بہار کا) ماخذ امیر خسرو کی "چہار درویش" ہے۔ میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا۔" لیکن مولوی صاحب مدظلہ کے اس قول کی تردید خود میر امن صاحب کے بیان سے ہوتی ہے۔ وہ دیباچۂ "باغ و بہار" میں لکھتے ہیں "جان گلگرسٹ صاحب نے اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تک گنگا جمنا میں پانی بہے۔ لطف سے فرمایا کہ اس قصہ (چہار درویش) کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

مولوی صاحب موصوف "گنج خوبی" کی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ "امیر امن نے "اخلاق محسنی" کے تتبع میں ایک کتاب "گنج خوبی" لکھی۔" مگر مرحوم آزاد لکھتے ہیں کہ "اخلاق محسنی کا ترجمہ کیا۔" مذکورۂ بالا تجربہ کے بعد مولانا آزاد کے قول کو بے پس و پیش ماننا پڑتا ہے۔ ۱۲

ترجمہ کیا اور بہت کچھ اپنی طرف سے قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ "شکنتلا کی کہانی" میر کاظم علی دہلوی نے یہ برج بھاشا سے ترجمہ کیا ہے "خرد افروز" ابوالفضل کی 'عیار دانش' کا ترجمہ ہے۔ اسکے مترجم حفیظ الدین احمد صاحب پروفیسر فورٹ ولیم کالج ہیں۔ "مذہبِ عشق" گُلِ بکاولی کا قصہ۔ نہال چند لاہوری نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ہیں۔ خود جان گلکرسٹ صاحب نے ایک اُردو کی لغت اور کچھ اُردو کے قواعد لکھے۔ دوسرے یورپین حضرات نے بھی اُردو لغتیں لکھی ہیں جن کی انھیں اشد ضرورت تھی۔

اِدھر تو انگریزوں نے اُردو کی طرف توجہ کی اور اس کے حال پر یہ مہربانی فرمائی اُدھر چند حضرات علما کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اب اگر اُردو میں مذہبی کتابیں لکھی جائیں تو بڑا فائدہ ہوگا۔ کیونکہ عربی، فارسی جاننے والے روز بروز کم اور مفقود ہوتے جاتے ہیں اور یہ اُردو یہاں کی مادری زبان ہے اُس کو پڑھے لکھے، اعلیٰ، ادنیٰ، سب یکساں سمجھ سکتے ہیں۔ اسی خیال سے جناب شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ نے قرآنِ مجید کا ترجمہ اُردو میں کرکے ملک پر احسان کیا اور اُردو کو مرہونِ منت بنایا۔ اس ترجمہ میں لفظی رعایت زیادہ تھی اور محاورہ کا چنداں لحاظ نہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک بڑی کمی تھی اس کے پورا کرنے کے واسطے آپ کے چھوٹے بھائی مولوی شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ نے سنہ ۱۸۰۳ع[ع] یا سنہ ۱۸۰۰ع میں "موضح القرآن" نام سلیس و با محاورہ ایک دوسرا ترجمہ کرکے خلق اللہ کے واسطے کتاب اللہ کے معانی و مطالب سمجھنا آسان کردیے۔

اجرہم اللہ اجراً حسناً ماکثین فیہ ابداً

"موضح القرآن" اگرچہ شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ سے عمدہ اور سلیس و با محاورہ ہے ؎ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ مگر "الفضل للمتقدم" کے اعتبار سے شاہ رفیع الدین صاحب

ع شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے دیباچہ ترجمۃ القرآن میں اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۰۵ھ بتایا ہے اور مولانا آزاد نے آبحیات میں سنہ ۱۲۰۳ھ۔

ہی کو فوقیت ہے۔

اس کے بعد مولوی اسمٰعیل صاحب شہید نے "تقویۃ الایمان" اور کئی رسالے عام فہم اُردو میں لکھے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے اُردو پر صرف اتنا ہی احسان کیا کہ کتابوں کا اس میں اضافہ کر دیا بلکہ اُنھوں نے ایک ایسے با اقتدار گروہ کو یہ (ترقی اُردو کا) راستہ بتایا اور اُس پر لگا دیا جن کا اثر ملک پر حکومت و سلطنت کے بعد ہی تھا۔ یعنی مذہبی پیشوا عام حضرات علما کو اس طرف متوجہ کر دیا کہ اُردو میں کتابیں لکھ لکھ کے تلقین و تعلیم، ترغیب و ترہیب کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسے صاحب اقتدار اور با اثر لوگوں کی توجہ سے کیا کچھ نہ اُردو کی ترقی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ مذہبی کتابیں اُردو میں بکثرت لکھی گئیں۔ لیکن نہ ان میں انشا پردازی کے اصول کی رعایت مدنظر رہی نہ ٹکسالی زبان کا لحاظ۔ بلکہ اپنی سیدھی سادی عبارت میں مطالب بیان کر دیے جاتے تھے۔ مگر ان کی عربیت کا رنگ (جو کتب عربیہ کی مزاولت کی وجہ سے ان کی زبان کا جزو لاینفک ہو گیا تھا) قائم رہا۔ جو ایک ضروری امر تھا۔ جس نے اس سادگی کی خوبی کو بہت گھٹا دیا۔ اسی وجہ سے ادبی دنیا میں ان کی کتابیں معدودے چند کسی گنتی شمار میں نہیں۔ ورنہ جس سادگی پر ان کی بنیاد ہے اُس پر آج دُنیا مٹی ہوئی ہے۔ ان میں اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیا عجب تھا کہ آج وہ میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" کے مثل مانی جاتیں۔ خیر اُردو ادب میں انھیں چاہے جو درجہ دیا جائے، لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اُردو کی ترقی میں ان کو بہت کچھ دخل ہے۔

۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں سید انشا نے (جن کی ہر بات میں ظرافت اور ہر کام میں تمسخر کو ضرور دخل ہوا کرتا تھا) اُردو قواعد کی ایک کتاب "دریائے لطافت" لکھ کے اُردو پر بڑا احسان کیا اسکے صلہ میں اولیت کا تمغہ لیا۔ اس میں بھی طبیعت ثانیہ کا اثر نمایاں طور پر ہے۔ ظرافت و شوخی جی کھول کے خرچ کی گئی ہے۔ تاہم بہت سی مفید باتیں اور کارآمد نکتے لکھے ہیں۔ اچھے اچھے گُر بتائے ہیں اور ایک ایسی بنیاد ڈال دی ہے جس پر قابل معمار عمدہ عمدہ عمارتیں بنا سکتے ہیں۔

آپ نے اُردو میں ایک قصہ بھی لکھا ہے اور اس قید سے کہ اس میں کوئی عربی فارسی

لفظ نہ آنے پائے۔ اس اہم شرط کو اس خوبی سے نبا ہا ہے کہ زبان موٹے موٹے الفاظ سے پاک وصاف اور بے تکلف ہے۔ مرحوم آزاد نے آبِ حیات میں ایک صفحہ کے قریب عبارت نقل کی ہے جس سے اس باکمال کی قادر الکلامی کا ایسا ثبوت ملتا ہے جیسے آفتاب سے دھوپ کا۔ مبدء فیاض سے اس شخص کو ایسی ذکی طبیعت اور ایسا عالی دماغ ملا تھا کہ کم لوگوں کو ملتا ہے۔ کاش یہ متانت اور سلامت روی سے کام لیتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو ۔۔۔ اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

انھیں نے غالباً سب سے پہلے ریختی میں شعر کہے ہیں اور یہ انھیں کی ایجاد ہے جس میں فطرت کے موافق عورت کی طرف سے مرد پر عشق کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ورنہ آج تک تو فارسی کی کورانہ تقلید میں شوق امردہی کو نباتے تھے۔ اور

حسنِ سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر ۔۔۔ دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

پر مٹے ہوئے تھے۔ جان صاحب وغیرہ نے اس کو (ریختی کو) بہت ترقی دی اور بس انتہا کر دی۔

۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں سرور لکھنوی نے اپنی مشہور و مقبول کتاب "فسانۂ عجائب" مقفٰی عبارت میں فارسی انشاپردازی کے اصول پر لکھی جو اُس وقت مُلک کا عام مذاق تھا۔ سرور نے اس کے علاوہ اور بھی کتابیں لکھیں جو سب کی سب زمانہ کی روش پر ہونے کی وجہ سے بہت ہی مقبول ہوئیں۔ مُلک کی خوش مذاقی کہیے یا بدمذاقی کہ ان کو ایسا پسند کیا اور ان کی اتنی مانگ ہوئی کہ بہتوں کو سرور مرحوم کی تقلید میں اسی روش پر دیو و پری کے افسانے، امیر حمزہ، عمرو عیار وغیرہ کی بے سروپا داستانیں گڑھ گڑھ کے حجیم و ضخیم کتابیں لکھنا پڑیں۔ نولکشور پریس نے اپنے فائدہ کے لیے مصنفین سے کتابیں مانگ مانگ کے اپنے اہتمام سے بڑی بڑی ضخیم جلدیں بحسن و خوبی چھاپیں بلکہ خود فرمائشیں کر کر کے لکھوائیں اور چھاپ کے شایع کیں۔ جو اپنے حجم اور مصنف کی پرواز تخیل کے اعتبار سے حیرت ناک اور تعجب خیز ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت ان کی مقبولیت کا کیا عالم تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کے اکثر حضرات معمولی اور ذلیل ناولوں سے بھی انھیں کم وقعت سمجھتے ہیں اور بالکل پوچ لچر خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ ان کی کوتہ نظری ہے۔ آج ملک کا مذاق بدل جانے سے انھیں کسی قابل نہ سمجھنا، مہمل و لغو خیال کرنا، یا ادبی بزم میں ان کے مقام سے پیچھے کر دینا "انصاف کی گردن پر چھری" کے ہم معنی ہے۔ اُس وقت ملک کا وہی مذاق تھا اسی کی قدر تھی، اسی کی مانگ۔ پھر بیچارے مصنفین "مرتے نہ تو کیا کرتے"۔ اسی طرز اور اسی روش پر لکھنا تھا۔ ورنہ کون ہے جو اپنی کتاب کو دیدہ و دانستہ مقبولیت سے محروم رکھنا چاہتا ہو! اگر آج کی سادگی سے وہ کتابیں لکھی جاتیں تو ہرگز وہ مقبولیت و شہرت جو اُن کو حاصل ہو چکی ہے نہ نصیب ہوتی بلکہ اس کا عشر عشیر بھی میسر نہ ہوتا۔ بس ایسا ہی سمجھ لیجیے کہ آج اگر کوئی دیو وپری کے من گڑھت، بے سروپا، طول طویل افسانے۔ عبارت آرائی اور استعارات و تشبیہات سے مزین کر کے ملک کے آگے پیش کرے تو کس پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جائیں گے؟ کون ان کا دلدادہ بنے گا؟ اور کتاب ختم کرنے کی زحمت گوارا کرے گا؟ اُس وقت رنگینیوں پر مٹے ہوئے تھے اس وقت سادگی پر مرے ہوئے ہیں۔ جب کا وہ مذاق تھا، اب کا یہ ہے ؎

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ ان کو آپ اس نظر سے دیکھیے جس سے وہ دیکھے جا چکے ہیں بلکہ صرف اتنی التجا ہے کہ ان کی تخئیل، ان کی بلند پروازی، ان کے استعارات و تشبیہات پر جن میں بڑی کاوش، دماغ سوزی اور محنت کرنا پڑی ہوگی" پوچ لچر، لغو مہمل کہہ کے پانی نہ پھیر دیے۔

۱۸۳۵ء سے سرکاری دفاتر اردو میں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد پھر اکا دُکا اخبار بھی نکلنا شروع ہو گئے۔

۱۸۴۷ء میں سرسیّد نے اپنی بیش بہا کتاب "آثار الصنادید" کا پہلا اڈیشن شایع کیا جس میں تقریباً ۲۰۲ عمارتوں، زبانِ اُردو اور دہلی کے مشائخ، علما، قرّا، اطبّا، شعرا، خوشنویسوں، مصوروں اور موسیقی دانوں وغیرہم کا حال تھا۔ اِدھر آثار الصنادید کے شایع ہونے کی دیر تھی

اُدھر اس کی خوبی و عمدگی نے لندن لیجا کر اس کو "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" میں پیش کر دیا۔ اسکے ممبروں کو ایسی پسند آئی کہ انھوں نے اس بات کی خواہش کی کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے اس کتاب نے سرسید کو "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کا ممبر بنا دیا۔

اُردو میں اپنے موضوع کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اگر یگانۂ روزگار نہیں تو یکتائے اُردو تو ضرور ہے اس اڈیشن میں زمانہ کے مذاق کے مطابق مبالغہ، تکلفات، رنگینی عبارت، سب ہی کچھ تھا جس کے متعلق رحمت اللہ صاحب رعدؔ مالک مطبع نامی کانپور یہ ریمارک کرتے ہیں "مضمون متروک اور مبالغہ آمیز عبارت میں ہے" جو کسی جگہ واقعات کے بھی خلاف ہے"۔ دیکھو! جس کی طبیعت فطرةً بناوٹ سے بیر اور سادگی سے لگاؤ رکھتی تھی۔ جس نے آگے چل کے اُردو کو سادگی کے ڈھرے پر لگایا اور اس کی کایا پلٹ دی اس کو بھی اُس وقت کے مذاق سے مجبور رہنا پڑا۔ مگر آج اس بات پر جو اُس نے سوسائٹی کی پسندیدگی اور کتاب کی مقبولیت کے واسطے اپنی طبیعت کے خلاف اختیار کی تھی یوں ریمارک کیا جاتا ہے۔ "مضمون متروک اور مبالغہ آمیز عبارت میں ہے۔ جو کسی جگہ واقعات کے بھی خلاف ہے"۔

۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا اڈیشن جس میں بہت کچھ ترمیم و اصلاح کی گئی اور عبارت بھی بالکل سیدھی سادی کردی گئی تھی چھپا۔ ۱۹۰۰ء میں رحمت اللہ صاحب رعدؔ نے پہلے اور دوسرے اڈیشن کے نقائص کو نکال کے اور تمام محاسن کو جمع کرکے اپنے خاص اہتمام سے چھاپا۔ ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔

غدر سے پہلے پہلے جو کچھ نثر اُردو کی ترقی ہوئی وہ بھی محدود ہی تھی۔ البتہ غدر کے بعد ترقی کی اسٹیم بہت تیز ہوگئی اور زمانہ نے اُردو کو بہت سے قابلِ ناز اہل قلم دیے جنھوں نے اسکو مالا مال کر دیا۔ ان کی مختصر تفصیل کے لیے بھی بہت کچھ طوالت درکار ہے۔ آیندہ اگر موقع ملا تو غدر کے بعد کی ترقی کا حال بھی ہم حوالۂ قلم کریں گے۔ فی الحال تو اپنے مضمون کو ادھورا چھوڑتے ہوئے ناظرین سے رخصت ہوتے ہیں۔

محبوب علی (لکھنوی)

اول خویش بعدہ درویش

گر چاہتے ہو خلق چلے راہِ راست پر　　ہوں کُل معائب و مصائب یہاں سے دور
معمورۂ نشاط ہو ویرانۂ جہاں　　صحرا کی وہ فضا ہو کہ ہو قلب کو سُرور
اصلاحِ نفس خود ز ملامت نخست کُن
زاں پس معاملاتِ خلایق درست کُن

خواہش اگر یہ ہے کہ زمانے کو ہو نجات　　قیدِ معاصیاتِ صغیرہ و کبیرہ سے
اور دل شکستہ لوگوں کو حاصل ہو انبساط　　ہو رنج دُور قلب تسلی پذیرہ سے
اول میانِ نیک و بدِ خویش فرق کُن
زاں پس رُخِ معاملہ در غرب و شرق کُن

گر چاہتے ہو خلق کو صحت نصیب ہو　　طولِ مرض سے شدتِ اندوہ و درد سے
حاصل ہو حظِ صحتِ کامل ہر ایک کو　　بیمار کو نجات ملے آہِ سرد سے
بیماری خودی ز دلِ خویش دُور کُن
معمور قلب را بہ تجلائے طُور کُن

بیداریِ زمانہ ہے مدِ نظر اگر　　اس خوابِ مرگ و ظلمت و شر و فساد سے
اُس کے بجائے امن و محبت کا دَور ہو　　اور زیست کو بقا ہو نسیمِ مراد سے
بر حالِ خویشتن نظر از عقل و ہوش کُن
وز عاجز ایں نصیحتِ کامل بگوش کُن

رئیس احمد عاجزؔ (کاکوروی)

غزلیات

ہمارے عزیز دوست مسٹر محمد علی بی اے آکسن ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد جو آج کل قانون تحفظ ہند کی عشوہ طرازیوں کی بدولت چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں آزادی سے محروم ہو کر نسبتاً سکون و تعطل کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنا اکثر حصۂ وقت کلام مجید کی تلاوت میں صرف کرتے ہوئے سنے گئے ہیں معلوم ہوا ہے کہ کبھی کبھی اپنے وجدان فطری کی مناسبت سے شعرگوئی کا پُر لطف و بے ضرر شغل بھی جاری رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک دوست کی عنایت سے ہمیں اُن کا تھوڑا سا کلام الناظر میں شایع کرنے کے لیے حاصل ہوا ہے۔

مسٹر محمد علی نے اپنے کلام کے ساتھ ان صاحب کے پاس اپنی شاعرانہ زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھکر بھیجا ہے جو ہم انشاء اللہ آئندہ مہینہ کے الناظر میں شایع کریں گے تاکہ ہماری طرح ناظرین الناظر بھی نوجوان مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور ہندوستان کے لایق ترین فرزند کی شاعرانہ زندگی کے لطائف سے لذت اندوز ہو سکیں۔ ذیل میں اُن کی ایک غزل ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ وھوھذا

"مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور"

(غالبؔ)

...وطن نہ آئے ہمیں کیوں شطن سے دُور
جاتی نہیں ہے بوے چمن کیا چمن سے دُور

...ر بوے گُل نہیں، نہ سہی، بادِ گُل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دُور

...داش جُرمِ عشق سے ہے کب تلک مفر
مانا کہ تم رہا کیے دار و رسن سے دُور

...تقوے سے کے بعد، خوف کہاں، حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دُور

...ستِ مئے الست کہاں، اور ہوس کہاں
طرزِ وفا سے غیر ہے اپنے چلن سے دُور

...واعظ کا ارتداد، نہ میرا ہی ترکِ کُفر
کچھ بھی نہیں ہے ساقیِ توبہ شکن سے دُور

...ہے بُعد کربلا سے بھی، قربِ یزید بھی
اور چاہتے نہیں کہ نہ ہوں پنجتن سے دُور

...اللہ رے نورِ چشمِ محبت کی جستجو
نکلا اسیرِ مصر نہ کچھ بھی وطن سے دُور

...سان نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دُور

...سلم اجل سے دُور نہیں روز کربلا
رہتا نہیں برات میں دولھا دُلھن سے دُور

...تارِ عندلیب کو صیاد سی چکا!
مانا کہ گوشِ گُل ہے لبِ نا رُزن سے دُور

...بچ سکو موذنۂ حشر سے، تو ہاں،
مارو دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دُور

مفتیِ مفت خوار کو سب کچھ حلال ہے
بوئے شرابِ شرک ہو پھر کیوں دہن سے دور

دستِ دراز کو ترے اے رندِ باصفا
رکھے خدا عمامۂ شیخِ زمن سے دور

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

ہیں اتنے لافِ شوق پہ مرعوبِ حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور

تم ہو تو نذرِ عشق، نہ لکھیں وہ مرثیہ
یہ بات ہے مروتِ اہلِ سخن سے دور

تاویل بڑھ کے اقربُ للکفر ہو گئی
کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم و فن سے دور

تم سے بعید تھا کہ بھلا دو، اگرچہ ہم
اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

جاں کہ پئے دوست رواں ہو گئی
بے خبرِ سود و زیاں ہو گئی

یاس ہے مایوس کہ چشمِ امید
پھر تری جانب نگراں ہو گئی

دلبریِ حسن ترے عہد میں
فتنۂ ہر پیر و جواں ہو گئی

پہلے تو ارزاں تھی متاعِ وفا
اب یہ مرے بعد گراں ہو گئی

کس کی گلی ہے یہ جہاں بارہا
روحِ وفا نالہ کناں ہو گئی

یادِ الٰہی میں کٹی تھی جو عمر
آج وہی نذرِ بتاں ہو گئی

ہم سے تھی مخصوص پر اب وہ نظر
مایۂ نازِ دگراں ہو گئی

جسم کی تکلیف ترے شوق میں
میرے لیے راحتِ جاں ہو گئی

کس کو یہ دیکھا کہ مرے دل کی آنکھ
قبلۂ صاحب نظراں ہو گئی

موت سے پوری ہوئی شرطِ وفا
پر نہ کہا تم نے، کہ ہاں ہو گئی

روح کو حاصل نہ ہوا ذوقِ عشق
مشتغلِ سود و زیاں ہو گئی

ضبط سے حسرت نہ چھپا رازِ غم
حالتِ دل صاف عیاں ہو گئی

فضل الحسن حسرت موہانی

نظرے خوش گزرے

نیشنل کانگریس کے متعلق تو شروع سال ہی سے یہ مشتہر ہو چکا تھا کہ اب کی سالانہ اجلاس
ھنؤ میں ہوگا۔ اور باضابطہ طور پر اگرچہ ہنوز اعلان نہیں ہوا ہے تاہم مطالبۂ عام یہ ہے اور مسلم لیگ
ارباب اقتدار کا مدعا بھی یہ ہے کہ اُس کا اجلاس بھی امسال یہیں منعقد ہو۔ آنا ظر کو سیاسیات
لی سے تو کچھ سروکار نہیں لیکن کانگریس اور لیگ کے اس اتحاد نے ہمارے لیے بھی کچھ سامان
پسپی فراہم کر دیا ہے۔ اس وجہ سے یہاں اُس کا تذکرہ بے موقع نہیں ہو سکتا۔ بعض اصحاب نے
بنہیں اُردو زبان کی موجودہ کس مپرسی کی حالت پسندیدہ نہیں معلوم ہوتی اور جو اُس کی
ظمت و اہمیت کے معیار کو اُسی قدر بلندی پر پہنچانا چاہتے ہیں جو ایک عظیم الشان برِ اعظم کی
نگوا فرنیکا' یا عام زبان کو حاصل ہونا چاہیے اس امر کی تحریک کی ہے کہ مختلف اقوامِ ہند
تعلیم یافتہ نمایندوں کے سامنے جو حسنِ اتفاق سے ماہِ دسمبر لکھنؤ میں جمع ہوں گے اس مشترکہ
بان کو پیش کر کے اُس کی وسعت و ترقی میں سب کو یکساں طور پر حصہ لینے کی دعوت دینا چاہیے چنانچہ
ی تحریک کی بنا پر ۱۱ستمبر کو لکھنؤ میں ایک جلسہ زیرِ صدارت عالیجناب نواب فوق القدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹر ایٹ لا
ابق رکن عدالت العالیہ حیدرآباد دکن) منعقد ہوا تھا جس میں بعد غور و بحث یہ طے پایا ہے کہ انجمن ترقی اردو
جو اس وقت زبان اُردو کی خدمت میں نمایاں مستعدی ظاہر کرنے کی وجہ سے ایک بڑی حد تک کامیابی
کے ساتھ کام کر رہی ہو ارباب لکھنؤ کی طرف سے اس بات کی دعوت دی جائے کہ اُس کا ایک جلسہ
بصورت اُردو کانفرنس دسمبر میں یہاں منعقد کیا جائے۔ دعوت کا پیام مرکز انجمن کو بھیج دیا گیا ہے
ور یقین ہے کہ انجمن کے آنریری سکرٹری صاحب اسے بخوشی منظور کریں گے۔ کیونکہ درحقیقت ایسا موقع ہمیشہ
ہیں میسر آسکتا۔ اور جب تک ہندو مسلمان دونوں مل کر اس کام کو نہ کریں گے اُردو زبان کو جیسی چاہیے
وسعت و ترقی نہیں حاصل ہو سکتی۔ امید ہے کہ وہ تمام اصحاب جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کے لیے دل سے
ستاں ہیں اس موقع پر دانشمندی مستعدی اور یکدلی کے ساتھ کام کریں گے۔

لکھنو جو اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے، اخبارات کے لحاظ سے کچھ زیادہ خوش قسمت نہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں سے درجنوں اعلیٰ درجے کے اخبار و رسائل شایع ہوتے مگر اودھ کے لوگ کچھ اس قدر بے حس اور مستِ مئے غفلت ہیں کہ انھیں اس شدید ضرورت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت دو اخبار یہاں ایسے ہیں جو اسی نام و شہرت کے مستحق ہیں۔ جن میں سے روزانہ "اودھ اخبار" باوجودیکہ اُس کے مالک ایک بڑے روشن خیال، زمانہ شناس اور صاحبِ ثروت بزرگ ہیں اب تک اُسی انداز سے نکل رہا ہے جو اُنیسویں صدی کے لیے تو شاید کسی حد تک موزوں ہو سکتا تھا، لیکن زمانۂ موجودہ کے لحاظ سے بالکل نامناسب ہے۔ البتہ معزز ہم عصر "ہندوستانی" ضرور اس قابل ہے کہ اُس کی عظمت کی جائے اور اگرچہ خالص ادبی حیثیت سے ہم اُس کی مدح سرائی نہیں کر سکتے تاہم اخبار جسے کہتے ہیں وہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔
اب شیخ شاہد حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا و تعلقدار گدیہ کی عنایت سے ایک نئے اخبار کی اشاعت کا سامان ہوا ہے جو غالباً ہفتہ عشرہ میں جاری ہو جائے گا۔ "ہمدم" اس اخبار کا نام تجویز پایا ہے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ سید جالب دہلوی جیسے مشاق اور تجربہ کار اخبار نویس اُس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں جو بلحاظ اس کے کہ "ہمدرد" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، اکثر رقیق القلب اصحاب کے لیے اگرچہ حد درجہ مہیب اور خوفناک معلوم ہوں گے لیکن ہمیں یقین واثق ہے کہ اُنکی ایڈیٹری میں "ہمدم" بہت جلد ایک ممتاز و مقبول اخبار کا مرتبہ حاصل کر لے گا۔
بعض ارباب نے یہ سُن کر کہ شیخ شاہد حسین صاحب اس اخبار کے بانیوں میں ہیں مبتلا از بیش بدگمانی اور ناخوشی کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ صاحب موصوف کے متعلق اُن لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ سید جالب صاحب نے اودھ اخبار کے ذریعہ سے باور کرانے کی کوشش کی ہے امید ہے کہ یہ خدشات غلط ثابت ہوں گے۔ ہم اپنے نئے اسلامی معاصر کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ اُس کا وجود مُلک و ملت کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ آمین۔

مختصر ماہانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۱۶ء

---

۱ اصحاب ذیل کی جانب سے چندہ ماہ اگست سنہ ۱۶ء میں وصول ہوا ہے۔

مولوی سید افتخار حسین صاحب مہتمم ٹیلیفون	عہ	حالی
مولوی محمد مستحسن صاحب وکیل اورنگ آباد دکن	صہ	"
خواجہ فریدالدین صاحب " "	عہ	"
خواجہ اصغر علی صاحب " "	مے	"
مسٹر ڈنکبر داس صاحب " "	صہ	"
نواب فخر جنگ بہادر تعلقدار بھونگیر	عہ	"
سید مظفرالدین صاحب مددگار مہتمم کوتوالی محبوب نگر	عہ	"
مولوی ظہور الحسن صاحب کنٹراکٹر محبوب نگر	عہ	"
مولوی حمیدالدین صاحب بی اے صدر دارالعلوم	عہ	"
مولوی خیرالدین صاحب اسسٹنٹ انجینیر حیدرآباد دکن	عہ	"
مولوی مصطفےٰ علی صاحب وکیل جالنہ	عہ	"
مولوی عبدالوحید صاحب۔ ایم اے۔ از اجمیر	عہ	کلدار
مولوی عبدالرزاق صاحب تحصیلدار از بھوپال	عہ	"
مولوی خواجہ فیاض حسین صاحب وکیل	عہ	"
میر حفیظ الدین صاحب (علیگ) نواب زادۂ سورت	عہ ۵	"

مولوی سلطان حیدر جوش نائب تحصیلدار ہردوئی	للعہ	کلدار
آنریبل یعقوب حسن صاحب از مدراس	للعہ	"
مولوی ظفر عمر صاحب بی اے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کیمپری	عہ	"
مولوی نذیر محمد صاحب ڈرائنگ ماسٹر نظام آباد	عہ	حالی
نواب فخر جنگ بہادر بھونگیر	عہ	"
مولوی سید شاہ پیراں صاحب۔ بی اے۔ مہتمم مجلس نظام آباد	عہ	"
مولوی غلام اکبر خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن	عہ	"
مولوی عبد القادر صاحب سابق صوبہ دار گلبرگہ شریف	عہر	"
مولوی شرف الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن	للعہ	"
مولوی محمد تقی حسن صاحب تعلقدار صرف خاص حیدرآباد "	عہ	"
مولوی حمید الدین صاحب بی اے صدر دار العلوم حیدرآباد "	عہ	"
مسٹر داراب جی باپوجی چنائی مددگار معتمد مالگذاری " "	عہ	"
مولوی اسد اللہ صاحب بی اے رجسٹرار مجلس وضع قوانین " "	عہ	"
مولوی تفضل حسین صاحب مترجم صدر دفتر نظامت تعلیمات "	عہ	"
پروفیسر قادر حسین خاں صاحب ایم اے سول سروس کالج "	عہ	"
مولوی جان عالم صاحب اسسٹنٹ انجنیر سیدر	عہ	"
مولوی معشوق حسین صاحب مددگار معتمد مالگذاری شاخ ریلوے	عہ	"
نواب غلام احمد خاں صاحب کلامی کاروسنڈل کوسٹ بنگلور	عہ	"
بیگم صاحبہ مسعود الزماں صاحب بیرسٹرایٹ لاء ورمیں باندہ	صرعہ	"
خان بہادر مولوی مرزا سلطان احمد صاحب از پنڈ دادن خاں	للعہ	"
بیگم صاحبہ حشر حید امام احمد صاحب لکھنو	عہ	"

مولوی ظہور الحسن صاحب کنٹراکٹر محبوب نگر	ھ	حالی
مولوی سردار علی خاں صاحب دوم تعلقدار رایچور	ع	"
مولوی احمد الدین صاحب رجسٹرار جتور	ع	"
مولوی جمیل احمد صاحب ڈسٹرکٹ انجینیر عثمان آباد	ع	"
مولوی احمد خاں صاحب ہیڈ کوارٹر انسپکٹر پولیس نلگنڈہ	ع	"
مولوی حکیم عبد الحبیب صاحب دریا بادی۔ لکھنؤ	ع	"
مولوی فخر الدین علی خاں صاحب مددگار مال نلگنڈہ	ع	"

جملہ میزان لـــہ

سکہ حالی للعہ سکہ قیصری ہدسہ

۱ - دریائے لطافت (من تصنیف سید انشاء اللہ خاں دہلوی مرحوم) شائع ہو چکی ہے اور دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو لکھنؤ یا سکرٹری سے قیمت عہ یا مجلد عہ ل سکتی ہے۔

پلوٹارکس لائیوز (مشاہیر یونان) بھی چھپ کر شائع ہو چکی۔ قیمت عہ مجلد ہے،

۲ - بعض بہی خواہانِ اُردو کلکتہ میں ایک انجمن اُردو کے قیام کی تجویز کر رہے ہیں امید ہے کہ اسکے قیام سے بنگال میں اشاعت اُردو کو بہت بڑی مدد ملیگی۔ وہاں ایک ایسی انجمن کی شدید ضرورت ہے۔

علاوہ اسکے دیگر مقامات میں بھی اسی قسم کی کوششیں ہو رہی ہیں جو ایک مبارک فال ہے۔

۳ - تاریخ یونان جو دار العلوم کے نصاب کے لیے لکھوائی جا رہی تھی، ختم ہو گئی ہے اور اب اس پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔

عبد الحق

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو

شکریہ

جمیع ارکان و معاونین انجمن ترقی اُردو اس بات کو سن کر محظوظ ہوں گے کہ عالی جناب نواب ذو القدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا سابق رکن مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد دکن نے ازراہ علم دوستی و ہمدردی قومی اپنی لاجواب تالیف **خلافت اندلس** کی تینوں جلدوں کے ۲.. مکمل سٹ خاکسار کو اس غرض سے عطا فرمائے ہیں کہ بعد فروخت اُن کی کل قیمت انجمن ترقی اُردو کے حوالہ کی جائے۔

نواب صاحب کی یہ فیاضانہ اعانت حقیقت میں نہایت درجہ قابل ستائش ہے اور میں انجمن کی طرف سے اُن کی اس توجہ و ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خلافت اندلس کیا چیز ہے؟ یہ تو اب عام طور پر تمام ارباب علم پر ظاہر ہی ہو گیا ہے کہ یورپ کی موجودہ تمام ترقیات کا اصلی منبع اور سرچشمہ درحقیقت وہ علمی و عملی کوششیں ہیں جو مسلمانوں سے بزمانۂ حکومت اندلس ظاہر ہوتی رہیں۔

مسلمانان ہند کو ابتدا میں بیشتر اندلس کی اسلامی حکومت کے کارناموں سے یک گونہ بیخبری رہی لیکن الحمدللہ کہ اب یہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ اگرچہ فی الحقیقت اندلس کے علمی خزانوں کے دروازے ابھی تک اُن کے لیے عموماً بند ہیں۔

نواب ذوالقدر جنگ بہادر کو جبکہ وہ یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اندلس کے حالات سے بہت گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اُنھوں نے اُس کے متعلق ہر قسم کا سرمایۂ کتب جمع کرنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان آ کر جب اطمینان سے بیٹھے تو اپنے وسیع مطالعہ اور کثیر معلومات سے برادران ملت کو مستفیض کرنے کی غرض سے اُنھوں نے عربوں کی ہشت صد سالہ حکومت کی تاریخ مرتب فرمائی جو تہذیب و شائستگی اور علوم و فنون کے میدان میں صدیوں تک سارے یوروپ کی اُستاد بنی رہی اور جس کے مٹے ہوئے نشانوں پر حقیقت میں آج وہ قصر رفیع بنایا گیا ہے جسے اب کی محکوم قومیں دیکھ دیکھ کے حیران و خیرہ سر ہو جاتی ہیں۔

خلافت اندلس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ سب دیدہ زیب ہے اور ہر جلد میں متعدد عکسی تصاویر بھی ہیں جن سے اُس کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ بلحاظ فرق حجم و تعداد تصاویر وغیرہ کے حسب ذیل قیمتیں معین کی گئی ہیں

جلد اول عہ/ جلد دوم عمہ/ جلد سوم للعہ/ مکمل سٹ کے خریدار سے صرف للعہ/ لیے جائیں گے۔

خاکسار۔ ظفر الملک علوی۔ ایڈیٹر الناظر و اعزازی مہتمم دارالاشاعت انجمن ترقی اردو

چوک۔ لکھنؤ

۱۲ ستمبر ۱۹۲۶ء

نوٹ:۔ جو صاحب خواہش کریں گے اُن کے لیے خوشنما جلدیں بھی بنوا دی جائیں گی

حقائق اسلام

میں جو گویا اثبات واجب الوجود کا دوسرا حصہ ہے، جناب مفتی انوار الحق صاحب ایم اے منشی فاضل نے عام فہم طریقہ پر اور عقلی استدلال کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ فرقہ کے ذہن نشین کرنے کے لیے اسلام کے تمام ضروری شعبہ جات سے بحث کی ہے۔ چنانچہ حصہ اول میں عقائد کی بحث کے تحت توحید تصدیق رسالت۔ ایمان بالقدر۔ اعتقاد حشر و نشر۔ معجزات اور اسلام کے عنوانات قائم کیے ہیں۔ حصہ دوم میں اعمال و عبادات کو لیکر۔ صلوٰۃ۔ صیام۔ زکوٰۃ اور حج کی تشریح کی ہے۔ حصہ سوم میں آداب و معاملات کے سلسلہ میں عام اخلاق۔ اخوت اسلام۔ رعایت حقوق صنف ضعیف اور اسلام۔ قانون ازدواج۔ حرمت ربوٰا۔ غلامی اور اسلامی کی سرخیاں رکھی ہیں۔ اور حصۂ چہارم میں متفرقات کی مد قائم کرکے اسلامی تیوہار۔ رسوم اسلام۔ طعام اہل اسلام۔ اسلام اور روحانیت اور مسلمانوں کی موجودہ حالت سے بحث کی ہے۔ اور جا بجا نہایت معقولیت اور مضبوط دلائل سے اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جو عام طور پر اسلام کے علمی فرائض سے ناواقفیت اور بعض اوقات دیدہ دلیری سے کیے جاتے ہیں۔ حجم ۲۰۲ صفحے۔ کاغذ۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب۔ قیمت عہ

عطر سخن یا جذبات مسلم

یعنی

ہندوستان کے مشہور و معروف شعرا کی بہترین نظموں کا مجموعہ سب نظمیں قومی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں

قیمت ۸؎

وجدانی نشتر

عرف

سوز و گداز

اہل اللہ کے لیے راز و نیاز۔ سوز و ساز۔ سکون و اضطراب۔ حال و قال۔ اور وجد و وصال کا ایک لازوال روحانی خزانہ

مولفہ حضرت فوق۔ قیمت عہ

اسلام کی دنیوی برکتیں | مولانا چراغ علی صاحب

مرحوم نے اسلام کی دنیوی برکتوں کو اس سالہ میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے اور چونکہ اپنے اقوال و براہین کو قرآن مجید سے ثابت کیا ہے اور قرآن ہی کو وہ معلم اصلاح معاش و معاد قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کسی کو اسکے انکار کا موقع باقی نہیں رہا کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب (قرآن) میں دنیاوی برکتیں حاصل کرنے کی ممانعت ہے۔ خوش معاملگی اور حسن معاشرت اسلام کا خاص اصول ہے اور اسی ذریعہ سے ہر قسم کی ترقی ہوسکتی ہے۔ انصاف۔ حریت۔ اور مساوات اسلام کی مسلم ہے۔ تحصیل علوم اور اکتساب حرف و صنائع میں مرد و عورت کو آزادی حاصل ہے اصلاح نفس و اخلاق کے لیے قرآن مجید میں خاص ہدایتیں موجود ہیں۔ اسلام اپنی مجموعی خوبیوں کے لحاظ سے غیر قوموں کے مدبرین کے نزدیک بھی قابل احترام ہے اسلام کی دنیوی برکتوں میں دین کے فوائد بھی مضمر ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے قیمت ۸ر

دین و دانش | مولوی محمود علی صاحب پروفیسر

کیور تھلہ کالج نے دین و دانش میں حکیمانہ اصول سے اسلامی تعلیمات کا سائنس سے موازنہ کیا ہے اور خدا کے واجب الوجود ہونے کو نہ صرف کتب مذہبی سے ثابت کیا ہے بلکہ مشہور یوروپین سائنس دانوں کے اقوال و خیالات سے بھی خدا کی ہستی کو ثابت کر دکھایا ہے۔ گو بعض سائنس داں اور دہریے خدا کو صاف الفاظ میں نہیں مانتے مگر ان کے لب و لہجہ سے خدا کا نام اور اُسکی قدامت اور اُس کی قدرت کی باطنی کارفرمائی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ برق۔ کشش۔ ثقل و انفصال کی قوتوں کے تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ یہ سب طاقتیں کسی ایک اور محیط کل طاقت کی مختلف مظاہر ہیں۔

خدا اور اُس کی قدرت کاملہ پر جو دلیلیں اُنھوں نے قرآن مجید اور نیز قابل تسلیم قیاسات اور بدیہی نظائر سے پیش کی ہیں اُن کی تردید محال ہے انسانی جماعتوں کے لیے مذہبی پابندی لازمی اور غیر مفر شے ہے۔ اسی طرح خدا کو ازلی ابدی اور قادر مطلق ماننے کے لیے دنیا کی بہت سی عبرت انگیز باتیں موجود ہیں اور اُن کا ظہور وقتاً فوقتاً ہوا کرتا ہے اور جب ایک کامل العقل عالم۔ حکیم یا سائنس داں اپنی فرزانہ تدبیر سے کامیاب نہیں ہوتا تو اُسے کسی باطنی قوت (خدا) کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس کتاب میں بہت وضاحت سے اس موضوع پر بحث کی گئی ہے قیمت ۳ر

غم حسینؑ و محرم کی بدعتیں مولوی عبداللہ العمادی صاحب نے اس مختصر رسالہ میں مورخانہ معلومات کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ غم حسینؑ کے نام سے محرم میں جو بدعتیں کی جاتی ہیں اُن سے مذہب اسلام پر ایک بدنما داغ ہے - اور اُن کو دُور کرنا چاہیے - غم حسینؑ کی ممانعت نہیں ہے مگر پیغمبر اسلام کے فرزند کا غم اُن کی شان و شعائر کے موافق ہونا چاہیے - مولانا نے بعض مجتہدین عراق کی رائے بھی ان بدعتوں کے ترک کے باب میں لکھی ہے - واقعۂ کربلا کے ظہور کے اسباب بھی مورخانہ طور پر لکھے ہیں - یہ رسالہ اہل اسلام کے ملاحظہ کے قابل ہے - قیمت فی جلد ۳/

روح کی بیداری اصل میں اس کتاب کا مصنف ایک یونانی فلاسفر ہے - اس کا پہلا ترجمہ عربی میں ہوا پھر عربی سے انگریزی میں - مولوی فدا علی خاں صاحب ایم اے نے اس مفید کتاب کا ترجمہ اُردو میں کیا تاکہ اس کے مطالب عام طور سے سمجھ میں آسکیں - (رُوح کی بیداری) کو ایک تاریخی فسانہ سمجھنا چاہیے - اس میں حیّ ابن یقظان کی پیدائش اور اُس کی عجیب و غریب طریقہ سے پرورش کی کیفیت بیان کی گئی ہے - زمانۂ قدیم میں ایک جزیرہ میں ایک بادشاہ حکمراں تھا اور اُس کی ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی مگر وہ کسی سے اُس کا عقد کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا مگر یقظان پر وہ لڑکی خفیہ طور پر عاشق ہوگئی حتی کہ پوشیدہ طور پر اُس سے نکاح بھی ہوگیا اور اُس سے ایک اولاد پیدا ہوئی (اس کا نام حیّ ہے) خوف رسوائی سے شہزادی نے اپنی اولاد کو ایک صندوق میں مقفل کر کے سمندر میں ڈال دیا - قدرت خدا سے یہ صندوق ایک کنارہ پر پہنچا اور وہاں ایک ہرنی اپنے بچہ کی تلاش میں آئی اُس نے اس صندوق کو پنجوں سے کھولا ہرنی کو اس پر رحم آیا اور دودھ پلانے لگی اور بعد چندے یہ اپنی مدد کے قابل ہوا اور مختلف مدارج زندگی صرف عقل کی رہنمائی سے طے کیے - اس کی تدریجی روحانی ترقی کا حال بہت دلچسپ ہے - روح کی بیداری نے اس کو (حی) آخرکار ایک خدا شناس ولی بنا دیا ہے - اور حقیقی روح کی بیداری یہی ہے - روح کی بیداری نہایت دلچسپ دانش افروز قصہ ہے -

قیمت ۴/

فتح اندلس | یہ ایک تاریخی ناول ہے جس کے اصل مصنف مصری فاضل جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال ہیں۔ اس میں اسلامی فتوحات سپہ سالاران اسلام کے کارناموں اور انصاف گستری اور یہودیوں عیسائیوں کے سوء اخلاق اور انتقام کشی کا تاریخی ذکر ہے۔ یہ ناول عربی زبان میں تھا اس کا بامحاورہ ترجمہ اُردو میں کیا گیا ہے۔ ہرچند یہ ایک تاریخی ناول ہے مگر اس میں سچے جذبات حسن و عشق کے دلکش مناظر بھی ہیں۔ اندلس ایک تاریخی شہر ہے اس کی مختلف قسم کی عمارات۔ باغات شاہی محلسرائیں اور قصر موقوعہ لب دریا بحر و بر اور دیگر مناظر حد درجہ دلکش اور دلفریب ہیں مسلمانوں کے لیے فتح اندلس کا مطالعہ نہ صرف دلآویز بلکہ تاریخی معلومات میں اضافہ کرنے والا ہے۔ اور اس سے وہ اپنی گذشتہ فاتحانہ حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ قیمت عہ

ہندوستان کی تاریخی کہانیاں | جس میں دلچسپ کہانیوں کے پیرایہ میں ہندوستان کے اہم تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں اور اُنکی توضیح مزید کی غرض سے ۲۳ مختلف عکسی تصاویر لگائی گئی ہیں۔ یہ کتاب تاریخ بھی ہے اور افسانہ بھی لڑکوں کے لیے سبق آموز بھی ہے اور بوڑھوں کے لیے دلچسپ بھی۔ حجم ۱۵ جزو۔ کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی اور اس پر قیمت صرف ۲/

دکن کی تاریخی کہانیاں | یہ کتاب بھی مثل اول الذکر تاریخ اور افسانہ کی دوگونہ خوبی رکھتی ہے۔ اور تصاویر اس میں اُس سے زیادہ یعنی ۲۶ ہیں۔ مگر سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی اس کی اعلیٰ درجے کی عبارت ہے۔ ایسی پاکیزہ اُردو بہت کم لوگ لکھ سکتے ہیں اور جو لکھ سکتے تھے وہ ایک ایک کرکے اُٹھ گئے۔ اسلوب بیان۔ سادگی و سلاست جو ادبی کمالات میں داخل ہیں سب اس میں موجود ہیں۔ قیمت ۱۰/

سلطنت برطانیہ کا مستقبل | سلطنت برطانیہ کے مستقبل پر ایک جاپانی مورخ نے اپنے دوستانہ خیالات نیک نیتی کے ساتھ اپنی ایک مختصر تصنیف میں ظاہر کیے ہیں۔ اُسکے خیال میں جن اسباب و وجوہ سے سلطنت رومہ کو زوال ہوا قریباً وہی اسباب سلطنت برطانیہ میں پیدا ہوتے جاتے ہیں اور اسکی مختصر تفصیل بیان کی ہے۔ منشی محمد عبداللہ صاحب بہاس ایڈیٹر اخبار وکیل امرتسر نے اس جاپانی تصنیف کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے تاکہ ابھی ہماری حکومت اپنے نقائص پر مطلع ہوکر اصلاح کار میں

منیجر الناظر بک ایجنسی چوک لکھنؤ سے طلب کیجئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۸۹ جلد ۱۵ — یکم نومبر ۱۹۱۶ء

خود ڈاکٹر بن جائیے

اگر آپ خود ڈاکٹر بن کر اپنے اور اپنے عزیزون کو وبائی امراض کے زمانہ مین محفوظ رکھنا چاہتے
ہین یا اپنے غریب پڑوسیون کو ان کے نازک وقت مین امداد کر کے حق انسانیت سے ادا
ہونا چاہتے ہین تو اس کا ایک نہایت عمدہ طریقہ ہے جس مین نہ زیادہ دولت کی ضرورت
ہے اور نہ دقت کی اور وہ یہ ہے کہ کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کے مشہور بکس
بکس کو خرید لیجئے۔

اس مین جملہ ایسی مجرب مفصل ذیل دوائین ہین جو آپ کو ہر وقت اور ہر موقع پر کام دین گی۔

تفصیل ادویات

عرق کافور ہیضہ و گرمی کے دست کی ایک ہی دوا ہے۔ دمہ کی دوا فوراً دم کو دبا دیتی ہے۔ بولانا نمک
ہر ایک کے لیے طاقت بڑھانے کی دوا۔ مقوی باہ کی گولیاں جیسا نام ویسا فائدہ جلاب کی گولیاں

آسانی سے پیٹ صاف کرتی ہیں۔ عرق پودینہ سبز درد شکم و ریاحی درد کی دوا قیمت فی بکس
ایک روپیہ آٹھ آنہ محصول ڈاک چار آنہ ۴؍

ادویات ہر جگہ دوکان دارون اور دوا فروشون سے مل سکتی ہین ورنہ کارخانہ سے طلب کیجیے۔

قوت کی گولیان

۳۱ برس سے تمام ہندوستان مین مشہور ہو رہی ہین طاقت دینے والی مشہور دوائین فاسفورس
اسیکٹیا ڈامینیا ملا کر گولیان بنی ہین اس لیے مغز پٹھہ اور خون کو طاقت دینے کا خاص
دعویٰ رکھتی ہین زیادہ محنت جوانی کی خرابی و بے اعتدالیون کے استعمال سے اول ہی روز مین
فائدہ نظر آتا ہے۔ بدن مین قوت اور مزاج مین گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرے پر رونق
اور جوانی مین ضعیفی کی سی حالت ڈھلے ہوئے جسم مین دوبارہ جوش لاتی ہے قیمت ۳۰
گولیون کی شیشی دو ہفتہ کی خوراک کا ایک روپیہ محصول ڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵؍
دیکھیے جناب ایڈیٹر صاحب مخبر دکن کیا تحریر فرماتے ہین ہم نے ڈاکٹر صاحب کی تعریف پر
خیال کر کے تیس گولیان منگائین اس کے بعد حیرت انگیز اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہین تو ان
گولیون کی قیمت بجائے ایک روپیہ کے دس روپیہ رکھنی چاہیے تھی۔

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۳ جلد ۵ یکم نومبر سنہ ۱۹۱۶ء

تاریخ الفلسفہ

بسلسلہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۶ء

حصۂ دوم - یعنی تاریخِ مسائلِ فلسفیہ

جب انسان وحشت کی حالت میں تھا تو اُس کی یہ عادت تھی، اور اب بھی جہاں کہیں وحشی آدمی یا قومیں پائی جاتی ہیں اُن کی بھی یہ عادت معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی ایسی قوۃ یا حرکت اُس کی نظر سے گذرتی ہے جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اُسے فی الفور دیوتا سمجھ لیتا ہے اور سجدہ و سلام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہی حالت قدیم یونانی قوم کی بھی تھی۔ ان لوگوں نے رفتہ رفتہ تمام مظاہر فطرت کو معبودوں کا درجہ عطا کر دیا، اور یہی اُن کا تمدن کی جانب پہلا قدم تھا۔ اُن کو اس پرستش میں اس قدر انہماک تھا کہ اس کی بدولت ایک بسیط سلسلہ قصص الاصنام کا مرتب ہو گیا جن کو ہومر و دیگر شعرا نے اپنی بے بہا نظموں کے ذریعہ سے حیات ابدی کا خلعت عطا کیا۔ یہی نظمیں آگے چل کر اہل یونان کے خیالاتِ فلسفیہ کا سنگ بنیاد بنیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان نظموں میں جو اخلاقی تعلیم موجود ہے وہ نہایت ابتدائی اور پست قسم کی ہے، مگر یہ بات بھی ماننا پڑتی ہے کہ اس میں عزت نفس، حقوق و فرائض کی تعین

تشخیص ضرور موجود ہے۔ چنانچہ اس شاعری کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قدیم یونانی شاعر ہسیاود کہتا ہے "کیا اچھے تھے وہ لوگ جو اب مقدس ارواح کی سرزمین میں پہونچ گئے ہیں اور کیسے کمبخت ہیں ہم لوگ جو ایسے بدتر زمانہ میں پیدا ہوے، جب باغ دنیا سے بہار کے دن رخصت ہو چکے اور نسل انسانی اس حد تک قعرِ مذلت میں گر چکی ہے کہ دو آخری نکیاں یعنی (شرم و کیفرکردار کا خیال) بھی ہمیشہ کے لیے دنیا سے نابود ہو گئی ہیں۔

سیمونائیدس، ہپتوگنیس و دیگر تاریک خیال شعرا کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کی تحریروں کے جستہ جستہ فقرے باقی رہ گئے ہیں جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی ہمیشہ مقدر کے جزر و مد، دوستوں کی بیوفائی۔ افلاس و علالت کے مصائب وغیرہ افسردہ کن مضامین بیان کیا کرتے تھے۔

شعرا کے وقت کے بعد وہ وقت آیا جس کو یونان کی تاریخ میں عقلاے سبعہ کا زمانہ کہتے ہیں۔ ان عقلا میں اول درجہ حکیم سولون کا تھا جس کے اقوال ادلفی کے پھاٹک پر آبِ زر سے لکھے گئے تھے۔

انھیں عقلا میں ایک شخص تلیس بھی تھا۔ یہ اختر شناس اور تاجر تھا۔ حکیم ارسطو نے اس کو "اوّل فلاسفر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ تلیس اور اس کے نقش قدم پر چلنے والے اس کوشش میں مصروف تھے کہ دریافت کریں کہ مظاہر عالم میں تغیر کا سلسلہ کیوں قائم ہے۔ وہ کیا شے ہے جو سببِ تخلیقِ عالم ہے اور جس پر تغیر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس حکیم کی آخری رائے یہ تھی کہ عنصرِ آب مبدأ کائنات ہے۔

دوسرا فلاسفر حکیم انکسامینڈر۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ابتدا میں کائنات ایک ایسے شعلہ کی شکل رکھتی تھی جس میں آفتاب و ماہتاب و سیاروں کی وجہ سے جا بجا رخنے معلوم ہوتے تھے۔ ہماری دنیا اس شعلہ کے عین وسط میں ایک ستون کے مانند قائم تھی۔

تیسرا فلاسفر حکیم انکسامینس تھا۔ اس کا قول تھا کہ (عنصر باد) مبدأ کائنات ہے۔ یہی ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں تک کہ چونکہ روح انسانی بھی ایک قسم کی بادہی ہے اس لیے باد انسان پر بھی قادر ہے۔

غرضکہ ان تینوں اول یونانی فلاسفروں نے عناصر میں سے کسی نہ کسی کو مبدأ کائنات قرار دیا اس وجہ سے یہ لوگ حکماے طبیعی کہلاتے ہیں۔

حکیم ارسطو نے ان کے فلسفۂ طبیعی کو بھی آگے چل کر ایک مستقل علم قرار دیا۔ اس وجہ سے اس کے مجمل بیان کی ضرورت واقع ہوئی۔

فلسفۂ طبیعی اس فلسفے کی علت غائی یہ ہے کہ اُس اصل عنصر کا پتہ لگایا جائے جو ہزاروں اشکال ومظاہر کے پردے میں پنہاں ہے۔

ارسطو نے اپنی کتاب (طبیعات) میں لکھا ہے کہ بالکل ابتدائی فلسفیانہ تحقیقات کا رُخ اس عالم کی ظاہری چیزوں کی طرف تھا۔ انسان نے اپنے نفس کا مطالعہ پہلے نہیں کیا اور مظاہر فطرت کے مطالعے اور اُس کی تحقیق میں مصروف رہا۔ اس کی خاص وجہ ہے وہ یہ کہ وہ چیزیں جن کا ادراک ہم کو اپنے حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے، ہماری توجہ فوراً اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ برخلاف اس کے ادراک تخیلی صرف اُس وقت نصیب ہوتا ہے جب آدمی کا دماغ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے کافی طور سے پختہ ہو چکتا ہے۔ اس وجہ سے انسان کے لیے سوا اس کے اور کچھ ممکن ہی نہ تھا کہ صرف انھیں چیزوں کے متعلق غور و فکر کریں جو ہر وقت اس کے سامنے رہتی ہوں یا اس کو محسوس ہوتی رہتی ہوں۔ لاجرم اُس کے دل

میں یہ سوالات پیدا ہوئے۔

یہ ہزاروں قسم کی مختلف چیزوں کا ہجوم، یہ لاانتہا مظاہر و صور اور اُن کے درمیان مسلسل تغیر و تبدل یہ سب کیا ہے؟

وہ کون سا جوہر، یا عنصر یا مادّہ ہے جو اس تمام کائنات کا سبب فاعلی ہے اور جس پر ان تغیرات کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟

ان سوالات کا جواب قدیم حکما ے فلسفۂ طبیعی نے اپنی اپنی رائے سے دینا چاہا ہے جن میں سے تین اول فلاسفروں کی بابت ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ان لوگوں کے بعد حکیم ہرقلیطس کا زمانہ آیا۔ یہ شخص تاریک خیال تھا۔ اس کے تمام اقوال مختصر اور افسردہ کن ہوتے تھے۔

(۱) مثلاً یہ کہ تمام اجزاے عالم التہاب و اضطراب کی حالت میں ہیں۔ ان کو کبھی قرار نہیں ہوتا۔

(۲) حیات و وقت دریا کی دھار کے مانند ہیں جو ہمہ وقت گذرتی ہی چلی جاتی ہے اس موج آب کی سطح پر افعال و خیالات پانی کے بُلبُلوں کی طرح تھوڑی دیر کے لیے نمایاں ہوتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد حکیم فیثاغورث کا وقت آیا۔ اُس نے اس معمے کو ریاضیات کے ذریعہ سے حل کرنا چاہا۔ اس کی رائے تھی کہ جوہرِ عالم عدد ہے۔ اور اشیا اعدادِ مُدرک ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ عدد جوہرِ اشیا ہے، اور توحُّد جوہرِ عدد ہے۔ سیاروں کی گردش ایک مسلسل نغمہ ہے۔ رُوح ایک زمزمہ ریز چیز، جو قفس عنصری میں مقیّد کر دی گئی ہے۔

حکیم فیثاغورث کا ساتھی حکیم دیمقراطیس تھا۔ جس نے اجزاے لایتجزّٰی کا مسئلہ تیار کیا۔ مگر چونکہ یہ حکماے دہریّین کا امام ہے اس لیے اس کا ذکر مسئلۂ دہریت کے ساتھ کیا جائے گا۔

اس تمام بحث سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ حکماے فلسفہ طبیعی گو کہ تلاش حق میں سرگرم تھے مگر اُن کا قدم عالم و مظاہر فطرت سے کسی طرح آگے نہ بڑھ سکا۔ چنانچہ انکی آخری پرواز یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے خود فطرت کو ایک وحدت قرار دیا۔ جو کثرت یعنی اشکال و صور کے لباس میں جلوہ نما تھی۔

آخرالامر اشراقیین کا وقت آیا۔ جنھوں نے مظاہر فطرت کے تنگ دائرہ سے قدم باہر نکالا اور عالمِ ارواح کی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔

حکیم پارمینڈس ان کا امام تھا۔ اس نے جن مسائل کا اظہار کیا وہ یہ ہیں:۔

عدم ایک ناممکن چیز ہے۔ جو چیز ممکن اور ثابت ہے وہ وجود ہے۔ یہ وجود اُسی قادر مطلق ہستی کا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ خلا، وقت، کثرت۔ تغیر، یہ سب باتیں محض خیالی ڈھکوسلے ہیں۔

اس نے ایک نظم بھی لکھی تھی۔ جس میں اس نے مسائل تغیر وغیرہ کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اسی نظم میں اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے عقل کی دیوی نے یہ حکم دیا ہے کہ میں آدمیوں کو وہ امرِ حق بتلا دوں جو کبھی تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ یہ حکیم اپنے آخری وقت میں زینو کے ہمراہ شہر اتھنس میں آیا اور سقراط سے جو اُس وقت ایک بست سالہ نوجوان تھا مباحثہ کرتا رہا۔ حکیم افلاطون اس کا نام ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا کرتا تھا اس کا یہ قول تھا کہ " اگر تمام فلاسفر یکجا کر دیے جائیں تب بھی پارمینڈس سب پر فائق ثابت ہوگا۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ شخص مجموعی حیثیت سے سب سے زیادہ قابلِ احترام ہے۔

اس حکیم کے بعد سب سے زیادہ سربرآوردہ فلسفی حکیم سقراط تھا۔ جس کا ذکر ہم کو اس جگہ مقصود ہے۔ مگر ہم اُس کا ذکر صرف اس قدر کریں گے جس سے اُن مسائل فلسفیہ پر روشنی پڑتی ہے جن کی اشاعت و تعلیم اس نے اپنا مقصد زندگی قرار دیا تھا۔ کیونکہ حیاتِ سقراط لکھنا مقصود نہیں ہے۔

حکیم سقراط

اس حکیم نے اہم مسائل حیات و اخلاق کو اپنا مبحث قرار دیا تھا۔ مثلاً یہ مسائل کہ نیکی کی کیا ماہیت ہے۔ امر حق کیا شے ہے۔ انصاف کس کو کہتے ہیں۔ ان پر وہ ہمیشہ بحث کیا کرتا تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے اعلان کے ساتھ یہ بیان کیا کہ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اپنی حقیقت معلوم کرے تو اُسے چاہیے کہ آپ اپنا مطالعہ کرے۔ اپنی فطرت پر غور کرے۔ اپنی خوشیاں، اپنی نیکیاں، اور بدیاں دیکھے اور نیز دیگر مخلوقات سے اپنا مقابلہ کرکے سمجھے کہ اُس کا مرتبہ کیا ہے اور اُس کے وجود کا منشا کیا ہے۔ نیز یہ کہ اُس کے پیدا کرنے سے خالق کو کیا نتائج برآمد کرنا مقصود ہیں۔

حکیم سقراط نے تمام مدبرینِ مُلک۔ شعرا۔ عقلا۔ اور فلاسفروں پر جرح کی ہے۔ اسکی مختتم رائے یہ تھی کہ بنی آدم کے تمام علوم محض مفروضہ اور در اصل جہل ہیں۔ حقیقی عقل و علم صرف خداوند تعالیٰ سے متعلق ہے۔ انسانی عقل محض بے کار شے ہے۔ آدمیوں میں سب سے زائد عقلمند وہی شخص ہے جس کو صرف یہ معلوم ہو کہ "مجھے کچھ بھی معلوم نہیں"۔

یہ پہلا شخص تھا جو عقل کی آزادی کی حمایت اور اعلانِ توحیدِ حق کی وجہ سے شہید کیا گیا

حکیم افلاطون

حکیم سقراط کا پیرو اور شاگرد رشید تھا۔ اس نے ارض مقدس۔ مصر۔ ہندوستان و چین تک کا سفر کیا تھا۔ ہر گروہ کے خیالات کا علم رکھتا تھا۔ کیونکہ اس نے ہر فن کے ماہروں یعنی متکلمین۔ اصولی۔ مذہبی۔ صوفی منش۔ مہندس۔ فلاسفر۔ صناع۔ شعرا میں کے سربرآوردہ لوگوں سے علم اخذ کیا تھا۔

یہ حکیم آج تک الٰہیات کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

افلاطون کے اہم اقوال یہ ہیں:۔

یہ دنیا بقائے دوام کا پہلا زینہ ہے۔ موت رُوح کو جسم کی قید سخت سے آزادی بخشتی ہے

بدیں وجہ عقلا موت کی تمنا کرتے ہیں اور اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔"

"انسان اپنے خالق سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہماری دنیاوی زندگی بھی ایک قسم کی موت ہے۔ رُوح نکل جانے کے بعد نعش کی تجہیز و تکفین کے متعلق اسراف بالکل ناجائز ہے۔ کیونکہ وہ پیارا جس کی نسبت اعزا و اقربا یہ خیال کر رہے ہیں کہ ہم اس کو سپردِ خاک کر رہے ہیں، دراصل کہیں اور ہی چلا گیا ہے اُس کو اس جھمیلے سے کچھ مطلب اور واسطہ نہیں ہے۔"

اصل چیز رُوح ہے۔ اور ہم اُسی کی طفیل موجودہ حالت میں دکھائی دیتے ہیں یہ جسم رُوح کی تصویر اور اُس کا سایہ ہے۔ جسم سے علٰحدہ ہونے پر رُوح اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ آدمی کیا چیز ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ اس کی ہستی ایک کٹھ پتلی سے زائد نہیں ہے جو قضا و قدر کے زبردست ہاتھ کے ادنیٰ اشارہ پر ناچتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جو افعال اُس سے سرزد ہوتے ہیں ان میں کچھ شائبہ اختیار کا بھی موجود ہے

حکیم ارسطو

افلاطون کا شاگرد رشید تھا مگر اس کا پیرو نہ تھا۔ ۲۰ سال تک اُستاد کی خدمت میں رہا۔ اس کی رائے روحانیت کے مسئلہ میں اُستاد کے خلاف تھی۔ اس نے اپنے علم و فضل کی وجہ سے نصف دنیائے علم پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ اُس وقت سے اس وقت تک یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر فلاسفر اپنے خیالات کے حساب سے یا فلاطونی ہوتا ہے یا ارسطوئی ہوتا ہے۔

یہ شخص بغیر کسی قوی دلیل کے ایک بات بھی مُنھ سے نہیں نکالتا تھا۔ یہ میدانِ عمل کا فرد فرید تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے اپنی کتاب (سیاست) تصنیف کی تھی تو اس سے قبل تین سلطنتوں کے آئین کا مطالعہ محض اسی غرض سے کیا تھا۔ اس کا قول ہے کہ مجھے ایسے فلاسفروں سے بالکل ہمدردی نہیں ہے جو بجائے غور و خیال کے شاعرانہ بلند پروازی سے کام لیتے ہیں۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ارسطو نے علوم خاص کے زمانہ کا افتتاح کیا تھا اور فلسفہ

کے ہر شعبے کو اس نے ایک مستقل علم کی شکل عطا کی تھی۔ چنانچہ فلسفہ کی خاص خاص شاخیں جو اس کے فیض سے علوم مستقل بن گئی ہیں، یہ ہیں۔

(۱) فلسفۂ طبعی یا فلسفۂ فطرت، جس کا ذکر ہم اسی حصے میں کر چکے ہیں۔

(۲) علم مابعد الطبیعی۔ (۳) علم النفس (۴) علم منطق (۵) علم تناسب اشیا (۶) علم اخلاق (۷) فلسفۂ قانون (۸) اشتراکیات (۹) فلسفۂ تاریخ۔ (باقی آیندہ)

یادداشت:۔ جاننا چاہیے کہ علوم فلسفیہ کی بہت سی شاخیں تو ضرور ہیں لیکن اگر ذرا سا غور کیا جائے تو یہ صاف نظر آوے گا کہ یہ سب علوم صرف تین مسئلوں میں سے کسی نہ کسی سے متعلق ہیں:۔ (۱) مسئلہ وحدت (۲) مسئلہ کثرت (۳) مسئلہ مخلوقات ذی حیات۔ یہ مسائل وہی ہیں جن پر آدمی کے ابتدے شعور کے زمانہ سے بحث ہوتی آرہی ہے اور دنیا کے اختتام کے وقت تک ہوتی چلی جائے گی۔

خادم حسین

اہلِ حرم کا ساتھ بہت دن سے چھوڑ کے
ہم بتکدے میں بیٹھ رہے پانؤں توڑ کے

کیا جانے آنکھ پھیر کے کیا اُس نے کہدیا
بیٹھے ہیں مُنھ ہم اپنے پرائے سے موڑ کے

دامن ہمارے خون میں آلودہ کیجیے
گھر ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے اک ہاتھ چھوڑ کے

تصویرِ نا امیدیٔ یاس و الم ہیں ہم
کُنجِ قفس میں بیٹھے ہیں گلزار چھوڑ کے

مہندی کے بدلے پاؤں میں دل کا لہو لیں
اتنا کہیں گے آپ سے ہم ہاتھ جوڑ کے

واعظ حرام کیوں نہ کہے تو شراب کو
نکلا ہے خانقاہ سے ایمان چھوڑ کے

بیٹھے ہیں سجدہ کرنے تو اے آرزوے دل
اُٹھیں گے سنگِ تربت کا فر کا توڑ کے

اُس کو خبر نہیں ہے کہ یہ گھر خدا کا ہے
شاداں وہ بت ہے جگر دل کو توڑ کے

جگر۔ صدیقی (بسوانی)

قبائے رنگیں

(بسلسلۂ انتظار ماہ نومبر ۱۹۱۵ء)

مضمون ذیل ہمارے دفتر میں اُس وقت موصول ہوا تھا جبکہ ہم شدت علالت کے باعث قطعاً معطل و بیکار تھے اور کارکنان دفتر اسی کے اثر سے سراسیمہ و مضطرب۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون بعض دوسرے کاغذات کے ساتھ ایک ناقابل امتیاز مجموعہ میں جاکر مل گیا اور کسی کو اسکی خبر نہ ہوئی۔ تا آنکہ صاحب مضمون مہینوں بعد اُس کے متعلق مستفسر حال ہوے اور غالباً ہم سے ہماری لاعلمی کی حالت میں یہ جواب پاکر کہ مضمون نہیں پہونچا کسی قدر بددل بھی ہوے ہوں گے۔ اب اتفاق سے کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں یہ مل گیا تو کمر بستہ پر ڈاک خانہ کی مُہر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ کب کا آیا پڑا ہے۔ بہر حال ہمیں اس کا بدل افسوس ہے اور ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد امید ہے کہ صاحب مضمون کو کوئی شکایت نہ رہیگی اور وہ اس کے بقیہ اجزا کی روانگی میں آیندہ تامل نہ فرمائیں گے جیسا کہ اِدھر اُن کی خاموشی سے اندیشہ ہو چلا ہے۔ ایڈیٹر

تیقّنِ قتل کے بعض علامات

جاتے ہوے سمیّہ راستہ میں اپنے خیالات میں گُم ہو گئی۔ ابھی امۃ اللہ کی دلدہی۔ اور عرفجہ کی فہمایش سے جو اطمینان کا رنگ اُس کے چہرہ سے عیاں ہو رہا تھا، وہ سب کافور ہو گیا۔ خاص کر اُس موقعہ پر پہونچتے ہی اُس کی حالت میں ایک عجیب قسم کا تغیّر واقع ہوا جہاں چند حبشی غلام ایک اونٹ کو نحر کر کے اُس کی کھال نکال رہے تھے۔ معاً اُس کا خیال اِدھر گیا "ہو نہ ہو انھیں لوگوں نے حسن کو قتل کیا ہے، اور یہ اُسی کا اونٹ ہے، جسے اُس کے قتل کے بعد یہ لوگ خوشی خوشی کاٹ رہے ہیں۔ ہائے! ان لوگوں کے دل نے اُس بے گناہ کے قتل

کو کیسے گوارا کیا ہو گا؟

ان خیالات کے ساتھ ہی اُس کے چہرہ پر رقت و گرویدگی کی عجب کیفیت طاری ہوئی۔ مگر خدا جانے کیا سوچ کر اُس نے اپنی حالت کو فوراً سنبھالا، کیونکہ اُس کی تغیر شدہ حالت میں خاص ترقی نہیں ہوئی۔

امۃ اللہ اُس کے چہرہ کے ان تغیرات کو نظر بچا بچا کے دیکھتی جاتی تھی کہ اتنے میں طارق کا کیمپ آ گیا۔ محمل ایک وسیع اور بلند خیمہ کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ جو بہت سے خیموں کے جھرمٹ میں استادہ تھا۔ اور سمیہ معہ امۃ اللہ محمل سے اُتر کر خیمہ میں گئی۔ خیمہ نہایت پرتکلف و بیش قیمت اسباب آرائش و آسائش سے آراستہ تھا۔ اندر جا کر سمیہ فرش پر بیٹھ گئی۔ امۃ اللہ بھی اُسی کے پاس لب فرش جا بیٹھی۔ سمیہ اگرچہ خیمہ کے اندر تھی مگر باہر لشکر والوں کی دوڑ دھوپ۔ کام کاج۔ اِدھر اُدھر آمد و رفت کا غل و شور ایسا تھا جس نے کچھ دیر کے لیے اُس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہیں قریب ہی ایک کُتّا ایک سبز عبا کو لیے ہوئے اُس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اُسے نوچتا تھا، اور چھوڑ کر چلا جاتا تھا، پھر دوڑ کر شکار کی طرح اُس پر حملہ کرتا تھا۔ دو چنے کے بعد اُسے اُچھال دیتا تھا۔ اسی طریقہ سے ایک مرتبہ جو اُس نے اُچھالا تو عباء خیمہ کے اندر سمیہ کے سامنے جا گری۔ اُس نے کُتے کو دُتکار دیا، امۃ اللہ نے اُسے لکڑی سے اُٹھا کر باہر پھینکنا چاہا تو کیا دیکھتی ہے کہ عبا خون سے تر بتر ہے۔ اُس نے تعجب سے پاس لے جا کر سمیہ کو دکھایا، اُسے دیکھتے ہی سمیہ کے کلیجے پر ایک چوٹ سی لگی۔ حسن کے تیقن قتل کی وجہ سے رقیق القلب اور دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ اور چند در چند شبہات میں مبتلا ہونے سے "دیوانہ را ہوئے بس است" کی صورت ہو گئی۔ اُس نے کہا "ہو نہ ہو یہ والد کی عبا ہے جو انھوں نے حسن کو دی تھی۔ اور جس کا منشا یہ تھا کہ اس عباء کے ذریعہ سے قاتل کو شناخت میں آسانی ہو۔ میں اُس وقت پس دیوار کھڑی تھی۔"

یہ سُن کر اگرچہ معاملہ کی پیچیدگی سے وہ گھبرائی، مگر اشارہ سے سمیّہ کو خاموش رہنے کی

ہدایت کی اور چپکے سے پوچھا " یہ تم نے کیسے جانا کہ یہ وہی عباء ہے؟ کیا ایک طرح کی اور نہیں ہوسکتیں؟"

سمیّہ (بات کاٹ کر) نہیں، میں اُس عباء کو خوب پہچانتی ہوں، اس لیے کہ وہ خاص میرے ہی ہاتھوں کی کاٹی اور بنائی ہوئی ہے (دامن ہاتھ میں لے کر) تو تم ہی دیکھو! کیا میرے ہاتھ کی سِلائی تم نہیں پہچانتیں؟" دکھانے کی اُلٹ پلٹ میں خون آلود حصہ پھر اُس نے دیکھا اُس کی سطح دماغ پر اس خیال کے وارد ہوتے ہی کہ یہ خون حسن کے رگِ گلو سے بہا ہوگا" پھر ایک تیر سا اُس کے کلیجہ پر پڑا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور رُکتی ہوئی آواز میں اُس نے کہا " اب مجھے اس بات کا قطعی یقین آگیا کہ حسن کی جان لی گئی اور وہ اب دنیا میں ...."

لُؤلُؤ از نرگس فروبارید گُل را آب داد   وز تگرگ روح پرور مالش عناب داد

امۃ اللہ (قطع کلام کرکے) تمہارا اچھا یقین ہے۔ بھلا اس قبا کو حسن سے کیا تعلق۔ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں آپ کرتی ہیں؟

سمیّہ بے شک۔ میری باتیں بہکی ہوئی نہ ہوں گی تو کس کی ہوں گی۔ تم خود باور کرو، اُس روز مکان پر جب حسن ملنے آئے ہیں تو وقتِ وداع باوجود اُن کے اظہار عدم ضرورت کے والدنے یہ اصرار اپنی سبز قباء اُنھیں دی؛ اور تاکید کی تھی کہ اسی کو اوڑھ کر وہ مدینہ سے روانہ ہوں کہ موسمی سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ ایسی منافقت کا درد و محبت جتانے والے کو خدا سمجھے۔ دکھانے کو تو یہ کہے اور دل میں یہ کاٹ پیچ بھرے ہوں کہ جان لینے والے جو پہلے سے مقرر کیے گئے ہیں اُن کو یہ قبا دکھا دی گئی ہے کہ جسے یہ قبا پہنے ہوے دیکھیں اپنا کاری وار اُسی پر لگائیں۔ خدایا! وہ اسی بے رحمی اور بے دردی سے میرا قصہ بھی پاک کر دیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ حسن مظلوم کی طرح میں بھی تو گردن زدنی ہوں۔ اگر وہ نہ سمجھتے ہوں اور پرسش و عقاب کا ڈر ہوتا! خداوندا! مجھے دعوٰی نہ ہوگا خونِ ناحق کا   تجھے اپنی قسم پرسش نہ کرنا میرے قاتل سے

اتنا کہا اور مُنھ ڈھانپ کر رونے لگی۔

امۃ اللہ۔ بیوی! ذرا صبر کرو۔ اب اس معاملہ کو خدا کو سونپو۔ اُس کے فضل اور شانِ کریمی سے آس مت توڑو۔ ہوگا وہی جو مقدر میں ہے۔ مگر صبر و شکر سے وہ پروردگار بہت خوش ہوتا ہے۔"

قاعدہ ہے کہ کسی مصیبت کے آنے سے پیشتر اُس کا تصور بھی بندھتا ہے تو دل دہل جاتا ہے۔ اُس کا صدمہ ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب انسان اُس میں مبتلا ہوجاتا ہے تو باوجود اضطرار و بے چینی امتداد سے رفتہ رفتہ ضبط و برداشت کی قوت بھی اُس میں منجانب اللہ آجاتی ہے۔ یہ صدمہ اگرچہ سمیّہ کے لیے قبل از وقوع جان لیوا تھا، مگر بعد از ابتلاء صبر و شکر ناگزیر امر تھا، صدمہ اور وفورِ غم سے اُس کا دماغ پورے طور پر کام نہ دیتا تھا مگر صبر و سکوت کے سوا اب اُسے بھی کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا، فطرتی تقاضا، استحفاف سے امۃ اللہ کی اُس وقت کی باتیں اُس کے دل میں بیٹھ گئیں۔ اور پورے طور پر بیٹھیں۔ وہ خاموش تو ہوگئی۔ مگر جیسے کچھ بڑے غور و فکر میں کوئی ہوتا ہے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی، پیشانی پہ بَل پڑے ہوئے، پَیر زمین پہ پھیلے ہوئے۔

امۃ اللہ نے اُس کی مزاج کو ٹھہرا ہوا دیکھا تو کٹی۔ شکیزہ پانی سے بھرا ہوا لاکر سامنے رکھ دیا اور ہاتھ مُنھ دھونے کو کہا۔ جب وہ ہاتھ مُنھ دھونے لگی تو خون آلود عباء کو لیکر سامنے سے علیٰحدہ کر دیا۔ اس کے بعد کھانا منگایا، خوشامد درآمد سے دوچار نوالے اُسے بھی کھلائے اور خود بھی کھایا۔ کھانے کے بعد سمیّہ لیٹ گئی اور بظاہر سو بھی گئی۔ مگر امۃ اللہ کو بجائے خود اطمینان نہ ہوا، اُس نے ساری رات اس معاملہ کے انجام پہ غور کرنے میں تارے گِن گِن کے کاٹ دی۔

ستارۂ صبح کی نمود سے پہلے ہی تمام سادہ منش عرب سپاہی اپنا سامان طیار کر کے منتظرِ حکم ہو بیٹھے۔ اُفقِ مشرق پہ ادھر سفیدۂ صبح نظر آیا، با جماعت فریضۂ صبحگاہی معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں سب بجا لائے۔ اور الرّحیل کا نعرہ بلند ہوتے باقاعدہ فوجی ترتیب کے ساتھ

تمام لشکر مکہ کی سمت روانہ ہوگیا۔

آگے آگے پیش خیمہ تھا، پیش خیمہ کے بعد سردارانِ فوج و شیوخِ قبائل، اُن کے وسط میں طارق بن عمرو ایک چالاک عربی گھوڑے پر سوار چھلاوے کی طرح جس میں تڑپ، ایک فارسی زرہ اُس کے زیب بر۔

بدوی سپاہیوں اور عرب سرداروں کے جسم پر اگرچہ کوئی زرق برق وردی اور اُس کا لوازمہ چمکدار اور نازک ساخت کے اسلحہ نہ تھے، مگر ان کی رفتار سے استقلال، تیور سے تہوّر اور عزت نفس پر سر کٹانے کی آن نمایاں تھی۔ یہ جماعت اپنے یکساں بدوی لباس میں، دُبلے مگر چالاک اور صبا رفتار عربی گھوڑوں پر سوار، لمبے لمبے نیزے معمولی طریق پر اس طرح سنبھالے ہوئے کہ اگر کوئی بھولے سے بھی ان کے سامنے آجائے تو ان کے پھل سینہ و جگر کے پار ہوئے بغیر نہ رہیں۔ آہستہ آہستہ رواں تھی۔

سب سے پیچھے ایک محمل تھا، جس کی مُہار ایک حبشی غلام کے ہاتھ میں تھی۔ چپ و راست حفاظت و احتشام کی غرض سے کئی کئی سوار تھے۔ یہ سمیّہ کا محمل تھا۔

طارق قلب لشکر سے نکل کر بار بار محمل کے پاس آتا تھا، پوچھتا تھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ جس کا جواب اندر سے امۃ اللہ "ہاں" یا "نہیں" میں دیتی تھی۔ پھر ایک چکر تمام فوج کا وہ اس غرض سے لگاتا تھا کہ کوچ میں سپاہی اپنی تہذیب و ترتیب سے کہیں متجاوز تو نہیں ہوئے۔

(۴۲)

عبداللہ

چونکہ سمیّہ کو "دلے بربندش" کی قید میں جہاں وہ جانا نہیں چاہتی وہاں اب جانا ہی ہوگا اس لیے اس مجبوری پر نظر کرکے ہم بھی تا وقتیکہ وہ مکہ نہ پہونچ جائے اُسے خدا کو سونپتے ہیں اور اس ٹوہ میں نکلتے ہیں کہ عبداللہ خادمِ حسن جب سمیہ کو پہونچا کر واپس ہوا تو کہاں گیا؟ اور اُس پر کیا گذری؟

عبداللہ سمیہ کو خاتون محترم کے یہاں پہونچا کر واپس گیا۔ مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد پھر عرفجہ کے مکان پر اُسے پوچھنے آیا۔ اور اُسے نہ پاکر فوراً واپس گیا۔

عبداللہ کے دوبارہ آنے کی خبر سمیہ کو امۃ اللہ نے اُس وقت دی جب وہ خاتونِ محترم کے یہاں سے اپنے باپ کے گھر آئی۔ سمیہ یہ سُن کر سخت پریشان ہوئی کہ عبداللہ کے دوبارہ آنے کی آخر! کیا وجہ تھی؟ مجھے پوچھنے آیا تھا تو پھر آنا تھا، یا ٹھہر کر انتظار کرنا تھا۔ یہ کیا؟ کہ آیا، اور فوری واپس چلا گیا۔

سمیہ کی فکر اور تشویش بیجا نہ تھی، مگر اصل ماجرا اور حقیقت حال اور ہے۔ جب عبداللہ نے سمیہ کو بھیج کر واپس ہوا تو حسن کی تنہائی اور انتظار کے خیال سے وہ تیز قدم روانہ ہوا اُس نے آج سمیہ اور حسن کی گفتگو سے حسن کی جان کے خطرہ میں ہونے کی جو کیفیت بوقت ملاقات ان دونوں سے قریب رہنے کی وجہ سے سنی تھی، اُس سے وہ متردد اور پریشان بھی تھا، اس وقت ان خیالات سے اس پر کچھ ایسی ربودگی غالب ہوئی کہ راستہ بھول کر وہ کہیں سے کہیں جا رہا۔ یہاں تک کہ باب المدینہ کے بجائے کسی دوسرے دروازہ سے جب وہ بیرون آبادی آیا تو اُس نے اونٹ کو اور حسن کو دیکھا مگر نہ پایا۔

تاریکیِ شب بڑھ رہی تھی۔ عبداللہ اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا، آخر کار راستہ نہ پاکر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ جدھر قصد کرتا تھا، کوئی درخت یا جھاڑی حائل راہ ہو جاتی تھی۔ آخر دیر کے بعد اس کشمکش سے نجات پائی تو اب حیران تھا کہ جائے تو کدھر؟ بدویوں کی طرح وہ کواکب کے اندازہ و شمار سے واقف نہ تھا کہ اُن کے پتہ پر روانہ ہو۔ آخر دُور پر ایک روشنی اُسے نظر آئی۔ جس کے پاس وہ گیا، جہاں سمت و جوانب کا کچھ نہ کچھ پتہ اُسے ملا۔ اور راستہ پر پڑ کے آبادی میں آیا۔ یہاں آکے اُس نے خیال کیا کہ "کہیں حسن اپنی محبوبہ (سمیہ) کے یہاں نہ آگئے ہوں"۔ اس خیال سے وہ سیدھا عرفجہ کے مکان پر آیا، یہاں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حسن کیسے، سمیہ بھی یہاں نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر

بیرون آبادی حسن کو ڈھونڈھنے روانہ ہوا، اور غریب نے ساری رات ادھر سے اُدھر چکر کاٹ کاٹ کے گذار دی مگر حسن کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اب غالباً سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عبد اللہ کے عرفجہ کے مکان پر آکر سمیہ کے پوچھنے کا باعث کیا تھا۔ اُتنی رات کا خیال کیجیے اور اب صبح ہو گئی تھی مگر عبد اللہ اب تک برابر دوادوش میں مصروف تھا، کہ ناگاہ اُس کے کان میں اونٹ کی آواز آئی، جس پر اُس نے کان لگایا تو پھر آواز آئی۔ وہ آواز کی طرف چلا تو قریب سے آواز آئی، اور آواز بھی مانوس اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے عادت کے موافق کچھ الفاظ کہکر اونٹ کو بلایا۔ جسے سُنتے ہی اونٹ بل بلایا، مگر بغیر جنبش و حرکت کے۔ اس سے اُس کا گمان درجۂ یقین کو پہونچ گیا کہ یقینی میرے آقا کا اونٹ ہے۔ اور وہ فوراً اونٹ کے پاس پہونچا۔ دیکھا تو فی الواقع حسن کا اونٹ تھا، مگر کوچیں کٹی ہوئی تھیں، جس سے وہ جنبش نہ کر سکتا تھا۔ قریب جانے پر وہ اسکی طرف گردن پھیر پھیر کے دیکھتا اور اپنی معذوری اور شب گذشتہ کے واقعات اپنی زبان میں اُس سے کہتا تھا، بہرحال اس امر کے متحقق ہونے پر کہ اُسکی کوچیں کٹی ہوئی ہیں، اور حسن کا پتہ نہیں، اُس کے پریشانی و اضطراب میں دوگونہ اضافہ ہوگیا۔

پھر اُس نے کجاوہ اونٹ پر سے اُتارا، اور اُس میں جو کچھ تھا، اُسے نکالا، اور اُسے لے کر کچھ سوچتا ہوا پھر مدینہ کی آبادی کی طرف روانہ ہوا۔ عرفجہ کے مکان کے قریب پہنچا تو پہلے اس کا ارادہ ہوا کہ حسن کو پوچھے۔ مگر اس خیال سے کہ اس سے مبادا سمیّہ پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے، رُک رہا۔ تاہم پتہ لگاتا ہوا نکلا، کہ شاید کچھ سراغ لگے۔ مگر ناکامی کے سوا وہاں کچھ نہ تھا، اس کے بعد وہ وہاں گیا جہاں یوم ورودِ مدینہ اُس نے شب گزاری تھی۔ مگر وہاں میدان خالی تھا۔

تلاش و تجسس میں اپنی انتہائی قوت صرف کر چکا تھا اس لیے وہ ایک جگہ بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا، اس نے کجاوہ کا سامان کھولا۔ جس میں اُسے مُہر کیا ہوا ایک خریطہ ملا، جس پر

عبداللہ ابن زبیر کا نام لکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہی خط حسن کے یہاں آجانے کا باعث اور سبب ہوا۔ مگر اُس نے سوچا کہ اگر حسن سے اونٹ چھوٹ گیا تھا تو اُس نے اس خط کو اُس میں کیوں رہنے دیا؟ اس مقام پر اُس کے دماغی عضلات میں ایک سخت ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی۔ اُس کا دل خود بخود اس امر کی گواہی دینے لگا کہ ہو نہ ہو اُسے کوئی سخت ناگہانی مرحلہ پیش آیا ہے۔ یا تو وہ جان سے مارا گیا ہے یا اپنے قبضہ و اختیار میں نہیں رہا۔ اس خیال سے دم بہ دم اُس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ عجیب مہیب و متوحش خیالات اُس کے خزانہ خیال میں دورہ کر رہے تھے۔ سارا دن اُس کا اسی اُدھیڑبُن میں گزرا۔ ایک دانہ تک اُس کے منھ میں اُڑکے نہ گیا۔ باؤلے کی طرح کبھی وہ یہاں کھڑا ہے تو کبھی وہاں جا پہونچا ورجہاں پہونچتا ہے ہر شخص کا مُنھ تکتا ہے۔ ہر ایک کی گفتگو پر کان لگاتا ہے کہ شاید حسن ہی کی بابت کچھ کہہ سُن رہے ہوں۔ مگر وہاں آج حجاج کی طلب پر کمک کی روانگی کے ذکر کے سوا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ بہرحال سخت اُلجھن اور بے چینی کے ساتھ اُس نے دوسری رات بھی مدینہ میں گذاری۔ مگر اب اُسے یہ فکر تھی کہ مجھے کرنا کیا چاہیے۔ مشورہ دینے والا اور راے بتانے والا وہاں اُس غریب کو کون تھا، آخر اُس نے خود ہی اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا، کہ پہلے خالد کے خط کو عبداللہ بن زُبیر کے پاس پہونچا کر حسن کی سفارت مجھے پوری کرنی چاہیے۔ اب درمیان میں اُس کی تلاش سے بھی غافل نہ رہوں گا۔ ممکن ہے کہ اسی میں کہیں مل جائے۔

اللہ ری میری شامِ الم کی اُداسیاں جس سمت دیکھتا ہوں سماں بیکسی کا ہے

(۴۳)

عبداللہ ابن زبیرؓ

حضرت عبداللہ بن زبیر ایک جلیل القدر صحابی جناب رسول اللہؐ کے تھے۔ بعد وفات جناب معاویہؓ جب یزید کے لیے بیعت لی جانے لگی تو مثل حضرت امام حسین علیہ السلام کے اُنھوں نے بھی اُس کی بیعت سے انکار کیا، اور دونوں بزرگواروں نے بلحاظِ مصلحتِ وقت مدینہ سے ہجرت

فرما کے مکہ میں اقامت اختیار کی۔ اور جمہور کو اپنی اپنی بیعت کی تبلیغ کی۔ مگر عبداللہ نے مظاہرہ کو جناب امام ہمام کے مقابلہ میں جائز نہ رکھ کے اپنی تبلیغ کو اُن جناب کی صدائے تبلیغ پر فوق دینے کی کبھی جرأت نہ کی۔ یہاں تک کہ جناب امام نے کوفہ کا قصد فرمایا، اور اُس کے بعد معرکۂ کربلا پیش آیا۔

شہادت جناب سید الشہداء کے بعد اُنھوں نے اپنی ذات کو احق بالامامت پایا اور تبلیغ و دعوت کا نعرہ لبند آہنگی کے ساتھ بلند کیا۔ حجاز و یمن کا سواد اعظم اُن کی دعوت پر لبیک کہتا ہوا ٹوٹ پڑا۔ مکہ کو اُنھوں نے اپنا دار الخلافت قرار دیا۔

عبداللہ کی کامرانیوں کے اس شہرہ نے بنی اُمیہ کے حریفانہ جوش کو اُبھار کر کئی مرتبہ ان سے دست و گریبان کرایا، مگر کبھی بھی ان کی اُن سے پیش نہ گئی۔

عبدالملک بن مروان کو بھی اپنے عہد میں اس مدعیِ گراں کا وجود خار کی طرح کھٹک رہا تھا، مگر وہ توازن کے ساتھ توفیرِ قوت کا منتظر تھا، کہ جس سے پورا پورا استیصال ہو سکے۔ عبدالملک کے اس منشاء دلی کو پا کے حجاج بن یوسف نے جو اُس کے دربار کا ایک امیر کبیر، اور اُس کا مزاج شناس تھا، اس خصوص میں اُس کو متوجہ دیکھ کر عرض کیا۔ "میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں نے عبداللہ بن زبیر کو پکڑ لیا ہے، اور اُس کی کھال نکال کر اُس میں بھوسہ بھرا کر لٹکوا دیا ہے"۔

عبدالملک اُس کا خواب سن کر بہت خوش ہوا اور حجاج کو تین ہزار شامی سپاہ کا سردار مقرر کر کے عبداللہ ابن زبیر کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ اور ایک دستخطی فرمان اس مضمون کا بھی اُسے دیا کہ اگر ابن زبیر مع اپنے ساتھیوں کے خود اطاعت کر لیں تو وہ اپنے کو ہماری امان میں سمجھیں۔

---

۵ اہل عرب کے یہاں کسی سرکش کو زیر کرنے کے بعد عبرت اغیار کے لیے یہ طریقہ رواج پذیر تھا کہ اُسکی کھال نکال کر اُس میں بھوسہ بھر کر اُسے منظر عام پر لٹکا دیتے تھے۔ اس سے تشہیر غلبہ کے سوا اپنے جوش انتقام کو سراہنا بھی مقصود ہوتا تھا۔

حجاج[1] اس مہم پر بڑے کروفر سے روانہ ہوا، اور جاتے ہی دونوں لشکروں میں مُڈبھیر کی نوبت آگئی۔ کئی روز تک جنگ بالمقابل جاری رہی۔ آخر جب نقشۂ جنگ کسی طرح پلٹتا ہوا نہ دکھائی دیا، تو حجاج کو تشویش ہوئی۔ اور اُس نے ذریعہ معروضہ پیشگاہ عبد الملک سے حصارِ کعبہ اور حرم میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ عبد الملک کے یہاں سے اجازت سے علاوہ پانچ ہزار سپاہ اور بطور کمک کے بھی آئی۔ اس سپاہ کے آنے سے حجاج کی گذشتہ قوت اور حوصلہ میں ایک عظیم اضافہ ہوگیا، اور دوسرے ہی دن اس لشکرِ جرّار نے ابن زبیر کو مع اُن کے ساتھیوں کے کُھلی ہوئی فضا سے بھگا کر حرم میں محصور کرلیا۔ اور فوراً جبل بوقبیس پر جو آبادیِ مکہ کے شمال و مشرق میں واقع ہے منجنیقیں نصب کردیں۔ مسلمانوں پر یہ امر بہت شاق تھا، مگر اس سے چھٹکارے کی صورت ہی کیا تھی۔ چند ہی روز میں کھانے پینے کے سامان کی کمی سے اُنھیں بھوک پیاس کے شدائد میں بھی مبتلا ہونا پڑا۔ مکہ اُس وقت نام تھا، تھوڑے سے قطعۂ زمین پر مسجدِ حرام اور اُس کی متعلقہ چند عمارات کا۔ جس کے عین وسط میں کعبہ کی ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی۔ مگر عبد اللہ ابن زبیر نے حجاج کی چڑھائی سے قبل اُسے پہلے سے زیادہ وسیع رقبہ اور پیمانہ پر تعمیر کرادیا تھا۔ جبل بوقبیس پر جو منجنیقیں چڑھی تھیں عمارتِ کعبہ بالکل اُن کی زد پر تھی۔

عبد اللہ ابن زبیر مع اپنے جاں باز اصحاب کے مسجد حرام کی متعلقہ عمارتوں میں مقیم و محصور تھے، اور باوجود ان شدائد و تکالیف کے اپنے قول پر قائم اور غیرحق کی اطاعت سے استقلال اور ثبات کے ساتھ رُوکشی کا عملی ثبوت دے رہے تھے۔ حجاج کی فوجیں ہر وقت محصورین کے چہار جانب چکر لگاتی رہتی تھیں کہ کہیں سے کوئی مدد محصورین کو رسد وغیرہ کے متعلق نہ پہونچ جائے۔

با ایں کثرت و شمار و سدّ و سائل جب اُن ناحق کوشوں کی اس قلیل جماعت نے

[1] یہ ۷۲ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۲

اطاعت نہ کی، اور اپنے عروۃ الوثقیٰ مقال سے باوجود اُن کی تحریفات اور اپنے ابتلاے شدائد کے کسی طرح نہ پھرے، اُس وقت پھر حجاج کو توسیعِ لشکر کا خیال ہوا کہ ایک زبردست حملہ کر کے ان طائرانِ حرم کو ایک دم میں شکار کر لیا جائے۔

اور اسی خیال کے بموجب اُس نے طارق عامل مدینہ کو معہ اُس کے لشکر کے طلب کیا تھا، جو آپ کو کسی پچھلے باب میں معلوم ہوا ہے کہ مدینہ سے روانہ ہو چکا ہے۔ اور مکہ پہونچنے ہی کو ہے۔

(۴۴)

محمد بن حنفیہ اور مختار

ہمارے عزیز دوست حسن کو مکہ روانہ ہوے عرصہ ہوا۔ مگر وہ تاریخ ہے اور آج کا دن کہ اُس کے احوال کی مطلق ہمیں اطلاع نہیں۔ آخر اُس کی خبر تو لینی چاہیے کہ منازل سفر اُس نے خیریت سے طے کیں، اور وہ مکہ پہونچا یا نہیں؟

مکہ سے روانگی کے روز سلیمان کے والد نے جو اونٹ حسن کو سواری کے لیے دیا تھا اور جو اپنا خاص خادم اُس کے ساتھ کیا تھا، اُنھیں کی مدد سے حسن قطع منازل کرتا ہوا کچھ دنوں کے بعد ایک دن غروب آفتاب کے وقت مکہ پہونچا۔ دیکھا، تو وہاں کا رنگ ہی کچھ اور تھا، شامی سپاہ آبادی مکہ کے ہر چہار جانب خیمہ زن تھی۔ قدم قدم پر چوکیاں تھیں۔ جہاں مُسلّح ایرانی سپاہی مستعدی سے پہرے پر ٹہلتے ہوے معلوم ہوتے تھے۔

اس نقشے کو دیکھ کر حسن اور بلال دونوں کو حیرت ہوئی۔ بلال نے کہا "چوکی پہرے والوں کے دیکھنے سے تو یہ بنی امیّہ کی سپاہ معلوم ہوتی ہے۔ مجھے امید نہیں کہ ایسی حالت میں ہم آبادی کے اندر جانے پائیں۔ ذرا میں جاکر دیکھتا ہوں کیا معاملات ہیں؟ صورتِ رہائی بھی ممکن ہے یا نہیں؟"

حسن۔ ہاں جاؤ! مگر وہاں دیر نہ لگانا، میں وہاں سامنے والے کھنڈر کے پس پُشت

ٹھہرتا ہوں، وہیں آنا۔"

بلاؔل گیا۔ اور حسؔن نے اونٹ کو لے جا کر اسی دیوار کے نیچے لا کھڑا کیا۔ یہ دیوار بجانب شرق راستہ سے بالکل علٰحدہ تھی، اور کسی قدیم تعمیر کی بوسیدہ یادگار معلوم ہوتی تھی۔ دیوار کی پشت پر اونٹ گیا تو دیوار اُس کے لیے بالکل حاجب بن گئی۔ حسؔن اُترا۔ اور کسل سفر کی وجہ سے زمین پر کمل بچھا کر دیوار کی ٹیک سے بیٹھ گیا، چونکہ بہت کسلمند تھا، آرام جو ملی تو دیر تک چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ جب بہت دیر ہوئی اور آفتاب کو غروب ہوئے عرصہ ہوگیا تو اُس کو بلاؔل کے اب تک نہ لوٹنے پر تعجب ہوا۔ یہاں تک کہ جب بالکل اندھیرا ہوگیا، اور بلاؔل نہ آیا، تب وہ اُٹھ کر راستہ کی طرف غور سے شفق کی روشنی میں دیکھنے لگا کہ آتا تو نہیں۔ اتنے میں بلاؔل کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اب اُس نے غور کیا تو دیکھا کہ بلاؔل ہرنیوں کی طرح کودتا آرہا ہے۔

آکر اُس نے بیان کیا کہ "رات میں اندر جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ یہ حجّاج کا لشکر ہے جس نے بہت زبردست محاصرہ اور ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

حسن ۔ پھر کیا ہو؟ جانا تو بہت ضروری ہے۔

بلال ۔ اس وقت ٹھہر جائیے، کل تک کوئی سبیل نکل آئے گی۔

حسن ۔ تو کیا رات اسی دیوار کے سائے میں بسر کرنی ہوگی؟

بلال ۔ جی نہیں۔ میں نے ایک جگہ تلاش کرلی ہے۔ جہاں تک امید ہے اُس ذریعہ سے کام بھی نکل جائے گا۔ یعنی آپ کی رسائی اندر بھی ہو سکے گی۔ اور آرام سے شب گذاری بھی کرسکیں گے۔

حسن ۔ ایسا وہ کون سا ذریعہ ہے؟

بلال ۔ محمد بن حنفیہ کو آپ جانتے ہیں؟

حسن ۔ جناب حسنین کے برادرِ علاّتی نا! اُنھیں کون نہیں جانتا۔

بلال - لبیک یا مولائی (جی ہاں) انھیں حجاج اور ابن زبیر ہر دو متخاصمین قابل عظمت جانتے ہیں - پس ان کی سفارش سے جہاں تک امید ہے ہم بآسانی اندر جا سکیں گے -

حسن - قاعدہ سے تو اُن سے اور متخاصمین سے عداوت ہونی چاہیے - کون نہیں جانتا کہ مختار نے اُنھیں کے لیے پہلے حجاز میں اور پھر شام میں تبلیغ بعیت کی تھی - ایسی صورت میں وہ دونوں ان سے کیسے خوش ہوں گے؟ کیا مختار کے کارناموں سے تم واقف نہیں ہو؟

بلال - جی نہیں -

حسن - یہی کہ مختار نے پہلے عراق میں محمد بن حنفیہ کے لیے اعلان خلافت کیا - جس کا مصعب بن زبیر نے آکر خاتمہ کیا - پھر مصعب بن زبیر نے عبد اللہ بن زبیر اپنے برادر کلاں کے لیے تبلیغ و دعوت کی - جس کی گرمجوشیوں کو عبد الملک بن مروان نے ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر کے عراق کو اپنے زیر نگیں کیا - بہرحال ان کا تو دونوں کے ساتھ رشتۂ رقابت قائم ہوگا؟

بلال - بے شک - آپ کا فرمانا بجا ہے مجھے یہ معلوم نہ تھا - لیکن مختار نے محمد بن حنفیہ کو تو صرف ایک آڑ بنا لیا تھا - ورنہ دراصل اُس کا منشا اپنی ذات خاص کے لیے حصول خلافت و تسخیر قلوب تھا - چنانچہ محمد بن حنفیہ ایک جاے خاص پر مقیم تھے اور مختار اُس کرسی ساتھ لیے ہوے اس کے متعلق عجیب و غریب روایات بیان کر کر کے اُس کے پراسرار اور مقدس ہونے کا رعب دلوں پر بٹھاتے پھرتے تھے - اُن کا بیان تھا کہ وہ کرسی حضرت علیؓ کی ہے جس پر آپ جلوس فرماتے تو ملائکۂ مقربین نزول فرماتے تھے اور پیغامات الٰہی و ارشادات ربانی آپ تک پہونچاتے تھے - گویا وحی و الہام اور مدارج نبوت کی آپ سے نسبت کی جاتی تھی - انھیں مزخرفات کو سُن کر لوگوں کو ان سے بدظنی ہوئی، اور اُن کا رنگ جیسا جمنا تھا نہ جما -

حسن - تم نے وہ کرسی دیکھی تھی؟

بلال - حضور دیکھنا کیسا، میں اُس کے تمام اسرار سے واقف ہوں - بلکہ میں اُس کی تقدیس سے پہلے بارہا اُس پر بیٹھا بھی ہوں -

حسن۔ خوب! آپ تو بڑے واقف الاسرار اور وسیع المعلومات نکلے۔ فرمائیے تو وہ کیا اسرار تھے؟

بلال۔ حضور! زندگی میں سب ہی رنگ کے انسان نظر سے گزرے ہیں۔ مثل ہے زیادتیِ عمر زیادتی تجربہ کی دلیل ہے۔ ایک زمانہ میں مجھے کئی سال تک مدینہ میں رہنے کا اتفاق ہوا میرے پڑوس میں ایک شخص طفیل بن جعدہ بن ہُبیرہ تھا، جس کی اکثر مجھ سے صحبت رہتی تھی اور طفیل کے پڑوس میں ایک گندھی رہا کرتا تھا، جس کے پاس بھی طفیل اکثر جا کے بیٹھتا تھا، میں بھی اتفاقاً کبھی اُس کی طرف جا نکلتا تھا۔ اُس کے مکان میں ایک کرسی پڑی رہتی تھی جس پر وہ مال بھی رکھتا تھا، اور جب وہ خالی ہوتی تھی تو کوئی آکے اُس پر بیٹھ بھی جاتا تھا۔ اتفاقِ وقت سے طفیل کو افلاس نے آگھیرا۔ وہ پریشان رہتا تھا، مختار نے اُنھیں ایّام میں اُن اشقیا اور بانی کاروں کے مقابلہ میں آوازۂ جہاد بلند کر رکھا تھا، جو ہنگامۂ کربلا کے بانی مبانی تھے۔ بہرحال طفیل نے حالتِ افلاس میں خیال کیا کہ کوئی جائز تدبیر حصول زر کی بن نہیں آتی تو کوئی حیلہ ہی کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے گندھی پڑوسی کے یہاں سے وہ کرسی چپکے سے لے لی جو خوشبویات اور تیل میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُسکو دھو مانجھ کر صاف کیا، تو اُس کے اندر سے نہایت چمکدار اور خوشرنگ لکڑی نکل آئی۔ اس کے بعد وہ سیدھا مختار کے پاس پہونچا۔ اور کہا،

"اس وقت میں آپ کو ایک راز سے آگاہ کرنے آیا ہوں جو مجھ پر ظاہر تھا۔ پس میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو بھی اس کی اطلاع کر دوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ابو جعدہ[1] (طفیل کے دادا) ایک کرسی پر نشست فرماتے تھے جو اب تک ہمارے یہاں محفوظ ہے اُس میں جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اثراتِ ولایت و امامت مرکوز ہیں۔ یہ سُن کر مختار نے کہا "سبحان اللہ! ایسی مقدس اور بیش بہا شئے کو اب تک تم نے

[1] اُمّ جعدہ یعنی طفیل کی دادی حضرت علی کی بہن ہوتی تھیں۔

کیوں مجھ سے چھپائے رکھا۔ فوراً اُسے میرے پاس لاؤ" حکم کے ساتھ ہی وہ کرسی کو لے گیا۔ اور مختار سے بارہ ہزار درہم بطور اُس کے ہدیہ کے اُس نے وصول کیے۔

مختار اُسے دیباے منقش سے منڈھوا کر اور قیمتی جواہرات سے مکلف بنا کر مسجد میں لے گئے اور بعد از نماز اُس کے متعلق یہ خطبہ دیا،

"مومنین یہ کرسیِ مقدسہ ذخائر جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السّلام سے ہے، جس کی عظمت ہمارے نزدیک بمنزلہ اُس تابوت کے ہے جو بنی اسرائیل کے پاس تھا، اور جس کے ذریعہ سے اُن پر سکینۃ من اللہ نازل ہوتی تھی۔ لڑائیوں میں فتح پاتے تھے اور ہر موقعہ سے مظفر و منصور ہو کر پلٹتے تھے"

لوگوں نے اس کی تصدیق کی۔ اور اس طریقہ سے اُس کرسی کو تابوت بنی اسرائیل کی وقعت حاصل ہوئی۔ یعنی لڑائی کے وقت وہ قلب لشکر میں رکھی جاتی تھی۔ اور رجز میں کہا جاتا تھا،

" فتح و ظفر تمھارے لیے ہے، کیونکہ تمھارے پاس وہ کرسیِ معظم ہے جو درجہ میں تابوتِ بنی اسرائیل کے مثل ہے۔ جس کی وجہ سے آسمان سے تمھاری مدد کو ملائکہ نزول فرمارہے ہیں۔ دیکھو! لشکر میں اور تمھاری صفوں میں اس کی روشنی اور برکت چھا رہی ہے، جس کا عکس تمھارے قلوب پر بطور سکینہ قلب کے پڑ رہا ہے، جو تمھاری رگوں میں شجاعت اور بسالت کا خون بن کر دوڑ رہا ہے، اور تمھارا حریف تمھارے خوف و دہشت سے مرعوب ہو رہا ہے"

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ محمد بن حنفیہ ان خرافات کو جائز رکھتے ہوں گے اور ان مکائد سے صرف اس لیے متفق ہوں گے کہ اس پردہ میں اُن کی امامت کی تبلیغ کا کام فروغ پا رہا ہے؟ حاشا و کلا! جو لوگ اُن سے واقف ہیں، کہ اُن کی ذات والا صفات ان اختراعاتِ فاسدہ سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔

حسن (قطع کلام کر کے) کیا تم اُن سے (محمد بن حنفیہ سے) اچھی طرح واقف ہو؟—

بلال۔ حضور! میں اُن سے خوب واقف ہوں۔ عہد جناب امیرؑ میں ایک زمانہ تک میں اُنکی خدمت میں رہا ہوں۔ لوگ اُنکی قوت کے متعلق سنی سنائی باتیں بیان کرتی ہیں۔ اور میرے سب وہ چشم دید واقعات ہیں،

حسن۔ اُن کی شہزوری کے کیا واقعات ہیں؟ میں نے نہیں سُنے۔

بلال۔ ایک واقعہ سُنیے! جناب علی ابن ابی طالب کی ایک زرہ تھی، جس کی کچھ کڑیاں وہ نکلوانا چاہتے تھے۔ اُسے ان کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنی کڑیاں اس زرہ سے نکالدیں اور انھوں نے نہایت معمولی طریقہ سے دونوں ہاتھوں سے اُن کڑیوں کو نکال دیا، بلا کسی اوزار کی مدد کے۔ اور پھر کڑیوں کے مُنھ کھول کر سب کے مُنھ جوڑ دیے۔

حسن۔ خوب! مگر محمد ابن حنفیہ کی واقفیت سے اس وقت کیا مطلب نکلے گا۔

بلال۔ مطلب یہ نکلے گا کہ وہ آج کل یہیں قریب مکہ ٹھہرے ہیں۔ ہم شب میں جاکر وہیں ٹھہریں گے اُس کے بعد کل دیکھا جائے گا۔

حسن۔ کیا جہاں وہ ٹھہرے ہیں، وہاں کا راستہ تمھیں معلوم ہے؟

بلال۔ میں نے یہاں سے جاکر اور کیا کیا؟ اپنے دل میں خیال کرکے گیا تھا کہ جب تک آپ کے لیے آرام کی جگہ تلاش نہ کرلوں گا، نہ لوٹوں گا۔ کیونکہ میرے آقا نے آپ کی راحت رسانی کی چلتے وقت مجھ سے سخت تاکید کردی تھی اور آپ کی ذات فی الواقع ہے بھی ایسی ہی کہ جس کے لیے کسی امکانی کوشش سے دریغ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

حسن۔ یہ تمھاری لیاقت ہے۔ خدا تمھیں تمھارے ارادوں میں برکت دے۔

اس کے بعد حسن اور بلال دونوں کجاوے کو اونٹ پر رکھنے میں لگ گئے۔ بلال نے کہا "ہیں، آجکل مکہ والے واقعی بڑی مصیبت میں۔ اور دیکھیے ابن زبیر کا کیا انجام ہو۔ امویوں نے بہت بُری طرح اُنکو گھیر رکھا ہے۔ بظاہر کوئی صورت بچاوے کی اُن کی نظر نہیں آتی۔

حسن۔ خدا رحم کرے۔ بیشک بڑی مصیبت اور نرغہ میں ہیں۔ (باقی آیندہ) جواد علیخاں عالی

جوہر و حسرت کی لے میں

تھا پاس عرز بوم بُتِ دلشکن سے دُور
مارا مجھے وطن میں نہ مارا وطن سے دُور ۔ "پُرلاش ہے پڑی ہوئی گور و کفن سے دُور"
گوہر کو نمایش قوت کا جوش ہے (جوہر)
ساحل کی لغزیا ہے مگر بانکپن سے دُور
شاخوں پہ کچھ بکھر سے گئے ہیں اداس پھول
فریاد کس نے کی یہ تڑپ کر چمن سے دُور : "مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور"
اے بے نصیب گر نہ ملی چشمِ عندلیب (غالب)
یکساں ہے پھر چمن میں ہو تو یا چمن سے دُور
مارا ہمیں فریب نے لفظوں کے ہمنشیں
تھی قتل گہہ نہ یار کی کچھ انجمن سے دُور "مانا کہ ہم رہا کیے دارورسن سے دُور"
نکلا نہ آفتابِ صداقت ہی ورنہ یاں (جوہر)
ظلمت وہ تھی کہ ہوتی نہ اُسکی کرن سے دُور
یہ عین انہاکِ خودی ہے کہ بے خودی؟
اے ہاشمی وطن میں رہے تم وطن سے دُور ۔ "اک عمر ہو گئی کہ ہوے انجمن سے دُور"
(غالب) (جوہر)

سید ہاشمی (از فرید آباد)

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء

حضرت محسنؒ کاکوروی

جس وقت مولوی محمد محسن صاحب مغفور کے سلسلۂ خاندان پر نظر ڈالی جائے اور اُن کے محترم آبا و اجداد کی حالت کو غور سے دیکھا جائے تو اُس وقت یہ بات بعید القیاس نہیں رہتی کہ حضرت محسنؒ نے اپنے پُرجوش و پراثر انداز کلام نعتیہ سے بارگاہ رسالت میں شرف قبولیت حاصل کیا اسلیے کہ حضرت محسنؒ کے اجداد میں سے ایک بزرگوار یعنی قاری عبد المجیدؒ آستانۂ عالیۂ حضرت رسول مقبول کے دربان تھے، اس قدیمی روحانی تعلق کے سبب سے حضور اقدسؐ کی باطنی توجہ کا مبذول ہونا ممکنات سے تھا اور حضرت محسنؒ کو مدّاحی رسول سے عاشقانہ شغف و محبت کا پیدا ہوجانا گویا نزولِ رحمتِ الٰہی ہے ظاہر ہے کہ جناب رسول خدا محبوب رب العالمین ہیں اور محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوا کرتا ہے۔ حضرتِ محسنؒ کا تخلص بھی کتنا پیارا ہے۔ پروردگار عالم محسن کو بہت دوست رکھتا ہے اور اس کا ثبوت اس آیۂ کریمہ سے ہوتا ہے "ان اللہ یحب المحسنین"۔ پس حضرت محسن کو دُہرا شرف حاصل ہوا، خدا کا دوست رکھنا اور جناب سرور کائنات کا اعزازِ قبول بخشنا، عجیبُ غریب بائۂ فخر ہے۔ حضرتِ محسن نے مداحی رسولؐ سے جو خاص قبولیت حاصل کی وہ ان کا حصہ ہے۔ حضرت محسن کا نَو سال کی عمر میں زیارت جمال مبارک حضرت رسولؐ مقبول سے مشرف ہونا اس بات کو ثابت کررہا ہے کہ وہ مادرزاد ولی تھے۔ نُو برس کی عمر بالکل بچپن کا زمانہ ہے۔ وہ گویا طفلی ہی سے منظورِ نظر سَرورِ عالم ہوگئے۔ حتیٰ کہ آں حضرت کی مبارک خواہش و نوازش سے عالمِ خواب (جو عین بیداری تھی) میں مشرف بہ بیعت ہوے۔ اس موقع ہمایوں پر پہلے حضرت محسن کے جد بزرگوار کو آں حضرتؐ نے شرفِ بیعت بخشا۔ یہی وہ بیعت ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں وارد ہوا ہے یداللہ فوق ایدیھم اور ایسے ہی خواب کو رُویاءِ صادق کہتے ہیں۔ لقد صدق اللہ

رسولہ الرؤیا بالحق ۔ اور بعد اس کے حضرت محسن اپنے جد بزرگوار کے آغوش عاطفت میں تھے یہ بھی کیا مبارک وقت تھا۔ حضرت محسن نے اس خواب کو فارسی میں نظم کیا ہے۔

حضرت محسن ایسے برگزیدہ اور مقبول مدّاح ہیں کہ جناب سرور عالم نے بعض دوسرے بزرگوں اور ایک مقدس درویش کامل کو باطنی ہدایت فرمائی کہ وہ حضرت محسن کو مُطّلع کریں کہ اُن کا نعتیہ کلام ہماری جناب میں مقبول ہوگیا۔ مولوی محمد مظفر الدین صاحب حیدرآبادی نے بھی خواب میں دیکھا کہ مولانا شہیدیؒ اپنا قصیدہ بارگاہ نبوی میں پڑھ رہے ہیں۔ اس پر جناب رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا کہ محسن اپنا سراپا سناؤ وہ بہت اچھا ہے اور ہمارے یہاں مقبول ہے"۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ جناب سرور کائنات کی یہ بارہا توجہ ظاہر کرتی ہے کہ حضرت محسن نہایت مقبول اور مقرب مدّاح تھے اور ان کا نعتیہ کلام حد درجہ دل نشیں تھا۔

مقبول سراپاے رسول اکرمؐ کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:-

للہ الحمد شبِ غم نے اُٹھایا بستر ۔۔۔ مرحبا طالع بیدار مبارک ہو سحر

مژدہ اے دل کہ ہوا نورِ خدا پیشِ نظر ۔۔۔ بارک اللہ طبیعت کا ہے رنگِ دیگر

گر نہ ہو پاسِ ادب تو مجھے کچھ دعویٰ ہے

سجدہ کرتے ہیں ملائک مرا وہ رتبا ہے

لامکاں تک لیے جاتی ہے مجھے طبع رسا ۔۔۔ لڑ گیا عرش کے پایہ سے سخن کا پایا

ہو رہا ہے صفِ ارواح میں میرا چرچا ۔۔۔ خیر مقدم کی چلی آتی ہے ہر سُو سے صدا

بزمِ قدسی کا بلایا ہوا مہمان ہوں میں

ملک آنکھوں پہ بٹھاتے وہ انسان ہوں میں

اسی سلسلہ میں حضرت محسن نے اپنی واجبی اور پسندیدہ تعریف کی ہے اور قلم، دوات اور کاغذ کی صفت بھی دلکش انداز سے کی ہے۔ بخیالِ اختصار اُن اشعار کو نہیں لیا۔

اسی سراپا میں ذیل کے دو ایک بند اور ملاحظہ ہوں، حضور اقدس کی صورت مبارک کی مصوری فرماتے ہیں۔ مضمون اسلامی عقائد کی رو سے بالکل صحیح ہے۔

کیسی تصویر کہ ہے صبح بہار امکاں　　کیسی تصویر کہ ہے آئینہ پرداز جہاں
کیسی تصویر کہ ہے لوح و قلم نور افشاں　　کیسی تصویر کہ ہے کلک مصور نازاں
کیسی تصویر کہ سب صل علیٰ کہتے ہیں
کیسی تصویر کہ سب جل علیٰ کہتے ہیں

اسلامی نقطۂ نظر سے کسی مسلمان کے لیے اس سے زیادہ شرف نہیں حاصل ہو سکتا کہ اس پر رسول خداؐ کی توجہ خاص مبذول ہو اس لیے کہ رسول خداؐ کی توجہ اسی پر مبذول ہوتی ہے جس پر خداوند تعالیٰ خاص رحمت و کرم فرمائے۔ بے شک یہی برگزیدہ اصحاب اولیا اللہ کہے جانے کے مستحق ہیں اور اولیاء اللہ کی شان میں خدائے قدیم و عظیم فرماتا ہے۔ اَلَا اِنَّ اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

حضرت محسنؔ کے شجرۂ انساب سے واضح ہے کہ وہ سیّد علوی ہیں۔ حضرت محسنؔ کے والد ماجد کا نام مولوی حسن بخش صاحب، اور جد امجد کا نام مولوی حسین بخش شہید ہے۔ شہید تخلص نہیں، بلکہ آپ کو ایک ظالم ناخدا ترس نے رسول آباد ضلع اناوہ میں حالتِ نماز میں شہید کیا تھا۔ حضرت شاہ تراب علی کاکوروی نے جو مشہور درویش اور صوفی ہیں "شہید کہ گزشت" ۱۲۶۲ھ تاریخ لکھی ہے۔

حضرت محسن کے تمام آبا و اجداد زیورِ علم و شرافت اور اخلاق حسنہ سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ منتہائے نسب حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہے۔ قاری محمد صدیق (المعروف بہ ابو محمد خافی) اس خاندان میں اول شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے زیب و زینت دی۔ حضرت محسن کو عربی النسل کہنا بالکل بجا ہے۔

حضرت محسن نے اپنے والد مولوی حسین بخش کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم پائی۔

آپ کا سنہ ولادت ۱۲۳۱ھ ہے حضرت محسن جناب شاہ میر محمد قلندر کے مُرید اور صاحبِ ارشاد و اجازت تھے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت محسن صوفیانہ مزاج کے شخص تھے اور اُنھوں نے سرکاری ملازمت کو صرف اس لیے چھوڑا کہ ان کے مشاغل تالیف و تصنیف میں خلل پڑتا تھا۔ انھوں نے ترک ملازمت کے بعد اپنی زندگی اذکار و اشغال خاندانی اور تصانیف مفیدہ کے لیے وقف کر دی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کو دین کے واسطے ترک کرے اُس کے مقاصد کہاں تک بلند اور ارفع ہوں گے۔ حضرت محسن بھی وللآخرۃُ خیرٌ لک من الاُولیٰ کی حد میں ہیں۔ جو شخص خدا اور رسول کا پسندیدہ ہو جائے دنیا اُس کے سامنے کیا چیز۔

چاہنا ہم کو تو اُن کا چاہیے وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

حضرت محسن علوم عربیہ و فارسیہ میں پوری قابلیت رکھتے تھے اور اُن کا زہد و ریاضت عابدانہ تھا۔ اخلاق و عادات میں متصوفانہ شان تھی۔ حضرت محسنؒ اپنے والد کے سوا مولوی عبدالرحیم سے بھی تحصیل علم کی۔ اور اپنا فارسی کلام مشہور زمانہ مولوی ہادی علی صاحب اشک کو دکھلایا ہے۔ حضرت اشک اپنی انشا پردازی اور شاعری کے لیے مشہور ہیں۔ اعلیٰ درجے کے فاضل و ادیب اور حد درجہ متشرع تھے۔

حضرت محسن اردو کے سوا فارسی نظم و نثر میں بھی اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے اور قانونی معلومات میں عبور تھا۔ حکام ان کی خاص عزت کرتے تھے اور ان کے تدین اور راستبازی سے حد درجہ خوش رہتے تھے۔

حضرت محسن کے اوصاف ظاہری و باطنی کی جو کچھ بھی تعریف کی جائے وہ مبالغہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ اور آخر کار اُن کی اس طہارت قلبی اور خیال حسنِ عاقبت نے حضرت محسن کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے کو مداحِ رسول مقبول کے لیے وقف کر دیں۔ چونکہ حضرت محسن مۓ عشق و محبت رسولؐ سے مسرور ہو چکے تھے اس لیے اُنکے

کلام میں ایک خاص کیفیت ہے اور اس سے اہل مذاق کو جو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے وہ وجدانی حالت سے مشابہ ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ کسی شاعر کے کلام (خصوصاً نعتیہ نظموں میں) اُس وقت تک دل کشانہ اوصاف نہیں پیدا ہو سکتے جب تک اُس کے جذبات اور خیالات میں اصلیت کی رُوح نہ ہو۔ حضرت محسن کے سوا دوسرے شعرا نے بھی مداحی رسولؐ کی ہے اور بہت کچھ زورِ طبیعت دکھایا ہے مگر حضرت محسن کا کلام بعض خصوصیات کے لحاظ سے بہت ہی قابل قدر ہے اور انھوں نے اپنے نعتیہ کلام میں فصاحت و بلاغت کی وہ شان دکھائی ہے جو بہ اعتبار بلندیِ مضامین اور معانی آفرینی کے مشہور شعرائے فارسی کے ہمپایہ ہے حقیقی اور مجازی عشق کے جذبات میں جو نازک فرق ہے اُس کو اربابِ بصیرت سمجھ سکتے ہیں عشق مجازی کے جذبات نگاری میں قلم مطلق العنان رہتا ہے لیکن عشق حقیقی میں قلم کو دائرۂ ادب سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور یہ وہ دقتیں ہیں جن کو شاعر کے سوا ہر ذی علم اور اہل فہم سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عشق حقیقی ایک صیقل ہے جو دل کو زنگ سے پاک کر دیتا ہے اور دل کی صفائی اور پاکی سے جو انوار اس میں پرتوفگن ہوتے ہیں اُن کی نورانیت کو لفظوں میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔

حضرت محسن کی جس نظم کو دیکھیے وہ بیاختگی کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے۔ شگفتہ خاطری اور رنگینی طبع کے اثر سے ہر نظم ایک گلدستۂ دلکش معلوم ہوتی ہے۔ مضامین کی بلندی، الفاظ کی شان و شوکت، بندش کی چستی اور بیان کی سلاست ان کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔ حضرت محسن کے کلام کو جو مقبولیت حاصل ہو چکی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکے کلام کی قبولیت خداداد ہے۔ اور بے شک جب تائید ایزدی اور توجہ نبویؐ شامل حال ہو تو کیونکر ایسے شاعر کے کلام میں دلفریبی نہ ہو اور دردمندانہ جذبات سے سامعین کے دل پر چوٹ نہ پڑے۔ محسن اور عشق رسول مقبولؐ۔ بقول مسیحی

دل از عشق محمدؐ ریش دارم　　رقابت با خدائے خویش دارم

لیکن اصل یہ ہے کہ

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مبارک ہیں وہ لوگ جو خدا اور رسول کے برگزیدہ ہو جائیں۔

محسن نے سولہ برس کی عمر میں ایک قصیدہ نعت میں لکھا ہے اور اُن کا یہ پہلا قصیدہ ہے اور غالباً انھوں نے اپنا یہ قصیدہ کسی شاعر کو بنظر اصلاح دکھایا بھی نہیں۔ یہ قصیدہ مولوی محمد احسن مرحوم کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے۔ صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں اس کم عمری میں ایسا قصیدہ لکھا جو ان کے جوہر طبعی کو ظاہر کرتا ہے :۔

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن غنچہ ہے نام خدا نافۂ آہوے ختن

فیض تاثیر ہوا ہے کہ ہوا جاتا ہے رو کش باغ خلیل اب کی سرا پا گلخن

جملۂ انبتہ اللہ نباتاً حسنا ان دنوں فصل بہاری میں ہے طغرائے چمن

اس تمہید و تشبیب کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

کس کے کاکل کے تصور میں پریشاں ہوں نہیں کون سے آئینۂ رخ پہ ہوں حیراں ہمہ تن

کس کی آنکھوں کا ہوں بیمار اٹھانے جو آج میرے تلووں سے لگا دیئے آہوئے ختن

حضرت محسن کا آخری شعر کس کی آنکھوں الخ اپنی لطافت معنوی کے لحاظ سے قابلِ داد اہل بصیرت ہے۔ مصرعۂ اُولیٰ میں وہ خود کو اپنے پاک نبی کی آنکھوں کا بیمار کہتے ہیں گر ہے بیمار جس کی تلووں سے آہوے ختن کی آنکھیں مل جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ طبی اصول سے آہوے ختن کی آنکھ کا تلووں سے لگنا مفید ہو لیکن ظاہری اعزاز دیکھیے کہ عشق رسول مقبولؐ سے یہ سرفرازی حاصل ہوئی کہ کف پا میں ہرن کی آنکھیں مل گئیں۔ مجھے نہیں یاد آتا کہ کسی اُردو یا فارسی شاعر نے اس مضمون کو کہا ہو۔

ذیل کی طرح میں حضرت محسن نے جو قصیدہ نعت میں لکھا ہے وہ معانی آفرینی کے لحاظ سے اعلیٰ ترین شاعری کا نمونہ ہے۔ دوسرے شعرا نے بھی اس طرح میں پوری پوری دماغی قوت

صرف کی ہے اور اپنی علمی قابلیت کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا شہیدیؒ کا قصیدہ بہت مشہور ہو چکا ہے حضرت امیر مینائی نے محسنؒ کے اس قصیدہ کی تضمین کی ہے۔ یہ تضمین سونے میں سُہاگہ ہو گئی ہے۔ حضرت امیر جس پایہ کے شاعر ہیں محتاج بیان نہیں۔ اور صرف شاعر نہیں بلکہ نعتیہ کلام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ محامد النبی قابل دید نعتیہ دیوان ہے۔

حضرت محسن کے اس نعتیہ قصیدہ کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔ جن اصحاب نے حضرت محسن کا نعتیہ کلام اب تک نہیں دیکھا ہے وہ اس سے خاص طور پر محظوظ ہوں گے اور بیتابی کے ساتھ محسن کے کلیات نعت کے مطالعہ کے مشتاق ہو جائیں گے۔ واقعی یہ کلیات اس قابل ہے کہ اس کی ایک ایک جلد ہر مسلمان کی میز پر رہے۔ الغرض حضرت محسن اپنے عاشقانہ جذبات کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:۔

مٹانا لوحِ دل سے نقش ناموسِ اب وجد کا — دبستان محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

الٰہی کس کے غم میں نکلے آنسو چشم قنا سے — کہ عطر فتنہ میں ڈوبا ہے رومال اس سہی قد کا

کہاں ہے آتش یاقوت لب میں وہ بھڑک باقی — کہ خطِ سبز نے چھینٹا دیا آبِ زمرد کا

مطلع میں یہ بات ثابت کی ہے کہ میں نے جب سے دبستان محبت میں ابجد شروع کی ہے، لوح دل سے اب وجد کے ناموس کو مٹا دیا۔ یہ دبستانِ محبت کون ہے؟ حضرت رسول مقبول کے عشق کا۔ بیشک جو شخص عشق رسولؐ سے مست ہو گیا اُس کو محبت والدین کا بھی خیال نہیں رہ سکتا۔ عشق پیغمبر عشق خالق اکبر ہے۔ عاشقان خدا و رسول کے نزدیک فرزند و زن اور مال و دولت کچھ چیز نہیں رہتے۔ اس لیے حضرت محسن نے اس مطلع میں کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے بلکہ ایک سچا خیال ہے متوسط درجہ کے لوگوں کا کیا ذکر ہے بعض بادشاہوں نے تخت و سلطنت کو عشق خدا میں چھوڑ دیا ہے۔ واقعی کوچہ عشق رسولؐ کے گدا شاہوں سے ممتاز ہیں۔ مطلع میں تناسب لفظی اور دونوں مصرعوں کے قافیہ تجنیس خطی نے جو لطف پیدا کیا ہے محتاج بیان نہیں۔

دوسرا شعر الٰہی کس کی الخ اپنی جدت آفرینی، رنگ تغزل اور نازک خیالی کے لحاظ سے

ایسا ہے کہ کوئی اچھے سے اچھا غزل گو بھی اس سے زیادہ لطف اور شوخی نہیں پیدا کر سکتا۔ نعت میں یہ رنگ پیدا کرنا محسن ہی کا کام ہے۔ شعر کے معنی بظاہر یہ پیدا ہوتے ہیں کہ جب چشمِ فتانِ محبوب سے آنسو نکلے اور اُس نے ان کو رومال سے پونچھا تو رومال سے عطرِ فتنہ کی بو ہی نہیں آنے لگی بلکہ وہ عطرِ فتنہ میں ڈوب گیا۔ "عطرِ فتنہ" میں جو خوبیاں ہیں وہ اہلِ فہم پر خود ظاہر ہیں۔ کیا کسی شاعر نے محبوب کی آنکھوں کے آنسوؤں کو عطرِ فتنہ سے تشبیہ دی ہے؟ میرے نزدیک نہیں دی ہے۔ البتہ عرقِ عارضِ گلرنگ کو عطرِ گلاب سے تشبیہ دی ہے۔ یہاں فتنہ سے مراد فتنہ و آفت نہیں بلکہ محض عطرِ فتنہ ہے۔ لیکن مصرعۂ اُولیٰ میں چونکہ چشم کو فتاں کہہ چکے ہیں اس لیے عطرِ فتنہ نے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ اب رہا یہ خیال کہ چشمِ محبوب کس کے غم میں روئی؟ اس کا مطلب ہم اسلامیوں کے عقائد کے موافق یہ ہو سکتا ہے کہ وہ غمِ امت میں روئی۔ با غور کرنے سے اور مطلب بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ محسن کا یہ شعر اعلیٰ ترین ادبی قابلیت کو ظاہر کرتا ہے۔

کہاں ہے آتشِ یاقوت الخ، شعر کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اب یاقوتِ لب کی آتش میں وہ بھڑک یعنی تیزی اور حدت نہیں رہی بلکہ اُس میں اعتدال پیدا ہو گیا ہے۔ اور اسی لحاظ سے مصرعہ کے معنی اور مفہوم میں تنزل نہیں بلکہ ترقی پیدا ہو گئی۔ مصرعۂ ثانی میں اس کا سبب بیان کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خطِ سبز نے نکل کر آتشِ یاقوتِ لب پر زمرد کے پانی (خطِ سبز) کا چھینٹا دیا۔ لعل پر آبِ زمرد کا چھینٹا دینے سے ایک جدید مرکب خوشنما رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ادیبانہ خیال آفرینی ہے اور اس کی خوبیوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اساتذۂ فن کے کے کلام کو بنظرِ غور و تعمق دیکھ چکے ہیں۔

اسی زمین میں اس شعر کی نازک خیالی ملاحظہ ہو۔ محسن کے اس شعر کو حزیں کے اس مشہور شعر سے ملائیے اور دونوں کے لطفِ معنی آفرینی میں جو فرق ہے اُس کو دیکھیے۔

محسن:— مُوا میں ناتواں سن کر صدا پائے دلبر کو　　مجھے کھٹکا تھا مثلِ ہمزۂ وصل اُس کی آمد کا
حزیں:— آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزارِ ما　　بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

محسن کہتے ہیں کہ میں صرف محبوب کی آمد کی آواز پا کو سُن کر تمہارے شوق و لذت سرور سے وصل الی اللہ ہوگیا۔ محسن نے اپنے ضعف و ناتوانی کو جدا گانہ انداز سے بیان کیا ہے شوقِ مفرط کی تصویر اس سے زیادہ لطیف نہیں کھنچ سکتی۔ صرف آوازِ پا ہی سے جب یہ حال ہوگیا تو لذتِ وصل کون حاصل کرتا۔ اس سے ممدوح کی ارفع شان محبوبیت کا پتہ چلتا ہے اور مادح اپنی کم مائگی اور بے حقیقتی کو ظاہر کرتا ہے اور ادب شناس عاشق کا یہی فرض ہے کہ وہ اپنے محبوب معشوق حقیقی کے سامنے خود کو ہیچ سمجھے۔

تو در وگم شو کمال این است وبس

حزیں نے اپنے ضعف و ناتوانی کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے معشوق یا دوستوں کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ ہمارے مزار پر پھول آہستہ ڈالو ورنہ ہمارا شیشۂ دل جو بہت نازک ہے ٹوٹ جائے گا۔ الغرض یہ طولانی قصیدہ دیکھنے کے قابل ہے۔ (باقی آیندہ) ا۔ ز (لکھنوی)

دل اسیر گیسوِ خمدارِ جاناں ہی رہا
یہ خیال آخر مرا خوابِ پریشاں ہی رہا

چشمِ پُرنم کا سفینہ غرقِ طوفاں ہی رہا
یوسفِ دل قیدیِ چاہِ زنخداں ہی رہا

خانۂ دل حسرت و ارماں سے خالی کب رہا
اک نہ اک غم آئے دن اس گھر میں مہماں ہی رہا

کچھ نہ تھا اسکے سوا میرے سوالوں کا جواب
لب پہ اُس ظالم کے ساری رات جی ہاں ہی رہا

عذر کیوں کرتے ہو صاحب ایک بوسہ کے لیے
تم سمجھ لینا کہ اسکے سر پہ احساں ہی رہا

زلف کا مضموں نہ سوجھا کھائے لاکھوں پیچ و تاب
شب کو فکرِ نظم سے دست و گریباں ہی رہا

وادیِ غربت میں بڑھتے ہی رہے میرے قدم
دستِ وحشت مائلِ جیب و گریباں ہی رہا

اُڑ گیا تیرِ نظر اُن کا نشانہ لے کے ساتھ
دل ہی پہلو میں رہا میرے نہ پیکاں ہی رہا

روئے روشن اُن کا کیا چھپتا بھلا زیرِ نقاب
پردۂ افلاک میں خورشید عریاں ہی رہا

راہ تنگ و تاریک اور منزلِ دور و دراز
کوچۂ گیسو میں دل میرا پریشاں ہی رہا

کچھ نہ سمجھائے سمجھانے سے ہوا اُس کو آثرؔ
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا۔

سید آغا حیدر۔ آثرؔ

عالمِ یاس

دمِ واپسیں کا ایک حسرتناک نظارہ

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال　　ایک دل اُس پہ یہ نا امیدواری ہائے ہائے

پہاڑ کی بلند چوٹی پر صبح ہوتے ہوئے جس طرح ماہ و مشتری، الفراق بینی و بینک کا خیال کر کے ایک دوسرے کا مُنھ تک رہتے ہیں، اُسی طرح ایک ماہ پیکر خاتون، مرض الموت میں مبتلا، زانوِ مادر پر سر رکھے ہوئے آخری وقت کا یقین کر کے در و دیوار پر حسرت بھری نگاہیں ڈال رہی ہے۔ کسنی کا عالم ہے۔ شادی کے بعد دو تین ماہ سے زیادہ اپنے پیارے شوہر کی صورت دیکھنا اُس کو نصیب نہیں ہوئی اور آج بھی دونوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ اُس کو اپنے اصلی مونس و ہمدم سے جدا کیے ہوئے ہے۔ لیکن اس آخری وقت میں بھی ہر لحظہ اُس کے چہرہ کی بدلتی ہوئی رنگت اور حسرت بھری ہوئی متجسس نگاہیں کسی کو نہایت بےچینی کے ساتھ ڈھونڈھ رہی ہیں۔ مگر آہ۔ ہر مرتبہ بےرحم موت کا خیال اُس کو نا امیدی کا پیغام سُنا دیتا ہے۔ ہاں ذرا دیکھو اور سُنو، کہ کسی کے نازک ہونٹ ہلے۔ اور خدا معلوم کس کو مخاطب کر کے، رُکتی ہوئی اور دردمند آواز سے غالب کا یہ شعر پڑھا

عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا　　عمر کی بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

یاس و نا امیدی کے عالم میں، آرزوؤں اور ارمانوں کے ماتم میں مندرجۂ ذیل خیالات اسکی حالتِ زار کا آئینہ بن سکتے ہیں۔ و ہو ہذا

بات ہے حسرتوں بھری۔ کہیے نہ اسکو شاعری　　چرخ کی کینہ پروری۔ بخت کی تیرہ اختری
غم نے جو کی فسوں گری۔ طبع کو ہے یہ ابتری　　کرتا ہے یوں مصوری۔ خامہ بہ قولِ سنجری

رات تھی آگ کی بھری۔ جلتے تھے ماہ و مشتری　　انجمِ چرخِ چنبری۔ کرتے تھے کارِ اخگری
سینہ زنی کی رات تھی۔ نوحہ گری کی بات تھی　　سکتہ میں کائنات تھی۔ دیکھ کے اسکی ابتری

ہائے نصیب کا بگاڑ - اوٹ میں تل کے تھا پہاڑ　　آئی تھی کرکے شب کی آڑ - بخت کی تیرہ اختری

قصۂ جانستان غم - کیسے ہو خامہ سے رقم　　کس سے کروں بچشم نم - شکوۂ چرخ چنبری
دامن شب ہے تارتار - چشم نجوم اشکبار　　وقت سحر ہیں سوگوار - چہرۂ ماہ و مشتری
صبح ہوئی جو ناگہاں - آیا نظر عجب سماں　　گریہ کناں لصد فغاں - بلبل زار بسنگری
وادی سنگ و خار ہے - کثرت دیودار[1] ہے　　برسر کوہسار ہے - خانۂ حور یا پری
بستر غم پہ اک حسیں - مہر جمال و مہ جبیں　　حور لقا و حور عیں - رشک بتان آذری
آں گل باغ مدعا - آں لب لعل جانفزا　　کوکب اوج اقربا - مہر سپہر مادری
درد جگر سے بیقرار - حالت نزع آشکار　　کیسی صدا یہ دلفگار - آتی ہے حسرتوں بھری
یاس نے آس توڑ دی - بخت نے پیٹھ موڑ لی　　دل نے امید چھوڑ دی - تم نے خبر نہ لی کبھی
آہ کسی کی شام غم - ہائے کسی کی زندگی　　لخت جگر بچشم نم - لب پہ فغان بیکسی
ہستی ناشناس ہے - چہرۂ گل اداس ہے　　عالم رنج و یاس ہے اور خیال بے بسی
کس نے کہا کہ ہوشیار، آئی خزاں سے اب بہار　　رہنے دو مجھ کو اشکبار - بہر کمال نیستی
قصہ جانستاں کہوں - راز دل تپاں کہوں　　ہجر کی سختیاں کہوں - اور مآل زندگی
دل میں کسی کا درد ہے - چہرہ کا رنگ زرد ہے　　باب امید بند ہے - چشم مریض ہے کھلی
بستر غم ہے اور میں - یاد صنم ہے اور میں　　جور و ستم ہے اور میں - سوز فراق و جاں کنی
حسرت و یاس دلفگار - رنج و ملال آشکار　　شاہد حال چشم زار - عرض گذار خامشی
شام سے صبح تک جلوں - صبح عدم کی راہ لوں　　صورت شمع کیا کہوں - قصۂ موت و زندگی
ای کہ بوعدۂ کرم - کرتے ہو مجھ پہ کیوں ستم　　من بحبالے خود دوم تا تو بنزد من رسی

دعائیہ

زندہ رہو ابد تلک - شاد رہو بہ سروری
کشور دل ہو باغ باغ - بس نہ شباب برخوری

راشد علی - اظہر (ہیمی)

---

[1] دیودار یعنی چیڑ - کا جنگل -

زمین، آفتاب اور ماہتاب

زمین، آفتاب، اور ماہتاب کے متعلق کسی زمانہ میں جو اعتقادات اور اُن کے معجز نما اثرات کا چرچا تھا، گو وہ فی زمانہ کیسا ہی مضحکہ خیز معلوم ہو لیکن اُس کے نتائج کے کارآمد اور پُر از معلومات ہونے میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ سورج اور چاند کے پُر اسرار تعلقات، زمین اور اُس کی نہایت ہی عجیب و غریب مچھلی یا گائے، کسوف و خسوف کے مفروضات اور زلزلہ کے اسباب و وجوہات آج بھی پُرانے زمانہ کی بوڑھیوں سے ہم سُن سکتے ہیں بوڑھیوں پر کیا منحصر، دیہاتی طلبا بعض اوقات امتحانوں میں اس قسم کے تذکرے کرکے ممتحن کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم میں ابھی تعلیم کی کس قدر کمی ہے۔ اردو مڈل کے امتحان میں ایک بار ایک طالب علم نے زلزلہ کے اسباب یوں لکھے تھے:-

مادر گیتی کو ایک زبردست گائے اپنے سینگوں پر رکھے ہے جب ایک سینگ پر رکھے رکھے تھک جاتی ہے تو دوسرا سینگ بدلتی ہے۔ اسی تبدیلی سے جو حرکت پیدا ہوتی ہے اُسکا نام زلزلہ ہے!

یہ باطل خیالات، ناقابلِ قیاس مفروضات شروع زمانہ میں مضر ضرور تھے لیکن اُنھوں نے جس علم کی بنیاد ڈالی وہ ضرور قابل قدر ہے۔ ہم اس مختصر مضمون میں تمام نظام سیارگاں سے قطع نظر صرف چاند، سورج اور زمین کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

اس جگہ پر یہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا آفتاب کوئی غیر معمولی اجرامِ سماوی میں سے نہیں ہے۔ اگر ہم ایک تاریک رات کو تاروں بھرے آسمان کی جگمگاہٹ کا نظارہ کریں تو ہم کو ہزارہا ستارے نظر آئیں گے۔ ان میں بعض بعض ایسے ستارے بھی ہیں جو ہمارے آفتاب سے کہیں بڑے ہیں۔ تاہم ہمارا آفتاب ایک بہت بڑے نظام کا مرکز ہے۔ اور صرف ہماری زمین ہی کا نہیں بلکہ عطارد اور زہرہ سے لیکر جو بہ نسبت زمین کے

آفتاب سے زیادہ نزدیک ہیں نیچون تک کا جو دو ارب ۷۹ کروڑ میل کے فاصلہ سے آفتاب کے گرد گردش کرتا ہو، آفتاب ہی مرکز ہے۔ لیکن باطل پرستیوں نے آفتاب کی حرکات صدیوں سے ہمارے مختصر کرہ کے ماتحت کردی تھیں۔ موسموں کی تبدیل، دن کا رات ہونا اور ربیع و خریف کا شمار، یہ تمام باتیں صرف اسی عقیدہ پر مبنی تھیں کہ زمین ایک ساکن جرم سماوی ہے۔ اور آفتاب۔ ماہتاب وغیرہ زمین کے گرد ایک مدور راستہ میں گردش کرتے ہیں۔ لیکن نظام سیارگاں کی حقیقی تشریح کاپرنیکس Copernicus نے کی جس نے کہ زمین کے بجائے آفتاب کو تمام نظام کا مرکز قرار دیا اور کہا کہ "گو یہ خیال ہمارے واسطے اور ہمارے کرۂ ارض کے واسطے تحقیر آمیز ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہی، وہ زہرہ اور مریخ کے درمیان ایک مقررہ راستہ پر گردش کرتی ہے، اور زمین نہیں بلکہ وہ آفتاب کی زبردست ہستی ہو جس کے زیر اثر مثل اور سیاروں کے ہماری زمین بھی گرداں ہے"

کاپرنیکس Copernicus کی زبردست دریافت کے بعد سے مغرب نے علم ہیئت میں نہایت ہی تیز گامی سے کام لیا اور دوربین کی ایجاد نے اُن کی معلومات میں ایک تحیر خیز انقلاب پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ آج ہمارا یہ خیال کہ زمیں میں صرف دو حرکتیں محوری اور مداری ہیں باطل ہوگیا اور اب معلوم ہوا کہ ہماری زمین فضا سے آسمانی میں دس سے زیادہ مختلف حرکتیں کرتی ہے جن میں سے خاص ذیل میں لکھی جاتی ہیں

(۱) گردش مداری۔ آفتاب کے گرد زمین ۳۶۵۲۲۵۶۴ دن یا ۳۶۵ ¼ دن میں ایک بار گردش کرتی ہے۔ اس کو گردشِ مداری کہتے ہیں۔ وہ بیضاوی راستہ جو زمین آفتاب کے گرد گھومنے میں بناتی ہو زمین کا مدار کہلاتا ہو۔ وہ تاریخ جب کہ زمین آفتاب سے سب سے قریب ہوتی ہو یکم جنوری ہے اور یکم جولائی کو سب سے زیادہ دور ہو جاتی ہو۔ زمین و آفتاب کے درمیان فاصلہ اوسطاً ۹،۲۷،۹۶،۹۵۰ میل ہے۔

(۲) گردش محوری۔ زمین ۲۴ گھنٹے میں ایک بار اپنے محور پر گھومتی ہے اس گردش کو گردش محوری کہتے ہیں۔ محورِ زمین مدارِ زمین کے ساتھ نہ تو محوری حالت میں ہی نہ متوازی ہی بلکہ چند درجوں کے زاویہ پر جھکا ہوا ہے اور محورِ زمین قطب شمالی کی طرف ہمیشہ ایک مقررہ نقطہ کی جانب رہتا ہی اُسی نقطہ کے بالکل قریب قطب ستارہ ہے۔

(۳) لیکن محور زمین بھی بہت آہستہ آہستہ ایک مدوّر خط بناتا ہوا اپنی جگہ تبدیل کرتا رہتا ہی چنانچہ محور کا یہ دورہ ۲۸۵ صدیوں میں پورا ہوتا ہی۔ اسی سبب سے موجودہ ستارۂ قطب محورِ زمین کے ساتھ ایک ہی خط میں کچھ عرصہ بعد نہ رہے گا اور بارہ سو برس بعد ایک دوسرا ستارہ (Vega) ویگا ای بھی محور زمین کے ساتھ ایک ہی خط میں ہو جائیگا جیسے کہ وہ ۱۴ ہزار برس پہلے تھا۔

(۴) منجملہ اور تمام گردشوں کے جن سے کہ مدارِ زمین میں کچھ اختلاف پیدا ہو جاتا ہی ہر ایک خاص تغیر یہ دس سیاروں زہرہ اور مشتری کی قوتِ کشش سے پیدا ہوتا ہی۔

(۵) ان تمام گردشوں اور حرکتوں سے زبردست تر ایک دوسری گردش ہی: آفتاب خلاے آسمانی میں اپنے تمام ماتحتین سیارگاں اور اقمار کے ساتھ ایک اتنی زبردست گردش کرتا ہی کہ ہماری زمین اب تک ایک ہی جگہ سے دو بار نہیں گزری!

ابھی ایسے آدمی بکثرت موجود ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آفتاب زمین کے گرد گردش کرتا ہی اور زمین ساکن ہی۔ لیکن زمین کی حرکت کے صاف اور واضح ثبوت موجود ہیں۔ اگر ہم سکونِ زمین کا یقین کریں تو ہم کو سب سے زیادہ مضحکہ انگیز جو بات معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ آفتاب، ماہتاب، سیارے سب گو زمین سے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں اور خواہ زمین سے کتنے ہی فاصلہ پر کیوں نہ ہوں زمین کے گرد ناقابلِ قیاس سُرعت سے گردش میں ہیں تھوڑی دیر کے واسطے ہم مانتے ہیں کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہی، آفتاب زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دُور ہی تو وہ مدار جس پر ہم آفتاب کو حرکت کرتا ہوا مانیں گے، ۵۷ کروڑ

۵۰ لاکھ میل ماننا پڑے گا۔ اس محیط کو آفتاب، جس کا قطر ہماری زمین کے قطر سے ۱۰۸ گنا بڑا ہی ۲۴ گھنٹے میں طے کرے گا۔ یعنی ۶۰۰۰ میل فی سکنڈ! اس سے بھی زیادہ تحیر خیز زحل اور نیچوں کی چالیں ہوں گی۔ یہ دونوں سیارے ۵۰۰۰۰ میل فی سکنڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ رفتار سے زمین کے گرد گھومتے ہوے ماننے پڑیں گے! اسی طرح سے اگر ہم تمام نظام عالم سیارگاں کو لیں اور اُن زبردست ستاروں کی بابت قیاس کریں جو زمین سے ناقابل قیاس دُوری پر واقع ہیں تو ہم کو آخر کار یہ سادی اور آسان بات ماننا پڑے گی کہ زمین خود اپنے محور پر ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گھومتی ہے۔

زمین اور اُس کی حرکتوں کے متعلق اس قدر بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہی کہ چاند کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ شمار و اعداد سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ خط مستقیم جو زمین اور چاند کے مرکزوں کو ملاتا ہی زمین کے قطر سے ¼ ۶۰ گُنا بڑا ہے، یا یہ کہ زمین اور چاند کے درمیان کا فاصلہ ۲،۳۸،۸۵۸ میل ہی۔ زیادہ سے زیادہ فاصلہ زمین اور چاند کے درمیان ۲،۵۲،۹۷۲ میل ہی اور کم از کم فاصلہ ۲،۲۱،۶۱۴ میل شمار کیا گیا ہی۔ یہ فاصلے دونوں مقامات کے مرکزوں کے درمیان ہیں اس لیے اصل فاصلے جو ان دونوں اجرام کی سطحوں کے درمیان ہیں مذکورۂ بالا فاصلوں سے ۵ ہزار میل کے قریب کم ہیں۔

چاند زمین کے گرد ۲۷ دن ۷ گھنٹے ۴۳ منٹ ۱۱ سکنڈ میں گردش کرتا ہی اور اسی عرصہ میں زمین آفتاب کے گرد اپنی سالانہ گردش کا قریبًا تیرھواں حصہ طے کر جاتی ہی۔ یہی بات ہی کہ چاند کے طلوع و غروب کے درمیان بجاے اس کے کہ ۲۷ دن ۷ گھنٹے ۴۳ منٹ ۱۱ سکنڈ صرف ہوں، ½ ۲ دن کے قریب دوبارہ طلوعِ قمر میں زیادہ صرف ہوتے ہیں۔ قبل اسکے کہ اس چھوٹے پڑوسی کے متعلق کچھ اور لکھا جائے، اس بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہی کہ مدارِ زمین اور مدارِ قمر ایک ہی سطح میں نہیں ہیں بلکہ موخر الذکر کے ساتھ ۵ درجے کا زاویہ بناتا ہی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیشہ ہلال کی حالت میں سورج گرہن اور بدر کی حالت میں چاند گرہن ہوتا اور ہم

چودھویں رات کی شفاف چاندنی سے محروم رہ جاتے۔

چاند اصل میں ایک تاریک کرہ ہے لیکن اس کو روشنی آفتاب سے ملتی ہے۔ اس کی صورت میں تغیرات چاند کے اُن اختلافات سے پیدا ہوتے ہیں جو اُس کی زمین کے ساتھ آفتاب کے گرد حرکت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہماری زمین چاند سے ۸۱ گنی بڑی ہے۔ جب چاند زمین اور سورج کے درمیان ہوتا ہے تو اُس کا روشن حصہ سورج کی طرف ہوتا ہے۔ اور اس طرح اُس زمانے میں ہم چاند کو نہیں دیکھ سکتے۔ نئے چاند نکلنے اور قمری ماہ کی ابتدا کا زمانہ یہی ہے۔ گھومتے گھومتے چاند ایک ایسی حالت میں آجاتا ہے جب چاند زمین اور آفتاب کے ساتھ زاویۂ قائمہ بناتے ہیں اور رفتہ رفتہ چاند کی صورت میں تغیر ہوتے ہوتے ہلال سے نصف چاند روشن ہو جاتا ہے۔ آخر کار یہی گردش چاند کو بدر کی حالت میں لاتی ہے اور چاند کا وہ حصہ جو زمین کی طرف ہے روشن ہو جاتا ہے۔

قمری ماہ کی شروع تاریخوں میں چاند کا بہت تھوڑا حصہ منور نظر آتا ہے لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو باقی حصہ بہت ہی خفیف روشنی سے منور ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ چاند میں یہ روشنی کہاں سے آتی ہے؟ اس کا جواب نہایت ہی سادہ ہے۔ چاند ہی کی طرح ہماری زمین بھی روشنی کے لیے آفتاب کی محتاج ہے۔ جس طرح چاند کی روشنی کا عکس زمین پر پڑتا ہے اسی طرح ہلالی حالت میں زمین کی روشنی ہوتی ہے جو چاند کو خفیف سی روشنی دے کر باقی حصہ کو اُتنا منور تو نہیں کرتی جتنا کہ وہ آفتاب سے منور ہوتا ہے، البتہ اتنا منور ضرور کرتی ہے کہ ہم ہلکی روشنی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے تاریخیں گزرتی جاتی ہیں ویسے ویسے چاند کا منور حصہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب نصف کے قریب چاند منور ہو جاتا ہے اُس وقت ہم زمین کی روشنی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ چاند کے تنوّر کے سبب زمین سے پہونچی ہوئی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔

متذکرۂ بالا بیانات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی کچھ سطحی حالت بھی بیان کی جائے۔ علم ہیئت کی ابتدا سے اس وقت تک علماء نے چاند کی بابت

مختلف نظریات قائم کیے ہیں۔ فیثا غورس اور اُس کے شاگرد ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ چاند بھی ہماری ہی مادرگیتی کی طرح ایک زمین ہی۔ فرق صرف یہ ہی کہ چاند میں جانور ہماری دُنیا کے حیوانات سے بڑے ہیں، درخت ہماری دنیا کے درختوں سے زیادہ خوبصورت، اور باشندگان کرۂ ماہ ہم سے پندرہ گنا ہر حیثیت سے بڑے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں بلکہ دُوربین کی ایجاد سے پہلے تک چاند کی ماہیت کی بابت مختلف خیالات لوگوں میں مشہور رہے لیکن دُوربین کے ذریعہ سے جو مشاہدات ہوے ہیں وہ کسی طرح یہ نہیں ثابت کرتے کہ چاند ایک آباد کرہ ہی۔ کیونکہ خیال کیا جاتا ہی کہ وہاں ہَوا نہایت ہی لطیف حالت میں ہی اور بادلوں کا کہیں نام تک نہیں چاند کے مختلف حالتوں کے بکثرت نقشے موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہی کہ اس مختصر کرہ میں پہاڑ ہیں، وادیاں ہیں، آتش فشاں ہیں۔ یہ چیزیں محققین کے واسطے دلچسپی کا باعث ہیں۔ چاند کے پہاڑ اندر سے کھوکھلے ہیں۔ اکثر جگہ ۵۰ میل سے ۱۰۰ میل تک لمبے تنگ میدان پہاڑوں کے اندر پائے جاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ سب آتش فشان مادّہ سے بنے ہیں اِن مشاہدات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ کرۂ ماہ میں زبردست آتش فشانیاں ہو چکی ہیں اور اب بھی ہوتی ہوں گی۔ اور چونکہ چاند کا ہمیشہ ایک ہی حصہ نصف کرہ دنیا کے سامنے رہتا ہی اس لیے یہ تمام حالات اور قیاسات اُسی کی بابت ہیں، دوسرے کرہ کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم بعض علماے علم ہیئت کا خیال ہی کہ چونکہ آتش فشانی وغیرہ اس نصف کرہ میں ہوتی ہی اس لیے ممکن ہی کہ دوسرے کرہ میں سرسبز وادیاں، ہرے بھرے میدان، مواج سمندر، اور بہتے ہوے دریا ہماری زمین سے کسی قدر مختلف حالت میں موجود ہوں۔

اب ضروری معلوم ہوتا ہی کہ سورج کا کچھ حال لکھا جائے۔ یہ بیان کیا جا چکا ہی کہ سورج بھی ایک ستارہ ہی لیکن چونکہ بہ نسبت اور ستاروں کے زمین سے زیادہ نزدیک ہی اس واسطے اتنا بڑا نظر آتا ہی۔ یہ زمین سے تقریباً دس لاکھ گنا بڑا ہی۔ اُس کا قطر ۸۶۶،۰۰۰ میل ہی لیکن اس کا وزن زمین سے اتنا زیادہ نہیں ہی جتنا کہ نسبتاً ہونا چاہیے۔

کیونکہ زمین سے صرف ۳ لاکھ گنا وزنی ہو۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ سورج ایک تھالی کی طرح چپٹی شے ہو لیکن اگر ہم دوربین سے بغور دیکھیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک دہکتا ہوا کرہ نار ہے آفتاب کی حرارت کی بابت اتنا کہنا کافی ہو کہ ہم اُس کی گرمی کا اندازہ بمشکل کرسکتے ہیں لیکن یہ بات بہ آسانی قیاس میں آجاتی ہو کہ سوائے پگھلے ہوے بے انتہا گرم مادہ کے آفتاب میں کچھ نہیں۔ اس مادہ کا زیادہ حصہ غار کی صورت میں ہے۔ خاص چیز جو آفتاب کی سطح پر نظر آتی ہو اس کے سیاہ داغ ہیں۔ جب یہ داغ دریافت ہوے ہیں علما نے خاص توجہ انکی جانب کی ہو اور معلوم ہوا ہو کہ یہ داغ آفتاب کے مشرقی حصہ سے مغربی حصہ تک بارہ یا تیرہ دن میں پہونچتے ہیں اس کے بعد وہ بارہ یا تیرہ دن تک غائب رہتے ہیں اور پھر مشرقی حصہ کے نمودار ہوتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہو کہ آفتاب اپنے محور پر ۲۶ دن میں گھومتا ہو۔

رہا یہ سوال کہ میں نے یہ معلومات کہاں سے بہم پہونچائیں؟ پروفیسر پانڈے ایم۔ اے بی۔ ایس۔ سی کے ایک مضمون سے۔ جو اُنھوں نے سینٹ جانس کالج میگزین میں لکھا تھا اور اُن کو یہ تمام واقعات کیونکر معلوم ہوے؟ اُن کی تحریروں سے جو علم کے جویا ہیں۔ ان کی کتابوں سے جو تحقیقات کے شیدا ہیں، اور اُن کے اخبارات و رسائل سے جو علمی کارناموں کے مردمیدان ہیں۔ کبھی مسلمانوں میں بھی ایسے افراد تھے اور ایسی ہستیاں تھیں جن پر علمائے فرنگ کو رشک آتا تھا، لیکن آج مسلمان اور علم دو متضاد لفظ ہیں، جن کو ہم معنی کرنا گویا غیر ممکن کو ممکن کر دکھانا ہے!

غزلیات

یوسف الزمان

اِس کا دل پہ کچھ اثر نہ ہوا قصۂ شوق مختصر نہ ہوا
حُسن کو عشق سے مَفر نہ ہوا لاکھ چاہا کہ ہو مگر نہ ہوا
عاشقی اُس کی معتبر نہ ہوئی جو ترا بندۂ نظر نہ ہوا

کچھ ٹھکانا ہے اس تغافل کا آپ کا جور بھی خبر نہ ہوا
اشک پیہم سے شوق سجدہ کا گوشۂ آستیں بھی تر نہ ہوا
مرمٹے ہم کہ دیں وہ دادِ وفا اور جو اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا
آہ اس التفاتِ ناز کی یاد وہ جو پھر بارۂ دگر نہ ہوا
نہ کھُلے ہم سے آپ پر نہ کھلے نہ ہوا اعتبار پر نہ ہوا
حالِ دل کی انھیں خبر نہ ہوئی طائرِ شوق نامہ بر نہ ہُوا
صرفِ دشمن وہ لطف ہو ہی گیا جو کبھی میرے حال پر نہ ہوا
کچھ نہ آیا ہمیں تو کیا اے عشق یہ بھی اک طرح کا ہنر نہ ہوا
آ گئے تم جو بر سرِ بالیں میں بھی آمادۂ سفر نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ حُسنِ عفیف جو کبھی فتنۂ نظر نہ ہوا
صرفِ عصیاں ہوا وہ حصۂ عُمر جو تری یاد میں بسر نہ ہوا
صدمہ پہونچا جو تجھ سے اے غمِ عشق نفعِ جاں ہو گیا ضرر نہ ہوا
تم لبِ بام جلوہ گر نہ ہوئے میں سرِ راہ بخبر نہ ہوا
خام ہے اُس کی عاشقی جو عزیز باخبر ہو کے بے خطر نہ ہوا
تابِ نظارۂ دگر نہ ہوئی حُسن پر غلبۂ نظر نہ ہوا
ہے جہاں مدفنِ شہیدِ وفا آپ کا واں کبھی گزر نہ ہوا
رہ گئی شرمِ بیکسی حسرت
مجھ پہ احسانِ اہلِ زر نہ ہُوا

فضل الحسن حسرت موہانی

گردن ہے جھکی دیر سے اب سر نہ اُٹھے گا افسوس مگر آپ کا خنجر نہ اُٹھے گا
وہ وقت ہے خوش تو بھی ستمگر نہ اُٹھے گا بالیں سے مری اب کوئی ہمدم نہ اُٹھے گا
خونریزیِ وحشت کی نہ ہو گی کبھی تشریح جب تک کہ ہر اک دشت سے پتھر نہ اُٹھے گا

پھونکی ہے مرے جسم میں اعجازِ عشق نے وہ رُوح
مرجاؤں گا مَیں درد جو دم بھر نہ اُٹھے گا

جب لاؤں گا ہاتھوں پہ دلِ کشتہ کی میّت
کیا شور سرِ عرصۂ محشر نہ اُٹھے گا

اے اہلِ دل اب روؤگے تا چند مجھے تم
کب تک یہ مرا بالش و بستر نہ اُٹھے گا

یہ کہہ کے لگائی ہے کسی شوخ نے ٹھوکر
دیکھوں تو کوئی قبر سے کیونکر نہ اُٹھے گا

سب دیکھ رہے ہیں مرے قاتل کی نگاہیں
یہ ظلم تو اے داورِ محشر نہ اُٹھے گا

سرمایۂ کونین ہیں آنکھوں میں ہماری
طوفان ہر اک اشک سے کیونکر نہ اُٹھے گا

جو ہونی ہو ہو جائے کہ ہے خانۂ عشق
پھر بعد مرے آپ کا خنجر نہ اُٹھے گا

ہر طرح ہیں گو آپ مری جان کے مالک
یہ یاد رہے پھر کوئی مرکر نہ اُٹھے گا

وہ دل ہی ہمارا ہی کہ تصویرِ وفا ہے
یہ نقش کبھی آپ کے دل پہ نہ اُٹھے گا

یہ کشمکشِ بخیہ مرے زخم پہ کب تک
ہر روز کا صدمہ تو رفوگر نہ اُٹھے گا

ہیں مطمئن ایسے وہ لہو میرا بہا کے
گویا کبھی ہنگامۂ محشر نہ اُٹھے گا

کچھ رنگ عزیز اب نظر آتا ہے مجھے اور
شاید کہ یہ درد آج سے اُٹھ کر نہ اُٹھے گا

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

دی زندہ دلے دیدم کو بر سرِ خم نے زد
ہر مے زد و ہو زد، ہو نعرۂ یا حے زد

خوش ہمہ فروشے کو از محنتِ خود ناں خورد
را دست کہ پشتِ پا بر جودِ بنِ طے زد

ابر آمد و گلشن را صد رنگِ بہار آورد
گل آمد و کیے ورخ آتش بہ دلِ وے زد

داغے کہ تو ام دادی بر سینہ فلک کے داد
تیرے کہ تو بکشادی آں تیر قضا کے زد

نازم بہ دلے کز غم بخشید فراغت ہا
سر پنجۂ بے لوثی در دامن لاشے زد

آں عارف دیں پرور کو زینتِ منبر بود
در میکدہ اش دیدم ہو بادہ پیا پے زد

آہ آں پسرِ سادہ وآں نغمۂ داؤدیش
عالم ہمہ در ہم خورد او چوں بہ لبش نے زد

خود دعوئ ہستی کرد و ز کردہ پشیماں شد
صد غوطہ ز خجلت ہا ضامن بہ شطِ خوے زد

ضامن کنتوری

نظرے خوش گزرے

ماہ گذشتہ میں لکھا گیا تھا کہ اہل لکھنؤ کی طرف سے انجمن ترقی اُردو کو دعوت دی گئی ہو کہ اُس کا ایک جلسہ بصورت اُردو کانفرنس دسمبر کے آخری ہفتہ میں میں یہاں منعقد کیا جائے۔ قبل اس کے کہ کارکنان انجمن کی طرف سے اس بات کا اعلان کیا جائے کہ ہماری دعوت کو اُنھوں نے قبول کرلیا ہی اخبارات میں محض اُس نوٹ کی بنا پر جو اُردو کانفرنس کے عنوان سے مقامی انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف میں اُس جلسہ کے متعلق شائع ہوا تھا، جس میں یہ طے پایا تھا کہ یہاں سے دعوت بھیجی جائے اس مسئلہ پر مختلف حیثیات سے بحث شروع کردی۔ صداقت۔ وکیل۔ نئی روشنی اور لاہور کے متعدد اخبارات نے ایک طرف اس تحریک کو لبیک کہا۔ تو دوسری طرف مولانا البشیر سلمہ اللہ تعالیٰ نے نہایت شد و مد سے مخالفت کی۔ مؤیدین کانفرنس نے نفس حقیقت کو سمجھنے اور اس ضرورت کو وسعت کے ساتھ دائرۂ بحث میں لانے کی جو کوشش کی وہ یقیناً غایت درجہ اطمینان بخش ہے۔ کیونکہ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہی کہ زبان اُردو آج جس حال میں ہی اور نیز جس منزلت کی اصلاً وہ مستحق ہی وہ بہت سے ارباب ملک کے یکساں طور پر پیش نظر ہے اور وہ اس کو وہی اہمیت دینے کے لیے تیار معلوم ہوتے ہیں جس کی وہ حقیقتاً سزاوار ہی۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ اسی ضمن میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور اُس کا طرز عمل، اور اُس کی وہ گراں قدر امداد بھی معرض بحث میں آگئی جو زبان اُردو کو توسیع و ترقی کے لیے اپنے شعبۂ اُردو کو وہ دینا چاہتی اور دینے کا وعدہ کرتی ہی مگر دے نہیں سکتی۔ اس سلسلہ میں بعض اخبارات نے کسی قدر مبالغہ اور غلط بیانی اگر نہیں تو غلط فہمی کی بنا پر واقعات کے خلاف لکھنے سے بھی دریغ نہیں کیا جو ایسے اخبار کی شان کے یقیناً منافی ہی جس کے ایڈیٹر ایک لائق گریجویٹ ہوں اور جو الہ آباد و ایسے مرکزی مقام سے شائع ہو رہا ہو۔ "نئی روشنی" کا یہ بیان حقیقتاً صحیح نہیں کہ دسمبر ۱۳ء میں جب کانفرنس کا اجلاس آگرہ میں ہوا تو انجمن کے اجلاس کے لیے پنڈال میں موقع نہیں ملا۔ بلکہ اسکول کے ایک کمرہ میں جہاں ایک درجن آدمی سے زیادہ نہ تھے انجمن کا اجلاس منعقد ہوا۔ جو لوگ اُس موقع پر آگرہ میں موجود تھے اور جن میں سے اکثر اصحاب کو انجمن کے اجلاس شبانہ میں شرکت کا موقع ملا ہی وہ اس واقعہ کی تصدیق کریں گے کہ انجمن کا اجلاس زیر صدارت آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کانفرنس کے پنڈال ہی میں جبکہ کانفرنس

کی پہلی شب کو منعقد ہوا تھا۔ اور اگرچہ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے اور نیز معززین قوم میں مذاق علمی کے فقدان اور اہل ملک کو عام طور پر اپنی زبان کی طرف پوری توجہ نہ ہونے کے باعث جلسہ چنداں پُررونق نہ تھا، تاہم پندرہ چند آدمی ضرور موجود تھے اور یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ جلسہ نہیں ہوا۔ اسکول کی عمارت میں انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام منتخب اشخاص کا ایک جلسہ اس غرض سے منعقد ہوا تھا کہ جدید اُردو قاعدہ کے متعلق غور و بحث ہو سکے۔ گر وہ حقیقتاً انجمن کا سالانہ جلسہ نہ تھا۔

خیر یہ تو ایک جداگانہ بحث تھی، مگر اخبارات نے کانفرنس کے طرز عمل اور اس شعبہ کے ساتھ اُس کے تعلقات پر بحث کرنا بزرگ اُمادہ کو نعل در آتش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ مقدس البشیر نے اس اعتراف کے باوجود کہ لکھنو والے جلسہ کے مفصل اور صحیح حالات معلوم نہ تھے۔ مجوزانِ جلسہ کو ایک ہی سانس میں علی گڈھ کی مرکزیت کا دشمن اور خانہ ساز جلسوں اور کانفرنسوں کا بانی وغیرہ سب کچھ کہہ ڈالا۔ بارے البشیر کی اس دلچسپ اگرچہ یقیناً نہایت غیر خوش آیند بلکہ شر انگیز تحریر کا جو جواب جدید معاصر مقامی روزنامہ ہمدم کی وساطت سے مسٹر عبد الماجد نے دیا اُس سے محترم مولانا کی حرارت مزاج کا پارہ اعتدال پر آگیا اور اُس وقت سے اب تک غالباً ہمارے خطاب یافتہ مکرم کو کسی منوّم دوا کے استعمال کے بغیر سکون و اطمینان کی نیند نصیب ہوتی رہی ہے۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ صاحب البشیر کے خرمن صبر و سکون کے حق میں کہیں یہ خبر برق خاطف نہ بن جائے کہ کارکنانِ انجمن ترقی اُردو نے اہل لکھنؤ کی دعوت قبول کر لی ہے۔ اور مجوزہ اُردو کانفرنس کے انعقاد کا مسئلہ جو اب تک ایک تجویز و تحریک سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا اب ایک واقعی قرار داد کی صورت حاصل کر چکا ہے۔

ایک بات البتہ شاید ہمارے زود مشتعل معاصر کی اشک شوئی کے لیے کافی ہو اور وہ یہ ہے کہ کانفرنس کے جوائنٹ سکرٹری بلکہ موجودہ علی گڈھ کے روح رواں جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جب انتخاب جداگانہ کے متعلق ۱۱ر اکتوبر کے جلسہ میں لکھنؤ تشریف لائے ہیں اور مسٹر سجاد حیدر بی اے نے اُن کی رائے اس بارہ میں دریافت کی ہے تو صاحبزادہ صاحب نے اس تجویز سے کوئی مخالفت نہیں کی، اور اس شرط کے ساتھ کہ کانفرنس میں سالانہ رپورٹ خوانی کی جو خدمت مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن کے سپرد ہے اُس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ ہو اُن کو اس کانفرنس کے انعقاد پر کوئی اعتراض نہیں۔ انشاء اللہ آیندہ نمبر میں جو شاید کچھ تاخیر سے شائع کرنا پڑے اس کانفرنس کے متعلق تفصیل سے لکھیں گے۔

یقیناً یہ خبر نہایت مسرت سے سُنی جائے گی کہ ہمارے برادر مکرم مولوی ظفر علیخاں صاحب نے حسب وعدہ ایک علمی و ادبی اخبار "ستارۂ صبح" کے نکالنے کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ ہفتہ وار کرم آباد سے شایع ہوا کریگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ اشتہار سے معلوم ہوگا۔ اور غالباً اس پرچہ کے ناظرین الناظر کی خدمت میں پہونچنے تک اخبار مذکور کا پہلا نمبر نکل جائیگا۔ ہم 'ستارۂ صبح' کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اُس کے ذریعہ سے ہماری زبان کی خاطر خواہ خدمت ہوسکے۔ آمین۔

دائرۂ معارف مشرقیہ کے متعلق ستمبر کے الناظر میں جو کچھ لکھا گیا تھا اُس سے متاثر ہوکر بیگم صفدر علیصاحب نے مبلغ بیس روپے ہمارے پاس اس غرض سے بھیجے ہیں کہ اُن کی طرف سے چار حصے خریدے جائیں۔ دوسرے ناظرین الناظر بھی اگر ہماری وساطت ان حصص کی خریداری چاہیں تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے تیار ہیں۔ اُن تعلقات برادرانہ کی بنا پر جو مولوی ظفر علی خاں صاحب موصوف سے سالہا سال سے ہمیں حاصل ہیں صاحب موصوف نے اس سے پہلے ہی ہمارے پاس ایک رسید بھی بھیجدی تھی کہ جو اصحاب آمادہ ہوں اُن سے رقوم وصول کرکے فوراً رسید دے دی جائے۔

حیاتِ نظامی اس نمبر میں ختم ہے۔ سرورق اور فہرست بھی تیار ہو جائے گی۔ جو صاحب اُسے علیٰحدہ رسالہ کی صورت میں رکھنا چاہیں، اطلاع دیں کہ آیندہ نمبر کے ساتھ فہرست اور سرورق بھیج دیا جائے ہم نے کچھ جلدیں ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر زائد تیار کی ہیں۔ جو صاحب خریدنا چاہیں ۱۲ر میں منگالیں۔

مملکت آصفیہ کے قدر دانان الناظر اور خصوصاً مدارس سرکار عالی کے آسانی کے خیال سے رسالۂ الناظر کی محکمۂ ڈاک خانہ (ٹپہ خانہ) ریاست حیدرآباد دکن میں بھی رجسٹری کرائی گئی ہے اور آیندہ سے اصحابِ دکن کی خدمت میں اورنگ آباد کے ٹپہ خانۂ (سرکار عالی) سے رسالہ تقسیم ہوا کرے گا اور اُس پر مغلئی ٹکٹ چسپاں ہوگا۔ اطلاعاً گزارش ہے۔

گزشتہ نمبر میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آیندہ مہینہ میں مسٹر محمد علی کی شاعرانہ زندگی کا خود نوشت خاکہ شائع کیا جائیگا۔ لیکن ایک واقف کار دوست نے چونکہ یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے مسٹر محمد علی کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے کا احتمال ہے۔ لہٰذا مزید واقفیت حاصل ہونے تک اس دلچسپ و قطعاً غیر سیاسی تحریر کی اشاعت نہیں کرسکتے۔

اس نے پانچ پانچ شعروں کی تین غزلیں درج کی ہیں، جن میں سے آخری غزل میں نظامی نے اپنے فرزند دلبند کا ماتم کیا ہے۔ کشف الظنون میں لکھا ہے "دیوان نظامی فارسی من النظامی الگنجی صاحب الخمسۃ"۔ لطف علی آذر نے بھی آتشکدہ میں نظامی کے تین قصیدے نقل کیے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ نظامی کا کلام قصائد، غزلیات، اور رباعیات کل بیس ہزار شعر ہیں جو بالفعل نایاب ہیں۔ ہدایت قلی خاں نے اپنے تذکرے[1] میں نظامی کے تین قصائد (ایک ۲۴ شعر کا دوسرا ۱۹ شعر کا اور تیسرا ۳۷ شعر کا) اور تین تین چار چار شعروں کی ۹ غزلیں مع ایک رباعی کے نقل کی ہیں۔ ڈاکٹر باخر نے اپنے تذکرۂ نظامی میں لیلیٰ و مجنوں کا ایک شعر درج کر کے اس سے استدلال کیا ہے کہ لیلیٰ مجنوں کی تصنیف کے بعد (۵۸۴ھ) نظامی نے اپنا دیوان مرتب کیا۔ مؤلف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لکھتا ہے :-

"نظامی نے ۵۸۴ھ میں اپنے قصائد و غزلیات کے مجموعہ کو جمع کر کے دیوان مرتب کیا، جو کہا جاتا ہے کہ بیس ہزار اشعار ہیں۔ گو اس کے صرف چند نسخے جو ہم کو دستیاب ہوئے ہیں ایک قلیل تعداد اشعار کی رکھتے ہیں۔"

لیکن پروفیسر براؤن کی رائے میں نظامی کا اور کلام نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"گر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسی تخلص کے اور بہت سے شعرا گذرے ہیں جن کا یہ کلام ہو سکتا ہے، اور اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ایک مدت مدید سے بالکل معدوم اور نایاب ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ اسی تخلص کے دیگر شعرا گذر چکے ہیں۔ چنانچہ خود نظامی کے زمانے میں اس تخلص کے تین شاعر موجود تھے[2] لیکن مذکورۂ بالا بیانات کے علاوہ تمام کتب تذکرہ سے اس قول کی تائید ہوتی ہے اور اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے۔ آغا احمد علی صاحب مرحوم کے پاس ایک مختصر دیوان نظامی کا موجود تھا جس کی نسبت وہ لکھتے ہیں :-

---

[1] مجمع الفصحا جلد اول صفحہ ۶۳۷ [2] چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی۔

"نزد بندہ، احد یک موجز دیوان شیخ نظامی گنجوی، محتوی بر قصائد و غزلیات و رباعیات عارفانہ کہ تخمیناً ہمگی یا نصد بیت خواہد بود موجود است کتابخانہ ام را از و شرفی نا محدود"[۵۱]

نظامی کی غزلیات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ" باوجودیکہ انھوں نے بلبل کے نغمے اور گل کے رنگ و بو سے بہت کام لیا، پھر بھی اس کے الفاظ اور بندش میں غزلیت کا مزہ نہیں پیدا ہوا"[۵۲]۔ چنانچہ تذکروں میں ان کی جتنی غزلیں پائی جاتی ہیں وہ پھیکی اور بے مزہ ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

ہزار بار بجاں آمدست کار مرا — نگشت عشق تو الّا یکے ہزار مرا
ز خام کاری، کاسے چناں مکن با من — کہ ہیچ کار تو ناید بہ یچ کار مرا
چو بے کنار و میان است عشق تو لابد — میانِ دل (کشند) از دیدہ در کنار مرا

× × × × × × × × × × × ×

چو بہ جو محنت من زاں رخِ گندم گون است — کہ ہمہ شب رخ پر کاہم از آں پر خون است
من چو گندم شدہ ام از غم او دل بدو نیم — ایں غم او را بہ یکے جو کہ نظامی چون است

اپنے جگر گوشہ کے ماتم پر یہ غزل لکھی ہے:-

اے شدہ ہمسرِ خوبانِ بہشت — آں چناں عارض و آنگہ بہ خشت
خط نیاوردہ بتو عمرِ ہنوز — ایں قضا بر سرت آخر چہ نوشت؟
چہ عجب گر شودی جان و جہاں — خاک از دیدہ من خوں آغشت
سبزہ زاری خطت در خاک است — آب کے باز تواں داد بکشت"

اس غزل کے مقابلہ میں خواجہ حافظ کی اس غزل کو دیکھو جو نظامی ہی کی طرح انھوں نے بھی اپنے فرزند کے ماتم میں لکھی ہے کتنی پُر سوز و گداز ہے:-

بلبلے خونِ جگر خورد و گلے حاصل کرد — باد غیرت بصدش خار پریشاں دل کرد

---

۵۱ ہفت آسماں مطبوعہ ۱۸۷۳ء کلکتہ ۵۲ سخندانِ فارس صفحہ ۳۶

طوطیِ را بہ ہوائے شکرے دل خوش بود ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد

قرۃ العینِ من آں میوۂ دل یادش باد کہ خود آساں بشد و کار مرا مشکل کرد!

ساربان بار من افتاد خدا را مددے! کہ امید کرم ہمرہِ این محمل کرد

روے خاکی و نمِ اشکِ مرا خوار مدار چرخ فیروزہ طرب خانہ ازیں کہگل کرد

نزدی شاہ رخ و فوت شد امکان حافظ چہ کنم بازیِ ایام مرا غافل کرد"

شاعری شاعری کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے، طبع رسا تحصیل علوم، اور فیض یزدانی چنانچہ انوری کہتا ہے :-

"شاعری را سہ چیز می باید تا کہ اشعار بر مراد آید

طبع و تحصیل و فیض یزدانی ہر کرا نیست ژاژ میخاید"

مبدأ فیاض سے نظامی کو یہ سب باتیں حاصل تھیں ۔ قدرت نے ان کو ازل ہی سے شاعری کی دولت سے مالا مال کر کے تمام باتوں سے مستغنی کر دیا تھا، ان کی بلند پرواز طبیعت نے فارسی شاعری میں وہ نقش آرائیاں کیں جو بعد میں متاخرین کا سرمایۂ ناز رہیں -

مثنوی، قصائد، اور غزل لکھنے میں فردوسی، انوری، اور سعدی پیغمبران سخن مانے گئے ہیں - چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :-

"در شعر سہ تن پیمبر انند ہر چند کہ لا نبیَّ بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی"

لیکن جب قائل قطعۂ مذکور سے پوچھا گیا کہ تم نے ان تینوں کو تو پیغمبرانِ سخن قرار دیا اور نظامی جو اُستادِ بے بدل ہیں ان کا نام کیوں نہیں لیا؟ تو اُس نے جواب دیا کہ میں نے پیغمبران سخن کا ذکر کیا ہے اور وہ (نظامی) تو خدائے سخن ہے ۔

شعرائے ایران کسی نہ کسی صنفِ خاص میں کمالیت رکھتے تھے، چنانچہ فردوسی رزمیہ میں، خیام فلسفہ میں، سعدی عشقیہ اور پند و موعظت میں، اور حافظ غزل سرائی میں ممتاز تھے، لیکن نظامی

کی نکتہ رس، اور معنی یاب طبیعت نے تمام انواعِ شاعری کو لیا، اور بدرجۂ کمال پہنچایا۔ پختگیِ کلام نظامی کا خاص شیوہ ہے، تمام شعرائے متوسطین و متاخرین اس بات پر متفق ہیں کہ اُن کا ساپختہ گو آج تک پیدا نہیں ہوا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:-

"نظمِ نظامی بہ لطافت چو دُر　　وز دُر او سربسر آفاق پُر
پختہ ازو شد چو معانی تمام　　خام بود پختن سودائے خام"

فیضی نے جہاں اور شعرائے نامور کا ذکر کیا ہے لکھا ہے:-

ز سحر کاری گنجور گنجہ خیز مپرس　　کہ داشت کلکش بر گنجِ غیب ثعبانی
بنظمِ او برسد نظمِ غیر اگر برسد　　مخیلِ متنبی بنصِ قرآنی"

نظامی نے بہت سی باتیں ایجاد کیں، مثلاً

سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں۔
سب سے پہلے انہی نے مخزنِ اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو مثنوی میں داخل کیا۔
سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن) میں پانچ نعتیں لکھیں۔
سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کی داغ بیل ڈالی۔
سب سے پہلے انہی نے قصیدہ کو مدح سے پاک کیا۔

استعارہ اور تشبیہ میں سب سے پہلے نزاکت اور لطافت جس نے پیدا کی وہ نظامی ہی ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ اس کے موجد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات جن کو مضمون کے موثر اور دلآویز بنانے میں بہت بڑا دخل ہے نظامی کے کلام میں کثرت سے مستعمل ہیں، اور ان کو نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) پیغمبر (صلعم) کی نعت میں فرماتے ہیں۔

گزیں کردۂ ہر دو عالم توئی　　چو تو گر کسے باشد آں ہم توئی"

یعنی تجھ سا اگر کوئی ہے تو وہ خود تو ہی ہے۔ جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

اس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں ایک ہیں۔ اس صنفِ تشبیہ کے مخترع ہندی ماہران فن بدیع ہیں، اس کا نام انھوں نے اُپّتیا النکار رکھا ہے۔ فارسی میں اس قسم کی مثالیں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مُلّا ظہوری کہتے ہیں :-

"چوں ظہوری بجز ظہوری نیست　　　در محبت یگانہ مے باشد"

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

"تو ان گفت زخوبان دگری باشد　　　ہم توئی از تو اگر خوب ترے می باشد"

میرزا جلال طباطبائی نے اپنے منشآت میں یہ شعر نقل کیا ہے :-

"آب رُخِ آئینۂ جم منم　　　ایچو منے گر بود آں ہم منم"

(۲) "سبغۂ ارغواں کشتہ بجائے جو　　　بنفشہ درودہ بوکت درو"

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں پیدا ہوا، اس کو اس طرح ادا کیا کہ آتش پرست نے ارغوان بویا، اور بنفشہ کاٹا۔

(۳) شکن گیر گیسوشں از مشک ناب　　　زدہ سایہ بر چشمۂ آفتاب

اس (معشوق) کی زلف پر شکن نے، جو مشکِ خالص سے بنی تھی، چشمۂ آفتاب (چہرہ) پر اپنا سایہ ڈالا۔

(۴) ز سرسبزی گنبد تابناک　　　زمرد شدہ لوحِ طفلانِ خاک

کہنا یہ تھا کہ نیلگوں آسمان کے فیض سے نباتات کا رنگ بھی ہرا ہو گیا۔ اس کو اس طرح ادا کیا کہ گنبد تابدار کی سرسبزی سے طفلانِ خاک (نباتات) کی لوح بھی زمرد ہو گئی۔

(۵) لیلےٰ کے چہرے کی تعریف کرتے ہیں :-

"زلفش چو شبے رخش چو باغے　　　یا مشغلۂ بجنگ زاغے"

لیلیٰ کی زلف کو رات سے، اور اس کے چہرے کو باغ سے تشبیہ دی ہے۔ پھر دوسرے مصرع میں زلف کو کوّے سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں اُس کا باغ سا چہرہ رات جیسی زلفوں کے نیچے

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوے کے پنجے میں کوئی شعلہ کی چیز ہو۔

(۶) دخاں از بر شعلۂ آذری چو بر سرخ گل برگ نیلوفری

آگ کا شعلہ بھڑکا اور اس میں سے جو دھواں اُٹھتا تھا اُس کو تشبیہ اور استعارہ میں اس طرح ادا کیا کہ شعلہ کے سر پر دھواں ایسا خوش نما معلوم ہوتا تھا جیسے گُلِ سرخ پر برگِ نیلوفر یعنی معشوق کے سرخ سرخ رخسارہ پر سیاہ بال۔

اب ہم نظامی کی چند اقسامِ نظم، مثلاً، جذباتِ انسانی کا اظہار، منظر نگاری، عشقیہ، رزمیہ، اخلاقی، فلسفیانہ وغیرہ کو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

جذباتِ انسانی: یہ بھی ایک شاعری کے انواعِ لطیفہ میں سے ہے۔ قدماء میں سوائے فردوسی کے اس صنف میں نظامی کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ جذباتِ انسانی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ہو بہو تصویر کھنچ جاتی ہے۔ مثلاً، سکندر کی دارا کے ساتھ مبارز طلبی، دارا کا خود اپنے نوکروں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مرنا — سکندر کا اُس کے پاس جانا، اور دارا کا سر اپنی گود میں لینا — دارا کا اس سے حسرتناک باتیں کرنا، نظامی نے اس قدر پُر اثر اور درد انگیز طریقہ پر بیان کیا ہے جس سے جذباتِ انسانی مشتعل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"سر خستہ را بر سرِ راں نہاد شب تیرہ بر روز رخشاں نہاد

فرو بستہ چشم آں سر خوابناک بدو گفت "برخیز ازیں خون و خاک"!

"رہا کن کہ در من رہائی نماند چراغ مرا روشنائی نماند

سپہرم بر آں گونہ پہلو درید کہ شد در جگر پہلویم ناپدید

تو اے پہلواں کامدی سوے من نگہدار پہلو ز پہلوے من

کہ با آں کہ پہلو دریدم چو میغ ہمی آید از پہلویم بوے تیغ

سرِ سروراں را رہا کن ز دست تو مشکن کہ ما را جہاں خود شکست!

چہ دستی کہ با ما درازی کنی بتاجِ کیاں دست بازی کنی

نگہدار دستت کہ دارست این! نہ پنہاں چو روز آشکار است این
چو گشت آفتاب مرا روے زرد نقابے بُن در کش از لاجورد
ببیں سرورا در سر افگندگی چو من شاہ را اور چنیں بندگی!
ذریں بندم از محنت آزاد کُن بآمرزشِ ایزدم شاد کن،
رہا کن کہ خواب خوشم می برد! زمین آب و چرخ آتشم می برد
مگرداں سرِ خفتہ را از سریر کہ گردون گرداں برآرد نفیر
زمانِ من اینک رسد بے گماں رہا کن بہ کام خودم یک زماں
اگر تاج خواہی ربود از سرم یکے لحظہ بگذار تا بگذرم
چو من زیں ولایت کشادم کمر تو خواہ افسر من ستاں خواہ سر!
سکندر بنالید "کاے تاجدار! سکندر منم، چاکر شہریار!
نخواہم کہ بر خاک باشد سرت نہ آلودۂ خوں شود پیکرت
ولیکن چہ سوداست کیں کار بود تأسف ندارد کنوں ہیچ سود
اگر تاجور سر برافراختے کمر بندِ او چاکری ساختے
دریغا بدریا کنوں آمدم! کہ تا سینہ در موج خوں آمدم
چرا مرکبم را نیفتاد سُم چرا پے نہ کردم دریں راہ گُم
مگر نالۂ شاہ نشنیدمے نہ روزے بدیں روز ہم دیدمے
بدار اے گیتی و دانائے راز کہ دارم بہ بہبود دارا نیاز
ولیکن چو بر شیشہ افتاد سنگ کلیدِ در چارہ ناید بچنگ
دریغا کہ از نسل اسفندیار ہمیں بود و بس ملک را یادگار
چہ بودے کہ مرگ آشکارا شدے سکندر ہم آغوش دارا شدے

بچارہ گری چوں ندارم تواں   کنم نوحہ بر زادِ سروِ رواں
چہ تدبیر داری مرادِ تو چیست؟   امید از کہ داری و ہمت زکیست؟
چو دارا شنید آں دمِ دلنواز   بخواہش گری دیدہ را کرد باز
بدو گفت "کاے بہتریں بختِ من   سزاوارِ پیرایۂ تختِ من
چہ پُرسی؟ زجان بجاں آمدہ   گُلے در سمومِ خزاں آمدہ
زسبے آبیم سینہ سوز درون   قدم تا قدم غرق دریاے خوں
+ + + + +   + + + + +
جہاں غارت از ہر درے می برد   یکے آورد دیگرے می برد
نہ زو ایمں آنانکہ ہستند نیز   نہ آنانکہ رفتند، رستند نیز
بہ بیں روزِ من راستی پیشہ کُن   تو نیز از چنیں روزے اندیشہ کُن

منظر نگاری ۔ مناظرِ قدرت میں باغ و بہار کی تعریف شعراے ایران کا عام موضوع رہا ہی جس پر ابتدا سے آج تک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں ۔ چنانچہ نظامی نے بھی اس میں دادِ سخن دی ہو، منوچہری دامغانی کے سوا قدما میں سے کسی نے نیچر کی ایسی دلکش تصویر نہیں کھینچی جیسی نظامی نے ۔ ملاحظہ ہو ، سرسبز و شاداب مرغزار میں جانوروں کا چرنا ، پاس ہی چشموں کا بہنا ، اشجارِ ثمردار کی سرسبز شاخوں کو نسیم صحرا کا ہلانا وغیرہ کا نظامی نے نیچرل سماں آنکھوں کے سامنے پیش کردیا ہے :۔

"چو مینو چراگاہے آمد پدید   کہ از خرمی سر بہ مینو کشید
بہ ہر پنج گاہے دراں مرغزار   روانہ شدہ چشمۂ خوشگوار
ہوای خوش و بیشہ ہاے فراخ   درختاں بارآور و سبز شاخ
رواں آب در سبزۂ آب خورد   چو سیماب بر پیکرِ لاجورد

گیاہان نورستہ از آب پُر　　چو بر شاخ مینا بر آوردہ دُر
پے آہو از چشمہ انگیختہ　　جو بر نیفہا نافہا ریختہ
سُمِ گور بر سبزہ خارید جاے　　چو بر سبزہ دیبا خطِ مشکساے
ہوا نے خس و سبزہ بے خار بود　　دگر بود خار انگبیں دار بود
ز شیریں گیاہاے کوہ و درہ　　شکر یافتہ شیر آہو برہ
ہر آہو کہ باداغ آزادہ بود　　ز نافہ کشی نافش افتادہ بود
گوزنے کز و روے بر خاک داشت　　بچشمش جہاں چشم تریاک داشت
حریر زمیں زیر سُمِّ ستور　　شدہ کور چشم از پے چشمِ گور"

باغ کا نظارہ، انواع و اقسام کے پھولوں کا ذکر، طیور کی نغمہ سرائی۔

"خندید شگوفہ بر درختاں　　چوں سگۂ روے نیک بختاں
گُل یافت ستبرق حریری　　شد باد بگوشوارہ گیری
غنچہ کمر استوار می کرد　　پیکان کشی ز خار می کرد
از لالۂ لعل و از گُلِ زرد　　گیتی علم دو رنگ بر کرد
نرگس ز دماغ آتشیں تاب　　چوں تب زدگاں نجستہ از خواب
زاں چشمۂ سیم کز سمن رست　　نسریں ورقے کہ داشت می شست
نیلوفر از آفتاب گل رنگ　　بر آب سپر فگندہ بے جنگ
جوشیدن قطرہاے بادہ　　خوں از رگ ارغواں کشادہ
زلفین بنفشہ از درازی　　دریاے فتادہ وقت بازی
سنبل سرِ نافہ باز کردہ　　گل دست بہ او دراز کردہ
سوسن نہ زباں کہ تیغ در بر　　نے نے غلطم کہ تیغ بر سر
شمشاد بہ جعد شانہ سے کرد　　گلنار بہ نار دانہ سے کرد

سیرابی سبزہ ہای نوخیز　از لولوے تر زمرد انگیز

× × × × × × × × × × × × ×

بلبل ز درخت سر کشیدہ　مجنوں صفت آہ بر کشیدہ
دُرّاج ز دل کبابے انگیخت　قمری نمکے ز سینہ می ریخت
ہر فاختہ بر سر نیارے　در زمزمۂ حدیثِ یارے
مرغان زباں گرفتہ چوں زاغ　بکشادہ زبان مرغ در باغ"

سراپا نگاری یعنی کسی چیز کا حلیہ بیان کرنا اکثر مدحیہ قصائد میں شعرا بادشاہ کی تعریف کے ساتھ اُس کی تلوار اور گھوڑے وغیرہ کی بھی تعریف کرتے تھے، قدما میں منوچہری نے اس میں زورِ سخن دکھایا، اور گویا وہی اس کا موجد بھی ہے۔ گو متاخریں بلند پردازی کرکے اس میدان میں آگے نکل گئے ہیں، لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں۔ نظامی نے بھی اکثر جگہ اپنی مثنویوں میں حلیہ نگاری کا استعمال کیا ہے، خصوصاً کسی معشوق کا حلیہ بیان کرنے میں اس قدر زورِ تخیل سے کام لیا ہے کہ متاخرین میں اور ان میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سکندر خاقانِ چین کا مہمان ہے، خاقان نے کئی بیش بہا تحائف سکندر کی نذر کیے، ان میں سے ایک گُل اندام معشوقہ (کنیز) بھی ہے، جس کا سراپا نظامی اس طرح بیان کرتے ہیں:-

کنیزے سیہ چشم و پاکیزہ روی　گُل اندام و شکرلب و مشکبوے
خرامندہ ماہے چو سروِ بلند　مسلسل دو گیسو چو مشکیں کمند
رُخش بر بنفشہ گُل انداختہ　بنفشہ نگہبان گُل ساختہ
کمر بستۂ زلفِ او مشکناب　کہ زلفش کمر بستہ بر آفتاب
بلوریں تن و قاقمیں پشتِ او　بہ شکلِ دُمِ قاقم انگشتِ او
ز دربرکس از تنگ چشمی نظر　ز چشمش دہانش بسے تنگ تر

تو گفتی کہ خود نیست او را دہا ل | ہماں نام او ہست اندر جہان!
ز ابرو کماں کردہ از غمزہ تیر | بہ تیر و کماں کردہ صد دل اسیر
بر و غبغبے کاب ز وے چکید | بر آتش بر آبِ معلق کہ دید؟"

(۲) روشنک دختر دارا کا سراپا ،

"رُخی چوں گُل و آبِ گُل ریختہ | گلابے ز ہر چشم انگیختہ
زباں کوتہ و زلف و گردن دراز | لب چوں شکر خال باد و بہ راز
زنخ سادہ و غبغب آویختہ | میاں لاغر و سینہ انگیختہ
فریبندہ چشمے جفا جوے نیز | دو ابخشِ بیمار و بیمار نیز
شکن گیر گیسوش از مشکِ ناب | زدہ سایہ بر چشمۂ آفتاب" ۔

عشقیہ | "ایران کی شاعری کا اصل مایۂ ناز عشقیہ شاعری ہے"۔ نظامی پہلے شخص ہیں جنھوں نے عشقیہ شاعری کی صنف قائم کی ، اور عشقیہ مثنویاں لکھ کر اس کو اوج ترقی پر پہنچا دیا غزل گوئی کی ایجاد بھی ان ہی سے ہوئی۔ متقدمین کے زمانہ میں شاعری میں عشق و عاشقی کی روح نہ تھی ، نظامی نے عاشقانہ خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے ایک مستقل لٹریچر پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان کی عشقیہ مثنویاں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں ، جو عاشقانہ خیالات و جذبات سے اس قدر لبریز ہیں جس کی نظیر قدما کی عشقیہ مثنویوں میں نہیں ملتی ۔

رزمیہ | رزمیہ نظم جس کو انگریزی میں ایک پوئٹری Epic Poetry کہتے ہیں ، ایک حد تک قوم کے شجاعانہ جذبات کو برانگیختہ کرنے میں پورا دخل رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے اہل یورپ اس کو بہترین انواع سخن میں شمار کرتے ہیں ، ان کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے جس کا فخریہ کارنامہ یہی رزمیہ شاعری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہومر کے برابر رزم ، دنیا کا کوئی شاعر آج تک نہیں لکھ سکا ، لیکن اگر کوئی رزمیہ نظم ایسی ہے جس کو ایلیڈ (Iliad) و اوڈیسی

کے پہلو میں جگہ دی جا سکے، تو وہ فردوسی کا شاہنامہ ہے۔ شعرائے ایران میں رزمیہ شاعری کے لحاظ سے فردوسی کا کوئی بھی مدِ مقابل نہیں۔ اس صنف میں فردوسی کے بعد دوسرا نمبر نظامی کا ہے۔ چنانچہ سکندر نامہ جو شاہنامہ ہی کا عکس ہے، نظامی کی رزمیہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس میں رزمیہ کے تمام اصول بدرجہ احسن پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شروع میں حربی باجوں کا بجنا، ہنگامۂ جنگ اور شور و دار و گیر، آلاتِ حرب، رجز، دشمنوں پر حملہ کرنا وغیرہ باتوں کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے:-

حربی باجوں کا بجنا:-

زبس شورشِ کوس رو ئینہ طاس — بہ گردون گرداں در آمد ہراس
شغبہائے شیپور زآواز تیز — چو صورِ سرافیل در رستخیز
ز نعرہ برآوردنِ گاؤ دُم — شد از آسماں زہرۂ گاو گم
دُہلہای گرگینہ چرم از خروش — در آورد مغز جہاں را بہ جوش
ز شوریدن طنبک زخم ریز — دماغِ فلک سُفتہ از زخم تیز
ز شوریدنِ نای کرنائے — بر افتاد تب لرزہ بر دست و پائے
دلِ ترکتازان دراں دار و گیر — بر آورد از نائے ترکی نفیر

ہنگامۂ جنگ:

ز غوغا برآوردن خیل روس — نگاور شدہ زیرِ شیراں شموس
غبار زمیں بر ہوا راہ بست — عنانِ سلامت بروں شد ز دست
ز نعل سمندانِ پولاد میخ — زمیں را ز جنبش برآفتادہ بیخ
زبس نعرہ کامد بروں از کمیں — فرو اوفتاد آسماں بر زمیں
در آمد بہ جنبش دو لشکر چو کوہ — کز اں جنبش آمد جہانے ستوہ
برانگیخت رزمے چو بارندہ میغ — تگرگش ز پیکان و بارانِ تیغ

زسینے زگوگرد بے آب تر ہوائے ز دوزخ جگر تاب تر
چو لشکر بہ لشکر در آمیختند قیامت زگیتی بر انگیختند "

آلاتِ حرب :-

بہ ابرو درآمد کماں را شکنج ثنا یاں شدہ تیر چوں مار گنج
ستیزندہ از تیغ سیماب ریز چو سیماب کردہ گریزا گریز
ز پولادِ پیکانِ لشکر شکن تنِ کوہ لرزید بر خویشتن
خدنگِ سہ پر کردہ زاہن گزار چو مرغِ دو پر بر سرِ مرغزار
ز نیزہ نیستاں شدہ روئے خاک زگوپالہا کوہ گشتہ مغاک
سناں بر سر موئے بازی کناں بہ خوں روئے دشمن نمازی کناں
نہنگان شمشیر جوشن گداز بگردن کشی کردہ گردن دراز
نکد کوبہ گرزۂ ہفت جوش بر آورد از گاوِ گردوں خروش
ز قارورہ و ناچخ و بید و برگ قوارہ قوارہ شدہ درع و ترگ "

رجز :-

" چنیں گفت با پہلوانانِ رُوم کہ فردا دریں مرکز سخت بوم
بکوشیم کوشیدنی مردوار رگِ جاں بکوشش کنیم استوار
اگر دست بردیم ما راست ملک دگر ما شدیم آنِ دار است ملک
قیامت کہ پوشیدہ از رائے ماست بود روزِ آں روز فردائے ماست "

اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہوکر دشمن پر حملہ کرنا :-

" جرّم نامی از کوہِ لاکن چو کوہ در آمد کز و عالم آمد ستوہ
یکے ترگ (نام پہلوان) زد آہنی بر سرش کہ یکبارہ می ریخت از پیکرش
قبائے زرہ (خود) بر تنش تاب وار چو سیماب روشن چو سیم آب دار

بشروه درآمد چو شیرِ دماں　　زگفتن ندادش زمانے اماں
چناں راند شمشیر بر شیرمرد　　کزاں شیر شرزه بر آورد گرد
چو افتاد دشمن دراں پاے لغز　　به سُمِّ سمندش بسائید مغز
دوالی چو دید آں چناں گردنے　　نه گردی به ماناکه گردن زنے
به پیچید و پیرایۂ جنگ خواست　　بسیچ شدن کرد و درجنگ راست
تبارک برآورد روی آہنیں　　کجے ترک سفته زپولاد چیں
حمائل یکے تیغ زهر آبدار　　کمندے چو زلفِ بتاں تابدار
فرس را برافگند برگستواں　　بزیں اندر آمد چو کوہ رواں
سوے دشمن آمد چناں تازه روے　　که طفل از دبستاں در آید بکوے
جرم چوں دراں فرزِ زیبنده دید　　دل از جنگ شیراں شکیبنده دید
ولیکن نبودش سرِ بازگشت　　بنا چار با مرگ دمساز گشت
بگرد دوالی درآمد دلیر　　دوالک همی باخت با تُندشیر
بسی حرف در بازی اندوختند　　زرحمت یکے حرف ناموختند
دوالی کمربست چوں شیرِ نر　　زدش ضربتے بر دوالِ کمر
گزارنده شد تیغ بے هیچ رنج　　دو نیمه شد آں کوهِ فولاد سنج
بدیں گونه آں کوهِ پولاد پشت　　بسے گردِ لشکر شکن را بکشت"

اخلاقی شاعری

نظامی کا کلام اخلاقی شاعری سے مملو ہے، خصوصاً مخزن اسرار، جو ان کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ خاص اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے تمام کلام میں جا بجا اخلاقی باتیں درج ہیں۔ کسی نے ان کے تمام اخلاقی اشعار کو یکجا جمع کر کے اس کا نام "انتخاب پنج گنج" رکھا ہے۔ اس مجموعہ کا ایک نہایت خوش خط اور مطلّا قلمی نسخہ ریاست

جونا گڈھ کی بہادر خانجی لائبریری میں موجود ہے۔

فلسفیانہ شاعری | علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں کہ "فلسفیانہ مسائل نظامی نے اس حد تک لکھ دیے ہیں کہ زبان کی کم مائگی کی شکایت نہیں ہو سکتی، اور اگر متاخرین ان کے نقش قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بن گئی ہوتی"۔ بلا شبہ نظامی نے جہاں فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا ہے وہاں بہت کم عربی الفاظ کو دخل دیا ہے، لیکن اس سے فارسی کا فلسفیانہ زبان بنجانا ایک غیر متوقع امر تھا؛ کیونکہ اول تو جتنی فلسفیانہ اصطلاحات عربی زبان کی ہیں اُن کو اگر فارسی کا جامہ پہنایا جاتا تو بلحاظ غیر مانوس ہونے کے ان کے سمجھنے میں بڑی دقت واقع ہوتی اور فلسفہ کی حالت فارسی زبان میں آکر ایسی ہو جاتی جیسی آج کل کسی عمدہ انگریزی ناول کے اُردو ترجمہ کی! یہی سبب ہے کہ بوعلی سینا کی حکمتِ علائیہ معما ہو کر رہ گئی۔ دوسرے یہ کہ نظامی نے فلسفہ کے صرف چند مسائل بیان کیے ہیں جن میں سے اکثر تو فلسفۂ اخلاق سے متعلق ہیں، اور بعض الہیات اور طبیعیات کے، اور وہ بھی ابتدائی مسائل مثلاً ابتدائے موجودات، عناصر، سلسلۂ علل وغیرہ کے متعلق صرف یونانی حکما کی آراء نقل کی ہیں، علاوہ ازیں جو اصطلاحیں نظامی نے عربی سے فارسی کے قالب میں ڈھالیں وہ ایسی ہیں کہ بڑی مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ مثلاً:- پوئندہ، فرسودن، توانائی، بخشش، افسردگی، کیا ان سے کوئی شخص متحرک بالارادہ، تغیر، وجود، نوع، اور قسر کے معنی سمجھ سکتا ہے؟

تجاذب اجسام | علم طبیعات کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ کُل اجسام، اور کُل ہستیاں مختلف ذرات سے مرکب ہیں۔ ہر جسم اور ہر ہستی خواہ کسی نوع سے ہو، اپنی نوع کے ساتھ ایک قسم کی کشش اتصالی رکھتی ہے۔ یہی کشش "نظامِ نسبت" کا جزو اعظم ہے جس پر عالم ایجاد و تکوین کا دارومدار ہے۔ حکما نے اس کو "تجاذب اجسام" کے نام سے موسوم کیا ہے، لیکن نظامی اپنی شاعرانہ زبان میں اس کو بہ الفاظ دیگر "عشق" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس اہم مسئلہ کو معمولی مثالیں دے کر یوں سمجھاتے ہیں:-

"ہر آں جوہر کہ ہستند از عدد بیش — ہمہ دارند میل مرکز خویش
گر آتش بر زمیں منفذ نیابد — زمیں بشگافد و بالا شتابد
وگر آبے بماند در ہوا دیر — بمیل طبع ہم راجع شود زیر

\+ + + + + + + + +

کہ مقناطیس گر عاشق نبودے — بدان شوق آہنے را کے ربودے
وگر عشقش نبودے در گذرگاہ — نبودے کہربا جویندۂ کاہ
طبائع جز کشش کارے ندارند — حکیماں ایں کشش را "عشق" خوانند"

اسی کو ایک انگریزی شاعر نہایت آسان طریقے سے یوں ذہن نشیں کراتا ہے :-

The mountains mingle with the river
And the rivers with the ocean.
The winds of heaven mix for ever
With a sweet emotion;

See the mountains kiss high heaven
And the waves clasp one another;
No sister flower would be forgiven
If it disdain'd its brother:
And the sunlight clasps the earth
And the moonbeams kiss the sea."

چشموں کو دریا میں مل جانے کا اشتیاق ہے، اور دریاؤں کو سمندر کا، آسمان کی ہوائیں غایت دلی جوش کے ساتھ باہم ہمکنار ہوتی ہیں، دیکھو، اُونچے اونچے پہاڑ افلاک سے بوسہ ستانی کر رہے ہیں، اور سمندر کی موجیں باہم آغوش ہوتی ہیں! اُس گل کو کون اچھا کہے گا جو اپنے بھائی پھولوں سے الفت نہ کریگا! اور سورج کی روشنی زمین سے بغل گیر ہوتی ہے اور چاندنی کرنیں سمندر کو چومتی ہیں۔"

۱ ماخوذ از نظم "فلسفۂ عشق" (Loves Philosophy) مصنفہ P. B. Shelly پرسی بیسی شیلی

قوت مردی کیلئے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہوکر علاج سے تنگ ہوگئے ہون آخرمین اب ایکبار ہماری سفارش کو قبول فرمائین اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف ادویہ اننگ نگرہ گویون کو استعمال فرمائین اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کرین، گئی ہوئی اور ہاتھون سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتین از سر نو عود نکرائین تو ہمارا ذمہ۔ صاحبو! اس کے باب مین زمانہ کے معزز اصحاب تعریف فرما رہی ہین لاکھون کی تعداد مین سرٹیفکٹ موجود ہین مردون اور عورتون کو بہت مفید ہے اور نباتات سے مرکب ہین قیمت بھی بہت کم ہے۔ صرف فی بکس تیس گویون کا ایک روپیہ آزمائش شرط ہے یکمشت چار روپیہ کے خریدار کو ایک روپیہ کی دوا زیادہ ملے گی۔

وید شاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

بسم اللہ

الناظر

نمبر ۹ جلد ۱۵ یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۹ جلد ۱۵ —— یکم دسمبر ۱۹۱۶ء

نظامِ ازدواج

جون ۱۸۵۵ء کا زمانہ ہی۔ انگلستان میں امراضِ شُش وصدر کے مشہور اسپشلسٹ (ماہر خصوصی) ڈاکٹر سر . . . کی شہرتِ حذاقت اپنے منتہائے شباب پر ہی۔ مطب میں ہر وقت ایک ہجوم رہتا ہی، اور عام اعتقاد یہ ہی کہ ڈاکٹر موصوف کی تشخیص کسی حالت میں غلط ہی نہیں ہوسکتی۔ ایک روز ان کے مطب میں پروفیسر ہکسلی، اپنے ہمراہ ایک مریض صورت نوجوان خاتون کو لیے داخل ہوتا ہی۔ لوگ ہکسلی کے مرتبہ و عظمت سے واقف ہو چکے ہیں، اور اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہکسلی کا ضبط، متانت، و خودداری، دوست دشمن سب کو مسلم ہی۔ وہ اپنی اُسی طبعی سنجیدگی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس پہنچا ہے، اور خواہش کرتا ہی کہ اُس کی ساتھ والی خاتون کا معائنہ کیا جائے۔ ڈاکٹر سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہی، اور ایک غائر و طویل معائنہ کے بعد بالآخر یہ فیصلہ صادر کرتا ہی کہ "اس خاتون کو دق شروع ہوگئی ہے، اب یہ کسی طرح نہیں بچ سکتی، زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اور چل سکتی ہی"۔ خوددار ہکسلی یہ سُن کر دفعتہً بیخود ہو جاتا ہی، اور چیخ کر بول اُٹھتا ہی کہ "کچھ پروا نہیں، خیر، کچھ پروا نہیں۔ چھ مہینے کیا معنی اس کی زندگی اگر چھ دن یا چھ گھنٹے کی بھی اور باقی ہی، تو بھی میں اسکے ساتھ شادی کروں گا، اور دیکھ اے شقی القلب ڈاکٹر کہ تیری اس پیشین گوئی کو کیسا غلط ثابت کرتا ہوں"۔

ہکسلی خود بھی ڈاکٹر ہے، مگر اس موقع پر اصولِ طب کو بالکل نظرانداز کر جاتا ہے۔ قوانینِ حفظِ صحت اُسے نوکِ زباں ہیں، لیکن اس وقت اُن پر ذرا اعتنا نہیں کرتا؛ خوب جانتا ہے کہ مدقوق کے ساتھ مجالست و مخالطت سمِّ قاتل ہے، لیکن بہ خوشی اس جامِ زہر کو اپنے مُنھ سے لگا رہا ہے۔ ضابطہ و خوددار ہے۔ لیکن شادی کی رُکاوٹ کا وہم آتے ہی یک بیک بیخود ہو جاتا ہے۔ یہ سب خوارقِ عادات کیوں ہوے؟ اس لیے، اور صرف اس لیے، کہ "ازدواج" کی خواہشِ پنہاں، اس علامۂ عصر کے دل و دماغ، عقل و جذبات، غرض سارے قویٰ پر حکمرانی کر رہی تھی۔

کیا خواہشِ ازدواج کی قوّت ایسی ہی عظیم الشان ہوتی ہے؟

مُلک ناروے کی کرسچینیا یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ امتحان کے لیے پندرہ سو کا انعام مقرر ہے، جس کے لیے (ذکور و اناث) متعدد طلبہ امیدوار ہیں۔ مگر تمام اساتذہ کو یقین ہے، کہ انعام ہر نورلنڈ کو ملے گا، جو مفلس و نادار ہونے کے ساتھ بہ لحاظ اپنی محنت، استعداد، شوقِ علم، و ذہانت کے سب میں ممتاز ہے۔۔ حریفوں کی جماعت میں ایک صاحبہ مِس پرڈوپ بھی ہیں۔ امتحان کا وقت آتا ہے عین اُس وقت، مس موصوف، نورلنڈ کو سُنا کر بہت ہی شرگیں لہجے میں فرماتی ہیں، کہ "کیا کہوں، مجھے اس وقت بھوک کیسی تیز معلوم ہو رہی ہے۔ بیتاب ہوئی جاتی ہوں، لیکن تنہا کھانا کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا"۔ نورلنڈ فوراً ہوٹل میں دو آدمیوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے، اور یہ دونوں کھانے میں مشغول ہیں، یہاں تک کہ امتحان کا سارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ پروفیسروں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوتی ہے، تو وہ سخت برافروختہ ہوتے ہیں۔ وہ نورلنڈ کو اب تک مفلس و نادار سمجھتے تھے، حالانکہ وہ ہوٹلوں میں احباب کی پُر تکلف ضیافتیں کرتا ہے! وہ اسے علم کا شائق سمجھتے تھے، حالانکہ وہ اس قدر بدشوق و بے پروا ہے کہ امتحان کا سارا وقت احباب پرستی کی نذر کر دیتا ہے! ایسے بدشوق و بے پروا کو انعام اگر ملتا بھی ہو تو نہ ملنا چاہیے۔ اس غصہ میں نورلنڈ کا نام ہی سرے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اور انعام اس کے

بجائے، اس کی کامیاب حریف، مس پروکوپ کو دے دیا جاتا ہے۔ نورلنڈ اس ساری ذلت و رُسوائی، ناکامی، اور مالی خسارہ کو بہ کمال خندہ جبینی برداشت کرلیتا ہے۔ مگر یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ چند ہی ہفتے کے اندر نورلنڈ، مس پروکوپ کو اپنے عقدِ نکاح میں لانے والا ہے، اور یہی ہوتا ہے۔

کیا کشش ازدواجی کے سامنے سارے جذبات شہرت پسندی، غیرت، خودداری، حُبِّ زر، و فرض شناسی کی متحدہ قوت ہتھیار ڈال دیتی ہے!

فلاسفۂ انگلستان کے مرقع میں سب سے زیادہ خشک عبوس تصویر مل کی نظر آتی ہے۔ مختلف علوم پر اس نے ہزار ہا صفحے اپنی یادگار چھوڑے ہیں، لیکن ایک ایک صفحہ، خشک مزاجی و تقشُّف کی کی تصویر ہے۔ سیرت نگاروں کا اس پر اجماع ہے کہ اس کی زندگی اوّل سے آخر تک رُہبانیت کا ایک مجسمہ ہے۔ عمر بھر میں شاید ایک یا دو موقع پر وہ کھُل کر ہنسا ہو، ورنہ زیادہ سے زیادہ اُسکے لب تبسّم سے آشنا ہو سکتے تھے۔ شوخی، رنگینی، مزاح وظرافت، کا اُس کے آس پاس گزر بھی نہ تھا، مذاقِ سخن کا اُس کے گرد وپیش بھی نشان نہ تھا۔ یہی مل، یہی رُہبانیت و جذبات کُشی کا پُتلا ۱۸۳۱ء میں ایک کتخدا خاتون مسز ٹیلر سے ملاقات پیدا کرتا ہے۔ راہ ورسم بہت جلد دوستی، اور دوستی بہت جلد محبتِ شدیدہ کی شکل اختیار کرلیتی ہے، یہاں تک کہ مل کو اُس کے دیکھے بغیر ایک گھڑی چین نہیں پڑتا۔ خاتون موصوف کے شوہر مسٹر ٹیلر کو خبر ہوتی ہے، اور وہ اپنی بیوی کو مل سے ترکِ ملاقات پر مجبور کرانا چاہتے ہیں، لیکن اس میں ناکامی ہوتی ہے۔ بالآخر وہ اپنی بیوی کو انگلستان سے پیرس روانہ کردیتے ہیں۔ مل صاحب بھی وہاں پہنچتے ہیں۔ مل کے والد کو اس کی اطلاع ہوتی ہے۔ وہ سخت ناخوش ہوتے ہیں، اور فلسفی فرزند کو بُلا کر سخت فہمایش کرتے ہیں۔ لیکن مل، والد کی دلی ناخوشی اور زبانی فہمایش سے یکساں غیر متأثر رہتا ہے۔ سوسائٹی میں اس کے چرچے ہوتے ہیں، لیکن مل اپنے کان بند کرلیتا ہے۔ خاندان کے مختلف ارکان، بھائی، بہن وغیرہ سب اس صورتِ حال پر اظہارِ نفریں

کرتے ہیں، لیکن مِل سب کی طرف سے بے پروا رہتا ہے۔ آخر میں احباب کی باری آتی ہے، اور وہ مِل کو سمجھانے بجھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے، لیکن مِل اپنے عزیز ترین دوست سے قطع تعلق کرلینے کو اس پر بدرجہا ترجیح دیتا ہے، کہ اُس کی زبان سے اس موضوع پر ایک حرف بھی سُنے۔ آخر سب لوگ تھک کر مِل کو اُس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں، اور زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ سال، دو سال، پانچ سال، یہاں تک کہ پورے بیس سال گزر جاتے ہیں، اور مسز ٹیلر کا پیمانۂ حیات لبریز ہو جاتا ہے۔ مسز ٹیلر بیوہ ہوتی ہیں۔ لیکن آج بیوہ ہوتی ہیں، اور کل ہی دوبارہ لباس عروسی پہننے کی مسرت حاصل کرتی ہیں۔ اب دنیا ان کو مسز مِل کے نام سے پکارتی ہے۔

کیا جذبۂ زوجیت، بڑے سے بڑے نفس کُش فلسفی کو بھی مغلوب و مسخر کرلیتا ہے؟

مذکورۂ بالا تاریخی واقعات ہیں۔ مگر ہم نے ان کی سند میں اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن کیا اس کی ضرورت ہے؟ کیا یہ واقعات اس کے محتاج ہیں؟ کیا تواتر و کثرتِ وقوع کے لحاظ سے اس طرح کے واقعات روزانہ زندگی کا جزو نہیں بن گئے ہیں؟ اور کیا ہر شخص اپنے ذاتی علم و تجربہ سے اس قسم کے متعدد نظائر نہیں تلاش کرسکتا؟ ہمارا مقصد بھی ان واقعات کے تذکرہ سے کسی جدید و مخفی حقیقت سے روشناس کرنا نہیں تھا، بلکہ صرف ایک معلوم و مسلّم حقیقت کی طرف اُن کی توجہ کو از سرِ نو منعطف کرانا تھا۔ موت سے بڑھ کر قطعی و یقینی اور کون حقیقت ہوسکتی ہے؟ لیکن عملی زندگی میں ہر شخص اسے فراموش رکھتا ہے۔ بالکل یہی حال کششِ ازدواجی کا ہے۔ اس کی اہمیت سب کو مسلّم ہے۔ لیکن عملاً اکثر زبانیں اس کو بھلائے رکھتی ہیں، اس لیے ضرورت تھی، کہ آغازِ کلام ہی میں ہر ناظر اسے ایک بار پھر اپنے پیش نظر کرلے۔

مسئلۂ ازدواج، درحقیقت دو مختلف مسائل سے مرکب ہے:۔

(۱) اول یہ کہ جذبۂ زوجیت کی ماہیت کیا ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی تسکین، نظام ازدواج متعارف سے کہاں تک ہوسکتی ہے؟

ا مسئلہ۔ جذبات کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے، کہ وہ منازلِ حیات طے کرنے کے لیے فطرت
طرف سے انسان کے لیے دلیلِ راہ ہیں۔ حیات نام ہے ذات و ماحول کے درمیان ایک خاص
م کے تطابق کا۔ اس تطابق میں جب تک توازن قائم ہے، انسان کے قوائے حیات نمو پاتے
ہتے ہیں، اور عواملِ حیات افزا سرگرمِ کار رہتے ہیں۔ اور جہاں اس توازن میں خلل واقع ہوا،
ثرات حیات فرسا عمل کرنے لگتے ہیں، اور زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ غرض انسان کی زندگی
منحصر اُس توازن کے ہاتھ ہے، جو اُس کی ذات و ماحول کے درمیان پایا جاتا ہے۔ لیکن خود
سان کے پاس اس اطلاع کا کیا ذریعہ ہے، کہ کسی وقت یہ توازن اپنی اصلی حالت پر قائم ہے
نہیں؟ ظاہر ہے، کہ اس سے زیادہ انسان کے لیے کوئی چیز اہم نہیں ہو سکتی، کہ نوعِ انسان
بغیر اس طرح کی واقفیت کے قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے فطرت نے ہر انسان کو ایک معیار
ے دیا ہے، جس سے وہ ہر وقت اُس توازن کے ثبات و اختلال کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس
ا ریا مقیاس کا نام احساس ہے۔ جس کے دو پہلو، انبساط و انقباض، مسرت و غم، یا لذتؔ
سے موسوم ہیں۔ جس وقت تک عواملِ حیات افزا کا پلہ بھاری رہتا ہے، انسان پر مسرت
نبساط کی کیفیت طاری رہتی ہے، اور جب عواملِ حیات فرسا غالب آنے لگتے ہیں، تو انسان
دو الم سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ گویا جب انسان اپنے تئیں مسرت و انبساط کی کیفیت میں
ئے، یقین کرلے کہ اس کی زندگی کو ترقی و تقویت ہو رہی ہے، اور جب انقباض و اذیت میں
پائے، تو سمجھ لے کہ نظامِ حیات مختل ہو رہا ہے۔ اس بنا پر کہہ سکتے ہیں، کہ احساس، معیار
مدارجِ حیات کی کیفیت و کمیت کا[1]۔

---

[1] نظریۂ احساس کو ہم نے اپنے "فلسفۂ جذبات" میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:۔
".. کسی مخلوق کے زندہ رہنے کے یہ معنی ہیں، کہ وہ اپنے اندر اپنے ماحول کے مقابلہ میں ایسی استعداد موجود رکھتی ہے
باعث اس کے موثراتِ حیات افزا کا پلہ بہ نسبت عواملِ مہلکہ کے بھاری ہے ..... اگر اسے زندہ رہنا ہے،
ورہے کہ اس میں اُن تاثرات کا حصہ جو حیات کو قائم رکھنے والے، اسکی قوتوں کو بڑھانے والے" (باقی برصفحہ ۶)

لیکن عملی زندگی میں احساس کبھی مفرد و بسیط حالت میں نہیں پایا جاتا، بلکہ ہمیشہ کسی نہ کسی جذبہ کی صورت میں پایا جاتا ہے، جو مرادف ہے احساس مرکب کے۔ انسان پر مجرد لذت، یا مجرد الم کی کیفیت کبھی بھی طاری نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ کسی مخلوط و مرکب شکل میں ہوتی ہے، اور اسی کا نام جذبہ ہے۔ غم، مسرت، خوف، غضب، رحم، شقاوت، یاس، اُمید، شرم وحیا، یہ سب جذبات ہیں۔ مگر اب ان کی حیثیت محض ایک معیار یا مقیاس کی رہتی، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی ہو جاتی ہے، کہ یہ بجائے خود تحفظ حیات کا کام دینے لگتے ہیں، اور قیام وبقاے نظام حیات کا سبب بن جاتے ہیں؛ اور پھر سبب بھی ایسے اہم کہ یہ نہ ہوں، تو نظامِ حیاتِ بشری چشم زدن میں درہم برہم ہو جائے۔ غور کرو، کہ اگر خوف و دہشت کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا،

اور جسم ونفس کو بالیدگی پہنچانے والے ہیں، بہ نسبت اُن تاثرات کے زیادہ ہو، جو اُسکی قوت کو گھٹانے والے، اُسکے قویٰ کو کمزور وناتواں بنانے والے، اور اُسے موت کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کے پاس ان عوامل متضاد میں امتیاز کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟ کیا شے ہے، جس کی بنا پر وہ فیصلہ کر سکتا ہے، کہ فلاں فلاں افعال صیانت حیات کے حق میں مفید ہوں گے اور فلاں مضر؟۔۔۔ (اس کا جواب یہ ہے کہ) فطرت نے خود نفس انسانی میں ایک ایسی قوت ودیعت کر رکھی ہے، جسکے باعث وہ فی الفور مضر کو مفید سے، اور زہر ہلاہل کو آب حیات سے تمیز کر سکتا ہے، اور یہ وہ شے ہے، جسے ہم حیات نفسی میں احساس حظ والم سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی جو اشیا ہمیں خوش ذائقہ معلوم ہوتی ہیں، جتنی چیزیں خوشبودار ہوتی ہیں، جن آوازوں کا سننا خوشگوار معلوم ہوتا ہے، جن نظاروں کا دیکھنا مرغوب ہوتا ہے، جن چیزوں کے مس کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے، غرض جو چیزیں ہم میں کسی حیثیت سے بھی لذت، مسرت، حظ، وانبساط کا احساس پیدا کرتی ہیں، وہ علی العموم وہی ہوتی ہیں، جو ہمارے قیامِ حیات کے حق میں مفید ہوتی ہیں۔ اسی طرح جو ماکولات و مشروبات ہمیں بد ذائقہ معلوم ہوتے ہیں، جو آوازیں کرخت ہوتی ہیں، جن چیزوں میں بو آتی ہے، جن چیزوں کے نظارہ سے آنکھ میں خشکی یا خیرگی محسوس ہوتی ہے، جن چیزوں کو مس کرنا ناگوار گزرتا ہے، غرض جو چیزیں ہم میں کسی حیثیت سے بھی درد، کرب، اذیت وانقباض کا احساس پیدا کرتی ہیں، وہ وہی ہوتی ہیں، جو صحت انسانی کو نقصان پہنچانے والی، اُس کے شیرازۂ حیات کو متفرق کرنے والی اور اُس کے لیے سودی الالفنا (باقی بر صفحہ)

تو کون شے اُسے خونخوار درندوں، زہریلے حشرات الارض، اور دیگر مہلک موثرات سے محفوظ رہنے پر آمادہ کرسکتی؟ یا اگر جذبۂ غضب نہ ہو، تو کیا شے اُسے دشمنوں اور مخالفوں کی زد سے بچنے پر مستعد کرسکتی ہے؟ غرض یہی حال تمام جذبات کا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا، کہ بہ حیثیت مجموعی، صیانتِ حیات کے اصلی ضامن یہی ہوتے ہیں۔

مگر یہ عام جذبات، ظاہر ہے، کہ خود بخود نہیں پیدا ہوتے رہتے ہیں، بلکہ اپنی تکوین کے لیے بعض خارجی اسباب یا مہیجات کے محتاج رہتے ہیں۔ مثلاً غصہ ہمیں ہر وقت نہیں رہتا، بلکہ اُسی وقت آتا ہے، جب کوئی اشتعال انگیز واقعہ پیش آتا ہے۔ ہنسی ہمیں ہر گھڑی نہیں آتی، بلکہ صرف اُسی وقت آتی ہے، جب کوئی مضحک یا خوشگوار کیفیت پیش آتی ہے۔ اسی پر اکثر جذبات کو قیاس کرنا چاہیے۔ لیکن چند احساسی کیفیات ایسی بھی ہیں، جو تحفظ و صیانتِ حیات میں بہ لحاظِ اہمیت، ان عام جذبات سے بہ مراتب بالاتر ہیں۔ ان کے لیے ہمیں فطرت نے محرکاتِ خارجی یا مہیجات کے وقوع کا محتاج نہیں رکھا۔ وہ اپنے اوقاتِ معین پر خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے بالکل مستغنی ہے کہ کوئی مہیج موجود ہو۔ بھوک، پیاس، نیند، اس طبقے کے عنوانات ہیں۔ بھوک ہمیں ہر چند گھنٹے کے بعد بہرحال معلوم ہوگی، خواہ کھانا موجود ہو یا نہ ہو، خواہ اُس کا تصور ہمارے ذہن میں ہو یا نہ ہو۔ نیند ایک خاص وقت کے بعد ہمیں لازمی طور پر آنے لگتی ہے، خواہ کوئی خارجی سبب ہو یا نہ ہو۔ اس قسم کے جذبات کو، جو عام جذبات سے اہم تر ہیں، ہم اصطلاح میں اشتہاآت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ جذبات اگر زندگی کے لیے لازم ہیں، تو، اشتہاآت لازم تر ہیں۔ اُن کی قید سے اگر نجات پانا دشوار ہے، تو ان کی غلامی سے آزاد ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ ایسے شخص کا وجود، تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلینا نسبتہً آسان ہے، جسے ساری عمر

ہوتی ہیں۔ اور چونکہ یہ بھی انسان کی جبلت میں داخل ہے کہ وہ ہمیشہ اُن افعال کو اختیار کرتا ہے جن سے حظ حاصل ہوتا ہے، یا حصولِ حظ کی توقع رہتی ہے، اسلیے فطرت نے ہم میں احساس حظ والم ودیعت کرکے ہمیں ایک قابلِ اعتماد دلیل اور ایسا رہبر دیا ہے، جو قدم قدم پر ہمیں مضرت کی راہ سے خبردار اور منفعت کی راہ کی طرف مستعد کرتا رہتا ہے اور جسکی رہبری میں ہم بخوف خطر منازلِ حیات طے کرسکتے ہیں" (ص ۵۹-۶۱)

کبھی غصہ نہ آیا ہو، لیکن ایسے شخص کا تصور آنا ہی دشوار ہے جسے عمر بھر کبھی بھوک ہی نہ معلوم ہوئی ہو۔ اشتہاآت چونکہ عام جذبات سے اہم تر و قدیم تر ہوتی ہیں، اس لیے ان کی قوت بھی بدرجہا بالاتر ہوتی ہے۔ دنیا کی حلیم ترین شریعت، اپنے پیرووں کو یہ تو ہدایت کر گئی، کہ جو تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے، تو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دو۔" لیکن اس تعلیم کی اسے بھی جسارت نہ ہو سکی، کہ "جو تجھے ایک رات نہ سونے دے، تو اُس کے ساتھ ساری راتیں جاگتا رہ۔ یا "جو تجھے ایک وقت بھوکا رکھے، تو اُس کی خاطر مدت العمر بھوکا رہ۔" جذبات کُشی کچھ دیر کے لیے قابلِ عمل ہو سکتی ہے، لیکن اشتہاآت کُشی اتنی دیر تک کے لیے بھی نہیں چل سکتی[1]۔
انھیں اشتہاآت کی فہرست میں ایک شے ایسی بھی ہے، جو حیاتِ شخصی کے لیے نہیں

---

[1] اشتہاآت و جذبات کے باہمی تعلقات و فروق کو ہم نے "فلسفۂ جذبات" میں یوں بیان کیا ہے :-

" حوائجِ مادی کے مطالبات اگرچہ تمام تر صیانتِ حیات میں معین ہوتے ہیں، مگر یہ ضروری نہیں، کہ سب کے سب براہِ راست ہی معین ہوں، بلکہ بعض اس مقصد کو براہِ راست پورا کرتے ہیں اور بعض بالواسطہ۔ اسی بنا پر احساس نے اپنی رفتارِ ارتقاء میں دو مختلف راستے اختیار کیے۔ ایک راستہ اُن مطالبات کا ہے، جن کے اوپر حیاتِ انسانی براہِ راست مشروط و منحصر ہے، مثلاً گرسنگی، تشنگی، خواب وغیرہ۔ دوسرا راستہ اُن مطالبات و مقتضیاتِ فطری کا ہے، جو حیاتِ انسانی کے قیام میں بالواسطہ معین ہیں، مثلاً خوف، کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان اپنی حفاظت کا کچھ سامان نہ کر سکے۔ یا غصہ، کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان اپنے مخالفین سے مقاومت نہ کر سکے۔ صنفِ اول الذکر کے احساسات کو اشتہاآت کہتے ہیں، اور آخر الذکر کو جذبات۔ اشتہا اور جذبہ کے درمیان قطع نظر دیگر فروق کے ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اشتہا، برخلاف جذبہ کے ہمیشہ دوری ہوتی ہے، یعنی ہر اشتہا کا دَور ایک وقفۂ معینہ کے ساتھ زندگی بھر طاری ہوتا رہتا ہے ..... لیکن جذبات اس کے برخلاف موقت نہیں ہوتے۔ وہ وقت کی پابندیوں کے ساتھ مقید نہیں کیے جا سکتے۔ غم، مسرت، الفت، وحشت کے متعلق یہ کون کہہ سکتا ہے، کہ وہ ایک میعادِ معین کے بعد یکساں طور پر سب پر طاری ہوں گے" (صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹)

حیاتِ نوعی کے لیے بمنزلۂ بنیادِ کار رکھے ہے، اور وہ وہی ہے جسے عرفِ عام میں شہوت سے
یر کرتے ہیں۔ جذبۂ زوجیت کی ماہیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ، وہ خواہش ہے جو مرد
ورت کو ایک دوسرے کے ساتھ اتحادِ تناسلی کی ہوتی ہے۔

نظامِ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ فطرت کا منشا، وجودِ افراد سے نہیں، بلکہ
دِ نوع سے پورا ہوتا ہے۔ ہزارہا افراد روز فنا ہوتے رہتے ہیں، لیکن حیاتِ نوع بالکل غیر متاثر
ی ہے۔ جنگ، طوفان، سیلاب، آتش زدگی، زلزلہ، قحط، طاعون، ہیضہ، سے
سال لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں، لیکن نسلِ انسانی منقطع نہیں ہوتی۔ اکابر رجال چشم
ن میں نذرِ اجل ہو جاتے ہیں، لیکن نظامِ کائنات میں کوئی خلل نہیں واقع ہوتا۔ فلاطون
سطو، کینٹ و اسپنسر، پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں، لیکن فلسفہ کو موت نہیں آتی۔ سکندر و جولیس
ر، تیمور و نپولین گزر جاتے ہیں، لیکن دنیا سے عسکریت کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ شیکسپیر و گیٹی،
ظ و غالب کے ذراتِ استخواں تک بھی آج نہیں مل سکتے، لیکن شعر و سخن کی دنیا اُسی طرح
ہے۔ بڑے سے بڑے تاجدار، بڑے سے بڑے فاتح، بڑے سے بڑے حکیم، بڑے سے بڑے
ن، اسی طرح ہر شعبۂ حیات کے بڑے سے بڑے افراد ہر زمانہ میں وفات پاتے رہتے ہیں، لیکن
تِ ان کی طرف سے بالکل بے نیاز و بے پروا رہتی ہے، اور اگر کچھ اعتنا کرتی بھی ہے تو صرف
حیثیت سے، کہ ان کا تاریخی مرتبہ کیا ہے، یعنی انھوں نے اپنے بعد کتنی بڑی ایسی جماعت
ڑی ہے، جو اُن کے آثارِ قدم پر چلے گی، اور اُن کے کارناموں پر اضافہ کرے گی۔ گویا ان کی
ت کا معیار یہی ان کی نسلِ معنوی ہے۔ غرض جہاں تک فطرت کے نقطۂ خیال سے نظر کی جاتی ہے،
رادی زندگی کی بجائے خود مطلق اہمیت و وقعت نہیں معلوم ہوتی ہے، بلکہ جو کچھ اسکی قدر و قیمت
، وہ صرف اسی حیثیت سے ہے کہ وہ نوع کا تسلسل قائم کیے ہوئے ہے۔ افراد کی حیاتِ شعوری
، جذباتِ ذاتی کی قوت بے شبہ بہت زبردست ہوتی ہے، لیکن یہ صرف اس لیے کہ بغیر انکے
تِ نسلی کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اگر سب دانے بکھر جائیں تو تسبیح بھی باقی نہ رہے گی؛

اگر سب کڑیاں ٹوٹ جائیں، تو زنجیر کا بھی وجود نہ رہے گا؛ اگر اینٹیں ایک ایک کرکے الگ کرلی جائیں تو دیوار بھی قائم نہ رہ سکے گی۔ دانہ، کڑی، اور اینٹ کی حفاظت، ہمارے لیے مقصود بالذات نہیں ہوسکتی، لیکن چونکہ ان کی حفاظت بالواسطہ، تسبیح، زنجیر، و دیوار ہی کی حفاظت ہے، اس لیے ہم انھیں بھی عزیز و محفوظ رکھتے ہیں۔ بالکل یہی حال حیاتِ شخصی کا ہے۔ وہ بذات خود ناقابلِ اعتنا ہے، لیکن چونکہ حیاتِ نسلی اسی سے وابستہ ہے، اس لیے ہم اس کی اہمیت بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا، کہ جب حیاتِ شخصی و حیاتِ نسلی میں آکر تصادم واقع ہو، تو جذباتِ نسلی کا پہلو غالب رہنا چاہیے، اور یہ بعینہ وہ نتیجہ ہے، جسکی تصدیق مشاہدات و تجربات ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ مرغی کی بزدلی سب کو مسلّم ہے، لیکن جس وقت کوئی دشمن اسکے چھوٹے بچوں پر حملہ کرتا ہے، وہ بچوں کو چھپا کر خود اُس کے مقابلے پر تل جاتی ہے۔ گائے سے زیادہ حلیم اور کون جانور ہوگا، لیکن اس کے بچے کو اس کے سامنے چھیڑو، تو جان دینے پر آمادہ ہو جائے گی۔ شیرنی کے بچے کو اُس کے سامنے سے ہٹانا چاہو، تو شیر سے بھی زیادہ غضبناک ہو جاتی ہے۔ یہی حال تقریباً تمام چرندوں، پرندوں، اور درندوں کا ہے۔ لیکن حیوانات سے گزر کر خود انسانی زندگی براہ راست کس قسم کی شہادت دیتی ہے؟ اس کے جواب میں بابر کا یہ واقعہ پیش نظر ہو جاتا ہے، کہ جب اُس کے فرزند ہمایوں کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں باقی رہتی، اور معالجین اُسے لبِ مرگ قرار دے دیتے ہیں، تو وہ خود اپنی جان اُس کے معاوضہ میں دیدینا چاہتا ہے، اور بالآخر اس خواہش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ کہہ سکتے ہو، کہ اول تو یہ روایت ہی مشتبہ ہے، اور اگر سچ ہو بھی، تو یہ ایک استثنائی واقعہ ہوگا، جس کی بنا پر کلیہ قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ صحیح ہے۔ ہم بھی ان مستثنیات سے قطع نظر کیے لیتے ہیں۔ لیکن غور کرو کہ روزانہ زندگی کے عام واقعات کیا شواہد پیش کرتے ہیں؟ کون ماں ایسی ہے، جو اولاد کی خاطر وضع حمل و رضاعت کے شدائد کو خندہ جبینی سے قبول نہیں کرلیتی؟ کون باپ ایسا ہے، جو اولاد کی وجہ کفالت

کے لیے، سخت سے سخت مشقت، بلکہ بعض اوقات اپنی صحت تک کو معرضِ خطر میں ڈالنا، گوارا نہیں کرتا؟ کون والدین ایسے ہوتے ہیں، جو اولاد کی تعلیم، تربیت و پرداخت پر اپنی دولت، وقت، آرام، و منفعت کو قربان نہیں کر دیتے؟ غرض جذباتِ نسلی کے مقابلہ میں جذباتِ شخصی کی مغلوبیت کے شواہد ہیں اپنے گرد وپیش، قدم قدم پر ملتے ہیں۔ بے شبہ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں، جو بظاہر اس کلیہ کے مخالف معلوم ہوتی ہیں، مثلاً قحط کے زمانہ میں والدین کا خود اپنے بچوں کو فروخت کر ڈالنا، یا بعض صورتوں میں اُنھیں کھا جانا۔ لیکن درحقیقت یہ مثالیں اس کلیہ کے مُعارض نہیں۔ حیاتِ شخصی تو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، خود ایک کڑی ہے تحفظ حیاتِ نسلی کے سلسلہ کی۔ اس لیے اس پر انسان کا اس قدر حریص ہونا گویا خود حیاتِ نسلی پر حریص ہونا ہے۔ جو شخص اپنے شہر یا قصبہ کی خدمت میں منہمک ہو، کون کہہ سکتا ہے، کہ وہ بالواسطہ اپنے مُلک کی خدمت نہیں کر رہا ہے؟

اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا، کہ اتحادِ تناسلی کی خواہش کا انسان میں پیدا ہونا، اس کے ارادہ و اختیار کی چیز نہیں، بلکہ فطرت کے قانون کے لحاظ سے لازمی ہے، اور اسی قدر لازمی ہے، جیسے بھوک لگنا، پیاس معلوم ہونا، یا نیند آنا۔ اور اگر کوئی مثال اس کے خلاف ملتی ہے، تو اُسے اختلال اشتہاآت کا مریض سمجھنا چاہیے، بالکل اسی طرح کہ جیسے کوئی شخص سقوطِ اشتہا یا بیخوابی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جس شخص کو نیند نہیں آتی، یا بھوک نہیں لگتی، وہ شخصی حیثیت سے مریض ہے، اور جس میں اتحادِ تناسلی کی خواہش مردہ ہو، وہ نسلی حیثیت سے مریض ہے۔

اس موقع پر سوال ہو سکتا ہے، کہ مسائل بالا کی بنا پر اگر کوئی جذبہ نہایت شدید و قوی ٹھہر سکتا ہے، تو وہ جذبۂ محبتِ اولاد ہو سکتا ہے۔ جذبۂ زوجیت تو اس سے ایک علحدہ شے ہے۔ ان مقدمات سے اس کی قوت کا نتیجہ کیونکر نکل سکتا ہے؟

یہ سوال بے شبہ معقول و قابلِ غور ہے۔ لیکن سائل کو یہ حقیقت ذہن نشین کر لینا چاہیے،

کہ فطرت کا طریق کار کیا ہے۔ فطرت، دراصل، نہایت ہی ہوشیار آقا ہے۔ وہ جب ہم سے کوئی کام لینا چاہتی ہے، تو براہِ راست اُس کا حکم نہیں دیتی، بلکہ اُسے ہمارے لیے اس قدر دلکش مرغوب و پُر لطف بنا دیتی ہے، کہ ہم بے اختیار اُس کے کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تغذیہ سے اصل مقصد یہ کہ بدل ما یتحلل ہوتا جائے، یعنی جو اجزائے جسم روزانہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں، اُن کی جگہ نئے اجزاء لیتے رہیں۔ لیکن فطرت ہم سے یہ مقصد براہِ راست حکم دے کر پورا نہیں کراتی، بلکہ غذا میں اس قدر التذاذ رکھ دیا ہے، کہ ہم اُسے بہ کمال رغبت و اشتیاق کھانے پر مجبور رہیں۔ خواب، زندگی قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے، لیکن کوئی شخص اس مقصود کو پیش نظر رکھ کر نہیں سوتا، بلکہ ہر شخص کو فطرۃً نیند میں ایسی لذت محسوس ہوتی ہے، کہ ہر روز سونے پر مجبور رہو جاتا ہے۔ اپنے اسی عام طریق کار سے فطرت نے اس بارے میں بھی کام لیا۔ کوئی شخص یہ تصور کرکے کبھی اتحاد تناسلی پر مائل نہیں ہوتا، کہ اس سے کائنات کا نظام نسلی قائم رہے گا، بلکہ یہ عمل بجائے خود اپنے اندر اس قدر دلکشی رکھتا ہے، کہ انسان اسے محض اپنے لطف و لذت کی خاطر کرتا ہے۔ اصل یہ ہے، کہ ہر فعل، ہر عمل کا ایک فوری و نمایاں مقصد ہوتا ہے، اور ایک انتہائی و آخری غرض و غایت ہوتی ہے۔ انھیں کو محرک بھی کہتے ہیں۔ تو گویا محرک دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک محرکِ قریبہ، دوسرے محرکِ بعیدہ۔ پہلا محرک عموماً فاعل کے شعور و علم میں ہوتا ہے، اور وہ اُسے پیش نظر رکھ کر کوئی فعل کرتا ہے لیکن دوسرا، فاعل کی نظروں سے مستور و مجہول اور اُس کے لیے غیر شعوری رہتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دونوں محرکات میں باہم اختلاف بلکہ تضاد واقع ہو جاتا ہے، یعنی کسی فعل کا جو انتہائی مقصد ہوتا ہے، اُس میں اور اُس کے حصول کے وسائط و ذرائع میں (جو بجائے خود مقاصد قریبہ ہوتے ہیں) تخالف ہو جاتا ہے۔ اب اگر مقصودِ آخری کا حصول منظور ہے، تو انسان کو کچھ اور طریق عمل اختیار کرنا چاہیے، اور اگر مقاصد قریبہ کو پورا کرنا مدِ نظر ہے، تو اس سے بالکل مختلف طرزِ عمل رکھنا چاہیے۔ ایسی حالت میں فتح ہمیشہ مقاصد قریبہ کو حاصل ہوتی ہے، کیونکہ صرف وہی انسان کے پیش نظر ہوتے ہیں، اور مقصود انتہائی تو اس کے علم و شعور سے بھی خارج ہوتا ہے۔

جنگ کی اصلی و آخری غایت یہ ہے، کہ بدنظمی دُور ہو، اور امن و قانون، اور آئین کا دَور دورہ ہو؛ لیکن عین حالتِ جنگ میں یہ حقیقت کسی کے ذہن میں محفوظ رہتی ہے؟ معمولی سپاہیوں کا ذکر نہیں، تعلیم یافتہ و آئین پرست جنرل، اور بڑے بڑے سردارانِ فوج تک قانون شکنی پر تُلے ہوتے ہیں، اور بجز شقاوت، خوں ریزی، و بہیمیت کے اُنھیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ کیا یہ تناقضِ مقاصد کی روشن مثال نہیں؟ یہی اصول، مسئلۂ زیرِ بحث پر بھی عامل ہے۔ اتحادِ تناسلی کی آخری غرض کائنات کے نظامِ نسلی کو محفوظ و برقرار رکھنا ہے، لیکن افراد کی حیاتِ شاعرہ میں یہ غرض مستور و مجہول رہتی ہے، اور انسان اسی عملِ اتحادِ تناسلی کو بجائے خود ایک مقصود قرار دینے لگتا ہے، اور اس کی دلکشی و لذت بخشی کی بنا پر، اسی کو پوری قوت کے ساتھ عزیز و محبوب رکھنے لگتا ہے۔

اس حقیقت کی توضیح، اگر نفسیاتی اصول پر ذہن نشیں کرنا منظور رہے، تو ہمیں قانونِ ائتلاف سے مدد لینا چاہیے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے، کہ بعض ذہنی کیفیات، دوسری ذہنی کیفیات سے ایسا تخصیصی تعلق رکھتی ہیں، کہ جب اول الذکر پیدا ہوتی ہیں، تو آخر الذکر بھی لازمی طور پر از خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس قانون کی فعلیت کی متعدد صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک علاقۂ مقارنت ہے، یعنی جب دو، یا زائد چیزیں زمانی یا مکانی حیثیت سے قرب یا اتصال رکھتی ہیں، تو جو جذبات ہم پر اُن میں سے کسی ایک شے سے طاری ہوتے ہیں، وہی جذبات اُس کے مقارن شے یا اشیاء سے بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اگر ہم کو زید کے ساتھ عداوتِ قلبی ہے، تو لازمی ہے، کہ اُسکے اعزہ، اُس کے احباب، اُس کے خاندان، غرض ہر اُس شے سے، جسے زید کے ساتھ تعلق یا وابستگی ہے، کسی نہ کسی حد تک عداوت ہو جائے گی۔ مجنوں کو اگر لیلیٰ سے عشق تھا، تو ناگزیر تھا کہ اُس کے کتّے سے بھی الفت ہو جائے۔ دوسری صورت، علاقۂ مماثلت ہے۔ یعنی جب دو یا زائد چیزیں باہم گر بعض حیثیات سے مشابہ ہوتی ہیں، تو جو جذبات ہم میں مثل لہٗ سے پیدا ہوتے ہیں، وہی جذبات اُس کے مماثل اشیاء سے بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اگر گلاب کا پھول ہمیں خوش نما معلوم ہوتا ہے، تو ضرور ہے، کہ گلابی رخسار بھی ہمارے لیے دلفریبی رکھیں۔ تیسری صورت،

علاقۂ تضاد ہے۔ یعنی جب دو چیزوں میں باہم تقابل یا تضاد ہوتا ہے، تو جن جذبات کی تکو
ایک شے سے ہوتی ہے، اُن کے بالکل مخالف جذبات ہم میں شے یا اشیاء سے مقابل پیدا ہوں
اگر ہمیں زید سے دشمنی ہے، تو اُس کا دشمن ہمارا دوست ہوگا۔ غرض ائتلافات کی ان سب صورتو
یہ ہوتا ہے، کہ بعض مخصوص اشیاء، بعض دیگر مخصوص اشیاء کو ذہن کے سامنے لے آتی ہیں، اور جو
و خیالات ہمیں اول الذکر سے پیدا ہوتے تھے، اب وہ سب آخر الذکر سے پیدا ہونے لگتے ہیں
نام سنتے ہی حسن و جمال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ فرعون کا نام آیا، کہ موسیٰ
یاد پڑ گئے۔ سرسید کا ذکر ہوا، کہ علیگڈھ کالج کی یاد تازہ ہوگئی۔ کُرسی کا ذکر آتے ہی فوراً د
احمقوں کا بھی خیال آجاتا ہے۔ رستم کا خیال ذہن میں آیا، کہ معاً قوت و شجاعت کا تصور
پیدا ہوگیا۔

یہ نفس بشری کا ایک مستحکم قانون ہے۔ اس میں انسان کے خواہش و ارادہ کو بالکل دخ
لزومِ ذہنی کا یہ سلسلہ، بغیر اُس کے قصد و اختیار کے خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن بعض او
اسی سلسلہ میں ایک نئی بات یہ پیدا ہوجاتی ہے، کہ جس جذبہ کی تکوین براہ راست کسی شے سے
ہے، وہ اُس سے تو نہیں پیدا ہوتا، بلکہ جس شے سے بالواسطہ ہوئی تھی، اب اُسی سے
ہونے لگتا ہے۔ انبعاث جذبہ کے براہِ راست محرکات جو ہوتے ہیں، وہ شعورِ خفی میں ماند پڑ
ہیں، اور جو چیزیں، کہ محض بالواسطہ وضمناً محرک ہوسکتی تھیں، وہ شعور میں آجاتی ہیں۔
سبب یہ ہوتا ہے، کہ جن ذراتِ دماغ میں، اعمال اول الذکر کے وقت حرکت ہونا چاہیے
ان میں بر بنائے عادت و تواتر، التزاماً اعمال آخر الذکر سے حرکت ہونے لگتی ہے۔ ہم ایک
مربہ کھا رہے تھے، کہ اُس میں مکھی نکل آئی۔ اس کے بعد سے ہمیں مربے ہی سے نفرت ہو
ہے، اب ہم جب مربے کو دیکھتے ہیں، بغیر پچھلا واقعہ یاد کیے ہماری طبیعت خود بخود مالش کر
لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ طبیعت کی مالش کا اصل باعث مکھی کا پڑنا تھا، لیکن علاقۂ مقارنت
ہمارے ذہن میں خود مربے کی طرف سے نفرت سما جاتی ہے۔ روپے سے محبت ہمیں ا

صرف اس لیے ہوتی ہے، کہ یہ ہر قسم کی آسایش کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اُسکی یہ حیثیت نظر انداز ہوجاتی ہے، اور محبت و روپیہ میں ایسا لزومِ ذہنی قائم ہوجاتا ہے، کہ ہم روپیے کو محض روپے کی خاطر عزیز و محبوب رکھنے لگتے ہیں، اور اُسے اپنی کسی آسایش پر صرف کرنا گناہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ صرف و نحو کی اصلی غرض یہ تھی، کہ زبان و ادب سیکھنے میں سہولت ہو لیکن یہ قانونِ ایتلاف، اکثر معلّموں اور متعلموں کے دماغ پر اس طرح عمل کرتا ہے، کہ وہ اسی کو مقصود بالذات سمجھنے لگتے ہیں، اور اصل زبان و ادب پر کبھی توجہ نہیں کرتے۔

پس یہی زبردست قانونِ ایتلاف، جو بعض علماے فلکیات کو دُوربین و دیگر آلات رصدگاہ کی تیاری میں اس قدر محو و منہمک کردیتا ہے، کہ اُنھیں آسمان کی طرف نظر اُٹھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی، اور جو انسانی مقاصد کو وسائط، اور وسائط کو مقاصد میں تبدیل کر دیتا ہے، اس بارۂ خاص میں بھی نفسِ بشری پر عامل ہے۔ جذبۂ زوجیت کا اصل مقصود بقاے نسل ہے۔ لیکن لزومِ ذہنی کی بنا پر ہم میں اُسی قدر زبردست تحریک نفسِ اتحادِ تناسلی کے لیے بھی پیدا ہوجاتی ہے، اور ہوجانا چاہیے۔ لیکن اس جذبہ کی تقویت کا ایک سبب اور بھی ہے۔ اوپر ہمنے جتنی مثالیں ایتلاف کی بیان کیں، اُن اشیا یا واقعات میں محض ایک ذہنی لزوم تھا، عملی لزوم کسی میں نہ تھا۔ لیلیٰ اور سگِ لیلیٰ صریحًا دو بالکل علٰحدہ چیزیں تھیں۔ کرسی اور وہاں کے احمق بداہتہً مختلف ہستیاں ہیں۔ سرسید احمد اور علیگڈھ کالج ظاہر ہے کہ ایک چیز نہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا، کہ کہ باوجود اس مادّی علٰحدگی، اس عملی افتراق کے، محض ارتباطِ ذہنی کی بنا پر، دو بالکل متبائن الاصل چیزیں، شے واحد کے حکم میں داخل ہوجاتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ جب دو افعال میں عملًا بھی علٰحدگی ممکن نہ ہوگی، تو ان میں لزوم و التزام کی باہمی قوت کس قدر شدید و قوی ہوگی، اور ظاہر ہے کہ عملًا وظیفۂ بقاے نسل اور اتحادِ تناسلی دو چیزیں نہیں کہی جاسکتیں۔

ان اسباب کی بنا پر ہم جذبۂ اتحادِ تناسلی میں جس قدر قوت پاتے ہیں، وہ ذرا بھی غیر متوقع نہیں۔ اس کے کُھلے ہوے طبعی اسباب موجود ہیں، جن کے لحاظ سے ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ البتہ

جن افراد میں یہ خواہش اس حد تک نہ پائی جاتی ہو، اُن کا شمار مستثنیات میں ہونا چاہیے، اور اُنکی اس معمول عام سے ہٹی ہوئی کیفیت کی تشریح کے لیے مخصوص حالات و اسباب تلاش کرنا چاہیے۔

یہاں تک اس جذبہ کی جو کچھ اہمیت دکھلائی گئی، وہ ایک عام حیثیت سے تھی۔ خواہشِ اتحادِ تناسلی، ہر مرد کو عورت کے ساتھ، اور ہر نر کو ہر مادہ کے ساتھ ہو سکتی ہے، لیکن زن و شو کے درمیان کشش اس سے بدرجہا زائد ہوتی ہے۔ کششِ ازدواجی، محض خواہشِ اتحادِ تناسلی کا نام نہیں، گو اس کا ایک جزوِ اہم یہی ہوتی ہے، تاہم اس کے علاوہ اور بھی متعدد مؤثرات قوی انتخابِ زوج میں نفسِ بشری پر عامل ہوتے ہیں، مثلاً اتحادِ ذوق، موافقتِ مزاج، خوش سیرتی، خوش دماغی، اور سب سے بڑھ کر ایک عرصہ کا ارتباط و رفاقت۔ جانور، بلکہ بے جان چیزیں جو ہمارے پاس عرصہ تک رہتی ہیں، ہمیں اُن سے لازمی طور پر لطف و اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ رفاقت، بجائے خود ایک بڑا سبب کشش و الفت کا بن جاتی ہے۔ تو انسان اپنے صنفِ مقابل کی جس ہستی کے ساتھ ایک عرصہ تک لطف ہمنشینی حاصل کرے گا، ساتھ خورد و نوش رکھے گا، ساتھ نشست و برخاست رکھے گا، غرض جسے معاشرت کے ہر پہلو میں ساتھ رکھے گا، اُس کے ساتھ اُسے جس قدر کشش ہو، بجا ہے۔ اور پھر خواہشِ اتحادِ تناسلی، جو شادی سے قبل صنفِ مقابل کے تمام افراد پر، مساوی طور پر منتشر اور پھیلی ہوتی ہے، اب سمٹ کر صرف ایک مرکز پر مجتمع ہو جاتی ہے۔ روشنی کی شعاعیں جب تک کسی بڑے دائرہ پر پھیلی ہوئی رہتی ہیں، معمولی حد پر رہتی ہیں، لیکن جب کسی ایک نقطہ پر آکر جمع ہو جاتی ہیں، تو وہاں کی روشنی کی قوت صدہا مدارج بڑھ جاتی ہے۔ یہی صورت حال ایک آئیڈیل شوہر، اور ایک آئیڈیل بیوی، یعنی اُن زوجین کے درمیان پائی جانا چاہیے، جو نظام ازدواج کے علمی نصب العین ہیں۔

خلاصہ یہ کہ

(۱) انسان کے لیے دنیا میں سب سے زبردست طاقت جذبات کی ہے۔ اور ان میں بھی علی الخصوص اشتہاآت کی۔ ان کے احکام سے انسان سرتابی کر ہی نہیں سکتا۔

(۲) نظام فطرت میں حیاتِ نسلی، حیاتِ شخصی پر مقدم و اہم تر ہے۔

(۳) جو جذبات و اشتہاآت متعلق بہ حیاتِ نسلی ہیں، وہ جذبات و اشتہاآت متعلق بہ حیاتِ شخصی پر مقدم و اہم تر ہیں۔

(۴) حیاتِ نسلی کا دارومدار براہِ راست جذبۂ زوجیت پر ہے۔

(۵) اسی لیے جذبۂ زوجیت، تمام دیگر جذبات کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ طاقتور ہے۔

(۶) زن و شو کی باہمی کششِ ازدواجی میں علاوہ اس جذبۂ زوجیت کے، اور بھی خارجی مؤیدات شامل ہو جاتے ہیں۔

نفسیاتِ زوجیت کے ان حقائق کے مسلّم ہو جانے کے بعد اب عملی مسئلہ پیش ہوتا ہے، یعنی یہ کہ نظامِ ازدواج متعارف کس حد تک درست، اور کس حد تک قابلِ اصلاح ہے؟

عبد الماجد

کیا بُری تقدیر تھی اُس کشتۂ دیدار کی — مرتے دم جس کو نظر آئی نہ صورت یار کی
غش ہوئے موسیٰ تجلی دیکھ کر دیدار کی — ہم کو ہر شے میں نظر آتی ہے صورت یار کی
دُور سے انجامِ الفت کا تماشا دیکھ لو — لاش اُٹھتی ہے تمہارے کشتۂ دیدار کی
نرگسِ بیمار کا بوسہ تو دیتے ہی نہیں — اور کیا حسرت کہیں تم سے دلِ بیمار کی
ہے یہی پردہ تو لے پردہ نشینِ بزمِ دل — مار ڈالے گی ہمیں حسرت ترے دیدار کی
سایۂ طوبیٰ میں جب بیٹھے پسینا آ گیا — دل میں حسرت تھی جو اُنکے سایۂ دیوار کی
جل رہا ہے طور، موسیٰ غش ہیں، محوِ نازِ یار — کون لوٹے اب بہاریں گلشنِ دیدار کی
آرزوئے دید لائی تھی عدم سے کھینچ کر — پھر عدم کو لے چلی حسرت ترے دیدار کی

گلعذاروں کی محبت میں جگر ہم مست ہیں
ہم نے برسوں سیر کی ہے حسن کے گلزار کی

حکیم جگر۔ صدیقی

زائرِ تربۂ مشہد و من جانبِ خیام

یہ مضمون ایک مشہور امریکن سیاح ولیم جکسن (W. Jackson) کی کتاب "از قسطنطنیہ تا بوطن عمر خیام" From Constantinople to the home of Omar Khayyam سے نقل کیا گیا ہے۔ جزو اول کتاب مذکور کے سترھویں باب ("نیشاپور وطن عمر خیام") کے ابتدائی حصّے میں ملے گا اور جزو دوم اٹھارویں باب ("مقبرۂ عمر خیام") کا پورا ترجمہ ہے۔ مترجم نے (چند اشعار کو چھوڑ کر) بہت کم تصرف کیا ہے اور مصنف کے اندازِ بیاں اور جذبات کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ولیم جکسن امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں ہندو ایران کی قدیم زبانوں اور انگریزی لٹریچر کا پروفیسر ہے۔ اُس نے ایران اور ماوراء النہر میں تاریخی اور ادبی تحقیقات کے لیے متعدد سیاحتیں کی ہیں اور دو دلچسپ سفرنامے، جن میں ایک مذکورۂ بالا کتاب ہے اور دوسرے کا نام "ایران ماضی و حال" (Persia, Past & Present) ہے لکھے ہیں اس کے علاوہ ایک کتاب زردشت کے حالات میں بڑی تحقیقات سے لکھی ہے جو بہت مقبول ہوئی ہے۔ پروفیسر مذکور کی تحریر اعلیٰ انشا پردازی کا نمونہ ہوتی ہے۔ جو مضمون ہمارے پیش نظر ہے اُس کی عبارت میں جابجا فٹز جرالڈ کی مشہور انگریزی رباعیات (جو عمر خیام کے تتبع میں میں لکھی گئی ہیں) الفاظ بے ساختہ اُس کے قلم سے نکل گئے ہیں اور اُن لوگوں کی جو نثر کی رباعیات سے واقف ہوں بہت لطف دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُس لطف کو ترجمہ میں برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے اور جو لوگ اصل کتاب پڑھ سکتے ہیں اُنھیں چاہیے کہ اصل ابواب پڑھ کر محظوظ ہوں۔ لیکن جو ترجمے پر قناعت کرنے پر مجبور ہیں اُن کے لیے مترجم نے اپنی بساط کے موافق مصنف کے اندازِ بیاں اور جذبات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔

"سلطان اور غلام نے کیساں طور پر بہن گوں کے ساتھ سفر اختیار کیا ہے، لیکن وہ جس پر آج نیشاپور میں سے سات صدی پہلے عقلا مفتوں تھے آج بھی سحر کاری کر رہا ہے"

(طامس پیلیے ایڈرک۔ بدح عمرِ خیّام)

(۱)

سورج نے ابھی تک رات کے میدان سے تاروں کو منتشر نہیں کیا تھا کہ ہم چار گھوڑوں کی گاڑی میں عمر خیام کے گھر کی زیارت کرنے کی دُھن میں اپنے سفر کی اخیر منزل طے کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ ماہ مئی کا اخیر دن تھا، لیکن آغازِ صبح کی ہوا میں سخت خنکی تھی۔ صبح کاذب کے بعد مطلع پر تاریک کُہر چھایا ہُوا تھا، جس کی وجہ سے پیچدار سڑک جو قدیم نیشاپور تک پہونچنے سے پہلے پہاڑی کے اوپر درے میں سے ہو کر گذرتی تھی، ابھی تک صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی۔ جب ہم سب سے اونچی پہاڑی کی چوٹی پر پہونچ گئے تو پَو پھٹنے لگی اور نیشاپور کا وسیع میدان ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہُوا دکھائی دیا۔ "چرخ چوں طاس نگوں افتادہ" بلّور کی طرح شفاف، جھلکنے دمکنے لگا، البتہ سفید بادلوں کا ایک ہلکا سا نقاب نیلگوں پہاڑیوں کی، جو پائین شہر کی جانب پسِ میدان سر کھینچے کھڑی تھیں، پست و بلند چوٹیوں کو اس طرح چھپائے ہوے تھا کہ انکے نشیب و فراز کا تفاوت ایک حد تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بلبلِ فارس کے گلستاں میں شیریں ترانے سُن کر دل میں سوز و گداز پیدا ہو رہا تھا، اور چڑیوں کے چہچہے نسیم صبح کو اس طرح جگا رہے تھے جیسا کہ شاید اس سے پہلے "منطق الطیر" میں (جسے عمر کے ہم نوا فرید الدین عطار نے تصنیف کیا ہے اور جس کے مضامین سبھی سے ہم فٹز جیرالڈ کے خلاصہ کی بدولت واقف ہیں) ان چہچوں نے نسیم صبح کو جگایا تھا۔ موسلا دھار مینھ کی وجہ سے، جو اس سال خلافِ معمول مقررہ موسم سے بہت پیچھے ہوا تھا، ریتیلے اور ویران صحرا میں جا بجا نرم سبزہ اُگ آیا تھا۔ دیر تک دُور ایک سراب نظر آتا رہا، لیکن جب ہم پاس پہونچے تو معلوم ہوا کہ اصل میں یہ سارا رقبہ دَلدَل تھا، جس پر نمک کی تہ اس طرح جم گئی تھی گویا صحرا کے گرد آلود چہرے پر برف کا نقاب پڑا ہوا ہے۔

ایک پُرانی کارواں سرائے کے پاس، جو عمرِ خیام کے زمانے کی "کہنہ رباط" سے مشابہ تھی، گھوڑوں کی چوکی بنی ہوئی تھی، وہاں کچھ دیر ستا کر تیزی کے ساتھ ہم اپنے سفر پر روانہ ہوگئے تاکہ دوپہر سے پہلے شہر پہونچ جائیں۔

زائرین کے گروہ کے گروہ سبز علَم ہاتھ میں لیے سڑک پر جا رہے تھے۔ خواہ ان کا اعتقاد وہ ملت کے کسی فرقے سے تعلق کیوں نہ ہو، لیکن یہ امر یقینی تھا کہ ان میں سے کوئی آزاد خیال عمر کی قبر کی زیارت کو گھر سے نہ چلا تھا، بلکہ سب کے سب مشہدِ مقدس کو امام کے روضے کی زیارت کو چلے جا رہے تھے یا وہاں سے اپنے اعتقاد کے موافق ثوابِ جزیل کما کر واپس ہو رہے تھے۔

اگر اُن سے نیشاپور یا اُس کی تاریخ کا حال پوچھا جاتا، تو بعض اس شہر کے متعلق مبہم سی کہانیاں کہہ سُناتے، ان میں سے چند کو شاید یہ بھی یاد آ جاتا کہ تیرہویں صدی کے شروع میں تاتار اور مغلوں نے اس پر تاخت و تاراج کی تھی اور اُسی زمانے میں کئی دفعہ زلزلے بھی آئے تھے، جن کی وجہ سے شہر برباد ہوگیا۔ اور آبادی دوسری جگہ جا بسی۔ ہاں یقیناً اُن سب کو یہ معلوم ہوگا کہ اُس مقبرہ کا نیلگوں گنبد جو سر بلند کیے ہوئے ہمارے سامنے دکھائی دے رہا تھا، امام زادہ محمد محروق کے، جو امام رضا رضؓ مشہدی کے قرابتمند تھے، مدفن پر تعمیر ہوا تھا۔ ان میں سے دو چار نے شاید عمر خیام کا نام بھی سُنا ہو لیکن نہ بحیثیت حکیم عمر خیام اور ایک فلسفی اور ہیئت داں کے، جس کی تحقیقات نے سالِ شمسی کی بہترین مقدار معیّن کی تھی۔ شاید وہ یہ بتا دیتے کہ وہ ایک "عالمِ بے بدل اور شیخِ فاضل" تھا، لیکن اُن میں سے یہ ایک کو بھی معلوم نہ ہوگا کہ وہ شاعر بھی تھا۔عـــہ

اصل یہ ہے کہ عمر میں وہ اوصاف نہیں پائے جاتے جو ایران کے مسلمانوں کی عقیدتمندی کو اپنی طرف مائل کر سکیں۔ وہ سُنی تھا اور اہلِ ایران شیعہ ہیں۔ اُس کا نام خلیفۂ عمر رضؓ (جن سے شیعہ سُنیوں کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے نفرت کرتے ہیں) اور عربوں کی فتوحات کو یاد دلاتا ہے اور اُسکے اشعار،

عـــہ مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ طہران میں مجھ سے ایک وزیر نے جو انگریزی بھی جانتا تھا کہا تھا کہ "تمہارے فٹزجرالڈ کا مشہور انگریزی ترجمہ اصل رباعیات سے بہتر ہے"!

جو مینوشی کے خیالات سے پُر ہیں، صوفیوں کے سوا جو اُنھیں پُر رمز وکنایہ سمجھ کر خاطر خواہ معنی پہنا لیتے ہیں، عام طور پر صریح معنوں میں لیے جاتے ہیں اور خداے تعالیٰ کی شان میں جو عمر خیام نے خیالات ظاہر کیے ہیں کفریات سے کم نہیں سمجھے جاتے۔

بنا بریں یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ ہمارے گاڑی بان کو قطعاً معلوم نہ تھا کہ عمر خیام کے نام سے کیا مراد ہے۔ لیکن اُس نے اپنی ناواقفیت کی کمی اس طرح پوری کرلی کہ سب سے پہلا مسافر جو ملا اُس سے اُس سڑک کو دریافت کیا "جو اُس حکیم کے یہاں تک جاتی ہے جسکے پاس فرنگی جایا کرتے ہیں" بعد ازاں اُس نے اپنے گھوڑوں کے ایک ہنٹر رسید کیا اور گاڑی تیزی سے گذرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ہمیں یہ معلوم ہو کر افسردگی ہوئی کہ یہ راستہ ایک یہودی حکیم کے گھر کو جاتا تھا، جہاں ایک دفعہ کچھ یورپین سیاح نیشاپور آنے کے وقت طبی مشورہ حاصل کرنے کے لیے گئے تھے (بیچارہ گاڑیبان حکیم یعنے طبیب سمجھا) ایسی حالت میں سوا اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ گاڑی موڑ کر چاپارخانہ (چوکی) کی طرف ہنکوادی۔

گھوڑے سرپٹ ایک چوڑی سڑک پر ہو کر گزرے، جس کے دونوں طرف سُنہری اناج (پکے ہوے اناج) کے کھیت پھیلے ہوے تھے۔ میرے دماغ میں مسٹر فٹز جرالڈ کے ترجمۂ رباعیات کی ایک ایک تشبیہ چکر کاٹنے لگی۔ اگرچہ اس کا حال کہ مسٹر فٹز نے جو عطار اور جامی کے کلام میں بھی غرق تھا، یہ تشبیہات براہ راست عمر خیام یا بعد کے شعرا سے چُنیں، اُنھیں لوگوں کو ٹھیک معلوم ہو سکتا ہے جنھوں نے ایک ایک انگریزی رباعی کا اصل فارسی رباعیات سے مقابلہ کیا ہو۔ "سبزۂ نوزائیدہ جسکی نرم گھاس دریا کنارے اُگی ہے" ایک ایسی تشبیہ ہے، جو ہو بہو ایرانی منظر کا فوٹو ہے اور عمر خیام کے اصل کلام سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ یہ کیفیت اس وقت خود ہمارے پیش نظر تھی، اس لیے کہ جب پانی کے چند قطرے بھی یہاں کی خاک کو میسر آجاتے ہیں تو نیچر ایران میں دنیا کے ہر خطہ سے بڑھ کر شکر گزاری کے ساتھ تبسم کرتی ہے۔ شمالی ایران میں ہمارا پانسو میل کا سفر مدت تک صحراے لوط کے کنارے کنارے طے ہوا تھا۔ اُس وقت بار بار

فٹز جرالڈ کے وہ اشعار یاد آئے جن میں "خطۂ سبزۂ آسودہ جو صحرا کو لبِ کشت سے جدا کرتا ہے" کا بیان ہے۔ اگرچہ فارسی رباعیات میں یہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ اس جملے کو خیام نے کن الفاظ میں ادا کیا ہے۔ ہم نے بارہا "طربِ زندگانی صحرائے نیستی میں چکھا" اور اس کیفیت کا واقعی نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا، اگرچہ ترجمہ کے یہ دونوں استعارے اور نیز "کاروانِ موہوم" ایسا معلوم ہوتا ہے فارسی شعر کے غیر صحیح ادراک کا نتیجہ ہیں، اس لیے کہ اصل شعر یوں ہے:۔

این قافلۂ عمر عجب می گذرد — دریاب دمے کہ بطرب می گذرد

بہر نہج 'کارواں' ایک ہر دم نظر سے گذرنے والی حقیقت تھی۔ بارہا اُس آہستہ خرام قافلے کی قریب آنے کی خبر سنسان رات میں آگے چلنے والے اونٹ کی گردن میں بندھے ہوئے جرس کی بلند صدا سے معلوم ہو جاتی تھی۔ لیکن "دہلِ دُور" جو میں نے دیکھا، لیکن جس کی آواز نہ سن سکا، وہ طنبورہ تھا، جو نیشاپور کے قریب پہونچ کر ڈاک گاڑی کے سامنے، جو خستہ حال اور پُرانے پھٹے کپڑوں میں لپٹے ہوئے ایرانی سپاہیوں سے بھری ہوئی تھی نظر آیا۔ ڈھول کا سر ٹوٹا ہوا تھا اور میرا گمان ہے اُس کے کھلے ہوئے ہونٹوں سے نغمہائے طرب یا نالہائے غم نہیں سُنے جا سکتے تھے۔

چند منٹ بعد ہم نیشاپور کی پست فصیل کے نیچے سے گذر کر بازار کی سمت میں جا رہے تھے یعنی عمر خیام کی بازار میں، جہاں بیکار لوگوں کا مجمع آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے اور سوالات کرنے کے لیے گھرا ہوا تھا۔ اس لیے کہ نیشاپور میں فرنگی کمتر جاتے ہیں۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ شہر کے محلِ وُقوع میں تبدیلی ہو گئی ہے اور وہ خوبصورتی جس کی آج سے ہزار برس پہلے اس قدر تعریف کی گئی ہے، ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی ہے، لیکن اُس کے خط و خال اور باشندوں کے اطوار بلاشبہہ وہی ہیں جو اُس شاعر کے زمانے میں تھے۔

شہر کی صورت چوکور ہے اور اُس کی دیواریں جن میں ۸۰ برج ہیں دو میل سے زیادہ رقبہ گھیرے ہوئے ہیں۔ ان دیواروں میں ہر ایک سمت میں چار دروازے بنے ہوئے ہیں۔ شہر کے چار حصے ہیں، اور ہر حصے میں معمولی کارواں سرائے اور حمام موجود ہیں۔ شہر کے بازار

مختصر ہیں، لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں ساڑھے چار سو دوکانیں ہیں، جن کا کاروبار بخوبی چلتا ہے۔ سب سے مشہور عمارت جامع مسجد ہے جس کی تاریخ بنا معلوم نہیں، لیکن کم سے کم تین سو برس پرانی ہے اس لیے کہ اُس میں ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کے واسطے شاہ عباس نے ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں کوئی زمین وقف کی تھی۔

عمر کے وطن پہونچ کر گاڑی سے اُترنے کے بعد فطرۃً ہمارا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ کوزہ گروں کی دوکانوں کی جانب روانہ ہوں، جن کا بیان عمر کی رباعیات کے اُس حصہ میں ہے جو "کوزہ نامہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوزہ سازی نیشاپور میں ایک مستقل تجارت کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے کہ میں نے اپنے ایران کے تینوں سفروں میں کہیں یہاں سے بڑھ کر کوزہ سازی کا کام ہوتے نہیں دیکھا۔ گو اس میں شبہہ نہیں کہ یہ ایران کا ایک نہایت قدیم ہنر ہے جس کا ذکر اوستا میں آیا ہے۔ اتفاق سے جہاں ہم ٹھیرے وہیں کوزہ گروں کی دوکانوں کی ایک قطار تھی اور ہر دوکان میں کوزہ گر گیلی مٹی گوندھ رہا تھا۔

دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار بر تازہ گلے لگد ہمی زد بسیار

اکثر دوکانوں کی پشت پر چبوترہ بنا ہوا تھا، جہاں مٹی سانی، سکھی اور توڑی جاتی تھی تاکہ چاک (چرخ) پر چڑھ کر ڈھالی جا سکے۔ سامنے چکنی مٹی کے بڑے بڑے گولے پڑے ہوئے تھے، جنھیں بمقابلہ کسی دوسری چیز کے میں گھوڑوں کی کنھٹی یا موٹر کے پھیلے ہوئے ٹائروں سے زیادہ تشبیہ دے سکتا ہوں۔ پاس ہی گیلی مٹی کے تھونے رکھے ہوئے تھے جن کی صورت ہمارے یہاں کے نان بائیوں کی ڈبل روٹی سے ملتی ہے اور انھیں کمھار اخیر شکل میں تبدیل کرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے تھپیا رہے تھے۔

دروازے کی اندر کی طرف ہوشیار کاریگر بیٹھا مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ پیر سے چکّر کو تیزی کے ساتھ گھما رہا تھا، جس میں ایک سیدھی خراد لگی ہوئی تھی، اور اس خراد پر وہ کمال چابکدستی سے بے شکل مٹی سے بیسیوں طرح کی صورتیں ڈھال رہا تھا، اُس کی کارروائی

اُنگلیاں چکّر کاٹنے اور حکم ماننے والے چاک پر اس طرح جنبش کر رہی تھیں کہ چاک کی نہ تھمنے والی آواز میں تال اور سُر نکلتے معلوم ہوتے تھے۔ دوکان کی بھدّی الماریوں پر اُس کی کاریگری کے نمونے بکری کے برتنوں کی شکل میں جلوہ گر تھے۔ "طرح طرح کی صورتوں اور مختلف قد کے برتن چھوٹے اور بڑے کچھ فرش پر پڑے اور کچھ دیوار سے لگے کھڑے تھے۔" اس سامان گِلی میں بڑی صراحیاں (مینہ) پانی پینے کی صراحیاں، پیالیاں اور پیالے اُس شکل کے جیسے عمر کی مے نوشی میں کام آتے ہوں گے، بدہیئت اور خوش وضع، بدنما اور خوش نما برتن، غرض سب طرح کی چیزیں موجود تھیں۔ عالم خیال میں مجھے معلوم ہوا کہ عمر کے الفاظ میں میں اُنکی گفتگو سُن رہا ہوں!

ناگاہ یکے کوزہ برآورد خروش   کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش!

(۲)

آنانکہ محیطِ فضل و آداب شدند   از جمع کمال شمع اصحاب شدند

رہ زیں شبِ تاریک بروند بروں   گفتند فسانہ و در خواب شدند

دوپہر پیچھے کا سورج برف کی ہلکی تحریر پر جو دُور پہاڑوں پر فولادی بندھن کی طرح جگمگا رہی تھی اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا کہ ہم خیام کی قبر دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ مقام شہر سے جنوب و مشرق کی طرف ٹھیک شاد یاخ کے کھنڈروں کے دوسری طرف واقع ہے۔ قدیم نیشاپور بھی انھیں کھنڈروں کے پاس تھا اور شادیاخ، جو اُس کے سواد میں داخل تھا کبھی ایک عجب فضا کا عالم رکھتا تھا۔

ہمارا راستہ کچھ دیر تک ایک پرانے گورستان میں ہو کر جاتا تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ مشرقی جغرافیہ نویسوں نے آج سے ہزار برس پہلے لکھا ہے کہ پرانے شہر کے جنوب میں "آلِ حسینؓ" کے قبرستان تھے، اگرچہ اس ویرانۂ خموشاں کی بابت نہیں کہہ سکتے کہ یہی گورستان ہے۔ کچھ آگے چل کر شادیاخ کے کھنڈروں کے قریب فرید الدین عطار (متوفی ۶۲۳ھ ۱۲۳۰ء) کا مقبرہ تھا۔ ایک روسی سیاح کا بیان ہے کہ عطار کی قبر پر ایک سنگ سیاہ کی تختی لگی ہوئی ہے۔

جس پر ایک لمبا کتبہ کندہ ہے، لیکن خیام کی قبر پر کوئی لوح نہیں جو بتائے کہ وہ یہاں پیر پھیلائے سوتا ہے۔

خشخاش کے کھیت راستے کے کنارے کھڑے ہوے تھے اگرچہ وہاں پر عمر کے گُل و لالہ جو شہریارانِ از یاد رفتہ کے خون کا پتا دیتے موجود نہ تھے۔

ہر جا کہ گُل و لالہ زارے بودست   از سرخی خون شہر یارے بودست

ہماری آنکھوں کے سامنے ایک عجب منظر نمایاں تھا کہ خشخاش کے کھیت کے مقابلہ میں مٹی اور ریت کے ڈھیر تھے جو شہر کہنہ کی وسعت اور حدود بتا رہے تھے اور بہ زبانِ حال کہہ رہے تھے کہ اے گذرنے والے ذرا ٹھہر اور ماضیِ مدفون کی کہانی سنتا جا۔

راستہ بھر امام زادہ محروق کی مسجد کا سبز گنبد جو عمر کی قبر کے قریب ہے دکھائی دیتا رہا۔ جیوں جیوں فاصلہ کم ہوتا گیا خوشنما سبز کاہی رنگ کا گنبد جس کے چاروں طرف زرد اور سفید رنگ کی تحریر عربی حروف میں لکھی ہوئی تھی اُبھر اُبھر کر ہماری نظر کو مسحور کرنے لگا چند لمحے بعد ہم سفید چار دیواری کے دروازے پر تھے اور اونچے اونچے پیڑ ہل ہل کر ہمارے خیر مقدم میں سر جھکا رہے تھے۔

پھاٹک سے محرابی برآمدے میں داخل ہوتے ہی بہت سی سبز جھاڑیاں اور سفید پھولوں کے پودے نظر پڑے، کہیں سب سے بڑھ کر مرسو گلاب کے پھول تبسم کرتے دکھائی دیے۔ یہ واقعی ایک خالص ایرانی وضع کا باغ تھا، جہاں سرسری طرح کی روشیں، پتھر سے ڈھکی پانی کی نالیاں بنی ہوئی تھیں اور ہر طرف سایہ دار درخت لگے تھے اور پھول مہک رہے تھے۔ اس وقت مجھے نظامی سمرقندی کا بیان یاد آگیا جو عمر کا ایک عقیدتمند شاگرد تھا، اور اُس کی وفات کے چند روز بعد ۱۱۳۲ء میں اپنے اُستاد کے مزار کی زیارت کے لیے آیا تھا۔ یہ وہی نظامی ہے جس نے اُس مشہور پیشین گوئی کو بیان کیا ہے جس میں عمر نے کہا تھا کہ میری قبر ایسی جگہ ہوگی جہاں موسم بہار میں پھول اپنی پتیاں میری قبر پر برسائیں گے۔ یہ حکایت بہت مشہور ہے اور یہاں پر میں

اُس کا لفظی ترجمہ اُس جگہ سے کرتا ہوں جہاں نظامی کہتا ہو کہ آج سے بیس برس پہلے میرے اُستاد نے حسب ذیل پیشنگوئی کی تھی :۔

"بلخ میں ۵۰۶ھ (۱۱۱۲-۱۳ع) جب عمر خیام اور مظفر اسفزائی سرائے امیر ابو سعید میں، جو بردہ فروشوں کے کوچہ میں ہے، مقیم تھے تو میں اُس سے جاکر وہاں ملا۔ صحبت الحق عمر کو اُس مجلس میں میں نے یہ کہتے سُنا کہ میری قبر وہاں ہوگی جہاں باد شمال ہر موسم بہار میں گُل برسائیگی۔ میں نے اس بات کا اُس وقت چنداں خیال نہ کیا، لیکن میں یہ ضرور جانتا تھا کہ ایسا شخص یاوہ گوئی نہیں کر سکتا۔ رجب ۵۳۰ھ (۱۱۳۵-۳۶ع) میں میں نیشاپور آیا تو چار برس گذرے تھے کہ اُس ذات بزرگ نے اپنا چہرہ نقاب خاک میں چھپا لیا تھا اور عالم سفلی کو یتیم چھوڑا تھا میں جمعے کی صبح کو اُس کے مرقد پر گیا، اس لیے کہ میرے اوپر اُس کے حقوق اُستادانہ تھے۔ ایک رہبر جو اُس کی قبر کا نشان دے سکے اپنے ساتھ لیا۔ وہ مجھے گورستان حیرہ میں لے گیا اُلٹے ہاتھ مڑا تو سامنے اُس کی تربت نظر آئی، جو دیوار باغ سے لگی ہوئی بنی تھی۔ ناشپاتی اور شفتالو کے درخت باغ کے باہر سے سر نکالے جھانک رہے تھے اور اس قدر شگوفہ ہائے گُل اُسکے مزار پر بکھرے ہوے تھے کہ اُس کی قبر گل پوش ہو رہی تھی۔ مجھے وہ بات یاد آگئی جو بلخ میں اُسکی زبان سے سنی تھی اور میں رونے لگا، اس لیے کہ مجھے اس زمانہ میں دُنیا کے کسی خطہ میں اُسکا مثل نظر نہیں آتا۔"

ٹھیک جس طرح آٹھ سو برس پہلے نظامی سمرقندی نے کیا تھا، ہم بھی اُلٹے ہاتھ کی طرف مُڑے اور اُس جگہ پہونچے جہاں وہ سپرد خاک ہے جس نے اپنی رباعیات میں ایران کے آزاد ترین خیالات کا اظہار کیا تھا۔

اگرچہ عمر کی قبر کسی زمانے میں اس باغ میں زیر دیوار تھی، لیکن اب اُس محراب دار بازو کے نیچے ہے جو امام زادہ محروق کی مسجد میں بائیں جانب بڑھایا گیا ہے۔ امام زادہ موصوف عمر کے زمانے سے تین سو برس پہلے شہید ہوے تھے۔ اُن کے مزار پر جو عمارت بنی ہوئی ہے سترھویں صدی کی معلوم ہوتی ہے اور قدیم کہنہ و خستہ عمارت کی ہر جگہ تعمیر ہوئی ہے۔ بہت سے عقیدت مند مسلمان زیارت

کے لیے یہاں آتے رہتے ہیں۔ ہم نے اس روضہ کی جانب زیادہ التفات نہیں کیا، اس لیے کہ ہماری دلچسپی کی چیز صرف عمر کی قبر تھی۔

عمر کی قبر تین محرابوں میں سے بیچ کی محراب میں ہے۔ اس محراب کی لمبائی تیرہ فٹ ہے اور اس کے دونوں طرف جو محرابیں ہیں وہ دس فٹ کی ہیں اور اندر سے بالکل خالی ہیں۔ اینٹوں کی بنی ہوئی دو سیڑھیوں کو چڑھ کر اُس جگہ پہونچتے ہیں جہاں تربت بنی ہوئی ہے۔ ایک مستطیل شکل کا چبوترہ اینٹ چونے کا بنا ہوا ہے۔ اسی کے نیچے شاعر کی ہڈیاں دبی ہوئی ہیں اور اگرچہ سرِ مزار کوئی لوح نہیں ہے جو بتائے یہ کس کی خواب گاہ ہے، لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ یہ عمر کی قبر ہے۔ شقی القلب گشت کرنے والوں نے (جن کی حالت ایران میں بھی وہی ہے جو کہیں اور ہے) اس چبوترہ کو تختۂ مشق بنایا ہے اور نوکِ خامہ سے اُس کی تزئین کی ہے۔ برابر کی دیوار پر بھی اپنے نام کھود دیے ہیں، جسکی وجہ سے بھورے رنگ کے چونے کے نیچے جو سفید قلعی ہے چمک آئی ہے۔ لکڑی کا ایک ڈنڈا، پتھر کا ایک ٹکڑا، کچھ ٹھیکرے، یہ تھے وہ تبرکات جو ہمیں وقتِ زیارت خیام کے مزار پر چڑھے ہوئے ملے۔ میرے جی میں آیا کہ رباعیات کا ایک نسخہ نذر چڑھاؤں۔ لیکن اس خیال سے باز رہا، کہ اُسے فوراً وہاں سے کوئی اُٹھا کر لے جائے گا اور کوڑیوں میں بیچ ڈالے گا۔

ایک معمر مُلّا جو مسجد کی خدمت کے لیے معین تھا ہمارے پاس آیا اور ادب سے سلام کر کے گلاب کے پھول پیش کیے۔ یہ اہلِ ایران کے نزدیک مہمان نوازی کی علامت ہے۔ لیکن اسوقت گلاب کا کوئی پھول شاعر کی تربت پر اپنی پتیاں نہیں نثار کرتا۔ ہاں ایک زمانہ تھا جب وہ اُسکے دل کی اس سب سے عزیز آرزو کو پورا کیا کرتا تھا۔

افسوس ہے کہ عمر کے مغربی مداحوں نے بھی ابھی تک اس جگہ کوئی مناسب کتبہ کندہ کرا کے نہیں لگوایا، جس سے معلوم ہوتا ہے مغرب میں اُس کی شہرت کس قدر پھیلی ہوئی ہے۔ بہرحال حافظ اور سعدی شیرازی کی طرح وہ موقع جہاں خیام آرام کر رہا ہے مسجد کے قرب کی بدولت محفوظ ہے اس لحاظ سے خیام کو اس بدقسمتی سے سابقہ نہیں پڑا جو مشہور شاعر فردوسی کو نصیب ہوئی،

جس کی قبر طوس کے کھنڈروں میں ہمیشہ کے لیے مفقود ہوگئی ہے۔

ہم خاک بوس ہو چکے تھے اور اب زبان پر "الوداع" تھا۔ جب ہماری گاڑی اُس چوڑی سڑک پر جو شہر کو جاتی ہے گھڑگھڑاتی چلی جا رہی تھی میں نے گلاب کے پھول کی کچھ پتیاں راستہ میں بکھیر دیں تاکہ اگر قبر پر نہیں تو عمر کے مزار کی راہ ہی پر کچھ پھول جو اُسے اس قدر عزیز تھے نثار ہو جائیں۔

اُسی رات نیشاپور سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے چاہا کہ صراحیِ مے سے، جسے عمر کے اشعار نے اس قدر معروفِ انام کر دیا ہے، ایک جرعہ چکھوں۔ خادم تمام شہر کا چکر کاٹ کر لوٹا تو بعد ہزار جستجو نہایت ادنیٰ قسم کی روسی شراب لایا۔ عمر کی روح اس شراب کو دیکھ کر کیا کہتی ہوگی۔

جب ہم سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہوئے اور شہر سے نکل کر اُس سڑک پر پہونچے جو خیام کے مزار تک جاتی ہے، تو تاریکی کے علامات نمودار ہونے لگے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی مانند پڑ جانے والی چمک دُور قلّہ ہائے کوہ کے برفستانی خطوط پر دوبارہ عکس فگن ہو رہی تھی کہ ہم نے اپنے گھوڑوں کو تھوڑی دیر کے لیے شاعر اور اُس کی آرام گاہ کو آخیر الوداع کہنے کے لیے ٹھیرایا۔ حسن اتفاق سے ہمارے ارمنی خادم کے پاس شرابِ سرخ کی ایک بوتل موجود تھی جو اُس نے دَورانِ سفر میں کسی دوسرے گانوں میں خرید لی تھی۔ اگرچہ ساقی سرو قد موجود نہ تھا جو اپنے ہاتھوں سے بلوریں جام پیش کرتا، لیکن عمر کی یاد میں ایک جرعہ نوش کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ سامنے ماہِ کامل طلوع ہو رہا تھا اور جلد ہی اُس سنسان باغ کا نظارہ کرنے کے لیے آنے والا تھا جہاں خیّام بے خبر سو رہا ہے۔ آہ۔ اب وہ ان مہمانوں کے جُھرمٹ میں نہیں ہے، جو فرشِ سبزہ پر نجوم کی طرح بکھرے ہوتے تھے۔ ہم سب نے مل کر چمکتی ہوئی شراب اُس کے نام پر پی اور جب ہم نے جامِ تہی کو اُلٹا کیا تو اس آرزو کے ساتھ کہ آنے والے زمانے میں اس مشہور حکیم، مہندس اور شاعر کی شہرت کی بنیاد اُن چیزوں سے تازہ ہوتی ہے جو بہترین

ہیں - تب ہم روانہ ہوے اور ایک خیال میں محو ہو گئے اور تعجب کرنے لگے کہ مغرب و مشرق میں عمر خیام کے متعلق موافق و مخالف راؤں میں کس قدر عظیم اختلاف ہے۔ بعض اُس کے اشعار کی تعریف کرتے اور کہتے ہیں یہ اُن حقیقی جذبات کا مردانہ اظہار ہے جو انسان کے دل میں اپنا گھر رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ تعداد ہے اُن کی، جو اُس کی رباعیات کو ناپسند کرتے اور کہتے ہیں کہ محبت کی تصویر کھینچنے میں شہوانی جذبات کی رنگ آمیزی کی ہے، اُس کی نولے فلسفیانہ میں یاس و الم کے سوا کچھ نہیں ہے اور لامذہبی کے اظہار میں بیباکی سے کام لیا ہے۔ ایسے معاملات کا اخیر فیصلہ اُس جملہ سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا جو مشرق میں اس قدر زباں زد ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سید حسن برنی

دردِ فراق

(سر رابندرناتھ ٹھگور کے کلام کا ترجمہ)

بسیطِ عالم ہے دردِ فرقت - نمود ہو کر ثبات ہو کر
دکھا رہا ہے ہزاروں جلوے نمایشِ کائنات ہو کر
فلک پہ شب کو جو ایک تارے سے دوسرے تک ہے اک خموشی
غمِ جدائی کی ہے یہی تو نگاہ بازی نظارہ کوشی
ہے پتیوں کی جو سرسراہٹ سے فصلِ باراں میں نغمہ خیزی
ہے یہ بھی احساسِ رنجِ دُوری کی ایک شانِ ترانہ ریزی
یہی ہے دردِ فراق پنہاں عمیق ہو کر محبتوں میں
اسی سے انسان گھر گیا ہے مصیبتوں میں مسرتوں میں
یہی مرے دل میں مستتر ہے خلوص بنکر نیاز ہو کر
یہی لبوں سے مرے نکلتا ہے شاعرانہ گداز ہو کر

کلام ناظم کا تعلق غالب سے

(۲)

اس مضمون کی پہلی قسط میں ہم اُن قرائن کا ذکر کر چکے ہیں جن سے دیوان ناظم مرزا غالب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ ضمناً، دیوان ناظم سے ردیف الف تک، وہ اشعار بھی چُن کر ہم نے پیش کیے تھے جن سے غالب کا رنگ نمایاں ہے۔ آج اسی سلسلہ میں دوسری ردیفوں کے شعر ناظرین کے سامنے لائے جائیں گے، اور اگلی مرتبہ اس بحث کو چند اور دلیلوں سے تقویت پہونچا کر ختم کر دیا جائے گا۔

گر یہاں آخر میں تو وہ اشعار ہیں جن کے خاص خاص الفاظ، ترکیبیں یا معنی، غالب کے اُردو دیوان میں بجنسہٖ یا مماثل صورت میں موجود ہیں اور اول وہ غزلیں اور شعر نقل کیے ہیں جن سے مجموعی طور پر غالبیت مترشح ہے۔ غالبیت سے جو کچھ مفہوم ہے اُسے ہم ناظرین کی قوتِ فیصلہ پہ چھوڑتے ہیں۔ کیونکہ اُس کی تشریح ایک مستقل اور مفصل بحث کی محتاج ہے جس کا یہاں موقع نہیں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون شروع کرنے سے قبل، اصولاً، ہمیں مرزا غالب کی خصوصیاتِ شعری ہی کو سمجھنا اور سمجھانا چاہیے تھا۔ بہرحال، اب تو دیوان ناظم کی پہلی قسم کے شعر سنیے:-

غزل (صفحہ ۹۹)

ہٹی نہ وصل میں بھی کلفتِ زبانِ فراق — تمام رات کہی ہم نے داستانِ فراق
خوشا حبیب ادا ہائے دلستانِ حبیب — بُرا فراق و الم ہائے جانستانِ فراق
فغاں کو جانتے ہیں ہم درائے وادیِ غم — نفس کو مانتے ہیں گردِ کاروانِ فراق
نہیں ہے اشک یہ ہے نورِ دیدۂ ہجراں — نہیں ہے داغ یہ ہے شمع دودمانِ فراق
جگر گداز ہے کیا گرمیِ نگاہِ عتاب — جگر شگاف ہے کیا تیزیِ سنانِ فراق

دمِ گسستہ ہوا آیا طنابِ خیمۂ صبر — دلِ برشتہ ہے گویا کبابِ خوانِ فراق
غبارِ دشت ہے افزایشِ جمالِ جنوں — متاعِ درد ہے آرایشِ دکانِ فراق

پڑھوں یہ مصرعِ حافظ تو ناظم آیں کہ
کہ روے ہجر سیہ باد و خانمانِ فراق

دوسری غزل - دیوانِ ناظم - صفحہ ۹۵ -

پہلے سیکھے طرز بال افشانیِ پروانہ شمع — پھر بنے پروانۂ شمعِ رُخِ جانانہ، شمع
چاہتی ہے گرمیِ ہنگامۂ پروانہ شمع — ورنہ کیوں سر پہ لیے پھرتی ہے آتشخانہ، شمع
سرگزشتِ شعلۂ و دُود وادِ اشک آتشیں — ہے تجھے اچھی طرح از بر مرا افسانہ، شمع
طرۂ موجِ دُخاں کے پیچ و خم کیونکر کھُلیں؟ — گاہ گاہے یاد سے لیتی ہے کارشانہ شمع
جل بجھی تو بھی اگر پروانہ خاکستر ہوا — دی خدا نے داد اس بیچارے کی دکھانا، شمع

خلوتِ اہلِ سخن میں ہے کچھ اس کی شان اور
گرچہ ہے ناظم شکوہ افزاے ہر کاشانہ شمع

ان دونوں غزلوں میں، خصوصاً پہلی میں، الفاظ کی بلاغت اور زور، پھر، مصرعوں کی روانی اور بیوستگی، معانی کی ندرت اور تشبیہوں کی تازگی بار بار مزا لینے کے قابل ہے اور یہ سب خوبیاں ملا کر کلام کو وہ امتیاز دیتی ہیں جو اُردو شاعری میں صرف غالب کا حصہ ہے اور قریب قریب پوری غزلوں کے نقل کر دینے کا مدعا یہ ہے کہ یہی امتیاز بخوبی نمایاں ہو جائے اور یہ کہنے کی گنجایش نہ رہے کہ کسی غزل میں ایک آدھ شعر کا غالب کے رنگ میں ہونا کچھ بھی تعجب کی بات نہیں۔ اور یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ کلام ہی غالب کا ہوئے سو جب غزلیں کی غزلیں غالب کے طرزِ خاص میں ہمارے سامنے ہوں تو یا انھیں غالب کلام سمجھا جائے گا اور یا یہ کہ نواب ناظم اپنے اُستاد کے اُن خوش نصیب تلامذہ میں سے تھے جنھوں نے غالب کا اتباع کیا اور اُس میں ایسی غیر معمولی کامیابی حاصل کی کہ آج اُن کے اور غالب کے کلام میں تمیز کرنا دشوار ہے۔ مگر ہم آیندہ یہ دکھانے کی

کوشش کریں گے کہ نواب ناظم کی نسبت ایسا حسنِ ظن مبالغۂ شاعرانہ سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں جستہ جستہ بعض اور شعر بھی قابل ملاحظہ ہیں :-

(۱) بلا ہے بسکہ شبِ انتظار کی صورت — نظر میں پھر گئی روزِ شمار کی صورت

(۲) بشرط لعل سخن گو و نرگسِ غماز — مہ دو ہفتہ میں ملتی ہے یار کی صورت

اب اس مضمون کو کہ ایسے ہونٹ اور آنکھیں چاند کی ہوں تو بے شک یار کو اُس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے" شعر مندرجۂ بالا کی صورت میں ادا کرنا، درحقیقت غالب ہی کا کام تھا۔ اور ایسے نادر اور دقیق مگر دلکش اسلوب بیاں کی مثالیں ڈھونڈھنی ہوں تو اساتذۂ فارسی کا کلام پڑھنا چاہیے اُردو اس معاملہ میں مفلس ہے۔

(۱) مل جائیں اژدہام میں ہم ہی ہم سے دُور — اک گھر جدا بنائیں گے دیر و حرم سے دُور!

(۲) پیرو ہوں لیک پاسِ ادب بھی ضرور ہے — رکھتا ہوں پاؤں خضر کے نقشِ قدم سے دُور

(۳) چاہوں کہ حالِ وحشتِ دل کچھ رقم کروں — بھاگیں حروف وقتِ نگارش قلم سے دُور

(۴) دم بھر میں جا پہونچتے ہیں یاں کے مقیم واں — یہ مرحلہ نہیں ہے سوادِ عدم سے دُور

ایک جگہ مذاہب کے ظاہری اختلاف، اور حقیقی اتحاد کو بڑے لطف سے بیان کیا ہے اور مرزا غالب مرحوم کا عقیدۂ متصوفانہ یہی تھا :-

(۱) ہو کیوں نہ الگ سبحہ و زنار کی آواز — ہر رشتے پہ جاتی ہے بدل تار کی آواز!

(۲) رہتے ہیں ہم اُس کوچہ میں گو بار نہ پائیں — کھلتا ہے تو سنتے ہیں در یار کی آواز

(۳) معلوم ہو کیا کثرتِ عالم کی حقیقت — سجھائی نہیں دیتی ہے بازار کی آواز

---

(۱) ہے آئینہ خانے میں ترا ذوق فزا رقص — کرتے ہیں بہت سے ترے ہمشکل جدا رقص

(۲) بے زخمہ صدا دینے لگے ساز عجب کیا — گر کرنے لگیں خود بخود آلاتِ غنا رقص

(۳) گر ہو نہ ترے باغ میں آنے کی توقع — کیوں سرو کو تعلیم کرے بادِ صبا رقص

یہ شعر بھی انصاف سے غور کرنا چاہیے کہ مرزا غالب کے سوا کسی اور کی قلم لکھ سکتی ہے :-

(۱) ہم نشیں، صورتِ آرائشِ عالم کب تک — جا و دانی سہی نقیش، مگر ہم کب تک

(۲) کون ہو گا کہ نہ ہو معتقدِ فصلِ بہار — موسم اچھا ہے، پہ یہ کہیے کہ موسم کب تک

اس زمین میں کہ "ہے کبود اس کی ملیسان کا رنگ" ایک ایسا شعر انشا ہوا ہے کہ جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ فرماتے ہیں :-

نو بہار آئی، اور کیا ہو گا — کچھ نکھر جائے گا خزاں کا رنگ

اور حقیقت میں اکثر اہلِ فلسفہ کے نزدیک کائنات کا فطری میلان "زوال" کی طرف ہے۔ پس اُس کا "عارضی عروج" جاننے والوں کی نظر میں محض مصنوعی شے ہو گا۔ اور ہمارا بے عدیل شاعر اسی فلسفیانہ خیال کو دوسرے لباس میں یوں جلوہ دے چکا ہے کہ :-

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادِ یاں (غالب)

گر اب ہم ایک ایسا شعر پیش کرتے ہیں جس کا خود نقص، منہ سے بول رہا ہے کہ میں غالب کا نقص ہوں :-

ایسا کیا آساں ہے اس عالم کا برہم مارنا
وہ خرامِ ناز بھی ہو گا قیامت کا شریک (ناظم)

مصرعۂ ثانی کا سیاق اور اُدھر برہم زدن کا ترجمہ برہم مارنا، دونوں اُردو روزمرہ کے خلاف نظر آتے ہیں۔ اور بہت سے اہلِ زباں اس لفظ کا ایسا استعمال ایک طرف، اس کی صحت میں بھی غالباً متردد ہوں گے۔ لیکن ہمارا مقصود یہاں صرف یہ جتانا ہے کہ فارسی محاورہ کو ایسی بیباکی سے اُردو میں گھسیٹ لینا بھی اگر ہے تو اُسی مجددِ زباں کا کام ہو سکتا ہے جس نے یہ بھی لکھا ہے کہ

(غالب) نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ! وہکذا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

اپنے دوسرے عنوان میں ہم نے ناظم کے وہ اشعار چُنے ہیں جن کے خاص خاص الفاظ ترکیبیں یا مضمون بجنسہ یا مماثل صورت میں خود مرزا غالب مرحوم کے دیوان اُردو میں موجود ہیں - چنانچہ اس کی چند مثالیں یہ ہیں :-

(ناظم) نہ پہونچے آپ کو صدمہ سمجھ کے توڑئیگا بندھا ہے عہدِ وفا آپکے، استوار بہت

مطلب یہ ہے کہ آپ نازک بہت ہیں اور عہد مضبوط بندھ گیا ہے، اسے توڑا تو ایسا نہ ہو کہ توڑنے کی کشمکش میں آپ کو صدمہ پہونچ جائے" مضمون شعر، رعایت لفظی پر مبنی ہے - مگر اسی کو ایک خفیف اُلٹ پھیر کے ساتھ ہم مرزا غالب کے اس شعر میں پاتے ہیں :-

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا۔

ناظم کی اسی غزل کا مطلع ہے :-

مریضِ غم کو عیادت ہے ناگوار بہت ہمیں ستاتے ہیں یارانِ غمگسار بہت

طرزِ بیاں کے علاوہ خود مضمون بھی وہی نظر آتا ہے جو مرزا غالب کے اس قطعہ میں، کہ "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ــــ الخ" زیادہ تفصیل اور خوبی کے ساتھ بندھا ہے۔

(ناظم) مے پیجئے بہار میں، پوچھے اگر خدا ہے عذرِ ذوق بخشیِ آبِ ہوا، جواب

یعنی جب شراب خواری پر محاسبہ ہوگا تو کہہ دیں گے کہ موسمِ بہار کی آب و ہوا ہی ذوق میکشی پیدا کر دیتی تھی" دیوان غالب میں ہے :-

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے مُدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

اس میں اگرچہ موسمِ بہار کی تصریح اور خدا کے ہاں جوابدہی کا کوئی عذر نہیں، لیکن اصل میں مضمون وہی ہے - اور پہلے مصرعہ نے اس میں جوش اور تازگی پیدا کر دی ہے۔

(ناظم) بڑھتا رہا بدن میں مرے دمبدم لہو سینے پہ تھا وہ دستِ حنائی تمام رات

یہی مضمون ترقیِ تخئیل کے ساتھ مرزا صاحب کے ہاں اس شکل میں نظم ہوا ہے کہ

اچھا ہے اُس انگشت حنائی کا تصوّر دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

(ناظم) جو کھانے کی قسم کھائی نہ ہوتی — تو میں کیوں مر نہ جاتا زہر کھا کر
(غالب) زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

دونوں شعروں میں معنی بے شبہ متضاد ہیں لیکن مجموعی طور پر دیکھئے تو قیاس ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں:

(ناظم) ہر چند مسلک ہمارا اہلِ صورت سے، مگر — چاہیے ناچار ہونا رسم و عادت کا شریک

یہ وہی فلسفیانہ خیال ہے جو مرزا صاحب کے ہاں زیادہ پیچیدہ اور بلند ہو کر بندھا ہے:-

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یا:- ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — الخ

(ناظم) نظر نہ رنگ ہو آئے پئیں ہزاروں میں — پیالہ کوئی بہ از ساغرِ سفال نہیں
(غالب) جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

اسی طرح کے اور بہت شعر ہم نے تلاش کر رکھے ہیں مگر بالفعل ہم اس مضمون کو یہیں ناتمام چھوڑتے ہیں۔ فرصت کم ہے اور ایڈیٹر صاحب الناظر کا تقاضہ بہت۔ بحث کے خاتمہ کا ابھی ناظرین اور انتظار گوارا کریں۔ فقط

سید ہاشمی (فرید آبادی)

اُف یوں شہیدِ ناز کی تقدیر پھر گئی — وہ کیا کریں کہ حلق پہ شمشیر پھر گئی
جب آنکھ تیری لے کے بتِ بے پیر پھر گئی — مجھ کو یقیں ہوا مری تقدیر پھر گئی
نکلا چمک کے مہرِ مبیں آسماں پہ جب — میری نگاہ میں تری تصویر پھر گئی
جادو کا کام کیوں نہ کرے چشمِ سرمگیں — سرمہ کے ساتھ آنکھ میں تاثیر پھر گئی
شاید دوبارہ عرضِ تمنا قبول ہو — پچھتا کے آہ تا درِ تاثیر پھر گئی
دیکھا جو اُن کو تیغ بکف قتل گاہ میں — میری نظر میں موت کی تصویر پھر گئی
دیکھا جو اُسکے عارضِ نازک کو باغ میں — نکہت گلوں سے بلبلِ دلگیر پھر گئی

([illegible] دہلوی)

دیارِ دوست

اے نسیمِ صبحدم ! اے باعثِ آرامِ جاں — تیرے جھونکوں سے دماغ و دل ہیں محوِ انبساط
تیری نکہت آفریں رفتار سے ہے شادماں — وہ دل ہجراں کشیدہ ، جو تھا محرومِ نشاط

وہ سرور انگیز کلیاں ہیں تری چھائی ہوئی — جانتا ہوں میں کہ تو ہے آشنائے کوے دوست
تیرے آنے سے مسرت میں فراوانی ہوئی — آ رہی ہے تیرے ہر جھونکے سے مجھکو بوے دوست

اُن سُنہرے گنبدوں کو جا کے چھُو آتی ہے تُو — حسرتِ دیدار جن کی خوں رُلاتی ہے مجھے
مجھ سے للچائے ہوئے کو اور للچاتی ہے تُو — تیرے آنے سے کسی کی یاد آتی ہے مجھے

صبح کا دلچسپ منظر ، تازگی بخشِ نظر — پُر فضا اُونچے پہاڑوں سے طلوعِ آفتاب
تو ہے اس نظارۂ سیمیں میں ڈوبی کس قدر — ہے نمایاں تیرے ہر انداز سے کیفِ شراب

وہ تمنائے بہار آلود میرے دل میں ہے — حسرتوں کی چھا رہی ہے جس پہ کچھ پژمردگی
کچھ اثر واماندگی کا پہلی ہی منزل میں ہے — بن گیا ہوں میں سراپا مرکزِ افسردگی

دل شکستہ ہو گیا ، اتنی بڑھیں ناکامیاں — دے دیا ہمت نے میری مجھ کو افسردہ جواب
پھر بھی ہے بیتابیوں کا رنگ چہرے سے عیاں — اور اندازِ سکوں میں بھی ہے شانِ اضطراب

ہو رہے ہیں خوب ہی جھونکے ترے غرقِ شمیم
اپنے دامن میں لیے آتی ہو خوشبو دار پھول
ہو دیارِ دوست میں تیرا گزر گر اے نسیم!
نذر کر دینا مری جانب سے بھی دو چار پھول

لیکن ایسے پھول، جو افسانۂ جذبات ہوں
جن کی ہر اک پنکھڑی پہ ہو کھنچی تصویرِ دل
الفت صادق میں جو دیوانۂ جذبات ہوں
ہر رگ و ریشہ پہ جن کے ہو لکھی تفسیرِ دل

اے دیارِ دوست! اے عشق و محبت کی زمیں!
کاش مجھ افسردہ کو دیدار ہو تیرا نصیب
فدویت کے سجدوں سے آباد ہو میری جبیں
خاک میں مل کر تری، کھل جائے پھر میرا نصیب

قیصر

وہ اگلی گرمیٔ قاتل نہیں ہے
کہ اپنا سا کوئی بسمل نہیں ہے
دکھا او جذبۂ دل کچھ تماشا
محبت کا کوئی قائل نہیں ہے
نہ تڑپے وہ، نہ لوٹے وہ، تو آخر
کرے کیا؟ پاس جس کے دل نہیں ہے
مری مشکل کوئی مشکل ہے؟ لیکن
ترحم عادتِ قاتل نہیں ہے
ہمارِ زندگانی ایک دل تھا
سو وہ بھی اب کسی قابل نہیں ہے
یہ دل کیا ہے؟ حقیقت اسکی کیا ہے؟
حسینوں کی تو اک محفل نہیں ہے!
کریں اوروں کی کس منہ سے شکایت
جب اپنا دل ہی، اپنا دل نہیں ہے!
نگاہِ یاس تو نے کر دیا کیا؟
کہ اپنے ہوش میں قاتل نہیں ہے!
ٹھہر تا قیس! کیا لیلےٰ کا ناقہ
یہ دشتِ نجد ہے، منزل نہیں ہے!
خدا کا شکر، ناصح اب یہ سمجھا
کہ سمجھانے سے کچھ حاصل نہیں ہے
ہوئی تاریک دنیا سے محبت
خدا بخشے ہمارا دل نہیں ہے!

([illegible])

جنتری کی تاریخ

آج کل جنتریاں حشرات الارض کی طرح ہندوستان کے گلی کوچوں میں چکر لگا رہی ہیں لیکن غالباً ان جنتریوں کے چھاپنے والوں کو بھی یہ نہ معلوم ہوگا کہ جنتری کا موجد کون تھا اور زمانہ کے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھ چکی ہے :

انگریزی میں جنتری ہیں "المناک" (Almanac) اور عربی میں "المنہ" کہتے ہیں ؛ گو تاریخی وسائل سے مخصوص علوم اسلامی کے بہت سے حصہ سے ناواقفیت رکھنے کی وجہ سے ہم اس کے موجد کا نام تو نہیں بتا سکتے لیکن لفظ "المنہ" کا عربی اور اس کے مشابہ المناک کا انگریزی زبان میں موجود ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ یورپ میں اس کی ایجاد ہونے سے پہلے ہی عرب اس کو عالم وجود میں لے آئے تھے ؛ لیکن اب لکھنا یہ ہے کہ یورپ میں کیس رنگ میں استعمال ہوے اور زمانہ کی کیسی کیسی نیرنگیاں اس کے حصہ میں آئیں ؟

ابھی تھوڑے عرصہ قبل تک یورپ کی جنتریاں بھی سیاروں کی چالوں اور فضول خرافات باتوں سے بھری ہوتی تھیں لیکن اب موجودہ زمانہ کی جنتریوں میں نہایت مفید حواشی مثلاً تاریخی، جغرافی، تمدنی اور معاشرتی وغیرہ ہوتے ہیں ؛ افسوس ہے کہ ہم یورپ کے متعلق بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہاں سب سے پہلے کس شخص نے جنتری تیار کی لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ برٹش میوزیم اور کرسٹی کالج کیمبرج کے عظیم الشان کتب خانوں میں سب سے پرانی دستی لکھی ہوئی نایاب کتابوں کے ذخیروں میں ایک جنتری بھی موجود ہے ؛ یہ چودھویں صدی عیسوی کی ہے۔

یورپ میں سب سے پہلے جو قابل وقعت جنتری تیار ہوئی اس کا مترتب غالباً پرنج تھا ؛ جنتری ۱۴۲۵ء اور ۱۴۶۱ء کے درمیان لکھی گئی تھی اس کے بعد بھی جو غیر معروف جنتریاں وقتاً فوقتاً تیار ہوئیں دستی لکھی ہوئی تھیں :

پرنج کا ایک شاگرد گیوٹیلنس تھا اس نے سنہ ۱۴۷۵ء سے سنہ ۱۵۰۶ء تک کی ایک جنتری تیار کی جس کے صلہ میں تھیس کورنیوس شاہ ہنگری نے اُس کو بہت کافی انعام دیا، اس کے بعد تین جنتریاں اور قابلِ قدر طبع ہوئیں، ایک بارسلونا کے باشندہ برنارڈ کی بنائی ہوئی سنہ ۱۴۸۷ء کی اور دوسری وائنا کے اینگل کی سنہ ۱۴۹۱ء کی اور تیسری طوبنجن کے اشافر کی سنہ ۱۵۲۴ء کی لیکن افسوس ہو زمانہ کی ناقدردانی نے ان تینوں جنتریوں کو آج قطعاً نایاب کردیا ہے؛

سنہ ۱۵۳۳ء میں ربی لاس نے ایک جنتری تیار کی اور سنہ ۱۵۳۵ء و سنہ ۱۵۵۰ء میں بالترتیب اُس کی اشاعت کی تجدید کی۔ اسی زمانہ میں نوسٹرڈیمس ایک نجومی پیدا ہوا اُس کی بنائی ہوئی جنتریوں نے سب کو ماند کرکے ہردلعزیزی کا تمغہ حاصل کیا لیکن ایک بار اُس نے جنتری میں ہنری دوم شاہ فرانس کی موت، چارلس اول شاہ انگلستان کے قتل اور لندن کے آگ سے تباہ ہونے کی پیشین گوئیاں درج کردیں جس سے رعایا میں عام طور پر ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوگیا۔ آخر ہنری سوئم شاہ فرانس کو مجبوراً سنہ ۱۵۷۹ء میں سیاسی پیشین گوئیوں کو قانونی جرم قرار دینا پڑا، اور انگلستان میں یہ قاعدہ مقرر کردیا گیا کہ ہر جنتری رجسٹری کراکے بشپ سے خاص طور پر اُس کی اشاعت کی اجازت لی جائے؛

پیشین گوئی کرنے والی جنتریاں اب بھی فرانس کے چند دیہاتوں اور جاہل لوگوں میں مروّج ہیں اور افسوس ہو کہ یہ مرض عموماً ہندوستان میں بہت زور پر ہے۔ بلکہ یہاں تو عام طور پر ماسوائے ایک آدھ کے سب فضول مزخرفات سے بھری ہوتی ہیں، یعنی جنتریوں کی جو حالت یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی میں تھی آج وہی حالت ہندوستان میں بیسویں صدی میں ہو، یا ہندوستان فرانس کے چند معمولی دیہات کے برابر ہے؛ بہرحال فرانس کی اس قسم کی جنتریوں میں "النک لیگویز" بہت زیادہ مقبول ہو؛ یہ سب سے قبل لیج میں چھاپی گئی اُس کے بعد سنہ ۱۶۳۶ء میں لینس برگ میں اس کی اشاعت کی تجدید ہوئی؛ یہ جنتری اس وجہ سے اور زیادہ مقبول ہوئی کہ اس کی بعض بعض باتیں ایک محض جاہل شخص بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہو

مثلاً ہر تاریخ کے چاند علٰحدہ علٰحدہ بنے ہوے ہیں اور ایک چاند کے نیچے ایک شیشی بنا دی ہے جس میں سے کسی چیز کے چند قطرے نکل رہے ہیں اس سے دیکھنے والے نے سمجھ لیا کہ اس تاریخ کو دوا پینا بہت مفید ہوگا ؛ غرض اُس میں اس قسم کے اشارے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس جنتری میں پیشین گوئیاں بکثرت ہوتی تھیں چنانچہ ۱۸۲۴ء میں اسی جنتری میں ایک پیشگوئی یہ بھی طبع ہوئی تھی کہ "کسی شاہی منظور نظر پر اپریل میں ایک بہت سخت مصیبت پڑے گی" ؛ میڈم ڈباری، لوئیس پنجدہم کی بہت چہیتی معشوقہ تھی اُس پر اس پیشین گوئی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ اپریل کے تمام مہینہ بھر یہی کہتی رہی کہ "خدا اس منحوس مہینے کو جلد ختم کرے" اور آخر کار لوئیس کا انتقال ہوگیا اور ایک حد تک پیشین گوئی پوری ہوگئی ؛ اُس وقت سے اس جنتری کی اور زیادہ وقعت ہوگئی ؛ اور رفتہ رفتہ فرانس کا ایک خاص مشغلہ جنتری بینی بھی ہو گیا۔

۱۸۵۲ء میں ایم پاس وزیر پولیس نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملکی رسائل میں سے مفید رسائل علٰحدہ اور مضر الگ کر دیے جائیں۔ اس موقع پر سات آٹھ ہزار رسالوں کا ڈھیر تھا اور ان میں نصف سے زیادہ جنتریاں تھیں ؛ کمیشن ان جنتریوں اور ان کی پیشین گوئیوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا اور محسوس کیا کہ ایسی جنتریوں کی اشاعت جبراً و قانوناً بند کر دینے کی سخت ضرورت ہے۔ غرض اسی زمانہ سے جنتریوں کا پُرانا ڈھیر ٹوٹا اور طرز جدید کی جنتریاں شایع ہونا شروع ہوئیں ؛ اب فرانس میں نہایت عمدہ عمدہ جنتریاں چھپتی ہیں ان میں بھی "المنک امپیریل" سب سے زیادہ مفید اور کار آمد ہے۔

ابھی تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ محض فرانس ہی تک محدود تھا لیکن اب لکھنا یہ ہے کہ دیگر اقطاع یورپ میں اس کی کیا حالت رہی ؛ یورپ کے قریب قریب ہر حصۂ زمین میں جہاں جہاں جنتری نے جنم لیا اول اول وہ ایسی ہی صورتوں میں نمودار ہوئی تھیں جیسے فرانس میں ہوئی تھیں ؛ انگلستان میں بھی جنتریاں نہایت بیہودہ معاملات سے لبریز نظر آتی تھیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہاں سیاسی پیشین گوئیاں بہت کم کی جاتی تھیں ؛ غرض چند در چند تبدیلیوں اور مجبوریوں

کے بعد ۱۸۲۸ء میں انگلستان نے بھی اپنی جنتری کا پرانا جامہ اُتار کر اور نئی طرز کی دلربایانہ دلفریب وناز آفریں پوشاک پہنا کر پبلک کے سامنے پیش کی ؛ پہلے برٹش المنیک اس کے بعد انگلش مین المنک شایع ہوئیں ؛ ان میں نہایت مفید اور کارآمد حواشی ہوتے ہیں اور حتی الامکان فضول باتوں سے اجتناب برتا جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ میں سب سے پہلی جنتری سولھویں صدی میں چھپی اور دوبارہ سترہویں صدی میں ایڈنبرا میں چھپی ۱۶۷۷ء میں وہاں جنتری بینی کا اس قدر شوق ہوا کہ بہت سی طرح طرح کی جنتریاں جاری ہوئیں اور اُن کی سالانہ اشاعت پچاس ہزار تک پہونچ گئی، ۱۶۸۳ء میں ایڈن برگز ڈوالمنک طبع ہوئی ؛ اول اول یہ جنتری سولہ صفحہ پر طبع ہوئی تھی لیکن شروع سے آخر تک نہایت لغو اور بیہودہ باتوں سے لبریز ہوتی تھی ؛ ۱۷۴۵ء سے اس نے اپنا رنگ بدلا اور سولہ صفحے سے چھتیس صفحے کی جنتری کرکے اُس میں چند مفید باتیں درج کی گئیں مثلاً اسکاٹ لینڈ کے ممبران پارلیمنٹ کی فہرست وغیرہ۔ بارہ سال کے عرصہ میں یہ جنتری بہتر صفحے کی ہوگئی اور ۱۷۶۹ء میں ۱۵۲ صفحے کی۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۷ء میں اُس کا نام بھی تبدیل کرکے الیور اینڈ بوائڈ نیو ایڈنبرگ المنک رکھ دیا اور ۱۸۷۳ء میں ۱۰۵۹ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہوگئی ؛ اس میں نہایت مفید معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔

آئرلینڈ میں بھی بہت سی تبدیلیوں کے بعد ایک جنتری تھامس آئرش المنک طبع ہوتی ہے ؛ پیشین گوئی کرنے والی جنتریاں اس وقت بھی جزائر برطانیہ میں طبع ہوتی ہیں لیکن اُن کی اشاعت محض جاہل اور توہم پرست لوگوں ہی میں ہے۔

بلجیم کی روائل المنک ، جرمنی کی پروشین روائل المنک اور امریکہ کی امریکن المناک اور المنک ڈی گوتھا نے خاص طور پر پبلک میں وقعت حاصل کرلی ہے ؛ پیشین گوئیاں کرنے والی زبردست جنتریوں نے بھی اب عموماً اپنا رنگ بدلنا شروع کردیا ہے ؛ برلن میں ایک جنتری طبع ہوئی ہے جس میں علم ہیارہ کے متعلق نہایت مفید معلومات درج ہوتی ہیں اور عوام الناس میں وہ بہت ہردلعزیز ہے۔

جرمنی اور فرانس میں اس زمانہ میں ایسی جنتریوں کا بہت زیادہ رواج ہے جس میں کہ ملک کے ضروری معاملات کے متعلق ضروری معلومات درج ہوں؛ یہ جنتریاں ہر سال طبع ہوتی ہیں اور انگلستان میں ان کو انیویل (Annual) یعنی سالانہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنتری سے اب یہ دوسرا کام لیا جانے لگا ہے کہ بڑے بڑے سوداگر اس کے ذریعہ سے اپنے یہاں کے اشتہارات شایع کرتے ہیں؛

پہلے جنتری کی اشاعت کے لیے ایک زبردست ٹکیس یعنی ۱۵ پنس فی کاپی مقرر تھا لیکن ۱۸۳۴ء سے یہ ٹکیس منسوخ کردیا گیا جس سے جنتریوں کی اشاعت میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔

شبیر حسین۔ مارہروی (علیگ)

دلِ غمِ اینؔ آں کی خو نہ کرے　　اس سے تیری ہی آرزو نہ کرے
صبر کا نام بھی نہیں دل میں　　نگہِ یار جستجو نہ کرے
تیری خوشبو کے بعد رُوح مری　　گُلِ جنت بھی ہو تو بُو نہ کرے
مجھ میں تابِ جمالِ یار کہاں　　شوق اُنھیں میرے روبرو نہ کرے
حُسن سے عشق حکمِ دل کے خلاف (ق) کھُل کے بے پردہ گفتگو نہ کرے
اور کرے بھی تو پھر زراہِ نیاز　　روبرو ہوکے دو بدو نہ کرے
ہے یہ آئینِ عاشقی میں گناہ　　غم سے دِل ترکِ آرزو نہ کرے
کچھ نہیں شوقِ جُبّہ و دستار　　دل سرِ ساغر و سبو نہ کرے
ترکِ مے کے معاملے ہیں فضول　　محتسب مجھ سے گفتگو نہ کرے
معتبر عشق میں ہے زخم وہی　　جو کبھی خواہشِ رفو نہ کرے
دل رضا کار ہے وہی جو کبھی　　طلبِ فتح میں غلو نہ کرے
جم چکا ہم پہ حال وقال کا رنگ　　شیخ بے کار ہاؤ ہُو نہ کرے
جانِ حسرت کی ہجر میں تسکیں　　اور پھر کس سے ہو جو تُو نہ کرے

نتیجۂ حسرت (علیگ)

دلِ افسردہ کو ملامت

تو اے دلِ عزیز بتا کیوں نڈھال ہے؟ — افسردگی یہ کیوں ہے؟ یہ کیسا ملال ہے؟
آشفتہ حال اور پریشاں خیال ہے؟ — کھویا ہوا سا کیوں ہے؟ یہ کیا تیرا حال ہے؟
تیرا شگوفہ ہوتا نہیں آج وا - یہ کیوں؟
محسوس تجھ میں ہوتا ہے مجھ کو خلا- یہ کیوں؟

اے مرغِ خوش نوا وہ چہک تیری کیا ہوئی — اے شمعِ جاں فروز چمک تیری کیا ہوئی
باغِ طرب کے پھول! مہک تیری کیا ہوئی — اے دردمند دل وہ کسک تیری کیا ہوئی
خوشیاں ہیں عیش میں نہ مزے اب وہ غم میں ہیں
باقی ہمیں نہیں غرض اب اپنے "ہم" میں ہیں

مانا کہ یار کی وہ طبیعت نہیں رہی — وہ دل نوازیاں وہ مروّت نہیں رہی
مانا اُسے وہ تیری محبت نہیں رہی — تجھ پر وہ چشمِ لطف و عنایت نہیں رہی
لیکن یہ سچ بتا ہے تقاضا وفا کا کیا؟
اے مدعی وفا کا! ہے معنیٔ وفا کا کیا؟

ہاں قیدِ وضعِ عشق و محبت وہ کیا ہوئی — جَور و جفائے یار کی لذّت وہ کیا ہوئی
تیرِ نگاہِ یار کی حسرت وہ کیا ہوئی — اور تیری آرزوئے شہادت وہ کیا ہوئی
افسوس تو نے نام وفا کا ڈبو دیا
اور اپنی آبروئے محبت کو کھو دیا

کیا ایک جھونکے میں ترا گل ہوگیا چراغ؟ — اک رنجِ عشق نے کیا مختل ترا دماغ؟
اک بادِ تُند سے ہوا برباد تیرا باغ؟ — اک سیلِ غم نے دھو دیے الفت کے سارے داغ؟

شہرہ تھا جس کا کیا یہی ناچیز ذات تھی؟
کیا تیرے گھر کی صرف یہی کائنات تھی؟

دے کچھ جواب۔ بحث کا وہ جوش کیا ہوا؟ کیوں چپ لگی ہوئی ہے ترا ہوش کیا ہوا؟
کیوں اے ہمارے رونق آغوش کیا ہوا؟ ہاں چونک! چونک! کیوں ہے تو خاموش کیا ہوا؟
نازک بہت تھا تاب تغافل نہ لا سکا
شاید کہ مر گیا مرا دل وا مصیبتا!

محمد مسلم (عظیم آبادی)

بہارِ سوزِ الفت بلبل بے خانماں تک ہے کہ نذرِ شعلہائے آتش دل آشیاں تک ہے
فنا کا لطف دنیا میں گروہِ عاشقاں تک ہے کہ جن کی مرگ کی سرحد حیاتِ جاوداں تک ہے
میں کہتا ہوں کہ میں نامِ وفا پر جان دیتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ بس دعوائے الفت امتحاں تک ہے
نمودِ عشق نے زندہ رکھا ان مرنے والوں کو نہیں باقی جہاں میں جن کے مرقد کا نشاں تک ہے
پھنکا جاتا ہے دل لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیسی آگ ہے یا رب نہیں جس کا دھواں تک ہے
ملے ہیں دل مگر ظاہر میں شکوے ہیں تغافل کے مزا اسرارِ الفت کا مجھ ایسے رازداں تک ہے
نہ لب تک آہ آئے اور جل کر خاک ہو جانا طلسمِ رازِ الفت کا مزا ضبطِ فغاں تک ہے
نہ ہوگی جبہ سائی ہم سے کعبہ ہو کہ بتخانہ نیازِ عشق کی زینت کسی کے آستاں تک ہے
رہے گا یہ رگِ جاں کی طرح عشاق کے دل میں مری جاں ناوکِ ظلم آپ کے بس میں کماں تک ہے
نظامِ دہر نے سیکھا سلجھنا اسکی زلفوں سے کہ جس کی گردشِ دامن کا پیرو آسماں تک ہے
رسائی شاد کی اس جلوہ گاہِ ناز تک کیا ہو
رموزِ عشق سے واقف جہاں کا پاسباں تک ہے

سید محمد شاد

مرد - یا - عورت؟

فرض کیجیے کہ قدرتِ خود رائے زمانہ کی علم لبریز ترقی کے مشاہدہ سے اس درجہ متاثر ہو کہ اپنی روشِ خود رائی کو تخلیق کی جانے والی ہستی کے انتخاب پر مبنی کر دے اور سب سے پہلے ہیولائے بے حس کو دماغ عطا فرما کر سوال کرے کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی کو تجنیس کے اعتبار سے کس رنگ میں بسر کرنا پسند کرے گا۔ یعنی۔ "مرد بننا چاہتا ہے یا عورت"؟ تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

آپ۔ یعنی میری اس تحریر کے قاری یا سامع۔ خواہ بحالت موجودہ مرد ہوں یا عورت، یا اگر ان دونوں کے علاوہ اور کچھ ہو سکتے ہوں تو وہ بھی۔ خود اپنی طبیعت کے موافق غور کریں اور اس خیالِ بے جا کو علیحدہ کر دینے کے بعد غور کریں کہ "وہ فی الحال مرد ہیں یا عورت"! پھر بتائیں کہ اُن کی طبیعت کا کیا تقاضا ہے؟ عام طور پر خیال ہے کہ مرد ہمیشہ مرد ہی بننا پسند کرے گا اور عورت...... آزاد و تہذیب یافتہ دُنیا کا فرقۂ اناث تو یہی بتاتا ہے کہ وہ باوجود عورت ہونے کے عملی زندگی میں حتی الامکان مرد کی نقل اُتارنے کی کوشاں ہے! پھر بھی "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد"۔ مَردوں میں بھی ایسی طبائع کا ہونا ممکن ہے جو جنسِ نازک کو دل ہی دل میں پسند کرتے ہوں! جو حضرت اس انتخاب پر قلم فرسائی کریں اُن کو چاہیے کہ ترجیح کے دلائل کو نظر انداز نہ فرمائیں!

مجھے خوف ہے کہ میرا سوال خشک طبع لمبے چہرے والوں کو مذاق غیر مہذب نظر نہ آئے۔ کیونکہ حال ہی میں میرے مضمون "محشرِ خیال" نے جو تمدن کے گذشتہ پرچہ میں نکلا تھا کئی متانت معمور افراد کی بنیادِ سکوت کو قریب قریب متزلزل کر دیا تھا اور سنا گیا ہے کہ مُہرِ سکوت عتاب کی سر بمہر بوتل سے سوڈے کے اُبال کی طرح نکلنے والی تھی مگر ایک عنایت فرما کی عنایت سے دُنیا کا اَمن بمشکل تمام قائم رہ گیا اور ادبی دنیا کی سرزمین

ایک غیر معمولی بھونچال سے بال بال بچ گئی! خیر۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ میرا کام صرف اس قدر ہے کہ اپنے خیالات کو بلاکم و کاست پیش کر دوں۔ اگر ہنسنے کی بجائے کوئی شخصیت رونے لگے تو میں اس کا جواب دہ نہیں! ہنسنا اور رونا محض آپ کی اندرونی حالت کا تقاضا ہے! اور کون بتا سکتا ہے کہ بظاہر متین نظر آنے والی صورت باطن کے لحاظ سے "خندۂ لبریز" ہے یا "گریۂ معمور"؟

ہاں! ایک بات ضرور اکثر طبائع کی نگاہ میں کھٹکتی نظر آتی ہے اور اس کا کھٹکنا صحیح بھی ہوگا! یہ اعتراض کیا جائے گا کہ میں نے یہ سوال پیش کیا تھا تو سب سے پہلے مجھے ہی جواب دینا بھی لازمی تھا! سائل کے لیے کسی قانون کی رُو سے اگرچہ اس کی حاجت تو نہیں تاہم مجھے اپنی طبیعت کے اظہار سے نہ کبھی گریز ہوئی اور نہ اب ہے!

میں کہہ چکا ہوں کہ ہیولائے بےحس کو تجنیس عطا کرنے سے پیشتر جب تک دماغ نہ بخشا جائیگا کوئی انتخاب ناممکن ہے۔ اس لیے فرض کیجیے کہ مجھے میرا ہی دماغ عطا ہوا اور پھر یہ سوال کیا گیا کہ میں "مرد بننا چاہتا ہوں یا عورت؟"

میرا خیال ہے کہ میرا دماغ کسی طرح بھی عورت بننا پسند کرنا کیا معنی گوارا بھی نہیں کر سکتا! کیوں؟ اس کیوں کا جواب نہایت طویل اور چناں وچنیں سے بھرا ہوا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں فی الحال مختصر اور عام فہم بننا چاہتا ہوں!

"کیوں" کا جواب ملاحظہ ہو:۔

میرا دماغ فطرتاً محنتِ جسمانی کا بیحد شائق ہے اور ایسا شوق صنفِ نازک کے لیے ناموزوں و عیب ہوگا: میں کسی وقت آرام۔ آرام وہ جس کو فرقۂ لطیف آرام سمجھتا ہے۔ نہیں چاہتا میں خلقتاً درشت اور سخت ہوں۔ میرا دماغ مجبور کرتا ہے کہ میں مرد بنوں اور مرد رہوں! میں کسی حد تک بھی پابندی گوارا نہیں کر سکتا، میں کسی وقت بھی خاموش نہیں رہ سکتا، میں کسی حالت میں بھی تقدیر پہ صابر نہیں، میں کبھی ہرگز کچھ مربع گز زمین میں مقید نہیں رہ سکتا، مجھ سے بچوں کی پرورش ناممکن ہے

میں نے ماں باپ کی مرضی پر اپنی زندگی قربان نہیں کی اور نہ کر سکتا ہوں۔ میں حسب حاجت سچ بول سکتا ہوں لیکن مبالغہ کی چاشنی کے بغیر مجھے خود اپنی گفتگو میں مزہ نہیں آتا! میں صبح سے شام تک ہنس سکتا ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ منہ بنا کر ایک گھنٹہ بھی نہیں بیٹھ سکتا! صالح طبیعتیں مجھے گنہگار کہتی ہیں مگر میں اُن ضروریاتِ ہستی کو جو مسرت زا ہوں مشکل سے گناہ مانوں گا!

ایسی طبیعت اور ایسا دماغ مشرق کے لحاظ سے کسی طرح بھی عورت کا جامہ نہیں پہن سکتا اور اس لیے اگر ازل میں مجھ سے پوچھا جاتا تو بھی میں فطرتاً مجبور تھا کہ مرد ہی بننا پسند کرتا! شاید یہ سمجھا جائے کہ مغربی زندگی کے فرقۂ اناث کو ملحوظ نہیں رکھا گیا لہذا میں اپنے دماغ سے مغربی زندگی کا بھی موازنہ کیے دیتا ہوں!

اچھے کپڑے میں ضرور پہننا چاہتا ہوں مگر فیشن کی نکھ سے سکھ تک پابندی میرے لیے بار ہے! اونچی اڑی کے جوتے سے میں کبھی ہرگز راستہ نہیں چلوں گا؛ پوڈر اور بلوم میری طبیعت کبھی پسند نہیں کر سکتی، مورچال سے مجھے نفرت ہے، تنگیِ کمر کے مرض میں مبتلا ہو کر میں اپنے اچھے خاصے پھیپڑے کو آزادانہ تنفس سے محروم نہیں کر سکتا، میں روزانہ بال، دانت، رنگ، آنکھ، ناک، کے تصنع میں گھنٹے ضائع نہیں کر سکتا، غالباً مجھے اپنی زندگی میں چار گھڑی بھی جینا دشوار ہوگا۔ میں شیطان صفت فرقۂ نوجوان کے خوش رکھنے کے لیے نہ زندگی خراب کر سکتا ہوں اور نہ کسی کے پھانسنے کے لیے ماضیِ بد نما کو بھول سکتا ہوں! مجھے افسوس ہے کہ میں گا بھی نہیں سکتا اور ناچنے سے بھی متنفر ہوں! مختصر یہ کہ مغرب کا زنانہ لباس اور ادا ہائے دلکش میری مردانہ آنکھوں کو کیسی ہی دلفریب و دلکش کیوں نہ معلوم ہوتی ہوں لیکن میں خود اپنی شخصیت کے لیے ان کو ایک لمحہ کے واسطے بھی گوارا نہیں کر سکتا!

یہاں تک تو میں نے سوال زیر بحث کا جواب اپنے دماغ کی رجحان پسندیدگی و نفرت کے لحاظ سے دیا لیکن اس کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو میرے خیال میں ۱۰۰ فی صدی مرد مرد ہی بننا پسند کریں گے اور مشکل سے ۲۵ فی صدی عورتیں صحیح طور پر عورت بننا چاہیں گی!

میرا مقصد اس اظہار سے خدانخواستہ صنفِ نازک کی ہتک نہیں ہے بلکہ محض میرا خیال ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اکثر وجوہات جو مجھے مرد بننے پر مجبور کرتے ہیں بعض عینک سے نقائص نظر آئیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نقائص مجھ میں ہیں اور میں اُن سے کسی طرح دست کش نہیں ہو سکتا! میں ظالم تو نہیں ہوں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اپنی ذاتی رائے میں کسی تحکم آمیز تغیر یا اصلاح کو گوارا نہیں کر سکتا! اس کو آپ نہایت آسانی کے ساتھ جہالت کہہ سکتے ہیں اور منطق کے زیرِ سایہ بہت کچھ بحث کر سکتے ہیں لیکن یہ جہالت میری فطرتِ ثانیہ ہے اور مجھ سے جدا نہیں ہو سکتی! میرا تجربہ ہے کہ فرقۂ اناث کی تین چوتھائی آبادی مشرق میں اور کم و بیش نصف آبادی مغرب میں مرد نہ ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی رنگ میں مبتلائے مصائب ہے! عورت شکایت کرتی ہے کہ مرد سخت ہوتا ہے، خود رائے ہوتا ہے، اور اُس پر کسی نہ کسی حد تک حکمرانی کرنا چاہتا ہے! مرد اپنی دماغی و جسمانی حالت کی وجہ سے ایسا بننے کے لیے فطرتاً مجبور ہے! اب عورت کی شکایت فی الحقیقت قدرتِ خلّاق کی شکایت ہے جس نے اُسے عورت بنایا! میری نظر نے کسی مرد کو مرد ہونے کی وجہ سے نالاں نہیں پایا! یہ حالت مشرق و مغرب، دونوں جگہ، بہ لحاظِ طرزِ معاشرت مشترک ہے! نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا کی تین چوتھائی آبادی مرد ہونے کو پسند کرتی ہے!!

حسن عورت میں ایک بے مثل چیز ہے! لیکن حسین عورتیں ۱۰ فی صدی بھی نہیں ملتیں! اور عورت کا بدصورت ہونا مرد کے بدصورت ہونے سے بدرجہا ظلم ہے! عورت کی صرف ایک مایۂ ناز چیز حسن ہے۔ معاف کیجیے حسنِ سیرت، سلیقہ، یہ، وہ، سب خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اچھی چیزیں ہیں لیکن صورتِ بدنما ان تمام اوصاف پر بیک نظر پانی پھیر دیتی ہے! مرد معمولی نقشہ اور اچھی صحت کا کارآمد اور موزوں ہے لیکن معمولی صورت کی عورت کا زیادہ سے زیادہ دلکش قطعی نہیں! عورت کے لیے دلکش نہ ہونا ظلم ہے! میرا یقین ہے کہ بدصورت مرد فرقۂ اناث کی نظر میں ایسی بری چیز نہیں جس قدر بدصورت عورت مرد کی نگاہ میں ہے! اسکو بھی چھوڑیئے: عورت کو قدرت کا ملہ

نے حسنِ دلفریب کے ساتھ ایسی کمزوریاں اور تکالیف عطا کی ہیں جن کو کوئی عقل سلیم محض حسنِ چند روزہ کے عوض نہیں قبول کرے گی! اس سب پر غضب یہ کہ عورت بہت جلد اپنی رعنائی و دلفریبی کو باوجود احتیاط و کوشش کھو بیٹھتی ہے۔ عورت مرد کے مقابلہ میں نسبتاً جلد اپنی جوانی کو زائل کر دیتی ہے۔ مرد ۲۰ برس سے ۴۰ برس تک بڑھا نہیں کہا جا سکتا اور عورت ۲۵ برس کے بعد سے محض بچوں کی ماں۔ یا گھر والی۔ اور ۳۰ برس کے بعد سے شوہر کے لیے عذابِ جاں بنجاتی ہے! بحث کے لیے حامیانِ فرقۂ لطیف تسلیم نہ کریں لیکن واقعہ سے انکار اُن کی آنکھیں بھی نہیں کریں گی! جذبۂ محبت کو لیجیے: عورت بیچاری اس معاملہ میں ہمیشہ خسارہ میں رہتی ہے اور فطرتاً اس خسارہ کے لیے مجبور ہے! مرد اپنے جذبہ سے سُرور حاصل کرتا ہے، محبت سے لطف اُٹھاتا ہے، حسن کو لُوٹتا ہے: عورت اپنے جذبہ سے بیوقوف بنتی ہے، پھنستی ہے، تکلیف اُٹھاتی ہے، تمام رعنائی و دلربائی کو قربان کر دیتی ہے! یہ سب کچھ وہ خوشی سے نہیں کرتی بلکہ اُس کی فطرت کا تقاضا ہی یہ ہے!

کس قدر قیامت برپا ہوتی اگر قدرت خود رلے اس معاملہ میں انتخاب کو انسان پر چھوڑ دیتی! میرا تو خیال ہے کہ یا تو عورت دُنیا سے اس قدر مفقود ہوتی جس قدر موجودہ جنگ کے دس سال تک چل جانے کے بعد مرد ہوگا اور یا روزِ ازل ایسا طول طویل دن ہوتا کہ نصف صدی تک اسی مسئلہ کے سلجھانے میں اُلجھا رہتا!

میں واقعی ممنون ہوں گا اگر آپ مجھ سے مخالفت کریں اور استدلال کے ساتھ مجھے بتائیں کہ میں کہاں غلطی کرتا ہوں! واقعہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کو بالکل اپنے ہاتھ میں رکھنے سے قدرت کاملہ نے نہایت حکمت سے کام لیا ہے: سوچیے لیا ہے یا نہیں؟ آپ پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید برسوں آپ ایک ایک بات کو سوچا کرتے اور ہمیشہ وجود میں آنے سے گریزاں ہی رہتے! ایک لائق مغربی مصنف کی رلے اس معاملہ میں عجیب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ہر حصۂ عمر میں نئی چیز بننا چاہتا۔ یعنی۔ "۱۵ برس سے ۲۰ برس تک حسینۂ کی۔

۲۰ برس سے ۳۰ برس تک خوشرو اور قومی ہیکل فوجی افسر - ۳۰ برس سے ۳۵ برس تک دولتمند جوان - ۳۵ برس سے ۴۰ تک نازک خیال نقاش - ۴۰ سے ۴۵ تک آنریری مجسٹریٹ - ۴۵ سے ۵۰ تک خان بہادر - ۵۰ سے ۶۰ تک کسی بڑے شہر کا پریسیڈنٹ - ۶۰ سے ۷۰ تک حاجی و متقی - ۷۰ کے بعد سے تارک الدنیا صوفی"

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی رائے کہاں تک صحیح ہے! مجھے دیکھنا ہے کہ آپ کا دل و دماغ اس معاملہ میں کیا کہتا ہے! مجھے صنفِ نازک کی دل آزاری مقصود نہیں۔ میں اُن سے پھر بھی معافی چاہتا ہوں!!

سُلطان حیدر جوش

تضمین

"ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے"

سفر کو نکلے ولایت سے چند نصرانی — گماں یہ تھا کہ زرِ بے شمار راہ میں ہے
یہ طے ہوا کہ چلیں سوے ملک ہندکداں — قدم قدم پہ دُرِ شاہوار راہ میں ہے
پھر ایک اُن میں سے بولا کہ یہ تو سب کچھ ہے — بھلا کہیں کوئی ہوٹل بھی یار راہ میں ہے؟
جو تھک کے بیٹھ رہے پھر کریں گے کیا آخر — کہ ایک دشت پُر از ریگ و خار راہ میں ہے
گر ایسی جا پہ ضرورت ہوئی سواری کی — تو کیا بجز شترِ بے مہار راہ میں ہے
اگر ہو طبع میں پیدا تھکن سے اضمحلال — تو کب سبوے مئے خوشگوار راہ میں ہے
لگے جو بھوک تو اس کے سوا نہیں چارہ — کہ دفن زیرِ زمیں ہیں مزار راہ میں ہے
یہ سُن کے ساری تدابیر ڈاروِن بولا — فرودگاہ کا کیا اعتبار راہ میں ہے
ہماری جنس کو ہے ناشتہ کی کیا دقت — کہ لاکھ کشتِ مسور و جوار راہ میں ہے
ہوئی جو شب تو اُچک کر قیام کرلیں گے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مجنوں - بی - اے (علیگ)

نیشنل کانگریس

اے اہل ہند جس کا تمھیں انتظار تھا — پنہاں تمھارے قلب میں جس کا شرار تھا
جس دن پہ سب اُمیدوں کا دار و مدار تھا — جس دن کے انتظار میں دل بے قرار تھا
فرقت میں جس کی رہتی تھی ہر وقت چشم تر
سینے میں جس کے واسطے بیتاب تھا جگر

وہ امر جس کا رہتا تھا ہر شخص کو خیال — گلزارِ دل میں جس کا تھا پھولا پھلا نہال
کھولے ہوئے تھا آنکھ کو ہر شایقِ جمال — اور لب پہ یہ دعا تھی کہ نکلے مہِ کمال
آخر مرادِ دل سے ہوئے تم بھی ہمقریں
شاداں ہوئی شگفتہ ہوئی خاطرِ حزیں

باغِ عمل میں تازہ بہار آئی مرحبا — امید کے چمن میں خراماں ہوئی صبا
فیضِ نسیمِ صبح سے ہر غنچہ گل ہوا — گلبن ہوا شگفتہ کہ گلدستہ بن گیا
بلبل کو ہے حصول زرِ گل کا مال و گنج
ہے باغ باغ سرو پہ قمری ہے نغمہ سنج

وہ موقع جس میں اپنی لیاقت ہو آشکار — دکھلا سکو وفا کے گہرہائے آبدار
قدموں پہ بادشاہ کے جانیں کرو نثار — اور اپنا مال بیچ کے پیدا کرو وقار
ہمت سے تم نے پورا اُٹھایا ہے فائدہ
برٹش پہ جان و مال کو قربان کر دیا

جانبازیاں دکھائی ہیں جنگِ فرنگ میں — دشمن کو خوں رُلایا ہے میدانِ جنگ میں
تم سر کٹا رہے ہو یہ برٹش کے سنگ میں — آیا کبھی نہ فرق تمھاری اُمنگ میں

شمشیر برق وش میں تمھاری وہ آب ہے
جس کے مقابلہ کی نہ دشمن کو تاب ہے

مالی مدد جو آج تلک ہندیوں نے دی — تعریف اس کی شاہ معظم نے دل سے کی
اب تک نہیں ہے جوش وفا میں ذرا کمی — آیندہ بھی یہ جوش نہ ہوگا فسردہ کبھی

بے شک ہیں اہلِ ہند وفادار و خیرخواہ۔
جو کچھ ہے اُن کے پاس وہ ہے بہرِ نذرِ شاہ

بے شبہ تم جہاں میں ہو مشہور منچلے — جرمن تمھاری تیغ کا لوہا ہیں مانتے
برٹش کا جس جگہ پہ پسینہ ذرا گرے — ہاں اہلِ ہند خون تمھارا وہاں بہے

الفاظِ شاہ یہ ہیں کہ "ہے جاں نثارِ ہند"
بیشک بڑھایا جائے کا عزو وقارِ ہند

کہتے ہیں جس کو "کانگرس" اربابِ علم و فن — ہے جاں نثارِ شاہ تو دلدادۂ وطن
بے شک ہے یہ غلامی و ذلت کی بیخ کن — ہے خیرخواہِ قوم شریکِ غم و محن

قومی حقوق شاہ سے مانگے گی باادب
بے شک مرادیں دل کی برآئینگی اُسکی سب

وہ دردِ دل بیان کریگی جو شاہ سے — تسکین دیں گے اُس کو محبت کی راہ سے
کب تک یہ خستہ دل رہے حال تباہ سے — لازم ہے اب وہ دیکھیں کرم کی نگاہ سے

اب جلد ہم کو مرہمِ زخمِ جگر ملے
اور سلف گورنمنٹ کا ہم کو ثمر ملے

کیا بات ہے کہ دوسرے آزاد ہوگئے — گلشن میں تیرے عہد کے شمشاد ہوگئے
وہ رنج و غم جو اُنکے تھے برباد ہوگئے — آزادی کے حصول سے سب شاد ہوگئے

پر ہم ہیں اب بھی تیغ غلامی سے دلفگار

کب تک رکھے گا صدمۂ توہین اشکبار

آخر جہاں میں ہم نے کیا ہے قصور کیا — کیا قابل کرم نہیں - ہم اے حضور کیا
اے شاہِ جارج آپ ہیں حامیِ بینوا — ہم بیکسانِ ہند کی سُن لیجیے صدا
اب وعدہ ہائے شاہی کا ایفا ہو جلد تر
ہے آرزو ہماری یہی - قصّہ مختصر

آزاد ہم کو کیجیے ہتھیار دیجیے — پھر سر کو اپنے قدموں پہ قربان لیجیے
تیار فوج ہند کروروں ہی لیجیے — بے فکر ہو کے امن کی مے آپ پیجیے
کچھ شک نہیں کہ ہند کی فوجوں کے سامنے
جرمن کی فوج کاہ ہے موجوں کے سامنے

اغیار اپنی آرزوے دل کریں عیاں — جذباتِ باطنی کو بھی اپنے کریں بیاں
باقی نہ اختلاف کا بالکل رہے نشاں — شاہ و رعایا مل کے رہیں مثل جسم و جاں
پھر دیکھیں کون ڈالتا ہے ہند پر نگاہ
سب مل کے اپنی جان کریں دل سے نذرِ شاہ

تعلیم اور صنعت و حرفت کو ہو کمال — افلاس و جہل سے نہ رہے ہند خستہ حال
یہ انتظام گر ہو مسلسل پچاس سال — پھر دیکھیے کہ ہند ہے دولت سے مالامال
قدموں پہ شاہ کے وہ جواہر نثار ہوں
جن کی چمک سے نجم فلک شرمسار ہوں

ہندوستاں کے ہاتھ میں ہو ملک کا نظام — اور ہندیوں کے ہاتھ میں ہو دیں تمام کام
اپنا ہو کام اور شہنشہ کا ہووے نام — بر آئے اہل ہند کا ہر مقصد و مرام
پھر ہند کی ملاحظہ ہوں جاں نثاریاں
سائنس و علم و فن کی نئی ہوں ترقیاں

اے اہلِ ہند خوش ہو کہ ہے شاہ مہرباں   نوشیرواں ہے عدل میں اور حاتم زماں
اُس کے حضور جتنی شکایات ہوں بیاں   اُن کو زراہِ لطف سُنے گا وہ بے گماں

امید ہے یہ ہم کو کرم ہائے شاہ سے
ہم عہد جنگ سلف گورنمنٹ پائیں گے۔   رائزادہ آفتاب

تاریخ نظیر در ماتم ظہیر

ڈیر ایڈیٹر۔ تسلیم۔

اس وقت شیخ نظیر حسین صاحب قدوائی تعلقدار گدیہ ضلع بارہ بنکی نے عزیز گرامی شیخ واثق علی صاحب کی استدعا پر شیخ محمد ظہیر مرحوم کے انتقال پُر ملال کی تاریخ اپنے کمال محبت سے تصنیف فرما کے مجھے بھیجی ہے۔ تاریخ مذکور مجھے بیحد پسند آئی۔ غم ظہیر تازہ ہو گیا۔ اُس کی دینداری اور اُس کی نیکیاں یاد آگئیں اُس کی بیماری کی تکالیف اور اُس کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی یتیمی اور اُس کی نوجوان بیوی کی سوگواری کا خیال کرکے دل بے چین ہو گیا۔ ظہیر مرحوم کی زبان پر مرتے دم تک جس صادق اور بے ریا دوستِ عزیز کا نام رہا وہ آپ ہی کا نام تھا۔ اس لیے جی نہ چاہا کہ اپنے قوتِ بازو کے غمِ مرگ میں آپ اور آپ کے "الناظر" کو شریک نہ کروں۔

تاریخ ارسال ہے۔ امید ہے کہ درج الناظر کرکے اُس نوجوان جنت مکاں کی یاد اور غم کو تازہ فرما دیجیے گا۔   غم نصیب محمد شہیر

وھو ہذا

ظہیر رفت بدارِ بقا زدارِ فنا   جوانِ صالح و دیندار بود و نیک نہاد
برائے سالِ وفاتش نظیر قدوائی   بگفت۔ جائے محمد ظہیر مینو باد

۱۳۳۴ھ

رؤف کی یاد میں

انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی خاص شخص کے افعال و حرکات کا بعض خاص موقعوں پر مطالعہ کرنا، اُن تاثرات و جذبات سے محظوظ ہونا جو ایک وقتِ واحد میں مختلف اسباب کے ماتحت اُس پر طاری ہوتے ہیں نہایت دلچسپ اور انتہائی دلفریب ہے۔ غم و غصہ، رنج و خوشی اور اسی قسم کے دوسرے جذبات روز دیکھنے میں آتے ہیں لیکن اگر ہمارا تجسس کسی قدر اور ترقی کرے تو ہماری نگاہوں کی گرفت بعض ایسے بزرگوں کے مخفی حیات و دلی جذبات بھی باہر لا کر ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے جن کی زندگی رازہائے سربستہ کا ایک ایسا دفتر ہے جس کا کوئی ورق بھی دنیا کے سامنے کبھی نہیں آیا!

یہ تو ہم نے بھی سُنا تھا کہ انگریز حکام کا مزاج مقامی ہوتا ہے۔ یعنی ایک ضلع میں اگر کوئی حاکم نہایت نرم و خلیق ہے تو وہی دوسرے ضلع میں نہایت سخت و درشت ہو جاتا ہے۔ مگر یہ روایت قصہ کے طور پر آئی تھی اور تاریخی و واقعی پہلو سے کبھی کوئی تنقید نہیں کی گئی۔ لیکن اسی وقت ایک دوسرا تجربہ بھی ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ بعض صاحبوں کا مزاج فصلی ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آموں کی فصل ہو تو کیچڑ، پانی، مکھیوں اور رس چیپ کی کثرت سے وہ تنک مزاج ہو جاتے ہیں، نہیں۔ بلکہ گرمی کی شدت، مچھروں کی زیادتی، انسانی طبیعت پر فطرتاً ایک اثر کرتی ہے اور سردی کی سختی، برف باری کی کثرت انسان پر دوسرا رنگ چڑھاتی ہے۔ اسی طرح برسات و موسم بہار اپنی دلفریبیوں اور رعنائیوں میں جو جاذبیت و نیرنگی رکھتے ہیں وہ انسان کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

اسی طرح حالتِ مرض، کیفیتِ اضطراب، رنج و تعب، تردد و فکر اور دوسرے مواقع پر

انسان کی طبیعت ضرور ایک خاص رنگ میں نظر آتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو رؤف کی مسلسل صحبت سے محظوظ ہونے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ باوجودیکہ انسان کی تمام ہستی انقلابات و تغیرات کی ایک مسلسل اور کڑی دار زنجیر ہے پھر بھی اُس کو یہ قوت حاصل ہے کہ وہ خود انقلابات و تغیرات کو اپنا محکوم بنالے اور اپنے ہی ارادے اور قوت کے تابع جس طرح اُن کو چاہے اپنے لیے مفید بنالے

اگر تم رؤف سے پہلی مرتبہ ملتے ہو تو اُس کا فرض صرف اس قدر ہے کہ تم سے ضابطہ کا اخلاق کرے اور گفتگو میں آخر تک اپنے ابتدائی اخلاق کی شان نبھا دے اور بس۔ ہاں وہ دوچار جملوں میں تمھاری قابلیت، اور تمھارے مذاق کو ضرور جانچنا چاہے گا اور کم سے کم یقینی معلوم کرلیگا کہ آیا تم اُس کے ہم مذاق ہو یا نہیں؟ — اگر ہو تو رؤف کی باتیں اپنی دلچسپی میں نمایاں طور پر مگر تدریجی ترقی کرتی جائیں گی اور تمھاری عقیدت اُسی مناسبت سے بڑھتی رہے گی۔ لیکن اگر بدقسمتی سے تم اُس کی معیار پر پورے نہیں اُترتے ہو تو اثنائے گفتگو میں دو چار مواقع پر ایک لفظ سنو گے "جی ہاں!" جس کے اندر بہت سی عبارتیں، الفاظ، اور اُن کے معنی نہاں ہیں اور جس کا مکمل علم شرح و بسط کے ساتھ آج تک اُسکے خاص احباب کو بھی نہیں ہوا۔

اس 'جی ہاں' کی تفصیل تو نہیں ہوسکتی مگر بعض خصوصیات ظاہری پر بارہا ہماری نگاہ بھی پہونچی ہے مثلاً 'جی ہاں' کی 'ی' کے تلفظ میں اس قسم کی طوالت ہوتی ہے کہ بعض موقعوں پر دو دو تین تین سکنڈ تک آواز پورے طور پر ادا نہیں ہو پاتی اور کبھی 'جی' تو معمولی حالت پر رہتا ہے مگر 'ہاں' کا 'ا' ایسا کھنچ جاتا ہے کہ ایک خاص امتیازی شکل پیدا کردیتا ہے۔

اپنے اس عجیب قسم کے معیارِ انتخاب کے استعمال کے بعد رؤف کا دوست روف کا دوست ہو جاتا ہے اور وہ اُس کی صحبت کے تمام حصہ کا شریک اور بقدرِ 'حصہ رسد' مالک بن جاتا ہے۔

(۲)

رؤف شاعر تھا، مگر شعر کبھی نہ کہتا۔ اُس کے سامنے میر کا شعر پڑھو:

ناظر

درپہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر ہائے کس طرح کی پابندی ہے!

ور پھر اُسکے چہرے کو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت واقعی جو شاعر پر بھی نہ گزری ہوگی اُسپر اری ہے، آنکھیں بے خودانہ حرکت کر رہی ہیں، ہاتھ پاؤں ایک ارفتگی کے عالم میں بغیر قصد و ارادہ متحرک ہیں، اور زبان شعر کے ورد میں مشغول ہے۔ کمرے میں ٹہلتا جاتا ہے اور شعر پڑھتا ہے، شعر پڑھتا ہے اور داد دیتا ہے۔ غرض اس قسم کا تجربہ بارہا ہوا ہے۔ گھنٹوں شاعری کا تذکرہ کیجیے، غور کیجیے، روف کے ذوق وشوق میں کوئی کمی نہیں۔ کسی قسم کی فسردگی نہیں، اُس کا جوش اُس کی داد بدستور سرگرم مجلس نوازی ہیں اور دماغ اسی طرح مطالب معانی کا مرقع! شعروشاعری کی صحبتوں کی یہ شدت ہے کہ اکثر احباب ہنستے ہیں، آوازے کستے اور فقرے چست کرتے ہیں مگر رؤف کی زبان سے 'جی ہاں' کے علاوہ نہ کوئی فقرہ نکلتا ہے اور نہ وہ اصلاً اُن کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔ رؤف کی نماز جو بورڈنگ کی مشہور نمازوں میں تھی بارہا چھ چھ گھنٹے کے فرق سے ادا ہوئی (قضا نہیں) مگر شاعری کی مجلس بدستور گرم رہی۔

صبح وشام شاعری کے جلسوں نے روف کی طبیعت پر ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے اُسکے مختصر حلقۂ احباب میں اکثر تو وہ ہیں جن کو اُس سے عقیدت و محبت ہے مگر بعض ایسے بھی شریک ہوگئے ہیں جن کی نیازمندی پر رؤف کو فخر ہے، اور گو وہ ہر وقت اُس کے پاس موجود نہ ہوں مگر اُن کی یاد اور اُن کا ذکر کبھی اُس کی صحبتوں سے جدا نہیں ہوتا۔ اور وہ اگرچہ اپنی اس نئی دلچسپی کو اپنے احباب سے چھپانا چاہتا ہے مگر اپنے حرکات پر اور اضطراری کیفیات پر ہر وقت قابو نہیں پا سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر اکثر وہ حسب معمول بغیر کسی خاص تبدیلی کے شعروشاعری میں مصروف رہتا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص شعر پر کوئی ایسا فقرہ کہہ اُٹھتا ہے جو اُس کے پرہیجان جذبات دوارفتہ تخئیل کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے کہ جس سے

زیادہ بدحواسی کی شان شکل سے ظاہر ہوگی۔
اُس کا دل بے اختیار کسی طرف کھنچتا ہے اور وہ کشش محبوب کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ بے خود ہو جاتا ہے مگر یہ نہیں مانتا کہ مجھ سے بدحواسی سرزد ہوئی۔ اس قسم کے کسی موقع پر جب سے ٹوکا گیا اور وہ جواب دینے پر مجبور ہوا مگر جواب نہ دینا چاہا تو وہ ۔۔۔۔ 'رو دیا'۔ گویہ 'رونا' آنسوؤں سے نہ تھا مگر اُس کا اضطراب دلی اُس کے چہرے پر جو بے بسی، ندامت، اور خفگی کا ایک مجموعی اثر پیدا کرتا تھا اُس کا نام ہم نے 'رونا' رکھا تھا۔
یہ تو بارہا ہوا کہ اُس کی اس نئی دلچسپی کے متعلق گفتگو کرتے کرتے یکبارگی کوئی کہہ اُٹھا کہ "بس اب مذاق نہیں، سنجیدگی سے گفتگو کرو!" تو وہ اپنے اُس اضطراری اور بیخودانہ الفاظ کو دوسرا رنگ نہ دے سکتا اور ناچار روتا' روتا اور بُری طرح روتا۔
رؤف کھیلنے جاتا ہے مگر دماغ محو یاد ہے اور زبان مصروف شعرخوانی۔ بھلا ایسی حالت میں ٹینس کیسے کھیلا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام کو جب خیریت مزاج کا سوال کیا گیا تو ہاتھ کی موچ کی شکایت فرمائی۔ مگر دبی زبان سے۔ اور اس انداز سے کہ الزام نہ اپنی بدحواسی پر عائد ہو اور نہ بالواسطہ کسی دوسری ذات تک یا اُس ذات کے خیال تک پہونچے۔ اور شام کا واقعہ ایک حادثۂ اتفاقی تسلیم کر لیا جائے۔

امتحان کے بعد کا زمانۂ بے شغلی، پھر گرمی و برسات کی پُرلطف تفریحات، اور اُس کے ساتھ ہی تعلیمی پروگرام کی بے ضابطگی اور دفع الوقتی سب ختم ہو چکے ہیں اور پڑھنے کا زمانہ آگیا ہے لوگوں نے اپنی بھولی اور کھوئی ہوئی کتابیں پھر حاصل کر لی ہیں اور کاپی ~~درست و مرتب~~ ہوگئے ہیں اور پڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ رؤف کی شاعری، اُس کا تخیل اُس کی دلچسپی انہماک و وارفتگی سب رخصت ہو چکی ہیں اور اب وہ اگلا رؤف نہیں ہے وہ طالبعلم ہے اور صرف طالبعلم۔ انسانی طبیعت کی تبدیلیوں کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ناظرین

کے ذہن میں ہوں گے ۔ لیکن اگر انتہائے کمال نہیں تو ایک قسم کا انتہائی کمال یہ ضرور ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو اس حد تک تبدیل کرلے کہ وہ انسانیت سے گزر کر کسی دوسری شکل میں نمودار ہو (تناسخ کے مسئلہ سے بحث نہیں، جس میں انسان کے اپنے ارادہ کو تبدیلیِ ہیئت میں کوئی دخل نہیں)

کہتے ہیں کہ جب پڑھنے کا وقت اور قریب آگیا تو رؤف ایک مشین بنگیا، جس کا نام تحصیلِ علم کی کل بتایا گیا ہے۔ کیونکہ اول وہ پروگرام بنا لیتا کہ اتنے صفحے نثر کے، اتنی نظمیں، یہ مسائل اقتصادیات کے اور اس قدر حصہ عربی کا آج ختم ہونا ہے۔ ارادہ کرلینا ہی کام کے انجام پا جانے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ جس طرح تم رُوئی کو مشین میں دیتے ہو اور چند منٹ کے بعد وہ بنولے الگ کرکے بقیہ حصہ ایک جگہ جمع کردیتی ہے، بالکل اسی طرح جب آخر شب میں معلوم کرو تو رؤف کا مقررہ کورس ختم و ہضم ہوچکا تھا۔ صبح سے ساڑھے بارہ تک مسلسل پڑھنے کے بعد وہ پندرہ منٹ کھانے میں دس منٹ نماز میں اور پانچ کپڑا پہننے میں صرف کرتا اور پھر تعلیم میں مصروف ہو جاتا۔ شام کو پورے ۴۵ منٹ تفریح و ہوا خوری میں گزرتے اور پھر شب کو بیس منٹ نمازِ عشا و کھانے کے نذر کرنے پڑتے۔ پروگرام کی پابندی کا یہ حال تھا کہ جہاں پندرہ منٹ کھانے کے ختم ہوئے اور اُس نے کرسی سرکائی اور ہم کو خواہ مخواہ رخصت ہونا پڑا۔ شاعری سے رؤف اس قدر بیزار تھا گویا محض ناآشنا ہے۔ جس قسم کا بھی شعر آپ پڑھیں اُس کے نزدیک بے معنی ہے۔ شعر بذاتہٖ اُس کے نزدیک پڑھنے اور سُننے کی چیز ہی نہیں، اور نہ شاعری سمجھدار انسان کے لیے پیدا ہوئی۔ حُسن و خوبصورتی فی الحقیقت کوئی چیز ہی نہیں مگر بدمذاقی البتہ ایک تکلیف دہ چیز ہے جو اُس کے لیے اب بھی ناقابلِ برداشت ہے۔

یہ سب کچھ تھا مگر ہاتھ کی موچ بدستور تکلیف دہ تھی، اس کی کھٹک پھانس کی طرح تو نہ تھی لیکن جو کچھ بھی تھی بامزہ تھی، اور بالطف تھی۔ رؤف کو اُس سے محبت تھی اور وہ اُس کو علیحدہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ وہ موچ اور وہ موچ زدہ ہاتھ آج تک اُسکے

گلے کا ہار ہے۔

اسی دَورِ آخر میں جب کبھی دوران مطالعہ میں اقتصادی مسائل، درآمد و برآمد، محنت و سرمایہ کے جھگڑے اُس کو اتنی تکلیف پہونچاتے کہ اُس کی روح بے چین ہو جاتی اور وہ بے اختیار ہو کر پھر اپنے عزیز و پُر اسرار خیال سے مدد چاہتا تو ڈرتا کہ کہیں وہ ہی خیال پھر غالب نہ آجائے اور فاتح سے مفتوح نہ بن جائے۔ اس اندیشہ سے وہ بھاگتا اور سیدھا ہمارے کمرے میں دَم لیتا —— رات کے وقت اس طرح کتاب چھوڑ کر یہاں آ بیٹھنا ضرور یہ سوال پیدا کرتا "خیر تو ہے؟ کیا پھر تیر کا شعر یاد آگیا؟" —— مگر واہ رے استقلال! جواب وہی "جی ہاں" —— اور چونکہ "جی ہاں" پیدا کرنے والی کیفیات نہایت موجود ہوتیں لہذا "ی" اور "اں" دونوں کی کشش بہت کافی اور لہجہ خواہ مخواہ درشت ہو جاتا، اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد رؤف پھر اپنی میز پر مشغول ہو جاتا۔

نور الرحمٰن

غزل ہاشمی

نہاں اہل طلب سے بادۂ رخشاں نہیں ہے
یہ آبِ مردِ پردہ در چشمۂ حیوان نہیں ہے

نہ دل جینے سے بہلا تھا نہ دَم آسان نکلے گا
ہماری خوشدلی کا دہر میں سامان نہیں ہے

جو طاقت ہے تو ظلمات مایوسی میں جا ڈوبیں
کہ یاں اُمید کا دریا کبھی پایاں نہیں ہے

طلوعِ شمس جوشِ وصل میں پانی کا اُڑ جانا
حیاتِ منجمد کا عشق میں امکان نہیں ہے

طبیعت پر نہ قابو ہے تو یہ تسکین دے یارب
کہ میرے جزرِ پنہاں کا کوئی نگران نہیں ہے

بسانِ شمس سینہ میرا جلتا ہے تو جیتا ہوں
وگرنہ مگر پا ئل خاک میں کچھ جان نہیں ہے

نظرے خوش گزرے

اگرچہ نومبر کے آخر میں لکھ دیا گیا تھا کہ دسمبر کا پرچہ قدرے تاخیر سے شایع ہوگا لیکن جتنی تاخیر ہوگئی، یہ غیر متوقع تھی۔ اور جو شکایتی خطوط موصول ہوے ہیں اُن کا جواب دینے کے بجاے مناسب ہوگا کہ منتظمین الناظر کی طرف سے معذرت چاہی جائے۔ چونکہ اُردو کانفرنس کی تمام ذمہ داریاں احباب لکھنؤ نے خاکسار ایڈیٹر کے سر رکھی ہیں اس وجہ سے حد درجہ عدیم الفرصتی ذاتی کاروبار پر توجہ کرنے میں مانع آتی ہے اور جس قدر احباب نے اس عرصہ میں خطوط تحریر فرمائے ہیں یا اب لکھیں گے اُن کو اگر جواب نہ مل سکے یا نہ ملے، تو یقین ہے کہ وہ ہماری معذوریوں پر نظر فرما کر معاف کریں گے۔

اُردو کانفرنس کے انتظامات کے لیے ایک مجلس استقبالیہ قائم کی گئی ہے۔ جس کے حسب ذیل عہدہ داران و ارکان منتخب ہوے ہیں:۔

صدر انجمن:۔ جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا۔

نائبین صدر:۔ سید التفات رسول صاحب ہاشمی تعلقدار سندیلہ۔ نواب سلطان علی خاں صاحب رئیس لکھنؤ
نواب آغا محمد شفیع خاں صاحب رئیس لکھنؤ۔ پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے ہیڈ ماسٹر
جوبلی اسکول لکھنؤ۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا بی اے۔ مولوی نظام الدین
حسن صاحب ایم اے بی ایل (سابق میر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد دکن) مولوی سید سلیمان
صاحب ندوی۔ مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی۔ ٹھاکر نواب علی صاحب تعلقدار

(نوٹ) ان کے علاوہ آنریبل منشی پراگ نرائن صاحب مالک نولکشور پریس لکھنؤ اور جناب مولانا سید کرامت حسین صاحب سابق جج ہائیکورٹ الہ آباد بھی نائب صدر منتخب ہوے تھے لیکن ہر دو اصحاب نے بوجوہ اسے منظور کرنے سے انکار فرمایا۔

معتمدین:۔ پنڈت برج نرائن چکبست بی اے۔ مولانا عبد الحلیم صاحب شرر۔ ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب
ایم اے ایل ایل ڈی۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔

مددگاران معتمد:۔ مسٹر عبد الوالی بی اے (ایڈیٹر معلومات) مسٹر عباس حسین قاری ایڈیٹر تمدن۔ مولوی صبغۃ اللہ
شہید ایڈیٹر ہنفامیہ۔ مولوی اکرام اللہ خاں ایڈیٹر الندوہ ظفر الملک علوی

ارکان مجلس کا رکن: پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی۔ سید سجاد حیدر بی اے۔ مسٹر عبد الماجد
بی اے۔ سید جالب ایڈیٹر ہمدم۔ منشی ممتاز حسین ایڈیٹر اودھ پنچ۔ منشی سخاوت علی رکن انجمن

میونسپل بورڈ لکھنؤ - راجہ غلام حسین بی اے سب ایڈیٹر آئی ڈی ٹی - منشی پیارے لال شاکر ایڈیٹر العصر خواجہ امیر احمد انصاری بی اے - مسٹر وصی الحسن بی اے ایل ایل بی - خواجہ رشید الدین رئیس لکھنؤ منشی نوبت رائے نظر ایڈیٹر اودھ اخبار - مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی - منشی مقبول حسین ظریف سید میر جان میونسپل کمشنر لکھنؤ - چودھری نذیر احمد صاحب بیرسٹر شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری

پھر ان میں سے سات سات اصحاب کی تین ذیلی مجلسیں ترتیب دی گئی ہیں جن کے متعلق ضروری مصارف انتظامی کے لیے چندہ فراہم کرنا - جلسہ ہائے کانفرنس کا نظام عمل مرتب کرنا اور مہمانداری کا سرانجام کرنا رکھا گیا ہے - ان میں سے نظام عمل مرتب کرنے والی مجلس خاص اہمیت رکھتی ہے اس لیے اُسکے اراکین کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) پنڈت منوہر لال زتشی (۲) سید سجاد حیدر (۳) مسٹر عبد الماجد (۴) سید سلیمان (۵) پنڈت کشن پرشاد کول (۶) سید جالب (۷) مرزا محمد ہادی عزیز -

مجلس استقبالیہ اور اُس کی تمام ذیلی جلسوں کا معتمد کارکن ایڈیٹر الناظر مقرر ہوا ہے - اُردو کانفرنس کے اجلاس ۲۹ دسمبر کو ½ ۸ بجے صبح اور ۳۰ دسمبر کو ایک بجے دن سے ہوں گے اور ان جلسوں کی صدارت کے لیے نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال رئیس عظیم آباد پٹنہ منتخب ہوئے ہیں -

انشاء اللہ جنوری نمبر میں ہم کانفرنس کی روداد اور جملہ کارروائیوں کے متعلق پوری اطلاعات بہم پہونچا سکیں گے ہی خواہان اُردو کو عام طور پر دعوتی خطوط بھیجے جا رہے ہیں - ناظرین الناظر کو ہم اس موقع پر خاص طور سے دعوت دیتے ہیں کہ اُردو کانفرنس میں شریک ہو کر اس کی رونق افزائی فرمائیں اور ہمیں حصول نیاز کا موقع عنایت کریں - اور جو صاحب ہماری دعوت قبول فرمائیں - براہ کرم ۲۵ دسمبر سے قبل اپنی تشریف آوری کی تاریخ اور وقت سے مطلع فرمائیں -

---

ایسے وقت میں جبکہ لکھنؤ میں اُردو کانفرنس منعقد ہونے والی ہے، ہمارے شہر کے دو نامور شاعروں کا انتقال ہو جانا نہایت افسوسناک ہے - جناب سید علی محمد عارف خاندان حضرت میر انیس مرحوم کی یادگار تھے - اور پنڈت بشن نرائن در آبر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ایک مشہور اور مسلمہ سیاست داں اور اہل ملک کے ایک سچے خیر سگال اور دلیر رہنما ہونے کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے تھے - جناب عارف مرحوم کے حالات ہمارے دیرینہ کرم فرما حضرت محشر لکھنوی خاص الناظر کے لیے لکھ رہے ہیں جو آیندہ شایع ہو سکیں گے - اور پنڈت صاحب آنجہانی کا سوانحی تذکرہ لکھنے کی بھی ہم نے بعض احباب کو دعوت دی ہے جن میں سے کوئی نہ کوئی صاحب غالباً جلد توجہ فرمائیں گے

قوت مردمی کیلئے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہارون سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ ہو گئے ہون آخر مین اب ایکبار ہماری سفارش قبول فرمائین اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف دویہ اننگ نگرہ گولیون کا استعمال فرمائین اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کرین، گئی ہوئی اور ہاتھون سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتین از سر نو عود کر آئین تو ہمارا ذمہ۔ صاحبو! اس کے باب مین زمانہ کے معزز اصحاب تعریف فرما رہے ہین لاکھون کی تعداد مین سرٹیفکٹ موجود ہین مردون اور عورتون کو بہت مفید ہے اور نباتات سے مرکب ہین قیمت بھی بہت کم ہے صرف فی بکس بتیس گولیون کا ایک روپیہ آزمائش شرط ہے یکمشت چار روپیہ کے خریدار کو ایک روپیہ کی دوا زیادہ ملے گی:-

پتہ

وید شاستری جام نگر۔ کاٹھیاوار۔